[illegible]

جامع [illegible]

[illegible]

جامعہ

سالانہ چندہ چھ روپے		قیمت فی پرچہ پچاس پیسے
جلد ۶۳	بابت ماہ جنوری ۱۹۷۱ء	شمارہ ۱

سید ابوالکاظم قیصر زیدی

فہرست مضامین

مُدیر

ضیاء الحسن فاروقی

خط وکتابت کا پتہ

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

طابع وناشر: عبداللطیف اعظمی　　مطبوعہ: یونین پریس دہلی　　ٹائیٹل: دیال پریس دہلی

شذرات

دسمبر ۶۸ء میں دہلی میں دو کنونشن منعقد ہوئے، ایک مسز سبھدرا جوشی کی صدارت میں آل انڈیا سمپردائکتا ورودھی کمیٹی (کل ہند فرقہ واریت مخالف کمیٹی) کا اور دوسرا جناب بدرالدین طیب جی کی صدارت میں کل ہند مسلم پولیٹیکل کنونشن۔ فرقہ واریت مخالف کنونشن ۱۱، ۱۲ اور ۱۳ دسمبر کو ہوا اور ۱۳ دسمبر کو اس کے ڈیلیگیٹس کا جلسہ اسی ہال میں ہوا جس میں ۱۹ دسمبر کو مسلم کنونشن منعقد ہوا۔ کس قدر دلچسپ بات ہے یہ کہ جس جگہ ۱۳ دسمبر کو یہ ریزولیوشن منظور ہوا کہ مسلمانوں کو علیحدگی پسندی کا رجحان چھوڑ کر مشترک زندگی کی جدوجہد میں شریک ہونا چاہئے، اسی جگہ ۱۹ دسمبر کو یہ فیصلہ کیا گیا کہ مسلمانوں کی ایک الگ سیاسی تنظیم قائم کی جائے۔

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

فرقہ واریت مخالف کنونشن میں وہ زعمائے ملت شریک نہیں ہوئے جو ۱۹ دسمبر کو اسٹیج پر نظر آئے، حالانکہ کنونشن میں ہندو فرقہ واریت سے ملک کو، اقلیتوں کو اور خاص طور سے مسلمانوں کو جو نقصانات پہونچے ہیں، اور اگر اس کا خاتمہ نہ ہوا، تو جو نقصانات پہونچیں گے، ان پر بڑی تفصیل سے تبادلۂ خیال ہوا۔ اس بات کو زور دے کر بار بار کہا گیا کہ مسلمانوں کی تباہی صرف مسلمانوں ہی کی نہیں بلکہ ملک و قوم کی تباہی بھی ہے، اس لئے انسانیت اور حب الوطنی دونوں کا تقاضا ہے کہ ہندو، مسلمان، عیسائی، سکھ، غرض ملک کے ہر طبقے اور ہر مذہب کے لوگ فرقہ واریت کے خلاف جم کر کھڑے ہو جائیں اور اسے ملک سے ہمیشہ کے لئے ختم کر دیں۔ افسوس ہے کہ یہ زعمائے ملت بزعم خود مسلمانوں کی ایک علاحدہ سیاسی جماعت کو ہی مسلمانوں کے درد کا مداوا سمجھتے ہیں۔ فکر و عمل کی اس سے بڑی محرومی اور کیا ہو سکتی ہے؟

ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ تقسیم ہند سے دو تین سال پہلے جب مسلم لیگی حضرات سے نظریۂ پاکستان پر گفتگو ہوتی تھی تو وہ کس طرح دوران بحث یہ کہہ اٹھتے تھے کہ ۱۹۰۶ء کا سال مسلمانان ہند کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے، ہم ان سے کہتے تھے کہ یقیناً وہ سنگ میل ہے لیکن مسلمانوں کی سیاسی کج اندیشی کی تاریخ کا سنگ میل ہے، آج اگر جناب بدر الدین طیب جی اور جناب ڈاکٹر فریدی سے پوچھا جائے کہ ۱۹۰۶ء کی آپ کے نزدیک کیا حیثیت ہے تو یقیناً وہ یہی بات کہیں گے، حالانکہ وہ بخوبی جانتے ہیں کہ مسلم فرقہ واریت نے اس برصغیر کے مسلمانوں اور خاص طور سے مسلمانان ہند کی ہیئت اجتماعیہ پر جو شدید ضربیں لگائی ہیں اُن کا زخم نہ معلوم کب مندمل ہوگا۔ افراد کی طرح قوموں اور جماعتوں کی زندگی میں بھی چند ایسے لمحے آتے ہیں جہاں ان کا ایک غلط فیصلہ بے شمار ناکامیوں اور ہلاکتوں کا پیش خیمہ بن جاتا ہے۔ مسلمانانِ ہند کی تاریخ میں ایک وقت آیا جب انہیں ایک تاریخی فیصلہ کرنا تھا، اور انہوں نے ۱۹۴۷ء میں یہ تاریخی فیصلہ کیا لیکن وہ فیصلہ غلط تھا اور اس کی تباہیاں، معلوم و نامعلوم، بے شمار۔ ایسے فیصلہ کن لمحے روز روز نہیں آتے، قوموں اور جماعتوں کی صدیوں کی تاریخ کا نتیجہ ہوتے ہیں یہ لمحے، اس لئے ایسے وقت میں ایک غلط فیصلے کے نتائج برسوں، قرنوں اور بسا اوقات صدیوں پر پھیلے ہوتے ہیں:

یک لحظہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شُد

جن قوموں اور جماعتوں میں تاریخی حقائق سے عبرت حاصل کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے وہ ایسی غلطیاں نہیں کرتیں جن کی پاداش میں پچھلے لوگ مصیبتوں اور ہلاکتوں میں مبتلا ہو چکے تھے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانان ہند میں اب یہ صلاحیت بھی باقی نہیں رہی۔

مسلمانوں کے اس کنونشن میں جب ایک ڈیلیگیٹ نے مسلمانوں کی علاحدہ سیاسی جماعت کی تشکیل کے اثرات و نتائج کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ عمل اور ردعمل کے نتیجے میں یہ ہوگا کہ اس سے ہندو فرقہ واریت اور ہندو فرقہ وارانہ جماعتوں کو طاقت ملے گی، تو مسلم مجلس (یو، پی) کے قائد ڈاکٹر فریدی نے جواب دیا کہ "ہم خود عمل اور ردعمل کے اسی سلسلے کی ایک کڑی ہیں" ذرا اس جملے پر غور فرمایئے، یعنی مسلمانوں کو

یہ بتانے کی کوشش کی جارہی ہے کہ تم فکر و ارادہ کی صلاحیت سے محروم ہو چکے ہو، تم جن کے اسلاف کبھی تاریخ کا دھارا موڑ دیتے تھے، آج تاریخی جبریت کے محکوم ہو، تمہارے ہاتھ میں کچھ نہیں، وقت تمہیں جیسا بنادے بن جاؤ، اگر ایک جماعت کی فرقہ واریت سے تمہیں نقصان پہونچ رہا ہے تو تم بھی اس فرقہ وایت کا جواب اپنی فرقہ واریت سے دو، دوسروں کا جیسا عمل اپنا ویسا ہی ردعمل!
فاعتبروا یا اولی الابصار۔

بُرائی سے بُرائی پیدا ہوتی ہے اور نیکیاں بُرائیوں کو دور کر دیتی ہیں، یہ الہی قانون ہے جو انسان کی معنوی دنیا میں کارفرما ہے، قرآن شریف میں ہے: إِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ط ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ ہ اور یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نیک عملوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔ اب جب فرقہ واریت انسانوں کی مادی اور روحانی دونوں طرح کی زندگیوں کے لئے مضر اور تباہ کن ہے تو وہ ہندو فرقہ واریت ہو یا مسلم فرقہ واریت، اس سے کبھی خیر و فلاح کی امید نہیں رکھنی چاہئے، اگر آگ کا خاصہ جلانا ہے، تو وہ ہر جگہ چیزوں کو جلائے گی، اس سے آپ ریفریجریشن کا کام نہیں لے سکتے، یہی حال فرقہ واریت کا ہے، اس لئے جو لوگ مسلم فرقہ واریت سے ہندو فرقہ واریت کا جواب دینا چاہتے ہیں، وہ گویا بُرائی کو بُرائی سے ختم کرنا چاہتے ہیں، ماضی میں ایسا کبھی نہیں ہوا، اور آیندہ بھی کبھی ایسا نہیں ہوگا۔ یہ سنت الٰہی ہے، اس میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ہ

مسلمانوں کی بہت بڑی آبادی اَن پڑھ ہے، یہ لوگ اپنے چھوٹے چھوٹے دھندوں، مثلاً کاشتکاری، گھریلو صنعتیں، محنت مزدوری یا چھوٹی موٹی دوکان داری میں لگے ہیں اور اپنی روزی کماتے ہیں، انھیں کسی طرح کا سیاسی شعور نہیں، ہاں مذہبی جذبہ رکھتے ہیں اور ان کے اس جذبے کی قدر کرنی چاہئے۔ یہ لوگ اتنے سادہ لوح ہیں کہ کوئی بھی شخص مسلمانوں کے خیر خواہ ہونے کا بہروپ بھر کر ادر ان کے مذہبی جذبے کو مشتعل کر کے اپنا مقصد حاصل کرسکتا ہے، ہاں تباہی و بربادی آئے گی تو انھیں بیچاروں کے حصے میں۔

ان کی خیر خواہی کا مطلب تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ مسلمانوں کی جماعتیں ان میں تعلیمی و تہذیبی کام کرتیں، سماجی کاموں کی افادیت کا شعور ان میں پیدا کرتیں، سچی اسلامی زندگی کے لئے ان کے مذہبی جذبے کو تعمیری کاموں کی طرف موڑ دیتیں، یہ جماعتیں کچھ نہ کرتیں، اگر اوقاف کا نظام ٹھیک اور مسلمانوں میں زکوٰۃ کا معاملہ ہی احکام قرآنی کے مطابق درست کرلیتیں تو یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں کی اجتماعی مشکلات و مصائب کا حل، بہت بڑی حد تک، خود بخود پیدا ہو جاتا۔

کنونشن کی عملی سیاست اور اس کے قائدین کا سیاسی مزاج کیا ہوگا، اس کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ کنونشن نے طیب جی کی صدارت میں مسلم پرسنل لا میں تبدیلی سے متعلق ایک تجویز پاس کی اور کنونشن کے بعد جناب صدر نے اپنی ذاتی رائے کہہ کر اس تجویز سے اپنی برات کا اعلان کردیا۔ تجویز یہ تھی کہ حکومت جلد از جلد اس کا واضح اعلان کردے کہ کسی اقلیت اور خاص طور سے مسلمانوں کے پرسنل لا میں کوئی تبدیلی نہیں کی جائے گی۔ اخباری نمائندوں سے بات کرتے ہوئے پریس کانفرنس میں طیب جی نے کہا کہ "میں اس تجویز سے متفق نہیں ہوں" (ہندوستان ٹائمز، ۱۲ر دسمبر ۱۹۷۰ء) جب اُن سے کہا گیا کہ کیا اس قرارداد کی منظوری ان کی شکست نہیں ہے تو انھوں نے جواب دیا کہ "میں اسے اپنی شکست تسلیم نہیں کرتا۔ مجھے بہرحال مسلم کمیونٹی کے ساتھ رہنا ہے، میں اسے چھوڑ نہیں سکتا۔" (روزنامہ الجمعیۃ، ۲۲ر دسمبر ۱۹۷۰ء)۔ اس دو رنگی کا کیا مطلب ہے؟ کیا اسی راہ پر چل کر مسلمانوں کی بہتری کے دروازے کھولے جائیں گے۔ ۱۹۴۷ء میں امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد نے دہلی کی مسجد جامع میں مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ مسلمان خوف اور تذبذب کی اپنی ہی دو دھاری تلوار کی کاٹ کے شہید ہیں۔ آج یہ جو دبے دبے لفظوں میں یہ کہہ کر کہ مسلمانوں کو سیاسی مشورہ کی ضرورت ہے اور ہم سب کے ساتھ تعاون کریں گے، مسلمانوں کے ایک گروہ نے آل انڈیا مسلم سیاسی مشاورتی کمیٹی قائم کی ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے ماضی سے کچھ نہیں سیکھا ہے، یہ دراصل اس ملک میں مسلمانوں کی علاحدہ سیاست کی بنیاد ہے اور اسے سب جانتے ہیں کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی علاحدہ سیاست پختہ کاری کی دلیل نہیں، بلکہ اس میں ہمیشہ خوف، تذبذب اور شکست خوردگی کی کارفرمائی رہی ہے اور آج بھی یہی صورت حال ہے، کیا مسلمان آج بھی اس دو دھاری تلوار سے اپنی شہ رگ پر ضرب لگانے اور اس طرح خودکشی کے لئے تیار ہو جائیں گے؟

پروفیسر خواجہ غلام السیدین

خطبۂ جلسہ تقسیم اسناد

(آگرہ یونیورسٹی ، ۸ر دسمبر ۱۹۶۷ء)

میں آپ کی یونیورسٹی کے چانسلر اور وائس چانسلر صاحبان کا شکر گذار ہوں کہ انھوں نے مجھے اِس کنووکیشن میں شریک ہونے کی عزت بخشی۔ میں نے کبھی اس یونیورسٹی میں تعلیم نہیں پائی لیکن اس صوبے میں بہت سال تک کام کرنے کی وجہ سے میرا ایک زمانے میں اس سے قریبی تعلق رہا ہے اور مجھے معلوم ہے کہ ماضی میں اس کی بہت اچھی شہرت تھی۔ اس کے بعض اچھے کالجوں میں حاضر ہونے کا موقع بھی مجھ کو ملا ہے۔ مجھے دعوت دی گئی ہے اس کنووکیشن میں ایڈریس دینے کی۔

میرا اندازہ ہے کہ ہندوستان کی تمام یونیورسٹیوں میں ہر سال کم سے کم سَو اڈریس دیئے جاتے ہوں گے اور اگر اُن کالجوں کو بھی شامل کر لیا جائے جو اپنے الگ کنووکیشن کرتے ہیں تو ان کی تعداد بہت بڑھ جائے گی۔ اور پھر یہ تماشا ہر سال دُہرایا جاتا ہے۔ طلبہ کو ان تقریروں میں کوئی خاص دلچسپی نہیں ہوتی بلکہ اکثر ایسے موقعوں پر اب یہ کہا جاتا ہے کہ "ہمیں تقریریں نہیں چاہئیں، ہمیں روٹی چاہیئے، ہمیں ملازمت چاہیئے" اور کون کہہ سکتا ہے کہ یہ مانگ غلط ہے؟ لہٰذا "مہمان اس بلاوے کو قبول کر کے آتا ہے اسے ایک طرف تو اس سوالت کے لئے تیار ہونا چاہیئے اور دوسری طرف اُسے یہ فکر ہوتی ہے کہ وہ کونسی ایسی بات کہے جو کسی حد تک نئی ہو یہ طالب علم سُننے کے لئے مشتاق نہ ہوں تو کم سے کم راضی ہوں۔ پھر آپ ہی

بتائیے کہ (بقول شاعر)

اس طرح سے رونے کو کہاں سے جگر آوے!

ممکن ہے آپ یہ پوچھیں یا آپ کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ یہ سب جانتے ہوئے بھی اس شخص نے یہ دعوت کیوں منظور کی۔ صرف اس لئے نہیں کہ بلاوا میرے ایک محترم دوست یعنی آپ کے چانسلر کی طرف سے آیا تھا بلکہ اس وجہ سے بھی کہ جوں جوں عمر بڑھتی ہے اور کشتی دریا کے دوسرے کنارے کے نزدیک پہنچ جاتی ہے میرا دل چاہتا ہے کہ نوجوانوں سے میرا رشتہ نہ ٹوٹے، کیونکہ زندگی کی موج انھیں کے سینوں میں رواں ہے۔ یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتا کہ میں اُن کے دل و دماغ کو، اُن کے درشٹی کونٹر، یعنی نقطۂ نظر کو، ان کی نئی تحریکوں کو پوری طرح سمجھتا ہوں اور کیسے سمجھ سکتا ہوں جب وہ خود بھی ان کو پوری طرح نہیں سمجھتے! لیکن کوئی چیز میری اس دلچسپی کو کم نہیں کر سکتی جو مجھے نوجوانوں کی آرزوؤں اور اُمیدوں، اُن کی کٹھنائیوں اور محرومیوں، اُن کے حال اور مستقبل سے ہے۔ میں یہ کہہ کر آپ کو خوش کرنے کی کوشش نہیں کروں گا کہ دیش کا مستقبل آپ کے ہاتھ میں ہے۔ ایک صاف سی بات کو دہرانے سے کیا فائدہ؟ لیکن اتنا جانتا ہوں کہ آپ اپنے دل اور دماغ کو، اپنی سیرت اور شخصیت کو اس طرح بنانے اور سنوارنے کی کوشش نہیں کریں گے جس طرح ایک جوہری ایک اَن گڑھ ہیرے کی کانٹ چھانٹ کرتا ہے تو دیس کا مستقبل ہرگز نہیں سُدھرے گا۔ دیکھئے، میں نے یہ نہیں کہا کہ آپ کے ماں باپ یا استاد ایسا کریں کیوں کہ یہ تو ایسی ذمہ داری ہے کہ اس کو پورا کریں گے تو آپ اور نہ پورا کریں گے تو آپ، کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔ یہ آپ کی خوشامد نہیں بلکہ آپ کو ایک چیلنج ہے۔

میں نے یونیورسٹی کی گذشتہ دو سال کی رپورٹوں پر سرسری نظر ڈالی ہے اور خاص طور پر ان کے بارے میں وائس چانسلر کے ریمارکس کو غور سے پڑھا ہے، دلچسپی کے ساتھ، لیکن اس دلچسپی میں کچھ فکر اور پریشانی بھی شامل ہے۔ اِن رپورٹوں سے پتہ چلتا ہے کہ یونیورسٹی میں ذہنی اور علمی ایمان داری کی آب و ہوا کو پیدا کرنے کے لئے کیا کوششیں کی جا رہی ہیں لیکن اس سے یہ بھی

اندازہ ہوتا ہے کہ اپنی منزل تک پہنچنے کے لیے ابھی ہمیں کتنا فاصلہ طے کرنا ہے، صرف اسی یونیورسٹی میں نہیں بلکہ ملک کی بیشتر یونیورسٹیوں میں۔ وائس چانسلر نے بہت سے ملحقہ کالجوں کی مادی اور علمی حالت کی جو تصویر کھینچی ہے اس میں بہت کم روشن رنگ ہیں۔ میں خود کو اس کا اہل نہیں سمجھتا کہ ان کے بارے میں کوئی حکم لگا سکوں۔ البتہ اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ اس صورتِ حال کی اصلاح اس وقت تک نہیں ہو سکتی کہ جب تک وہ سب لوگ جن کا ان کالجوں سے تعلق ہے، خواہ استادوں کی حیثیت سے یا کارپرداز کی حیثیت سے یا ودیارتھیوں کی حیثیت سے، مل جل کر اس بوجھ کو نہ اٹھائیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ ان میں ذہنی اور تعلیمی کمال کے لئے ایسی تڑپ، ایسا جذبہ، ایسی روش اور ایسی غیرت پیدا ہو جائے کہ وہ کسی گھٹیا چیز کو قبول کرنے پر راضی نہ ہوں۔ لیکن افسوس ہے کہ ہمارے بیشتر کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اس جنسِ عزیز کی مانگ بہت کم ہے۔

میں اس موقع پر، عام دستور کے خلاف، آپ کو کوئی اُپدیش دینا نہیں چاہتا گو یہ جانتا ہوں کہ زندگی کی وسیع حدوں میں اس کا بھی ایک مقام ہے۔ میں تو آپ کے سامنے چند خیالات پیش کرنا چاہتا ہوں جن میں آپ کو شاید کچھ دلچسپی ہو سکے۔ ان کا تعلق اس دنیا سے ہے جس میں آپ آج زندگی بسر کر رہے ہیں اور اُس دنیا سے جس میں آپ اس کا زیادہ تر حصہ بسر کریں گے۔ یعنی بیسویں صدی کی اجنبی دنیا۔ میں تعلیم کے بارے میں بھی براہ راست کچھ نہیں کہوں گا۔ ایک تو اس لیے کہ عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں' اور دوسرے یہ کہ آج کل ہر شخص نے تعلیم کے بارے میں اظہارِ خیال کرنا، اس پر کڑی نکتہ چینی کرنا اپنا حق سمجھ لیا ہے۔ اور جتنی کم کسی کو اس سے واقفیت ہوتی ہے اتنی ہی شدت اور یقین کے ساتھ وہ اس کے بارے میں حکم لگاتا ہے۔ ہاں ایک بات آپ کو راز کے طور پر بتانا چاہتا ہوں۔ میرے دل کے کسی کونے میں ہمیشہ یہ خواہش رہی ہے کہ کوئی وقت ایسا آئے کہ ہماری یونیورسٹیاں ذاتی مقصدوں اور فائدوں کی رسہ کشی اور ہڑتالوں، ہنگاموں اور مخالفتوں سے بلند ہو کر علم کے پیاسوں اور اہلِ نظر کے لئے تیرتھ استھان بن جائیں جہاں وہ اپنی پیاس بجھا سکیں اور اپنی تلاش کو تسکین دے سکیں۔ مدت ہوئی ہمارے ایک شاعر

الہ آباد گئے جہاں اُن کی ملاقات اکبر الہ آبادی سے ہوئی اور اس سے متاثر ہو کر انھوں نے یہ شعر کہا ؎

الہ آباد میں ایک اور ہی سنگم نظر آیا
بہم تھے علم اور حکمت کے دریا قلبِ اکبر میں

اکبر تو عرصہ ہوا خدا کو پیارے ہو گئے لیکن جی چاہتا ہے کہ جب کوئی یاتری الہ آباد جائے تو وہاں صرف گنگا اور جمنا کے پوتر پانی کا سنگم ہی نہ دیکھے بلکہ اُسے الہ آباد یونیورسٹی میں علم اور حکمت، سائنس اور فلسفہ، فن اور ادب کا سنگم بھی نظر آئے۔ جی چاہتا ہے کہ جب وہ آگرہ آئے تو یہاں صرف تاج محل کی سُندرتا کا معجزہ ہی نہ دیکھے جس میں نزاکت ہے اور عظمت، توازن ہے اور تخیل کی بلندی اور جس کے سنگِ مرمر کی رگوں میں انسان کی محبت اور محنت اور فن کاری کی لہریں دکھائی دیتی ہیں بلکہ اس کے دل میں یہاں کی یونیورسٹی دیکھنے کی آرزو بھی پیدا ہو، اس اُمید میں کہ اُسے یہاں انسان کے دماغ کی روشنی اور جولانی، اس کے دل کا گداز اور دیا، اس کی انسان دوستی اور رفاقت کی جھلکیاں، اس کی قدروں کی بے تاب تلاش کا جلوہ نظر آئے گا، وہ یہاں یہ محسوس کرے کہ زندگی محض اپنی ذات کے لئے چھوٹے چھوٹے فائدوں کی تلاش کا نام نہیں جس میں انسان نیکی اور بدی، سچ اور جھوٹ کے فرق کو بھول جاتا ہے۔ یہاں زندگی نام ہے اس مسلسل کوشش کا جو انسان علم کی سیماؤں کو وسیع کرنے اور انسانی رشتوں میں شرافت اور دنیا کے کارنگ بھرنے کے لئے کرتا ہے۔ کیا ہم کسی حد تک بھی اس آئیڈیل تک پہنچ سکے ہیں؟ میں نہیں جانتا۔ آپ اس سوال کا بہتر جواب اپنے ضمیر کو دے سکتے ہیں کیونکہ آپ اپنی یونیورسٹی کو مجھ سے زیادہ اچھی طرح جانتے ہیں۔ لیکن جس حد تک میں ملک کی عام یونیورسٹیوں سے واقف ہوں، اتنا کہہ سکتا ہوں کہ وہ اس کسوٹی پر کسی طرح پوری نہیں اُترتیں۔ کیا اس آدرش کی طرف بڑھنا بالکل ناممکن ہے؟ اگر ہے تو دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ہم نے کیوں اتنے ادارے اتنے وشو ودیالے کھول رکھے ہیں جو اپنے لاکھوں طلبہ کی کسی طرح بھی تسلی نہیں کر سکتے۔ وہ غیر مطمئن ہیں ملازمت پر

محرومی کا احساس چھایا ہوا ہے، اور ان میں سے اکثر کی سماجی اور اقتصادی زندگی بھی ناکام رہتی ہے۔ میں یہاں صرف یہ سوال اٹھاتا ہوں۔ اس کا جواب دینا آپ کا، آپ کے استادوں کا، آپ کے مشغلوں کا کام ہے۔

معاف کیجئے میں اپنے مقصد سے ذرا ہٹ گیا۔ میں آپ سے آپ کی اس دنیا کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا تھا۔ انسان کی زندگی میں دو ہی بڑی کہانیاں ہیں۔ ایک آپ بیتی جس کا یہ موقع نہیں۔ دوسری جگ بیتی جس کو کوئی بھول نہیں سکتا۔ اور جس میں ایک طرح سے میری، آپ کی اور ہم سب جگت باسیوں کی کہانی شامل ہے۔ بات یہ ہے کہ اس دنیا کی حالت جہاں آپ اور ہم اپنی زندگی کے دن بسر کر رہے ہیں، بہت خراب اور خطرناک ہے۔ باوجود اس حیرت ناک ترقی کے جو انسان نے سائنس اور ٹکنولوجی میں، زراعت اور صنعت وحرفت میں، ڈاکٹری اور (ایک حد تک) سماج سیوا کے میدان میں کی ہے، باوجود اس کے کہ اس نے اپنی کمند ستاروں تک پھینکی ہے اور چاند کی سرزمین پر اس کے قدموں کی چھاپ موجود ہے، ہماری زندگی کے مسئلے زیادہ پیچیدہ ہوتے جاتے ہیں۔ اور یہ مسئلے بنیادی طور پر ٹکنولوجی کے نہیں بلکہ سماجی اور اخلاقی رشتوں کے ہیں۔ ان کا تعلق مادہ اور قوت کو رام کرنے سے نہیں بلکہ انسان کی فطرت کو رام کرنے سے اور اس کی قوت کو نظر کا تابع بنانے سے ہے۔ اس کی قوت تو بے اندازہ بڑھ گئی ہے لیکن اس کا سماجی احساس کند اور اس کی زندگی کی قدریں ابھی تک بہت گھٹیا ہیں۔ اس بات کا اندازہ ہم لوگوں کی تقریروں اور تحریروں سے نہیں کر سکتے کیونکہ وہ تو اکثر خلوص سے خالی ہوتی ہیں۔ یہ اندازہ تو اس وقت ہوتا ہے جب نازک موقعوں پر ہم اپنی ذاتی غرضوں کو قومی غرضوں پر، اور قومی غرضوں کو انسانی غرضوں پر مقدم سمجھتے ہیں۔ ہمارے مشہور شاعر اقبال نے اس دور کے انسان کی حالت کا نقشہ ان شعروں میں کھینچا ہے:

عشق ناپید و خرد می گزدش صورت مار
عقل کو تابعِ فرمانِ نظر کر نہ سکا

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا
اپنے افکار کی دُنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا
آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

اس کا مطلب یہ ہے کہ محض علم اور سائنس کی ترقی اس کی بہبودی اور اس کی زندگی کی بہتری کا راستہ نہیں کھول سکی۔ یہی نہیں کہ ہم نے ان مسئلوں کا حل نہیں ڈھونڈا۔ بلکہ مجھے تو اکثر یہ شبہ ہوتا ہے کہ ہم سچائی اور ایمانداری کے ساتھ ان کا حل ڈھونڈنا چاہتے بھی ہیں یا نہیں، خاص طور پر وہ لوگ جن کے ہاتھ میں طاقت اور اختیار ہے وہ تو اپنے ذاتی اور جماعتی فائدوں یا قومی خود غرضیوں کے تنگ دائرے میں اس طرح قید ہیں کہ کسی مسئلے پر عالمی اور انسانی نقطۂ نظر سے غور نہیں کر سکتے اور اپنی خود بنائی ہوئی زنجیروں کے حلقوں کو تنگ کرتے جاتے ہیں۔ میرے پاس نہ اتنا وقت ہے نہ آپ کے پاس اتنا صبر کہ ان مسئلوں کو آپ کے سامنے پیش کر سکوں۔ اس کے لئے تو ایک دفتر درکار ہے۔ لیکن چاہتا ہوں کہ یو۔ این کی Committee on human survival کی رپورٹ میں سے ایک مختصر پیراگراف آپ کو سناؤں جو حال ہی میں شائع ہوئی ہے جس کے صدر کنیڈا کے سابق پرائم منسٹر لسٹر پیرسن تھے اور شریمتی وجیالکشمی پنڈت بھی اس کی ایک ممبر تھیں۔ اس کا کام تھا اس مسئلے پر غور کرنا کہ دنیا جس قسم کے خطروں میں آج گھری ہوئی ہے ان میں انسانی زندگی قائم بھی رہ سکتی ہے یا نہیں؟ یاد رکھئے کہ یہ رپورٹ کسی سنسنی خیز اخبار نویس کی نہیں بلکہ اس کی تیاری میں دنیا کے بعض بہترین دماغ شریک تھے، جن میں سائنس داں، تاریخ کے ماہر، قانون داں اور منصوبہ بندی کرنے والے بھی شامل تھے۔ انھوں نے بہت نپے تلے لفظوں میں لکھا ہے:

"We meet at a time when human existence on this planet is in jeopardy. We see a world in which human population is increasing at a rate that will strain to the breaking point the ability of an earth to sustain human beings in dignity, welfare and freedom. We see wars in Indo China and the Middle East and threats of war in the south of Africa. Remanents of colonialism persist. We see the blight of racial discrimination in many lands. We see an escalating arms race which the super-powers seem unable to halt or contain, with more than 200 billion dollars being spent last year on arms. We see a deteriorating human environment brought about by the mishandling and improper use of Earth's resources. We see youth protesting a world in which they have no future, a world in which nations exempt theselves from the orderly and rational behaviour they demand of their citizens, a world in which an accident or miscalculation could obliterate civilization and make a farce out of human evolution, a world in which force is immediate and total and justice is indefinite and partial."

اس میں اتنا اور شامل کر لیجئے کہ حال ہی میں مجلسِ اقوام کے سکریٹری جنرل او۔تھانٹ نے اپنے یک بیان میں کہا ہے کہ ہمارے پاس مشکل سے دس سال کی مہلت ہے جس میں ہم ان مسئلوں وسنجیدگی کے ساتھ سلجھانے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد وہ ہمارے بس سے باہر ہو جائیں گے۔ کیا یہ صورتِ حال بہت ڈراؤنی اور ساتھ ہی ہمت کو چیلنج کرنے والی نہیں ؟ اس کے ہر پہلو پر بہت غور کرنے کے بعد کمیٹی اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ اگر انسان عقل اور سمجھداری سے کام لے، اگر وہ اپنی قوت کی باگ ڈور شرافت کے ہاتھ میں دیدے، اگر وہ سچے دل سے انے کو بگاڑنے پر، اہنسا کو ہنسا پر ترجیح دے، اگر وہ مجلسِ اقوام سے صحیح طریقے پر کام لے اس کے لئے ممکن ہے کہ وہ ان خطروں کے منجدھار سے نکل جائے اور ایک زیادہ تندر د بالانصاف زندگی کی بنیاد ڈال سکے۔

میری دعا اور خواہش ہے کہ ان کا یہ خیال صحیح ہو لیکن کس قدر لیکن، کس قدر سخت ہے اگر کی فہرست۔ اگر انسان یہ کرے، اگر انسان وہ کرے۔ کیا وہ ایسا کر سکے گا؟ کیا وہ ایسا

کرنے پر آمادہ ہوگا ؟ میں نہیں جانتا۔ میرا دماغ تو یقین کے ساتھ اس سوال کا جواب ہاں میں نہیں دے سکتا۔ لیکن میرا دل، میرا دھرم، میرا عقیدہ کہتا ہے کہ ایسا ہونا ممکن ہے۔ میں کس طرح یہ سمجھ لوں کہ یہ دنیا جس میں اس قدر امکانات خوبی اور ترقی کے موجود ہیں، خدا نے اس لئے بنائی تھی کہ ایک دن انسان کی مورکھتا اور ایٹم بم کی مار سے اس کا خاتمہ ہو جائے گا ؟ "خدایا تو نے اس دنیا کو بے کار نہیں بنایا" لیکن آج کتنے لوگ ہیں جو خدا پر اور اس کی حکمت اور دیا پر یقین رکھتے ہیں ؟ اور جو رکھتے ہیں انھیں بھی یاد رہے کہ اس کی مدد بندوں کو اس وقت تک نصیب نہیں ہوتی جب تک وہ اس کے تخلیقی مقصدوں کو پورا کرنے میں اس کا ہاتھ نہ بٹائیں۔

انسان نے اب تک تاریخ میں جو کارنامے کئے ہیں ان میں اس کی توفیق اور فیض ضرور شامل ہیں لیکن ان میں اس کی اپنی کوشش اور محنت کو بھی بڑا دخل ہے۔ جب کوئی قوم ہمت ہار دیتی ہے اپنے تخیل اور نظر کو استعمال نہیں کرتی اور زندگی کی اعلیٰ قدروں پر اس کی پکڑ ڈھیلی پڑ جاتی ہے تو وقت کا بے رحم ہاتھ اس کو ذلت کے غار میں ڈھکیل دیتا ہے یا حرفِ غلط کی طرح مٹا دیتا ہے اور اب تو ایسا زمانہ آگیا ہے کہ کوئی ایک ملک یا قوم ہی نہیں بلکہ ساری دنیا تباہی کے اس چکر میں پھنس سکتی ہے۔ قرآن شریف میں لکھا ہے کہ اُس آفت سے ڈرو کہ جب وہ آتی ہے تو صرف انھیں لوگوں کو اپنی لپیٹ میں نہیں لیتی جنھوں نے خاص طور پر ظلم کیا ہے بلکہ سبھی اس کی لپیٹ میں آسکتے ہیں، ایٹم بم ہوں یا زہریلی گیسیں، یا جراثیمی جنگ جو بیماریوں کو دنیا میں اس طرح بکھیر سکتے ہیں جیسے کوئی کسان اپنے کھیت میں بیجوں کو، یا زمین پانی اور ہوا کی بڑھتی ہوئی مہلک گندگی سب اسی قسم کی آفتیں ہیں۔ وہ سپاہی اور عام شہری، گناہگار اور بے گناہ، چھوٹے اور بچے، مرد اور عورت، یہاں تک کہ آج کی نسل اور آنے والی نسلوں میں بھی کوئی تمیز نہیں کرتیں سب کے لئے زندگی کو ایک عذاب بنا سکتی ہیں۔ جو تباہی اپنی خونی اور خوفناک شکلوں سے ہم آج دیکھ رہی ہے اس کی کوئی مثال ہمیں تاریخ میں نہیں ملتی !

میں آپ سے پوچھتا ہوں اور یہ سوال صرف آپ سے نہیں بلکہ آپ کے بزرگوں اور پیشواؤں
بھی ہے جن کے ہاتھ میں اختیار ہے۔ فرض کیجئے ایک گھر میں بہت سے آدمی رہتے ہیں جیسے
ل کے وحشی اور خونخوار درندوں کے ایک گروہ نے گھیر لیا ہے اور وہ اس خطرے کا کوئی
ش نہیں لیتے بلکہ اپنا سارا وقت اور قوت ایک دوسرے سے چھوٹی چھوٹی غیر ضروری باتوں
جھگڑنے اور فساد کرنے میں صرف کرتے ہیں۔ یا ایک شہر کسی جوالامکھی پہاڑ کے دامن میں
ہوا ہے جو ایک دم پھٹ جاتا ہے اور اس میں سے آگ اور لاوا نکل کر اس کو تباہ کرنے
الے ہیں۔ لیکن شہر کے مگن اور بے حس باشندے اس کی فکر نہ کریں بلکہ اپنی اپنی چین کی
بسری بجاتے رہیں یا ایک دوسرے کی جڑ کاٹنے میں مشغول رہیں۔ آپ ایسے لوگوں کے بارے
یں کیا خیال کریں گے؟ یہی نا کہ ایسی غفلت نہ صرف حماقت بلکہ خودکشی ہے۔ بالکل اسی طرح کی حرکتیں
اج دنیا کی قومیں کر رہی ہیں اور خود ہمارا دیس بہت سی باتوں میں باقی دنیا سے کچھ پیچھے نہیں۔
اس صورتِ حال کا تقاضا تو یہ تھا کہ ہم اپنی تنگ اور چھوٹی چھوٹی وفاداریوں کو چھوڑ کر اپنے
خیالات اور جذبات میں فراخی پیدا کرتے، اپنے مذہبی اور سماجی بھید بھاؤ اور ذات پات،
صوبے کے فرقوں کو قومی فائدے سے زیادہ اہم نہ جانتے، ہم قومی فائدے کا پورا لحاظ رکھتے
لیکن اس کو عالمی فائدے یعنی نسلِ انسانی کی بھلائی، ترقی اور امن سے زیادہ اہمیت نہ دیتے۔
ساری دنیا کے فائدے میں ہمارا قومی فائدہ بھی شامل ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ قومی فائدے
میں، جس انداز سے قومیں اس کو دیکھتی ہیں، ساری دنیا کا فائدہ بھی شامل ہو۔ کہنے اور سننے
میں یہ باتیں بالکل صاف اور سیدھی سادی معلوم ہوتی ہیں، جن سے کوئی انکار نہیں کرے
گا۔ لیکن اگر آپ ان سیاسی سازشوں اور چال بازیوں پر غور کریں جو قوموں کی پالیسی کا حصہ
بن گئی ہیں اور کس کس طرح سے مجلسِ اقوام کے فیصلوں کو ناکام کرنے کی کوششیں کی جاتی
ہیں، اس وقت اندازہ ہوگا کہ ان صاف اور سچے اصولوں کا کس قدر کم اثر ہے قوموں کی
پالیسی پر۔ وہ ابھی تک ایک دوسرے پر قوت اور جبر کے زور پر غالب آنے کی فکر میں ہیں خواہ قوت الگ

ہو یا دوسری قوموں سے اُدھار لی گئی ہو۔ ان میں معاہدے ہوتے ہیں جن کی بنیاد باہمی دوستی اور اتفاق پر نہیں بلکہ دوسروں کی مخالفت پر ہے اور ان کے ذریعہ وہ اپنے چھوٹے چھوٹے فائدوں اور مقصدوں کی خاطر دوسروں کا زیادہ سے زیادہ نقصان کرنے میں کوئی تامل نہیں کرتے۔ وہ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ سب قوموں کی بنیادی ضرورتیں ایک ہیں، یعنی دنیا میں شانتی پھیلانا، سماجی اور قومی تعلقات میں نیائے کا چلن اور دوستی کی چاشنی، غلط بھید بھاؤ کی جڑ اکھاڑنا اور جہاں کہیں بھوک، غریبی، بیماری اور جہالت پائی جائے ان کا تدارک۔ عام آدمی کے لئے زندگی بیکار اور بے معنی ہے جب تک اس کی بنیادی اور اٹل ضرورتیں پوری نہ ہوں اور کس قدر بے معنی ہے دوستو، ہمارے دیس میں کروڑوں انسانوں کی زندگی!

ہم نے، جس میں ہندوستانی ہی نہیں بلکہ دنیا کی دوسری قومیں بھی شامل ہیں، ابھی تک پوری طرح یا مطلق یہ نہیں سیکھا کہ اہنسا جنگ اور ہنسا سے، بنانا بگاڑنے سے کہیں بہتر ہے۔ اور بگاڑنا آسان لیکن بنانا بہت مشکل ہے۔ اگر زندگی کی عمارت اینٹ اور گارے سے بنی ہوتی تو ہم اس کو گرا کر ایک اور عمارت آسانی سے بنا سکتے تھے۔ لیکن یہ عمارت تو باوجود اپنی تمام خرابیوں اور کمزوریوں کے، بے شمار نسلوں کی محنت کا پھل ہے۔ ہم کس طرح اس کی بنیادوں کو جڑ سے کھود کر ایک دوسری عمارت کھڑی کر سکتے ہیں؟ اس کا حال تو انسان کے دل کا سا ہے جس کے بارے میں شاعر نے کہا تھا ؎

دل کا اجڑنا سہل سہی بسنا سہل نہیں ظالم
دل کی بستی کھیل نہیں ہے بستے بستے بستی ہے

اس تصویر میں رنگ بھرنے کے لئے بے انتہا محنت اور صبر، محبّت اور تخیل کی ضرورت ہے۔ زندگی کا سِکہ انھیں کی بدولت ایک کھرے، معیاری سِکّہ میں تبدیل ہو سکتا ہے۔ ان کے بغیر کسی بہتر مستقبل کی اُمید رکھنا بے معنی بات ہے۔ جب تک ہم اس اٹل سچائی کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلیں گے، ہم گمراہی کی بھول بھلیاں میں بھٹکتے رہیں گے اور صراطِ مستقیم ہمارے

ں کو نہیں چھوڑے گی۔

یہ بات تو اب بالکل صاف ہوگئی ہے اور پچھلے سال آپ کے وائس چانسلر صاحب
ی اپنی رپورٹ میں اس کا ذکر کیا تھا اور ہر شخص، مع ہمارے طلبہ کے، یہ جانتا ہے کہ دنیا
اور خود ہمارے دیس میں جتنی خرابی ہے اس کی ذمہ داری ہماری نسل پر ہے، اس میں
ادوش ہمارا ہے، ہم نے اپنے فرض کو پورا نہیں کیا اور آپ کے لئے ایسی مثالیں قائم
جنھوں نے آپ کو زندگی میں ٹھیک سہارا نہیں دیا۔ جب ہماری نسل کے لوگ آپ کو آپ
رض کی یاد دلاتے ہیں تو آپ پلٹ کر ہم سے پوچھ سکتے ہیں: کیا آپ نے اپنے فرض کو صحیح
پر پورا کیا؟ آپ نے سچائی اور ایمان داری اور رواداری کی زندگی بسر کی؟ آپ نے
، فائدہ کو اپنی ذات سے زیادہ اہم سمجھا؟ اِن سوالوں کا ہم کیا جواب دے سکتے ہیں،
ئے اس کے کہ اگر ہم میں سچائی کا احترام ہے تو اس الزام کو قبول کریں۔ یہ سب ٹھیک ہے
آپ کی کڑی تنقید سر آنکھوں پر۔ لیکن میں بہت نرمی کے ساتھ یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ
کے دماغ کے کسی کونے میں یہ خیال پڑا رہے تو اچھا ہے کہ "شاید میں نے بھی کبھی کوئی غلطیاں
وں، شاید میں بھی کبھی ٹھیک راستے سے بھٹک گیا ہوں، شاید جن چیزوں کے خلاف میں
دت کر رہا ہوں ان کے پیدا کرنے میں میری بھی کچھ ذمہ داری ہو" میری یہ مانگ کوئی معمولی
ے نہیں۔ اس کے لئے بڑے دل اور جگر اور ایمان داری کی ضرورت ہے۔ مشہور تاریخ داں
Arnold Toynb نے اپنی نئی کتاب EXPERIENCES میں لکھا ہے کہ "اپنے آپ سے آنکھ
یا خود کا محاسبہ کرنا اس سے بھی زیادہ کٹھن امتحان ہے کہ انسان اپنے عزیزوں یا دوستوں
دت کا صدمہ جھیلے یا اس کی توہین جواب دیدیں یا وہ خود موت سے دوچار ہو۔" آپ کبھی
یہ بھی یاد کر لیا کریں کہ اس نسل نے، اور اس سے پہلے جو نسل گزری ہے اس نے، ہندوستان
ب آزادی لڑی، پولیس کی لاٹھیاں کھائیں، گولیوں سے سینے چھلنی کرائے، ضرورت پڑنے
ں سے اپنی جانیں بھی قربان کیں اور آخر کار اس جنگ میں کامیابی حاصل کی۔ انہیں نسلوں

نے آروبندو، ٹیگور، اقبال، گاندھی، نہرو، آزاد، سروجنی نائیڈو، رفیع احمد قدوائی، مادھا
سبھاش چندر بوس، اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، پی، سی، رے، جگدیش چندر بوس، ونوبا بھ
اور ذاکر حسین پیدا کئے اور آج؟ آج جب میں نئی نسل کو دیکھتا ہوں کہ اس میں وہ دلیر
انسان کہاں ہیں یا وہ ہونہار جوان جو آگے چل کر ان کی جگہ لیں گے، تو وہ مجھے نظر نہیں
سوال کرتا ہوں تو بس گونج کی اُداس آواز سنائی دیتی ہے کہ "وہ کہاں ہیں؟" میں یہ بار
دُہرانا چاہتا ہوں کہ دوسروں پر نکتہ چینی کرنے کے ساتھ خود پر نکتہ چینی کرنا بھی ضروری ہے
اس احساس نے آدمی کو انسان بنایا ہے کہ شاید وہ غلطی پر ہو، ورنہ وہ ابھی تک کیچڑ کا کیڑا
ہوتا! غلطی کرنا اور اس پر غور کرنا، تنقید کرنا، اس سے سیکھنا انسان کا خاص شرف ہے۔ سقا
نے دو ہزار سال سے بھی زیادہ ہوئے کہا تھا کہ جس زندگی کی کڑی جانچ پڑتال نہ کی جائے وہ ا
کے شایانِ شان نہیں۔ اور میرا خیال ہے کہ اس نے اس بات کو ایک عام اصول کے طور
بیان کیا تھا۔ نئی نسل کو اس سے الگ نہیں کیا تھا۔

ایک بات اور آپ سے کہنا چاہتا ہوں جس کا کچھ تعلق ابھی جو کچھ میں نے کہا اس سے
ہے۔ میں اس بات کا قائل ہوں کہ نوجوانوں کو ذہنی آزادی ملنی چاہیئے، انھیں خود اپنی عقل
مدد سے زندگی کے مسئلوں کا فیصلہ کرنا چاہیئے اور ہر نسل نے اپنی بعد کی نسل پر جو بے جا پابند
لگائی ہیں ان کی گرفت ڈھیلی ہونی چاہیئے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ نسلوں کی اس رسہ کشی میں ایک
بہت بڑی صفت ہے جو کام آگئی ہے وہ ہے Reverence یعنی ادب یا آدر۔ اس کو آ
کل ایک پُرانے فیشن کی اور بورژوا صفت سمجھا جاتا ہے جس کو جدید ذہن اکثر قبول کرنے سے
انکار کر دیتا ہے۔ میں آپ سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ایسا سوچنا ٹھیک نہیں۔ اس میں بیشک
ہمارے ماں باپ کی عزت بھی شامل ہے جنھوں نے ہمیں جنم دیا اور اپنی محبت اور خدمت
بھینٹ دی۔ ان اُستادوں کی عزت بھی، جنھوں نے ہمارے ذہن کو جگایا اور ہمیں علم
سے آشنا کیا۔ لیکن یہ اس کا صرف ایک پہلو ہے۔ ادب کا بنیادی مقصد کیا ہے؟ یہ نہیں کہ

ا میں اپنے ماں باپ یا دوسرے بزرگوں کے سامنے اپنی گردن جھکا دیں یا کبھی ان
ے سے اختلاف نہ کریں، یا سچ کی سیوا نہ کریں بلکہ حکومت اور قوت کی ہر دہلیز پر
م کر دیں۔ یہ تو بزدلی اور نامردی ہے۔ اس کا اصلی مقصد یہ ہے کہ جہاں کہیں
ال کی جھلک دکھائی دے، جہاں کہیں حقیقی بڑائی اپنا جلوہ دکھائے، ہم کھلے
، اس کی قدر اور اعتراف کریں۔ وہ انسانوں میں ہو یا ان کے خیالات اور جذبات
اتن اور ادب میں، خواہ ان کا تعلق کل سے ہو یا آج سے، ماضی سے ہو یا حال سے۔
ی دولت کسی ایک زمانے کی، کسی ایک قوم کی ملکیت نہیں، وہ تو ساری نسلِ انسانی
ا سرمایہ ہے۔ "بڑھا کر جو اُٹھا لے ہاتھ میں مینا اُسی کا ہے" اور ادب نام ہے سندرتا
گنت رُوپوں پر دل کے تاروں کے ہلنے کا، چاہے وہ سندرتا انسان کے شاداب
ی ہو یا نکلتے اور ڈوبتے سورج کی، یا آسمان پر بادلوں کی چترکاری کی، یا کسی گرجا،
یا مندر یا مقبرہ کی، یا موسیقی اور مصوری کی، یا ان جھرّیوں کے جال کی جو وقت کا ہاتھ
ڑھی عورت کے چہرے پر بنتا ہے۔ عظمت یا بڑائی کو نہ پہچاننا بہت بڑا گناہ ہے،
ندرتا سے لطف نہ اٹھا سکنا بہت بڑی محرومی۔ سُنتا ہوں ہمارے یہاں ایسے
بھی ہیں جو سوامی وویکانند اور گاندھی جی اور جواہر لال اور ٹیگور کی مورتیوں کو
سیاہ کر کے اپنے دل کی بھڑاس نکالتے ہیں۔ ایسا کرنے سے ان عظیم انسانوں کی بڑائی
ں کمی نہیں آتی، صرف ان بدبختوں کے اندھے پن کا اظہار ہوتا ہے۔ جو شخص کمال
نہیں کرتا اور اس کے مقابلے میں اپنے حقیر وجود یا انا کو نمایاں کرتا ہے وہ
ے بے ادب ہے بلکہ بدنصیب بھی ہے کیونکہ وہ اس دولت کو ٹھکرا دیتا ہے
ان نے تاریخ سے ورثے میں پائی ہے۔ وہ اپنی زندگی خود غرضی اور خود پسندی
الی مفلسی میں بسر کرتا ہے۔ سائنس، ٹکنولوجی، مادی دولت بلکہ ہر قسم کی
یں تباہ کر سکتی ہے اگر وہ ہم میں غرور پیدا کرے، اگر ہم اس کی وجہ سے

یہ بھول جائیں کہ زندگی کتنی لامحدود ہے، اس میں کس قدر گہرے بھید چھپے ہیں، اگر ہماری نظر اپنے محدود کارناموں میں اُلجھ کر رہ جائے اور ہمیں یہ احساس نہ رہے کہ ابھی علم اور کمال کی کتنی کٹھن منزلیں طے کرنی ہیں۔ اس قسم کا ذہن رکھنے والا شخص بر خود غلط اور خود رائے ہو جاتا ہے اور نئی چیزوں کو سیکھنے کی صلاحیت کھو بیٹھتا ہے۔ ہمارے سماج کے نام کے بڑے اور با اثر لوگوں میں ایسے بہت سے افراد ہیں اور ہماری نوجوان نسل بھی ایسے افراد سے خالی نہیں جو سمجھتے ہیں کہ دنیا کی ساری دانش مندی ان ہی کے حصے میں آئی ہے۔ اگر من کی آنکھیں کھول کر دیکھا جائے تو ہم سب، بوڑھے ہوں یا جوان، ایک بہتر زندگی کی کھوج میں ہیں اور دُھندلکے میں اپنا راستہ ٹٹول رہے ہیں۔ اس لئے جہاں کہیں بھی ہمیں روشنی دکھائی دے ہمیں اس کی طرف بڑھنا چاہیے تاکہ ہم اپنی زندگی کی اندھیری رات میں اس کی مدد سے اُجالا کر سکیں۔

آپ نے شاید اس بات کو نوٹ کیا ہو کہ میں نے اپنی تقریر میں انسانی تصویر اور اپنے دیس کی تصویر کے روشن پہلو کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی۔ یہ اس وجہ سے نہیں کہ میں ان سے ناواقف ہوں۔ جانتا ہوں کہ ہمارے یہاں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن پر ہم فخر کر سکتے ہیں۔ ہم نے دنیا کی تہذیب کے ریکسے میں بہت کچھ دان کیا ہے علم، گیان، مذہب، فلسفہ، اخلاق، آرٹ، دست کاری، فنِ تعمیر وغیرہ، ماضی میں ہماری زندگی صرف بے انصافی، محرومی، اور ناروا داری کی داستان نہیں رہی بلکہ اس میں پریم، دیا، ذہنی ایمان داری، روا داری، ایثار اور انسان دوستی کی بے شمار جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔ نہ صرف ہمارے ادب اور فلسفہ اور تاریخ میں بلکہ ہمارے بڑے آدمیوں کی زندگی میں بھی جن میں سے بعض سے ملنے کی سعادت اور عزت مجھے بھی نصیب ہوئی ہے، اور اب بھی، باوجود اور بہت سی خرابیوں کے، جن کا میں نے ذکر کیا ہے، یہ خیر اور خوبی کا سلسلہ جاری ہے۔ اب بھی اس دیس میں لاکھوں نیک، شریف اور خدا ترس انسان بستے ہیں۔ پچھلے چند سال میں ہم نے زندگی کے بعض شعبوں میں خاصی ترقی کی ہے۔ اور چند میں اچھا

ا پیدا کیا ہے۔ میں نے ان کا ذکر اس لئے نہیں کیا کہ مجھے ہمیشہ یہ فکر رہتی ہے کہ اپنی منزل
ے پہنچنے میں ابھی ہمیں کتنا راستہ طے کرنا ہے، یہ نہیں کہ ہم نے کتنا راستہ طے کر لیا
،۔ اور اس لئے بھی کہ اس وقت بعض ایسی خوفناک آفتیں ہماری دنیا اور ہمارے
ں پر منڈلا رہی ہیں کہ ان کی طرف توجہ نہیں کی گئی تو زندگی کے چراغ بجھ جائیں گے۔ یہ
ت اپنی کمر ٹھونکنے کا نہیں بلکہ کمر باندھنے کا ہے۔

میں نے اپنے اندازہ سے زیادہ آپ کا وقت لیا جس کی معافی چاہتا ہوں۔ اور آپ
سب دوستوں کے لئے، جنھوں نے آج اپنی ڈگریاں لی ہیں، دعا کرتا ہوں کہ آپ کی
زندگی آرام اور تن آسانی اور مشکلوں سے چھٹکارے کی نہیں، بلکہ محنت، جدوجہد، آرزو
اور ولولے اور دل اور دماغ کے سرگرم معرکوں کی زندگی ہو۔ حضرت عیسیٰ نے کہا تھا:

"بڑی بھرپور ہے ایسی زندگی کی فصل، لیکن اس
کھیت میں کام کرنے والے کم ہیں۔ تم اپنے مالک
سے دعا کرو کہ وہ اپنی کھیتی میں اچھے کام کرنے
والوں کو بھیجے۔"

میں حضرت عیسیٰ کی اس دعا کو آمین کہتا ہوں اور میری آرزو ہے کہ وہ آپ کو اچھے کام کرنے
والا بنائے۔

انور صدیقی

علم و دانش کا چراغ ——— برٹرنڈ رسل

(۲)

رسل ابھی اپنی ذہنی اور فکری فتوحات میں ہی مصروف تھا کہ پہلی عالمی جنگ چھڑ گئی ۔ اس جنگ نے رسل کے عقائد پر زبردست ضرب لگائی ۔ اب سے پہلے رسل کا خیال تھا کہ عام انسان عقلی بنیادوں پر فیصلہ کرتے ہیں ، بیسویں صدی کے آغاز میں اس کا عقیدہ تھا کہ وہ مادّی ترقی جو انیسویں صدی کی ابتدا میں شروع ہوئی تھی ، انتہائی پرشکوہ انداز میں بیسویں صدی میں بھی جاری رہے گی ۔ اس کے یہ تصور پھٹتے ہوئے بموں کے دھوئیں میں کھو گئے ۔ رسل کے بہت سے بوڑھے ساتھیوں میں جس میں کینز بھی شامل تھا ، اس جنگ کو تہذیب کے لئے کوئی خطرہ نہ سمجھنے کا رویہ شکل پذیر ہو رہا تھا ۔ رسل کے لئے یہ جنگ نہ صرف موجودہ تہذیب بلکہ پورے تہذیبی ورثے سے انکار تھی ۔ اسے انسانی شرف و سعادت کے تمام تصورات خاک و خون میں ملتے ہوئے محسوس ہوئے ۔ اس نے جنگ سے اکتا کر ایک مرتبہ کہا تھا " ان دنوں جینا جہنم کے عذاب سے کم نہیں ہے ، کاش میں ۱۹۱۴ء سے پہلے ہی مر گیا ہوتا ۔" اس ایک جملے سے وہ کرب نمایاں ہے جو وہ محسوس کر رہا تھا ۔ رسل نے یہ طے کر لیا کہ وہ اس جنگ کی مخالفت کرے گا ۔ تحریر سے بھی اور تقریر سے بھی اور عمل سے بھی ۔ یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ رسل جرمن نواز تھا ۔ اسے انگلستان سے محبت تھی ہاں یہ ضرور ہے کہ سچائی اور صداقت کے لئے وہ اس محبت کو بھی قربان کر دینے کے لئے تیار تھا ۔ اس کا خیال تھا کہ جرمنوں پر اس جنگ

چھیڑنے کی ذمہ داری زیادہ ہے اور وہ یہ چاہتا تھا کہ یہ جنگ اتحادی طاقتیں ہی جیتیں۔ ی کے ساتھ ساتھ اس کا یہ بھی خیال تھا کہ یہ جنگ ایک لعنت ہے اور اس سے ہر قیمت پر نجات حاصل کرنی چاہئے۔ جنگ کو جاری رکھنے سے کہیں بہتر ہے کہ جیسی تیسی ہی سہی صلح کر لینی چاہئے۔ رائے عامہ کو بدلنے کی خاطر رسل اور اس کے دوسرے دوستوں نے اس تنظیم کی رکنیت قبول کر لی جو No Conscription Fellowship کے نام سے مشہور ہے۔ اس طرح جنگ کے خلاف دانشوروں کی جدوجہد کی رہنمائی کا کام اس نے سنبھال لیا۔ ٹرینٹی کالج کے بزرگ دانشوروں نے رسل کی کوششوں کی مخالفت شروع کر دی۔ نوجوان اس کے حامی تھے مگر وہ اس کی حمایت یوں نہیں کر سکتے تھے کہ وہ محاذوں پر لڑ رہے تھے۔ جنگ کے مسئلے پر اس میں اور مشہور ناول نگار ڈی، ایچ، لارنس میں بھی اختلاف تھا۔ اس اختلاف کی وجہ یہ تھی کہ لارنس کی بیوی جرمن تھی اور اس نے اس کے خیالات کو پوری طرح متاثر کر لیا تھا۔ رسل سے اس کی دوستی اسی مسئلے پر ختم ہوئی۔ اسی زمانے میں ایک اہم اور دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ جنگ کے خلاف ایک باضمیر احتجاجی کو زبردستی فوج میں بھرتی کر لیا گیا۔ جنگ کے خلاف کام کرنے والی تنظیم نے اس طرز عمل پر احتجاج کرنے کی خاطر ایک اشتہار شائع کیا۔ چھ افراد ایسے تقسیم کرتے ہوئے گرفتار کر لئے گئے۔ ان گرفتاریوں کی اطلاع پاتے ہی رسل نے اخبار Times کو ایک خط لکھا جس میں اس نے اطلاع دی کہ وہ اس اشتہار کا مصنف تھا اور یہ کہ اگر مقدمہ چلانا ہے تو اس کے خلاف چلایا جائے۔

چنانچہ رسل کے خلاف مقدمہ چلایا گیا اور اس پر سو پاونڈ جرمانہ کیا گیا۔ اسی مقدمے کی روشنی میں ٹرینٹی کالج کی کونسل نے ۱۱ جولائی ۱۹۱۶ء کو رسل کی ملازمت سے برطرفی کا حکم سنا دیا۔ رسل کو اس فیصلے سے سخت صدمہ پہنچا۔ اس صدمے نے اس کے اندر کالج کے بعض بزرگ استادوں کی طرف سے تلخی پیدا کر دی، خاص طور پر میک ٹیگرٹ کی طرف

سے جس نے برطرفی کی تجویز کی تحریک کی تھی۔ رسل نے ہمت نہیں ہاری اور جنگ کے خلاف امن پسندانہ مہم میں پوری سرگرمی اور جوش سے لگا رہا۔ اس عرصے میں اس نے اپنے وہ لکچر بھی مرتب کئے جن کا عنوان 'سماجی تشکیل نو کے اصول' Principles of Social Reconstruction تھا۔ ان لکچروں میں یہی نہیں کہ اس نے جنگ کے خلاف انقلابی خیالات کا اظہار کیا تھا بلکہ ایسے ہی خیالات کا اظہار اس نے تعلیم، ازدواج، اور دوسرے مسائل اور موضوعات پر بھی کیا تھا۔ اس کتاب کی اشاعت بھی ایک مسئلہ بن گئی۔ تقریباً اسی زمانے میں رسل کی دوستی اسٹینلی اَن وِن سے ہوگئی تھی جو خود بھی امن پسند تھا۔ وہ ناشروں کی مشہور فرم ایلین اینڈ اَن وِن کے ڈائرکٹروں میں تھا۔ وہ رسل کی تحریروں سے کچھ اس قدر متاثر تھا کہ اس نے اسے لکھا کہ اگر کوئی کتاب تیار ہو تو اشاعت کے لئے بھیجے۔ اس کے پاس 'سماجی تشکیل نو کے اصول' تیار تھی۔ اس نے کتاب کا مسودہ بھیج دیا۔ اسٹینلی اَن وِن کے علاوہ دوسرے ڈائرکٹر کتاب کی اشاعت کے مخالف تھے۔ چنانچہ یہ طے کیا گیا کہ آخری رائے کے لئے مسودہ پروفیسر میور ہیڈ کو بھیج دیا جائے۔ دوسرے ڈائرکٹروں کو یقین تھا کہ پروفیسر موصوف اشاعت کی تجویز کی مخالفت کریں گے لیکن معاملہ اس کے برعکس ہوا۔ انھوں نے لکھا کہ اگرچہ مجھے کتاب کے مندرجات سے شدید اختلاف ہے پھر بھی اس میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے وہ اتنے اہم ہیں کہ کتاب کی اشاعت ضروری ہے۔

یہ کتاب آج بھی اتنی ہی اہم ہے جتنی کہ اشاعت کے وقت تھی!

۱۹۱۶ء میں رسل کے لئے عالمی شہرت سے کہیں زیادہ اہم روزی کمانے کا مسئلہ تھا۔ ٹرینٹی کالج سے برطرفی کے بعد اس کے پاس کوئی ذریعۂ معاش نہیں تھا۔ لہٰذا اس نے طے کیا کہ لکچر دے کر اور کتابیں لکھ کر پیٹ پالے گا۔ امریکہ کی ہارورڈ یونیورسٹی سے اسے لکچر دینے کا دعوت نامہ ملا تھا مگر برطانوی حکومت نے پاسپورٹ دینے سے انکار کر دیا۔ مجبوراً اس نے طے کیا کہ برطانیہ میں ہی لکچر دینے کا پیشہ اختیار کرے گا۔ اس نے 'سیاسیات کے فلسفیانہ اصول' کے موضوع پر لکچر تیار کئے۔ اس نے ان لکچروں کو پیش کرنے کی جب اجازت مانگی تو وار آفس نے اسے

ادا کردہ یا پھر صرف مانچسٹر جیسے درمیانی علاقے کے شہروں میں دے سکتا ہے۔ برطانیہ کے
ساحلی شہروں میں اسے لیکچر دینے کی اجازت نہ ہو گی۔ جنگ مخالف تنظیم کے اخبار Tribunal
وہ برابر مضامین لکھتا رہتا تھا۔ اس نے اخبار کے لئے ایک مضمون انتہائی عجلت کے عالم میں
جس میں امریکی فوجوں کے خلاف چند باتیں کہی تھیں۔ یہ مضمون ۳ جنوری ۱۹۱۸ء کو شائع
مضمون کی اشاعت کے ایک ماہ بعد دو پولیس افسر رسل کے پاس آئے اور دریافت کیا کہ اس
مذکورہ مضمون لکھا تھا۔ اس نے اقرار کر لیا۔ رسل پر حکومت برطانیہ اور اس کے حلیف امریکہ
فوج کی توہین کرنے کے جرم میں مقدمہ چلایا گیا اور چھ ماہ کی سزا کا حکم سنایا گیا۔ جیل کی زندگی
ذہنی تنہائی کے عذاب سے نجات حاصل کرنے کے لئے رسل نے تصنیف و تالیف کا مشغلہ
یار کیا۔ اس کی کتاب An Introduction to Mathematical Philosophy
م اسیری کی یادگار ہے۔ جیل سے اس نے اپنے ایک خط میں یہ جملے لکھے جو آب زر سے
جانے کے قابل ہیں:

"جسم کو قید کرنے سے فائدہ جب کہ ذہن آزاد رہتا ہے؟ میرا ذہن میرے جسم سے
آزاد ہو کر برازیل، چین، تبت اور انقلاب فرانس کی سیر کرتا ہے۔ ان ذہنی سیروں
میں میں اس قید خانے کو بھول جاتا ہوں جس میں دنیا نے اپنے آپ کو محصور کر رکھا
ہے: میں آزاد ہوں اور دنیا بھی آزاد ہو کر رہے گی۔"

جیل سے رہا ہونے کے بعد رسل نے اپنی کتاب The Analysis of Mind لکھنی
شروع کر دی، اس کتاب کے بنیادی خیالات جیل ہی میں اس کے ذہن میں آئے تھے۔ اس نے
اس کتاب میں مرکزی خیال یہ پیش کیا تھا کہ مادہ اتنا مادی نہیں ہے اور نہ ہی ذہن اتنا ذہنی
جتنا کہ عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں۔ دونوں ہی مشترک خصوصیات کے حامل ہیں۔"

انگلستان کے ترقی پسند دانشوروں کے لئے انقلاب روس کی خبر ایک نئے عہد کے آغاز
کی بشارت تھی۔ بالشویکی سے آفتاب تازہ کی اس نمود نے رسل کے سینے میں بھی امیدوں

اور امکانوں کے چراغ روشن کر دیئے۔ جنوری ۱۹۱۸ء میں اس نے اپنے دوست ایلن کو لکھا کہ "دنیا قابلِ نفرت تاریکی میں گھری ہوئی ہے، لینن اور ٹراٹسکی ہی روشن نقوش ہیں۔" رسل کو لیبر وفد کے غیر سرکاری رکن کی حیثیت سے ۱۹۲۰ء میں روس کا دورہ کرنے کی دعوت ملی۔ امید حوصلہ اور آرزوؤں سے اپنے سینوں کو معمور کئے ہوئے یہ وفد روس کے لئے روانہ ہوا۔ روس پہنچنے کے بعد اور وہاں کی زندگی کو قریب سے دیکھنے کے بعد وفد کے بیشتر ارکان کو مایوسی ہوئی۔ اشتراکیت کو عملی شکل میں دیکھ کر رسل کو پہلی بار یہ احساس ہوا کہ یہ بھی مذہب کی طرح ہے اور اسے بھی ظلم کا بہانہ بنایا جا سکتا ہے۔ روسی حکومت کے بارے میں اس کا خیال ہے کہ یہ بالکل اس حکومت کی طرح ہے جیسی کہ سترھویں صدی میں انگلستان میں کرامویل نے قائم کی تھی۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس میں وہ تمام خامیاں ہیں جو پیوریٹن نظام میں تھیں۔ روس کے بارے میں اس نے اپنے خیالات کا تفصیلی اظہار اپنی کتاب Practice and Theory of Bolshevism میں کیا ہے۔ اس کے ان خیالات سے برطانوی سوشلسٹوں میں رسل کے خلاف غصے کی ایک لہر پھیل گئی۔ مگر اس نے سیاسی تنہائی کو دروغ گوئی پر ترجیح دی۔

۱۹۱۹ء کے اواخر میں اسے ٹرینٹی کالج میں دوبارہ ملازمت مل گئی۔ اسی اثناء میں اسے پیکنگ کی سرکاری یونیورسٹی کی طرف سے دعوت دی گئی۔ اس نے ٹرینٹی کالج کے اربابِ حل عقد سے ایک سال کی رخصت کی درخواست کی۔ اس کے بعد ملازمت سے بھی استعفیٰ دے دیا اس خیال سے کہ کہیں پہلی بیوی سے اس کے طلاق کو بعض لوگ مسئلہ نہ بنالیں۔ اس مسئلے پر وہ ایک عرصے سے غور کر رہا تھا اور اس کے تعلقات بھی ایک خاتون سے جن کا نام ڈورا بلیک تھا قائم ہو چکے تھے۔ ۱۹۲۰ء میں وہ انھیں خاتون کے ساتھ چین گیا۔ بعد میں یہی خاتون اس کی دوسری بیوی بنیں۔ چین کے دورے کا حاصل اس کی کتاب "چین کا مسئلہ" ہے۔ اس کتاب میں اس نے پہلی بار مستقبل قریب میں چین کی اہمیت کی پیش گوئی کی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اگر چین غیر ملکی اقتدار سے بچا رہا تو ایک دن وہ روایتی طرزِ زندگی کو چھوڑ کر حسبِ اخلاق

ریت کی پناہ اپنالے گا۔ آج چین میں جس طرح کے رجحانات فروغ پا رہے ہیں وہ رسل کے
ت کی تصدیق کرتے ہیں۔ رسل چینی تہذیب و ثقافت سے خاصا متاثر رہا اس نے لکھا کہ چین
روں کی قوم ہے، اس لئے اس میں فن کاروں کی سی خوبیاں بھی ہیں اور خامیاں بھی۔
سے واپسی پر رسل نے ڈورا سے شادی کرلی۔ لیبر پارٹی کے امیدوار کی حیثیت سے
ٹے کے دو الکشن لڑے اور ناکام رہا۔ چین میں سامراجی مظالم کے خلاف اس نے
لکھا یا کہا اس سے اس تنقید کی تلافی ہو گئی جو اس نے روس پر کی تھی۔ اب وہ سوشلسٹوں
ں مقبول تھا اور لبرل حلقوں میں بھی۔ اسی زمانے میں اس نے امریکہ کی مختلف یونیورسٹیوں
ر دینے کا ارادہ کیا تاکہ اپنی مالی حالت کو بہتر بنا سکے۔ رسل کی یہ عام خصوصیت تھی کہ وہ
لک کا بھی دورہ کرتا اس کی تہذیب، سیاست اور معاشرت کے بارے میں کوئی کتاب
ور لکھتا۔ مگر تعجب اس بات پر ہوتا ہے کہ امریکہ کے کئی دوروں کے باوجود وہ کوئی کتاب
لکھ سکا۔ ایسا لگتا ہے جیسے اسے امریکی تہذیب سے ایک طرح کی بیزاری ہو اور وہ اس
ہن میں شعوری طور پر کچھ لکھنے سے گریز کر رہا ہو۔ ایک مرتبہ اس نے بڑے دلچسپ انداز
ں کہا تھا کہ میں چاہوں گا کہ میرے مرنے کے بعد لوح قبر پر یہ عبارت کندہ کر دی جائے:
شخص چھ سال تک امریکہ میں رہا لیکن اس کے بارے میں ایک کتاب بھی نہیں لکھی۔" ویسے
ریکہ کے بارے میں اس نے کبھی کبھار جو کچھ کہا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ امریکی
م کو سطحی، مادہ پرست، غیر علمی اور کم مایہ سمجھتا ہے۔ اس نے امریکہ سے ۱۹۲۴ء میں واپسی
لکھا تھا:

> "انگلستان میں لوگ اگر کسی مصنف کو پسند کرتے ہیں تو اس کی کتابیں پڑھتے ہیں
> امریکہ میں لوگ صرف اپنے محبوب مصنف کا لکچر سننا پسند کرتے ہیں اس کی کتابیں
> پڑھنے کا انھیں خیال تک نہیں آتا۔"

۱۹۲۶ء میں اس نے ایک ایسی پیش گوئی کی تھی جو اس کی روشن بصیرت کی دلیل ہے:

"دنیا ایک نئے دور میں داخل ہو رہی ہے، دو نظامہائے حیات کے درمیان جنگ، تصادم اور کشمکش کے دور میں۔ اس جنگ میں روس اشتراکیت کی حمایت کرے گا اور امریکہ انفرادیت پسندی کی۔"

رسل انسانی زندگی کو کل کی حیثیت سے دیکھتا تھا۔ اسی وجہ سے کوئی شعبۂ زندگی ایسا نہیں ہے جس پر اس نے انتہائی معروضی اور بے لوگ انداز سے غور نہ کیا ہو۔ اس کے نظام فکر میں تعلیم کو جو اہمیت حاصل تھی اس کا اندازہ اس کی اس کتاب سے ہوتا ہے جو اس نے "سماجی تشکیل نو کے اصول" کے عنوان سے عرصہ ہوا لکھی تھی۔ اس کتاب میں اس نے روایتی اسکولوں پر تنقید کی تھی اور اس بات کو واضح کیا تھا کہ مروجہ ابتدائی تعلیم سے عسکریت اور جنگ جوئی کے جذبات ابھرتے ہیں جو بعد میں بچے کی شخصیت کو پوری طرح مسخ کر دیتے ہیں۔ اس کا خیال ہے کہ روایتی تعلیم نے قوت ارادی کو مضبوط کرنے کی خاطر عقل اور جذبے دونوں ہی کو تشنہ رکھا ہے۔ اپنے ان تعلیمی خیالات کو عملی جامہ پہنانے کی خاطر رسل اور ڈورا نے مل کر بچوں کا ایک اسکول چلانا شروع کیا جو روایتی اسکولوں سے سراسر مختلف تھا۔ یہاں بچوں کو اپنے جذبات کی ترجمانی کی مکمل آزادی تھی۔ اس لئے کہ رسل کا خیال ہے کہ بچپن میں جن جذبات کے اظہار پر پابندی لگا دی جاتی ہے وہ اندر اندر موج خیز رہتے ہیں اور آئندہ تخریبی اعمال کی شکل میں نمایاں ہوتے ہیں۔ جنگ بھی اسی تخریبی میلان کا ایک مظہر ہے۔ جنس و اخلاق کے معاملات میں بھی بچوں کو پوری آزادی تھی۔ انھیں یہ سکھایا جاتا تھا کہ وہ جنسی جذبے کو کوئی گناؤنی چیز نہ سمجھیں۔ اسی ضمن میں بچوں کے تجسس کی تسکین کے لئے استادوں کو آزادی تھی کہ وہ ان تمام سوالوں کا جواب دیں جو ان سے پوچھے جاتے ہیں۔ وہ چاہتا تھا کہ بچے یہ سمجھ لیں کہ جنسی جذبہ کوئی پُراسرار چیز نہیں ہے۔ ان آدرشوں کی رسل نے جس طرح تبلیغ کی اس نے اس اسکول کو ایک افسانوی سی حیثیت کا ادارہ بنا دیا۔ لوگ اس کے بارے میں طرح طرح کے افسانے تراشنے لگے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ اسکول زیادہ دنوں نہ چل سکا۔ اس تعلیمی تجربے کی ناکامی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ

آزادی کو ایک خطرہ سمجھتے تھے ان میں اختلافی صلاحیت کی کمی تھی۔

یہاں رسل کے جنس، اخلاق یا ازدواجی جنسیات و اخلاقیات کے مسئلے پر خیالات کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ ان مسائل پر غیر روایتی خیالات کی وجہ سے رسل کو جیسی رسوائی ہوئی اور جو مالی خسارہ برداشت کرنا پڑا وہ ایک الگ داستان ہے۔ رسل چاہتا تھا کہ جنسی جذبے کی اسراریت کو ختم کرے اس لئے کہ پراسراریت توہم پرستی کی خالق ہے۔ وہ سماجی یا روایتی اخلاق بدل ڈالنا چاہتا تھا کہ اس سے بہت سے ذہنی اور جذباتی مسائل پیدا ہوتے ہیں حالانکہ وہ یہ بات فراموش کر گیا کہ مذہب نے ایک خاص مصلحت سے جنسی جذبے کو پراسرار بنایا تھا۔ یہ جذبہ اتنا قوی تھا کہ بغیر پراسرار بنائے اس پر قابو حاصل نہیں کیا جا سکتا تھا اس لئے کہ اس جذبے سے وہ مسائل پیدا ہوتے ہیں جن کا حل نہ تو ماضی کے دانش مندوں کے پاس تھا اور نہ ہی آج کے دانش وروں کے پاس ہے۔ اس کے علاوہ رسل نے آزاد محبت کے تصور کو بھی عام کرنے کی کوشش کی۔ اس کا خیال تھا کہ عورتوں کے مقابلے میں مردوں میں زیادہ جنسی بے راہ روی کا رجحان ہوتا ہے۔ چنانچہ اس نے بیویوں کو بھی مشورہ دیا ہے کہ وہ شوہروں کے علاوہ دوسروں سے جنسی تعلقات رکھنے کے لئے آزاد ہیں۔ رسل کی رائے تھی کہ تخلیقی جذبات کی حوصلہ افزائی کرنی چاہئے اور استحصالی جذبات کی مذمت۔ اگر جذبات پر قابو پانا ہی ہے تو محبت کے جذبے پر کیوں قابو پایا جائے یا پابندی لگائی جائے۔ اس کے بجائے حسد اور رشک کے منفی جذبات کو کیوں نہ روکا جائے۔ گلبرٹ مرے کا خیال ہے کہ رسل نے اپنے آزاد محبت کے تصور کے پیش نظر یک زوجگی کو غیر فطری سمجھا اور خود کئی شادیاں کیں۔ انہی خیالات کی وجہ سے دوسری جنگ عظیم کے دوران امریکہ میں رسل کی اس وقت مخالفت کی گئی جب اس کا ایک یونیورسٹی میں تقرر ہو گیا تھا۔ یہ مخالفت مقدمہ بازی کی شکل اختیار کر گئی۔ ایک دندان ساز کی بیوی نے یونیورسٹی کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا۔ اس کی دلیل یہ تھی کہ جنس، اخلاق اور مذہب کے سلسلے میں مزاجی خیالات رکھنے والے شخص کو کسی یونیورسٹی کا معلم نہیں مقرر کیا جانا چاہئے۔ [illegible] تھا اس

نے رسل کے تقرر کے فیصلے کو منسوخ کر دیا۔ وہ تو کہیے کہ ایک خبطی لکھپتی بارنز Barnes نے اس کی بروقت دست گیری کی اور اسے تاریخ فلسفہ پر بارنز فاؤنڈیشن میں لکچر دینے پر ملازم رکھ لیا۔ اس طرح وہ کتاب مرتب ہو گئی جو بہتوں کے نزدیک رسل کا شاہکار ہے اور جس کا نام 'مغربی فلسفے کی تاریخ' ہے۔ یہ پہلا موقعہ تھا جب کسی فلسفی نے فلسفے کی تاریخ لکھی ہو۔ یہی اس کتاب کی خوبی ہے اور خامی بھی۔ تاریخ جس بے تعصبی کا مطالبہ کرتی ہے اور جو معروضی انداز چاہتی ہے وہ رسل سے کتاب کے ہر حصے میں نہیں نبھ سکا ہے۔ چنانچہ کانٹ اور برگساں پر جو ابواب ہیں ان میں رسل نے ان دو فلسفیوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے۔ اسی طرح بعض فلسفیوں کے زمانے کی سماجی اور سیاسی زندگی کے تجزیے سے گریز کیا گیا ہے۔ ان چند کوتاہیوں کے باوجود یہ کتاب فلسفے کے طالب علموں کے لئے اس موضوع پر چند اچھی کتابوں میں ہے اور ایک عرصے تک رہے گی۔

دوسری جنگ عظیم کے سلسلے میں بعض لوگوں نے رسل کے رویے پر سخت تنقید کی ہے جس شد و مد سے اس نے پہلی جنگ عظیم کی مخالفت کی تھی اس کا اظہار دوسری عالمی جنگ کے سلسلے میں نہیں ہوتا۔ اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ رسل نے امن پسندی کا مسلک ترک کر دیا تھا، یا اسے انسان اور انسانی تہذیب کی بقا اور بہتری کا پاس نہیں رہا تھا۔ اس سلسلے میں خود رسل کا بیان ملاحظہ ہو:

> "میں ان معنوں میں آج بھی امن پسند ہوں کہ امن کو دنیا میں ہر چیز سے زیادہ اہم سمجھتا ہوں لیکن میرا خیال ہے کہ دنیا اس وقت تک حقیقی امن سے ہم کنار نہیں ہو سکتی جب تک کہ ہٹلر موجود ہے۔ اس کی شکست کے بعد ہی کسی بہتری کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ اگر ہم جنگ ہار جاتے ہیں تو دنیا جہنم میں تبدیل ہو کر رہ جائے گی اور یہی کیفیت ایک عرصے تک رہے گی۔"

اسی مسئلے پر اظہار خیال کرتے ہوئے رسل نے ایک جگہ اور لکھا ہے:

"میرا خیال ہے کہ اس وقت میں کچھ کر سکتا ہوں تو وہ یہ ہے کہ اس مٹتی ہوئی تہذیب میں سے جو کچھ بچا سکوں بچالوں اس امید میں کہ شاید ایک ہزار سال بعد نشاۃ الثانیہ ہو سکے"

دوسری جنگ عظیم کے اختتام کے بعد سے رسل تیسری عالمگیر جنگ کے خطرے سے دنیا و آگاہ کرتا رہا۔ اس لئے کہ دوسری جنگ میں ایٹم بم کے استعمال نے اس کے ضمیر کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس نے ترک اسلحہ کی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ امن کی خاطر اس نے دنیا کے تمام مظلوموں کی حمایت کی اور ظالموں کی مذمت۔ خواہ ظالم امریکی رہے ہوں، روسی یا برطانوی ں نے زندگی کے ہر موضوع اور ہر مسئلے پر عقل و ضمیر کو اپنا رہنما بنایا اور سائنس ہی کی بنیاد پر خیر و شر اور ق و باطل میں فرق کیا۔ وہ ان فلسفیوں میں نہیں تھا جو بسم اللہ کے گنبد میں بیٹھ کر گرد و پیش ، زندگی سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ اس نے زمانے کے ہر تیکھے، ہر اضطراب اور ہر ارتعاش محسوس کیا اور یہی نہیں کہ محسوس کیا بلکہ ان کے سلسلے میں جو بھی عملی جد و جہد ہو سکتی تھی، کی۔ ۱۹۵۴ء میں اس نے ہائیڈروجن بم کے موضوع پر ایک انتہائی اثر آفریں تقریر کی۔ اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> "میں تمام انسانوں سے انسان ہونے کے رشتے سے یہ کہوں گا: سب کچھ بھول کر اپنی انسانیت کو یاد رکھو۔ اگر تم ایسا کرنے میں کامیاب ہو گئے تو سمجھ لو کہ تم پر ایک نئی فردوس کے دروازے کھل جائیں گے۔ اگر تم ایسا نہ کر سکے تو تمہارے سامنے عالمگیر تباہی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔"

ان چند جملوں میں رسل کے دل کا سارا سوز و گداز سمٹ آیا ہے اور اس کی یہ خواہش بھی کہ نسل انسانی اور اس کی تہذیب کو ہر قیمت پر بچایا جائے اور اس ورثے کو محفوظ رکھا جائے جس کی تعمیر میں عصر رواں کے سوا اور زمانے بھی شامل ہیں جن کا کوئی نام نہیں ہے۔ یہ رسل کی ہی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ اشتراکی اور غیر اشتراکی سائنس دانوں نے مل کر ایک ایسا اعلان کیا جس میں دنیا کو

ہائیڈروجن بم کی تباہ کاریوں سے آگاہ کیا گیا تھا۔ یہ اس کی بنائی ہوئی فضا کا فیض تھا کہ ۱۹۵۵ء میں عالمی طاقتوں نے جنیوا میں ترکِ اسلحہ کے مسئلے پر غور کرنا شروع کر دیا اور امنِ عالم کی اُمید کے چراغ کی لَو تیز ہو گئی۔ ضمیرِ عالم کو متحرک و بیدار کرنے کے سلسلے میں رسل کے کارنامے شاید دنیا کبھی فراموش نہ کر سکے گی۔

پہلی جنگِ عظیم کے بعد سے رسل کی عملی سرگرمیوں پر لوگوں نے زیادہ توجہ کی۔ اس کے فلسفیانہ کارناموں سے صرف تھوڑے سے لوگ باخبر رہے۔ اگرچہ اپنی عملی جدوجہد کے دوران بھی اس نے فلسفہ اور اس سے متعلقہ مسائل پر اظہارِ خیال کیا ہے پھر بھی عام لوگوں کے ذہن میں رسل صرف ایک ایسی آواز کی طرح ہے جو تہذیبِ انسانی کے بنائے ہوئے خرابے میں ابھرتی اور ڈوبتی رہی ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ رسل کا اپنا کوئی فلسفیانہ کارنامہ نہیں ہے۔ بعض لوگوں نے اس پر سطحیت کا بھی الزام لگایا ہے۔ کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس نے کوئی نیا خیال پیش نہیں کیا۔ دراصل ایک بڑا فلسفی ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ فلسفی کوئی سنسنی خیز اصول وضع کرے اور بعد میں کوئی دوسرا فلسفی اس کی تردید کر دے۔ پروفیسر آسٹن نے ایک بڑی دلچسپ بات کہی ہے وہ یہ کہ ایک بڑا فلسفی بننے کے لئے کوئی بڑی غلطی کرنی بہت ضروری ہے۔ رسل نے اس طرح کی کوئی ایسی غلطی نہیں کی جس کی تردید بعد کی نسلیں کر سکیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس نے فلسفے کو جس مقام پر چھوڑا ہے وہاں سے آگے جانے کی بہرحال گنجائش ہے۔ رسل کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے بہت سے فلسفیانہ سوالات اٹھائے اس لئے نہیں کہ اسے سوالات اٹھانے کا شوق تھا بلکہ اس لئے کہ وہ انتہائی خلوص سے ان سوالات کا جواب معلوم کرنا چاہتا تھا۔ یہی نہیں کہ اس نے سوالات اٹھائے، اس نے بہت سے سوالوں کے جواب بھی معلوم کر لئے تھے لیکن بہت سے سوال ایسے بھی رہ گئے جن کا جواب ممکن نہ تھا۔ رسل نے خود ایک مرتبہ کہا تھا کہ فلسفے کا زیادہ تر انحصار خود سوالات پر ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ دنیا میں عظیم فلسفے کم ہیں اور بڑے فلسفی زیادہ۔ رسل کا یہی کارنامہ

ہے کہ اس نے اپنی مختلف تحریروں کے ذریعہ یہ بات ثابت کر دی ہے کہ ہم کسی بھی
میں قطعی یقین سے کچھ نہیں جان سکتے۔ اس نے کلبی انداز کی تشکیک کو بنجر کہا ہے
ں کا خیال ہے کہ ایک پُرخلوص متشکک ہی ہمت اور حوصلے کی زندگی گزار سکتا
رسل کی پوری عملی اور ذہنی زندگی اسی ہمت اور حوصلے کا ایک لازوال
ہے۔

(ختم)

ذاکر حسین

وہ مردِ درویش، حق نے جس کو دئے تھے اندازِ خسروانہ

فطرت کتنی عظیم ہوتی ہے لیکن اس کی عظمت کا احساس عام طور پر اور عام حالات میں نہ ہوتا، ہوا، پانی، روشنی، آفتاب کی تابانی، مہتاب کی درخشانی اور فیض رسانی کا اعتراف شاید کسی احسان شناس کی زبان پر آتا ہو۔ یہ اس لئے ہوتا ہے کہ ہم یہ طے کر چکے ہوتے ہیں کہ وہ تو سرتا سر مفت نظر ہے ہی۔ اسے تو مان نہ مان ایسا کرنا ہی ہے۔ اور کچھ اس لئے بھی کہ اسی فیض بخشیوں کے لئے ہمیں کچھ کرنا نہیں پڑتا۔

کچھ یہی انداز ہمارا ذاکر صاحب کے ساتھ رہا ہے، جب تک وہ ہم میں رہے اس وقت تک سیاست و تعلیم، سماجیات و اقتصادیات، ملک اور ملت سب نے اُن سے استفادہ کیا لیکن ہم نے نہ کبھی دل کھول کر انھیں صلہ دیا نہ ان کے خدمات و احسانات کا بھرپور اعتراف ہی کیا۔ اس باب میں ہماری مردہ پرست قوم کی ناشناسی یا ناسپاسی کا اتنا دخل نہیں جتنا خود ذاکر صاحب کی آزاد فطرت اور بے نیاز طبیعت کا ہے۔ 'نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا' زندگی بھر ان کا اصول رہا۔ 'نیکی کر دریا میں ڈال' ہمارے لئے ایک مثل ہے، ان کے لئے زندگی کا دستور العمل۔

انھوں نے بچوں کے لئے شروع میں چند کہانیاں لکھی تھیں جن میں خود ان کی معصوم فطرت کی جھلکیاں موجود ہیں۔ انھوں نے اپنی ایک کہانی 'آخری قدم' میں ایک نیک دل انسان کو

ت کبھی سے کر وہ خفیہ خیرات تقسیم کرتا لیکن کسی کو اس کی خبر نہ ہونے دیتا تھا۔ لوگ اسے
بخیل سمجھتے اور ملامت کرتے لیکن وہ تنہائی میں آکر اپنی خیرات کی تفصیلات "حساب امانت"
کے رجسٹر میں لکھ لیتا اور اسے دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا کہ میرے نامۂ اعمال میں اتنی نیکیاں ہیں۔
کے کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ وہ سب کی سنتا لیکن کسی کو جواب نہ دیتا تھا۔ جب اس کا
وقت آیا تو یہ سوچ کر خوش ہونے لگا کہ آج دشمن میرا "حساب امانت" دیکھ کر شرمندہ
گے لیکن پھر دوسرے ہی لمحے اسے خیال آیا کہ میری منزل تو اب آگئی۔ میرا آخری قدم کیوں
تا ہے۔ میں دنیا والوں کو شرمندہ کر کے کیا کروں گا؟ چنانچہ اس نے وہ "حساب امانت"
وئی انگیٹھی میں پھینک دیا اور جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔

یہ ایک کہانی سہی لیکن میں اسے ان کی پاکیزہ روح کی سرگذشت اور ان کی زندگی کی
بھی سمجھتا ہوں۔ عمر بھر انھوں نے خاموش خدمت کی اور اس کے بدلے میں چند بدنامیاں
کے حصے میں آئیں لیکن کبھی کوئی حرفِ شکایت ان کی زبان تک نہ آیا۔ خاموش خدمت
خلوص و مسلسل محنت ہی میں ان کی عمر بھر کی کہانی چھپی ہوئی ہے، وہ آتشِ خموش کی
سلگتے رہے اور بلا کسی ترک بھڑک کے گرمی اور روشنی پہنچاتے رہے۔ شمعِ محفل کی
سب کے رفیق بن کر سب کے غم میں گھلتے اور پگھلتے رہے لیکن محفل کو لطفِ صحبت
سوچنے کا موقع ہی نہ ملا:

خیال تک نہ کیا اہلِ انجمن نے کبھی
تمام عمر جلی شمع انجمن کے لئے

ذاکر صاحب ایک دیندار گھرانے میں پیدا ہوئے اور بچپن ہی میں ایک بزرگ کے مرید
، جس کے دور رس اثرات آپ کی زندگی میں ہمیشہ رہے۔ ان کی عملی زندگی یادِ خدا سے
ی اور وہ عبادات کے پابند تھے۔ پبلک میں بھی وہ اپنی مذہبیت پر فخر کرتے تھے۔ شرماتے
تھے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کاشی

ودیا پیٹھ کے خطبۂ صدارت میں آپ نے فرمایا:

"سچے مسلمان ہندوستانی، اپنی مذہبی روایات، اپنی تاریخ، اپنی تمدنی خدمات، اور اپنے تمدن سے توقعات کی وجہ سے اپنے ملی وجود کو خود اپنے ہی لئے نہیں بے بہا سمجھتے بلکہ ہندوستانی قومیت کے لئے نہایت بیش قیمت جانتے ہیں اس کے مٹائے یا گم کئے جانے کو اپنے ہی ساتھ ظلم نہیں بلکہ ہندوستانی قوم کے ساتھ بھی خیانت سمجھتے ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کو اپنا دین کسی اور سے کم عزیز نہیں وہ ہندوستانی قوم کا جز ہونے پر فخر محسوس کرتے ہیں مگر وہ ایسا جز بننا کبھی گوارا نہیں کریں گے جس میں ان کی اپنی حیثیت بالکل مٹ چکی ہو ان کا حوصلہ یہ ہے کہ اچھے مسلم ہوں اور اچھے ہندی۔ نہ کوئی مسلمان انھیں ہندی ہونے پر شرمائے اور نہ کوئی ہندی ان کے مسلمان ہونے پر انگلی اٹھائے۔ ہندوستان میں ان کا دین ملک سے بے تعلقی کا عذر نہ ہو بلکہ خدمت کی ذمہ داری ان پر ڈالے۔ ان کے لئے عیب نہ ہو بلکہ امتیاز!"

جامعہ ملیہ پر تعارفی مضمون میں انھوں نے لکھا تھا:

"جامعہ کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی آئندہ زندگی کا ایک ایسا نقشہ تیار کرے جس کا مرکز اسلام ہو اور اس میں ہندوستانی تہذیب کا وہ رنگ بھرے جو عام انسانی تہذیب میں کھپ جائے۔" (جامعہ : دسمبر ۱۹۲۸)

انھوں نے کاشی ودیا پیٹھ کے خطبۂ صدارت میں فرمایا تھا:

"آپ مجھے معاف فرمائیں اگر میں اس معزز مجمع کے سامنے صفائی سے یہ بات پیش کروں کہ مسلمانوں کو جو چیز متحدہ قومیت سے بار بار الگ کھینچتی ہے اس میں جہاں شخصی خود غرضیاں، تنگ نظری اور ملک کے مستقبل کا صحیح تصور نہ قائم کر سکنے کو دخل ہے وہاں اس شبہ کا بھی بہت بڑا حصہ ہے کہ قومی حکومت کے ماتحت مسلمانوں کی تمدنی ہستی فنا ہونے کا ڈر ہے اور مسلمان کسی حال میں یہ قیمت ادا کرنے کو تیار نہیں اور میں بحیثیت مسلمان بھی نہیں

سچے ہندوستانی کی حیثیت سے بھی اس پر خوش ہوں کہ مسلمان اس قیمت کو ادا کرنے پر تیار نہیں۔ اس لئے کہ اس سے مسلمانوں کو جو نقصان ہوگا سو ہوگا ہی خود ہندوستان کا تمدن کہاں سے کہاں پہنچ جائے گا:

گرچہ مثل غنچہ دلگیریم ما　　گلستاں میرد اگر میریم ما

وہ اردو کے ایک اچھے ادیب تھے۔ ان کے تعلیمی خطبات، ان کی معاشیات پر کتابیں ور افلاطون کی ریپبلک کا ترجمہ ان کے اسلوب کا اچھا نمونہ ہیں۔ "ریاست" کے بارے میں لوگوں کہنا ہے کہ وہ اصل پر اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

ان کے اسلوب میں ان کی شخصیت ہی کی طرح شگفتگی، سادہ پرکاری، وضاحت و متانت ۔ مولانا حالی کے اسلوب سے ان کا اسلوب بہت قریب ہے اور اس لحاظ سے بھی اپنے امرین میں انھیں ایک ممتاز حیثیت حاصل ہے۔ ان کا اسلوب ہلکا تفلسف لئے ہوئے ہے ن سلاست اور عام فہمی میں اس سے فرق نہیں آتا۔

جہاں تک ان کی شخصیت کا تعلق ہے اس میں مذہب کی رواداری، ادب کی جمال نوازی علیم کی سنجیدگی و شگفتگی موجود تھی۔ ڈاکٹر صاحب کے بارے میں لوگوں کا عام تاثر تھا کہ ان ضیت ان کے کارناموں سے زیادہ دلچسپ ہے۔ وہ جن قدروں پر یقین رکھتے تھے کے اظہار کے بجائے ان کا نمونہ بننا زیادہ پسند کرتے تھے۔ وزیر اعظم مسز گاندھی نے ہا تھا کہ حسن ان کی شخصیت کے ہر پہلو سے نمایاں تھا، ان کا ایک بڑا کارنامہ مذہب اور ست یا ملک و ملت کے درمیان اتحاد بھی ہے انھیں اپنی مذہبیت اور قوم پروری میں تضاد نہیں محسوس ہوا۔ انھوں نے صدارت کا عہدہ سنبھالتے ہوئے کہا تھا کہ ہندستان گھر ہے اور اس کے رہنے والے میرا کنبہ ہیں۔ دراصل ذاکر صاحب کا مذہب ہی انھیں وکی ابت تک لے آیا تھا ان کے عقیدے نے انھیں بتایا تھا کہ خدمت عبادت ہے۔ وجہ ہے کہ ان کے مخالفین نے بھی کبھی ان کے خلوص نیت پر شبہ نہیں کیا وہ نیت کے

سچے اور اپنی دھن کے پکے تھے۔

ذاکر صاحب اپنی وطن دوستی اور قوم پروری میں حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، رفیع قدوائی اور مولانا ابوالکلام کی صف کے آدمی تھے۔ ان کی حب الوطنی کسی مصلحت یا اکثریت سے مرعوبیت کا نتیجہ نہ تھی بلکہ ان کی فطرت کا تقاضا اور طے شدہ پروگرام تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ مسلمان، ملکی فضا سے الگ ایک جزیرہ بن کر نہیں رہ سکتے بلکہ ان کا دھارا بھی متوازی سہی لیکن ساتھ ساتھ ہی بہنا چاہیئے۔ گاندھی جی کی وردھا اسکیم کی بنیادی تعلیم کو عملی شکل دینا ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے جس کے ذریعے انھوں نے ملک کی عظیم الشان اور ناقابل فراموش خدمت انجام دی۔ اس کے ذریعہ مفت لازمی تعلیم، دستکاری، اور دیسی زبانوں میں تعلیم جیسی نادر چیزیں ہندوستان کو ملیں۔ ۱۹۳۷ء میں وردھا میں جب گاندھی جی نے یہ اسکیم پیش کی تو کسی نے ان کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ لیکن ذاکر صاحب پہلے شخص تھے جنھوں نے عوام کے ذہن سے ان کے شبہات کو دور کیا اور پھر گاندھی جی نے انھیں اس کا چیرمین بنا کر نصاب تعلیم کا کام بھی ان کے سپرد کر دیا۔ گاندھی جی اور مولانا محمد علی جب ترک موالات کی پہلی اپیل لیکر علی گڑھ گئے تو جن نوجوانوں نے ان کی پرجوش پذیرائی کی ان میں ذاکر صاحب بھی تھے جو ضیاء الدین احمد خاں کی مخالفت کے باوجود تحریک آزادی میں آگئے اور پھر جامعہ ملیہ کے لئے اپنے کو وقف کر دیا اور دال دلیا کھا کر، رات دن ایک کر کے، اس کے لئے محنت کرتے رہے۔

ذاکر صاحب بنیادی طور پر ایک معلم تھے۔ ان کی خاموش طبیعت اور سنجیدہ فطرت نے انھیں ہر طرح تعلیم کے لئے موزوں پایا تھا۔ اگرچہ بہت اچھا لکھنے اور بولنے کی صلاحیت بھی ان میں کسی سے کم نہ تھی لیکن ان کا کہنا تھا کہ "کم بولنا اور دوسروں کی سننا زیادہ مہذب طریقہ ہے" ان کی سخت کوشی نے انھیں خود نمائی سے بہت دور رکھا تھا انھوں نے لکھا تھا کہ:

تمہارے دیس کو گردنوں سے اُبلتے ہوئے خون کے دھارے کی ضرورت نہیں بلکہ ہمارے ماتھے کے پسینے کا بارہ ماسی دریا درکار ہے۔ ضرورت ہے کام کی، خاموش اور سچے کام کی۔ ہمارا مستقبل کسان کی ٹوٹی جھونپڑی، کاریگر کی دھوئیں سے کالی چھت اور دیہاتی مدرسہ کے پھوس کے چھپر تلے بن سکتا ہے، سیاسی جھگڑوں، کانفرنسوں، اور کانگریسوں میں کل اور پرسوں کے قصوں کا فیصلہ ہوگا لیکن جن جگہوں کا میں نے نام لیا ان میں صدیوں تک کے لئے ہماری قسمت کا فیصلہ ہوگا ان جگہوں کا کام صبر چاہتا ہے اور استقلال، اس میں تھکن بھی زیادہ ہے اور قدر بھی کم۔ جلدی نتیجہ بھی نہیں نکلتا۔ ہاں کوئی دیر تک صبر کر سکے تو ضرور پھل میٹھا ہوتا ہے۔"

ڈاکٹر صاحب کا یہ صدارتی خطبہ ہی نہ تھا بلکہ ان کا نصب العین تھا اُن جملوں میں ان بہترین سوانح پوری تفصیل کے ساتھ آگئی ہے۔ قومیں تعلیم و تہذیب سے بنتی ہیں۔ ‏[...]رستانی قوم کی تہذیب و تشکیل میں جو حصہ ڈاکٹر ذاکر مرحوم کا رہا ہے وہ بنیادی ہے اور ‏[...]ے دائمی احسان کی حیثیت رکھتا ہے۔ ذاکر صاحب کی گرانقدر شخصیت کو سمجھنے کے لئے ‏[...]ی جوہر شناسی کی ضرورت ہے۔ ان کی شرافت، صدق نیت، اور دیانت ان کی شخصیت ‏[...]ازمی عنصر تھیں۔ مزاج کی شگفتگی اور ذوق کی پاکیزگی نے ان صفات پہ اور جلا کر دی تھی ‏[...]ر ان کی مسلسل محنت نے ان کو کندن بنا دیا تھا۔ ان کے ذاتی حالات تو اب سامنے ‏[...]ا رہے ہیں اور ویسے بھی ان کی زندگی، مکمل کتاب تھی۔

آنند سنکر رے
تلخیص و ترجمہ : ڈاکٹر جعفر رضا بلگرامی

انڈین یا ہندوستانی ؟

چند سال پہلے لندن میں میرے ایک دوست کی یہودی بیوی نے مجھ سے کہا تھا کہ یورپ کی سرزمین میں سامیت دشمنی رچ بس گئی ہے۔ مجھے اُن کے چہرے کی انتہاء افسردگی آج تک یاد ہے۔ کچھ اسی طرح کی افسردگی کا احساس مجھے ہوتا ہے جب میں یہ کہنے پر مجبور ہوتا ہوں کہ مسلم دشمنی ہندوستان کی مٹی میں رچ بس گئی ہے۔ لوگوں کو اس بات کا یقین نہیں رہا ہے کہ گاندھی وادی ان کی حفاظت کے لئے مؤثر تدابیر اختیار کرسکیں گے۔ پولیس بھی قابل اعتماد نہیں سمجھی جاتی۔ ہر فرقہ وارانہ فساد کے موقع پر فوجی مداخلت کا ایک شور بلند کیا جاتا ہے۔

اب یہاں انگریز نہیں ہیں جن کو ہم اپنی تمام تر مشکلات کے لئے موردِ الزام ٹھہرا سکیں اس مشکل مسئلہ سے ہم چشم پوشی نہیں کر سکتے اور نہ ہی اس کی ذمہ داری کسی اور کے سر تھوپ سکتے ہیں۔ چند برسوں سے پاکستان میں بھی ہندوؤں کو ان کی زندگیوں سے محروم نہیں کیا جارہا ہے۔ اس لیے اس ملک کے سر پر بھی یہ الزام نہیں تھوپا جاسکتا۔ اس کے باوجود معمولی سی

نوٹ : آنند سنکر رے (عمر ۶۶ سال) ۶۰ کتابوں کے مشہور بنگالی مصنف ہیں، ۱۹۵۱ء میں آئی، سی، ایس سے ریٹائر ہوئے۔ ساہتیہ اکیڈیمی ایوارڈ حاصل کر چکے ہیں۔ ان کا یہ مضمون اسٹیٹسمین ویکلی، ۲۲ نومبر ۱۹۷ء، میں شائع ہوا ہے۔

پر ہندوؤں اور مسلمانوں میں فساد ہو جاتے ہیں اور یہ فساد ہندوستان کی سرزمین پر ہی ہوتے

کچھ لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ پہل ہمیشہ مسلمانوں ہی کی طرف سے ہوتی ہے۔ اُن کا کہنا
پاکستان کا اس میں ہاتھ ہے، ان میں سے کوئی دعویٰ نہ تو آج تک ثابت ہوا ہے اور نہ
سکتا ہے، اس لیے اس کو رد کر دینا چاہیئے۔ جو لوگ اس طرح کا بیان دیتے ہیں وہ نہ تو
ت کی چھان بین کرتے ہیں اور نہ تفصیل میں جاتے ہیں، اس طرح کے غیر ذمہ دارانہ بیانات
ہ دوستان میں مسلم دشمنی کے جذبات مشتعل ہوتے ہیں۔

دستورِ ہند نے مذہبی بنیادوں پر علٰحدہ رائے دہندگی اور ملازمتوں میں متعین کوٹے کے اصول
ف کر دیا ہے، اس لئے ہندوستان میں مسلمان گھاٹے میں ہیں۔ تعلیم میں اُن کی پس ماندگی بھی
مایت کی مستحق نہیں سمجھی جاتی۔ مسلم نوجوان اپنی مرضی سے پاکستان چلے جاتے ہیں، جو اپنا گھر بار
نے پر رضامند نہیں ہوتے اور اپنے وطن سے جدا ہونا پسند نہیں کرتے وہ بیٹھے بیٹھے آنسو بہاتے
ہیں۔ میں بھی ان کے لیے روتا ہوں۔ لیکن میرے پاس ان کے مسائل کا کوئی حل نہیں ہے۔
انداز فکر کے مطابق فرقہ وارانہ بنیادوں پر ریزرویشن کا برطانوی حل غلط ہے کیونکہ اس طرح
ل کا لحاظ نہیں کیا جا سکتا۔ میں خود اپنی نوجوانی میں اِسی قسم کی تفریق کا شکار ہو چکا ہوں۔

دوسرے ملکوں میں بھی تاریخ کے مختلف ادوار میں ایسی صورتِ حال رونما ہو چکی ہے۔ ایک
یسا گزرا ہے جب یہودیوں، کیتھولک مذہب کے ماننے والوں اور غیر مقلدوں کا انگلستان
رمتیں حاصل کرنا یا پارلیمنٹ کے لئے منتخب ہونا ممکن نہ تھا۔ لیکن اس وجہ سے نہ تو وہ مایوس
ہوئے اور نہ ہی انھوں نے اپنی کوششیں موقوف کیں۔ انھوں نے زراعت، بنک کاری
، صنعت اور دستکاری کو فروغ دیا۔ کوئی ان کو انگلستان سے نکال نہ سکا۔ اور سارے
ل اور مواقع ان کے لئے نعمت بن گئیں۔

مذہبی بنیادوں پر علٰحدہ رائے دہندگی اور ملازمتوں کا تعین [illegible]

مسلمان اس کا خواب ضرور دیکھتے ہیں کہ شاید ایسا ہو جائے، لیکن بہرحال یہ ایک ایسا خواب ہے جو شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ اُن کے لئے تمام دروازے کھول دیے جائیں اور یقین دلا دیا جائے کہ مذہب کی بنیاد پر کوئی امتیاز نہیں برتا جائے گا۔

ہندوستان میں ہولی کے رنگ، گائے اور مسجد کے سامنے باجا بجانے کی وجہ سے بہت سے فرقہ وارانہ فساد ہوتے ہیں، اور ابھی حال میں اردو زبان بھی جھگڑے کا باعث بنی ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں نے مل کر اس زبان کو فروغ دیا ہے۔ یہ اُن میں سے کسی ایک کی زبان نہیں ہے۔ پنجاب اور اتر پردیش میں بہت سے ہندوؤں کی اُردو مادری زبان ہے۔ آخر اُردو کو ہندی پر کیوں قربان کر دینا چاہیے۔ بیس بائیس سال سے اس زبان کو جس طرح سے نظر انداز کیا جا رہا ہے اس سے یہ اندیشہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ زبان ختم ہو جائے گی۔ اس میں مبالغہ ہو سکتا ہے لیکن صورت حال کچھ اسی طرح کی ہے۔

پاکستان سے جو ہمارے رشتے ہیں ان میں سے ایک بنگالی اور دوسرا اردو کا رشتہ بہت ہی اہم ہے۔ اگر یہ رشتے بھی ٹوٹ گئے تو ہندوستان اور پاکستان ہر لحاظ سے ایک دوسرے کے لئے اجنبی ملک بن کر رہ جائیں گے۔

کیا عام ہندو کو یہ بات بار بار بتلانے کی ضرورت ہے کہ ہم نے اپنے ملک کا نام "انڈیا" رکھا ہے، "ہندوستان" نہیں۔ ہم نے ہر عقیدے کے ماننے والوں کے لئے اپنے دروازے کھلے رکھے ہیں اور اسی وجہ سے ہماری ریاست سیکولر کہلاتی ہے، ہم نے ملک کے ہر شہری کو دعوت دے رکھی ہے کہ وہ دوسروں کے ساتھ مل کر ملک کا مستقبل سنوارنے کے لئے جدوجہد کرے، ہماری تہذیب ایک رنگا رنگ کلچر کا نتیجہ ہے جس میں مسلمانوں اور دوسرے لوگوں کا بہت اہم حصہ ہے، ہماری معیشت ایک رشتۂ باہمی کا نتیجہ ہے جس میں مسلمانوں کو ایک اہم رول ادا کرنا ہے۔

ہم مسلمانوں کے بغیر[۱] "انڈین" نہیں ہو سکتے۔ ہماری [illegible] کے

---

۱ اور سکھوں، عیسائیوں، پارسیوں اور یہودیوں کے بغیر بھی (مدیر)

س ملک میں باقی رہنے پر مُصر ہے۔ اگر وہ چلے گئے تو ہم "ہندستانی" ہو جائیں گے۔ ہمارے ملک
نام "ہندستان" ہو جائے گا اور یہی پاکستان چاہتا ہے۔

یہ ایک خاص ذہنیت ہے جو انڈین قومیت کی قسم کھاتی ہے لیکن جب وہ اس ملک کو "انڈیا"
ہتی ہے تو وہ اسے صرف ہندوؤں کی سرزمین سمجھتی ہے اور مسلمانوں کو غیر انڈین، کیونکہ وہ
یر ہندو ہیں۔ اُن کے نزدیک صرف ہندو ہی سچے انڈین ہیں۔ ذہنی انتشار صرف اس وجہ سے
ہے کہ اس لفظ کو مختلف اور متضاد معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ لفظ "ہندو" ایک طرح کی
خصیص کا اظہار کرتا ہے جبکہ لفظ "انڈین" میں عمومیت اور وسعت ہے۔ اس اعتبار سے
ہندوازم" ایک مخصوص مذہب ہے جس کے اپنے حدود ہیں جبکہ "انڈیا" ایسا ملک ہے جس
ں تنوع، رنگارنگی اور وسعت ہے۔

اس بات کو ایک بار پھر واضح کر دینے کا وقت آگیا ہے کہ یہ ملک جس کو ہم انڈیا
ہتے ہیں وہ سارے عقائد کی سرزمین ہے، یہ ضرور ہے کہ اس کا ایک جزو کُل سے علاحدہ ہو گیا
ہے لیکن انڈیا کے عوام انڈین ہیں، صدیوں سے انڈین رہے ہیں اور محض اس بنا پر کہ
یک ٹکڑے نے علاحدہ ہو کر اپنا نام پاکستان رکھ لیا ہے اِن کو پھر سے Indianise
رنے کی ضرورت نہیں ہے۔

عبداللطیف اعظمی

جامعہ کا جشن زرّیں

۲۷ر تا ۳۰ر اکتوبر ۱۹۷۰ء

(۲)

سیمینار

جشن زریں کے موقع پر تین اہم موضوعات پر سیمینار کا اہتمام کیا گیا تھا جن کے حسب ذیل عنوانات تھے:

(۱) تدریس اردو کے مسائل

(۲) ہندوستانی مسلمانوں کے سوشل ویلفیر کے مسائل

(۳) تہذیبی اقدار کی ماہیت پہچاننے اور انھیں نئی نسلوں تک پہنچانے میں یونیورسٹیوں کا رول

پہلا سیمینار "تدریس اردو کے مسائل" پر استادوں کے مدرسے (ٹیچرز کالج) کے زیر اہتمام منعقد ہوا تھا، جس میں حسب ذیل مقالے پڑھے گئے:

(۱) اردو کے اساتذہ کی تیاری کے مسائل از پروفیسر سید احتشام حسین (الہ آباد یونیورسٹی) (۲) اردو نظم کی تدریس کے مسائل از ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی (دلی یونیورسٹی) (۳) نظم کی تدریس کے چند مسائل از جناب عبداللہ ولی بخش قادری (استادوں کا مدرسہ) (۴) نثر کی تدریس از محترمہ نجمہ سلطانہ (حیدرآباد) (۵) صحت املا اور (۶) ثانوی اداروں میں اردو کا نصاب از جناب

رشید حسن خاں (دلی یونیورسٹی) (۷) قواعد اور اس کی تدریس از ڈاکٹر شفیع بریکی (مدرسہ ثانوی جامعہ) (۸) اردو تدریس کے مسائل از جناب فرقان احمد (فتحپوری مسلم ہائر سکنڈری اسکول دہلی) (۹) اردو ذریعۂ تعلیم کے مسائل از جناب زین العابدین (فتحپوری اسکول دہلی) (۱۰) تدریس انشا اور اس کے مسائل از جناب سید منظور احمد قاسمی (فتحپوری اسکول دہلی) (۱۱) محترمہ ساجدہ زیدی (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) نے نظم و نثر کی تدریس پر مقالہ لکھا تھا، مگر ٹرین کی گڑبڑ کی وجہ سے وہ وقت پر تشریف نہ لا سکیں، اس لیے یہ مقالہ پڑھا نہ جا سکا۔

سیمینار کی تین نشستیں منعقد ہوئیں، پہلی کی صدارت ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، صدر شعبۂ اردو دلی یونیورسٹی نے کی، دوسری کی پروفیسر سید احتشام حسین، صدر شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی نے اور تیسرے کی شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب نے۔

سیمینار کا افتتاح شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب نے فرمایا۔ اپنی افتتاحی تقریر میں انہوں نے فرمایا کہ میں نے مولانا اسمٰعیل میرٹھی کی ریڈروں سے اردو سیکھی یا عابد صاحب کی کوششوں سے۔ زبان سیکھنا اور زبان سے محبت کرنا قاعدوں کا پابند نہیں ہوتا، یہ تربیت فرد کے ذوق اور اس کے اپنے شوق پر منحصر ہوتی ہے، اردو زبان کو اگر فروغ دینا ہے اور اسے اس زمانے کی تہذیب سے ہم آہنگ کرنا ہے تو ہم کو غزل کا سہارا لینا ہوگا، نثر کی ضرورت ہے اور رہے گی، مگر میرا خیال ہے کہ اردو زبان کی سرشت میں غزل شامل ہے، اگر ہم نے اسے نظرانداز کیا تو شاید ہم اردو کی ترویج و اشاعت کا کام موثر طور پر نہ کر سکیں گے۔ مجھے نہیں معلوم کہ آپ قاعدوں کا خیال رکھتے ہوئے اور کبھی کبھی ان قاعدوں کو نظرانداز کر کے اردو کی تدریس کے بارے میں بھی کچھ سوچیں گے یا نہیں، بہرحال میں آپ سب کا خیر مقدم کرتے ہوئے آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ تدریس اردو کے مسائل پر اپنے قیمتی مشوروں سے ہمیں مستفید فرمائیے۔

جامعہ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر سلامت اللہ صاحب نے سیمینار کے موضوع کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ مادری زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی ابتدا ۱۹۱۸ء میں عثمانیہ یونیورسٹی

میں ہوئی، اس کے بعد جامعہ نے قومی تعلیم کے لیے مادری زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی ا
کو محسوس کیا اور اس وقت صرف جامعہ ایک ایسی یونیورسٹی ہے، جہاں ابتدائی سے
اعلیٰ تعلیم تک ذریعۂ تعلیم اردو ہے۔ ٹیچرز کالج (استادوں کے مدرسے) میں اردو کے
استاد تیار کئے جاتے ہیں، اس سلسلے میں ہمارے سامنے بہت سے مسائل آتے ہیں۔
اس سیمینار میں تدریس اردو کے ان ہی مسائل پر ہم غور کریں گے، نصاب کی تشکیل،
کے ادبی سرمایہ کو نصاب میں شامل کرنا، درسی کتابوں کی تیاری اور اردو کے استاد و
تربیت وہ چند مسائل ہیں جن پر اس سیمینار میں تبادلۂ خیال کرنا ہے۔

آخری نشست میں، جس کی صدارت شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب نے،
سیمینار کے کنوینر جناب معین الدین صاحب نے ایک مفصل رپورٹ پڑھی، جس میں
اور مباحث کا خلاصہ پیش کیا گیا تھا۔

دوسرا سیمینار "ہندوستانی مسلمانوں کے سوشل ویلفیر کے مسائل" پر جامعہ اسکول آ
سوشل ورک کے زیر اہتمام منعقد ہوا تھا، جس میں شرکت کے لئے ملک کے مختلف حصوں
ڈیلیگیٹ تشریف لائے تھے۔ اس سیمینار میں پڑھنے اور بحث و گفتگو کے لئے جو مقالے لکھے
گئے تھے وہ سب کے سب انگریزی میں تھے، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

(۱) ہندوستانی مسلمانوں کے سوشل ویلفیر کے مسائل از جناب شمس الرحمٰن محسن (پرنسپل اسکول
آف سوشل ورک اور کنوینر سیمینار) (۲) ہندوستانی مسلمانوں کے سوشل ویلفیر کے مسائل کے چند معا
پہلو از پروفیسر اے ایم خسرو (انسٹی ٹیوٹ آف اکنامک گروتھ دہلی) (۳) ہندوستان میں مسلمانو
کے ویلفیر کی رضا کارانہ تنظیمیں از ڈاکٹر ڈی پی چودھری (ڈائرکٹر پبلک کوآپریشن حکومت ہند)
(۴) ہندوستانی مسلمانوں کے سوشل ویلفیر کا تعلیمی پہلو از ڈاکٹر سلامت اللہ (پرنسپل ٹیچرز کالج جا
(۵) ہندوستانی مسلمانوں کے سوشل ویلفیر کے سیاسی مسائل از ڈاکٹر ظفر امام (انڈین کونسل آف سوشل
سائنس ریسرچ دہلی) (۶) مسلم اوقاف اور سوشل ویلفیر کی سرگرمیاں از جناب حبیب الدین

وقف کونسل دہلی) (۷) ہندوستانی مسلمانوں کا سوشل ویلفیر اور تعلیمی مسائل از ڈاکٹر امین شکلا
ہر ٹیچرز کالج جامعہ) (۸) ہندوستان میں مسلمانوں کی سماجی سرگرمیاں از ڈاکٹر امتیاز احمد
ہرلال نہرو یونیورسٹی دہلی) (۹) سوشل ویلفیر کی خدمات اور اس کے معنی اور وسعت از
ایچ وائی صدیقی (اسکول آف سوشل ورک جامعہ) (۱۰) سوشل ویلفیر اور اسلام
انوار علی خاں سوز (اسکول آف سوشل ورک جامعہ) (۱۱) موجودہ صورت حال او
یفیر کی خدمات کی خصوصی ضروریات از جناب فقیر محمد (مسلم اوقاف تامل ناڈو، مدراس
شل ویلفیر کے لئے مسلمانوں میں تحریک پیدا کرنا از جناب یحییٰ بن محمد (اسکول آف سوشل
بدر آباد) (۱۳) سوشل ویلفیر کے لئے موثر طریق کار کی ضرورت از محترمہ مردولا سارا
دہلی) (۱۴) ہندوستانی مسلمانوں کے سوشل ویلفیر کا مسئلہ اور کامیابی کے امکانات
ب طلعت کمال (گاندھین انسٹی ٹیوٹ آف اسٹڈیز ورناسی)

س سیمینار کے ڈائرکٹر دہلی اسکول آف سوشل ورک کے پرنسپل جناب ایس ایم راناڈے مقرر
تھے، مگر وہ علالت کی وجہ سے نہ آسکے، اس لیے سیمینار کے کنوینر جناب محسن صاحب نے
انجام دی اور افتتاحی اجلاس کی صدارت کے فرائض ڈاکٹر ایم ایس گورے ڈائرکٹر
ٹی ٹیوٹ آف سوشل سائنسز نے انجام دیئے۔ افتتاحی اجلاس کے بعد سیمینار میں شریک
والوں کے دو گروپ بنا دیے گئے، ایک گروپ کی صدارت محترمہ مسز وہاب الدین احمد
ور دوسرے گروپ کی صدارت جناب معین الدین حارث صاحب نے۔ سیمینار کا
شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب نے فرمایا۔ انھوں نے افتتاح کرتے ہوئے
وں کا خیر مقدم کیا اور امید ظاہر کی کہ سوشل ویلفیر کے ممتاز ماہروں اور مسلمان عالموں
ؤں کے گراں قدر خیالات کی روشنی میں یہ سیمینار ان لوگوں کی مثبت رہنمائی کا فرض انجام
جو اس میدان میں قومی خدمت کا کام کر رہے ہیں۔ صدر جلسہ ڈاکٹر گورے نے
ہندوستانی مسلمانوں کے سوشل ویلفیر کے مخصوص مسائل ہیں، جن کو چار مدوں

خلوص کے ساتھ حل کرنے کی ضرورت ہے اور ایسے نئے طریقے اختیار کرنے کی ضرورت ہے کہ ان سے زیادہ سے زیادہ مفید نتیجے نکل سکیں۔ سیمینار کے کنوینر جناب شمس الرحمن محسن نے اپنے افتتاحی مقالے میں سیمینار کے موضوع کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ اس مسئلے پر خاص طور پر آج غور کرنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ سوشل ویلفیر کے میدان میں ہندوستانی مسلمان بہت پیچھے ہیں اور اب تک ان کے سماجی مسائل کی تحقیق و تفتیش اور ان کے حل کے لئے مناسب تدبیریں نہیں کی گئی ہیں۔ یہ سیمینار سماجی کارکنوں اور اداروں کو اپنے تین روزہ اجلاس میں ان دونوں باتوں کی طرف متوجہ کر سکے تو اس سے مفید نتیجے نکلیں گے۔

اس تین روزہ سیمینار کے اختتام پر جو رپورٹ منظور کی گئی اس میں اعتراف کیا گیا کہ ہندوستانی مسلمانوں میں سوشل ویلفیر کے لیے جو رضاکارانہ کام کئے جا رہے ہیں، ان کی نوعیت اور کیفیت کا صحیح اندازہ کرنے اور ضروری معلومات حاصل کرنے کے لئے ذرائع مفقود ہیں، اس لیے سیمینار میں حصہ لینے والوں نے اس پر زور دیا کہ جو ادارے مسلمانوں میں سوشل ویلفیر کا رضاکارانہ کام کر رہے ہیں، ان کے کاموں کے بارے میں صحیح اور ضروری معلومات حاصل کی جائیں اور جامعہ اسکول آف سوشل ورک سے خواہش کی گئی کہ وہ ایسے اداروں اور سوسائٹیوں کی ایک مکمل اور جامع ڈائرکٹری مرتب کر کے شائع کرے۔ سیمینار نے یہ بھی سفارش کی کہ دہلی اسکول آف سوشل ورک، جامعہ اسکول آف سوشل ورک، گاندھی سمارک ندھی اور سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف ریسرچ اینڈ ٹریننگ اِن پبلک کوآپریشن (نئی دہلی) کے ماہرین پر مشتمل ایک ایڈھاک کمیٹی مقرر کی جائے جو سماجی کام کرنے والی سوسائٹیوں کو مناسب مشورے اور ان کی رہنمائی کا فرض انجام دے۔

سیمینار کی بحث و گفتگو کے درمیان یہ بھی محسوس کیا گیا کہ سوشل ویلفیر کا کام کرنے والی مسلم تنظیموں نے اقتصادی پہلو کی طرف مناسب توجہ نہیں کی، جس کی وجہ سے خود غرض اور مفاد پرست تنظیموں کو در آنے کا موقع مل گیا۔ سیمینار نے سفارش کی کہ اوقاف کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی جائے اور مرکزی اوقاف کی مدد سے مختلف کوششوں میں ایسا ربط و ضبط پیدا

جائے کہ سماجی کام کرنے والی مسلم تنظیموں کو صحیح اور موثر رہنمائی مل سکے۔ مرکزی وقف کونسل کے سکریٹری
ب حبیب الدین صاحب کے بیان کے مطابق ملک کے تمام اوقاف سے، جن کی مالیت سو کروڑ ہے،
کروڑ کی سالانہ آمدنی ہوتی ہے۔ سیمینار کا خیال ہے کہ اگر اوقاف کے انتظام کو بہتر بنالیا جائے اور آمدنی
کنٹرول کیا جائے تو اس آمدنی میں پانچ سے چھ فیصدی تک اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

سیمینار نے دانشوروں سے اپیل کی کہ سماجی کام کو بہتر اور موثر بنانے کے لئے وہ عوام میں اعتماد کی فضا پیدا کرنے میں مدد کریں، اس نے یہ مشورہ بھی دیا کہ سماجی کارکنوں کو آپس میں ملنے اور تبادلۂ خیال کے لیے زیادہ سے زیادہ مواقع بہم پہنچائے جائیں، تاکہ موجودہ سرگرمیوں کو زیادہ مفید بنایا جا سکے اور نئے منصوبوں کے لئے راہیں پیدا کی جا سکیں۔

صدر جلسہ ڈاکٹر ایم ایس گورے نے سیمینار کے آخر میں جامعہ ملیہ کو مبارکباد دی کہ اس نے اس سیمینار کا انتظام کر کے ایک مفید خدمت انجام دی ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ ہندوستان کی سبھی قوموں کے سوشل ویلفیر کی راہ میں اہم مسائل ہیں، مگر ہندوستان کی مسلم کمیونٹی جو کل آبادی کا دسواں حصہ ہے، ترقی کی راہ میں بحیثیت مجموعی بہت پیچھے ہے، اس لیے اس کی سماجی فلاح و بہبود کے لئے بہت کچھ کرنے کی ضرورت ہے، امید ہے کہ اس سیمینار کے مقالوں اور بحث و گفتگو سے اس سلسلے میں بڑی مدد ملے گی اور سوچنے اور کام کرنے کے لیے نیا حوصلہ ملے گا۔

تیسرا سیمینار "تہذیبی اقدار کی ماہیت پہچاننے اور انھیں نئی نسلوں تک پہنچانے میں یونیورسٹیوں کا رول" جامعہ کالج کے زیر اہتمام منعقد ہوا، جس میں ڈاکٹر ڈی، ایس کوٹھاری، پروفیسر محمد مجیب، پروفیسر نہار رنجن رے، ڈاکٹر یوسف حسین خاں، ڈاکٹر ایس، سی گنگولی، پروفیسر بمل پرشاد، ڈاکٹر سید عابد حسین، اور پروفیسر مونس رضا نے حصہ لیا۔ صبح کے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر کوٹھاری نے کی اور شام کے اجلاس کی ڈاکٹر سید عابد حسین نے۔

ڈاکٹر کوٹھاری نے انتہائی وضاحت کے ساتھ یہ فرمایا کہ سماجی زندگی میں یونیورسٹیوں کا کام
نہیں ہے کہ وہ صرف اُن افکار اور طریقوں کو سراہیں جن کا سماج میں چلن ہو بلکہ ان کا کام یہ

بھی ہے کہ وہ جدیدیت اور روایت پرستی کے مختلف عناصر کا تجزیہ کریں اور ایسے عناصر کی بیخ کنی کریں جن کو وہ صالح سماج کے لیے خطرناک سمجھتی ہوں۔ ہندوستان جیسے ملک میں جہاں ایک نے زیادہ تہذیبیں ہیں یہ ضروری ہے کہ ان سب کی نشوونما اس طور پر ہو کہ ہر تہذیب آزادانہ ترقی کرکے اپنی معراج کو پہنچے۔

پروفیسر نہار رنجن رے نے اس افسوسناک صورت حال کی طرف توجہ دلائی کہ ہندوستانی یونیورسٹیاں اپنا آزادانہ ذہنی اور تہذیبی کردار نہیں بنا سکی ہیں جس کی اُن سے امید کی جاتی تھی۔ وہ علامتیں جو روحِ عصر اور روحِ تہذیب کی عکاسی کرتی ہیں یہاں ابھی وہی ہیں جو برطانوی عہد میں تھیں۔ ہماری یونیورسٹیاں ابھی مانگے کے اجالے پر جی رہی ہیں۔ علم و تہذیب کی توسیع کا کام کرنے میں وہ سراسر ناکام ہیں۔ اس کے علاوہ ہندوستانی یونیورسٹیوں میں ذہنی سرگرمیوں پر زیادہ زور دیا جاتا ہے اور جذبات کی تہذیب سے چشم پوشی کی جاتی ہے۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے یونیورسٹیوں میں معیار کے عام انحطاط سے بے اطمینانی کا اظہار کیا۔ اُن کے خیال میں یونیورسٹیوں کو چاہیئے کہ وہ طالب علموں کے ذہن سے ان تعصبات کو نکالیں جن کا وہ ایک غلط سماجی نظام میں شکار ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر گنگولی نے یوسف حسین صاحب کی اس رائے سے اتفاق کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ یونیورسٹیوں کا یہ فرض ہے کہ وہ مختلف فرقوں کی تہذیبی اقدار میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی شعوری کوشش کریں۔ یہ کام اس طرح بھی ہو سکتا ہے کہ ایک یونیورسٹی کا استاد کچھ دنوں دوسری یونیورسٹی میں پڑھائے۔

پروفیسر محمد مجیب نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے فرمایا کہ یونیورسٹیاں اقدار کی تراش خراش میں معاون ہو سکتی ہیں، کیونکہ ان کا کام صرف معلومات بہم پہنچانا نہیں ہے بلکہ اقدار کا تعین بھی ہے۔ ان کے خیال میں یونیورسٹی کا بھی ایک کردار ہونا چاہیئے اور افراد کا بھی۔ دونوں کی کشمکش سے بہتر اقدار سامنے آسکتی ہیں۔

پروفیسر مونس رضا اس خیال کے علمبردار تھے کہ یونیورسٹیوں کو ان طاقتوں کا ساتھ دینا چاہیئے

جو سماجی تبدیلیاں لانے کے لئے سرگرم عمل ہیں ۔ وہ ایک ایسا مرکز ثابت ہوں جو برسرِ اقتدار گروہ کی ہمنوائی سے گریز کرے اور جرأت انکار کی گرمی رکھتا ہو۔

سہ پہر کے اجلاس میں ان موضوعات اور مسائل کی مزید وضاحت کی گئی جو صبح کے اجلاس میں ابھر کر سامنے آئے تھے۔ اس اجلاس میں جناب بی آر، گرور، ڈاکٹر اظہر انصاری، پروفیسر ایس، سی شکلا، پروفیسر محمد عاقل اور دوسرے حضرات نے بحث میں حصہ لیا۔ ڈاکٹر سید عابد حسین نے اپنی صدارتی تقریر میں فرمایا کہ موجودہ صورت حال، نئی نئی آزادی، تازہ تازہ جمہوریت، پھیلتی ہوئی صنعتیت اور طبقاتی تنظیم میں برہمی کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ ان کے خیال میں ہندوستانی یونیورسٹیوں کا یہ کام ہونا چاہیئے کہ وہ اس انتشار کو ختم کرنے کی کوشش کریں اور مختلف علوم میں توازن قائم کریں تاکہ ایک بہتر، پرسکون اور پائدار سماج پیدا ہو سکے۔

تعلیمی اور علمی نمائشیں

جشن زریں کے موقع پر مختلف اداروں کی طرف سے نمائشوں کا بھی انتظام کیا گیا تھا۔ اس طرح کی نمائشیں ہر سال تعلیمی میلے کے موقعے پر کی جاتی ہیں۔ مگر اس مرتبہ ان کی تیاری پر خاص توجہ دی گئی تھی۔ بالخصوص کالج کی طرف سے ایک ایسی نمائش تیار کی گئی تھی جو اپنے موضوع اور مواد کے لحاظ سے بڑی اہم تھی۔ اس کا عنوان تھا "ہندوستانی تہذیب میں مسلمانوں کا حصہ"۔ یہ عنوان بہت وسیع ہے مگر نمائش میں صرف ان پہلوؤں پر زور دیا گیا جو تصاویر کے ذریعے دکھلائے جا سکتے تھے اور تصاویر تیار کرتے وقت اس کا پورا لحاظ رکھا گیا تھا کہ وہ مصدقہ ہوں۔ نمائش میں جو چیزیں پیش کی گئی تھیں ان کے ذیلی عنوانات حسب ذیل ہیں:

۱۔ فن تعمیر: مسلمانوں کے دور میں سب سے زیادہ فن تعمیر میں ترقی ہوئی۔ اس سلسلے میں محلات، قلعوں، مسجدوں، مقبروں اور باغات کی تصویریں پیش کی گئی تھیں۔ مشہور عمارتوں کی تصویروں کے ساتھ خاکوں اور نقشوں کے ذریعے عمارتی انجنیئرنگ کے خاص پہلوؤں کو

کو اجاگر کیا گیا تھا جو ہندوستانی فن تعمیر کے قدیم اصولوں سے مختلف تھے۔ مثلاً محراب، گنبد، مینار
چونے اور مسالے کے استعمال کو مسلمانوں نے رواج دیا اور یہ سب اضافے اُن کی عمارتوں کی ا
خصوصیات ہیں۔ پچی کاری، منبت کاری، پتھروں پر کندہ قرآنی آیات کے بہترین نمونے، طرح طر
کی پتھر کی جالیاں اور بیل بوٹے تزئین کاری کا اہم حصہ ہیں اور ان سب کو تصویروں میں بڑی خوب
سے پیش کیا گیا تھا۔

۲۔ مصوری: قدیم ہندوستانی مصوری کے بہترین نمونے ہمیں ایلورہ کے غاروں یا کھ
کے پتوں پر بنے ہوئے ملتے ہیں۔ مگر مسلمان اپنے ساتھ کاغذ لائے اور اس سے نہ صرف تحریر کے ز
میں اضافہ ہوا بلکہ مصوری کی ہیئت بدل گئی اور اس فن کو بڑی ترقی ہوئی۔ چنانچہ فن مصوری کے بہ
نمونے کتابی تصویروں کی شکل میں ملتے ہیں جس میں ایران اور ہندستان دونوں ملکوں کا کلاسیکی اد
شامل ہے مثلاً حمزہ نامہ، بابرنامہ، اکبرنامہ، رامائن، مہابھارت، انوار سہیلی (پنچ تنتر) وغیرہ
اس کے علاوہ مغلوں کے عہد میں شبیہ نگاری کو بھی بہت ترقی ہوئی اور نمائش میں ہر دور کے نمو
نمونے موجود تھے۔ شہنشاہوں سے لے کر خاص و عام کی صورتیں موجود تھیں۔

۳۔ سماجی زندگی: نمائش کا ایک حصہ مسلمانوں کی سماجی اور سوشل زندگی کے بعض مخص
پہلوؤں پر مشتمل تھا۔ مثلاً

الف۔ لباس: ہندوستان میں مسلمانوں کے آنے سے قبل سلے ہوئے لباس کا رواج
بالکل نہیں تھا۔ مسلمانوں نے نہ صرف سلے ہوئے کپڑوں کو رواج دیا بلکہ اس سلسلے میں نئے نئے ن
ایجاد کئے۔ سر سے لے کر پیر تک کے پہناوؤں کے مختلف نمونے اصلی تصویروں سے فوٹو لے
پیش کئے گئے تھے۔ مثلاً مختلف قسم کی پگڑیاں، دستار، جامے، قبا، پاجامے، شلوار، چغے، جو
جوتیاں وغیرہ۔ مردوں کے ساتھ خواتین کے لباس کی جھلکیں اور مغل پارچہ بافی کے بہترین نمو
بھی شامل تھے۔

ب۔ کھانے کے آداب: مختلف قسم کے کھانے اور طرح طرح کے ظروف بھی

کی ایجاد ہیں۔ شاید لوگوں کو جان کر تعجب ہو کہ کھانے کے وقت چمچے، چھری اور رومال جن کو ہم آج کی زبان میں نیپکن کہتے ہیں مسلمان استعمال کرتے تھے۔ اور یہ چیزیں ہمیں مسلمان شہنشاہوں کی تقریبات اور مہمان نوازیوں کے مناظر میں خاص طور سے نظر آتی ہیں

ج۔ تفریحات : اونٹ، ہاتھی، شکرے اور بازکی لڑائیاں، چیتوں اور بندوقوں کے ذریعے جانوروں کے شکار کو مسلمانوں نے رواج دیا۔ شکار کا ایک اور طریقہ قمرغہ تھا جس میں بہت بڑی تعداد میں لوگ کسی علاقے کو گھیر لیتے تھے اور بادشاہ شکار کرتا تھا۔

۴۔ اہم ٹیکنکی اضافے : عمارتوں کے علاوہ بعض اہم ٹیکنکی اضافے تھے جن کا ہندوستانی زندگی پر بہت اثر پڑا۔ مثلاً بارود کی بندوق، بارود کی توپ، گھوڑے کے لیے لوہے کی نعل، چرخہ، رہٹ، ریت گھڑی، گھوڑے کی رکاب اور کاغذ کا رواج مسلمانوں کا رہین منت ہے۔

یہ نمائش اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل منفرد اور معلومات کے لحاظ سے انتہائی مفید تھی۔ اس لئے جس کسی نے اس کو دیکھا بہت پسند کیا۔

مدرسہ ابتدائی میں چونکہ پروجکٹ (منصوبے) کا طریقہ رائج ہے، اس لئے نمائش کے معاملے میں وہ ہمیشہ پیش پیش رہتا ہے، اس مرتبہ مدرسہ نے خاص طور پر کوشش کی تھی کہ پہلی جماعت سے چھٹی جماعت تک ہر جماعت کوئی نیا منصوبہ بنائے تاکہ جشن زریں کی نمائش ، مدرسہ کا زیادہ سے زیادہ حصہ ہو۔ ان منصوبوں کی تفصیل حسب ذیل ہے :

جماعت اول : ہمارا گھر

〃 دوم : دنیا کے بچے

〃 سوم الف : ہماری تین اہم ضرورتیں (یعنی مکان، کپڑا اور غذا کے بارے میں ضروری معلومات دی گئیں)

〃 سوم ب : جامعہ کے یادگار لوگ

جماعت چہارم الف : منزل ایک، راہیں الگ الگ (یعنی مختلف مذاہب کا تقابلی مطالعہ کیا گیا)

" چہارم ب : جامعہ نگر کے جمادات، نباتات اور حیوانات

" پنجم الف : گاندھی جی

" پنجم ب : خلائی مہمیں

" ششم الف : ایجادوں نے کس طرح انسان کی زندگی بدلی

" ششم ب : آزادی کے ۲۲ سال

جامعہ کے یادگار لوگ پروجکٹ کی خاص بات یہ تھی کہ جامعہ کے بانیوں اور ممتاز اسا
کے علاوہ ان لوگوں کا بھی ذکر کیا گیا تھا، جو معمولی حیثیت کے مالک تھے، مثلاً ملازم، چپراسی او
معمولی استاد وغیرہ۔ ان کی خصوصیات بیان کرتے وقت کہا گیا تھا کہ "جامعہ کی بنیادوں میں معو
حیثیت کے لوگوں کا خون پسینہ شامل نہ ہوتا تو غالباً آج جامعہ کی یہ سر بفلک عمارتیں نہ ہوتیں
اور نہ بڑی شخصیتیں وجود میں آتیں۔"

مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین پر بھی ایک نمائش کی گئی تھی، جس میں ذاکر صاحب کی مختلف دور اور مختلف انداز کی تصویریں لگائی گئی تھیں، ان کی تصنیفات اور ان کے کچھ منتخب خطوط بھی نمائش کے لیے رکھے گئے تھے، ان کے علاوہ ان کے دفتر اور خواب گاہ کی تمام چیزیں جو ان کے استعمال میں تھیں اور وفات سے قبل جس ترتیب اور جس حالت میں یہ چیزیں، اسی طرح نمائش میں رکھی گئی تھیں۔ یہ نمائش خاص طور پر بہت پسند کی گئی۔

ان نمائشوں کے علاوہ نرسری اسکول، بالک ماتا سنٹر، مدرسہ ثانوی اور آرٹ انسٹی ٹیوٹ کے کاموں کی بھی نمائشیں کی گئی تھیں جن کی اپنی انفرادی خصوصیات تھیں جنھیں دیکھنے والو نے پسند کیا۔

...خبارات کے تاثرات

جامعہ ملیہ کی اس خوشی میں ملک کے اخبارات نے بھی شرکت کی، جشن زریں کے انعقاد سے
...لے اور انعقاد کے زمانے میں جامعہ کے بارے میں مضامین شائع کئے، اس کی خدمات کو سراہا اور
...بارکباد دی۔ ہندوستان ٹائمز کی خواہش پر پروفیسر محمد مجیب صاحب نے "جامعہ کے پچاس سال" کے عنوان سے
...ب مضمون لکھا تھا جو ہندستان ٹائمز کے عام ایڈیشن (مورخہ ۲۷ر اکتوبر) کے علاوہ اس کے بیرونی
...ایڈیشن میں بھی شائع ہوا تھا۔ یہ مضمون انگریزی کے متعدد اخبارات اور رسالوں نے نقل کر کے شائع
...ا۔ بہت سے اخبارات نے خود مضامین لکھے یا اپنے مخصوص نامہ نگاروں سے لکھوائے، جامعہ کی عمارتوں
...ور مختلف سرگرمیوں کی تصاویر لیں اور انھیں شائع کیا۔ اس سلسلے میں ہندستان ٹائمز کے علاوہ الٹریٹڈ
...یکلی (بمبئی) سیکولر ڈیماکریسی (نئی دہلی) اور یونیورسٹی نیوز (دہلی) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جشن
...زریں کی خبریں تو سبھی اخبارات نے نمایاں طور پر شائع کیں۔

اردو اخبارات سے جامعہ کا ہمیشہ سے گہرا تعلق رہا ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ انھوں نے اس موقع
...پر جامعہ کو یاد رکھا اور اپنے غیر مشروط تعاون سے جامعہ کے خادموں کو ممنون احسان کیا۔ ان
...اخبارات کی فہرست بہت طویل ہے، اس لئے ہم یہاں صرف ان اخبارات کا ذکر کرنا چاہتے ہیں
...جنھوں نے اس موقع پر طویل اداریے یا ادارتی شذرات لکھے ہیں۔ ہم ان اداریوں اور ادارتی
...شذرات کے اقتباسات بھی دینا چاہتے تھے، مگر افسوس کہ جگہ کی کمی کے باعث ہم اپنی اس
...خواہش کو پورا کرنے سے قاصر ہیں،

موقر روزنامہ "قومی آواز" (لکھنؤ) نے اپنی پہلی اور دوسری نومبر کی اشاعتوں میں دو قسطوں
...میں طویل اداریہ لکھا ہے اور ایک واقف کار کی حیثیت سے جامعہ کی خدمات اور اہمیت پر
...روشنی ڈالی ہے اور موجودہ شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب کی خدمات کا بھی اعتراف
...کیا ہے۔ اسی طرح جمعیۃ علماء ہند کے ترجمان روزنامہ "الجمعیۃ" نے ۳۱ر اکتوبر کے اداریے میں

کھل کر جامعہ کی تعریف کی ہے، اس نے کس قدر صحیح لکھا ہے کہ "یہ تعلیمی ادارہ ہندوستان کا واحد ادارہ ہے، جو مختلف تہذیبوں کا سنگم اور مختلف مذاہب کے اتحاد کی نمود ہے"۔ دلی کے مشہور ہفتہ وار اخبار "پیام مشرق" نے ۸ نومبر کی اشاعت میں ادارتی نوٹ لکھکر جامعہ کی خوشی میں شرکت کی اور بمبئی کے روزنامہ "ہندوستان" کے اداریہ مورخہ ۱۳ نومبر میں جناب ذاکر حسین فاروقی نے جامعہ کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے مخالفین جامعہ کو یہ احساس دلانے کی کوشش کی ہے کہ ان کا یہ فعل ملت کے مفاد کے خلاف ہے۔ ہفتہ وار "ندائے ملت" (لکھنؤ) نے اپنی ۵ اکتوبر کی اشاعت کو تمام تر جامعہ کے لیے وقف کر دیا اور پہلے امیر جامعہ حکیم اجمل خاں مرحوم، پہلے شیخ الجامعہ مولانا محمد علی مرحوم اور موجودہ شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب کے خیالات کے اقتباسات اور جامعہ کے بارے میں متعدد مضامین شائع کئے، ایک اداریہ بھی لکھا، جس میں اس نے اعتراف کیا کہ "جامعہ بلاشبہ مسلمانانِ ہند کے اہم ملی اداروں میں سے ہے"۔ مگر اسی کے ساتھ اس نے کچھ اعتراضات بھی کئے ہیں۔ جامعہ کے لوگوں نے مخالف تنقیدوں اور مخلصانہ مشورے کا ہمیشہ خیر مقدم کیا ہے، مگر وہی تنقید مفید ہوتی ہے جو حقیقت پر مبنی ہو اور وہی مشورہ قبول کیا جا سکتا ہے جو قابلِ عمل ہو۔ ہمیں افسوس ہے کہ "ندائے ملت" کے بیشتر اعتراضات غلط اطلاعات یا ناواقفیت پر مبنی ہیں، ایسی صورت میں اگر یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ یہ اعتراضات ملت کے مفاد کے خلاف ہیں۔ بہرحال جامعہ کی یہ روایت رہی ہے کہ مخالف اور موافق سبھی کی رایوں کا احترام کرتی ہے، امید ہے کہ آئندہ "ندائے ملت" میں جامعہ سے متعلق جو چیز چھپے گی وہ سنی سنائی باتوں کے بجائے صحیح معلومات پر مبنی ہوگی۔

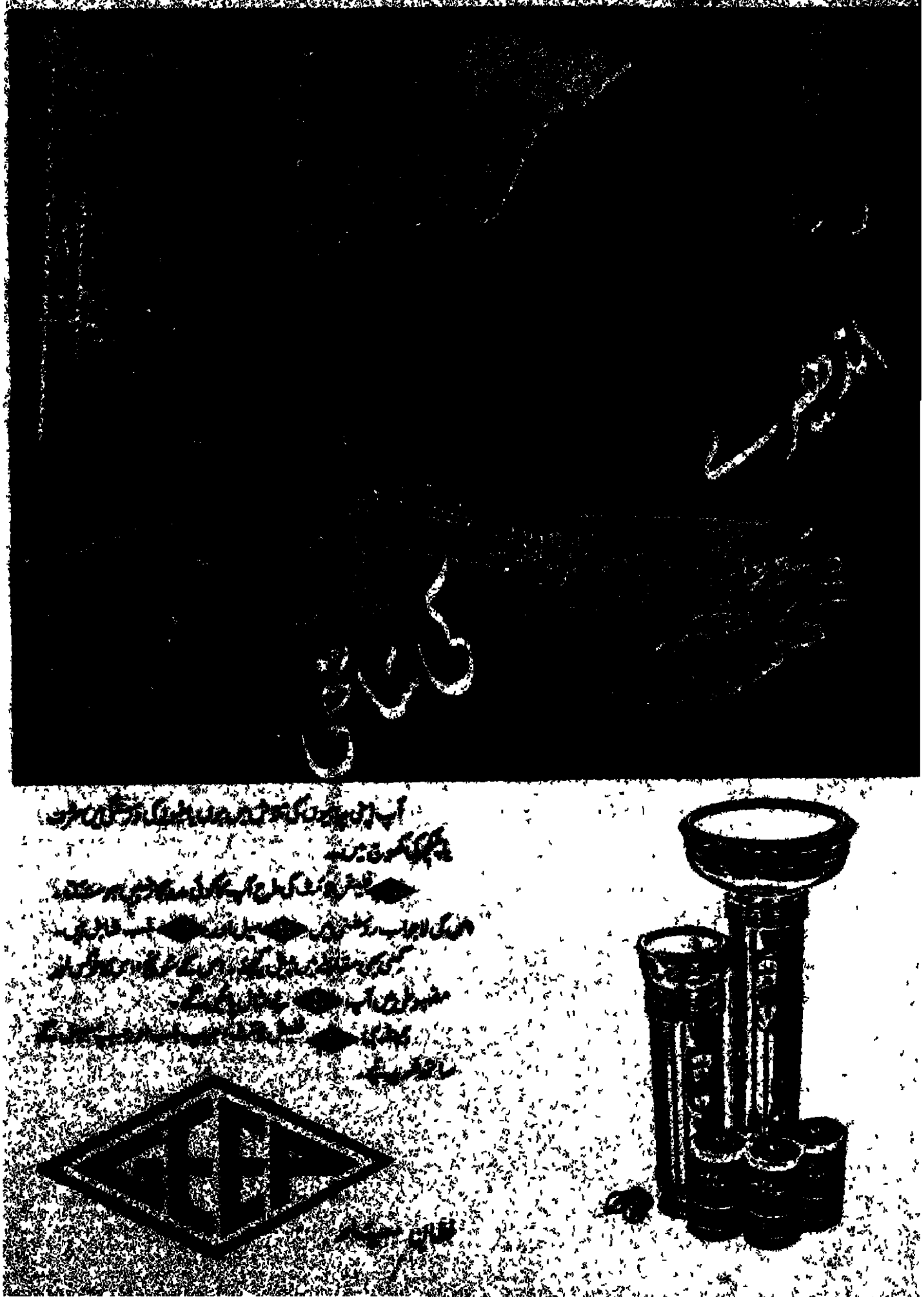
ہم آل انڈیا ریڈیو کے بھی ممنون ہیں کہ اس نے نہ صرف جشن زریں کی خبروں کو نمایاں طور پر نشر کیا بلکہ جامعہ پر کئی فیچر بھی نشر کئے۔

حکومت ہند نے جشن زریں کے موقع پر، ۲۹ اکتوبر کو جو جامعہ کے قیام کی تاریخ ہے ڈاک ٹکٹ جاری کیا تھا، جس کا فوٹو ابھی ہمیں نہیں مل سکا، ملے گا تو قارئین جامعہ کی واقفیت کے لئے ہم آئندہ اشاعت میں شائع کریں گے۔

Regd. No. D-[illegible] January, 1971

The Monthly JAMIA

JAMIA NAGAR, NEW DELHI-25



جامعہ

جامعہ ملّیہ اسلامیہ دہلی

جامعہ

سالانہ چندہ چھ روپے | قیمت فی پرچہ پچاس پیسے

جلد ٦٣ | بابت ماہ فروری سنہ ١٩٧١ء | شمارہ ٢

فہرست مضامین

خط و کتابت کا پتہ

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی — مطبوعہ: یونین پریس دہلی — ٹائیٹل: دیال پریس

"اک چراغ اور بجھا"

۲۲ جنوری کی صبح کو معلوم ہوا کہ رات میں شاہجہاں پور میں جہاں وہ ایک مشاعرہ کی شرکت کے
ہوئے تھے جناب روش صدیقی پر دل کا سخت دورہ پڑا اور ان کا انتقال ہو گیا، اناللہ وانا
ون، ہر چند کہ دل اس حادثہ کی تکلیف دہ اور افسوسناک خبر پر یقین کرنے کے لئے تیار نہیں تھا،
با یہ بات رہ رہ کر آتی تھی کہ وہ تو اچھے خاصے تھے، کبھی کسی عارضہ کا ذکر نہیں کیا، ہر حالت میں
ہنتے تھے اور بھرپور قہقہے ان کی شخصیت کا جزو تھے، ابھی کیسے اس دنیا کو خیرباد کہہ سکتے ہیں،
، بہ پے لوگوں نے یہ خبر دی اور ناچار اس خبر پر یقین کرنا پڑا۔ سوچتا ہوں، اہل وعیال سے
ریب الوطنی میں، جب دورۂ قلب کے ہیجان و اضطراب کے دوران کوئی لمحہ ایسا گذرا ہوگا کہ انھیں
یاد آئی ہوگی تو ان کے مضروب قلب پر کیا بیتی ہوگی، پھر کس طرح ان کے ایمان و ایقان نے
بنا کی خنک خنک، روح پرور کیفیت کی لذت انھیں بخشی ہوگی اور وہ شاداں و فرحاں اپنے
نے والے سے جا ملے ہوں گے، انھیں کا شعر ہے:

ایک پردہ ہے رنگ خاموشی ہم سخن جان کائنات سے ہوں

ناب شاہد عزیز روش صدیقی ۱۰ جولائی ۱۹۱۱ء کو جوالا پور (ضلع سہارن پور) میں پیدا ہوئے۔
الد ماجد مولوی خلیل احمد شاہد نے گھر ہی پر ان کی تعلیم کا انتظام کیا۔ ابتداً اردو اور فارسی
ں، پھر ہندی اور سنسکرت میں استعداد بہم پہونچائی اور بعد میں انگریزی سے بھی بقدر ضرورت واقفیت
والا پور گورو کل (کانگڑی) سے متصل ہے اور روش صاحب نے مجھ سے خود بیان کیا کہ ہندی اور
ں جو کچھ بھی انھوں نے حاصل کیا وہ گورو کل ہی کی دین تھی۔ شعر و سخن سے انھیں فطری مناسبت

تھی، جوالاپور کے مناظر فطرت کی آغوش میں اُن کی خداداد شعری صلاحیتیں پروان چڑھیں، انھیں اگر کسی
تلمذ تھا تو جوالاپور کے مناظر فطرت اور اپنے والد ماجد حضرت شاؔہد سے۔ قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ
کم سن ہی تھے کہ شعر کہنے لگے، کسی نے انھیں کے حوالے سے لکھا ہے کہ ان کی زندگی کے سب سے پہلے دو شعر یہ

یہ میرے ضبطِ محبت نے کی عجب تاثیر — کہ ان کو ضبطِ محبت کا حوصلہ نہ رہا
ہے روز میرے گریباں سے گفتگوئے رفو — بہار کے لئے کیا کوئی مشغلہ نہ رہا

روؔش صاحب نے غزلیں اور نظمیں دونوں لکھیں اور دونوں اصناف میں اُن کا مرتبہ و مقام
تھا، 'محرابِ غزل' میں اُن کی سب سے پرانی غزل ۱۹۲۴ء کی ہے، نظمیں بھی اُسی وقت سے ملک کے مشہور
جرائد میں شائع ہوتی اور رؔوش کی مقبولیت میں اضافہ کرتی رہیں، یہ حقیقت ہے کہ وہ اپنی نظموں کی وج
مشہور ہوئے لیکن اُن کی غزلیں بھی اربابِ فہم و دانش کے نزدیک خوبصورت اور معیاری ہیں اور بیا
ان میں فکر کی گہرائی اور تشبیہات و تراکیب کی گیرائی ایسی فنکارانہ ہم آہنگی کے ساتھ ملتی ہے کہ ان کا آہنگ
معلوم ہوتا ہے اور یہی وہ خصوصیت ہے جو اُن کے معاصرین میں کم کم ملتی ہے۔ ان کی وطنی و سیاسی نظم
الفاظ کا وہ گھن گرج، عبارت کا وہ زور شور اور لہجہ کا وہ طنطنہ نہیں جو جوؔش ملیح آبادی کی خصوصی
ہیں اُن کی ایسی نظموں میں وہ چیز ملتی ہے جو عام طور پر جوؔش کے یہاں نہیں پائی جاتی، یعنی ایک آفاقی ن
شعور کی پختگی، خیال کی رعنائی اور عزم کی متانت و سنجیدگی، یہی وجہ ہے کہ ان کی نظموں میں غضب کی تاثی
اور قاری کے دل و دماغ پر چھا جاتی تھیں۔ ان کی رومانی نظموں کی خصوصیت ان کا تغزل، ترنم اور ا
ساتھ ہی بعض معرکۃ الآرا نظموں میں خوش فکری اور خوش نظری بھی ملتی ہے اور اس لحاظ سے ان کی اکث
ہی قابلِ قدر ہیں۔ ذیل میں ہم ان کی دو نظموں کے ایک ایک بند نقل کرتے ہیں، ایک سیاسی ہے اور ایک

شمعِ آزادئ مشرق کو فروزاں کردیں
ایک لمحہ بھی نہیں گردشِ دوراں کا غلام
ایک ذرہ بھی نہیں مہرِ درخشاں کا غلام
ایک تنکا بھی نہیں صحنِ گلستاں کا غلام
کوئی انسان ہو پھر کیوں کسی انساں کا غلام
دہر کو جنتِ آزادیِ انساں کردیں

کس نے جھانکا ہے شفق رنگ جھروکے سے مجھے
صبح کے چاک گریباں کو خبر ہو شاید
زندگی فرش قدم بن کے بچھی جاتی ہے
آگہی حسرتِ دیدار ہوئی جاتی ہے
کیوں یہ پیشانیِ احساس جھکی جاتی ہے
حیرتِ عالم امکاں کو خبر ہو شاید

روشؔ صاحب کی شخصیت میں بڑی کشش تھی، میں نے ایسے اچھے شاعر بہت کم دیکھے ہیں جن میں دوست نوازی، وضعداری، منکسر المزاجی، دلدہی، دلداری، شرافت، تہذیب نفس اور مشرقی تہذیب کی قدروں کا بھرپور احترام جیسی قابل قدر خصوصیات پائی جاتی ہوں۔ بحیثیت شاعر وہ شاعری کی قدیم روایات اور صحتمند رجحانات کے حامل تھے، افسوس اُن کے انتقال سے ایک شریف انسان اور ادب کی ثقہ روایات کا ایک نمائندہ اٹھ گیا۔ وہ ایک متقی اور پرہیزگار انسان تھے، صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے اور کسی کی دل آزاری کو سخت گناہ تصور کرتے تھے، اُن کی زندگی اور معمولات پر تصوف اور اس کی جاندار و اعلیٰ قدروں کا بہت گہرا اثر تھا، ان کے کتابوں کے بیش قیمت ذخیرے میں تصوف اور صوفیائے کرام سے متعلق بڑی نادر کتابیں ہیں، ان میں سے بعض کتابوں کو تو انھوں نے بار بار پڑھا تھا اور ان کا جب ذکر کرتے تھے تو بڑے گہرے احساس سے کرتے تھے جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کی روحانی کیفیات کچھ اور ہیں، میں نے اُن میں خودداری اور مردانگی کے جوہر بہت کچھ دیکھے اور محسوس کیے، مصائب اور ناخوشگوار حالات میں جن کا ۱۹۴۷ء کے بعد انھیں گذشتہ تین چار سال سے دوسری بار سامنا تھا، راضی برضا اور ایک متصوفانہ احساس تشکر کے ساتھ خوش رہنا ان کا شیوہ تھا۔ یہ وہ وصف ہے جو اللہ کے خاص بندوں میں ملتا ہے۔

سیاسی خیالات کے اعتبار سے مرحوم بڑے راسخ العقیدہ نیشنلسٹ تھے، یہاں تک کہ صبر آزما حالات میں ایک لمحہ کے لئے بھی اُن کی نیشنلزم میں معمولی سی کمزوری نہیں آئی، ان کے ایک دوست شری پی، ایس، سیٹھی نے کہا ہے کہ "۱۹۴۷ء کے فسادات میں پنڈت پنت کے ایما پر میں جب مغربی اضلاع کا دورہ کر رہا تھا تو ایک دن مجھے اطلاع ملی کہ روشؔ صاحب کے قصبہ جلالپور پر فسادیوں نے حملہ کر دیا۔

میں وہاں پہونچا اور روش صاحب کو حیرت زدہ پایا۔ انھوں نے فرمایا کہ وہ یہ سمجھ نہیں پائے کہ ہندو مسلمان کیوں آپس میں لڑتے ہیں، اللہ کے بندے ہیں اور آپس میں محبت و آشتی سے رہنا چاہئے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ انھیں پاکستان جانے کے لئے مجبور کیا جا رہا ہے مگر وہ اپنے وطن (ہندستان) کو چھوڑنے کے لئے کبھی تیار نہیں ہوں گے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ انھیں پاکستان کے اعلیٰ حکام بڑے انعام و اعزاز دینے کے لئے تیار تھے لیکن روش صاحب نے پاکستان جانا گوارا نہیں کیا۔" برادر مکرم جناب قیصر زیدی صاحب فرماتے ہیں کہ "مئی ۱۹۳۸ء میں مسوری میں ایک مشاعرہ تھا، مشاعرہ میں ثاقب لکھنوی مرحوم، حکیم آزاد انصاری مرحوم، احسن مارہروی مرحوم، بیخود دہلوی مرحوم، شوکت تھانوی مرحوم کے علاوہ ملا صاحب، فراق، ساغر اور دیگر مشاہیر وقت کے ساتھ ایک آپ کا یہ غیر معروف ساتھی، شریک تھے، صدارت مرحوم سر سید سلطان احمد نے فرمائی تھی اور یہ مشاعرہ آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہوا تھا۔ ہم چند احباب کی فرمائش پر روش مرحوم نے اپنی نظم 'شمع آزادیِ مشرق کو فروزاں کردیں' پڑھی اور یہ نظم براڈکاسٹ بھی ہوئی، یہ وہ پہلی نظم ہے جو آل انڈیا ریڈیو سے آزادی کے سلسلے میں تمام کائنات میں نشر ہوئی۔" آزادی کے بعد بلکہ یوں کہئے کہ تقسیم ملک اور آزادی کے بعد، نیشنلسٹ مسلمانوں کی نیشنلزم پر بھی شبہ کرنے والا ایک طبقہ پیدا ہو گیا اور اس طبقہ کے بعض افراد کی سنگ دلانہ حرکت کی وجہ سے روش کو اکثر سخت قسم کی روحانی اذیتوں میں مبتلا ہونا پڑا، لیکن اس مرد حق بیں وحق آگاہ کے پائے ثبات میں ایک لمحہ کے لئے بھی لغزش نہیں پیدا ہوئی، ورنہ جوش ملیح آبادی کی طرح دنیوی منافع سے عارضی لطف اندوزی کے لئے وہ بھی کوئی عذر لنگ پیش کر کے سرحد اُس پار چلے جاتے۔ وہ یہیں رہے اور اسی ملک میں مرے، ایک آن کے ساتھ، ایک وقار کے ساتھ۔ اس کی پروا انھوں نے نہیں کی کہ ادیبوں اور شاعروں کی گٹ بندیاں اُن کے جائز مرتبے کو پہچاننے سے دیدہ و دانستہ گریز کرتی ہیں، قدیم کے 'افراطیے' اور جدید کے 'تفریطیے' اُن کی شاعری کی عظمت کو سمجھ نہیں سکے، ملک و قوم نے اُن کی پُرخلوص ادبی خدمات کی وہ قدر نہیں کی جس کے وہ مستحق تھے، لیکن اگر ایسا نہ ہو تو فقر و درویشی کی عظمت کسے یاد آئے!

فراغِ دل، سر و ساماں میں ڈھونڈنے والے
فراغِ بے سر و ساماں نہیں تو کچھ بھی نہیں (روش)

سعید انصاری

ہندوستان میں جدید تعلیم کی رفتار

تعلیمی دستاویزوں کی روشنی میں

ہندوستان میں تعلیم جدید کی تاریخ کوئی ڈیڑھ سو برس کی تاریخ ہے۔ اس مضمون میں ہم نے اسے بجائے اپنے لفظوں میں بیان کرنے کے مستند تعلیمی دستاویزوں کے ذریعہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ دستاویزیں کُل کی کُل نقل کرنے کی بجائے ہم نے اس کے صرف ضروری حصے لئے ہیں جس سے قارئین کو تعلیم جدید کی رفتار کا اندازہ ہو سکے گا۔ اس طرح یہ مضمون نہ صرف عام قارئین کے لئے دلچسپی کا باعث ہوگا بلکہ اردو میں جو لوگ ہندوستان کی تاریخ تعلیم کا غایر مطالعہ یا تحقیق کرنا چاہتے ہیں، ان کے لئے بھی مفید ہوگا۔ ہم نے اسے ۱۸۱۳ء کے آغاز سے لے کر آزادیِ ہند تک لاکر ختم کر دیا ہے جو ایک طرح سے اس کی پہلی قسط سمجھی جائے گی۔ آزادی ہند کے بعد سے دستور اساسی کی مجوزہ شکل میں تعلیم جدید کی رفتار نے جو رُخ اختیار کیا، اس کا ذکر دوسری قسط میں ہی آسکتا ہے۔

۱۸۱۳ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے جو اُس وقت ہندوستان کی سیاہ و سفید کی مالک تھی، سب سے پہلی بار ایک لاکھ روپے کی رقم اپنے سالانہ بجٹ میں اس غرض سے رکھی کہ اس سے "ہندوستان کے ادب کے دوبارہ احیاء و ترقی کا کام لیا جائے اور لائق ہندوستانیوں کی عزت افزائی کی جائے اور ہندوستان کے برطانوی علاقوں کے باشندوں میں سائنس کے علم کو رواج اور ترقی دی جائے"

اسی فیصلہ سے ہندوستان میں تعلیم جدید کی باضابطہ بنیاد پڑتی ہے اور اس تعلیم جدید کی غایت اور نوعیت متعین ہوتی ہے۔

اس فیصلہ کے مختلف پہلوؤں پر اگر آپ غور کریں تو بقولِ غالب

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برق کے خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

اِس فیصلہ میں جہاں ایک طرف "ہندوستانی ادب کے دوبارہ احیا روترقی" کا منصوبہ ملتا ہے، وہاں دوسری طرف "سائنس کے رواج و ترقی" کا ارادہ بھی ظاہر ہوتا ہے۔ گویا قدیم و جدید تعلیم کے امتزاج کی ایک بہترین شکل نظر آتی ہے۔

لیکن قدیم و جدید کے امتزاج کی یہ کوشش ایک چوتھائی صدی بھی نہ چلنے پائی تھی کہ حکومت کے سرکاری حلقہ میں دو گروہ بن گئے: ایک Orientalists کہلایا اور دوسرا Anglicists۔ اور اِن حامیانِ مشرقی علوم (Orientalists) اور حامیانِ انگریزی علوم (Anglicists) میں ایک باقاعدہ جنگ چھڑ گئی اور اس جنگ کا آخری فیصلہ تلوار سے نہیں گورنر جنرل کی ایگزیکیٹو کونسل کے لا ممبر لارڈ میکالے کے قلم سے ہوا جو تلوار سے بھی زیادہ تیز اور تو زیادہ مہلک ثابت ہوا اور ۱۸۳۵ء میں "حامیان انگریزی علوم" کی جیت ہوگئی۔ میکالے نے اپنی مشہور "یادداشت" میں ہندوستانی علوم اور تہذیب کے متعلق جو زہر اگلے ہیں، اس کے بعض حصے قابل ہیں۔ مثلاً ایک جگہ وہ لکھتا ہے کہ: "ایک اچھا یورپ کا کتب خانہ ہندوستان اور عرب تمام علوم و ادب سے کہیں بھاری ہے۔" اور پھر اس نے تعلیم جدید کے حق میں جو فیصلہ دیا ہے اس تعلیم کا جو مقصد قرار دیا ہے، وہ بھی سننے سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس جدید تعلیم کا سب سے بڑا مقصد یہ ہوگا کہ وہ ہندوستانیوں میں "ایک ایسا طبقہ پیدا کرے جو خون اور رنگ تو ہندوستانی ہوں، لیکن مذاق، خیالات، اخلاق اور ذہن انگریز کا رکھتے ہوں۔" بس ا ہماری تعلیم جدید کی بنیاد کھڑی ہوتی ہے:

خشتِ اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

١٨٥٤ء کا مراسلہ ووڈ : قدیم وجدید کا فیصلہ خواہ گورنر جنرل کی کونسل میں میکالے کے سحر نگار قلم نے ہی کر دیا ہو، لیکن اختلاف کی آگ دونوں ملکوں میں برابر سلگ رہی تھی۔ انگلستان میں عیسائی ریوں نے اس فیصلہ سے اپنے لئے عوام تک پہنچنے کا راستہ بند پایا۔ ہندوستان میں مشرقی زبان اور م کی طرف سے حکومت کی سرپرستی کا ہاتھ اٹھ جانے کی وجہ سے کافی احتجاج اور اظہار ناراضگی ہونے ۔ یہ صورت حال دیکھ کر پارلیمنٹ نے اپنی طرف سے ایک لایق افسر سر چارلس ووڈ کو تمام حالات کا زہ لینے اور تعلیم کو صحیح بنیاد پر قائم کرنے کے لئے بھیجا، جس نے ١٨٥٤ء میں ایک طویل یادداشت ب کی۔ یہ یادداشت اپنی جامعیت اور اہمیت کے لحاظ سے ہندوستان کی تاریخ تعلیم میں منشور ظم یعنی (Magna Carta) کہا جاتا ہے۔ اس کے تمہیدی الفاظ سے اس کی اہمیت کا کسی اندازہ ہو سکے گا۔ وہ لکھتا ہے کہ "ان اہم امور میں تعلیم سے زیادہ ہماری توجہ کا اور کوئی وع نہیں۔ یہ ہمارے ان مقدس فرائض میں سے ہے کہ ہم ہندوستان کے باشندوں کو، جہاں ارے امکان میں ہے، ان عظیم اخلاقی اور مادی برکتوں سے نوازیں جو اس مفید علم کی اعت سے حاصل ہوں گی اور جو، خدا نے چاہا تو ہندوستان کو انگلستان کے ساتھ تعلق صل ہو سکتا ہے...."

اب اس کے بعد مراسلہ میں تعلیم کے جو مقاصد قرار دیئے گئے ہیں، وہ بھی قابل غور ہیں:

١۔ ہندوستانی باشندوں کو ان وسیع اور مادی برکات سے مستفیض کرنا جو مغربی علوم کی ت سے حاصل ہوں گی

٢۔ نہ صرف اعلیٰ ذہنی صلاحیت پیدا کرنا بلکہ جو ان برکات کے حصول میں حصہ لیں گے، ان کے کردار کو بھی بلند کرنا۔

٣۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کو اپنے کاموں کے لئے معتبر اور لایق ملازمین بہم پہنچانا۔

۴۔ انگلستان کے لیے ان بہت سی اشیا کی فراہمی جو اس کی صنعتوں کے لئے ضروری ہیں
وہاں کی آبادی کے عام استعمال میں آتی ہیں، اور اسی کے ساتھ برطانوی مزدور کی اتھاہ مانگ
لئے کچھ سامان کی فراہمی۔"

ان مقاصد میں نہ صرف تعلیمی ترقی مقصود نظر آتی ہے بلکہ اس سے ان کی معاشی اور سیاسی
کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اب چند تعلیمی مسائل میں یادداشت کی سفارش بھی ملاحظہ ہوں:

"ذریعہ تعلیم: عام تعلیم میں جہاں ضرورت ہوگی، انگریزی سکھائی جائے گی، لیکن اسی
ساتھ دیسی زبانوں کی تعلیم پر بھی خاص زور دیا جائے گا۔ ہم انگریزی زبان اور ہندوستان کی دیسی
دونوں کو یورپی علوم کی اشاعت کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور ہماری خواہش ہے کہ دونوں ہندوستان
کے تمام اسکولوں میں ترقی کریں۔

گرانٹ اِن ایڈ: یہ بات کہ ہندوستان کے تمام لوگوں کے لئے سرکار ہی تعلیم کا ا
کرے، ناممکن سی معلوم ہوتی ہے، اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ ان لوگوں کی کوششوں میں بھی ہم ا
جو اپنے طور پر اس سلسلہ میں کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ ہم نے ارادہ کیا ہے کہ ہم ہندوستان میں بھی گرا
اِن ایڈ' یعنی مالی امداد کا طریقہ اختیار کریں جو ہمارے ملک میں بہت کامیاب ثابت ہوا ہے۔ ا
سے نہ صرف یہ کہ حکومت کا بار ہلکا ہوگا بلکہ لوگوں میں اعتمادِ نفس بھی پیدا ہوگا۔ اس بنا پر ہم یہ امید
ہیں کہ جتنے سرکاری اسکول ہیں، وہ ایک دن سب بند ہو جائیں گے یا پرائیویٹ جماعتوں کے
کر دیے جائیں گے اور حکومت صرف انھیں گرانٹ اِن ایڈ' دیتی رہے گی۔

"مدرسوں میں مذہبی تعلیم: سرکاری مدرسوں میں مذہبی تعلیم کی طرف سے بہت خوف کا ا
کیا جا رہا ہے یہ ادارے ہندوستان کے تمام لوگوں کے لئے قائم کئے گئے تھے اور اس لئے
لازم ہے کہ جو تعلیم ان میں دی جائے، وہ بالکل سیکولر ہو۔ ہمارا خیال ہے کہ انجیل اسکولوں
کالجوں کی لائبریری میں رکھی رہے اور طلبا چاہیں تو اس کا استعمال آزادی کے ساتھ کر سکتے ہیں
طلبا عیسائی مذہب کے بارے میں اپنے استادوں سے کچھ پوچھنا چاہیں تو پوچھ سکتے ہیں۔ یہ تعلیم

، سے بالکل رضا کارانہ ہوگی تاکہ لوگ یہ نہ سمجھیں کہ حکومت اپنا اثر مذہب کی اشاعت میں استعمال
ہی ہے بلکہ جو انسپکٹر معائنہ کے لئے وقتاً فوقتاً آئیں گے، وہ اس کا کوئی خیال بھی نہ کریں گے۔
استادوں کی تربیت : استادوں کی تربیت کے لئے مراسلہ نے اس طریقہ کے اختیار کرنے
نارش کی ہے جو انگلستان میں اُس وقت رائج تھا، یعنی جو استاد اس قابل سمجھے جائیں، انہیں
بلیفہ دیکر انتخاب کر لیا جائے اور مدرسہ کے اوقات کے علاوہ ان کی تربیت کا انتظام کر دیا
ئے۔ پھر بعد میں اگر وہ اس کے اہل ثابت ہوں تو انھیں نارمل اسکولوں میں مزید تربیت کے
لئے بھیج دیا جائے جہاں سے کامیابی پر انھیں سارٹیفکیٹ دیا جائے گا اور اس کے بعد پھر وہ
ل تنخواہ پا سکیں گے۔ ہماری خواہش ہے کہ استادوں کا پیشہ بھی ہندوستانی لوگوں کے لئے
ہی ترغیب دہ ہو جیسے اور سرکاری ملازمتوں کے کام۔

عورتوں کی تعلیم : عورتوں کی تعلیم کی اہمیت ہمارے نزدیک کسی طرح کم نہیں۔ یہ دیکھ کر
بڑی خوشی ہوتی ہے کہ بہت سے لوگوں میں اپنی لڑکیوں کو اچھی تعلیم دلانے کا شوق پایا جاتا ہے۔
، یہ بھی دیکھ کر اطمینان ہوتا ہے کہ لڑکیوں کے اسکول بھی گرانٹ اِن ایڈ کی اسکیم میں شامل ہیں۔
ر جنرل اِن کونسل نے بھی اس کے ساتھ اپنی پوری ہمدردی کا اظہار کیا ہے۔

یونیورسٹیوں کا قیام : ہندوستان کے لوگوں میں لبرل تعلیم کی تیزی کے ساتھ توسیع، سرکاری
وں میں ہندوستانی طلبا کی اعلیٰ کامیابی، میڈیکل کالجوں میں ہندوستانی طلبا کی شمولیت اور پھر یورپین
اینگلو انڈین آبادی کی کثرت سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ہندوستان میں اب یونیورسٹیوں کے
ا کا وقت آگیا ہے۔ یہاں بھی آپ دیکھیں گے کہ یونیورسٹیوں کے قیام میں جس مفاد کو پیش نظر رکھا
ہے وہ عام جمہوری مفاد نہیں ہیں بلکہ اعلیٰ طبقہ کے طلبا اور اس سے زیادہ یورپین اور اینگلو انڈین
ڑھتی ہوئی آبادی کا خیال ہے۔

ٹر کمیشن ۱۸۸۲ء :

قارئین کو یاد ہوگا کہ ۱۸۳۵ء میں میکالے کے سحر نگار قلم نے مشرقی زبانوں اور علوم کی تعلیم
سرے سے خاتمہ کر دیا تھا اور خالص انگریزی زبان اور علوم کی تعلیم کو ہندوستان کی تعلیم کا مقصد
بنایا تھا۔ پھر دوسری بات بعد کی دستاویز یعنی مراسلہ ووڈ ۱۸۵۴ء میں یہ طے پائی تھی کہ صرف "ا
طبقہ کی تعلیم کا انتظام کیا جائے اور یہ خیال کیا گیا تھا کہ اعلیٰ طبقہ سے تعلیم کا اثر عوام تک بھی پہنچے"
اور اس طرح تعلیم میں ایک "تقاطر" کا عمل کارفرما ہوگا اور تیسری بات یہ کہ تعلیم کو تمام تر سیکولر رکھا جا
اور مدرسہ کے اوقات میں سرکاری سرمایہ سے مذہبی تعلیم کا انتظام نہ ہوگا۔

لیکن اس دوران میں ایک اور بہت بڑا سیاسی واقعہ پیش آیا، یعنی ۱۸۵۷ء میں کمپنی کی
صد سالہ عہد حکومت سے تنگ آکر تمام ہندوستان میں تقریباً ایک عام بغاوت کی لہر دوڑ گئی تھ
بڑی مشکلوں سے دب سکی اور اس کے نتیجہ میں ہندوستان کی عنان حکومت کمپنی کے ہاتھوں سے نکل
تاج برطانیہ کے ہاتھ میں آگئی اور ایک شاہی اعلان کے ذریعہ تعلیم کے کلیتاً سیکولر ہونے، عام
رواداری اور عوامی تعلیم کی پالیسی اختیار کی گئی۔

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

ہنٹر کمیشن ۱۸۸۲ء :

اس بنا پر لارڈ رپن وائسرائے ہند نے ۱۸۸۲ء میں سب سے پہلا کمیشن مقرر کیا،
صدر ڈبلو، ڈبلو ہنٹر کے نام پر "ہنٹر کمیشن" کے نام سے مشہور ہے۔ اس کمیشن کا سب سے بڑ
یہ تھا کہ عوام کی تعلیم پر توجہ دی جائے اور "ابتدائی تعلیم پر خصوصیت کے ساتھ غور کیا جائے ا
کے لئے ایسے ذرائع اختیار کئے جائیں جس سے سلطنت برطانیہ کے تمام حدود میں اس کی تو
ہو سکے" اور اس سلسلہ میں اس کی بعض سفارشات ملاحظہ ہوں :

دیسی تعلیم : یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ دیسی مدرسے مقابلتاً خراب ہیں، ہمارا خ

ی حوصلہ افزائی کرنے کی کوشش کی جانی چاہئے۔ انھوں نے زمانہ کا سخت مقابلہ کیا ہے اور یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ ان میں قوت ہے اور انھیں قبول عام بھی حاصل ہے۔

ابتدائی تعلیم : اگرچہ تعلیم کی ہر شاخ کو ریاست کی سرپرستی کا حق حاصل ہے لیکن ملک کے موجودہ حالات کے پیش نظر یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ عوام کی ابتدائی تعلیم، اس کا انتظام، توسیع ور ترقی کو اس نظام تعلیم کا ایک جزو بنایا جائے جس کے لئے ریاست کی تمام کوششیں پہلے سے تیز تر ہونی چاہئیں اور یہ کہ ابتدائی تعلیم اس پورے نظام تعلیم کا ایک جزو ہو جس پر مقامی آمدنی کا کل حصہ اور صوبائی آمدنی کا بڑا حصہ صرف ہوتا ہے۔

استادوں کی تربیت : استادوں کی تربیت سے متعلق کمیشن نے یہ سفارش کی کہ نارمل اسکول خواہ سرکاری ہوں یا امدادی، وہ اس طرح کھولے جائیں کہ تمام ابتدائی مدرسوں کی ضرورت کے لئے کافی ہوں اور صوبائی خرچ جو پرائمری تعلیم کے لئے ہو، اس میں ڈائرکٹر، انسپکٹر اور نارمل اسکولوں سے متعلق اخراجات سب سے زیادہ مقدم سمجھے جائیں۔

انتظام : کمیشن کا خیال ہے کہ اگر دیسی تعلیم ہندوستانی لوگوں کے ہاتھ میں دیدی جائے تو ڈسٹرکٹ بورڈ اور لوکل بورڈ کے ہندوستانی ممبران اس سے زیادہ دلچسپی کا اظہار کرسکیں گے۔ لیکن اسی کے ساتھ اس نے یہ شرط بھی لگادی کہ ان کی امداد کا دارومدار ان کے امتحان کے نتایج پر ہوگا۔ یہ ناخوشگوار شرط آگے چل کر لارڈ کرزن کے عہد میں ختم کر دی گئی۔

ثانوی تعلیم : ثانوی تعلیم کے بارے میں کمیشن نے یہ سفارش کی کہ کم سے کم ہر ضلع میں ایک نمونہ کا ہائی اسکول قائم کیا جائے۔ کمیشن نے ثانوی تعلیم سے متعلق ایک اہم سفارش بھی کی اور وہ یہ کہ ہائی اسکول کی اعلیٰ جماعتوں میں تعلیم کے دو حصے کر دیے جائیں: ایک یونیورسٹی کے انٹرنس امتحان ختم ہو اور دوسرا حصہ ایسے مضامین پر مشتمل ہو جس سے طلبا کاروباری اور عملی زندگی میں شریک ہیں۔

نجی کوششیں اور مشنری جماعتیں : تعلیم کے سیکولر کر دینے سے عیسائی مشنریوں نے اپنے لئے

تعلیم کا میدان تنگ پایا۔ اور انگلستان کے حلقہ حکومت پر انھوں نے اپنا گہرا اثر ڈالا اور انھیں اجازت مل گئی، لیکن ہندوستان کی رائے عامہ اور سیاسی مصلحت کچھ اس کے حق میں نہ تھی، اس لئے کمیشن نے نہایت صاف لفظوں میں اپنی پالیسی کا اعلان کیا اور اس بات کی وضاحت کر دی کہ کوششوں سے مراد جس کی ہمت افزائی مقصود ہے، خود ہندوستان کے لوگ ہیں۔ نجی جماعتوں میں خود ہندوستانی سب سے اہم جماعت سمجھے جانے چاہئیں۔ ایک ایسے ملک میں جیسا کہ ہندوستان ہے کسی ایک جماعت کے ہاتھ میں اعلیٰ تعلیم نہیں دیدینا ہے، اور خاص کر ایسی جماعت کے ہاتھ میں جو برخ کر نیا من اور کام کی لگن رکھتی ہو، پھر بھی تمام معاملات میں وہ عوام کے ساتھ ہمدردی کا اظہار نہیں کر سکتی ہے۔ اسی کے ساتھ ہماری متفقہ رائے ہے کہ براہِ راست سرکاری انتظام مشنری جماعتوں کے حق میں نہیں دیا جا سکتا ہے اور اچھے قسم کے سرکاری ادارے مشنریوں کے انتظام میں منتقل نہیں کر دیئے جانے چاہئیں۔"

اعلیٰ تعلیم: کمیشن نے اعلیٰ تعلیم پر کوئی خاص سفارش نہیں کی، اس لئے کہ اس کے حدود میں ہندوستان کی یونیورسٹیوں کی تحقیقات کا مسئلہ شامل نہ تھا۔

انڈین یونیورسٹیز کمیشن ۱۹۰۲ء:

پورے ۲۰ سال گزر جانے کے بعد اب ضرورت محسوس ہوئی کہ اعلیٰ تعلیم کے مسائل اور یونیورسٹیوں کی کارکردگی پر بھی غور کیا جائے۔ نیز اس صدی کے شروع میں سیاسی حالات بھی کچھ ایسے پیدا ہوئے جس سے یونیورسٹیوں کے معاملات پر غور کرنا ضروری ہو گیا، اور یہ فخر ہندوستان کے بیدار مغز وائسرائے لارڈ کرزن کے عہد کو نصیب ہوا کہ ایک کمیشن "یونیورسٹیوں کے حالات کی تحقیقات، ان کے معیار تعلیم بلند کرنے اور علوم و فنون کی ترقی کی غرض سے مقرر کیا گیا" جس کی چند بڑی بڑی سفارشات حسب ذیل ہیں:

۱۔ یونیورسٹیوں کے انتظام کی دوبارہ تنظیم اور ان کے علاقائی حدود کا تعین۔

۲۔ یونیورسٹی کے ملحقہ کالجوں کی باقاعدہ نگرانی اور الحاق کی شرائط میں سختی۔

۳۔ طلبا کے قیام اور تعلیم کی طرف مزید توجہ اور ان کے لئے لائبریری وغیرہ کی سہولتوں کا بہم پہنچانا۔

۴۔ نصاب تعلیم اور طریقہ امتحان میں تبدیلیاں

۵۔ یونیورسٹی کا سب سے مقدم فرض جائز حدود کے اندر رہ کر تعلیم کا انتظام کرنا۔

ان سفارشات سے یونیورسٹی کے انتظامات اور اس کی تعلیم کی اصلاح و ترقی پر کافی روشنی پڑتی ہے اور ان سے جہاں ایک طرف عام تعلیم کی اصلاح، نصاب میں تبدیلی اور طریقہ امتحان کی درستی کا اندازہ ہوتا ہے، وہاں دوسری جانب طلبا کے قیام اور ان کی دوسری تعلیمی سہولتوں کی فراہمی کا بھی پتہ چلتا ہے۔

نیشنل کونسل آف ایجوکیشن

بیسویں صدی کے آغاز میں انگریزی حکومت اور انگریزی تعلیم کے اثر سے ایک طبقہ ایسا ہو گیا تھا جو اس جدید تعلیم میں ایک قومی اور ہندوستانی رنگ دینا چاہتا تھا، تاکہ اس سے آئندہ بالنوں کے دماغ ان مضر اثرات سے پاک رہیں اور وہ ایک سچے ہندوستانی اور بہتر محب وطن ہو سکیں۔ اس کے لئے بنگال میں ایک نیشنل کونسل آف ایجوکیشن قائم ہوئی۔ اس قومی مجلس تعلیم نے کام تین حصوں میں تقسیم کیا:

۱۔ کلکتہ میں ایک نمونہ کے کالج کا قیام

۲۔ قومی مدارس کی تنظیم کا کام

۳۔ بنگال کے باہر اس روح کو پھیلانا۔

اس قومی تعلیم کے دو بڑے مقصد قرار دیے:

۱۔ دیسی زبانوں کے ذریعہ تعلیم اور انگریزی بہ طور ایک لازمی مضمون کے۔

ب ۔ دیسی زبانوں میں درسی کتابوں کی تیاری۔

پھر اس کے علاوہ اور مقاصد جو پیش نظر رکھے گئے، وہ یہ تھے :

۱۔ جسمانی اور اخلاقی تعلیم کا انتظام، نیز مذہبی تعلیم جس کے لئے علیحدہ سے سرمایہ کا انتظام کیا جائے۔ اور طلبا میں ملک سے صحیح محبت اور خدمت کا حقیقی جذبہ پیدا کیا جائے۔

۲۔ ملک کی تاریخ، ادب اور فلسفہ کے حصول کی اہمیت جتانا، اور مشرقی خیالات اور زندگی کے ساتھ مغرب کے بہترین مقاصد کو سمونا۔

۳۔ سائنس اور صنعت و حرفت کی تعلیم میں سائینٹیفک اور ٹکنیکل پہلوؤں پر زور دینا، جس سے ملک کے مادی وسائل میں ترقی ہو سکے اور اس کی اشد ضرورتیں پوری ہو سکیں۔

اس نئی قومی تعلیم کی چند خصوصیات بھی ملاحظہ ہوں :

۱۔ طلبا کی ذہنی اور اخلاقی تربیت اس طرح کی جائے جس سے اعلیٰ مقاصد کے مطابق ان کی سیرت کی تشکیل ہو۔

۲۔ دیسی زبانوں کے ذریعہ اس نے تعلیم کو آسان بنا دیا ہے اور کلکتہ یونیورسٹی کے سات سال کے نصاب کو اس کے ذریعہ پانچ سال کے اندر پورا کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ اس کے ماتحت تمام جماعتوں میں صنعتی تعلیم لازمی قرار دی گئی اور کالج میں اس کا ایک مخصوص نصاب رکھا گیا۔

۴۔ ہندوستان کی تاریخ، فلسفہ، معاشیات، سیاسیات اور دیگر علوم میں ریسرچ اور تحقیقات کا انتظام کیا گیا۔

۵۔ تعلیم میں مشاہدہ پر زیادہ زور دیا جانے لگا اور الفاظ اور جملوں کی تعلیم کی بجائے بچے کے لئے اشیاء اور خیالات کے علم پر زیادہ زور دیا جانے لگا۔

گوکھلے کی قرارداد بابتہ لازمی تعلیم ۱۹۱۰ء

اب ہندوستان میں اتنی سیاسی بیداری پیدا ہو گئی تھی کہ لوگ تعلیم کا بطور ایک حق کے

کر سکیں۔ بمبئی کی لیجسلیٹو کونسل میں ہندوستان کے ایک بڑے سیاسی مدبر مسٹر گوکھلے آنجہانی نے سب سے پہلی بار ابتدائی تعلیم کو لازمی قرار دیے جانے کی تجویز پیش کی، جو اگرچہ دس روز کی گرماگرم بحث کے بعد مسترد کر دی گئی، پھر بھی تجویز میں جو دلیلیں اور نظیریں پیش کی گئیں، وہ قابل غور ہیں۔ قرارداد کے الفاظ حسب ذیل ہیں:

"یہ کونسل اس بات کی سفارش کرتی ہے کہ ملک بھر میں ابتدائی تعلیم لازم اور مفت کرنے کی طرف قدم اٹھایا جائے اور اس کے لئے متعین تجاویز مرتب کرنے کے لئے جلد سے جلد سرکاری اور غیر سرکاری افسران کا ایک ملا جلا کمیشن مقرر کیا جائے۔"

اس مسودہ قانون کا مقصد یہ تھا کہ "ملک کی ابتدائی تعلیم کے نظام میں 'لازمی' کا اصول بتدریج کئے جانے کا انتظام کیا جائے۔" اور اس کی تعمیل کا انحصار اس پر ہے کہ لازمی تعلیم جہاں کہیں بھی شروع کی جائے حکومت کس قدر بار اٹھانے کے لئے تیار ہوگی۔ چنانچہ اس کے لئے دلیلیں دی گئیں کہ چونکہ انگلستان میں ابتدائی مدرسوں پر پارلیمنٹری گرانٹ کے تمام خرچ کا دو تہائی حصہ ہوتا ہے، اسکاٹ لینڈ میں اس سے زیادہ ہوتا ہے اور آئرلینڈ میں عملاً پورا خرچ دیا جاتا ہے، اس لئے ہم ہندوستان میں پورے خرچ کا صرف دو تہائی حصہ مانگنے کے لئے حق بجانب ہوں گے جو حکومت کو برداشت کرنا چاہئے۔

ہندوستان کی تعلیمی پالیسی پر حکومت ہند کا رزولیوشن ۱۹۱۳ء:

لازمی تعلیم کا مسودہ ۱۰ دن کی گرماگرم بحث کے بعد نامنظور ہونے کو تو ہو گیا، لیکن اس کا یہ ہوا کہ حکومت ہند نے ہندوستان کی عام تعلیمی پالیسی پر ۱۹۱۳ء میں ایک قرارداد منظور کی جس کی رو سے اس نے ہندوستان میں ابتدائی تعلیم کی توسیع و ترقی کے لئے جو کچھ ہو سکتا تھا، وہ سب کیا۔ رزولیوشن کی بعض شقیں حسب ذیل ہیں:

۔ لوئر پرائمری اسکولوں میں کافی توسیع ہونی چاہئے اور ان میں لکھنا، پڑھنا اور حساب

کے ساتھ ساتھ ڈرائنگ، گاؤں کے نقشہ کا علم، مطالعہ فطرت اور تربیت جسمانی بھی شامل ہونا چاہئے
۲۔ اسی کے ساتھ اپر پرائمری اسکول مناسب جگہوں پر کھولے جائیں اور ضرورت ہو تو لوور پرائمری اسکولوں کو اپر پرائمری اسکول بنا دیا جائے۔
۳۔ پرائیویٹ امدادی اسکولوں کی جگہ لوکل بورڈ کی طرف سے اسکول قائم کئے جائیں۔
۴۔ مکتبوں اور پاٹھ شالاؤں کو کافی امداد دینی چاہئے۔
۵۔ پرائیویٹ اسکولوں کا انتظام اور معائنہ اور بہتر ہونا چاہئے۔
۶۔ ہندوستان کے بیشتر حصوں میں اگرچہ دیہی اور شہری اسکولوں کے لئے الگ الگ نصاب ممکن نہ ہوں لیکن شہری اسکولوں میں جغرافیہ کی تعلیم اور بچوں کو تعلیمی سیر (ایکسکرشن) وغیرہ پر لے جانے کی کافی گنجائش ہے۔

پھر اس کے علاوہ استادوں کی تعلیم اور ٹریننگ کی طرف بھی کافی توجہ دی گئی ہے:
۷۔ استاد کم سے کم مڈل امتحان پاس ہونے چاہئیں اور ان کے لئے ایک سال کی ٹریننگ بھی ضروری ہے۔
۸۔ پرائمری تعلیم کے استادوں کے لئے چھٹیوں میں ریفریشر کورس کا انتظام ہونا چاہئے۔
۹۔ ایک ٹرینڈ استاد کی تنخواہ ۱۲ روپے (اس وقت کے) ماہانہ سے کم نہ ہونی چاہئے۔ علاوہ اس کے ان کی سالانہ ترقی، پراویڈنٹ فنڈ اور پنشن کا بھی انتظام ہونا چاہئے۔
۱۰۔ ایک استاد کے ماتحت طالب علموں کی تعداد ۲۰ اور ۴۰ کے درمیان ہونی چاہئے۔
۱۱۔ مڈل اور سکینڈری ورناکیولر اسکولوں کی حالت اور بہتر ہونی چاہئے اور ان کی تعداد میں بھی اضافہ ہونا چاہئے۔
۱۲۔ اسکول صحت مند، فراخ لیکن کم خرچ عمارتوں کے اندر ہونے چاہئیں۔
۱۳۔ عورتوں کی تعلیم پر بھی بہت زیادہ توجہ کی ضرورت ہے۔
۱۴۔ ریاست کو ثانوی تعلیم سے بالکل ہی ہاتھ نہیں کھینچ لینا چاہئے، لیکن مزید سرکاری

ادارے نہ قائم کرنے چاہئیں۔

۱۵۔ اس رزولیوشن میں یونیورسٹی تعلیم کی توسیع کی بھی سفارش کی گئی اور ۵ یونیورسٹیاں اور ۱۸۵ کالج ملک کی ضروریات کا خیال کرتے ہوئے کم بتائے گئے۔ یونیورسٹیوں کو ہائی اسکولوں کے رکگنی شن کے بارے سبکدوش کر دیا گیا اور انھیں صوبائی حکومتوں کے ماتحت کر دیا گیا۔

کلکتہ یونیورسٹی کمیشن، ۱۹۱۷ء :

اوپر ہندوستان کی تعلیمی پالیسی پر حکومت ہند کی قرار واد دی گئی ہے جس سے ہندوستان کی ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے متعلق بہت سی تجویزیں ملیں گی، بالخصوص انتظامی امور سے متعلق جو اس سے پہلے نظر نہیں آئی ہیں۔ اب یونیورسٹی کی تعلیم کا مسئلہ رہ گیا تھا، اس کے لئے حکومت ہند نے ۱۹۱۷ء میں ایک رزولیوشن پاس کیا جس کی رو سے ایک کمیشن کا تقرر عمل میں آیا جو اپنے صدر کے نام پر سیڈلر کمیشن مشہور ہے۔ کمیشن کا اصل مقصد حکومت ہند کے لفظوں میں کلکتہ یونیورسٹی کے حالات کی تحقیق اور ان مسائل کے متعلق جو اس سے پیدا ہوں، ایک تعمیری پالیسی کی تشکیل" تھا۔ ۱۷ مہینوں کی محنت کے بعد کمیشن نے ثانوی، کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم سے متعلق ایک جامع رپورٹ پیش کی اور اس بات پر خصوصیت سے زور دیا کہ یونیورسٹی کی تعلیمی اصلاح کے لئے ثانوی تعلیم میں اصلاح و ترمیم کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ اس اعتبار سے اس کی بعض بعض تجویزیں ملاحظہ ہوں :

۱۔ انٹرمیجیٹ کی کلاسیں یونیورسٹی سے علیحدہ کر دی جائیں اور ایک تین سال کا بی۔ اے کی ڈگری کے لئے الگ نصاب بنایا جائے اور داخلہ کا معیار میٹرک نہیں، انٹرمیجیٹ رکھا جائے۔

۲۔ اس حصہ کی تعلیم کے لئے انٹرمیجیٹ کالج قائم کئے جائیں جن میں آرٹس اور سائینس کے تمام مضامین کی تعلیم کا انتظام ہو۔

۳۔ ہر صوبہ میں ایک علیحدہ ہائی اسکول اور انٹرمیجیٹ بورڈ بنایا جائے جو ثانوی تعلیم کا انتظام

کرے۔

۴۔ کمیشن نے انٹرمیجیٹ کالجوں میں مادری زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کی سفارش کی ہے۔
لیکن یہ کمیشن اصل میں کلکتہ یونیورسٹی کے معاملات کی اصلاح کے لیے مقرر کیا گیا تھا، اس لے
کر اس یونیورسٹی میں طلبا کی تعداد اور ملحقہ کالجوں کی تعداد دونوں بہت زیادہ ہوگئی تھی جو ایک
یونیورسٹی کے قابو سے باہر تھی۔ اس سلسلہ میں کمیشن نے تین تجویزیں پیش کیں :

۱۔ ڈھاکہ میں تعلیم کی اور اقامتی یونیورسٹی ہونی چاہیئے۔

۲۔ کلکتہ یونیورسٹی میں تعلیم کے وسائل اس طرح منظم کئے جائیں کہ یہ حقیقی معنوں میں ایک اعلیٰ تعلیم کی یونیورسٹی ہو جائے۔

۳۔ مفصلات کے کالجوں کی تنظیم اس طرح ہو کہ آگے چل کر متعدد یونیورسٹی مرکز بن سکیں۔

یونیورسٹی کے اندرونی انتظامات کے لئے کمیشن نے چند نئی تجویزیں پیش کی ہیں جو حسب ذیل ہیں :

۱۔ یونیورسٹی کے اندرونی انتظامات کے لئے سینیٹ کی بجائے ایک نمائندہ کورٹ اور سنڈیکیٹ کی بجائے ایک مختصر مجلس انتظامیہ ہو۔

۲۔ تعلیمی معاملات کے فیصلہ کے لئے ایک مجلس تعلیمی اور بورڈ آف اسٹڈیز ہونا چاہیئے۔

۳۔ ایک مستقل تنخواہ یاب وائس چانسلر ہونا چاہیئے۔

۴۔ مسلمان چونکہ تعلیم جدید میں پیچھے ہیں، اس لیے ان کو ہر طرح کی تعلیمی سہولتیں دی جانی چاہئیں۔

۵۔ لڑکیوں کے لئے ۱۵ یا ۱۶ برس کی عمر تک 'پردہ اسکول' ہونے چاہئیں۔

اس کمیشن نے ایک خاص بات اور کی اور وہ یہ کہ اس نے دیسی زبانوں کی تعلیم پر بہت زور دیا اور یہ کہا کہ ایک ایسے نظام تعلیم میں کوئی خرابی ہوگی جس میں طلبا تعلیم ختم کرنے کے بعد اس قابل نہ ہوں کہ وہ اپنی مادری زبان نہ صحیح اور اچھی طرح بول سکیں اور نہ لکھ سکیں، لہٰذا

ں کوئی دو رائے نہیں کہ ثانوی مدارس، انٹرمیجیٹ، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں دیسی زبانوں
بم کی خاص طور پر کوشش کرنی چاہیئے اور ایم۔ اے کے امتحان میں ان ہندوستانی زبانوں
تیدی، تاریخی اور تقابلی مطالعہ کی جو ایک جامع اسکیم یونیورسٹی نے بنائی ہے، اس کے لئے بنیاد مضبوط
ضروری ہے تاکہ اس کی تکمیل کے بعد بنگال میں ایک ایسے ادب کا نشو و نما ہو سکے جو یہاں کے
،کی تہذیب اور عظمت کا ضامن ہو۔

وگ کمیٹی، ۱۹۲۹ء :

۱۹۲۹ء میں ایک کمیشن کی بجائے ہارٹوگ کمیٹی ملک کی تعلیمی ضرورتوں کا جائزہ لینے کے لئے مقرر
اور اس عرصہ میں حالات میں جو تبدیلیاں ہوئیں، جس کے نتیجہ کے طور پر اس کمیٹی کے تقرر کی ضرورت
ئی، اس کا ذکر اس نے اپنی رپورٹ میں ان لفظوں میں کیا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ "اس عرصہ میں
، مدارس کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے، اسی طرح لڑکیوں کی تعلیم کا بھی مطالبہ ہونے لگا ہے۔
ں اور دیگر پسماندہ جماعتوں کی تعلیم میں بھی کافی اضافہ ہوا ہے۔ عام لوگوں میں بھی تعلیمی مسائل
ں چسپی پیدا ہو گئی ہے اور مجالس قانون ساز میں تعلیم پر مزید اخراجات کا مطالبہ ہونے لگا ہے۔"
ویر کا ایک رخ تھا۔ لیکن دوسری طرف اس نے لکھا ہے کہ "اس تعلیم کا کوئی اثر عام زندگی
ہیں آرہا ہے اور ہر طرف روپیہ اور محنت کی بربادی دکھائی دے رہی ہے۔ ابتدائی تعلیم
مقصد لوگوں کو پڑھا لکھا بنانا اور اس قابل کرنا تھا کہ انتخابات میں وہ اپنی رائیوں کا صحیح
کر سکیں، سب سے زیادہ ناکام اور بے مقصد دکھائی دے رہا ہے۔ ابتدائی مدرسوں کی
عتوں میں داخل ہونے والے بچوں کی بہت تھوڑی تعداد چوتھی جماعت تک پہنچتی ہے۔ لڑکیوں
ہ میں یہ صورت حال اور بھی افسوسناک ہے۔"

اسی طرح ثانوی تعلیم میں بھی جہاں استادوں کی تربیت اور مدرسوں میں عام مشاغل کے رواج
ے بہتر تو بنا دیا ہے، لیکن بعض خامیاں ثانوی تعلیم میں بہت قابل توجہ ہیں، مثلاً یہ کہ ثانوی

مدرسہ کا ہر طالب علم یونیورسٹی میں جانا چاہتا ہے۔ اسی طرح صنعت وحرفت کی تعلیم کا ثانوی تعلیم پر کوئی اثر نظر نہیں آرہا ہے۔

اسی کے ساتھ یونیورسٹی کی تعلیم اور ثانوی مدارس کے استادوں کے حقوق سے متعلق بھی کچھ سفارشیں ہیں، لیکن لوکل بورڈوں سے متعلق کمیٹی کا تبصرہ بہت دل چسپ ہے، مثلاً یہ کہ لوکل بورڈ کو تعلیم کا تجربہ نہ ہونے کی وجہ سے وہ اکثر افسرانِ تعلیم سے مشورہ کرنے میں کتراتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انتظام کے ساتھ تعلیم بھی خراب ہوتی ہے۔ بعض بعض صوبوں میں لوکل بورڈ کے چیئرمین کو پورے اختیارات دیدیے گئے ہیں اور اکثر ان اختیارات کا غلط استعمال ہوا ہے، مثلاً انتخاب کے زمانہ میں مدرسین ایجنٹ کا کام انجام دیتے ہیں۔ بعض صورتوں میں مدرسین چیرمین یا کسی ممبر کے ساتھ اس غرض سے وابستہ ہوجاتے ہیں کہ اس سے ان کا تبادلہ نہ ہوسکے گا، یا اگر تبادلہ کی خواہش ہو تو وہ آسانی سے ہوجائے گا۔ اس بنیاد پر ہارٹوگ کمیٹی نے بہت سے اختیارات ان سے لے کر صوبہ کی حکومتوں کے ہاتھ میں دیدیے اور یہ لکھا کہ اکثر صورتوں میں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ پبلک کا روپیہ ان بورڈوں کے ہاتھوں کس طرح صرف ہوتا ہے، اور بعض صورتوں میں ان پر کوئی تعلیمی نگرانی نہ ہونے کی وجہ سے ان کی تعلیمی حالت بھی خراب رہتی ہے

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ، ۱۹۳۵ء:

ہارٹوگ کمیٹی نے تصویر کا ایک ہی رخ سامنے رکھا۔ اس نے جہاں لوکل بورڈ کے انتظام میں خرابیاں بتائیں اور یہ تجویز کی کہ حکومت ابتدائی تعلیم کے انتظام کو اپنے ہاتھ میں لے لے، یہ نہیں بتایا کہ اس کے کچھ فائدے بھی ہیں، یعنی تعلیم عوام کے اپنے ہاتھ میں ہونے کی وجہ سے بڑا فائدہ تو یہ تھا کہ اس سے لوگوں میں ایک سیاسی بیداری اور قومی شعور پیدا ہوگیا تھا اور ابتدائی تعلیم کے خرچ کے بارے میں کسی حد تک زمین اور سامان کی شکل میں اکثر مقامی لوگ بھی شریک ہوجایا کرتے تھے۔

بہرحال، دوسرا قدم جو حکومت نے اٹھایا، وہ اصلاحِ تعلیم کا اتنا نہ تھا، جتنا تعلیم کے
نام سے متعلق ایک اساسی اور دستوری قدم تھا، یعنی حکومت نے ۱۹۳۵ء میں گورنمنٹ آف
یا ایکٹ کے نام سے ایک نیا قانون پاس کیا۔ جس کی رو سے اس نے تعلیم کا انتظام دو حصوں
تقسیم کر دیا: ایک حصہ مرکزی یعنی وفاقی حکومت کے ہاتھ میں رکھا اور دوسرا صوبائی حکومتوں
ماتحت دیدیا۔ مرکزی انتظام کے اندر امپیریل لائبریری کلکتہ، انڈین میوزیم، فوجوں کی تعلیم،
دستان کی دو بڑی یونیورسٹیاں یعنی بنارس ہندو یونیورسٹی اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، قدیم تاریخی عمارتوں
مثلاً، فن تعمیر اور مرکزی علاقوں کی تعلیم تھی۔ ان کے علاوہ اور دوسرے قسم کی تعلیم صوبائی حکومتوں کے
میں رکھی گئی۔

اس ایکٹ نے اگرچہ تعلیمی اعتبار سے اصلاح اور ترمیم کا کوئی بڑا قدم نہ اٹھایا ہو لیکن انتظامی
ائینی حیثیت سے اس نے سب سے پہلی بار ہندوستان کی حکومت کو ایک وفاقی شکل دی اور
یں مرکزی اور صوبائی دونوں حکومتوں کو شریک کیا۔

ڈ اینڈ ایبٹ رپورٹ ۳۷-۱۹۳۶ء:

اس وقت ہندوستانی تعلیم کے سامنے ایک بڑا مسئلہ یہ تھا کہ یونیورسٹیوں سے جتنے طلبا نکلتے
انھیں اپنی صلاحیتوں کے مطابق کام نہیں ملتا تھا، اس لئے ضرورت یہ سمجھی گئی کہ تعلیم کو اس قابل
ئے کہ طلبا تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد کسبِ معاش کے قابل ہو سکیں۔ چنانچہ حکومتِ ہند نے
سے دو ماہرین تعلیم بلائے جن میں سے ایک کا نام ایس۔ ایچ ووڈ اور دوسرے کا ایبٹ
ڈ نے عام تعلیم سے متعلق اپنی رپورٹ مرتب کی اور ایبٹ نے صنعتی تعلیم سے متعلق۔ رپورٹ
ت پر خاص زور دیا گیا کہ صنعتی تعلیم، عام تعلیم سے کسی طرح کم درجہ نہیں ہے اور یہ تعلیم کا اسی
ہم جزو ہے، جتنا عام تعلیم۔ رپورٹ کی دوسری سفارشات حسب ذیل ہیں:
۱۔ چھوٹے بچوں (انفینٹ) کی جماعتیں بھی تربیت یافتہ معلمات کے سپرد ہونی چاہئیں،

اس لحاظ سے عورتوں کی تعلیم بہت ضروری ہے۔

۲۔ ابتدائی مدرسوں کی تعلیم بچوں کی قدرتی دلچسپیوں اور مشغلوں پر مبنی ہونی چاہیئے، کتابوں کے۔

۳۔ دیہات کے مڈل اسکولوں کی تعلیم ان کے ماحول کے مطابق ہونی چاہیئے اور ان جما میں اگر انگریزی سکھائی بھی جائے تو اسے زبان کے تقاضوں سے بہت زیر بار نہ کیا جائے۔

۴۔ مادری زبان ہائی اسکول تک بطور ذریعہ تعلیم ہونی چاہیئے لیکن انگریزی پھر ایک مضمون کی حیثیت سے ہو۔

۵۔ پرائمری اور ثانوی مدرسین کی ٹریننگ کے لئے کم سے کم تین سال کا نصاب ہونا چ

دوسرے حصہ رپورٹ کی خاص خاص سفارشیں یہ ہیں:

۱۔ پیشہ کی تعلیم صنعتی ترقی کے ساتھ ساتھ چلنی چاہیئے۔

۲۔ عام تعلیم اور پیشہ کی تعلیم کو علیحدہ علیحدہ شاخیں نہ سمجھنا چاہیئے، بلکہ ایک کو ابتدائی ا کو اس کا تسلسل خیال کرنا چاہیئے۔

۳۔ جونیر ووکیشنل اسکول آٹھویں جماعت کے بعد تین سال کی تعلیم کے اور سینئر ووکیشنل ا گیارھویں جماعت کے بعد دو سال کی تعلیم کے ہوں گے۔

۴۔ جو لوگ کسی پیشہ میں داخل ہو چکے ہیں، ان کے لئے جزوی وقت کے اسکول ہوں گ

۵۔ حکومت کو چاہیئے کہ کسی عام ٹریننگ کے ساتھ ساتھ ایک ووکیشنل ٹریننگ کالج قائم کرے۔

بنیادی قومی تعلیم، ۱۹۳۷ء:

اس نئے آئین کے تحت ہندوستان میں سب سے پہلی بار صوبوں کو حکومت خود اختیار گئی اور اس اختیار کے ساتھ ہندوستان کے چودہ صوبوں میں سے سات صوبوں میں کانگریس

ت قائم ہوئی۔ اس کانگریس پارٹی نے سب سے پہلے اپنے صوبوں میں ابتدائی تعلیم کو ہاتھ میں لیا
مہاتما گاندھی جی کی رہنمائی میں اس نے ایک تعلیمی اسکیم مرتب کی جو شروع میں وردھا اسکیم اور بعد
بنیادی قومی تعلیم کے نام سے موسوم ہوئی۔ یہ ہندوستان کی تاریخ میں شاید سب سے پہلا واقعہ ہے
اس سررشتۂ تعلیم ما در دستِ ما باشد' کا صحیح اطلاق عمل میں آیا، ورنہ اس سے پہلے جب یہ مصرع
لیا تھا تو اس وقت 'دستِ ما' حقیقت میں دستِ ما نہ تھا بلکہ سب کچھ انگریزوں کے ہاتھ میں
نا تھا۔

دوسری بڑی بات یہ تھی کہ ہندوستان کی تعلیم کے مسئلہ کو ہمارے قومی رہنماؤں نے شاید سب سے
بار 'بنیاد' سے شکل دینے کی کوشش کی، ورنہ اس سے پہلے ہمیشہ یونیورسٹی کی تعلیم یا زیادہ سے
دہ نیچے اترے تو کالج اور ہائی اسکولوں کی تعلیم سے کبھی نیچے نہیں اترے لیکن اب کے بار
ل تقاضا کے اصول کی بنیاد پر نہیں بلکہ تعلیم کو ایک نمو پذیر شے کی حیثیت سے 'بنیاد' سے کام
یا گیا اور شاید اسی وجہ سے اس کا نام 'بنیادی تعلیم' زیادہ موزوں سمجھا گیا۔

اور تیسری بات یہ کہ یہ تعلیمی اسکیم پہلی بار ہندوستان کی قومی ضرورتوں کی بنیاد پر مرتب کی گئی تھی او
کا تعلق ایک طرف جہاں ہندوستان کی سماجی اور تہذیبی زندگی سے نہایت گہرا تھا، تو دوسری
ف بچہ کی ذہنی، جسمانی اور اخلاقی نشوونما سے بھی اسی قدر تعلق رکھتا تھا۔

ان خصوصیتوں کی بنیاد پر مہاتما گاندھی جی نے صوبوں کے تعلیمی وزرا اور ملک کے ماہرین تعلیم کی
کانفرنس مورخہ ۲۲ر و ۲۳ر اکتوبر ۱۹۳۷ء کو وردھا میں بلائی اور ان کے سامنے حسب ذیل تجویزیں
ہیں:

۱۔ ۷ سال سے ۱۴ سال تک کے سب بچے اور بچیوں کی مفت اور لازمی تعلیم کا انتظام۔

۲۔ تعلیم بچہ کی مادری زبان میں ہو۔

۳۔ تعلیم کا مرکز کوئی نفع بخش ہاتھ کا کام ہو۔ اور یہ

۴۔ تعلیم حتی الامکان اپنا خرچ آپ نکال سکے۔

دو دن تک بڑے رد و قدح کے بعد، بالخصوص آخری دو اصولوں پر، بالآخر یہ اصول تسلیم کر لئے گئے اور یہ طے پایا کہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی صدارت میں ایک کمیٹی مقرر کی جاتی ہے جو ان اصولوں کی روشنی میں ایک اسکیم مرتب کرے اور اس کے ساتھ ایک نصاب بھی تیار کرے۔ یہی اسکیم اور نصاب دونوں "بنیادی قومی تعلیم" کے نام سے موسوم ہیں اور کم و بیش ۲۵ سال تک حکومت کی سرپرستی میں ہندوستان کے طول و عرض میں چلتے رہے۔ لیکن بقول شاعر:

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

دل کے پھپھولے جل اٹھے سینے کے داغ سے

خود حکومت کے ہاتھوں اس تعلیم کی مٹی پلید ہوئی اور رفتہ رفتہ اس کے تمام اصولوں کو ختم کر دیا گیا۔ ایک بنیادی اصول "کام کے ذریعہ تعلیم" کا جو تھا، وہ ایجوکیشن کمیشن ۱۹۶۶ء میں بچوں کو کام کا تجربہ دینے کی شکل میں باقی رکھا گیا، ورنہ یوں بنیادی تعلیم ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی!

پوسٹ وار ایجوکیشنل ڈویلپمنٹ پلان، ۱۹۴۴ء یا سارجنٹ رپورٹ:

۱۹۳۵ء کے بعد سے تابڑ توڑ کئی باتیں ایسی پیش آئیں جس سے حکومت ہند کو ہندوستان کی تعلیم کے بارے میں ایک نیا قدم اٹھانا پڑا۔ ۱۹۳۵ء میں انڈیا ایکٹ کے ماتحت صوبوں میں حکومت خود اختیاری مل چکی تھی اور اس کی وجہ سے ملک میں تعلیم سے ایک قومی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ بنیادی تعلیم، قومی تعلیم کی از سر نو تشکیل کی سب سے پہلی کوشش تھی اور اس نے سب سے پہلی بار ہندوستان کی ابتدائی تعلیم کو کتابی تعلیم کی لیک سے نکال کر اس میں کام کے ذریعہ تعلیم، پیشہ کی تعلیم اور دوسرے تصورات کو داخل کیا تھا۔ اس سے پہلے حکومت ہند نے ووڈ اور ایبٹ جیسے ماہرین تعلیم کو ہندوستان کی تعلیمی اصلاح کے لئے بلایا تھا جس کی رپورٹ کا تذکرہ اوپر آچکا ہے۔ ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم شروع ہو گئی اور سیاسی اختلاف کی بنیاد پر قومی تعلیم کی تحریک رک گئی۔ لیکن بعد جب یہ جنگ ختم ہوئی تو حکومت ہند نے ۱۹۴۴ء میں ایک بعد از جنگ کا منصوبہ بنایا

ثیر تعلیم سرجان سارجنٹ کے نام پر سارجنٹ رپورٹ کے نام سے زیادہ مشہور ہے۔ یہ رپورٹ
، بڑے بلند آہنگ بلیغ فقرے سے شروع ہوتی ہے: "اس ملک کے لوگوں کی تعلیم پر ہی اس ملک
مت کا دار مدار ہے" اور نہایت اختصار لیکن بڑی جامعیت کے ساتھ اس نے کل ملک کی مالی
ت اور اس کے ساتھ پوری تعلیم کا ایک منصوبہ پیش کیا ہے۔ اس نے اعداد و شمار کے ذریعہ
بلہ کر کے بتایا ہے کہ انگلستان میں تعلیم کا خرچ جہاں فی کس ۳۲ روپیہ ۲ پیسے ہے ہندستان
صرف ۸۹ پیسے فی کس ہے۔ اس نے بڑی ہوشیاری سے بنیادی تعلیم کی اسکیم پوری اپنے
سمو لینے کی کوشش کی ہے، لیکن اس اسکیم کی سالمیت کو ختم کر کے اس نے جونیر بیسک اسکول
سینیر بیسک اسکول دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اس نے سب سے پہلی بار اعداد و شمار کے
یہ یہ بتایا ہے کہ ہندوستان میں ۸ سال کی لازم اور مفت تعلیم کے لئے کم سے کم ۴۰ سال کی
ن چاہئے، جس پر ہماری قومی حکومت کے سب سے پہلے اور بڑے وزیر تعلیم نے بڑی حیرت سے
رمایا کہ یہ تو ایک عمرِ نوح ہوگی اور شاعر کے الفاظ میں:

کون جیتا ہے ترے زلف کے سر ہونے تک
آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک

ن قومی حکومت کی وزارت تعلیم نے جب تعلیم کی توسیع و ترقی کا کام ہاتھ میں لیا تو تجربہ سے معلوم
اکہ شاید عمرِ نوح بھی کافی نہ ہو اور آہ کے اثر ہونے کے لئے ایک عمر تو چاہئے ہی، خواہ
مرِ نوح سے بھی لمبی کیوں نہ ہو جائے!

بہرحال اس کمیٹی نے اپنا کام شروع کیا اور اب سے پہلے کی بنیادی تعلیم کے بنیادی اصول
پنے اندر سمو لیا اور بنیادی تعلیم کی ۸ سالہ مدت کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کے باوجود یہ کہا کہ
منزلوں کے تسلسل کو پورے طور پر قائم رکھنا چاہئے اور اس پوری مدت کی تعلیم کو بڑی آبادی
خود کفیل بنا دینا چاہئے۔

اس کے بعد اس نے ہائی اسکول کی تعلیم کو لیا اور اس کے لئے اس نے دو قسم کے ہائی اسکول

تجویز کئے، ایک ادبی اور دوسرے صنعتی۔ ادبی ہائی اسکولوں میں تعلیم آرٹس اور خالص سائنس کی ہوگی۔ اور صنعتی ہائی اسکولوں میں عملی سائنس، صنعتی اور تجارتی مضامین کی ہوگی۔ لیکن دونوں میں کچھ مضامین مشترک ہوں گے جو زبان اور ادب سے متعلق ہوں گے۔ یونیورسٹی تعلیم سے متعلق رپورٹ میں لکھا ہے کہ اگرچہ ہندوستانی یونیورسٹیوں میں بعض خوبیاں ہیں، پھر بھی وہ قومی نظام تعلیم کی ضرورتا کو پورا نہیں کر رہی ہیں۔ ہائی اسکولوں کی مجوزہ تنظیم اس کمی کو بہت حد تک پورا کر دے گی۔ رپورٹ میں انٹرمیڈیٹ جماعتوں کو ختم کر دینے کی تجویز کی گئی ہے اور اس کے ایک سال کو ہائی اسکول سے ملا کر یونیورسٹی کے صرف تین سال رکھے گئے ہیں۔ تعلیم میں ٹیوٹوریل طریقہ پر بہت زور دیا گیا ہے۔

غرض آج تک ہماری جدید تعلیم نے جو ترقی کی ہے، وہ سب آپ اس تعلیمی دستاویز میں پائیں گے جو انگریزی عہد حکومت کی آخری دستاویز ہے۔ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کو آزادی ملی اور اس نے اشتراکی نمونے پر ایک جمہوری اور وفاقی حکومت قائم کی۔ اس کے دستور میں ہندوستان کی تعلیم اور اس کے طریقہ کار سے متعلق نہایت واضح دفعات ہیں جس سے ہماری جدید تعلیم ایک نیا رخ لے سکتی ہے۔ اس دستور کے بعد سے تعلیم کی توسیع و ترقی کے لئے مختلف کمیٹیاں، کمیشن اور منصوبے بنے جو ایک علیحدہ مقالے کے محتاج ہیں۔ اس وقت انگریزی عہد حکومت تک کا خاکہ پیش کیا جا ہے۔ دوسرے حصہ کا ناظرین کو انتظار کرنا ہوگا۔

گلن گریفتھس
ترجمہ: قیصر زیدی

میری پہاڑیاں، میرا گھر

افرادِ تمثیل

(جس ترتیب سے وہ پیش کئے گئے)

جین پرِیس — ولیم پرِیس کی بیوی
ولیم پرِیس — ایک چھوٹا زمیندار
لفٹنٹ سوالو — ایک فوجی افسر
میرین پرِیس — ولیم کی بہو
ایڈرن پرِیس — ولیم کا بیٹا
ایک اور فوجی

مقام : شمالی ویلز۔ زمیندار کے ڈیرہ کے باورچی خانہ میں

وقت : موجودہ

: گلن گریفتھس کے اس ایک ایکٹ کے ڈرامے کا شمار ۱۹۵۲-۵۳ء کے بہترین ڈراموں میں کیا جاتا ہے۔ چند اخلاقی قدریں ہیں جن کی طرف اس ڈرامے میں بڑی خوش اسلوبی اور تاثیر پیدا کرنے والے انداز سے اشارہ کیا گیا ہے۔ ہم جناب سید ابوالقاسم قیصر زیدی صاحب کے ممنون ہیں کہ انہوں نے ماہنامہ جامعہ کیلئے اس کا ترجمہ کیا۔ (مدیر)

شمالی ویلز کی ایک غیر آباد سی وادی میں ایک چھوٹے زمیندار کے ڈیرے کا باورچی خانہ، داہنی طرف صحن سے ملحق ایک دروازہ جو تھوڑا سا کھلا رہتا ہے۔ بائیں طرف دوسرا دروازہ جو عقبی باورچی خانہ کی طرف کھلتا ہے۔ دیوار سے لگی ہوئی شاہ بلوط کی ایک پرانی الماری جس میں چینی اور پیتل کے برتن سجے ہیں۔ مرکز میں جگہ کی اہمیت کی مناسبت سے ایک بڑی ویلز انجیل مقدس، پیتل کی جلد میں رکھی ہے بائیں جانب دیوار میں جالی پردوں سے آراستہ ایک چھوٹی کھڑکی صحن کی طرف کھلتی ہے۔ اور اس کے مقابل داہنی طرف آتشدان جس میں ہلکی ہلکی آگ جل رہی ہے۔ اور اس پر ایک کیتلی رکھی ہے۔ کارنس پر سجاوٹ کے طور پر چینی کے کتے اور شیشہ میں جڑی ہوئی چند تصاویر رکھی ہیں۔ اور ان کے درمیان ایک گھڑی ہے۔ آتشدان کے ہر دو جانب کرسیاں پڑی ہیں۔ ادھر ونڈسر ساخت کی کرسی کچھ اس طرح رکھی ہے کہ اس کی پشت سامعین کی طرف ہے وسط میں دو کرسیوں کے درمیان ایک میز ہے جس پر سفید میز پوش پڑا ہے۔

جیسے ہی پردہ اٹھتا ہے۔ بائیں دروازے سے جین چائے کا سامان لئے ہوئے داخل ہوتی ہے۔ اس کے چہرے پر پہاڑی عورتوں کی سی متانت ہے، تھکن کے آثار نمایاں ہیں، بال باریک ہیں اور سفیدی کی طرف مائل ہیں۔ چال میں غیر معمولی تیزی اور پھرتی، جسے دیکھ کر اس کی سیمابی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ غربت، افلاس اور جفاکشی نے اس کے جذبات کو سرد کر دیا ہے۔ وہ گھڑی کو بار بار دیکھتی ہے اور چائے کا سامان میز پر چنتی جاتی ہے۔ اس کے بعد وہ بائیں دروازہ پر جا کر آواز دیتی ہے۔

جین: ولیم! ولیم! اب آ بھی جاؤ چائے تیار ہے اور اُن لوگوں کے آنے میں بھی کچھ زیادہ دیر نہیں ہے۔ (وہ واپس میز تک آتی ہے اور چائے بنانے لگتی ہے۔ خالی چائے دان لے کر آتش دان تک جاتی ہے اور اسے کیتلی سے بھرتی ہے۔ اس کے بعد پھر میز تک واپس آ کر بیٹھ جاتی ہے اور کھانا شروع کر دیتی ہے ــــــ مضبوط و بلند قامت ولیم اتوار کے عجیب سے سیاہ لباس میں ملبوس کمرے میں خراماں خراماں داخل ہوتا ہے۔ اس کا چہرہ

پُروقار اور بارعب ہے۔)

ولیم: مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں اپنے بہترین لباس میں کسی کی تجہیز و تکفین میں جا رہا ہوں۔ (وہ کمرے کی ہر چیز کو کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھتا ہے۔ جین اس کے لئے چارپائی بناتی ہے۔ کمرے میں تھوڑی دیر کے لئے سکوت چھا جاتا ہے) جین!

جین: کیا بات ہے؟!

ولیم: ہم آج آخری بار یہاں کھا رہے ہیں۔

جین: (دھیمے لہجہ میں) ہاں ولیم۔

ولیم: میرے خیال میں خدا کی مرضی یہی ہے کہ ہم یہاں سے چلے جائیں
(وہ کمرے کو تکنے لگتا ہے جیسے کہ اس کی ہر چیز کو اپنے دل و دماغ میں بسا لے گا)
وقت آنے پر خدا کی مرضی پر عمل کرنا بھی آسان نہیں رہتا۔

جین: (افسردگی کے احساس کے باوجود، صورتِ حال کو اُمید افزا انداز میں پیش کرتے ہوئے) ہم شہر میں بہت خوش رہیں گے۔ سنا ہے کہ وہاں کا چھوٹا سا مکان نہایت آرام دہ ہے۔ اس میں پانی کا نل بھی ہے۔ ولیم! ذرا سوچو تو مجھے اب بالٹی لے کر صبح صبح کنوئیں پر نہ جانا پڑے گا۔

ولیم: (کچھ کھوئے ہوئے انداز میں) ہوں! تمہارے لئے وہاں کام کم ہوگا۔

جین: اور تمہارے لئے بھی تو! سوچو تو نہ وہاں ہل چلانا ہوگا اور نہ بیج بونا اور نہ ہی یہ کمبخت جھاڑیاں کاٹنے کا کمر توڑ دینے والا کام۔ بس ایک چھوٹا سا پائیں باغ، جہاں پھولوں کی چند قطاریں اور چند کیاریاں آلوؤں کی۔

ولیم: (کھوکھلے انداز اور لب و لہجہ میں) خوبصورت پھول ہوں گے۔ اچھے خوشنما

جین: (اپنے بناوٹی پُر امید انداز کو برقرار رکھتے ہوئے) ہر چیز ہمارے ہی آرام اور بہتری کے لئے کی گئی ہے۔ کس قدر اچھے ہیں یہ لوگ اور دیکھو نا، پہلی شب ہمارے قیام کا انتظام

ہوٹل میں کیا گیا ہے تاکہ ہمارا سارا سامان ہمارے نئے مکان میں آسانی سے منتقل کیا جا[illegible]

ولیم: ہاں انھوں نے ہر ایک بات کا پورا پورا لحاظ کیا ہے۔

جین: (معمولی لب و لہجہ میں) اچھا اب چائے پی لیجئے۔ ٹھنڈی ہوئی جا رہی ہے۔

ولیم: ارے، میں تو بھول ہی گیا تھا۔ (وہ پیالی میں چمچہ چلا کر، پیالی سے چمچہ نکالے بغیر، پیالی ہونٹوں سے لگا لیتا ہے)

جین: (ناپسندیدگی کے لہجہ میں) توبہ ولیم!!

ولیم: (سوالیہ انداز میں) کیوں۔؟

جین: کل تم نے وعدہ کیا تھا کہ تم پھر یہ حرکت نہ کرو گے۔

ولیم: (گھبراتے ہوئے) کیسی حرکت؟! میں سمجھا نہیں!!

جین: پیالی سے چمچہ نکالے بغیر پھر چائے پی؟!

ولیم: اوہ! (وہ پیالی آہستہ سے رکھ دیتا ہے اور چمچہ پر لگے ہوئے چائے کے قطروں کو [illegible] کرنے کے لئے جھٹکنے کے بجائے چمچہ پیالی کے کناروں پر مارتا ہے اس کے بعد وہ [illegible] میں رکھ دیتا ہے) ہاں تو تم نے بتایا تھا کہ یہ بدتمیزی ہے

جین: خیر، یہاں تو کچھ ہرج نہیں اس لئے کہ یہاں ہمارے علاوہ کوئی اور نہیں۔ البتہ [illegible] صورت دوسری ہوگی۔ وہاں ہمسائے بھی ہوں گے اور میں یہ گوارا نہ کرسکوں [illegible] تمہارے طرز عمل پر ہنسیں۔

ولیم: (دھیمے لہجہ میں) کیا وہ مجھ پر ہنسیں گے۔ یہ تو نہ ہونا چاہئے۔

جین: ولیم! تم تو برا مان گئے۔ ناراض ہو گئے [illegible]

ولیم: ناراض۔ نہیں تو۔ ہاں حیران ضرور ہوں کہ [illegible] چائے پینے [illegible] پتہ چلا کہ یہ بدتمیزی ہے۔ مجھے تو [illegible] سے ناوا[illegible] میں نے تو [illegible]

(زہر پڑتے ہوئے) اپنے گھر تو خیر یہ کوئی عیب نہیں۔ مگر دوسروں کے ہاں یہ حرکت یقیناً بُری سمجھی جائے گی۔

تو گویا مجھے شہر میں کوئی دوسرا کام ہی نہ ہوگا بجز دوسرے کے وہاں چائے پینے کے؟!

ولیم خدا کے لئے بات کو غلط نہ سمجھو۔

میری تو سمجھ میں یہ باتیں آتی نہیں۔

کتنے ہی واقعات ایسے ہوتے ہیں جن کو ہم نہیں سمجھ پاتے ولیم!

(میز سے اٹھ کر کھڑکی کی طرف جاتے ہوئے) سچ ہے۔ ہمارے ذہن کی رسائی ان تک نہیں۔ لیکن کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ ہمارے بڑھاپے نے ہمیں کند ذہن بنا دیا ہے۔ یا پھر تمام چیزیں ہماری وادی سے باہر کی دنیا سے متعلق ہیں اور ہم ان کے بارے میں کوئی علم نہیں رکھتے ہیں۔ مجھے تو تمہاری صحبت سے بھی کوئی فیض نہیں پہونچا۔ میرا خیال تھا کہ شاید اس طرح میری عقل کو کچھ جلا ملے گی لیکن افسوس میں تو نہایت ہی کم عقل اور ...ل ثابت ہوا۔ تمہیں یاد ہے وہ فوجی افسر کیا کہہ رہا تھا ـــ وہی (رکتے رکتے) ...پری ... گیڈ ... یر ... جس دن وہ ہمیں یہ اطلاع دینے آیا تھا کہ ہماری زمین ہم سے لی جا رہی ہے۔ "مسٹر ریس!" اس نے مجھے مخاطب کر کے کہا تھا "ان باتوں کے سمجھانے کا کوئی خاص طریقہ نہیں۔ یہ تو محض اس لئے کی جاتی ہیں کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں اور آپ" اس نے میرے کاندھے پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "آپ تو خاصے ...اور عقلمند ہیں۔ آپ بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ مقدرات کے سامنے کب سر جھکانا چاہئے"...

.... میں اس وقت اس کی باتوں کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ لیکن اب ہر چیز ...ف طور پر میرے ذہن میں آ چکی ہے۔

...بجائے اٹھ کر چائے کے برتن اکٹھا کرتے ہوئے) مجھے وہ شخص ایک آنکھ نہیں

[illegible]

ولیم: (کھڑکی سے آتشدان کی طرف آہستہ آہستہ جاتے ہوئے) کمانڈنٹ! وہ تو اس غم
شخص کی آنکھیں تھیں جو یہ جانتا ہو کہ اس کی تمنائیں کبھی بر نہ آئیں گی وہ اپنی مراد کو کبھی نہ
جین: (جوش کے ساتھ) ہماری زمین چھین کر تو وہ اپنی مراد کو پہونچ گیا، اور کیا تمنا
کی ؟! ......مگر
ہمیں بے چین کر کے وہ بھی سکھ نہ پا سکے گا۔

ولیم: رنج والم کا دور دورہ تو اس جگہ پہلے بھی تھا۔ لیکن وہ ہمارے اپنے برے کا
پھل تھا۔ رہی یہ نئی مصیبت، یہ نئی بپتا، یہ تو کچھ ایسا ہے کہ جیسے کسی انسان کو
ناچار کسی بد ذائقہ چیز کو حلق سے اُتارنا پڑے۔

جین: اُن مصائب کا کیا ذکر ؟! اُن میں رنج کے ساتھ خوشی بھی تھی...... ہمارے
ایڈرین پیدا ہوا۔ اس کمرے میں ... وہاں پیچھے۔ تو میں نے ساری تکلیف
خوشی برداشت کی۔

ولیم: لیکن اِس قدر زمین چھن جانے پر جو رنج پہونچا ہے اس میں بھی تو خوشی کا ایک
اور وہ ہے فرض کا احساس، اِس احساس سے جسم کا رواں رواں خوشی میں
ناچنے لگتا ہے جس طرح موسم بہار میں ہرے بھرے لہلہاتے ہوئے کھیتوں کو

جین: جب سے یہ کم بخت فوج یہاں آئی ہے ہمیں تو ذرا سی خوشی بھی نصیب نہیں ہوئی
(چائے کے برتن وہیں چھوڑ کر کھڑکی کی طرف جاتی ہے۔)

ولیم: (کھڑکی میں بیٹھے ہوئے) خالقِ کائنات سے کچھ پوشیدہ نہیں، وہ عالم الغیب

جین: (ولیم کی طرف رخ کرتی ہے اور جذباتی انداز میں کہتی ہے) کیا خدا میرے اُس
کو بھی دیکھ رہا ہے جو وہ اس پہاڑی میں لومڑی کی طرح، ان ظالم فوجیوں کے
چھپا ہوا ہے۔

ولیم: وہ مجرم ہے جین! خدا کی نظر میں بھی مجرم ہے۔

اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے باپ دادا کی زمین چھنتے ہوئے دیکھ کر وہ کیسے خاموش رہ سکتا تھا ولیم!

لیکن قانون اس کے ساتھ نہیں۔

یہ قانون بھی خوب ہے جو غریبوں کو ان کی اپنی جگہوں پر بھی قابض نہیں رہنے دیتا۔

تمہیں تو ساری کوفت ہی ایڈرن کی وجہ سے ہے۔

: لعنت ہے مجھ پر کہ میں اپنے بچے پر مظالم ٹوٹتے دیکھوں اور ان ظالم درندوں سے نفرت بھی نہ کروں۔

(اپنا وہی بیگانہ سا انداز قائم رکھتے ہوئے) ایڈرن نے ایک انسان پر گولی چلائی اور اسے قریب قریب ہلاک کر دیا۔

کبھی کبھی گولی چلانا اور کسی کو ہلاک کرنا بھی اسی قدر ضروری ہے جس قدر حق و انصاف کی باتیں کرنا۔

(جھلا کر) یہ کیا کفر بک رہی ہو؟! (جس وقت وہ یہ جملہ ادا کر رہا ہے داہنے دروازہ پر دستک ہوئی اور لفٹنٹ سوالو داخل ہوا۔ وہ نوجوان ہے اور اپنی تصنع آمیز نرمی، مسکراہٹ اور اخلاق سے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ یہاں آنے پر خوش ہے)

و: آداب عرض۔ میرا خیال ہے کہ میں قبل از وقت نہیں آپہونچا۔

: اگر آپ مناسب وقت تک بھی انتظار فرما کر یہاں وارد ہوتے تب بھی آپ قبل از وقت ہوتے۔ (ولیم سے مخاطب ہو کر) میں چتی باورچی خانہ میں جا رہی ہوں (اور وہ بائیں طرف سے چلی جاتی ہے۔)

آؤ میاں، یہاں آگ کے قریب آجاؤ گو اس میں اب زیادہ گرمی تو باقی نہیں رہی اور اسے جلا کر ہی کیا فائدہ ہوگا۔ ہم تو یہاں سے جا ہی رہے ہیں۔

عجیب طرح سے بوکھلاتے ہوئے) اوہ نہیں تو۔ ایسا تو نہیں

(جیب میں تلاش کرنے کے بعد سگریٹ کیس نکالتا ہے اور ولیم کی طرف)
لیجئے، سگریٹ پیجئے۔

ولیم: ارے !! معاف کیجئے ... آپ تشریف رکھیں

سوالو: میرا خیال ہے کہ مسز پریس کو تیار ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ میں نے م
ٹیکسی لانے کو کہا ہے اور اب تقریباً تین بجے ہیں۔

ولیم: ایں کیا اب اتنا کم وقت رہ گیا۔ مجھے تو دو ایک کام اور کرنا تھے (وہ بائیں درا
کی طرف جاتا ہے) میں جین سے کہے دیتا ہوں کہ میں چند لمحوں کے لئے ذرا باہر جا ر
ہوں (وہ دروازہ کھولتا ہے اور نرمی سے آواز دیتا ہے) جین! جین !!
جا رہا ہوں ــــ (وہ رکتا ہے ہلکے سے دروازہ بند کرتا ہے اور پھر میز کے قر
آتا ہے) وہ سبکیاں لے رہی ہے (پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ) غالباً اپنے اندا
میں اپنے گھر کو الوداع کہہ رہی ہے۔

سوالو: یہ! یہ تو !! واقعی آپ کے لئے بہت تکلیف دہ ہے !!

ولیم: بے شک۔ ہمارے لئے تو یہ قیامتِ صغریٰ ہے۔

سوالو: (آہستہ سے) میں آپ پر کس طرح ظاہر کروں کہ مجھے کس قدر رنج ہے۔ جہاں تک
ذات کا تعلق ہے میں یہی پسند کرتا کہ یہ سب کچھ نہ ہوا ہوتا۔

ولیم: (داہنے دروازہ کی طرف جاتا ہے) بُرا ہی ہوا .... خیر (ایک آہ سرد بھرتا ہے
کیا ہوتا ہے۔ جو ہونا تھا سو ہوا .... آپ چند منٹ تشریف رکھیں۔ میں ذرا باہر
ہوں بس چند ہی لمحوں کے لئے ــــ آپ کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ (جو
وہ دروازہ کی طرف مڑتا ہے، میرین داخل ہوتی ہے۔ وہ جوان العمر ہے۔ اس کا
گندمی ہے لیکن تفکرات نے اس کے چہرے کو زرد کر دیا ہے وہ ولیم کو دیکھتی۔
سوالو کو دیکھتی ہے۔)

ولیم: کیا بات ہے، میرین؟

سوالو: (کھڑے ہو کر) آداب عرض

میرین: (اس کے سلام کو نظر انداز کرتے ہوئے) اماں جان کہاں ہیں؟

ولیم: اب اسے زیادہ پریشان نہ کرو۔ غریب عقبی باورچی خانہ بیٹھی رو رہی ہے۔ بہتر ہے کہ اسے تھوڑی دیر تنہا رہنے دو۔ ہاں مجھے اب جانا چاہئے۔ دیر زیادہ ہو رہی ہے اور لفٹنٹ صاحب ہمیں لے جانے کے لئے تیار بیٹھے ہیں۔

میرین: (تلخ لہجہ میں) وہ تو آنجناب کی موجودگی ہی ظاہر کر رہی ہے۔ اور اس کے علاوہ موصوف کا کام ہی کیا ہے۔ بس غریبوں کو گھر سے بے گھر کرنا۔

ولیم: (سمجھاتے ہوئے) چھوڑو میرین!!۔ ان کو مورد الزام نہ ٹھہراؤ۔ بھلا اس میں ان کا کیا قصور! یہ تو اپنا فرض انجام دے رہے ہیں (وہ اس نتیجہ پر پہونچتا ہے کہ دونوں کو تنہا چھوڑنا معاملہ کی نزاکت کے اعتبار سے غلط ہے) میرین! تم ذرا میز ہی صاف کر دو۔ جین کو کچھ آرام مل جائے گا۔

وہ دروازہ تک جاتا ہے اور کھڑے رہ کر لمبے سانس لیتا ہے — آج تو ہوا میں اوس کی بھینی مہک ہے، فصل کاٹنے اور سمیٹنے کا بہترین زمانہ ہے۔

(سوالو آتشدان کے قریب بیٹھا ہوا اپنی سگرٹ سے کھیل رہا ہے۔ میرین الماری سے ے لے کر اس میں چائے کے برتن میز پر سے اٹھا کر رکھ رہی ہے اس کے بعد وہ دسترخوان دروازے کے باہر صحن کی طرف جھٹک کر صاف کرتی ہے اور تہہ کر کے الماری کے ایک نہ میں رکھ دیتی ہے۔ پھر وہ کھڑکی کی طرف جاتی ہے، اِس تمام عرصہ میں وہ گنگناتی رہتی ہے ادسن کو مبارک چمن، چمن کو شمیم" اک ذرا کھڑکی سے باہر جھانکتی ہے۔ گنگناہٹ کی آواز ختم ہوتے ہی وہ تیزی سے مڑ کر سوالو کو بغور دیکھنے لگتی ہے جو اس تمام عرصہ میں دل سے اس کا تعاقب کرتا رہا تھا۔)

رین: (سوالو سے چونکا دینے والے انداز میں) ذرا یہاں تو آیئے اور یہ ملاحظہ فرمایئے۔ دسترخوان پر دوستوں کی محفل میں پُر لطف موضوعِ گفتگو رہے گا (سوالو بغیر کسی جنبش کے اُس کو کھوئے ہوئے انداز میں دیکھتا ہے) آیئے نا تماشا دیدنی ہے (سوالو اکتاہٹ سے اُٹھ کر اُس کے پاس آ کھڑا ہوتا ہے۔ وہ کھڑکی سے باہر اشارہ کرتی ہے) وہ دیکھئے۔

سوالو: (تیوری پر الجھن کے آثار) یہ بڑے میاں !! مسٹر پیس !؟

میرین: آپ نے یہ بھی دیکھا کہ وہ کر کیا رہا ہے۔

سوالو: وہ کچھ کھود رہا ہے مگر کاہے کو۔

میرین: ارے آپ کیا جانیں !

سوالو: ٹھہرو۔ وہ کچھ کھود نہیں رہا ہے۔ بیلچہ سے مٹی اٹھا کر گتے کے ڈبہ میں ڈال رہا ہے۔

میرین: جانتے ہیں آپ کہ وہ اس گتے کے ڈبے کا کیا کریں گے؟ وہ اسے اپنے ساتھ لے جائیں گے اُس عالی شان مکان میں جو فوجی حکام نے قصبہ میں ان کو عطا کیا ہے۔

سوالو: مٹی بھرا ہوا ڈبہ ؟ میں نہیں سمجھا۔

میرین: میں نے آپ سے پہلے ہی عرض کیا تھا کہ آپ نہیں سمجھ سکیں گے۔ اِس ننھے منے منظر دماغ میں اس کی گنجائش کہاں ! میں بتاؤں کہ وہ ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ آپ نے اُن سے اُن کا گھر چھین لیا ہے۔ وہ اس خطہ کی کچھ مٹی ہی چرا کے لئے جا رہے ہیں تاکہ گھر نہ سہی اُس کی خاک ہی سہی (تلخ طنزیہ لہجہ میں) ہے نا مزے کی بات ؟

سوالو: (موٹی بھونڈی آواز میں) آپ کے نزدیک ہم تو احساس سے عاری ہیں۔ یہی ہے نا

میرین: کیا کہوں، کچھ دیکھتی تو کہتی۔

سوالو: (کھڑکی سے پھر آتشدان کی طرف واپس آتے ہوئے) یہ ہی تو ہے جو ہر چیز کو بھیانک اور بدشکل بنائے ہوئے ہے۔ وادی میں رہنے والے آپ لوگ کو یہ گمان ہے کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں اس میں ہماری ذات شامل ہے۔ آپ سمجھتی ہیں کہ یہ سب ہما

ہے، ہم معمولی سپاہیوں کا، اور آپ یہ سمجھنا ہی نہیں چاہتی ہیں کہ ہم یہاں ایک حکم پاکر اس کی بجا آوری پر مامور ہیں۔

میرین: جی ہاں حکم اور اس کی بجا آوری، قدیم باشندوں کو، بڈھوں کو ان کے گھروں سے دھکے دے کر نکالنا۔ یہ ہی ہے نا آپ کا فرض!

سوالو: (آتشدان کی طرف پشت کرتے ہوئے) حکم کی تعمیل ہمارا فرض ہے، غلط ہو یا صحیح، اس سے ہمیں کیا سروکار۔ رہی پسند اور ناپسند تو ہمیں ہی یہ سب کچھ کہاں پسند ہے؟

میرین: (بھرپور طنز سے) تو گویا ناپسندیدگی میں ہم ایک دوسرے سے متفق ہیں۔

سوالو: اگر آپ نے سمجھنے کی کوشش کی ہوتی تو تلخی کی یہ نوبت نہ آتی۔ بوڑھے پرلیس نے بہرحال کچھ سمجھا ہے۔

میرین: رونا تو یہ ہے کہ ہم نہ بوڑھوں کی طرح سوچتے ہیں اور نہ راضی برضا والوں کی طرح۔ ایسا ہوتا تو پھر آپ کو دشواری ہی پیش نہ آتی۔

سوالو: ہم نے آپ سے خلق اور تحمل برتا ہے اور آپ نے ہر ہر قدم پر روڑا اٹکایا ہے

میرین: ناشکرے اور کج فہم! ہاں ہم ایسے ہی ہیں۔

سوالو: (اسی تند لہجے میں) آپ لوگ شروع کرتے ہیں غوغا اور احتجاج سے۔

میرین: (قطع کلام کرتے ہوئے) اور جب کوئی نہیں سنتا، کسی کے کان پر جوں نہیں رینگتی تو ہم فوج کی دولاریاں اور خیمہ بھسم کر ڈالتے ہیں۔

سوالو: اور پھر وہ ستیہ گرہ اور عدم تشدد۔ سڑک کے بیچوں بیچ بیٹھے ہیں، فوجی نقل و حرکت کو معطل کرنے۔

...: پاجی لچھے نا پاجی

...نت غصہ کے عالم میں) آپ مذاق بھی فرمالیتی ہیں! بہت لطف لیا ہوگا آپ نے

...ہے آپ کے شوہر نے اس غریب سپاہی کو گولی کا نشانہ بنایا۔ غریب سپاہی!

میرین: مجھے تو اس کی ماں کا رہ رہ کر خیال آتا ہے (آواز میں وہ شگفتگی نہیں رہی)، لوگ بتاتے ہیں کہ وہ اس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ غم کی کیسی بھیانک اندھیاری اس کے دل کو گھیرے ہوگی۔ کاش میں اس کی بوڑھی ماں کا ہاتھ ہاتھ میں لے کر اس کو اپنی آنسو بھری آنکھوں سے لگا سکتی (شدید تر جذبہ میں) وہ کچھ میرے اس جذبہ کو سمجھ سکتی جو رات مجھ پر طاری تھا جب میں اپنے ایڈرین کے ساتھ تھی۔ اور تم اس کو ڈھونڈھتے پھرتے تھے۔ کبھی کبھی میں سوچتی تھی کہ تم اس کو پکڑلو تو اچھا ہو۔ اُس کی جان یونہی سلامت رہے مگر سلامتی۔ قید و بند کی سلامتی۔ اور پھر آپ کے انصاف اور عدل کے صدقے میں ایک بیوہ، شوہر سے محروم خانماں برباد، اور میرے پہلو میں وہ یتیم، بے سہارا۔

سوالو: (بھونچکا ہو کر) معاف کیجئے۔ مجھے کیا علم، مجھے کیا خبر! میرا مطلب ہے بچہ کے بارے میں۔

میرین: آپ جانتے ہی کیوں؟ کیا مجھے ماں بننے کے لئے آپ کے بریگیڈیر سے اجازت لینا تھی۔؟

سوالو: میں آپ کی جگہ ہوتا تو میں بیٹھ جاتا۔ ارے آپ تھک گئی ہوں گی!

میرین: جی نہیں بس معاف رکھئے۔ (وہ اپنی غمگینی چھپانے کے لئے کھڑکی کی طرف مُنہ کرلیتا ہے) فکر اور بے چینی کی اس شدت میں کون تھک سکتا ہے؟ پہاڑیوں میں سرگرداں پھرتے ہوئے آج ان کو تین راتیں گذر چکی ہیں۔

سوالو: ہم تو ان کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے عاجز آگئے۔

میرین: آپ کے ہاتھ آجانے سے ان کے لئے مرنا بہتر ہے

سوالو: (ان تمام نشتروں کی چبھن محسوس کرتے ہوئے) آپ کی نفرت کی کوئی انتہا بھا ہے؟

میرین: (متکبرانہ) جی نہیں۔ تم نے وہ نفرت پیدا کی ہے جو ہمارے دلوں پہ آسمان کا

طرح مسلط ہوگئی ہے۔

(دروازہ پر دستک ہوتی ہے۔ ایک سپاہی داخل ہوتا ہے۔ سوالو پر نظر پڑتے ہی وہ اپنی رائفل کاندھے پر رکھ کر سلامی دیتا ہے۔ اُس کا سانس پھول رہا ہے۔)

سوالو: کہئے! کیا ہے!!

سپاہی: سارجنٹ وِلّس نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ سڑک پر ایک معمولی حادثہ پیش آیا ہے۔ ٹیکسی کے ساتھ۔ وہ جو اِن لوگوں کو لے جانے کے لئے آرہی تھی۔ وہی ٹیکسی جناب!

والو: ارے ہوا کیا؟!

ہی: پنکچر جناب! پچھلے پہیئے میں۔ نچلی گلی کے موڑ پر وہ ایک کھانچے میں آگیا۔ پنکچر تو لگ گیا ہے جناب، مگر سارجنٹ کہتے ہیں کہ گاڑی کو گڑھے میں سے نکالنے کے لئے کم از کم دو گھوڑے درکار ہیں۔

لو: جاؤ ٹامس برائن ڈیری کے پاس جاؤ۔ اُس کے پاس گھوڑے ہیں۔

ی: اُس نے ہمیں انکار کر دیا ہے سرکار۔

: (لہجہ میں فاتحانہ انداز) کیا کہنے ہیں بوڑھے ٹامس برائن ڈیری کے!

: (میرین کی بات کو سنی ان سنی کر کے) سارجنٹ وِلّس چاہتے ہیں کہ ذرا آپ تشریف لے آئیں، آپ اُن بڑے میاں سے اپنے طور پر کہہ دیکھیں۔ کام تو بغیر حتمی حکم کے بنتا نظر نہیں آتا۔

: اللہ میرے، یہ اور بپتا ہوئی (میرین سے) کہئے کچھ خوشی ہوئی؟

: کیا آپ پسند کریں گے کہ میں آپ کے منہ پر قہقہے لگاؤں؟

(غیر جذباتی انداز میں) کیا آپ لوگوں کو یہ اطلاع کر سکیں گی کہ ان کی روانگی میں آدھا

گھنٹہ تاخیر ہوجائے گی اس کا ہمیں افسوس ضرور ہے۔

میرین: افسوس ظاہر کرنے میں کونسی رقم خرچ ہوتی ہے (سوآلو باہر جانے لگتا ہے پیچھے پیچھے سپاہی ہے۔ میرین بھی دروازہ تک آتی ہے اور ولیم سے کہتی ہے) ذرا ٹھہریئے ابا میں آپ کا ہاتھ بٹانے آرہی ہوں۔ (وہ باہر جاتی ہے۔ کمرہ ذرا دیر کے لئے خالی ہوجاتا ہے۔ یکایک بائیں طرف کے دروازے سے ایڈرن داخل ہوتا ہے، وہ کمرے کا جائزہ لیتا ہے۔ اس کے چہرے سے اعصابی تناؤ ظاہر ہے۔ وہ دروازے تک آکر باہر صحن میں جھانکتا ہے۔ تب وہ کھڑکی میں سے باہر نظر ڈالتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں رائفل ہے۔ وہ ولیم اور میرین کی آوازیں سنتا ہے، پہلے ولیم کے کمرے میں الٹے پاؤں آتا ہے۔ میرین گتے کے بکس کو دوسری طرف سے پکڑے اس کی مدد کررہی ہے۔ جیسے ہی اس کی نظریں ایڈرین پر پڑتی ہیں وہ چیخ پڑتی ہے اور بکس کا سرا اس کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔ وہ ولیم کے ہاتھ سے بھی چھوٹ جاتا ہے اور زمین پر گر کر ٹوٹ جاتا ہے۔ ساری مٹی ولیم کے قدموں میں گرجاتی ہے۔)

میرین: (خوشی میں پاگلوں کی طرح ایڈرین کی طرف بھاگتے ہوئے) ایڈرن!، ایڈرن اچھے تو رہے؟!!

ایڈرن: (تھکا تھکا سا انداز) تین دن تک جنگلوں میں مارے پھرنا جس قدر آرام دہ ہوسکتا ہے۔

ولیم: (قطعاً غیر جذباتی لہجے میں) تم یہاں کس طرح آئے؟

ایڈرن: میں صبح سویرے سے ان جھاڑیوں میں چھپا بیٹھا تھا۔ گیہوں گودام کے اس طرف تھا! منتظر تھا کہ موقع پاؤں تو گھر میں گھسوں۔

ولیم: تمہاری ماں تمہاری فکر میں مری جارہی ہیں۔

میرین: ہم سب کے سب۔ ہر ہر لمحہ صدی بن کر گذر رہا ہے۔ خوف یہ کہ تم گرفتار نہ ہوجاؤ

کبھی یوں بھی کہ کاش تم صحت اور سلامتی کے ساتھ ان کے ہاتھ ہی آ جاؤ۔ یہ پہاڑیاں تو جیسے تمھیں نگل لینا چاہتی تھیں، ان سے جو بربریت اور جو وحشت برستی تھی توبہ!

ایڈرن: میری وحشت سے پھر بھی بہت کم۔

میرین: ارے تم کو بھوک لگ رہی ہوگی۔

ایڈرن: بھوکے گدھ کی طرح، ایسی ویسی بھوک! بے پناہ بھوک۔ مم میرے لئے کچھ کر رہی ہیں۔ تم نے ان کا چہرہ دیکھا ہوتا جب میں کھڑکی میں سے دھم سے کودا۔ (وہ ہنس پڑتا ہے)

میرین: میں بھی جا کے کچھ ہاتھ بٹاؤں۔ تم بھی بس دیر نہ کرو۔ سپاہی بس اب یہاں آیا ہی چاہتے ہیں (وہ باورچی خانہ میں چلی جاتی ہے)

ولیم: (آہستہ آہستہ آتشدان کی طرف آتے ہوئے) تمھارا یہاں آنا ناسمجھی کی بات ہے۔

ایڈرن: میں آپ کے جانے سے پہلے آپ سے ملنا چاہتا تھا.... تو کیا آپ نے مجھے ابھی تک معاف نہیں کیا اباجان!۔

ولیم: جو کچھ ہو رہا تھا وہ کیا کم برا تھا اس پر تم خون کر بیٹھے۔

ایڈرن: میں نے جو کچھ کیا ٹھیک ہی کیا۔

ولیم: جب دل اپنی حس کھو بیٹھتے ہیں تو اُن کے لئے کوئی مغفرت نہیں۔

ایڈرن: مغفرت، غفور، غفار، جب سے ان سپاہیوں کا قدم آیا آپ کی زبان پر بس یہ ہی ہے۔ کیا کیا ہے اس بخشنے والے نے ہمارے لئے؟ آپ نے تو گھنٹوں اس کی بارگاہ میں مناجات کی کہ ہمیں ان کے ظلم و تشدد سے محفوظ رکھ جو ہماری زمینیں ہم سے چھین لینا چاہتے ہیں۔ دردبھری مناجات! لیکن ہوا کیا۔ کیا خدا نے فوجی لاریوں کے پہیوں کی حرکت بند کر دی۔ جی نہیں بالکل نہیں۔ یہ کیسا خدا ہے جو اس کو گوارا کرتا ہے کہ فوجی شہریوں کو ان کے گھر سے نکال باہر کریں صرف اس لئے کہ یہ وادی فوج کی تربیت گاہ

بن جائے۔

ولیم: تم تو ایک ننھے بچے کی طرح باتیں کرنے لگے جو کچھ نہ جانتا ہو۔

ایڈرن: مگر میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ کھیت، غلہ اور پھل اگانے کے لئے ہوتے ہیں۔ گولا بارود اگلنے کے لئے نہیں ہوتے۔

ولیم: یہ غیر شریفانہ ہے کہ....

ایڈرن: یہ یقیناً غیر شریفانہ ہے کہ مقدس زمین کو موت کی آغوش بنا دیا جائے۔

ولیم: تمہاری وہ گولی جو اس غریب سپاہی کی جان لے گئی کچھ کم غیر شریفانہ تھی؟

ایڈرن: اس سے ان لوگوں پر کم از کم یہ تو آشکارا ہو گیا کہ وادی میں اینٹ کا جواب پتھر دینے والے بھی موجود ہیں۔ رہے آپ لوگ، بے ضرر بھیڑوں کا گلہ۔

ولیم: خدا ہم سے فرماتا ہے کہ......

ایڈرن: پھر وہی اللہ فرماتا ہے، خدا فرماتا ہے۔

ولیم: بعض اوقات تو مجھے خدا پر ترس آتا ہے۔ معاملہ کوئی بگڑا اور اس پر الزام عائد۔ ذمہ دار وہ۔

ایڈرن: وہ نہیں تو پھر کون، "ہم ان کے معاملات سنوارتے ہیں جو ہمارے اطاعت گزار بندے ہیں۔"

ولیم: میں ایسے خدا کا قائل نہیں جو جان بوجھ کر گر کر چوٹ کھانے والے کو اٹھا کر بے پناہ شفقت سے اس کی گرد جھاڑے، اس کو اور چمکارے (ایڈرن تیزی سے دالان دروازے کی طرف جھپٹتا ہے۔ باہر جھانکتا ہے اور کسی کو نہ پا کر مطمئن ہو جاتا۔ ولیم کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ وہ تھکا ماندہ معلوم ہوتا ہے) یہ باتیں جو یہاں وقوع پذیر ہو رہی ہیں۔ میرا بڑھاپا شاید مجھے انھیں سمجھنے نہیں دے رہا ہے۔ شاید تم ٹھیک کہتے ہو کہ ہمیں سپاہیوں کے سامنے اس عجز و انکسار سے نہیں پیش آنا چاہئے تھا۔ مقدس بائبل، میرا ایمان، بیکس، ناتوان اور بے سہارا ہی زمین کے وارث ہوا

تم بھی جانتے ہو ہم نے وہ ورثہ پایا۔ زمین ہماری ہے، ہمارے پسینہ نے، ہمارے اعضاء کے کس بل نے، ہمارے ذہن کی اُپج نے اس بیابان کو سبزہ زار بنایا ہے۔ ہمارے اس فخر کو ہم سے کوئی نہیں چھین سکتا۔

ن: مگر یہ اندھے فوجی اس کو کہاں دیکھتے ہیں۔

: ہمیں ان کے اس اندھے پن کو معاف کر دینا چاہئے۔

ن: تو گویا یہ درست نہیں ہے کہ ہم اپنے ورثہ کے لئے لڑیں

: بس وہی ٹھیک ہے جو اس پیدا کرنے والے کی نظر میں ٹھیک ہے۔

ن: (انتہائی بے صبری سے) اُفوہ یہ مہمل باتیں۔ میں لڑوں گا آخر وقت تک لڑوں گا۔

: مگر ان کی طاقت تمہیں انجام کار ناکام بنا دے گی۔

ن: یہ ہی سہی مگر میں لڑوں گا ضرور!

: (دروازہ سے) ایڈرن۔ کھانا تیار ہے

ن: ابھی آیا

: ایڈرن، تم اپنی ماں سے بھی زیادہ چڑچڑے ہو۔ اِس نوجوانی میں یہ چڑچڑاپن زیب نہیں دیتا ہے اور بڑھاپے میں تو قطعی گناہ ہے۔

رن: ممی سمجھدار ہیں، وہ ہر چیز کو دیکھتی ہیں، ہر چیز کو پرکھتی ہیں۔

رین: ایڈرن جلدی کرو۔ ایک پل بھی ضائع نہیں کیا جا سکتا۔ وہ کسی لمحہ بھی یہاں آن دھمکیں گے۔

رن: ابو! میں آپ کی دعاؤں کا محتاج ہوں۔

م: بڈھے بکواسی کی دعاؤں کی کیا اہمیت تمہارے لئے؟

رن: آپ میرے باپ ہیں، مجھے دعاؤں سے نوازیئے، میری رخصت کا وقت آن پہنچا ہے۔

م: (فیصلہ کن لہجے میں) میں اس سرزمین کو جو ہماری ہے انسان کے خون سے لالہ رنگ نہیں بنانا چاہتا۔ خدا کے نافرمانبردار میری دعاؤں کے مستحق نہیں۔ مگر خدا کے لئے میری

زبان پر دعا ہے اور نہ دل میں جگہ (ولیم کھڑا ہو جاتا ہے۔ ایک لمحہ کے لئے باپ
کی آنکھیں چار ہوتی ہیں۔ ایڈرن روانہ ہو جاتا ہے)

ایڈرن: خدا حافظ ابا جانی!!

ولیم: (دھیمے لہجہ میں) اللہ کی امان بیٹے۔

(ایڈرن بائیں طرف دروازے سے باہر جاتا ہے۔ نظروں سے اوجھل ہونے
پہلے وہ اپنے باپ کو نظر جما کر دیکھتا ہے۔ میرین اس کے پیچھے پیچھے جاتی ہے۔ ولیم بہت
اور افسردہ نظر آتا ہے۔ پھر وہ الماری کی طرف بڑھتا ہے۔ انجیل مقدس اٹھا کر میز پر لا
ہے۔ یہاں بیٹھ کر جیب سے چشمہ نکالتا ہے۔ رومال سے اس کے شیشے صاف کر کے آنکھ
لگاتا ہے، انجیل کھولتا ہے اور اونچی آواز سے پڑھتا ہے "وہ کبھی پہاڑوں کی بلندیو
جاتے ہیں، وہ وادیوں میں اترتے ہوئے اس جگہ پہونچ جاتے ہیں جو تو نے اُن کا ملجا
قرار دی ہے...... حمد و ثنا اُس ذات کے لئے جو پہاڑوں کی وادیوں میں بہاریں
جو پہاڑیوں پر ابرِ رحمت برساتا ہے۔ زمین تیری عطا سے مالا مال ہے۔ تیری عطا جو جا
کے لئے سبزہ اور انسانوں کے لئے پھل اور پھول بن جاتی ہے۔")

(سوالو، داہنے دروازہ سے جھپٹ کر اندر آتا ہے، وہ کچھ بوکھلایا ہوا ہے
اس کے ہاتھ میں ایک ریوالور ہے۔)

سوالو: مسٹر پریس، کہاں ہے وہ!

ولیم: (آہستہ سے اس کی طرف چہرہ کرتے ہوئے اور عینک کے حلقوں کے اوپر سے
ہوئے) میں انجیل کی تلاوت کر رہا ہوں۔

سوالو: (تلملا کر) آپ کا بیٹا۔ وہ اس گھر میں آتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔ بتایئے وہ کہاں
آپ اُس کو چھپا رہے ہیں تو آپ اپنے لئے اور زیادہ مصیبتوں اور پریشانیو
دے رہے ہیں۔

: کیا آپ مجھے مصائب سے ڈرا رہے ہیں۔

: دیکھئے میں نے بہت صبر سے کام لیا ہے۔ میں نے بہت سی ایسی باتوں کو گوارا کیا، جو مجھے گوارا نہ کرنا چاہئے تھیں۔

: جی تو پھر!

: آپ کے بیٹے نے قانون شکنی کی ہے۔ آپ کا اُس کو پناہ دینا بھی قانون کی خلاف ورزی ہے۔ بتلایئے وہ کہاں ہے؟

: (بائیں دروازہ سے داخل ہوتے ہوئے) آپ ذرا دیر سے پہونچے جناب! اب وہ یہاں نہیں ہے۔

: یہ سراسر جھوٹ ہے۔ وہ اس گھر میں آتا ہوا دیکھا گیا۔ وہ کھڑکی میں سے آیا۔

: خدا کے لئے مجھے سکون سے انجیل پڑھنے دیجئے۔

: (سوالو سے) تو آپ کا یہ خیال تھا کہ وہ آپ کے انتظار میں یہاں بیٹھا رہے گا، وہ کبھی کا جا چکا جناب!

: اُف۔ میں نے اگر ایک لمحہ بھی سوچا ہوتا۔

: سوچنا ہے ہی تکلیف دہ عمل، اُس سے آپ کو کیا علاقہ؟ سنئے میرا شوہر جا چکا ہے۔ اُن ہی پہاڑیوں پر جہاں آپ اس کو نہیں پا سکتے۔ وہ ابھی عقبی باورچی خانہ میں تھا اور وہیں سے کھڑکی سے باہر نکل گیا۔ (ایک سپاہی صحن میں سے جھپٹ کر اندر آتا ہے۔)

: معاف کیجئے گا جناب، وہ باہر ہے، ہم نے اسے ڈھونڈ نکالا۔

: ٹھیک ہے، سارجنٹ سے کہو کہ گھر کا محاصرہ کرلیں۔ ہاں تو کہاں بتایا۔ (وہ یہ جملہ ادا کرتے ہوئے صحن میں بڑھتا چلا گیا۔)

(داہنے دروازہ کی جانب تیزی سے جاتی ہے اور باہر جھانکتی ہے) اللہ میرے! کاش

وہ نکل بھاگے۔! اس کو بچالے۔!!

ولیم: (انجیل کی طرف متوجہ ہو کر پھر اس کو پڑھنے لگتا ہے) "آدمی صبح سے فرائض کی انجام دہی !
پسینہ بہاتا ہے۔ مشقت اٹھاتا ہے۔ شام اس کے لیۓ راحت کا پیغام لاتی ہے۔ پیدا کر
والے، ہر چیز سے تیری کاریگری ٹپکتی ہے۔ زمین کا سینہ تیری نعمتوں سے معمور ہے۔"

میرین: (ایک دم تڑپ کر) وہ کھلیان کی طرف جارہے ہیں۔ ایڈرن وہیں تو چھپا ہے۔ کاش
وہ مچان کے دریچہ میں سے کود کر گھاس کے پولوں پر جا پڑے، بس یہ ہی بچ نکلنے کا
امکان ہے (ولیم متوجہ ہوۓ بغیر، انجیل کی تلاوت جاری رکھتا ہے۔)
اللہ میرے، اُسے بھاگ جانا ہی چاہیۓ۔ اگر وہ کہیں گولی چلا بیٹھا تو وہ اس کو پکڑ لیں
گے۔ میں بھاگ کر پہونچوں، وہ مجھے دیکھ نہ پائیں گے، میں کھلیان کے پیچھے سے اسے
آگاہ کیۓ دیتی ہوں (وہ ولیم کی طرف دیکھتی ہے۔ وہ تلاوت میں مشغول ہے۔ و
مڑتی ہے اور دوڑ پڑتی ہے۔ ولیم پھر بہ آواز بلند پڑھنے لگتا ہے۔)

ولیم: جب تک سانس ہے میں یونہی حمد کے گیت گاتا رہوں گا۔ میں یونہی حمد و ثنا کرتا رہو
گا جب تک میری حیات قائم ہے۔
(صحن میں چیخنے اور گولیوں کے چلنے کی آواز بلند ہوتی ہے) میری روح کو پاکیزگی بخش
پاک پروردگار۔ حمد و ثنا تیرے لیۓ رب جلیل۔ (جین بائیں طرف سے آہستہ آہ
آتی ہے۔ اس کے آنسوؤں سے بھیگے ہوۓ چہرے پر ایک ہول سی طاری ہے۔ و
میز کی طرف آتے ہوۓ مُنہ ہی مُنہ میں بولتی ہے) ولیم! ولیم! یہ تازہ مصیبت تو دیکھ
(ولیم کچھ کھویا کھویا عینک اُتارتا ہے۔ انجیل مقدس کو بند کرتا ہے۔ اُٹھ کر اس کو
جاتا ہے)

ولیم: ہماری برداشت سے باہر نہیں، جین، ہونے دو۔
(سوالو داہنے دروازے کی طرف نظر آتا ہے۔ وہ میرین کا جسم اپنے ہاتھوں پر اُٹھا

وہ ڈیوڑھی پر ٹھہر کر بوڑھے میاں بیوی کی طرف دیکھتا ہے۔ ولیم جین کے شانے پر ایسے کئے ہوئے ہے جیسے وہ اس کو کسی زد سے بچا رہا ہو۔ سالو آہستہ آہستہ کمرے میں آتا ہے)

: میں کہوں تو کیا کہوں !

: میرا بیٹا ! ؟ کیا ہوا میرے بیٹے کو ؟

: وہ بھاگ نکلا، اس کی بیوی (نعش کے چہرے پر نظر جماتے ہوئے) گولیوں کی بوچھار میں آگئی۔ میں نے اپنے آدمیوں کو روکا بھی، لیکن کوئی بے صبرا جوش میں نہ رک سکا اور اُدھر یہ ہلاک ہوگئی۔ مرگئی (جین بے قرار ہوگئی، ولیم کے کاندھے سے لگ کر سسکیاں لے کر رونے لگی۔ ولیم حیرت زدہ آنکھیں پھاڑے سالو کو دیکھتا رہا۔)

: وہی جلاتا ہے وہی مارتا ہے۔ اس کو اس کے بستر ہی پر لٹا دو۔ (سالو کمرے میں سے گذرتا ہوا بائیں دروازہ تک جاتا ہے۔ جین سسکیاں بھرتی ہوئی اُس کے پیچھے ہے۔ ولیم، کاندھے جھکائے جیسے کہ ان پر بے حد وزن رکھا ہو، کھڑا رہا۔ ذرا سے وقفہ کے بعد وہ اس طرف جاتا ہے جہاں وہ ٹوٹا ہوا بکس اور بکھری ہوئی مٹی پڑی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ جھکتا ہے اور مٹھی بھر مٹی اٹھاتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ اس پر میرین کے خون کے چھینٹے ہیں۔) خون، اس کا گرم گرم جوان خون، اس بوڑھی بوڑھی عمر رسیدہ مٹی پر۔ وہی ارضِ بسیط کا مالک ہے اور جو کچھ اس کے سینہ میں ہے۔ (وقفہ) پاک پروردگار، رحم فرما ہم پر، اپنی رحمت سے نواز (اور یہ کہتے کہتے اُس کا سر جھکتا ہے اور دونوں کاندھے جیسے آپس میں مل گئے ہوں۔)

پردہ گرجاتا ہے

م، ندیم (علیگ)

ذاکر صاحب کا ایک خط

ذاکر صاحب کا یہ خط نواب سر محمد مزمل اللہ خاں شروانی رئیس بھیکم پور (وفات ۱۳۸
کے نام ہے۔ نواب صاحب کا سرسید احمد خاں سے قلبی تعلق تھا۔ ہندوستانی مسلمانوں کی
تعلیمی تحریکوں سے بھی دلچسپی تھی۔ قومی ترقی اور فلاح وبہبود کے لئے زندگی بھر کوشاں ر
۱۹۲۵ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔ اور ۱۸۹۸ سے ۱۹۱۸ تک جوائ
سکریٹری کے فرائض انجام دئے۔ یوپی کے ہوم ممبر بھی منتخب ہوئے۔ اپنی فیاضی کے لئے ب
مشہور تھے۔ مختلف اداروں کو کئی لاکھ کی امداد دی۔

جس خطبہ کا ذکر ذاکر صاحب کے خط میں ہے، وہ ۴۵ ویں ایجوکیشنل کانفرنس من
میرٹھ ۳۱ مارچ و یکم و دوم اپریل ۱۹۳۴ء کے لئے لکھا گیا تھا۔ یہ خطبہ مسلمانوں کی تعلیمی پالیہ
نظر ثانی سے متعلق ہے اور جامع و خیال انگیز ہے اور اس سے آج بھی فائدہ اٹھایا جا سکتا
اس خطبہ میں مسلمانوں کے مختلف تعلیمی اداروں کی مخلصانہ کوششوں کا بھی ذکر ہے۔

خطبہ کے چند اقتباسات یہاں پیش کئے جاتے ہیں:

"گزشتہ نصف صدی میں قومی مجالس کے بڑے بڑے ولولہ انگیز مناظر
ان آنکھوں نے دیکھے اور ان کے اہتمام و انصرام میں شرکت کی، کچھ کہا بھی
اور بہت کچھ سنا بھی۔ سرسید کو دیکھا اور برتا۔ سات سال کی عمر سے یہ سلسلہ ا
شروع ہوا۔

۵ حلقۂ پیر مغانم ز ازاں در گوش است
ما ہمانیم کہ بودیم و ہماں خواہد بود

بزرگان کے جانشین نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک کو دیکھا اور ان کے ساتھ کام کیا اور کام کا صلہ ہمیشہ یہ سمجھا کہ ہماری سعی و محنت بار آور ہو اور ہم اپنی قوم کو ابھرتا اور آگے بڑھتا ہوا دیکھ کر حقیقی مسرت حاصل کریں۔ لیکن کس قدر حیرت اور افسوس کا مقام ہے کہ جیسے جیسے زمانہ آگے بڑھتا جار ہا ہے ہماری قوم کا قدم پیچھے ہٹتا جار ہا ہے۔ یہاں تک کہ اب قومی جلسے بھی بے کیف نظر آتے ہیں اور سر سید مرحوم کے عہد میں جو روح ان جلسوں میں کام کرتی تھی اب اس کے دیکھنے کو آنکھیں ترستی ہیں۔ حیران ہوں کہ کیا کہوں اور کیسے کہوں۔"

خطبہ صدارت اجلاس چہل و پنجم آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس

(صفحہ ۳ ـــ ۴)

جامعہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

".....اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ موجودہ تعلیم میں نقائص ہیں اور بغیر حکومت کے تعاون کے ان مشکلات کا دور ہونا ممکن نہیں اور حکومت کے ساتھ تعاون کا مسئلہ ایک ایسا مسئلہ ہے جیسا کہ جسم اور جان کا باہمی تعلق یا جیسا کہ ہندی میں کہا جاتا ہے کہ چولی دامن کا ساتھ ہے۔ صرف تعلیم ہی کا مسئلہ نہیں بلکہ ہر ایک ترقی کے مسئلہ میں ملکی گورنمنٹ کے تعاون اور ملک میں امن و امان اور اطمینان اور آرام کی سخت ضرورت ہے۔ اگر یہ نہیں تو اذا فات الشرط فات المشروط کا مسئلہ ہے۔ لیکن ملک میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو ایک غیر معین مدت تک اصلاح کا انتظار نہیں کر سکتے تھے اور آزاد تعلیم کا بلند تخیل ان کو ترغیب دے رہا تھا کہ ایسی تعلیم گاہ قائم کی جائے جو حکومت کی مداخلت سے یکسر آزاد ہو اور اس میں اعلیٰ تعلیم طلبار کی تربیت اور مذہبی پابندی کا بھی انتظام کیا جائے۔ چنانچہ اس تخیل نے جامعہ ملیہ کی صورت میں ظاہر ہوا جو پہلے نیشنل یونیورسٹی کے نام سے علی گڑھ

میں قائم ہوئی تھی اور پھر دہلی میں منتقل ہو گئی۔

یہ تعلیم گاہ نان کو آپریشن کے زمانہ میں سیاسی اسباب سے عالم وجود میں آئی تھی گویا وہ ایک نیم سیاسی اور نیم تعلیمی ادارہ تھا۔

لیکن جب حالات بدل گئے تو کافی تجربے کے بعد اس کے کارکنوں نے دانشمندی و تدبیر سے کام لے کر اس کو ایک خالص تعلیمی ادارہ بنا دیا۔ میرا خیال ہے کہ جن لوگوں کا مقصد انگریزی تعلیم سے حصول ملازمت نہیں ہے ان کو اس تعلیم گاہ سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ تعلیم سے متعلق ملک میں جس قدر تجربے بھی کئے جائیں وہ بہرحال نتائج کے لحاظ سے مفید ثابت ہوں گے اور ان مختلف تجربوں کے بعد حکومت اور پبلک دونوں کو ایک جدید نظام تعلیم مرتب کرنے میں آسانی ہو گی۔ من جملہ ان ہی جدید تجارب کے میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کو بھی ایک خوش آیند تجربہ سے تعبیر کرتا ہوں۔

(صفحہ ۴۹ — ۵۰)

ذاکر صاحب کا خط

۷۸۶

جامعہ ملیہ اسلامیہ — تار کا پتہ : "جامعہ" دہلی

مورخہ ۱۵ را پریل ۳۴ء — ٹیلیفون : ۲۲۱۹

ذو المجد و الکرم مدظلہ العالی — السلام علیکم و رحمۃ اللہ و

میرٹھ کانفرنس کے خطبہ صدارت کا ایک نسخہ شرف صدور ہوا۔ یاد فرمائی کا شکریہ کس کروں۔ پہلے پڑھ چکا تھا۔ پھر شروع سے آخر تک پڑھا۔ میں بالالتزام کانفرنس کے خطبا ہوں۔ لیکن مسلمانوں کی تعلیمی اور ملی بہبود سے قلبی تعلق کی جو روح پرور فضا اس سارے خ ہے وہ مشکل سے کبھی پہلے محسوس ہوئی۔ خدا کرے مسلمان اپنے بچے بھی خواہ کی آواز کو سنا

کی ہدایتوں کو سمجھیں اور ان پر عمل کریں۔

جامعہ کا ذکر ہی اس خطبہ میں آنا ہم لوگوں کے لئے کیا کم عزت افزائی کا باعث تھا کہ پھر اس عنوان سے ذکر آنا۔ خدا کرے آپ ہماری اس کوشش کو پھلتا پھولتا دیکھیں اور اس کے نتائج سے آپ کا دل خوش ہو۔

حکیم صاحب مرحوم و مغفور، افسوس کہ ہم میں سے اٹھ گئے اور جس پودے کی ابتدائی دیکھ بھال انہوں نے اپنے ہاتھوں سے فرمائی تھی اس کی جڑیں بھی ان کے سامنے اچھی طرح نہ جم پائیں۔ لیکن چند سال ان کی خدمت میں رہنے کی وجہ سے مجھے معلوم ہے کہ مرحوم کو آنجناب کی ذات گرامی سے کیسا گہرا تعلق تھا۔ ان کے دل میں بڑے بڑے ارمان تھے۔ وہ آپ کو جامعہ لانے کے منصوبے ہی کر رہے تھے کہ ہمیشہ کے لئے ہم سے رخصت ہو گئے۔ اب ہم بے یار و مددگار نوجوانوں کی جن کے سپرد حکیم صاحب مرحوم اس کام کو کر گئے تھے یہ تمنا ہے کہ آپ ہمارے کام سے خوش ہوں اور آپ کی خوشی سے آپ کے دوست اجمل خاں مرحوم کی روح خوش ہو۔

اب تک جو کچھ کیا ہے وہ اتنا کم اور ایسا حقیر ہے کہ اس کا ذکر کرتے شرم آتی ہے۔ مگر دل یہ ضرور چاہتا ہے کہ کچھ کام ہو جائے۔ دعا فرمائیے کہ ہماری نیتیں بخیر رہیں اور ہم اس اہم ملی کام کو اس طرح انجام دے سکیں کہ حشر میں آقائے ملت کے سامنے رسوائی و شرمساری نہ ہو۔ آمین۔

یہ معلوم کر کے کہ آنجناب ناسازی طبع کی وجہ سے میرٹھ تشریف نہ لیجا سکے تردد ہے۔ خدا کرے مزاج گرامی اب بخیر ہو۔ میرا قصد تھا کہ میرٹھ حاضر ہو کر آنجناب سے دہلی تشریف لانے کی التجا کروں۔ لیکن افسوس کہ یہ ممکن نہ ہوا۔ اگر اب دہلی تشریف لانے کی کوئی تاریخ مقرر فرما دیجئے تو بڑا کرم ہو۔ ہماری حیثیت نہیں کہ اپنے کرایہ کے جھونپڑوں میں آپ کا خیر مقدم کریں۔ لیکن یقین جانئے کہ آپ کے قدم رنجہ فرمانے سے ہمارے دلوں کی افسردہ بستیوں میں رونق آجائیگی۔

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ زیادہ نیاز۔

خادم

ذاکر حسین عفی عنہ

تبصرہ و تعارف

(ضروری ہے کہ تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں بھیجی جائیں)

گل رعنا: مرتبہ جناب مالک رام، کاغذ و کتابت و طباعت عمدہ اور دیدہ زیب، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۰۶، قیمت سات روپے پچاس پیسے، ناشر علمی مجلس، چھتہ نواب صاحب، فراشخانہ، دہلی۔

مرزا غالبؔ مرحوم کا کلکتے کا سفر کئی لحاظ سے اہم ہے، اس شہر کی علمی حیثیت بھی، مدرسہ عالیہ اور فورٹ ولیم کالج کی وجہ سے، مستند و مُسلّم تھی، انگریزی سامراج اور مغربی تہذیب و تمدن کے تخریبی و تعمیری گوشوں سے ہندوستان کا یہی شہر اور خطہ سب سے پہلے واقف ہوا۔ اس شہر میں مرزا کا قیام کوئی ڈیڑھ سال رہا اور اس عرصہ میں اُن کی ملاقات یہاں کے ایرانی تاجروں اور فارسی اور اردو کے ادیبوں سے ہوئی کلکتے میں منجملہ اور اصحاب کے ان کی مولوی سراج الدین احمد سے بھی ملاقات ہوئی۔ ان کے نام تعارفی خط انھیں مولوی محمد علی خاں صدر امین باندہ نے دیا تھا جنھوں نے اثنائے سفر کلکتہ میں قیام باندہ کے زمانے میں بہت لطف و کرم کا اظہار کیا تھا، اور بعد کو بھی ہمیشہ ان کے ہمدرد و غمگسار رہے۔ "نامہ ہائے فارسی غالب" کے بیشتر خطوط انھیں کے نام ہیں۔ رفتہ رفتہ غالبؔ کے مولوی سراج الدین احمد سے تعلقات میں گہرائی اور گیرائی پیدا ہوگئی۔ غالبؔ نے اپنے ایک مقطع میں ان کا ذکر کیا ہے:

با سراج الدین احمد چارہ جز تسلیم نیست

ورنہ، غالبؔ! نیست آہنگ غزلخوانی مرا" (مالک رام)

غالبؔ نے انھیں مولوی سراج الدین احمد کی فرمائش پر وہیں کلکتہ میں اپنے اردو و فارسی کلام کا ایک انتخاب گل رعنا کے عنوان سے کیا تھا۔ یہ انتخاب مفقود و معدوم تھا، لوگ اس سے واقف نہ تھے کیونکہ اس کے دیباچے اور خاتمے کی فارسی عبارتیں ان کے کلیات نثر (فارسی) میں شامل ہو گئی تھیں، حسرت موہانی مرحوم کو اس کے چند اوراق موجد موہانی کے مینار سے مل گئے تھے۔ انھوں نے

دیوان غالب مرتب کیا اور اس پر تشریحی حواشی قلمبند کیے، تو ان اوراق سے لے کر وہ اشعار بھی شامل دیوان کر دیے جو ہنوز کہیں نہیں چھپے تھے۔" (مالک رام) لیکن مولانا حسرت کی وفات کے بعد ان کا کتب خانہ برباد ہو گیا اور اسی کے ساتھ یہ چند ورق بھی ضائع ہو گئے۔ شیدائیان غالب کی خوش قسمتی ملاحظہ کیجئے کہ غالب صدی کے موقع پر دیوان غالب کا نسخۂ بھوپال (بخط غالب) اور گل رعنا کا اصل نسخہ جسے خود غالب نے لکھا تھا، (لاہور میں) مل گیا، اسی کے ساتھ مالک رام صاحب کو گل رعنا کا جو نسخہ ۱۹۵۷ء میں سید نقی بلگرامی صاحب سے ملا تھا وہ بھی مرتب کی خوش سلیقگی اور دیدہ ریزی کی بدولت طباعت وکتابت اور تدوین وترتیب کے حسن کے ساتھ چھپ گیا، مالک رام صاحب کو یہ نسخہ کیسے ملا اور اسے پا کر اُن کی کیا کیفیت ہوئی، یہ داستان بڑے دلچسپ پیرایے میں انھوں نے اپنے مفید اور پُر از معلومات مقدمہ میں بیان کی ہے۔ انھوں نے جو تحقیقی حواشی لکھے ہیں، وہ اُن کی ژرف نگاہی کا ثبوت ہیں۔ سید نقی بلگرامی کے دادا نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی مرحوم (۱۸۴۲ - ۱۹۲۶) تھے اور ان کے دادا خان بہادر مولوی سید کرم حسین بلگرامی مرحوم (ف ۱۲۵۷ م) تھے، جس زمانے میں غالب نے کلکتہ کا سفر کیا، یہ وہاں شاہ اودھ کی طرف سے گورنر جنرل کے دربار میں سفیر تھے۔ فاضل مرتب لکھتے ہیں:

"مجھے یقین ہے کہ جب غالب نے گل رعنا مرتب کی ہے، تو مولوی کرم حسین نے انھی ایام میں اس کی نقل حاصل کر لی ہوگی۔ اندرونی شہادت سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ نسخہ انھوں نے خود تیار کرایا تھا؛ غالب نے اسے لکھوا کر ان کی نذر نہیں کیا تھا۔ اس نسخے میں بعض جگہ بیاض ہے۔ اگر اسے غالب نے پیش کیا ہوتا، تو یہ ممکن نہیں تھا؛ وہ بآسانی یہ مقامات مکمل کر سکتے تھے۔ ان جگہوں پر بیاض کا رہ جانا ظاہر کرتا ہے کہ کاتب منقول عنہ نسخے میں مصرع یا لفظ پڑھ نہیں سکا، اس نے جگہ خالی چھوڑ دی۔ وہ یقیناً اسے مکمل کرنا چاہتا ہوگا، جس کی اسے فرصت نہ ملی۔ یقین سے کچھ کہنا تو ممکن نہیں، لیکن قوی امکان ہے کہ منقول عنہ نسخہ خود غالب ہی کا لکھا ہوا ہو۔

"یہ نسخہ مولوی کرم حسین کے خاندان میں رہا اور نسلاً بعد نسلٍ سید مہدی حسین (مہدی یار جنگ) کو ملا۔ انھوں نے اسے اپنے بھتیجے جناب سید نقی بلگرامی کو عطا کیا اور انھوں نے اسے مجھے مرحمت فرمادیا۔"

مالک رام صاحب نے گل رعنا کی ترتیب وتحشیہ میں بھوپالی نسخہ دیوان اردو (بخط غالب جو ۱۹۶۹ء میں دستیاب ہوا۔) ، نسخہ حمیدیہ، نسخۂ شیرانی ، نسخہ مطبع نظامی (کانپور)، گل رعنا (نسخہ لاہور، ۱۹۶۹ء) ، کلیات نثر فارسی (مطبوعہ نولکشور پریس، ۱۸۶۸ء) ، دیوان فارسی (یہ نسخہ ۱۲۵۲ھ کا لکھا ہوا ہے) ، دیوان فارسی (مطبوعہ دہلی، ۱۸۴۵ء) اور دیوان فارسی (مطبوعہ نولکشور پریس، ۱۸۶۳ء) سے استفادہ کیا ہے اور مختلف نسخوں کے فرق کو بھی بیان کیا ہے۔ اس طرح اس میں کوئی شبہ نہیں کہ گل رعنا کی اشاعت غالبیات میں ایک اہم اور مفید اضافہ ہے۔

البتہ میں درخواست کروں گا کہ فاضل مرتب مولانا فضل حق خیرآبادی کی شعر فہمی اور ادبی صلاحیت کے بارے میں اپنی رائے پر نظر ثانی ضرور کریں۔ یہ لکھنا کہ مولانا فضل حق "عالم ہوں گے، انھیں شعر وسخن سے کیا واسطہ" کوئی متوازن اور صحیح رائے نہیں ہے، کیا غالب خود مولانا کی سخن فہمی کے قائل نہیں تھے؟ مزید براں فاضل مرتب سے گزارش ہے کہ اگر وہ مولانا فضل حق خیرآبادی کے حالات زندگی کا تفصیل سے مطالعہ فرمائیں تو یقیناً وہ اپنی رائے بدل دیں گے۔ (ضیاء الحسن فاروقی)

No. D - 768 February, 1971

The Monthly JAMIA

JAMIA NAGAR, NEW DELHI-25

جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

جامعہ

سالانہ چندہ
روپے

قیمت فی پرچہ
پچاس پیسے

جلد ۶۳	بابت ماہ مارچ ۱۹۷۱ء	شمارہ ۳

فہرست مضامین

مدیر

ضیاء الحسن فاروقی

خط و کتابت کا پتہ

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی   مطبوعہ: یونین پریس دہلی   ٹائٹل: دیال پریس

شذرات

انیسویں صدی کے مشہور ریفارمر اور انقلابی سید جمال الدین افغانی (۱۸۳۸ـــــ ۱۸۹۷ء) کی شخصیت محتاج تعارف نہیں، افغانستان، ہندوستان، ایران، مصر، ترکی، فرانس، انگلستان اور روس میں انھوں نے بڑی ہیجانی اور معروف زندگی گذاری، اُن کے متعلق بعض باتیں تو اتنی پیچیدہ اور متضاد ملتی ہیں کہ بڑے بڑے مورخ دنگ رہ جاتے ہیں۔ خود افغانی نے بہت کم لکھا لیکن مشرقی اور مغربی زبانوں میں ان پر بہت زیادہ لکھا گیا ہے اور یہ سلسلہ ابھی جاری ہے۔ اس سلسلہ میں ترک پروفیسر برکیس نیازی کی کتاب The Development of Secularism in Turkey, Montreal, 1964.

اور برنارڈ لیوس کی تصنیف Emergence of Modern Turkey, London, 1961 کے علاوہ دو بڑی دلچسپ کتابیں ۱۹۶۶ء اور ۱۹۶۸ء میں چھپی ہیں۔ ان دو کتابوں میں افغانی کی شخصیت و سیرت کو پُراسرار بنانے اور مجروح کرنے میں بڑی ہوشیاری سے کام لیا گیا ہے اور اُن کے مذہبی افکار و خیالات کو "مطلقہ" بتانے کی کوشش کی گئی ہے۔

ان کتابوں اور ان کے مصنف کے نام درج ذیل ہیں:

Elie Kedourie, Afghani and Abduh, London, 1966.

N. R. Keddie, An Islamic Respons to Imperialism, University of California Press Berkeley, 1968.

کیدوری اور کیڈی دونوں نے افغانی کے عرب سوانح نگاروں پر شدید تمندانہ جانبداری کا الزام لگایا ہے، خاص طور سے علامہ رشید رضا نے تاریخ الاستاذ الامام میں جو کچھ لکھا ہے اُسے پورے طور پر یہ مصنفین صحیح نہیں

مانتے۔ ان دونوں کی تحقیقی کاوشیں اسی سلسلہ کی دو کڑیاں ہیں جو تقریباً دو سو برس سے مغرب میں اسلام اور مسلما
کی بڑی شخصیتوں سے متعلق غلط فہمیاں پیدا کرنے کے لئے بڑے منظم طریقے سے جاری ہے۔ یہاں تک کہ اس کا ا
دنیائے اسلام کے نوجوان اثر پذیر ذہنوں پر پڑتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہم اپنی غفلت، سہل انگاری، ور
کی کمی اور زندگی کی دوسری دشواریوں کے سبب مغرب کے تحقیقی معیار کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ لیکن ہم تو اپنی ذہا
سے بھی پورا فائدہ نہیں اٹھاتے اور ان کتابوں میں جو تضادات ہوتے ہیں اور جن کی بنیاد پر اکثر مستعمل تحقیقی موا
کی ساری تعبیرات و تشریحات ہی مشتبہ ہو جاتی ہیں، انھیں دیکھ نہیں پاتے۔

مثال کے طور پر، محمد المخزومی کی کتاب خاطرات سید جمال الدین اسد آبادی جس کا پہلا ایڈیشن بیروت سے ۱۹۳۱
اور دوسرا دمشق سے ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا اور جس کا مرتضیٰ مدرسی چہاردہی کا کیا ہوا فارسی ترجمہ تبریز میں ۱۹۵۰
چھاپا گیا، افغانی کی وفات کے چونتیس ۳۴ برس بعد منصۂ شہود پر آئی۔ کہا جاتا ہے کہ اس میں اُن ملاقاتوں اور گفتگ
کا بیان ہے جو مخزومی کی سید جمال الدین افغانی سے اس زمانے میں ہوئیں جب وہ سلطان عبدالحمید کی دعوت پر ق
آئے تھے اور ۱۸۹۲ سے ۱۸۹۸ تک وہیں مقیم رہے تھے۔ پروفیسر کیڈی اور پروفیسر کیدوری دونوں نے بعض اہ
نئے امور سے متعلق اپنے دلائل کی بنیاد اس کتاب کے مشتملات پر رکھی ہے۔ مخزومی نے کتنے مبالغے اور کتنی عقی
سے کام لیا ہے، اور خاطرات کو کس قدر اپنی من گھڑت باتوں سے بھر دیا ہے، اس کی بہت سی مثالیں مل جاتی ہ
کتاب کی ہر بات کو صحیح سمجھ کر اسے اپنے دلائل کی بنیاد بنانا تحقیقی مزاج سے کسی طرح میل نہیں کھاتا۔ اس کے علاو
نے جمال الدین افغانی کے نام مفتی محمد عبدہ کے ایک خط کے دو ٹکڑوں کا عربی سے انگریزی میں ترجمہ کرکے یہ ثابت
کی ناکام کوشش کی ہے کہ افغانی کا ایک مقصد یہ بھی تھا، اور عبدہ اس سے نہ صرف واقف بلکہ اس کے مؤید تھ
(معاذ اللہ) مذہب اسلام کی بیخ کنی کی جائے اور اس کے حصول کے لئے انھوں نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ خو
اپنے آپ کو پُرجوش مسلمان ظاہر کریں۔ مکتوب مذکور محمد عبدہ نے بیروت سے ۸ شعبان ۱۳۰۰ھ کو افغانی کے پا
بھیجا تھا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب فرانس کے مشہور مفکر اور عالم رینان نے اسلام اور سائنس کے موضوع پر سو
یونیورسٹی میں تقریر کی تھی۔ یہ تقریر ۱۹ مارچ کے Journal des Debats میں چھپی تھی

جمال الدین افغانی نے اس سلسلہ میں رینان کا جو تعاقب کیا تھا وہ ۱۸ مئی ۱۸۸۳ء کے اسی جرنل میں شائع ہوا تھا عبدہ
کو اس کی اطلاع بیروت میں مل چکی تھی اور انھوں نے ایک شخص کو اس کے لئے تیار کر لیا تھا کہ جوں ہی جریدۂ مذکور کا ۱۸ مئی
کا شمارہ ملے، افغانی کے جواب کا عربی ترجمہ چھاپ دیا جائے۔ لیکن جب یہ شمارہ افغانی کے خط کے ساتھ پہنچا اور عبدہ
کو معلوم ہوا کہ ان کے مرشد نے کیا لکھا ہے تو انھوں نے عربی ترجمہ کا خیال چھوڑ دیا اور اپنے خط میں افغانی کو لکھا
کہ "الحمد اللہ، ہم ایک بڑی پریشانی سے بچ گئے۔" کیدوری نے اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "چونکہ
(رینان کی تقریر پر) افغانی کا تبصرہ خود روایتی اسلام پر ایک زبردست حملہ تھا، اس لئے اس پر متعجب نہ ہونا چاہیئے
کہ افغانی اور عبدہ دونوں اسلامی ممالک میں اس کی اشاعت کے مخالف تھے۔" اس کے بعد انھوں نے پھر عبدہ
کے خط کی چند سطروں کا ترجمہ دیا ہے: "ہماری سرگرمیاں آپ کے اس ٹھوس اصول کے مطابق جاری ہیں: ہم مذہب
کا سر مذہب ہی کی تلوار سے کاٹتے ہیں (نَحْنُ الآنَ عَلیٰ سُنّتِكَ القَوِيمَة لَانَقْطَعُ رَاسَ الدِّيْنِ اِلّا بِسَيْفِ
الدِّيْن۔)"۔ جب تک عبدہ کا پورا خط ہمارے سامنے نہ ہو ہم کوئی قطعی رائے نہیں دے سکتے، البتہ اس
فقرے کی کہ "ہم مذہب کا سر مذہب ہی کی تلوار سے کاٹتے ہیں" یہ تاویل بھی ہو سکتی ہے اور یہی صحیح معلوم ہوتی ہے کہ
مذہبی ریفارمر اصلاح مذہب کے لئے مذہبی کتابوں، مذہبی آثار اور مذہبی اصطلاحات ہی سے کام لیتے ہیں،
مارٹن لوتھر نے رومی کلیسا کے خلاف جب آواز بلند کی تھی تو کیا اس نے انجیل مقدس ہی کو اپنی سب سے بڑی
دلیل کے طور پر پیش نہیں کیا تھا؟

جہاں تک میں نے افغانی کو سمجھا ہے، یہ ہے کہ مذہب سے متعلق ان کا نظریہ روایتی و تقلیدی نہیں
بلکہ فلسفیانہ و مجتہدانہ تھا۔ فلسفے سے ان کی گہری دلچسپی ظاہر ہے اور اُس مکتب خیال کی یاد دلاتی ہے جس
کے ترجمان ابن سینا اور فارابی تھے۔ روایتی اسلام نے نہ تو پہلے اسے برداشت کیا تھا اور نہ اب
برداشت کر سکتا تھا، لیکن اس وجہ سے ہم افغانی کو ملحد یا مرتد نہیں کہہ سکتے، ہاں ان کی آزاد خیالی اور
مذہب سے متعلق ان کے ارتقائی و عقلی نظریے سے ہمیں اختلاف کا پورا حق ہے۔ رینان کے جواب
میں افغانی نے جو کچھ لکھا ہے اس میں ایسی باتیں بہت کم ہیں جن سے اتفاق کیا جا سکے، ہمارے سامنے

اس کا انگریزی ترجمہ ہے (اصل فرانسیسی نہیں) اور اسی کے پیشِ نظر ہم یہ کہہ رہے ہیں۔ ہوسکا تو آیندہ کسی اشاعت میں اس انگریزی ترجمہ کا اردو ترجمہ شائع کیا جائے گا۔

کیدوری نے تو مفتی محمد عبدہ کو دشمنِ اسلام ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، کتنا بڑا ظلم ہے یہ علم و تحقیق پر؟ عبدہ کی کتابیں، مضامین اور دوسرے علمی و مذہبی کارنامے کسی سے پوشیدہ نہیں، کیا ان کی تحریروں یا ان کے معاصرین کے بیانات میں کوئی ایسی بات ملتی ہے جس سے اُن کی مذہبی گمراہی ثابت ہو؟ ہمیں تو ایسا لگتا ہے کہ یہ ایک سازش ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ عہدِ حاضر کے اُن مسلم زعمارِ اصلاح کو جنھوں نے مسلمانوں کی ذہنی و سیاسی بیداری کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دیں، عیار اور موقع پرست ثابت کیا جائے تا کہ مسلمان ان سے بدظن ہو جائیں، ان کے مجتہدانہ افکار اور اصلاحی کارناموں کو باطل اور گمراہ کن سمجھیں اور یہ بات اُن کے ذہنوں میں اور راسخ ہو جائے کہ نجات درحقیقت تقلید ہی میں ہے۔ پہلے یہ کام علماء ہی کا ایک مخصوص طبقہ انجام دیتا تھا، اب یہ فن اور بھی پختہ اور پیچیدہ ہو گیا ہے اور ہمارے قدامت پسند عناصر بڑی ہوشیاری سے اور بڑے پُرپیچ راستوں سے گزر کر کبھی دیدہ و دانستہ اور کبھی انجانے، اُن طاقتوں کے حلیف بن گئے ہیں جن کے پاس بے شمار وسائل ہیں اور جو علم و تحقیق کے نام پر مسلمانوں کی مفید تجدیدی و اصلاحی کوششوں کے متعلق شک و شبہ کی بوجھل فضا پیدا کرتی رہتی ہیں۔

ر الحسن فاروقی

ذاکر صاحب کے چند پسندیدہ اشعار

جناب صدر، عزیزو اور دوستو۔

دو برس کے قریب ہو رہے ہیں کہ ۳ مئی ۶۹ء کو ذاکر صاحب کا سایہ ہمارے سر سے اٹھ گیا۔ اس ے لے کر آج تک مرحوم کس کس طرح اور کیسے کیسے موقعوں پر جامعہ والوں کو یاد آتے رہے ہیں، بات کر کیسے بیان کروں اور بیان کروں تو کس کے سامنے کہ آپ ہی تو اس یاد کی ٹیسوں کو محسوس ر رہے ہیں۔ میں نے خود ذاکر صاحب کو بہت کم دیکھا اور بہت کم سنا لیکن بے اختیار جی چاہتا ہے ج جبکہ وہ ہم میں نہیں رہے ہیں، ایک بات آپ سے کہدوں، نہ معلوم کیا بات تھی کہ جب کبھی میں صاحب کو دیکھتا تھا تو جی چاہتا تھا کہ دید کی یہ فرصت طویل ہو جائے اور میں انھیں دیکھتا رہوں، ن کی شخصیت کے حسن میں گم ہو جاتا تھا اور آپ جانتے ہیں کہ ان کی شخصیت کے کتنے حسین اور نازک پہلو تھے، اور ہر ایک اپنی ہی طرف کھینچتا تھا۔

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

ذاکر صاحب سے ہر طرح کے لوگ ملتے تھے، ان میں بے غرض اور شریف انسان بھی ہوتے

: کہتے ہیں کہ ۸ فروری ذاکر صاحب مرحوم کی تاریخ ولادت ہے۔ اس دن چونکہ چھٹی تھی اس لئے ۱۰ فروری کو جامعہ میں جلسہ ہوا۔ یہ تقریر اس جلسے میں پڑھی گئی۔

تھے، مصور، موسیقار، بُت تراش، ادیب اور شاعر بھی ہوتے تھے اور ان سے شریفانہ قدروں کا حوصلہ بخش احترام اور اپنے فن کی داد پاتے تھے، یہ محسوس کرتے تھے کہ عام طور پر جس زندگی کو وہ خالی پاتے ہیں، وہ حسین، بھرپور اور اس قابل ہے کہ گذاری جائے۔

ایک اچھے شاعر جو ابھی چند روز ہوئے، اپنے پیدا کرنے والے سے جا ملے ہیں، مجھ سے کہا کرتے تھے کہ ذاکر صاحب کو شعر سناتا ہوں تو سمجھتا ہوں کہ یہی حاصل شاعری ہے۔ ذاکر صاحب ہر فن شریف اور سارے فنون لطیفہ کے قدرداں تھے، اور اچھے شعر و ادب کی تو بہت قدر کرتے تھے، انہیں نہ معلوم کتنے اچھے اور خوبصورت شعر یاد تھے، انھیں زندگی میں ہمیشہ حُسن کی تلاش رہی، ان کا یہ قول مشہور ہے کہ اگر کوئی کام اس قابل ہے کہ کیا جائے تو وہ اس قابل بھی ہے کہ اچھی طرح کیا جائے، یہ کیا ہے؟ یہ وہی حُسن کی تلاش ہے۔ حُسن آواز میں ہو یا چہرے میں، شعر میں ہو یا فن میں، شخصیت میں ہو یا فطرت میں، حُسن حُسن ہے اور اپنا فطری مطالبہ رکھتا ہے، اس مطالبہ کا جواب وہی شخص دے سکتا ہے جس کے سینے میں ایک حساس دل ہو اور جسے مبدا رفیاض سے سوز و گداز کی دولت بیدار ملی ہو۔

آج کی صحبت میں، میں ان کے چند پسندیدہ اشعار آپ کو سنانا چاہتا ہوں کہ اس سے ان کے ذوق لطیف کا کچھ کچھ اندازہ ہو جائے گا۔ ان اشعار سے ان کی طبیعت کا حُسن بھی ظاہر ہوگا اور ایک حد تک یہ بھی کہ ان کی دنیائے دل خود اپنی جگہ اسرار و معارف کا ایک چمنستان تھی۔ ایسے ارباب بصیرت خود اپنی ذات میں ایک انجمن ہوتے ہیں، ان پر تنگی کے دن ہوں یا فراخی کے، ہر حال میں خوش اور مطمئن رہتے ہیں کہ ان کے دلِ آباد میں خوش اور مطمئن رہنے کے لئے عزم اور یقین کا بہت کچھ سرمایہ ہوتا ہے۔ مرزا بیدل نے ان اشعار میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے:

ستم ست گر ہوست کشد کہ بہ سیرِ سرو و سمن در آ
تو ز غنچہ کم نہ دمیدۂ، درِ دل کشا، بہ چمن در آ
پئے نافہ ہائے خجستہ بو، مپسند زحمت جستجو
بخیال حلقۂ زلف او، گرہے خورد و بہ ختن در آ

(ستم ہے اگر ہوس سیر تجھے سرو وسمن کی طرف لے جائے۔ تو خود کس کھلے ہوئے پھول سے کم نہیں ہے۔ ذرا دل کے دروازے کھول، ایک خوبصورت چمنستان تیری آنکھوں کے سامنے ہوگا۔ اچھی خوشبو والے مشک کے لئے تو عبث سرگرداں ہوتا ہے۔ اُس زلف گرہ گیر کا تصور کر اور ایک خُتن در خُتن دنیا کی مشکباریوں سے لذت اندوز ہو۔)

غالب کو، ان کے اپنے خیال میں، شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا تھا، لیکن ذاکر صاحب کے یدہ اشعار ان کے ذوق کی بلندی کے ترجمان ہیں، ان عناصر کی نشاندہی کرتے ہیں جن کے خوشگوار امتزاج ن کی شخصیت کا خمیر تیار ہوا تھا، ان روایات کو اجاگر کرتے ہیں جو مہذب مشرقیت کی جان رہی ہیں اور ج منتشر ہوتی نظر آرہی ہیں، اُن اعلیٰ قدروں کو ابھارتے اور روشن کرتے ہیں جن کی خدمت ایک ، بنیادی سمجھ کر، انھوں نے عمر بھر کی اور جن کی خدمت سے زندگی میں، خواہ یہ زندگی ایک فرد کی ہو ۔ جماعت کی، حُسن پیدا ہوتا ہے۔

نئی دہلی میں، ایک جلسے کو خطاب کرتے ہوئے، تقریر کے دوران ایک موقع پر جس انداز سے ں نے غالب کے یہ اشعار پڑھے، اس سے خود ان کا دل بھر آیا اور میں نے دیکھا کہ کئی آنکھیں نم ں:

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی، دردِ بے دوا پایا
دوستدار دشمن ہے، اعتمادِ دل معلوم
آہ بے اثر دیکھی، نالہ نارسا پایا
سادگی و پُرکاری، بیخودی و ہشیاری
حُسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا
غنچہ پھر لگا کھلنے، آج ہم نے اپنا دل
خوں کیا ہوا دیکھا، گم کیا ہوا پایا

ذاکر صاحب کی شخصیت جس سانچے میں ڈھلی تھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ سانچا ٹوٹ لیا ہے اس سانچے میں امتیاز و انتخار کے جو نقوش تھے وہ اس تمدن، اس تہذیب کے نقوش تھے جسے ہم اس دلیس کی ملی جلی، گنگا جمنی تہذیب کہتے ہیں۔ اس کی تشکیل میں ایرانی تہذیب اور فارسی زبان و ادب کا بڑا حصہ تھا، ہماری بڑی بدبختی ہے کہ ہندوستان نے فارسی سے قطع تعلق کر لیا ہے، اس کا ذوق ختم ہو گیا ہے اور ہمارا دیس ایک بڑی تہذیبی دولت سے محروم ہو کر رہ گیا ہے۔ ذاکر صاحب کے حصہ میں یہ دولت وافر طور پر، آئی تھی۔ اس کا اثر ان کی پوری شخصیت پر تھا۔ جن فارسی اشعار کو وہ ذوق و شوق سے پڑھتے تھے، یا اپنی تحریروں اور تقریروں کو فارسی شاعری کے جن آبدار موتیوں سے سجاتے تھے، ان سے اگر ایک طرف ان کے دل کا معاملہ کھل کر سامنے آجاتا تھا تو دوسری طرف پڑھنے اور سننے والوں کی نگاہوں میں حقائق و معارف کا ایک اور ہی عالم پھر جاتا تھا، تغزل کی رعنائیوں کے ساتھ بلندی خیال کی وجہ سے وہ عرفی شیرازی کی شاعری کو بہت پسند کرتے تھے۔ ان کی تحریر کا ایک ٹکڑا ہے:

"..... اور اگرچہ بے بسیگی میں ہمارے منصوبوں کی آہٹ پاکر بسا اوقات نیک دل ہمدردوں نے ہم پر ترس کھایا اور زبان حال سے فرمایا:

به سادگی تو رحم آدم دریں بازار

که تنگ دستی و امیدوار می گزری

لیکن محمد علی کی تربیت نے ہمیں دلِ شکستہ و ویراں کی قدر کرنا سکھا دیا تھا اور ہم بھی عرفی ہی کے الفاظ میں اپنے نیک دل ہمدردوں سے کہہ دیتے تھے کہ:

عرفی دلِ آباد بہ یک جو نہ خرد عشق

من ہم دلِ ویراں بہ دو عالم نہ فروشم"

اسی تحریر میں عرفی کا یہ گونجتا ہوا شعر بھی موجود ہے جو انھوں نے اپنی اور اپنے ساتھیوں کی مدت العمر کی حسرت تعمیر کے پس منظر میں اس طرح قلمبند فرمایا ہے کہ گویا عرفی نے انھیں کے لئے یہ شعر کہا تھا:

ملال عالیاں دم بدم دگرگون است

منم کہ مدت عمرم بیک ملال گذشت

والوں کے غم کی نوعیت لحظہ بہ لحظہ بدلتی رہتی ہے، ابھی کسی چیز کے غم میں مبتلا ہیں تو تھوڑے وقت
ںد کسی اور چیز کی فکر میں ہیں۔ لیکن میرا معاملہ سب سے الگ ہے، میری ساری عمر ایک اور صرف
غم میں بیت گئی، یعنی اپنے غم کے ساتھ میرا معاملہ 'وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے' والا
ہے۔)

ایک بار نئی دہلی سے جامعہ تشریف لائے تھے۔ آرٹ انسٹی ٹیوٹ میں ایک مختصر سا اجتماع تھا۔
ت ہونے کے لئے کار تک آ رہے تھے۔ کہنے لگے جامعہ میں بڑی اچھی اچھی عمارتیں بن رہی ہیں،
یک لمحے کے لئے خاموش ہوئے اور میری طرف دیکھ کر فرمایا، عرفی کا یہ شعر تو آپ نے پڑھا ہوگا:

من از فریب عمارت گدا شدم، ورنہ

ہزار گنج بہ ویرانۂ دل افتادست

میرات کے فریب میں آ کر معنوی طور پر فقیر بن گیا، حقیقت یہ ہے کہ دل کے ویرانے میں ہزاروں بیش بہا
نے پڑے ہوئے ہیں۔ حُسن کا گنج گرانمایہ تجھے مل جاتا۔ تو نے فرہاد نہ کھودا کبھی ویرانۂ دل)

پڑتا ہے کہ ذاکر صاحب کی کسی تحریر میں کلیم کا یہ شعر دیکھا ہے:

طبیعتے بہم رساں کہ بسازی بعالمے

یا ہمتے کہ از سر عالم تواں گذشت

ن ایسی بنا کہ دنیا سے تیرا معاملہ آسان ہو جائے، یہ نہیں ممکن تو ایسی ہمت پیدا کر کہ دنیا پر
اسے پیچھے چھوڑ کر آگے گذر جا سکے)

صاحب کے اس سوز اور اس درد کا ترجمان ہے جب دنیا کے مصائب کے مقابلہ میں سینہ سپر ہو کے
ن میں بے تابانہ آگے بڑھے جا رہے تھے اور راہ شوق کی منزلیں چلتے چلتے ہی آسان ہوتی ہیں۔
زل کے دو شعر جو انہوں نے اپنے ایک ساتھی کو ایک خط میں تحریر فرمائے تھے، راہ شوق کے مسافر

کی اس ذہنی و روحانی کیفیت کے ترجمان ہیں جب وہ آسودۂ منزل ہوکر اپنے پیر کے تلوؤں سے کانٹے چن
رہا ہے اور زیر لب گنگناتا رہتا ہے:

بدنامی حیات دو روزے نبود بیش
آنہم کلیم با تو چہ گویم چساں گذشت
یک روز صرفِ بستنِ دل شد بہ این و آں
روزے دگر بہ کندن دل زین و آں گذشت

(ہم پر زندگی کی تہمت صرف دو روزہ کیلئے تھی، اور اے کلیم! تجھے کیا بتاؤں کہ یہ دو دن کس طرح گذرے
بس یوں ہے کہ ایک دن تو دنیا کے این و آں سے دل لگانے میں صرف ہوا اور دوسرا دن' این و آں
سے دل کا دامن چھڑانے میں گذرا)

تنے پیدا کن از مشتِ غبارے — تنے محکم تر از سنگیں حصارے
درونِ او، دل دردآشنائے — چوں جوئے در کنار کوہسارے

ایک مشت خاک سے ایسی شخصیت پیدا کر جو پتھر کے مضبوط حصار سے بھی زیادہ محکم اور مضبوط ہو،
اس کے سینے میں ایک درد آشنا دل اس طرح ہو جیسے پہاڑوں کی گود میں ایک جوئبار۔ درحقیقت اقبا
کے مرد مومن کی یہی خصوصیات ہیں اور اس مفہوم کو انھوں نے مختلف انداز سے بیان کیا ہے، بانگ
کی ایک نظم میں لکھتے ہیں:

گذر جا بن کے سیلِ تند رو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا
مصافِ زندگی میں صورتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا)

ڈاکٹر اقبال کا یہ فارسی قطعہ اور سرمد کی مندرجہ ذیل رباعی

سرمد گلہ اختصار می باید کرد — یک کار ازیں دو کار می باید کرد

یا تن بہ رضائے دوست می باید داد   یا قطع نظر زیار می باید کرد

(سرمد! مختصراً یہ ہے کہ دو کام میں سے صرف ایک کام کرنا چاہیئے، یا تو زندگی رضائے دوست پر قربان کر دینی چاہیئے یا پھر دوست سے کوئی تعلق نہ ہونا چاہیئے)

ذاکر صاحب کی سیرت کے خد و خال کو پورے طور پر نمایاں کر دیتی ہے۔ یہ دونوں چیزیں، یعنی اقبال کا قطعہ اور سرمد کی رباعی، مشہور خوش نویس منشی علی محمد خاں کے قلم جواہر رقم سے لکھی ہوئی کاغذ کی تختیوں پر، ان کے ڈرائنگ روم کی زیب و زینت تھی۔ جمال ظاہری اور حسن معنوی کا کتنا اچھا امتزاج تھا یہ! جو لوگ ان کو پہچانتے تھے وہ اس کی تصدیق کریں گے کہ اس فولاد سیرت انسان کے سینے میں درد و محبت کے خمیر سے بنا ہوا کیسا نرم دل تھا۔ ہر دم رضائے الٰہی کا جویا یہ دل انسان کے دکھ درد پر کتنا تڑپتا تھا۔

مرحوم، غالب کی اردو شاعری کے شیدائی تھے، لیکن میرا خیال ہے کہ اردو شاعری کے مقابلہ میں وہ غالب کی فارسی شاعری کے زیادہ دلدادہ تھے۔ غالب کے جو فارسی اشعار بہت پسند تھے وہ انھوں نے لکھ لیے تھے۔ ان کی تحریروں میں بھی غالب کے فارسی اشعار ملتے ہیں۔ غالب کی رجائیت، زندگی سے متعلق ان کا نظریہ اور 'ہمہ اوست' کا صوفیانہ فکر، یہ ساری باتیں ذاکر صاحب کے لئے باعث کشش تھیں۔ انھوں نے جن اشعار کو منتخب کیا تھا، اُن میں عام طور پر یہی باتیں پائی جاتی ہیں، چند اشعار آپ کو سنا کر اس دراز نفسی کا سلسلہ ختم کرتا ہوں:

زما گرم است ایں ہنگامہ، بنگر شور ہستی را   قیامت می دمد از پردۂ خاکے کہ انساں شد

(یعنی دنیا کے ہنگامے اور زندگی کا شور و غوغا، سب کچھ انسان ہی کے دم سے ہیں، یعنی ان سب کو جب مختصر کیا تو انسان بنا دیا۔)

ہمچو رازے کہ بمستی ز دل آید بیروں   در بہاراں، ہمہ بویت، ز صبا می آید

(جس طرح عالم سرمستی میں کوئی راز افشا ہو جاتا ہے، اسی طرح بہار میں صبا سے تیری ہی خوشبو آتی ہے۔)

سرابے کہ رخشد بویرانہ خوشتر   ز چشمے کہ پیرایۂ نم نہ دارد

(وہ سراب جو صحرا میں چمکے اس آنکھ سے بہتر ہے جو تر نہیں ہے۔)

٤۔ مقصود ما ز دیر و حرم جز حبیب نیست ہر جا کنیم سجدہ بداں آستاں رسد

(دیر و حرم سے ہمارا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ دوست کی قربت حاصل ہو۔ یہ اخلاص نیت ہی ہے جس کے سبب ہم کہیں بھی سجدہ کریں وہ اس آستان تک پہونچ جاتا ہے۔)

٥۔ با من میاویز اے پدر، فرزند آذر را نگر ہر کس کہ شد صاحب نظر دین بزرگاں خوش نکرد

(اے باپ! مجھ سے جھگڑا نہ کر، آذر کے فرزند کو دیکھو۔ جو صاحب نظر ہوتا ہے بزرگوں کے دین سے اس کا (کچھ نہ کچھ) اختلاف ہو جاتا ہے۔)

٦۔ مژدۂ صبح دریں تیرہ شبانم دادند شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند

(اندھیری راتوں میں مجھے طلوع صبح کا مژدہ سنایا گیا ہے۔ ارباب قضا و قدر نے شمع بجھا دی اور آفتاب کے طلوع ہونے کا اشارہ دیا۔)

٧۔ گوہر از تاج گسستند و بدانش بستند ہر چہ بردند بہ پیدا، بہ نہانم دادند

(تاج سے موتی توڑ لئے گئے اور علم و دانش میں جڑ دیئے گئے، یعنی جو کچھ علی الاعلان لوٹا گیا تھا، مجھے چپکے سے دے دیا گیا۔)

٨۔ کفر و دیں چیست جز آلایش پندار وجود پاک شو پاک کہ ہم کفر تو دین تو شود

(کفر و دیں پندار وجود کی آلائش کے سوا اور کیا ہے۔ اپنے آپ کو اس آلائش سے پاک کرلے تاکہ کفر و دیں میں کوئی امتیاز باقی نہ رہے۔)

٩۔ خشک و تر سوزی ایں شعلہ تماشا دارد عشق یک رنگ کن بندہ و آزاد آمد

(دیکھنے کی چیز ہے کہ اس شعلہ سے خشک و تر سب جل جاتے ہیں، عشق غلام اور آقا کے امتیازات ختم کر دیتا ہے)

١٠۔ آغشتہ ایم ہر سر خارے بخون دل قانون باغبانی صحرا نوشتہ ایم

(ہم نے ہر نوک خار کو اپنے خون جگر سے تر کر دیا ہے، اور اس طرح ہم نے صحرا کی باغبانی کا قانون قلمبند کیا ہے۔)

ذاکر صاحب کا اولین مضمون

"طالب علم کی زندگی"

[ذیل کا مضمون اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ کے کاغذات میں ملا ہے، جسے ذاکر صاحب نے اس وقت لکھا ہے جب وہ آٹھویں کلاس کے طالب علم تھے۔ اس پر تاریخ نہیں درج ہے مگر جس مجموعے میں یہ شامل تھا، اس میں دوسرے مضامین ۱۹۱۱ء کے ہیں اور ۱۹۱۱ء میں ذاکر صاحب آٹھویں کلاس کے طالب علم تھے۔ اب تک کی تحقیق کے مطابق ذاکر صاحب کا یہ اولین مضمون ہے اور اس کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ بچپن کا یہ مضمون ان کی زندگی کا عنوان بن گیا۔]

جناب صدر انجمن صاحب و دیگر حضرات!

آج میرا مضمون طالب علم کی زندگی پر ہے۔ یہ ایک ایسا مضمون ہے جس سے آپ میں سے ہر ایک کو کچھ کچھ کیا اچھی خاصی واقفیت ہونا چاہیے، کیونکہ ہم طالب علم ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر ایک شخص کا تعلیم پانے سے کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے۔ ایک شخص وکالت کے لئے تعلیم پاتا ہے۔ دوسرا ڈاکٹری کے لیے۔ تیسرا عام سرکاری نوکری کے لیے۔ اور عام خیال یہ ہے کہ طالب علم کی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ وہ زیادہ دولت پیدا کرے۔ یہ مقصد ابتداء ہی سے طالبعلم اس قدر پیش نظر نہیں رہتا جس قدر اس کے والدین کے۔ ہر طالب علم کا یہ فرض ہے کہ اگر اپنے خاندان کی ش اس پر منحصر ہو تو اس کو اپنے اور والدین کے گزارے کے لیے پڑھنا چاہیے اور یہ کہنا بھی صحیح ہے شخص کی مالی ترقی سے قوم کی مجموعی ترقی ہوتی ہے، مگر طالبعلم ہونے کی وجہ سے صرف دولت پیدا

کرنے اور اپنے پیٹ بھرنے کو اپنا مقصد قرار دینا صرف طالب علم ہی کی نہیں بلکہ انسانیت کی بھی ذلت ہے۔ اگر طالب علم کا پڑھنے سے یہ مقصد ہو کہ میں اچھے اچھے کوٹ پہنوں گا۔ گاڑی پر بیٹھوں گا۔ حکام سے ہاتھ ملاؤں گا۔ تو وہ طالب علم کہلائے جانے کا مستحق نہیں۔ الغرض دولت پیدا کرنا طالب علم کی زندگی کا بدترین مقصد ہے جو ہو سکتا ہے۔

جس طرح تحصیل دولت طالب علم کی زندگی کا مقصد نہیں اسی طرح آرام طلبی سے بھی اس کو کنارہ کشی کرنی ضروری ہے۔ کیونکہ آرام طلبی ایک ایسی چیز ہے جو سب آدمیوں کو عموماً اور طالب علموں کو خصوصاً ترقی کرنے سے روکتی ہے۔ اب تک میں نے مختصر طور پر ان چیزوں کا بیان کیا ہے جو طالب علم کی زندگی کا مقصد نہیں ہونی چاہئیں۔ اب میں ان چیزوں کا بیان کروں گا جو طالب علم کو کرنی چاہئیں اور جو اس پر فرض ہیں۔ ان چیزوں کا ذکر کرنے سے پہلے یہ بیجا نہ ہو گا اگر میں طالب علم کی مختصر تعریف کر دوں۔

طالبعلم سے مراد وہ شخص ہے جو اپنی طبیعت کو موجودہ حالت سے بہتر کرنا چاہتا ہے، جو اپنی قوتوں کو جہاں تک بڑھنے کی ان میں طاقت ہے وہاں تک ان کو بڑھانا چاہتا ہے، جو علم اور خیالات کے ان خزانوں سے جو ہزاروں برس میں سیکڑوں نسلیں اپنے آئندہ آنے والے وارثوں کے لیے چھوڑ گئیں (یا گئی) تھیں فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہے جو اس بات کا خواہش مند ہو کہ جہاں سے عقل کا سبق اس کو ملے، جہاں سے عمدہ عمدہ باتیں اسے معلوم ہوں، جہاں سے دانش اور اعلیٰ خیالات ا کو میسر آسکیں، جہاں سے اسے دنیا کی بابت اور خود اپنی بابت ایسی باتیں معلوم ہوں جو اسے نہ اور جن کے معلوم کرنے سے اس کو دنیا میں مدد ملے گی، وہاں سے ان سب کو حاصل کرے۔

ہونے کے لیے کم سے کم اتنی عقل ضرور ہونی چاہیے کہ وہ نیک و بد میں، مفید و مضر میں، قابل پسـ قابل نفرت باتوں میں تمیز کر سکے۔ اس کو چاہیے کہ محنت و مشقت سے تعلیم حاصل کرے۔ اس کو چاہیے کہ تعلیم سے اپنے دل میں غور و فکر کا مادہ پیدا کرے۔ اس کو چاہیے کہ غور و فکر کے ذریعہ سے ان اہم باتوں کو حاصل کرنے کی کوشش کرے جو انسان کے لیے ممکن ہیں۔ لیکن وہ اس دنیا میں کچھ نہ

ہیں کرسکتا، وہ اپنا اثر دوسروں پر نہیں ڈال سکتا جب تک کہ وہ استقلال کے ساتھ اپنی اخلاقی سطح دنیا کی
نظروں میں بلند نہ رکھے۔ وہ شخص ہرگز طالبعلم کہلائے جانے کا مستحق نہیں جو اپنے فرائض کو استقلال اور
بیدگی سے پورا نہ کرے۔ اس کو ہرگز اپنے دل میں یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ وہ کچھ نہیں کرسکتا۔ کیونکہ اگر وہ
یسا خیال رکھے گا تو وہ کچھ بھی نہیں کرسکیگا۔ بلکہ اس کو ہمت کے ساتھ کئے جانا چاہیئے، کیونکہ اگر وہ
یسا کرے گا تو وہ ضرور اپنے کام (میں) کامیاب ہوگا۔

ہمت بلند دار کہ پیش خدا و خلق
باشد بقدر ہمت تو اعتبار تو

طالبعلم کی زندگی کا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ جو اوہام و تعصبات اس میں ہوں ان پر غالب آجائے
ور اس کو چاہیئے کہ ذلیل عادتوں کو چھوڑ دے۔ اس کو چاہیئے اور اس کا فرض ہے کہ وہ اپنے جاہل بھائیوں
میں تعلیم کی اشاعت کرے اور اشاعت تعلیم کو بھی اپنی تعلیم کا جز و سمجھے۔ اس کو علم کو علم کے لیے پڑھنا
چاہیئے اور ساتھ ہی اس کو زندگی کی ضرورت سے بھی غافل نہیں ہونا چاہیئے۔ اگر وہ دنیاوی ضروریات
سے غافل ہوگا تو وہ اپنے خاندان کو سنبھال نہیں سکتا اور وہ بنی نوع انسان کے لیے مفید نہیں ہوسکتا۔
ور اگر وہ پڑھا ہوا نہ ہو تو وہ کوئی آدمی نہیں اور وہ اس دنیا میں کچھ اچھے کام نہیں کرسکتا۔

خاکسار
ذاکر عفی عنہ
درجہ ہشتم مدرسہ اسلامیہ اٹاوہ

عبداللطیف اعظمی

ذاکر صاحب کے ابتدائی حالات زندگی

مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی دلآویز شخصیت، غیر معمولی ذہانت اور ان کے کثرت مطالعہ پر ان کی زندگی ہی میں بہت کچھ لکھا گیا تھا، انتقال کے بعد مزید لکھا گیا، مگر ان کے حالات زندگی پر بحیثیت [illegible] اور ابتدائی حالات زندگی پر بالخصوص بہت کم لکھا گیا ہے، پروفیسر محمد مجیب صاحب سے مرحوم کی مفصل اور مکمل سوانح لکھنے کی درخواست کی گئی ہے اور انھوں نے لکھنا شروع کر دیا ہے، اس لیے ایسے واقعات اور حالات کی تلاش ہے جن سے مرحوم کی شخصیت اور سیرت پر روشنی پڑتی ہو۔ ان کے واقف کار اور عقیدت مندوں کا حلقہ بہت وسیع ہے، اگر یہ لوگ اپنے مشاہدات اور تاثرات لکھ کر ہمیں بھیج[illegible] تو اس سے کتاب کی تیاری میں قابل قدر مدد ملے گی۔

ذاکر صاحب کی پیدائش حیدر آباد میں ہوئی، جہاں ان کے والد جناب فدا حسین خاں صاحب مع خاندان بہ سلسلۂ وکالت مقیم تھے۔ اس وقت کے رواج کے مطابق ان کی تعلیم و تربیت گھر پر ہوئی مگر ان کے والد بیمار ہوئے تو پورا خاندان اپنے وطن قائم گنج آگیا اور بالآخر اسی بیماری میں ان کا ۱۹۰۷ء میں ۳۹ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ ان کے انتقال کے بعد ذاکر صاحب کو ان کے دو بڑے [illegible] ـــ سب سے بڑے مظفر حسین خاں اور ان سے چھوٹے عابد حسین خاں ـــ کے ساتھ تعلیم کے لئے اسلامیہ ہائی اسکول بھیج دیا گیا، جہاں انھوں نے چھ سات سال [illegible] ۱۹۱۳ء ـــ تک تعلیم کی۔ ذاکر صاحب کی پہلی مادر علمی یہ اسکول ہے [illegible] ابتدائی زندگی کے متعلق بہت کچھ [illegible] صاحب

ہیں اٹاوہ گیا اور اسلامیہ انٹر کالج ـــــ سابق اسلامیہ ہائی اسکول ـــ کے پرنسپل جناب انعام اللہ خاں احب شروانی کی عنایت اور کوشش سے وہاں کے کاغذات دیکھنے اور ان لوگوں سے ملنے کا موقع جنھوں نے ذاکر صاحب کی ابتدائی زندگی کو بچشم خود دیکھا ہے۔ اس سلسلے میں جو معلومات حاصل ئیں انھیں ذیل میں پیش کرتا ہوں۔

ریخ پیدائش

سب سے پہلا مسئلہ ذاکر صاحب کی تاریخ پیدائش کا ہے۔ صحیح تاریخ کسی کو معلوم نہیں ہے۔ ان پاسپورٹ میں ۱۴ فروری ۱۸۹۷ء درج ہے اور ہائی اسکول کے سرٹیفکیٹ کے مطابق ۸ فروری ۱۸ء ہے اور اسی کے لحاظ سے، ان کی زندگی کے آخری زمانے میں سالگرہ منانے کا سلسلہ شروع یا۔ میرے استفسار پر مرحوم نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ ان کی صحیح عمر اسکول کے داخلہ فارم سے معلوم تی ہے۔ ان ہی سے یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ اسکول کے امتحان کے لیے ان کی عمر کم تھی، اس لیے اصلی ہ اضافہ کیا گیا ہے۔ میں ان کی زندگی ہی میں اٹاوہ جا کر صحیح عمر معلوم کرنا چاہتا تھا، مگر حالات نے غفلت نے اس کا موقع نہیں دیا۔ اس مرتبہ اٹاوہ گیا تو بنیادی مقصد داخلہ فارم کو دیکھنا تھا۔ خط ہے کہ یہ اب تک محفوظ ہے۔ اس کو دیکھ کر ذاکر صاحب کی بات کی تصدیق ہوئی، انھوں نے داخلہ ت جو عمر لکھی تھی، کئی سال کے بعد اس میں نو ماہ کا اضافہ کیا گیا ہے۔ ذاکر صاحب کا اسلامیہ ہائی اٹاوہ میں ۸ دسمبر ۱۹۰۷ء کو داخلہ ہوا ہے۔ داخلہ فارم میں تاریخ ولادت کا خانہ نہیں ہے، ہے اور اس کے دو کالم ہیں، سال اور مہینے۔ اس میں ذاکر صاحب نے اپنی عمر ۱۰ سال ایک ماہ ، جس کے مطابق ان کی تاریخ ولادت ۸ نومبر ۱۸۹۷ء ہوتی ہے۔ کوئی ۲ سال کے بعد ۲۳ ۱۹۱ء کو انسپکٹر آف اسکولس مسٹر ایف جے ڈیورس کے دستخط سے ۹ ماہ کا اضافہ کر کے اس عمر کو ۱۰ ہ کر دیا گیا ہے۔ [illegible] کے مطابق ذاکر صاحب کی تاریخ پیدائش ۸ فروری ۱۸۹۷ء ، اور اسی حساب سے [illegible]

علمی و تعلیمی کیفیت

ذاکر صاحب کا داخلہ پانچویں کلاس میں ہوا تھا۔ اسکالر رجسٹر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شروع کے دو تین سال کلاس کی حاضری بہت اچھی نہیں رہی ہے۔ پہلے سال تو داخلہ ہی تاخیر سے ہوا تھا یعنی مئی کے دسمبر میں، چنانچہ اس سال ۲۱۶ میٹنگ میں سے صرف ۲۰۶ حاضری ہے، اس کے بعد چھٹی کلاس میں میٹنگ میں سے ۳۶۵ اور ساتویں میں ۴۴۹ میٹنگ میں سے ۳۹۴ حاضری ہے۔ اس کی وجہ شاید صحت کی خرابی ہے۔ آٹھویں، نویں میں بہتر ہے اور دسویں میں بہت اچھی، یعنی حسب ترتیب ۶ میٹنگ میں سے ۳۷۴ ، ۴۶۱ میں سے ۴۱۷ اور ۳۹۷ میں سے ۳۷۶۔ مگر حاضری کی اس کمی کے ان کی تعلیمی کیفیت اچھی رہی ہے۔ پانچویں کلاس میں، جس سال تاخیر سے داخلہ ہوا ہے، تعلیمی کیفیت کے خانے میں "اچھا" (g. Success) لکھا ہوا ہے۔ چھٹی کلاس میں "4" لکھا ہوا ہے، جس کا مطلب شاید یہ ہے کہ وہ کلاس میں چوتھے درجے پر تھے، اس کے بعد ساتویں، آٹھویں اور نویں کلاس میں اول درجے میں پاس ہوئے ہیں۔ دسویں کلاس میں صرف یہ لکھا ہے کہ "Passed S.L.C."

ذاکر صاحب کے ساتھیوں اور معاصر طالب علموں کا بیان ہے کہ وہ بہت اچھے مقرر اور مضمون نگار تھے، اس لیے مجھے ان کے زمانۂ اسکول کے کسی مضمون یا لکھی ہوئی تقریر کی تلاش تھی۔ اٹاوہ میں پوچھ گچھ سے معلوم ہوا کہ ایک قلمی مجموعے میں ان کی کوئی تقریر یا مضمون ہے، مگر وہ مجموعہ اٹاوہ میں نہیں ملا، پرنسپل صاحب نے بتلایا کہ جواہر میوزیم کا جو سامان مسلم یونیورسٹی کی مولانا آزاد لائبریری کو منتقل کیا گیا ہے، شاید اس میں ہو، میں علی گڑھ گیا اور اس مجموعے کی تلاش کی تو خوش قسمتی سے مل گیا۔ اس میں ذاکر صاحب کا ایک مختصر مضمون "طالب علم کی زندگی" کے عنوان سے شامل ہے، جو جامعہ کے اسی شمارے میں شائع کیا جا رہا ہے۔ یہ مضمون صرف اسی لحاظ سے اہم نہیں ہے کہ یہ ان کا اولین مضمون ہے، بلکہ اس لحاظ سے بھی ہے کہ انھوں نے ۱۹۱۱ء میں جب وہ آٹھویں کلاس کے طالب علم تھے جو مضمون لکھا تھا ان کی زندگی کا عنوان بن گیا۔

اکر صاحب کے اساتذہ

ذاکر صاحب کے پہلے استاد، ماسٹر عبدالغنی صاحب ہیں، جو ایک نومسلم انگریز تھے[1]۔ (غالباً انھوں نے حیدرآباد میں پڑھایا ہوگا۔) مجھے ان کے بارے میں ابھی تک تفصیلات نہیں مل سکی ہیں۔ اسکول ساتذہ میں وہ سب سے زیادہ سید الطاف حسین صاحب سے متاثر ہوئے، جو ۱۹۰۴ء سے ۱۹۴۴ء ٹاوہ اسلامیہ ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ ۱۹۶۸ء میں جب ذاکر صاحب کی اکہترویں سالگرہ کے پر، ملک کی طرف سے دو کتابیں ـــ اردو میں نذر ذاکر اور انگریزی میں Presentation Volume، پیش کی گئی تھیں تو انھوں نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ مجھ پر سب سے بڑا احسان والدہ کا ہے اور اس کے بعد میرے استاد سید الطاف حسین صاحب مرحوم کا۔ اگر ان دونوں کی تربیت مجھے حاصل نہ ہوتی تو نہ جانے میں کیا ہوتا۔ اسی وجہ سے وہ ان کا بیحد احترام کرتے تھے اور ہی ان کا ذکر آتا تو ان کی آنکھیں پرنم ہو جاتیں۔ مجھ سے بیان کیا گیا ہے کہ ایک مرتبہ الطاف حسین ب نے ذاکر صاحب کو اپنے یہاں کے ایک قدیم طالب علم کے لیے سفارش کی۔ جب وہ یہ سفارشی خط اکر صاحب کے یہاں پہنچے تو ذاکر صاحب نے استاد کے احترام میں دفتر سے نکل کر ان کا استقبال

مجھے افسوس ہے کہ الطاف حسین صاحب کے حالات زندگی تفصیل سے نہیں معلوم ہو سکے مگر جس علوم ہوئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ذاکر صاحب کی سیرت و شخصیت کی بیشتر خوبیاں ان ہی کی منت ہیں، یہ ضرور ہے کہ ان کا میدان عمل محدود تھا اور ذاکر صاحب کا بہت زیادہ وسیع، اس ستاد کی تعلیم و تربیت کو زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آنے کا موقع ملا۔ یہ شاگرد کی شرافت تھی کہ استاد بشن کیا اور ان میں ایسی صلاحیت تھی کہ ہر چیز میں ان کا اپنا رنگ تھا، اپنی انفرادیت تھی۔ میں

---

[1] نذر ذاکر صفحہ ۵۰

نے الطاف صاحب کو نہیں دیکھا، البتہ ذاکر صاحب کو قریب سے دیکھنے کی عزت حاصل ہوئی ہے۔ الطاف صاحب کی جو خوبی بھی سنتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو ذاکر صاحب کی خصوصیت تھی۔ مثلاً بیان کیا جاتا ہے کہ انھیں اسکول اور طالب علموں سے اتنا گہرا لگاؤ تھا کہ ان کی ذات ان دونوں میں گم ہو گئی، انھوں نے سب کچھ، اپنی زندگی، اپنا روپیہ اسکول اور اس کے طالب علموں پر قربان کر دیا۔ اسلامیہ انٹر کالج کے موجودہ منیجر جناب نفیس الحسن صاحب نے بیان فرمایا کہ جب وہ ریٹائر ہوئے تو کچھ رقم جمع کر کے، ان کے حسن خدمت کے اعتراف میں ایک تھیلی ان کی خدمت میں پیش کی گئی، پہلے تو انھوں نے لینے سے انکار کیا، پھر فرمایا اسے اسکول میں جمع کر دوں گا، بڑی مشکل سے انھیں راضی کر کے یہ رقم ان کے نام سے ڈاکخانے میں جمع کرا دی گئی اور چونکہ اس کا خدشہ تھا کہ اس رقم کو وہ اپنی ذات کے علاوہ دوسروں پر خرچ کر دیں گے، اس کی پاس بک نفیس الحسن صاحب نے اپنے پاس رکھی اور اسی وقت دیتے تھے جب انھیں یقین ہو جاتا تھا کہ ان کے ذاتی خرچ کے لئے رقم نکلوائی جائے گی۔ اب اگر ان کے شاگردوں پر نظر ڈال لیجے تو معلوم ہوگا کہ اس نے ایثار و قربانی کی ایسی مثال قائم کی ہے جس کی نظیر بیسویں صدی کے ہندوستانی مسلمانوں میں بالخصوص جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں شاید ہی ملے۔

نفیس الحسن صاحب نے ایک اور واقعہ بیان کیا۔ اسلامیہ اسکول کے بانی خان بہادر مولوی بشیر الدین صاحب نے ایک کم خرچ ہوسٹل قائم کیا تھا، جس کے طالب علموں کو مفت کپڑا بھی ملتا تھا۔ کپڑا اس ہوسٹل کے تمام طالب علموں کے لیے ایک ہی طرح کا ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کی وجہ سے ان طالب علموں میں احساس کمتری پیدا ہونا یقینی تھا۔ ایک مرتبہ وہاں کوئی نمائش ہوئی، تو الطاف حسین صاحب نے محسوس کیا کہ ان طلبا کو ان کپڑوں میں وہاں جانے میں تامل ہوتا ہے، اسی وقت انھوں نے اسی کپڑے کی جو طالب علموں کو دیا جاتا تھا، اپنے لیے شیروانی بنوائی اور اسے پہن کر نمائش جانے لگے۔ اس کو سننے کے بعد میرا ذہن "بچوں کے گھر" (دہلی) کی طرف منتقل ہو گیا۔ یہ در اصل ایک یتیم خانہ ہے۔ ذاکر صاحب کا اس سے تعلق پیدا ہوا تو سب سے پہلے یتیم خانہ کے بجائے اس کا نام بچوں کا گھر رکھا۔ اس کی منجملہ اور اصلاحات کے ایک یہ کہ بچوں کو اگر کوئی شخص کھانا کھلانا چاہے تو وہ

گھر پر نہیں جائیں گے، کھانا بچوں کے گھر بھیج دیا جائے یا اسی کے باورچی خانے میں پکوایا جائے اور کوشش کی جائے کہ بچوں کو اس کا علم نہ ہو کہ یہ کھانا کسی اور کے یہاں سے آیا ہے۔

ذاکر صاحب کے ایک اور استاد مولوی فیاض خاں صاحب ہیں، جو ابھی حیات ہیں اور علی گڑھ میں مقیم ہیں۔ مولوی صاحب اسلامیہ ہائی اسکول میں ۱۹۱۰ء سے ۱۹۲۰ء تک عربی اور فارسی کے استاد اور ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ اور ڈائننگ ہال کے سپروائزر تھے۔ پروفیسر محمد مجیب صاحب کے ارشاد پر ان سے بھی ملا۔ انھوں نے ذاکر صاحب کی ذہانت، کثرت مطالعہ، خطابت، مضمون نگاری اور شائستگی کی بے حد تعریف کی۔ انھوں نے فرمایا کہ ذاکر صاحب ہوسٹل کے نظم وضبط کا بڑا لحاظ رکھتے اور پابندی کے ساتھ نماز پڑھتے۔ ان کا بیان ہے کہ ذاکر صاحب کو نہ تو کبھی ترک نماز کی وجہ سے سزا دی گئی اور نہ قاعدوں کی خلاف ورزی کے سلسلے میں۔ مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ اس زمانے میں قائم گنج کے بہت سے طالب علم تھے، جن کی شرارتوں اور لڑائیوں کی وجہ سے نظم وضبط قائم رکھنا بہت مشکل ہوتا تھا، مگر ذاکر صاحب کی شرافت اور منکسر مزاج طبیعت کی وجہ سے وہ اکثر کہا کرتے کہ "ذاکر! تم پٹھان نہیں، طبیعت اور مزاج کے لحاظ سے سید ہو۔" اساتذہ اور طالب علموں میں ذاکر صاحب کی ہر دل عزیزی کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے بیان فرمایا کہ شروع میں نماز نہ پڑھنے پر بہت سخت سزائیں دی جاتیں، مثلاً شہر جانے کا پاس بند کر دیا جاتا، یا کھیل میں شرکت کی اجازت نہ ملتی یا پلیٹ بند کر دی جاتی۔ ان سزاؤں سے قائم گنج کے لڑکے سخت پریشان تھے۔ ایک مرتبہ لڑکوں نے اسٹرائک کی اور پلیٹ بند کرنے کی سزا کو ختم کرنے کا خاص طور پر مطالبہ کیا گیا۔ اس اسٹرائک میں ذاکر صاحب اگرچہ شریک نہیں تھے، مگر مولوی صاحب کا بیان ہے کہ ان کی ہمدردیاں اسٹرائک کرنے والوں کو حاصل تھیں اور شاید اسٹرائک کی پشت پر ان کا ہاتھ بھی تھا۔ یہ اسٹرائک باوجود کوشش کے جب ختم نہیں ہوئی تو مولوی فیاض خاں صاحب کی رپورٹ پر ہیڈ ماسٹر نے اسٹرائک کرنے والوں کو اسکول سے نکال دیا۔ اس حکم کے بعد ذاکر صاحب مولوی صاحب کے پاس آئے اور اصرار کیا کہ اخراج کا حکم واپس لیا جائے۔ انھوں نے دلیل دی کہ طالب علموں سے کھانے کی فیس لی جاتی ہے تو پلیٹ بند کرنا کسی طرح جائز نہیں ہے۔ طالب علم جب کسی

قاعدے کی خلاف ورزی کریں تو کوئی اور سزا دی جائے، مگر پلیٹ بند کرنے کا طریقہ ظلم ہے اور اخلاقی لحاظ سے ناجائز ہے۔ مولوی صاحب کا بیان ہے کہ میں نے لڑکوں کے اخراج کی سفارش کی تھی، اس لئے بہت پریشان ہوا، مگر ذاکر صاحب کا استدلال اتنا صحیح اور موثر تھا کہ مجھے اپنے فیصلے پر نظرثانی کرنی پڑا اور بالآخر ذاکر صاحب کی ضمانت پر مجھے اپنی سفارش اور ہیڈ ماسٹر صاحب کو اپنا حکم واپس لینا پڑا۔ بعد میں پلیٹ بند کرنے کا طریقہ مستقل طور پر بند کر دیا گیا۔

ذاکر صاحب مولوی فیاض خاں صاحب کا بھی بہت احترام کرتے تھے۔ ذاکر صاحب جب وائس چانسلر ہو کر علی گڑھ گئے تو ان کی لڑکیوں کی تعلیم میں ذاتی طور پر مالی امداد دی اور ان کی سب سے چھوٹی لڑکی کے، جس نے ماشاء اللہ ایم ایس سی تک تعلیم حاصل کی ہے، جملہ اخراجات ادا کئے۔ ذاکر صاحب کے انتقال سے کچھ عرصہ پیشتر انھوں نے ملاقات کے لئے لکھا تھا اور ۶ر مئی کو ۵ بجے شام وقت مقرر کر کے اطلاع کر دی گئی، مگر اس سے پہلے ہی ۳ر مئی کو مالک حقیقی کی طرف سے ذاکر صاحب کا بلاوا آ گیا یہ ملاقات نہ ہو سکی، جس کا مولوی صاحب کو بیحد قلق ہے۔

"ذاکر صاحب کو ان کے پرانے ایم اے او کالج کے ساتھی مرشد کہتے بھی ہیں اور سمجھتے بھی ہیں، لیکن ذاکر صاحب اسکول کے زمانے میں بھی اپنے اسکول کے ساتھیوں کے مرشد تھے۔ ہر طالب علم ان کی بے انتہا عزت کرتا تھا اور ان کی تقلید کرنے میں فخر محسوس کرتا تھا۔۔۔ مرشد کو اس زمانے میں بھی اخبار پڑھنے کا شوق تھا۔ "پائنیر" معیاری اخبار سمجھا جاتا تھا۔ انھیں جلد سے جلد خبریں معلوم کرنے کی اتنی فکر اور اس قدر اشتیاق رہتا کہ وہ "پائنیر" روزانہ خریدنے کے لیے اٹاوہ کے اسٹیشن جاتے اور واپس آ کر طالب علموں کو خبروں کا نہ صرف ترجمہ کر کے سناتے، بلکہ ان پر تبصرہ بھی فرماتے۔"

(ذاکر صاحب کے اسکول اور کالج کے ساتھی، پروفیسر حبیب الرحمان مرحوم)

روشؔ صدیقی (مرحوم)

غزل

لگی ہے بھیڑ، بڑا میکدے کا نام بھی ہے
کچھ اس میں خوبیٔ رندانِ تشنہ کام بھی ہے

جنونِ شوق نے دل کو کیا تباہ، مگر
کچھ اس میں تیرے تغافل کا اہتمام بھی ہے

کتابِ زیست ہے یکسر حکایتِ غمِ دل
حکایتِ غمِ دل حرفِ ناتمام بھی ہے

سکونِ اہلِ خرابات عشق کیا کہیے
رُکی رُکی سی یہاں عمر تیز گام بھی ہے

بتانِ شہر ہم اہلِ وفا سے ہیں بیزار
بتانِ شہر کو اہلِ وفا سے کام بھی ہے

وہ شخص اپنی جگہ ہے مرقعِ تہذیب
یہ اور بات کہ قاتل اسی کا نام بھی ہے

چراغِ صبح کی افسردگی نہیں تنہا
کہیں قریب یہیں آفتابِ شام بھی ہے

درِ صنم پہ رُکے ہیں، مگر بہ زیرِ قدم
ہزار سلسلۂ گردشِ مدام بھی ہے

جو خلوتوں میں سکوت آشنا رہا صدیوں
وہی روشؔ سے سرِ بزم ہم کلام بھی ہے

محمد اجتبا حسینی ندوی *

امام شافعیؒ

شاعر اور ادیب

امام محمد بن ادریس شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ فقہ اسلامی کے چار مذاہب میں سے ایک صاحب
اور امام کی حیثیت سے مشہور و معروف ہیں۔ فقہ و حدیث میں ان کا جو امتیازی مقام ہے وہ مح
نہیں ہے۔ لیکن کم لوگوں نے اس پر توجہ دی ہے کہ وہ بلند پایہ شاعر اور ادیب بھی تھے۔ آپ
اپنے دور کے شعراء میں بھی وہی تھا جو علماء اور ائمہ کی صف میں تھا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ شعر
کو باعث فخر تصور نہیں کرتے تھے جیسا کہ یہ شعر ان سے منسوب ہے:

ولولا الشعر بالعلماء یزری　　لکنت الیوم اشعر من لبید

(اگر علماء کے لئے شعر و شاعری ناپسندیدہ نہ ہوتی تو میں لبید سے بھی زیادہ بڑا شاعر ہوتا)
شاید اسی بنا پر امام شافعیؒ نے شاعری کو اپنا فن نہیں بنایا مگر جتنے بھی اشعار دستیاب ہوئے ہیں
اندازہ ہوتا ہے کہ وہ لبید سے زیادہ بڑے، پُرگو، فصیح اور پاکیزہ شاعر تھے۔ شیخ محمد مصطفےٰ نے
کے شعر کا ایک مجموعہ "الجوهر النفيس فی شعر محمد بن ادریس" کے نام سے مرتب کیا ہے۔

امام صاحب کے شعر و ادب پر گفتگو کرنے سے پہلے ان کے حالات زندگی کا ایک مختصر خاکہ پیش
ضروری معلوم ہوتا ہے:

امام شافعی قریش مکہ کے ایک نامور خانوادہ بنی ہاشم سے تعلق رکھتے تھے۔ جنگ بدر میں ان
والد بنو ہاشم کے علمبردار تھے جنگ کے خاتمہ پر گرفتار ہوئے اور فدیہ دے کر رہائی حاصل کی، ا

سلام قبول کیا۔

امام صاحب ۱۵۰ھ (۷۶۷ء) میں فلسطین کے شہر (غزہ) میں پیدا ہوئے۔ پیدائش کے سال والد کا انتقال ہو گیا۔ والدہ ان کے ساتھ مکہ مکرمہ منتقل ہو گئیں اور آپ کی ننھیال میں پرورش ہوئی۔ مکہ میں کلام پاک حفظ کیا اور فقہ و حدیث پڑھی۔ امام مالک کی شہرت سن کر مدینہ منورہ گیا اور امام صاحب سے مؤطا پڑھی۔ اسی وقت امام مالکؒ نے فرمایا تھا کہ "یہ بچہ بڑی کامیابی ضروری حاصل کرے گا۔

۱۹۵ھ میں بغداد تشریف لے گئے اور دو برس مقیم رہ کر وہاں کے علماء و اساتذہ سے علم حاصل کر کے واپس آ کر ۱۹۸ھ تک وہاں قیام کیا۔ ۱۹۹ھ میں مصر تشریف لے گئے اور آخر عمر تک وہاں قاہرہ میں بروز جمعہ ۳۰ رجب ۲۰۴ھ کو وفات پائی۔

امام صاحب نے اپنی زندگی میں ہی بڑی مقبولیت اور شہرت حاصل کر لی تھی اور آپ کا فقہی مسلک اسلام کے گوشہ گوشہ میں پھیل گیا تھا۔ آپ کے معاصرین آپ کی بڑی عزت کرتے تھے۔

ابوعبید قاسم بن سلام کہتے ہیں: "میں نے امام شافعیؒ سے زیادہ کامل انسان کبھی نہیں دیکھا۔"

عبداللہ بن احمد بن حنبلؒ نے اپنے والد سے پوچھا کہ امام شافعیؒ کیسے آدمی تھے کہ آپ ان کے لئے دعا کرتے ہیں فرمایا "اے میرے بچے امام شافعی دنیا کے لئے سورج اور جسم کے لئے عافیت کی مانند تھے۔ کیا ان دونوں کا کوئی بدل ہے؟"

امام محمد بن حسن شیبانیؒ امام شافعی کی بے حد تعظیم کرتے تھے۔ ایک مرتبہ امام محمد کسی جگہ جانے کو سوار ہوئے تھے کہ امام شافعیؒ آ گئے، آپ نے سفر کا ارادہ ملتوی کر دیا اور پورا دن امام شافعیؒ کے ساتھ گذارا اور کسی دوسرے کو ملاقات کی اجازت نہیں دی۔

امام احمد بن حنبلؒ نے فرمایا کہ کوئی بھی صاحب قلم ایسا نہیں ہے جس پر امام شافعی کا احسان

عبداللہ بن احمد کہتے ہیں کہ امام شافعی بڑے فصیح و بلیغ تھے۔ امام مالکؒ ان کی فصاحت کی

سے ان کی عبارت خوانی کو پسند کرتے تھے۔ ابو العباس بغدادی نے کہا ہے کہ میں نے امام شافعیؒ سے زیادہ پرگو اور خوش کلام کوئی اور شخص نہیں دیکھا۔
عبدالملک بن ہشام (بڑے زبان داں تھے) کہتے ہیں کہ امام شافعی ان چند شخصیتوں میں ہیں کہ جن سے زبان وادب حاصل کیا جا سکتا ہے۔

امام شافعیؒ کی نشو و نما اور تربیت عرب کے مشہور فصیح و بلیغ قبیلہ "بنو اسد" میں ہوئی تھی، اس سے آپ کو زبان پر قدرت اور فصاحت و بلاغت میں پورا ملکہ حاصل تھا۔ یہاں تک کہ "اصمعی" جیسے بلند پایہ ادیب و ناقد نے "ہذلی شعراء" کا کلام امام شافعی سے پڑھا تھا۔
امام صاحب کی قوت بیان، زبان کی فصاحت، تعبیر کی بلاغت ضرب المثل بن چکی تھی۔ خلیفہ ہارون الرشید نے اہل بیت کے چند افراد کے ساتھ آپ کو گرفتار کیا، جب دربار میں حاضر کئے گئے تو ہارون رشید کے سوالات کے جواب اتنے واضح قوی اور مدلل دیئے کہ سب حاضرین حیران و ششدر رہ گئے۔ آخر میں بڑی مؤثر اور بلیغ تقریر فرمائی جس سے لوگوں کے دل لرز گئے اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

زندگی کے آخری دور میں فقہ، حدیث اور تفسیر کے پہلو بہ پہلو زبان، شعر اور ادب کے لئے مرجع خلائق بن گئے تھے۔ امام شافعیؒ کی شاعری بلند خیالی، فکر انگیزی، اصلاح اور رشد و ہدایت پر مبنی تھی، آپ کے ہر شعر میں پند و نصیحت، عمل، حسن اخلاق اور اچھی صفات اختیار کرنے اور عمل میں لانے پر زور ہے۔
مثال کے طور پر چند اشعار پیش ہیں، ان اشعار میں قناعت کی طرف رغبت دلاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ قناعت ہی میں حریت اور آزادی ہے، طلب کرنے اور سوال میں ذلت و رسوائی ہے:

العبد حرٌ ان قنع والحر عبدٌ ان طمع

غلام اگر قناعت کرے تو وہ آزاد ہے اور آزاد آدمی طمع اور لالچ سے کام لے تو وہ غلام ہے

رأيت القناعة رأس الغنى   فصرت بأذيالها متمسك

میں نے قناعت ہی کو اصل سرمایہ سمجھا اور اس کا دامن مضبوطی سے تھام لیا۔

فلا ذا يراني على بابه   ولا ذا يراني به منهمك

پس نہ تو یہ مجھے اپنے دروازے پر دیکھتا ہے اور نہ ہی وہ اپنا گرویدہ پاتا ہے۔

فصرت غنيا بلا درهم   أمر على الناس شبه الملك

پس میں بغیر روپیہ پیسہ کے مالدار بن گیا، لوگوں کے سامنے سے بادشاہ کی طرح گذرتا ہوں۔

امام صاحب پرہیزگاری اور اس پر عمل کی ترغیب دیتے ہیں اور اس کے فائدے ان اشعار میں بیان کرتے ہیں:

المرء ان كان عاقلا ورعا   اشغله عن غيره ورعه

آدمی اگر عقلمند و پرہیزگار ہے تو اس کی پرہیزگاری اسے دوسرے سے بے نیاز کر دے گی۔

كما العليل السقيم اشغله   عن وجع الناس كلهم وجعه

جیسے کہ بیمار کی بیماری اور تکلیف دوسروں کی بیماری اور تکلیف سے بے پروا اور غافل بنا دیتی ہے۔

ہم پہلے یہ عرض کر چکے ہیں کہ امام شافعی نے صرف تصوف، نصیحت، خوش اخلاقی اور پرہیزگاری سے متعلق ہی اشعار نہیں کہے ہیں بلکہ ان کی شاعری کا میدان غزل بھی ہے۔ امام صاحب نے بیان کیا ہے کہ ان کی شادی مکہ کی ایک قریشی عورت سے ہوئی تو بطور مذاق وہ اپنا یہ شعر پڑھتے:

ومن البلية أن تحب   فلا يحبك من تحبه

بڑی مصیبت یہ ہے کہ تم جس سے محبت کرتے ہو وہ تم سے محبت نہیں کرتا۔

عورت جواب میں کہتی:

ويصد عنك بوجهه   وتلح أنت فلا تغبه

وہ شخص تو تم سے اپنا چہرہ پھیر لیتا ہے حالانکہ تم اس سے پل بھر بھی دور نہیں ہوتے ہو۔

امام شافعیؒ اپنی بیوی کو غصہ کی حالت میں تعرض کرنے اور گفتگو سے منع کرتے ہوئے کہتے ہیں:

خذی العفو منی واستدیمی مودّتی ولا تنطقی فی سَوْرتی حین اغضب

میری جانب سے معذرت قبول کر لو اور میری محبت ہمیشہ حاصل کرتی رہو بشرطیکہ میرے غصہ کے وقت بالکل کلام نہ کرو۔

فانی وجدت الحب والأذی فی القلب اذا اجتمعا لم یلبث الحب یذهب

کیونکہ جب بھی میں نے دل میں محبت و نفرت کو اکٹھا ہوتا پایا تو محبت کو رخصت ہوتے دیکھا ہے۔

بڑے معصوم، پاکیزہ اور سادہ انداز میں محبت سے متعلق فرماتے ہیں:

مرض الحبیب فعدته فمرضت من حذری علیه

وأتی الحبیب یعودنی فبرئت من نظری الیه

محبوب بیمار ہوا میں اس کی عیادت کے لئے حاضر ہوا تو اس کی ہلاکت کے خوف سے میں بیمار پڑ گیا۔

محبوب میری عیادت کے لئے آیا میں اسے دیکھتے ہی اچھا ہو گیا۔

امام شافعی کے اشعار کی امتیازی خصوصیت، سادگی، سہل نگاری، عام فہم انداز بیان، بلیغ تعبیریں اور پاکیزہ خیالات ہیں۔ مختلف ممالک، علاقوں اور شہروں کی سیاحت نے آپ کے شعر و ادب اور زبان پر بڑا اچھا اور خوشگوار اثر ڈالا ہے۔ آپ نے علم و ادب کے حصول کے لئے دور دراز علاقوں کا سفر کیا، مثلاً عراق، ایران، یمن، مصر اور مدینہ منورہ۔ ان ملکوں کے علماء، ادباء اور شعراء سے استفادہ کیا اور علمی، فقہی اور ادبی معلومات کے ساتھ ساتھ لوگوں کی عادتوں، رسم و رواج اور ان کے اخلاق سے بھی گہری واقفیت اور جانکاری حاصل کی۔ سفر و سیاحت کے بارے میں فرماتے ہیں:

ما فی المقام لذی عقل وذی ادب من راحة فدع الاوطان واغترب

سافر تجد عوضا عمن تفارقه وانصب فان لذیذ العیش فی النصب

عقلمند اور ضرورتمند کو قیام کرنے میں آرام نہیں، پس وطن کو چھوڑ دو اور مسافرت اختیار کرو۔

سفر کرو جن لوگوں سے جدا ہو گے ان کے بدلے میں لوگ مل جائیں گے۔
سیاحت کرو بلاشبہ زندگی کا لطف سیاحت ہی میں ہے۔

چند اشعار اور ملاحظہ ہوں۔ صبر و قناعت، سخاوت اور فراخدلی سے متعلق فرماتے ہیں:

دع الایام تفعل ما تشاء — وطب نفسا اذا حل القضاء
ولا تجزع لحادثة اللیالی — فما لحوادث الدنیا بقاء

گردش زمانہ جو کچھ کرنا چاہتی ہے کرنے دو، اگر قضا آجائے تو اسے خندہ پیشانی سے جھیل جاؤ۔
کسی بھی حادثہ سے پریشان نہ ہو کیونکہ حوادث کو بقا نہیں ہے۔

ولا حزن یدوم ولا سرور — ولا بؤس یدوم ولا رخاء
ورزقک لیس ینقصہ التأنی — ولیس یزید فی الرزق العناء

نہ تو غم ہمیشہ رہتا ہے اور نہ خوشی، اور نہ ہی بدحالی باقی رہتی ہے نہ خوش حالی۔
کم رفتاری و کوتاہی روزی کو کم نہیں کر سکتی اور نہ ہی مشقت روزی کو بڑھا سکتی ہے۔

ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں کتنے دلآویز، سادے اور پیارے انداز میں حکیمانہ نصیحتیں ہیں:

اذا شئت ان تحیی سلیما من الأذی — وحظک موفور وعرضک صین
لسانک لا تذکر بہ عورۃ امرئ — فلک عورات وللناس ألسن

اگر تمہاری خواہش ہو کہ تمہاری زندگی تلخیوں اور پریشان حالیوں سے محفوظ رہے اور خوش نصیبیوں سے ہم کنار ہو، تمہاری آبرو بے داغ رہے تو اپنی زبان کو آدمی کی پردہ دری سے بچاؤ کیونکہ تم مجسم سربستہ راز ہو اور لوگوں کے منہ میں زبانیں ہیں۔

وعینک ان ابدت إلیک معایبا — فصنها وقل یا عین للناس اعین

اگر تمہاری آنکھ تم سے کسی کی عیب جوئی کرے تو تم اس کو بچاؤ اور اس سے کہو کہ اے آنکھ دوسرے لوگ بھی نگاہیں رکھتے ہیں۔

امام شافعی صرف شاعر نہ تھے بلکہ ایک صاحب طرز نثر نگار بھی تھے۔ ان کے فقہی مضامین دلآویز و سحر آفریں نثر پاروں کا مجموعہ ہیں۔ چند جملے پیش خدمت ہیں:

"من تعلم القرآن عظمت قیمته ومن نظر فی الفقه نبل قدره ومن کتب فی الحدیث قویت حجته ومن نظر فی اللغة رق طبعه ومن نظر فی الحساب جزل رأیه، ومن لم یصن نفسه لم ینفعه علمه"

جس نے قرآن سیکھا اس کی قیمت بڑھ گئی، جس نے فقہ پڑھا اس کی عزت دو بالا ہو گئی جس نے "حدیث" کے بارے میں لکھا اس کی دلیل قوی ہو گئی، جس نے لغت و زبان پر کام کیا اس کا مزاج نرم ہوا، جس نے "حساب" پر غور و فکر کیا اس کی رائے وزنی ہوئی، جس نے اپنے نفس کی حفاظت نہ کی اسے اس کے علم سے فائدہ نہ ہوا۔

"لا یکمل الرجل فی الدنیا الا باربع: الدیانة والأمانة والصیانة والرزانة"

انسان دنیا میں چار باتوں سے کامل ہوتا ہے: دیانت، امانت، حفاظت اور سنجیدگی۔

"أشهر الأعمال ثلاثة: الجود من قلة، والورع فی خلوة وکلمة الحق عند من یرجی ویخاف"

مشہور اعمال تین ہیں: کم مائگی میں سخاوت، تنہائی میں پرہیزگاری، اس شخص کے سامنے کلمۂ حق کہنا جس سے راضی ہو اور جس سے ڈرتا ہو۔

"خیر الدنیا والآخرة فی خمس خصال: غنی النفس، وکف الأذی، وکسب الحلال ولباس التقوی، والثقة باللہ فی کل حال"

دنیا و آخرت کی بھلائی پانچ باتوں میں ہے: نفس کی بے نیازی، تکلیف دہ بات سے باز رہنا، حلال کمائی، تقوی اختیار کرنا۔ ہر حال میں خدا پر بھروسہ کرنا۔

(المنہل نومبر ۸۴ء سے ماخوذ)

ے شیام پاٹھک

"خانخاناں کی اخلاقی شاعری"

عبدالرحیم مرزا خان خاناں اکبر کے نورتن، اپنے زمانے کی اعلیٰ شخصیت، نامور سپہ سالار، شہزادہ سلیم
بق، اکبر کے معتمد بیرم خاں کے صاحبزادے، ترکی، فارسی، سنسکرت اور ہندی کے عالم
بے مثال سخی اور ایک معیاری سخن سنج وسخن فہم انسان کی حیثیت سے شہرت حاصل کر کے وہ ہندوستان
دلّی کی نظام الدین بستی کے قریب واقع اپنے مقبرے میں ابدی نیند میں سوئے ہوئے ہیں۔
رحیم اس دور کے انسان تھے جس زمانے میں ہندو مسلمان بہت قریب تھے۔ ہندو سنسکرتی
لامی تہذیب ایک دوسرے سے گلے مل رہی تھیں۔ ہندو مسلمان ایک دوسرے کے دکھ درد
ی تھے۔ انسانی اعلیٰ اخلاق کو اصلِ مذہب سمجھنے کی کوشش کی جارہی تھی۔ جذباتی اور ذہنی
نچاتھا، انسان کی قدر ہوتی تھی۔ ادب اور ادیبوں کے تخلیقی نور سے دل ودماغ کو روشن

عبدالرحیم خان خاناں نے زندگی کے تھپیڑے کھائے، دنیا سے سبق سیکھے اور انھیں تجربات
ری کے چمن کو دوہوں کے پھولوں سے سجادیا۔ رحیم "دوہاولی" کے یہ دوہے ہندی
ملاقی شاعری) کی عزت بڑھانے کے علاوہ انسانی اصلاح میں کتنے مددگار ثابت ہوئے،
اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ آج بھی ستائے، گھبرائے، بوکھلائے دلوں سے
وہے بڑی بے ساختگی سے نکلتے ہیں اور دل کی گہرائیوں میں سما جاتے ہیں۔
رحیم مرزا خان خاناں ہندی شاعری میں رحیم کے نام سے مشہور رہیں۔ ان کی شاعری کا

رنگ اپنے وقت کے تمام شعراء سے کچھ جدا تھا۔ ان کی پرورش درباری ماحول میں ہوئی تھی، لیکن عوام کے دلوں کی دھڑکنوں کو قریب سے سنتے تھے۔ اس لئے ان کی شاعری کے رنگ کا اثر اس زمانہ کے دوسرے مشہور شعراء نے بھی اختیار کیا۔ بیاس، برند، رس ندھی نے رحیم کے دوہوں سے متاثر ہوکر اپنے دوہے لکھے۔ بہاری اور متی رام جیسے اعلیٰ شاعروں نے بھی رحیم کی شاعری کا اثر لیا۔

رحیم نے اگرچہ ہندی میں عشقیہ شاعری بھی کی لیکن اخلاقی شاعر کی حیثیت سے ان کا درجہ بلند ہے۔ اخلاقی شاعری میں چار باتوں کا ہونا بہت ضروری ہے۔

۱۔ نصیحتیں ہوں۔

۲۔ دل پر اثر کرنے والے جذبات ہوں۔

۳۔ شاعری کی زبان صاف، پُراثر اور سلیس ہو۔

۴۔ بیان میں صفائی، کشش اور قومی مزاج کی ترجمانی ہو۔

یہ سب باتیں رحیم کی شاعری میں پائی جاتی ہیں، ان کا نظریۂ شاعری اخلاقی قدروں سے متاثر رہا ہے اس لئے ہندی شاعری میں ان کی شاعری کا ایک مخصوص مقام ہے۔

رحیم کی نیتی کاویہ (اخلاقی شاعری) چار طرز میں ملتی ہے۔

۱۔ ست سئی کے روپ میں۔

۲۔ مُکتک کے روپ میں۔

۳۔ دوہوں کے روپ میں۔

۴۔ آزاد نظموں کی شکل میں۔

رحیم نے "نائیکا بھید" کے سہارے بہترین عشقیہ شاعری کی اور دوہوں میں اخلاقی رنگ بھرا، اُن کے دوہے عوام اور خواص، دونوں نے پسند کئے۔ اس شاعری کا رنگ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ رحیم نے اپنی زندگی کے تجربات کو اپنی شاعری میں سمو دیا تھا۔

ہ تجربے اپنے ہی تجربے معلوم پڑتے ہیں۔ جب ہم اپنی باتیں اپنے ہی دکھ درد کے قصے یا اپنے ساتھ
ں ناانصافی کا بیان کسی شاعر کی زبان سے سنتے ہیں تو وہ باتیں ہمارے دل کو چھوتی ہیں اور ہمارے دل پر
ڈالتی ہیں۔ رحیم نے زندگی کے حقائق کو بڑے خوبصورت اور مناسب انداز میں بیان کیا ہے، وہ اپنی
ری میں عوامی زندگی پر اثر ڈالنے والی مثالیں بہت اچھے اور پر اثر انداز میں بیان کرتے ہیں۔ کچھ نمونے
ظہ کیجئے :

رحیمن دھاگہ پریم کا مت توڑو چٹکا ئے
ٹوٹے سے پھر نہ ملے گانٹھ پڑی جائے

رحیمن دیکھ بڑین کو لگھو نہ دیجئے ڈاری
جہاں کام آوے سوئی کہا کرے تلواری

ں جانتے ہیں ایک بار دل شکنی ہو جانے پر دلوں کا ملنا مشکل ہو جاتا ہے، اور اگر دل مل بھی جائیں تو
ں کے تار میں کوئی گانٹھ ضرور پڑ جاتی ہے، یہ بات بھی عام طور پر تجربہ میں آئی ہے کہ وقت پڑنے پر
ٹی چیزوں کی بھی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔

رحیم نے دوہوں میں اپنے قیمتی خیالات بیان کرنے کی وجہ بھی بتائی ہے :

دیرگھ دوہا ارتھ کے آنکھر تھوڑے آہی
جو رحیم نٹ کنڈلی سمٹ کو ند چڑھی جائی

ان کا خیال تھا کہ جس طرح نٹ اپنے جسم کو سمیٹ کر چھوٹے سے گھیرے میں کود کر چڑھ جاتا
طرح وسیع معانی دوہے کے تھوڑے سے لفظوں میں سما جاتے ہیں۔

رحیم کی نگاہ غریب اور امیر دونوں پر تھی، وہ کمزوروں کو عزت بخشتے اور معصوموں پر مہربانیا
انھوں نے زندگی کی تلخیوں کا مزا لیا تھا، غم کی اندھیری راتوں میں بھی انسانی محبت کی شمع
ئے رکھا تھا۔ انھوں نے بہاروں کا لطف اٹھایا تھا اور خزاں میں خاموش رہ کر قسمت کے

کرشمے دیکھے تھے، اس لئے انھوں نے لکھا:

کہہ رحیم سمپتی سگے بنت بہت بہو ریت
بپت کسوٹی جو کسے سوہی سانچے میت

رحیم کہتے ہیں کہ خوشحالی کے دن ہوں تو بہت سے ساتھی ساتھ ہو جاتے ہیں، سچے دوست
تو مصیبت کے وقت ہی ہوتی ہے۔ جیسے سچے سونے کی پہچان کسوٹی پر ہی ہوتی ہے اسی طرح
کی پہچان مصیبت کی کسوٹی پر ہوتی ہے۔

اچھی شاعری کے متعلق عالموں کے مختلف خیالات ہیں۔ سقراط کا خیال تھا کہ مفید چیزیں
ہوتی ہیں۔ ایڈیسن [illegible] کا بھی کچھ ایسا ہی خیال تھا۔ اچھی شاعری کے بارے میں عام خیال
کا رشتہ اخلاقیات اور اونچے خیالات سے ہونا چاہئے۔ رحیم کی شاعری میں یہ دونوں خ
جاتی ہیں۔ ہڈسن نے کہا ہے کہ اچھی شاعری حقیقت میں زندگی کی ترجمان ہوتی ہے۔ اگر
ہے تو عبدالرحیم خان خاناں کی شاعری اعلیٰ شاعری ہے۔ ان کی شاعری میں بڑی وسعت۔
مساوات اور اتحاد کے پاک جذبوں سے شاعری کی شان بڑھائی ہے اور اشاروں میں
کہی ہیں، ایک نمونہ دیکھئے:

پاوس دیکھیہ رحیم من کوئل سادھے موَن
اب دادُر وکتا بھیئے ہم کو پوچھے کون

رحیم کہتے ہیں کہ برسات کے دنوں میں کوئل خاموش ہو جاتی ہے کیونکہ وہ جانتی ہے کہ مینڈک
بولنے کے دن ہیں۔ ان دنوں ہماری آواز کون سنے گا۔ صاف معنی یہ کہ بُرے دن ہوں تو
اچھا ہوتا ہے۔ رحیم کا یہ بھی خیال تھا:

دھن رحیم جل پنک کو جے جیئے پی اَت اگھے
اُدِدھی بڑائی کون ہے جگت پیاسو جائے

رحیم کہتے ہیں کہ وہ کیچڑ ملا ہوا پانی زیادہ بہتر ہے جس سے چرندوں اور پرندوں کی پیاس بجھا

کی شہرت سے کیا حاصل جو بہت سے لوگوں کو پیاسا رکھتا ہے۔ رحیم نے یہ بھی کہا:

ترور پھل نہیں کھات ہیں سرور پی اَت نا پان
تیوں رحیم پر کاج ہت سمپتی سنچہیں سجان

پیڑ اپنے پھل کبھی نہیں کھاتے، تالاب بھی اپنا پانی خود نہیں پیتا، اسی طرح شریف آدمی کی دولت دوسروں کی بھلائی کے کاموں میں خرچ ہوتی ہے۔ رحیم نے اپنی شاعری میں جذبات کو مناسب انداز میں بیان کیا ہے ان کی شاعری میں ایک مخصوص ترتیب ملتی ہے، خیال اور مثال کا ایک بہترین رشتہ ان کے کلام میں دکھائی دیتا ہے۔ وفاداری اور بے وفائی کو سمجھانے کے لیے رحیم لکھتے ہیں:

جال پرے جل جات بہی تج مینن کو موہ
رحیمن مچھلی نیر کو تئو نہ چھانڑت چھوہ

جب مچھلیاں جال میں پھنس جاتی ہیں تو بے وفا پانی اُن کو جال میں پھنسا کر خود جال سے باہر نکل جاتا ہے، لیکن مچھلیوں کی وفاداری دیکھئے کہ وہ تب بھی پانی کی محبت چھوڑنے کے لئے تیار نہیں اور اس کے لئے تڑپ تڑپ کر جان دے دیتی ہیں۔ رحیم کی اخلاقی شاعری کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں دل کو سکون بخشنے کی بڑی طاقت ہے، یہی وجہ ہے کہ رحیم کی شاعری ہر طبقے میں مقبول رہی ہے۔

ڈاکٹر سید محمد احتشام ندوی

ادب اور نئی نسلیں

انسانی زندگی ایک ... زنجیر ہے پرانی نسل ختم ہوتی ہے تو نئی نسل سامنے آتی ہے ایک تسلسل ہے بقا و فنا کا۔ انھیں انسانی زندگی کے انقلابوں کے درمیان ادب اور فن آبیار حاصل کرتا ہے۔ ماضی پر حال کی اور حال پر مستقبل کی عمارت تعمیر ہوتی ہے جس طرح انسانی نسلوں سلسلہ ہے اسی طرح انسانی افکار و آداب بھی باہم ارتقار کا ایک سلسلہ رکھتے ہیں۔ اعلیٰ ادر ہر دور میں پیدا ہو سکتا ہے ماضی کی اس میں کوئی خصوصیت نہیں۔ انسانی زندگی ایک تناور درخ ہے جو پھل اور پھول کے ذریعہ زندگی کو حسن و رعنائی کی دولت عطا کرتی ہے۔

جب ہم ادب کے میدان میں قدم رکھتے ہیں تو ہم کو محسوس ہوتا ہے کہ گذشتہ نسلوں نے ان زندگی کی اپنے اعلیٰ افکار سے آبیاری کی تھی ہم ان سے اپنے علم و ادب کا چراغ روشن کرتے ہیں۔ اس طرح دنیا ایک وسیع حلقات کا سلسلہ ہے جو پھیلا ہوا ہے۔ ایک فکر دوسرے فکر کی تکمیل کرتی ہے۔ اس بنا پر ادیب کا فرض یہ بھی ہے کہ وہ ایسا جاندار ادب پیش کرے جو اس کے بعد آنے والی نسلوں کے لئے سنگ منزل کا کام کرے اور اس کے پیام کو آگے بڑھائے۔ اس لئے کہ ادب زندگی کا ایک مقدس، روشن اور دلکش پیام ہے جو ایک نسل سے دوسری نسل کو آئینۂ کتاب کے ذریعہ پہونچتا ہے۔

اب ہمارے سامنے ایک مشکل آتی ہے کہ اس پیام زندگی کو پہونچانے کے لئے کیا ذرائع اختیار کئے جائیں اور کس طرح اس راہ میں مدد حاصل کی جائے۔ کیا دور مستقبل کو ان غلطیوں سے بچانا لازم

ہے جس میں ہم مبتلا ہیں۔ کیا وہ ادبا جو بقعۂ نور اور روشن منارے کی طرح ہمارے سامنے ہیں ان کی پیروی کی جائے؟ ادب کے ارتقاء کے لئے کیا راہیں اختیار کی جائیں دور مستقبل وحال میں؟ اس طرح کے سوالات ہمارے سامنے آسکتے ہیں لیکن ان سب کا جواب یہی ہے کہ بقدر صلاحیت ادب کی خلوص سے اور محنت سے خدمت ہی اس سے وفا کی راہ ہے۔ ادب درحقیقت ایک آزاد اور بسیط شے ہے جس کی تعبیر دل کی گہرائیوں سے کی جاتی ہے جس میں خلوص و امانت کی روشنی شامل ہوتی ہے۔ اس میں انسانی احساسات کی تفصیل ہوتی ہے۔ چونکہ ادب کا مصدر قلب انسانی ہے اس لئے دوسرے انسانی قلوب کو وہ متاثر کرتا ہے "ہرچہ از دل خیزد بر دل ریزد"۔ یہ ادب تمام انسانوں میں یکساں تاثر کا حامل ہوتا ہے اس لئے کہ اس میں صدق و صداقت ہوتی ہے۔ فن زندگی کی تعبیر کا نام ہے جو ہر نسل اپنی زندگی کے پیمانوں سے اخذ کرتی ہے۔ زندگی کو ہم ایک وسیع معنی دیتے ہیں تاکہ وہ مختلف نسلوں، قوموں، ملکوں اور رنگوں کو اپنے اندر شامل کرسکے۔ ادب میں صرف خارجی زندگی کے واقعات جن سے انسان پریشانی محسوس کرتا ہے وہ ہی شامل نہیں ہوتے بلکہ اس میں انسان کے اندر کی دنیا بھی سامنے آتی ہے اس کے افکار وخیالات بھی فن کے قالب میں ڈھلتے ہیں۔ یہ عمل ہر نسل کرتی ہے اور ناقد اپنے دور میں انھیں ادبی افکار و اقدار کو اس طرح جانچتا پرکھتا ہے اور ان کی قیمت کا تعین کرنے کی سعی کرتا ہے جیسے صراف جب شام کو فرصت پاتے ہیں تو اپنے سکوں کا حساب لگاتے ہیں اور ان کو الٹ پلٹ کر دیکھتے ہیں۔ یہ عمل جاری وساری ہے۔

اس عمل سے ہم انقلاب کو روکتے نہیں بلکہ اس کی راہ ہموار کرتے ہیں۔ ہمارا دیا ہوا ادب اس ادب سے مختلف ہو جائے گا جو مستقبل میں وجود میں آئے گا اس لئے کہ زندگی بیقرار انقلاب ہے زمانہ کو ٹھہراؤ کہاں۔ زمانہ منقلب ہے زندگی منقلب ہے اس لئے ادب بھی انقلاب پذیر ہے۔ اسی طرح ہر نسل ادب کی تخلیق فطری اصول پر کرتی ہے جس طرح درخت سے پھل وپھول حسین ودلکش منظر ظہور پذیر ہوتا ہے اسی طرح انسانی زندگی سے افکار منصۂ شہود پر آتے ہیں۔ اس طرح ادب کو کئی اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے قدیم نسل کے افکار اور

جدید نسل کے افکار میں تصادم ہوتا ہے جس کے بارے میں علامہ اقبال فرماتے ہیں :

آئینِ نو سے ڈرنا ، طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

دو نسلوں میں اختلاف ایک فطری امر ہے۔ آگے نسل آگے جانا چاہتی ہے اور دوسری قدامت کی طرف جاتی ہے۔ قدامت پرستی تو یقینی طور پر غلط ہے لیکن ترقی پسندی میں قدامت سے رشتہ منقطع نہ کرنا چاہیئے۔

یہاں ایک اور انداز کا اختلاف سامنے آتا ہے اور وہ زیادہ باعث مصیبت ہے یعنی نظریات کا اختلاف جس کو ہم قدامت وجدیدیت کے اختلاف سے الگ ہٹ کر دیکھتے ہیں ایک شخص جمہوریت کا شائق ہے دوسرا سوشلزم کا تیسرا کمیونزم کا چوتھا ڈکٹیٹرشپ کو ترجیح دیتا ہے اس طرح ایک نسل میں نظریات کے اختلافات ہیں جو ادب پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں اس لئے کہ ادبی افکار زندگی کا عکس ہیں۔ دورِ جدید میں اس پر اختلاف کم ہے کہ انقلاب و تبدیلی بری شے ہے اصل وجہ اختلاف نظریات کا تصادم ہے اگرچہ اس میں ایک دوسرے کو رجعت پرست قرار دیا جاتا ہے مگر معاملہ یہ ہے کہ زندگی کے نظام مختلف رخ رکھتے ہیں اس میں فیصلہ دشوار ہے۔ اس کے اثرات ادب پر بھرپور پڑے ہیں۔ ایسا کوئی عقیدہ یا نظام نہیں جس کو پوری انسانیت تسلیم کرے۔ شاید اس کا امکان نہیں۔

بہرحال انسان قوت فکر کا حامل ہے اس لئے اختلافات تو ہمیشہ رہیں گے۔ انسانی تہذیب فطرت کی مخالف نہیں بلکہ فطرت کا ساتھ دیتی ہے۔ فطرت کو انسانیت کا ساتھ دینا ہے یا یوں کہئے کہ انسانیت کو فطرت کا ساتھ دینا ہے اس طرح جہاں تبدیلیاں آئیں گی وہاں وہ فطری رحمتیں اور زحمتیں بھی آئیں گی جن سے مفر نہیں۔ ہر نسل اپنے طرز کی فطری تبدیلیوں سے ہم کنار ہوگی۔ اور اس کی ترجمانی وہ اپنے ادب میں کرے گی۔ اس لئے انسانی اختلافات بھی فطری ہیں خواہ ادب میں ہوں یا تہذیب و فن میں۔

خالق کائنات کا کائنات کی تخلیق میں قانون و اصول کا ایک سلسلہ ہے اس سلسلہ میں قرآن کا
ل قابل غور ہے :

ولوشاء ربك لجعل الناس امة واحدة ولا یزالون مختلفین ...... الخ
اگر تمہارا پروردگار چاہتا تو تمام انسانوں کو ایک امت بنا دیتا اور لوگ ایسے ہی رہیں گے
کہ مختلف ہوں ۔ سورہ ۱۱ آیت ۱۱۸ (ترجمہ مولانا آزاد)

پس انسانی اختلاف قانون فطرت ہے ۔ ایک انگریز مفکر جون ہادہام کہتا ہے کہ :
"اگر ایسا ہوتا کہ تمام ملکوں کو جو ضرورت کی اشیاء حاصل ہیں وہ ایک شہر کو حاصل ہوتیں تو وہ مستقل علحدہ رہتا اور اپنے ہمسایوں سے بے نیاز ہو جاتا مگر اللہ نے دنیا کا نظم و نقشہ ایسا بنایا ہے کہ ہر شہر دوسرے شہر کا اور ہر ملک دوسرے ملک کا محتاج ہے یہ ایک فطری قانون ہے ۔"

اگر اس قانون کو ہم انسانی زندگی کے آئینہ میں دیکھیں تو ہمارے سامنے یہ حقیقت واضح ہوکر ے گی کہ اختلاف انسانی ضرورت ہے یعنی خدا کے ارادہ کا مظہر ہے ۔ اختلاف عقلیت اور چیز ہے اختلاف رائے دوسری ۔ ممکن ہے کہ دو مفکرین میں عقل کی بلندی کا معیار یکساں ہو مگر آراء ف ہوں ۔ اس موقع پر نئی نسلوں کا فرض ہے کہ وہ قومی اور جماعتی حیثیت سے وحدت کے سے انسانیت کی چمن بندی کریں[1] ۔ ایسے عناصر نکر جن سے عام معاشرہ میں شخصیت سازی ہو ان کو اختلاف سے قطع نظر کر کے فروغ دینا لازم ہے ۔

آج انسانیت، جمہوریت اور اشتراکیت کے دو اہم محاذوں میں تقسیم ہے ادب، معاشرت، ت اور زندگی کا ہر شعبہ انھیں دو نظام ہائے زندگی میں منقسم ہے ۔ بالفرض اگر ایک گروہ رے پر فتح کامل حاصل ہو جائے جب بھی اختلاف کے کانٹے فنا نہ ہوں گے پھر فاتح

۱۔ عربی سے اپنایا ہوا ۔

کے اندر مختصر عناصر میں کشمکش ہو گی۔

اس نظام حیات پر ادبی اختلافات کو قیاس کرنا چاہیئے۔ ادبی اختلاف سے دولت
ہے تنقیدی بصیرت عام ہوتی ہے انسانیت کے سامنے بہت سے نئے افق آتے ہیں
طرح زندگی قوس قزح کی طرح رنگین و بوقلموں بن جاتی ہے۔

چونکہ دور جدید کا ادیب فن کے پردے میں اپنی شخصیت کا عکس پیش کرتا ہے ا
نظریۂ حیات و کائنات کی تفسیر بھی اس لئے زندگی اور اس کے نظام کے بارے میں ا
کا انعکاس ادب پر ہو رہا ہے۔ ادب اخلاقی، سماجی اور معاشی اقدار سے دامن نہیں بچا
انھیں کا پروردہ ہوتا ہے۔ نظریاتی تصادم اقدار حیات کا تصادم ہے اس میں ادب
اہم رول ادا کرتا ہے آئندہ نسلیں بقاء اصلح کے اصول پر زندگی کے لئے مفید اقدا
کریں گی اس طرح ادب کے نگار خانہ میں چراغ سے چراغ جلتا رہے گا۔

ہر لحظہ نیا طور نئی برق تجلی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

فارم ۴ قاعدہ ۸

مقام اشاعت: جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵
وقفۂ اشاعت: ماہانہ
پرنٹر پبلشر: عبداللطیف اعظمی
قومیت: ہندوستانی
پتہ: دفتر رسالہ الجامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

نام اڈیٹر: جناب ضیاء الحسن فار
قومیت: ہندوستانی
پتہ: پرنسپل جامعہ کالج، جامعہ نگر
ملکیت: جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی

میں عبداللطیف اعظمی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق

دستخط پبلشر: عبداللطیف اعظمی
۲۵ فروری ۱۹۷۱ء

ضمیر اور آزادئ ضمیر

میر اور آزادئ ضمیر کے عنوان پر سب سے پہلے یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ ضمیر کسے کہتے ہیں۔ ند اس کی آزادی کو متعین کرنے کی ضرورت ہے۔

میر کی حقیقت: ہم جو غذا کھاتے ہیں وہ ہضم ہوتی ہے۔ ہضم ہونے کے بعد اس غذا ون میں شامل ہو جاتا ہے۔ خون قلب سے ہو کر سارے جسم میں گردش کرتا ہوا پھر قلب ہی میں ونچتا ہے۔ قلب کی حرکت سے حرارت پیدا ہوتی ہے۔ بوجہ اس حرارت کے خون سے بہت بخارات پیدا ہوتے ہیں۔ ان بخارات کا نام روح ہوائی یا نسمہ ہے۔ اسی روح ہوائی پر زندگی اور موت کا دار و مدار ہے۔ جب تک روح ہوائی جسم میں موجود رہتی ہے اس وقت ن زندہ رہتا ہے اور جس وقت روح ہوائی کا تعلق جسم سے منقطع ہو جاتا ہے انسان مردہ ہے۔

س روح ہوائی کا تعلق ایک دوسری روح سے بھی ہوتا ہے جو روح ہوائی سے کہیں زیادہ تی ہے اس کا نام روح الٰہی ہے۔ روح ہوائی اور روح الٰہی کا تعلق کبھی منقطع نہیں روح ہوائی جسم میں رہے یا نہ رہے۔

کہ روح ہوائی کا تعلق ایک طرف تو روح الٰہی سے رہتا ہے دوسری طرف مادی جسم سے ن کے دو رُخ ہوتے ہیں۔ جو رُخ روح الٰہی کی طرف رہتا ہے اس کا نام ملکیہ ہے اور جو ہم کی طرف رہتا ہے اس کا نام بہیمیہ ہے[1]۔ ملکیہ اور بہیمیہ دونوں اپنے اپنے احکام جسم پر

---

[1] للہ البالغہ (بیان حقیقۃ الروح)

چلانا چاہتے ہیں۔ اگر انسان ملکیہ کے احکام پر برابر کاربند رہتا ہے تو ملکیہ کو قوت حاصل ہو جاتی ہے او
بہیمیہ کمزور پڑ جاتی ہے۔ اور اگر بہیمیہ کے احکام پر برابر چلتا رہتا ہے تو ملکیہ کمزور پڑ جاتی ہے۔
علم اخلاق کی اصطلاح میں ملکیہ کا نام ضمیر ہے اور بہیمیہ کا نام نفس ہے۔ چنانچہ انسان کا ضمیر ہمیشہ
صحیح راستہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور نفس ہمیشہ خواہشات نفسانی اور غلط راستہ کی طرف لے
جاتا ہے۔ جب انسان پہلے پہل کوئی غلط کام نفس کے اشارہ سے کرتا ہے تو ضمیر فوراً آگاہ کرتا ہے
کہ یہ کام غلط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدا میں غلط کام کرتے وقت دل میں ایک ہچکچاہٹ محسوس ہوتی
ہے جسے (Dictates of Conscience) ضمیر کی تنبیہ کہتے ہیں۔ اگر ضمیر کی اس آواز کو
انسان سن لیتا ہے اور غلط کام سے رک جاتا ہے تو ضمیر کو قوت حاصل ہوتی ہے اور نفس شکست
کھا کر کمزور ہو جاتا ہے۔ اور اگر ضمیر کی آواز پر کان نہیں دھرتا تو نفس کو فتح حاصل ہو جاتی ہے او
کمزور ہو جاتا ہے۔ اس لئے اگر انسان ضمیر کی آواز پر لبیک کہتا ہے تو ضمیر ہمہ وقت بیدار رہتا
ہے اور نفس اس کے تابع ہو جاتا ہے۔ اور اگر نفس کے تقاضوں کو برابر پورا کرتا رہے تو نفس
طاقتور ہو جاتا ہے اور ضمیر تقریباً مردہ ہو جاتا ہے

ضمیر اور نفس کے مابین جو کشمکش ہوتی رہتی ہے اس کے اعتبار سے نفس کی تین حالتیں
کبھی نفس ضمیر پر غالب ہو جاتا ہے اور ضمیر تقریباً مردہ ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں نفس کو نفس
ہیں۔ کبھی ضمیر اور نفس برابر قوت کے رہتے ہیں یعنی کبھی ضمیر غالب ہو جاتا ہے اور کبھی نفس کو غلبہ
ہے۔ ایسی حالت میں نفس کو نفس لوامہ کہتے ہیں۔ اور کبھی ضمیر غالب ہو جاتا ہے اور نفس اس
تابع ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں نفس کو نفس مطمئنہ کہتے ہیں[۲۶]۔

ضمیر کی آزادی: جس وقت نفس مغلوب ہو جائے اور ضمیر غالب ہو اس وقت

---

[۲۶] قرآن پاک مترجم حضرت شیخ الہند (فوائد بسلسلہ سورۃ القیامۃ۔ لا اقسم بیوم
ولا اقسم بالنفس اللوامۃ)

کو آزاد چھوڑا جاسکتا ہے۔ لیکن بقیہ دو صورتوں میں جبکہ نفس امارہ یا نفس لوامہ کی حالت ہو ضمیر کو آزاد چھوڑنا انتہائی خطرناک ہے کیونکہ نفس امارہ کی حالت میں جو افعال بھی انسان سے صادر ہوں گے وہ نفس کے تقاضے سے ہوں گے مگر وہ ان کو ضمیر کی طرف منسوب کرے گا اور سمجھے گا کہ ضمیر کے تقاضے سے ہو رہے ہیں اور نفس لوامہ کی حالت میں جو افعال صادر ہوں گے وہ کبھی نفس کے تقاضے سے ہوں گے اور کبھی ضمیر کے تقاضے سے۔ مگر دونوں صورتوں میں انسان اُن افعال کو ضمیر کی طرف منسوب کرے گا اور یہ سمجھے گا کہ ضمیر کے تقاضے سے ہو رہے ہیں۔

اب ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہمیں یہ کیسے معلوم ہو کہ فلاں فلاں افعال ضمیر کے تقاضہ سے ہو رہے ہیں اور فلاں فلاں نفس کے تقاضہ سے؟ اس کے لئے ہمیں کوئی معیار مقرر کرنا پڑے گا۔ مگر وہ معیار سوسائٹی نہیں مقرر کرسکتی۔ کیونکہ سوسائٹی کے بعض افراد معیار مقرر کرنے کے لئے جو رائے دیں گے وہ ضمیر کی آواز ہوگی اور بعض افراد نفس کے تقاضہ سے رائے دیں گے۔ اس لئے لامحالہ ہمیں ایسی ذات کے بنائے ہوئے معیار کو قبول کرنا پڑے گا جس میں نفس کا شائبہ تک نہ ہو۔ ایسی ذات روح الٰہی یا اس سے اعلیٰ اور اس سے لطیف ذات ہوسکتی ہے۔ چنانچہ جتنے آسمانی مذاہب ہیں اُن سب میں بذریعہ وحی پیغمبروں کے واسطہ سے معیار مقرر کردیا گیا ہے۔ جب معیار مقرر ہوگیا تو اب ضمیر اور نفس کے تقاضوں کے درمیان تمیز کرنا آسان ہوگیا۔ جو افعال اس معیار کے مطابق ہوں گے ان کو بغیر تامل سمجھ لیں گے کہ یہ ضمیر کے تقاضہ سے ہیں اور جو افعال اس معیار کے خلاف ہوں گے ان کے متعلق یقین ہوجائے گا کہ یہ نفس کے تقاضہ سے ہیں۔

عزیز احمد قاسمی

مدرس دارالعلوم دیوبند

(۲)

محبی اعظمی صاحب   السلام علیکم

ماہنامہ جامعہ میں استاد محترم پروفیسر محمد مجیب صاحب کا فکر انگیز مضمون "اسلام میں افراد کے ضمیر کا مقام" پڑھا۔ ویسے

تو پروفیسر مجیب صاحب کے سبھی مضامین بڑے دلآویز ہوتے ہیں، مگر یہ مضمون خاص طور پر مجھے بہت پسند آیا۔ میرے خیال میں ان کے تمام مضامین میں یہ سب سے اچھا اور فکر انگیز ہے۔ اردو کے مصنفین میں ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے، جنھیں مفکر کہا جاسکے، ان چند لوگوں میں، میرے خیال میں، پروفیسر محمد مجیب صاحب یقیناً نہ صرف شامل ہیں، بلکہ ان میں ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔

لکھنؤ کے ایک مولوی صاحب نے اس مضمون کا جواب لکھا ہے، میرا خیال ہے کہ انھوں نے شاید اس مضمون کو سمجھا ہی نہیں۔ انھوں نے مضمون کے ابہام اور اغلاق کی شکایت کی ہے، جو لوگ شرحوں اور حاشیوں کی مدد سے کتابوں کو سمجھنے کے عادی ہو جائیں، انھیں واقعی ہر اس عبارت کو سمجھنے میں دقت ہوتی ہے، جو نئے ڈھنگ سے لکھی جائے اور جس میں نئے خیالات ہوں۔ علماء کی ان بحثوں کا ذکر کرنے کے بعد" جن کی وجہ سے اسلام کا تصور وسیع ہونے کے بجائے اور تنگ ہو گیا" استاد محترم نے لکھا ہے کہ:

"۔۔۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے ذہن اور جذبات کو دلدل سے نکالنے کے لیے نہ علماء کی رہنمائی کام آسکتی ہے اور نہ کسی فرضی امام کی، اگر کام آسکتی ہے تو یہ اصول کہ مسلمان کے ضمیر کو اور صرف اس کے ضمیر کو رہنما مانا جائے۔"

اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ مسلمانوں کی زندگی میں مکمل انارکی پیدا ہو جائے گی، اُس وقت صحیح ہوتا جب مسلمانوں میں کوئی اجتماعی نظام ہوتا۔ موجودہ صورت حال میں اس کے علاوہ اور کوئی صورت نظر نہیں آتی کہ افراد کے ضمیر کو بیدار کیا جائے اور اُس صالح ضمیر پر پورا اعتماد کیا جائے۔ جو غلط اور صحیح، اچھے اور برے میں تمیز کرسکے اور روزمرہ کی زندگی میں صحیح رہنمائی کرسکے۔

آپ کا

عبدالرحمٰن ناصر اصلاحی

مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر۔ اعظم گڑھ

صراحت

نئی دلی ۲۔ ۹ فروری ۱۹۷۱ء

کرم فرمائے من! آداب

فروری ۱۹۷۱ء کے شمارۂ جامعہ میں آپ کا 'گل رعنا' پر تبصرہ نظر سے گزرا۔ اس کی تعریف و تحسین میں جو کچھ آپ نے فرمایا، اس کے لیے شکر گزار ہوں۔ آخر میں آپ نے لکھا ہے:

البتہ میں درخواست کروں گا کہ فاضل مرتب مولانا فضل حق خیرآبادی کی شعر فہمی اور ادبی

صلاحیتوں کے بارے میں اپنی رائے پر نظر ثانی ضرور کریں۔ یہ لکھنا کہ مولانا فضل حق "عالم ہوں گے، انھیں شعر وسخن سے کیا واسطہ" کوئی متوازن اور صحیح رائے نہیں ہے۔ کیا غالبؔ خود مولانا کی سخن فہمی کے قائل نہیں تھے؟ مزید براں فاضل مرتب سے گذارش ہے کہ اگر وہ مولانا فضل حق خیرآبادی کے حالات زندگی کا تفصیل سے مطالعہ فرمائیں، تو یقیناً وہ اپنی رائے بدل دینگے۔

اسے پڑھ کر واقعی تعجب ہوا۔ یہ میری رائے نہیں ہے، نہ میں نے اسے اپنی رائے کی حیثیت سے پیش کیا ہے؛ یہ محمد حسین آزاد کی رائے ہے جو وہ کنایۃً غالبؔ پر اعتراض کرنے کی خاطر لکھ گئے ہیں۔ میرا تو محض اتنا گناہ ہے کہ جو بات آزاد لفظوں کے اینچ پینچ میں بیان کر رہے تھے، اسے میں نے واشگاف کر دیا۔ غرض یہ کہ یہ میری رائے نہیں ہے۔

خاکسار

مالک رام

نوٹ: ہمیں بھی حیرت تھی کہ مالک رام صاحب جیسے محقق سے ایسی چوک کیسے ہوگئی۔ میں نے اصل عبارت کو گلِ رعنا کے مقدمے میں، سیاق وسباق کے ساتھ، بار بار پڑھا، اور اس نتیجہ پر پہونچا کہ آبِ حیات کے متعلقہ اقتباس کے بعد فاضل مرتب نے جو عبارت لکھی ہے اس کے بعد الفاظ اور فقروں کی نشست کچھ ایسی ہو گئی ہے کہ قاری اُسے انھیں کی رائے تصور کرے گا۔ پھر مولانا محمد حسین آزاد کی تحریر میں یہ صاف درج ہے کہ "یہ دونوں باکمال (یعنی مولوی فضل حق اور مرزا خان عرف مرزا خانی) مرزا صاحب کے دلی دوست تھے، ہمیشہ باہم دوستانہ جلسے اور شعر وسخن کے چرچے رہتے تھے۔" دوسرے لفظوں میں یہ کہ اپنی اس عبارت میں آزاد دور دور تک بھی یہ نہیں کہنا چاہتے کہ انھیں (مولوی فضل حق کو) شعر وسخن سے کیا واسطہ" ـــــ بہرحال ہمیں، مالک رام صاحب کی صراحت ہی کو صحیح سمجھنا چاہیے کیونکہ 'تصنیف را مصنف نیکو کند بیاں' ـــــ (مدیر)

ذاکر صاحب کی ۷۴ ویں سالگرہ

ذاکر صاحب کی ۷۴ ویں سالگرہ منانے کے لئے ۸ فروری کو جامعہ کے محمد علی ہال میں قرآن خوانی ہوئی اور شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب کی صدارت میں ایک جلسہ منعقد ہوا۔ تلاوت قرآن حکیم کے بعد جناب ضیاء الحسن فاروقی صاحب نے ایک مضمون پڑھا جو جامعہ کی اسی اشاعت میں شریک ہے، اس کے بعد دلی کے ایک مشہور آرٹسٹ جناب امرناتھ سہگل صاحب نے خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے مرحوم کی ہمہ گیر شخصیت پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے فرمایا کہ ان کا مطالعہ اور مشاہدہ اتنا وسیع تھا کہ وہ جس موضوع پر بھی بات کرتے تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ ان کا خاص موضوع ہے۔ آرٹ ایک ایسا فن ہے، جس کی باریکیوں پر ہر شخص کی نظر نہیں ہو سکتی تا آنکہ اس نے خاص طور پر اس کو سیکھا نہ ہو۔ ہمیں یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ ذاکر صاحب کی اس فن پر بڑی گہری نظر تھی اور جب وہ اس پر بات کرتے تو بعض ایسے گوشے سامنے آتے، جن پر ہم آرٹسٹوں کی بھی نظر نہ ہوتی۔ مرحوم کی مروت اور شرافت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ صدر جمہوریہ منتخب ہونے کے بعد، ملاقات کے سلسلے میں انھیں وہ آزادی حاصل نہیں تھی، جو اس سے پہلے تھی، مگر فن کاروں سے مل کر بے حد خوشی ہوتی اور جب کسی علمی یا تعلیمی موضوع پر گفتگو ہوتی تو چاہے ملاقاتی کا محدود وقت ختم ہو جائے، مگر ذاکر صاحب گفتگو جاری رکھتے اور ملٹری سکریٹری بھی اپنے کو بے بس محسوس کرتا۔

اس کے بعد صدر جلسہ نے ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب سے تقریر کی فرمائش کی۔ انھوں نے فرمایا کہ ذاکر صاحب کی شخصیت اور زندگی کے بہت سے پہلو ہیں اور چونکہ ایک طویل عرصے تک ان کے ساتھ کام کرنے اور ان کی زندگی کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے، اس لیے ان کے بہت سے پہلوؤں پر آج گفتگو ہو سکتی ہے، مگر چونکہ آجکل لوک سبھا کے انتخابات کا زمانہ ہے اور سیاسی مسائل زیر بحث ہیں، اس لیے ذہن میں آیا کہ ذاکر صاحب کو سیاست میں شریک ہونے سے جو وحشت تھی، اس کا ذکر کروں۔ ہم لوگ ۱۹۲۶ء میں جب جرمنی سے واپس آئے تو اس کے دو تین سال کے بعد ذاکر صاحب سے کہا گیا کہ وہ سنٹرل سکریٹریٹ کے الکشن کے لیے کھڑے ہوں، مگر انھوں نے صاف انکار کر دیا، اس کے بعد آزادی سے قبل مرکزی کابینہ میں ان کو شامل کرنے کی کوشش

ی، مگر انھوں نے معذوری ظاہر کی، پھر آزادی کے بعد ۱۹۵۲ء میں پہلے عام انتخابات کا اعلان ہوا تو پنڈت
ہرلال نہرو نے شکایت کی کہ ہر شخص الکشن کے لیے ٹکٹ کا متمنی ہے، ملک میں بہت سے کام ہیں جو کرنے کے ہیں،
ان کے لیے کوئی نہیں کہتا۔ اس وقت ذاکر صاحب نے لکھا کہ کم از کم میں کسی ٹکٹ کا خواہشمند نہیں ہوں۔ مولانا
اد کے سامنے یہ تجویز رکھی گئی کہ ذاکر صاحب کو راجیہ سبھا کے لیے نامزد کیا جائے۔ مولانا نے اس تجویز کو پسند
یا، مگر جب ذاکر صاحب سے رائے لی گئی تو انھوں نے فرمایا کہ میرا تو رائے دہندوں کی فہرست میں نام بھی نہیں ہے۔
تمام مواقع پر انکار کرنے یا سیاست میں شرکت نہ کرنے کی یہ وجہ نہیں ہے کہ وہ سیاست کی اہمیت سے واقف نہیں
یا اس کو تسلیم نہیں کرتے تھے، بلکہ اصلی وجہ یہ ہے کہ سیاست میں جو بدتمیزی اور بدتہذیبی نظر آتی ہے، ذاکر صاحب
ان چیزوں سے نفرت تھی، وہ بیہودگی اور بے وفائی کو کسی حالت میں بھی معاف نہیں کر سکتے تھے۔ وہ اکثر جا
طالب علموں سے کہا کرتے تھے کہ آپ یہاں سے جائیں گے تو مختلف مشاغل میں حصہ لیں گے، کچھ ایسے بھی ہوں
جو سیاست کا میدان منتخب کریں گے۔ میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ آپ کس سیاسی پارٹی کو اختیار کریں، مگر یہ ضرور
ں گا کہ جس پارٹی میں بھی شرکت کریں، جامعہ کے روشن نام پر دھبا نہ آنے دیں۔ ذاکر صاحب کی نظر میں سیاست
یار وہی تھا جو گاندھی جی کا تھا، چونکہ وہ معیار نظر نہیں آتا تھا، اس لیے خود بھی سیاست سے بچتے رہے اور
ی لوگوں سے بھی کتراتے رہتے۔ نائب صدارت کے عہدے کو انھوں نے اس لئے قبول کر لیا کہ بعض ملکی
و مسلحتوں کی وجہ سے ان کو مجبور کیا گیا تھا، مگر اس زمانے میں سیاست کی تلون مزاجی اور سیاست
وں کی خود غرضیوں اور بیہودگیوں کی وجہ سے ان کو بہت تکلیف پہنچی۔ اس لئے اس کی مدت ختم ہوئی
بارہ اس کو قبول کرنے سے شدت سے انکار کر دیا۔ ان کی صلاحیتوں اور مقبولیت کا اندازہ اس سے
اسکتا ہے کہ وہ جب تک صدر جمہوریہ رہے سیاست کا بہت سا طوفان بدتمیزی رکا رہا اور آپ نے
کہ ان کے بعد یہ طوفان کس تیزی سے آگے بڑھا۔ آج ہم جب ذاکر صاحب کو یاد کرتے ہیں تو دراصل
ردوں کو یاد کرتے ہیں جو ان کو عزیز تھیں اور جن کو انھوں نے اپنی زندگی میں اختیار کیا۔

آخر میں صدر جلسہ پروفیسر محمد مجیب صاحب نے فرمایا: جیسا کہ آپ لوگوں کو معلوم ہے آج کل
ر صاحب کی سوانح حیات لکھ رہا ہوں۔ قدم قدم پر مجھے خیال آتا ہے کہ عام طور پر ذاکر صاحب کی تعریف
ہم ان کی ان تمام باتوں کو بھول جاتے ہیں، جو ان کو عزیز تھیں اور وہ ہم میں پیدا کرنا چاہتے تھے۔ مثلاً ہم
ے شوق کا ذکر کرتے ہیں، مگر ان کے شوق میں جو وسعت تھی وہ ہم اپنے اندر پیدا نہیں کرتے۔ اگر وسعت
نہ پیدا نہ کر سکیں تو ایک ہی شوق میں ڈمہارت اور خصوصیت پیدا نہیں کرتے کہ اس کا حق ادا

کرسکیں۔ جامعہ کے مالی فقیرا کے شوق اور خدمت کے انہماک کو دیکھکر انھوں نے کہا تھا کہ اگر مجھے اختیار
تو میں اسے شیخ الجامعہ بنا دیتا۔ جب وہ نائب صدر تھے تو میں اکثر ان سے ملا کرتا تھا، اگرچہ میں ان سے ملنے
بچتا تھا، مگر ان کی محبت اور بے لاگ تعلق ملنے پر مجبور کرتا تھا، اس پانچ سال کی مدت میں انھوں نے ایک
نوجوان کی اور پارلیمنٹ کے دو ممبروں کی تعریف کی کہ وہ تیار ہو کر آتے ہیں۔ جس نوجوان کی تعریف
وہ مالی تھا۔ ذاکر صاحب چاہتے تھے کہ باغ میں جتنے پھول ہیں، ان کے ساتھ ان کے نام بھی لکھے ہوئے
مگر کوئی مالی یہ کام نہ کرسکا۔ یہ نوجوان جب رکھا گیا تو اس نے تمام پھولوں کے نام معلوم کئے اور ان کو
طور پر لکھنا سیکھا اور ایک دن ذاکر صاحب باغ میں گئے تو دیکھا کہ تمام پھولوں کے ساتھ ان کے صحیح
نام لکھے ہوئے لگے ہوئے ہیں۔

ذاکر صاحب، خدمت اور دوستی کی ایک مثال بیان کیا کرتے تھے کہ قائم گنج میں ایک صوفی تھے
ایک مرتبہ انھوں نے اپنے ایک مرید سے کہا کہ فلاں درخت کی مسواک بہت اچھی ہوتی ہے۔ دوسرے
روز اس درخت کی مسواک ان کے یہاں رکھی ہوئی ملی اور ہر روز تازہ مسواک رکھی ہوتی۔ یہ درخت قائم
سے پانچ چھ میل کے فاصلہ پر تھا۔ مگر یہ مرید روز صبح سویرے اٹھتا اور وہاں سے مسواک لایا کرتا۔ خدمت ا
خلوص کی اس قسم کی مثالوں کا ذاکر صاحب کی سیرت پر گہرا اثر پڑا ہے۔ مثلاً صوفی حسن شاہ کو کتابوں کا بڑ
شوق تھا اور ان کی مالی حالت ایسی نہیں تھی کہ خرید سکتے، اس لیے ان کی پسند اور ضرورت کی کتابیں ذاکر صا
نقل کیا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں نہ جانے انھوں نے کتنی کتابیں نقل کیں۔ اطاعت، فرمانبرداری او
دوسروں کو خوش کرنے کی یہ بہترین مثال ہے اور ذاکر صاحب کی زندگی میں ایسی مثالیں نہ جا
کتنی ہوں گی۔

آخر میں پروفیسر محمد مجیب صاحب نے فرمایا کہ ذاکر صاحب کی یاد کو تازہ رکھنے کی سب سے
اچھی صورت یہ ہوسکتی ہے کہ جن مشکلوں کا انھوں نے سامنا کیا اور جن قدروں کو اپنایا، ان کو ہم اپنے سا
رکھیں۔ ان کی زبانی تعریف کرنا بہت آسان ہے، تعریف کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ ہم ان خوبیوں کو اپنا
جو ذاکر صاحب کی زندگی میں رچ بس گئی تھیں۔

عبداللطیف اعظمی

تبصرہ وتعارف

(ضروری ہے کہ تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں بھیجی جائیں)

تذکرہ : مرتبہ: جناب مالک رام، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ اور دیدہ زیب، مجلد، صفحات ۵۴۲، قیمت پندرہ روپے، ناشر: ساہتیہ اکادمی، رابندرا بھون، نئی دہلی

تذکرہ کا شمار مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی اہم تصانیف میں ہوتا ہے۔ یہ پہلی بار ۱۹۱۹ء میں فضل الدین احمد مرزا کے اہتمام میں کلکتہ سے شائع ہوا۔ یہ ایڈیشن ٹائپ میں ہے اور اس میں مولانا مرحوم کا ایک فوٹو بھی ہے جو اسی دور کا ہے اور خوب ہے، ذہانت اور وجاہت چہرے سے نمایاں ہے، زیر نظر ایڈیشن میں یہ فوٹو غالباً کسی تکنیکی دشواری کے سبب شامل نہیں کیا جاسکا ہے، حالانکہ فضل الدین احمد صاحب نے اپنے مقدمے میں 'مولانا کا فوٹو' کے عنوان سے ایک خاصا طویل اور دلچسپ پیراگراف قلمبند کیا ہے۔

ہماری قومی وملی بیداری میں مولانا آزاد کے افکار وخیالات، اُن کی تحریروں اور انداز نگارش کا بڑا حصہ ہے، اپریل ۱۹۱۶ء میں حکومت بنگال نے انھیں بنگال سے جلاوطن کردیا اور وہ رانچی میں مقیم ہوگئے، تذکرہ اسی زمانے کی تصنیف ہے اور صرف پانچ مہینے کی ذہنی کاوش کا نتیجہ ہے۔ اس تصنیف کی ابتدا یوں ہوئی کہ فضل الدین احمد صاحب نے اُن سے اپنے حالات قلمبند کرنے کے لئے اصرار کیا، لیکن اس اصرار کے بعد جو چیز سامنے آئی وہ یہ تذکرہ ہے جس میں ایک فصل ان کے اپنے حالات سے متعلق ہے جو اشارات و نایات سے معمور ایک مسحور کردینے والا انشائیہ ہے۔ تذکرہ کے صفحات کیسے لکھے گئے وہ بھی ایک دلچسپ داستان ہے جسے مقدمہ نگار نے بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ مقدمہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب کتاب پریس میں دی گئی تو ارادہ تھا کہ ایک ہی جلد میں شائع کی جائے گی، لیکن کمپوز شروع

ہونے کے بعد معلوم ہوا کہ میرا اندازہ ضخامت کے بارے میں غلط تھا... مجبوراً کتاب کو دو جلدوں
تقسیم کر دیا گیا۔ یہ پہلی جلد ہے۔ دوسری جلد کے پہلے حصہ میں مولانا کے خاندانی حالات کا بقیہ حصہ ہے
حصہ میں خود مولانا کی سوانح عمری ہے جو خاکسار نے ترتیب دی ہے اور اس کا بھی اکثر حصہ سوالات کے
میں خود ان کا لکھا ہوا ہے۔" افسوس کہ یہ دوسری جلد جس میں موجودہ کتاب کے بعض حواشی بھی جو رد کر
گئے تھے، شامل ہوتے، چھپ نہ سکی، غالباً ۱۹۲۲ء میں فضل الدین احمد مرزا کا اچانک انتقال ہو گیا۔
آزاد نے بہت کوشش کی کہ مسودہ ان کے خاندان والوں سے حاصل ہو جائے، لیکن وہ نہ مل سکا۔

اعتذار کے عنوان سے شروع میں مولانا آزاد کا ایک نوٹ ہے جس میں اس کا افسوس ہے
اس قدر جلد چھپ رہی ہے اور متعدد حصے جو نظر ثانی کے محتاج تھے، جوں کے توں شائع ہو رہے ہیں
کے نقائص میرے نقص کار و ضعف قلم کا نتیجہ ہیں، اس لئے شرمسار و معافی خواہ ہوں۔ چونکہ کتاب کا
چھپ چکا تھا، اس لئے بقیہ اجزاء کی نظر ثانی و تہذیب پر طبیعت مائل نہ ہوئی۔ لوگوں نے اپنی دلجم
فراغ خاطر کی یادگاریں چھوڑی ہیں، اپنی پریشان خاطری اور پراگندگی طبع کی بھی ایک یادگار رہے تو بہتر
کتاب میں بعض مقامات پر نقد و تعقب کی سختی و تلخی نمایاں ہے، خود مصنف کو اس کا احساس تھا، ا
اس کے لئے عذر خواہ بھی تھے۔ اس موقع پر انہوں نے مجرد علمی بحث اور اصلاحی و تبلیغی اسلوب کا فرق
کیا ہے اور لکھا ہے کہ بحث و نظر حکماء کی حکمت ہے اور دعوت و تبلیغ انبیائے کرام کی حکمت... پس یہ ا
نظر رہے کہ کتاب میں جہاں کہیں اس قسم کے مطالب آگئے ہیں، مقصود اصلی ان سے اصلاح و دعوت
اور اس لئے ضروری ہے کہ مکروہات کے بیان میں یک گونہ تشدد اور محاسن کے تذکرہ میں ایک حد تک
نمایاں ہو۔" درحقیقت مولانا کی یہ کتاب ایک خواب ہے، ایک آرزو ہے یا ایک قطرۂ اشک جو
اسلامیہ کے غم میں بے اختیار ٹپک گیا ہے جس میں جذبات کی شدت پورے طور پر سمٹ آئی ہے
درد و سوز کی ایک دنیا آباد ہے۔ اسے پڑھئے اور سمجھ لیجئے تو داخل حسنات ہونے کی تمنا ہوتی ہے
اور جد و جہد کی تڑپ پیدا ہوتی ہے اور یہ دعا قلب سے نکلتی محسوس ہوتی ہے: فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْ

اَنْتَ وَلِیّٖ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ ۚ تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ ۝

مبارکباد کے مستحق ہیں مالک رام صاحب کہ انھوں نے اردو کی اس کلاسیکی تصنیف کو بڑی محنت اور خوش سلیقگی سے ایڈیٹ کرکے شائع کرایا۔ انھوں نے اس کے لئے ایک پیش لفظ لکھا، ۲۴۴ صفحے پر پھیلے ہوئے حواشی تحریر کئے اور اعلام، بلاد و اماکن، آیات قرآنی واردۂ متن، احادیث واردۂ متن، کتب واردۂ متن اور مآخذ حواشی کی فہرستیں بڑی تفصیل سے تلبند کیں۔ تفصیل کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ یہ تمام فہرستیں تقریباً ساٹھ صفحوں پر مشتمل ہیں۔ حواشی لکھنے کے لئے فاضل مرتب نے اردو، عربی اور فارسی کی سیکڑوں کتابیں دیکھیں، قارئین اندازہ کرسکتے ہیں کہ کتنی دیدہ ریزی سے یہ کام ہوا ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو میں تحقیق اور ترتیب و تدوین کے کام کو سائنٹفک بنانے اور اس کے معیار کو اونچا کرنے میں مالک رام صاحب کا ایک نمایاں حصہ ہے۔

فاضل مرتب کے حواشی معلومات کا ایک خزینہ ہیں، سنین، تاریخی واقعات، اشعار اور احادیث و کتب وغیرہ (واردۂ متن) سے متعلق ضروری حوالے بہم پہونچانا خاصا دشوار اور صبر آزما کام ہے۔ شاید اسی لئے کہیں کہیں ایسی باتیں آگئی ہیں جن سے اختلاف کیا جاسکتا ہے، ان کی تعداد بہت کم ہے، چند امور کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں:

(۱) صفحہ ۳۴۳ ــــــ "مولانا محمود الحسن" صحیح نام محمود حسن ہے۔ انھوں نے "ملک کی آزادی کی تحریک میں بھی حصہ لیا اور اسی سلسلے میں قید و بند کی سزا ہوئی اور جزیرہ مالٹا میں جلاوطن بھی رہے۔" اس جملہ میں "جلاوطن بھی" کے فقرے سے یہ غلط فہمی ہوسکتی ہے کہ اس سے پہلے انھیں قید و بند کی دوسری منزلوں سے بھی گذرنا پڑا تھا، یہ صحیح نہیں ہے۔

(۲) صفحہ ۳۴۴ ــــــ مولانا محمد علی مرحوم سے متعلق لکھتے ہیں کہ "ان کی تعلیم ... بریلی اور الہ آباد ہوئی" مولانا محمد علی نے الہ آباد میں تعلیم نہیں حاصل کی۔ وہ علی گڑھ کے طالب علم تھے اور یونیورسٹی، قدیم ہوسٹل موریسن کورٹ میں رہتے تھے۔

(۳) صفحہ ۳۴۷ ــــــ صہیب رومیؓ کے متعلق لکھا ہے کہ "ان کا کافی زمانہ روم میں گذرا" یہاں وضاحت نہیں کہ یہاں روم سے کیا مراد ہے، شہر روم سے یا مغربی ایشیا کے اس علاقے سے جس پر

اس وقت مشرقی رومی شہنشاہیت کا قبضہ تھا اور جس کی نسبت سے کوئی اسلامی مشاہیر رومی کہے جا
مثلاً مولانا روم۔

(۴) صفحہ ۳۵۵ ــــ اس صفحہ پر "ضلع گنگوہ" لکھا ہوا ہے، آج گنگوہ ایک قصبہ ہے، ممکن
کسی زمانے میں ضلع رہا ہو۔ اس صورت میں اس کی وضاحت ہونی چاہیے تھی۔

(۵) صفحہ ۳۶۰ ــــ مولانا نے تذکرہ میں ایک موقع پر یہ شعر لکھا ہے :

من از فریب عمارت گدا شدم، ورنہ
ہزار گنج بہ ویرانۂ دل افتاد است

مالک رام صاحب نے اپنے حاشیہ میں لکھا ہے : "مطبوعہ دیوان میں اور تذکرہ کے
میں بھی مصرع اولیٰ میں 'عمارت' ہے ؛ لیکن مولانا نے اسے کاٹ کر 'امارت' بنادیا تھا ؛ یہ یقیناً
ہے۔" مجھے اس سے اختلاف ہے، مطبوعہ دیوان اور تذکرہ کے پہلے ایڈیشن میں 'عمارت' کا لفظ
ہے، کیونکہ میرے نزدیک عرفی نے پہلے مصرع میں 'عمارت' اور دوسرے مصرع میں 'ویرانہ' لکھ کران
کے تضاد سے شعر میں حسن پیدا کرنا چاہا ہے۔ اہل نظر جانتے ہیں کہ امارت اور گدا کے تضاد میں رو
نہیں، تعجب ہے کہ مولانا آزاد کو کیوں تسامح ہوا اور عمارت کاٹ کر امارت کر دیا۔

(۶) صفحہ ۳۷۶ ــــ وحشی کے ہاتھوں حضرت حمزہؓ کی شہادت جنگ بدر میں نہیں بلکہ جنگ احد
واقع ہوئی تھی۔ اگلے ایڈیشن میں تصحیح کر دی جائے۔

(۷) صفحہ ۴۴۶ ــــ ایک شعر ہے :

مشاطہ را بگو کہ براسباب حسن یار
چیزے فزوں کند کہ تماشا بما رسید

مالک رام صاحب نے لکھا ہے : "یہ شعر کوئی جگہ نظیری نیشاپوری کے نام سے دیکھا ہے، لیکن انکا
اس سے خالی ہے۔ عام طور پر مصرع ثانی میں 'رسد' کی جگہ 'رسید' ملتا ہے۔" انھوں نے اس سلسلہ میں اپنی را
نہیں دی ہے، دراصل یہ 'رسید' ہی ہے اور مولانا نے بھی یہی لکھا ہے۔

ایک بات اور توجہ کی محتاج ہے۔ فاضل مرتب نے اپنے پیش لفظ میں ایک موقع پر یہ لکھا ہے کہ
ملوں پڑھنے سے معاً خیال ہوتا ہے کہ وہ کوئی خاص دعویٰ کرنے کو پر تول رہے ہیں۔ دیکھا جائے تو اس
اد دراصل ۱۹۱۳ء میں پڑی، جب انھوں نے حزب اللہ کی بنیاد رکھی تھی؛ اور یہ اسی کا قدرتی نتیجہ تھا کہ
ءمیں انھوں نے اپنی امامت پر بیعت لینے کے لئے مختلف صوبوں میں داعی مقرر کر دیئے۔ معاملہ خاصا
بڑھ چکا تھا۔۔۔۔ میں واقعی ان کی کرامت خیال کرتا ہوں کہ وہ اس حد تک جانے کے بعد بھی صحیح سلامت
آگئے۔" میں نے یہ عبارت پڑھی تو سخت متعجب ہوا۔ ایک ایسی بات جس کی کوئی بنیاد نہ ہو اور ان
عاصرین، موافقین و مخالفین دونوں، اور ان کے مریدوں اور عقیدتمندوں میں سے کسی نے بھی جس کی
کوئی اشارہ نہ کیا ہو، آج کیسے محض قیاس کی بنیاد پر تسلیم کر لی جائے، مولانا مرحوم کی کسی عبارت کی اس
ی توجیہہ سے ان کے متعلق غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے۔ مولانا کی تعلیم و ارشاد کے حاصل اور نمونوں میں
ا عبداللہ قصوری، مولانا عبدالحیٰ فاروقی، مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد (بہاری)، مولانا غلام رسول
ور مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی وغیرہم ہیں، ان میں سے کسی نے بھی کبھی اس طرح کا تاثر قبول نہیں
یا کہ فاضل مرتب کا ہے۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ ہمیں کسی عبارت کی اس طرح کی تاویلات و تعبیرات
بنا چاہیئے۔

عیارِ غالب : مرتبہ: جناب مالک رام، صفحات ۲۷۲، متوسط تقطیع، کتابت و طباعت اچھی، مجلد، قیمت سات روپے ستر پیسے، ناشر: علمی مجلس، حبتہ نواب صاحب، فراشخانہ دہلی ۶

یہ کتاب درحقیقت علمی مجلس کے ماہی رسالے "تحریر" کا مخصوص غالب نمبر ہے جو گذشتہ سال فروری میں
کی صد سالہ برسی کے موقع پر شائع کیا گیا تھا۔ اس مجموعے میں جو مضامین ہیں وہ خاص اسی کے لئے لکھے
ہے، مضمون نگاروں میں فراق گورکھپوری، ڈاکٹر محمد حسن، پروفیسر ضیاء احمد بدایونی، قاضی عبدالودود، پروفیسر
نار رضوی ادیب، سید محمد حسین رضوی، گیان چند، محمد عزیز حسن مراد آبادی، ڈاکٹر نریندر ناتھ
ر عبدالجلیل اور مالک رام صاحب خود ہیں، اختر حسین نے غالب کی فارسی مثنوی "چراغ دیر" کا
منظوم ترجمہ کیا ہے، یہ خوبصورت، رواں اور اثر آفریں ترجمہ بھی اس مجموعہ میں شامل ہے۔ فاضل

مرتب نے اپنے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ سید محمد حسین رضوی کا مضمون "غالب کی صحیح تاریخ ولادت" ڈاکٹر عبدالجلیل کا مضمون "غالب کی بیماریاں اور مرض الموت" اور ڈاکٹر نریندر ناتھ وگ کا مضمون "غالب، ایک نفسیاتی مطالعہ" خاص طور سے پڑھا جائے۔ واقعی یہ مضامین اپنے موضوع کے اعتبار سے دلچسپ ہیں اور غالب کی زندگی اور موت سے متعلق نئے گوشے پیش کرتے ہیں، باقی مضامین بھی محنت اور بالغ نظری سے لکھے گئے ہیں اور ان سے غالب شناسی کے مواد میں معتدبہ اضافہ ہوا ہے۔

مجلہ سیفیہ غالب نمبر: مرتبہ: جناب متین سید، صفحات ۳۰۷، کتابت و طباعت عمدہ، ملنے کا پتہ: سیفیہ کالج، بھوپال

سیفیہ کالج کے شعبۂ اردو کے مجلہ کا یہ غالب نمبر اپنے مضامین کے تنوع کے اعتبار سے خاصے کی چیز ہے، اس کی ترتیب سے بھی خوش سلیقگی عیاں ہے، اس میں نظمیں بھی ہیں، اور غالب کی بعض تحریروں کے عکس بھی، جناب عبدالقوی دسنوی صاحب کا مضمون "نسخۂ بھوپال اور نسخۂ بھوپال ثانی" بڑی محنت سے لکھا گیا ہے، اگرچہ اب ان نسخوں کے بارے میں طرح طرح کی باتیں کہی جا رہی ہیں۔ اس میں ایک مضمون پروفیسر محمد مجیب صاحب کا بھی ہے، عنوان ہے، "غالب کی شاعری"، اس مضمون کی وجہ سے جبہ و دستار کے بعض حلقوں کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں حالانکہ اس میں کوئی ایسی بات نہیں ہے، پروفیسر محمد مجیب نے غالب کو محض ایک شاعر اور ان کی شاعری کو محض شاعری، جیسی کچھ کہ وہ ہے، سمجھ کر یہ مضمون لکھا ہے، اس کے بعض پہلوؤں سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن اس میں نہ تو غصہ آنا چاہیے اور نہ یہ سمجھنا چاہیے کہ "مذہب خطرہ میں ہے"۔

(ضیاء الحسن فاروقی)

Regd. No. D-780 March, 197[illegible]

The Monthly J A M I A

JAMIA NAGAR, NEW DELHI-25



جامعہ

جامعہ ملّیہ اسلامیہ دہلی

جامعہ

قیمت فی پرچہ
پچاس پیسے

[سا]لانہ چندہ
[...] روپے

شمارہ ۴	بابت ماہ اپریل ۱۹۷۱ء	[ج]لد ۶۴

فہرست مضامین

مدیر

ضیاء الحسن فاروقی

خط و کتابت کا پتہ

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی مطبوعہ: یونین پریس دہلی ٹائیٹل:

شذرات

جب بڑے پیمانے پر کسی معاشرے میں نئے اور طاقتور عمرانی، معاشی، تہذیبی، اخلاقی اور سیاسی رجحانات
نما ہوتے ہیں یا اس طرح کی فکری طاقتوں سے اس معاشرے کا سامنا ہوتا ہے تو دیکھنے میں یہی آیا ہے کہ
معاشرے کی قسمت کا فیصلہ اس امر پر ہوتا ہے کہ کس حد تک یہ معاشرہ تخلیقی سطح پر ان نئے چیلنجوں کا
اب دے سکتا ہے۔ اگر یہ معاشرہ ماضی کی پُر فریب پناہ گاہیں تلاش کرنے یا اپنے اصولوں اور آدرشوں
صلحت پر قربان کرنے کے بجائے، اعتماد اور وقار کے ساتھ تخلیقی عمل اور ردعمل کے اصول پر نئے
ائل سے آنکھیں ملاتا ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے حوصلوں کے لئے نئی جولانگاہیں فراہم
تا ہے اور اپنے اصولوں اور آدرشوں کو عمل میں لانے کے لئے خود ایک جہانِ تازہ کا متمنی بن جاتا ہے۔

یہ معاشرہ اگر حالات سے سمجھوتہ کرلے، اپنے اصولوں کو قربان کر دے، تو یہ نتیجہ ہوگا کہ اس
جود ہی خطرہ میں پڑ جائے گا، بعض ماہرینِ عمرانیات کا کہنا ہے، اور یہ تاریخی حقیقت بھی ہے، کہ یہ
شرہ فنا ہو جائے گا اور اس کی جگہ کوئی دوسرا سماج۔ تہذیبی وجود اجتماعی لے لے گا۔ لیکن اس سے
زیادہ سچی حقیقت یہ ہے: اگر کوئی معاشرہ ماضی ہی میں زندہ رہنے لگے ــــ اس ماضی کی یادیں
کتنی ہی شیریں اور خوشگوار کیوں نہ ہوں ــــ اور حال کی حقیقتوں کا سامنا کرنے میں ناکام رہے
ــ یہ حقیقتیں چاہے جتنی ہی تلخ اور ناخوشگوار کیوں نہ ہوں ــ تو پھر اسے فوسل (Fossil)
ر بن جاتا ہے، اور یہ کبھی نہ بدلنے والا قانونِ الٰہی ہے کہ فوسل زیادہ دنوں باقی نہیں رہتے: "وَمَا
نٰهُمْ وَلٰكِنْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ..." (سورۃ ہود: ۱۰۱)

ہمارا ایمان ہے کہ زندگی کی حقیقی اور روحانی اساس ذات الٰہی ہے اور اس کی اطاعت نظ
صحیحہ کی اطاعت ہے۔ یہ ایک قائم و دائم حقیقت ہے اور اسے ہم اختلاف و تغیر میں بھی جلوہ گر دیک
ہیں۔ جب ہم اس بات کو مانتے ہیں تو گویا اس پر بھی عقیدہ رکھتے ہیں کہ ثبات اور تغیر زندگی کی دو ا
خصوصیتیں ہیں اور ان میں سے، اسلامی عقیدہ کے مطابق، ہم کسی کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ نظم اف
اور تاریخی تسلسل کے لئے ثبات کی خصوصیت ضروری ہے ورنہ ہر لحہ بدلتی ہوئی اس دنیا میں کسی با
پر مضبوطی سے قائم نہیں رہا جا سکتا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے اور نہ کبھی رہا ہے کہ ثبات کے اہ
اصول سے تغیر اور تبدیلی کے جملہ امکانات کی نفی کر دی گئی ہے کیونکہ تغیر وہ حقیقت ہے جسے قرآ
مقدس نے اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی آیت ٹھہرایا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ قرآن نے
زندگی کو متحرک اور متغیر قرار دیا ہے۔

مسلمانوں کی قریب قریب گذشتہ ایک ہزار سال کی تاریخ کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے ک
عملی طور پر قرآن کے اس اصول کو فراموش کر دیا گیا کہ زندگی کی فطرت ہی حرکت اور تغیر ہے۔ انیسو
صدی کے دوسرے نصف حصہ میں ہمیں اس کوشش کا آغاز ملتا ہے کہ تجدد کے ساتھ آنے والے
چیلنجوں کا سنجیدگی سے جواب دیا جائے جن کا سرچشمہ مغرب اور مغربی تہذیب ہے۔ اس زمانے میں
ہند و پاک اور مشرق اوسط میں ہمیں ایسے مفکر ملتے ہیں جنھوں نے بڑی حد تک اپنی تخلیقی صلاحیت کا ثبو
دیا۔ آزاد مسلم ریاستوں کے قیام کے بعد سے تجدد کے تقاضوں کی رفتار اور تیز ہو گئی ہے اور ہو
چاہیے تھی۔ یہ ملک ترقی کرنا چاہتے ہیں اور کسی نہ کسی پیمانے پر صنعتی تمدن کی راہ پر گامزن ہیں، صنعت
سے یہ بچنا چاہیں بھی تو نہیں بچ سکتے۔ صنعت اور ٹکنولوجی کے اثرات اتنے ہمہ گیر اور گہرے ہو گئے
کہ اگر اسی پیمانے پر مسلمانوں کی طرف سے تخلیقی عمل کا سلسلہ نہیں شروع ہوتا تو ہمارا معاشرہ اس طرح
نہیں کر سکتا کہ وہ ترقی بھی کرے اور مسلمان بھی رہے۔ اس کے لئے مسلمانوں کو مسلسل، منظم طور پر اور نئ
زاویۂ نظر سے، غور و فکر کرنا ہے اور ایک ایسا فکری نظام بنانا ہے جو اسلامی اصولوں کے مطاب

ہد حاضر کے تقاضوں کا جواب بھی دے سکتا ہو۔ ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آج دنیائے
م میں اس طرز کی فکری کاوشوں کا دور دور تک پتہ نہیں۔ درحقیقت مسلمان آج بھی ذہنی کاہلی کا
رہیں اور نتیجہ میں ہمیں مسلمان ملکوں میں دو قسم کے انتہا پسندانہ رجحان نظر آتے ہیں: (۱) نئی فکری
ں اور معاشرتی ومعاشی طاقتوں کے سلسلے میں ایک بے نیازی اور عدم دلچسپی کا رویہ، اس رویے
بہ سے مسلمانوں کو وقت کے نشیب وفراز کے ساتھ اپنی مرضی کے کسی دخل کے بغیر چلنا پڑتا ہے۔
ماضی کی طرف فرار کا رویہ جس سے فوری طور پر جذباتی تشفی وتسکین کا سامان فراہم ہو جاتا ہے لیکن
ت میں یہ رویہ پہلے رویے سے زیادہ خطرناک اور مہلک ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ مسلمانوں نے ہمیشہ ذہنی کاہلی یا فرار کا راستہ اختیار کیا۔ ان کی تاریخ میں، خاص
ے اسلام کی پہلی دو صدیوں میں، اس کے شواہد کثرت سے ملتے ہیں کہ انھوں نے تعلیمات قرآنی
نت نبوی کی سماج میں پیدا ہونے والی نت نئی صورت حال سے نبٹنے کے لئے تخلیقی طور پر صراحت اور تعبیریں
، اور یہ چیزیں مسلم جماعت کی زندہ سنت بن گئیں، اور یہ اسی وقت ممکن ہو سکا جب مسلمانوں کے
رائے زندگی کو متحرک تصور کرتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اسلام کی ہیئت ترکیبی میں حرکت
ہر قائم رکھا جا سکتا ہے تو وہ صرف اجتہاد سے۔ آج اجتہاد کا نام لے لیجیے تو جبہ ودستار
لنیں پڑ جاتی ہیں، جیسے خدانخواستہ کفر والحاد کی کوئی بات کہدی گئی ہو۔

لغوی اعتبار سے اجتہاد کے معنی ہیں کوشش کرنا، لیکن فقہ اسلامی کی اصطلاح میں اس کا مطلب
اہ کوشش جو کسی قانونی مسئلے میں قرآن وسنت کی روشنی میں آزادانہ رائے قائم کرنے کے لئے
ئے۔ قرآن شریف اور احادیث نبوی میں اس طرح کے اشارے ملتے ہیں، مثلاً سورہ العنکبوت
یت: وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا، اور حضرت معاذ ابن جبل والی حدیث۔
ا ہمارے فقہائے متقدمین نے اس سلسلہ میں جو کارنامے انجام دئے وہ آج ہمارے مذاہب

اربعہ کی شکل میں موجود ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نظری طور پر اہل سنت والجماعت نے اجتہاد کی
سے کبھی انکار نہیں کیا لیکن مذاہب اربعہ کے قیام کے بعد عملاً اس کی اجازت بھی نہیں دی گئی کیونکہ
اس سلسلہ میں جو شرطیں لگائی گئیں ان کا پورا کرنا محال ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس نظا
قانون نے جس کی بنیادیں قرآن مجید پر استوار ہوئیں اور جو زندگی کو متحرک و متغیر قرار دیتا
ایسی روش کیوں اختیار کی اور قانون اسلام کیوں جامد ہو کر رہ گیا۔ ظاہر ہے کہ اس کے
اہم اسباب تھے لیکن اس صورت حال سے مسلمانوں کو جو نقصان پہونچ چکا ہے اور جو پہو
رہا ہے، وہ ناقابل تلافی ہے۔ مسلمانوں کے دانشور طبقے، علماء اور جدید تعلیم یافتہ دونوں
کو اس بظاہر عقدۂ لاینحل کو حل کرنا ہے، ورنہ مسلمانوں کی ذہنی پسماندگی اور من حیث الجماعۃ
ان کی سیاسی و معاشی کمزوری بڑھتی رہے گی اور ان کا شمار دنیا کے پست ترین انسانی گرو
میں ہوگا۔

ہدلقی

روشؔ ـــــــ ایک رومانی شاعر

روشؔ صاحب کے بارے میں سوچتا ہوں تو ذہن میں ایک متحرک مضطرب اور مختصر سے شخص کی تصویر ابھرتی ہے ۔ شخص کی یہ تصویر شخصیت کی بھی تصویر ہے اور شاعری کی بھی ۔ کبھی کبھی مجھے انھیں دیکھ کر کچھ ان محسوس ہوا ہے جیسے ان کے شخصی وجود اور شعری کردار میں کوئی فرق ہی نہ ہو ۔ ان کی زندگی کی امید پروری، حیات انگیزی، الوہی معصومیت، معصوم آسمان گیری یا مقدس ماورائیت، مہذب سرشاری، غیر نمائشی سلیقہ مندی وغیرہ اُن کی شاعری کے بھی اتنے ہی اہم اجزا ہیں جتنے کہ ان کی زندگی کے ۔

میرے ذہن پر روشؔ صاحب کی شاعری کا اوّلیں نقش اُن کی رومانی شاعری کا ہے ۔ میں نے بچپن میں ان کی نظم "مرے سروِ ناز ابھی نہ جا" پڑھی تھی ۔ مجھے یاد ہے کہ اس نظم نے مجھ پر ایک طرح کی وجد آفریں کیفیت پیدا کر دی تھی ۔ اب سوچتا ہوں کہ اس رومانی نظم میں کتنی تازگی اور طہارت تھی اور کیسی بسیط سحر آفرینی تھی ۔ اس کے بعد میں نے ان کی کتنی ہی رومانی اور غیر رومانی نظمیں مختلف رسالوں میں پڑھیں اور متاثر ہوا ۔ جسم کی ایسی غیر جسمانی شاعری کم از کم اس دور میں میری نظر سے نہیں گزری ۔ روشؔ اور ان کے ہم عصروں کی رومانی شاعری دراصل اردو کی اصلاحی اور مقصدی شاعری کے خلاف ایک طرح کا رد عمل تھی ۔ اس کے علاوہ بے رحم صداقتوں کے خلاف انسانی ذہن ہمیشہ باطنی یا تخئیل قلعہ بندی کرتا رہتا ہے ۔ رومانی شاعری کی ماورائیت، تخئیل پسندی، داخلیت، فطرت پرستی، خارجی زندگی کی بدصورتیوں کے مقابلے میں ذاتی نادیدہ گلستانوں کی تخلیق کے عزم کی آئینہ داری کرتی ہے ۔ غیر ملکی غلامی ، اقتصادی زبوں حالی اور سیاسی پراگندگی کے مقابلے میں یا مقابلہ نہ کر سکنے کی صورت میں، رومانی شاعری

کا اردو میں فروغ پانا سمجھ میں آتا ہے۔ رومانی شاعر کی طرح رومانی شاعری کی بھی عمر کم ہوتی ہے۔ زیادہ تر تو شاعر کی زندگی ہی میں رومانی شاعری دم توڑ دیتی ہے۔ آشوبِ آگہی انتقام لے لیتا ہے یا یوں کہیے کہ ذہنی اور جذباتی عمر جیسے جیسے بڑھتی جاتی ہے، رومانیت کم سے کم ہوتی جاتی ہے۔ بعض اوقات تو بعد کی شاعری رومانی شاعری کی تردید بن کر رہ جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ رومانیت ہمیشہ اور ہر حال میں صرف ایک جذباتی رویّہ نہیں ہوتی، ایک ذہنی رویّہ، فلسفہ اور انداز بھی ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں یہ تمام عمر طرح طرح سے شاعری میں آئینہ کاری کرتی رہتی ہے۔ اقبال اس لحاظ سے تمام عمر رومانی رہے۔ رَوِش کی رومانیت کی بھی کم و بیش یہی نوعیت ہے۔ رَوِش کی تعلیم و تربیت جس ماحول میں ہوئی اس میں صحت مند تصوف کی اقدار رچی بسی ہوئی تھیں۔ گرو کل کانگڑی میں تعلیم کے دوران انھیں ہندو فکر و فلسفے کی زندہ آگہی نصیب ہوئی۔ اس کے علاوہ بعد میں بھی وہ مسلم تصوف سے خاصے متاثر ہوئے۔ ان کی رومانی تخئیل کو اِنھیں فکری اور جذباتی ماخذوں سے بال و پر ملے۔ ہندو فکر و فلسفے میں روح اور جسم کی ثنویت پر اکثر زور دیا گیا ہے۔ غالبًا یہی وجہ ہے کہ رَوِش کی رومانی شاعری میں ہمیں ماورائی ٹھنڈک زیادہ محسوس ہوتی ہے اور جسم کی گرمی کم۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ انھوں نے جسم کے مطالبات کو ترفع کی منزل تک پہنچا دیا ہو اور جس کیفیت کا اظہار کیا ہو وہ اپنی اولین آلائشوں اور تناقضات سے پاک ہو کر ایک مقدس احساس بن گئی ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو ان کی رومانی شاعری میں کسی نہ کسی طرح کی، کسی نہ کسی سطح پر کشمکش کا احساس ہوتا۔ اچھی اور بڑی شاعری ٹنشن یا کشمکش کی پیداوار ہوتی ہے۔ رَوِش کی نظم "شاہدِ معصوم" کے چند بند ملاحظہ ہوں:

محفل آرائے وفا تو اور میں ننگِ وفا
دل مرا تاریک ہے تو بحرِ انوار و ضیا
رہروِ منزل ہوں میں اور تو ہر گرد و آشنا
نور تیری ابتدا ہے خاک میری انتہا
بھول جائے شاہدِ معصوم مجھکو بھول جا

فطرتِ رنگیں کو تو اے دل رُبا محبوب ہو
قدسیوں کو تیرا اندازِ حیا محبوب ہو
آہ، ہر محبوب کو تیری ادا محبوب ہو
اور تیرے دل کا ہر محبوب اک غم آشنا
بھول جا اے شاہدِ معصوم مجھ کو بھول جا

'بحرِ انوار و ضیا' اور 'گردوں آشنا' جیسی تراکیب اور اشعار کی باطنی فضا شاعر کے ذہن کی ماورائیت ازی کرتی ہے۔ طہارتِ فکر تروش کی رومانی، غیر رومانی اور نیم رومانی نظموں میں طرح طرح سے ں ہوتی ہے۔ غزلوں کے اشعار کی فضا بھی ان کے باصفا ذہن کی تابانیوں سے معمور ہے۔ ایسا لگتا جیسے انھوں نے فکر و احساس کی کسی بھی منزل پر غالب کی زبان میں 'آلائشِ پندارِ وجود' سے اپنی شاعری لودہ نہیں ہونے دیا ہو۔ زمین سے بلند ہو کر حیات و کائنات کی سیر، تروش کی رومانی افتادِ کی ایک خصوصیت ہے جسے آج کی سماجی تنقید پسند کرے یا نہ کرے، بہرحال اس نے ہمیں ایک ی فضا سے آشنا کیا۔ خود میں جب بھی اُن سے ملا ہوں تو مجھے ہمیشہ یہ محسوس ہوا ہے گویا ایک معصوم تہ غلطی سے اُس تاریک سیارے میں آ گیا ہو جسے ہم عرفِ عام میں دنیا کہتے ہیں۔ ان کا وہ اضطراب نگو کی تیزی اور جسم کی غیر اضطراری حرکت سے نمایاں ہوتا تھا، اس بات کا اظہار تھا کہ ان کا سارا وجود طرح کی مقدس بے اطمینانی کی گرفت میں ہو۔ ایک طرح کی الوہی بیزاری، سارے مادی وجود سے شخصیت کا جز معلوم ہوتی تھی۔

یہ ان کی رومانیت ہی کا کرشمہ ہے کہ وہ اپنی شاعری میں خبر کے مقابلے میں بے خبری، علم کے مقابلے یرت، عقل کے مقابلے میں عشق، سروسامان کے مقابلے میں بے سروسامانی اور گریز کے مقابلے میں ں کو اہمیت دیتے ہیں۔ یہ اقدار تصوف کی راہ سے بھی ان کی شاعری میں داخل ہوئی تھیں۔ اکثر رومانیت وف کا اور تصوف پر رومانیت کا گمان گزرتا ہے اور یوں بھی مغرب میں رومانیت کا ظہور عقلیت یت پسند رویوں کے خلاف احتجاج کا رہینِ منت ہے۔ کم و بیش مشرق میں بھی تصوف مذہب

کی خارجی تعبیر، فقیہانہ خشونت اور تنگ نظری کے خلاف بغاوت کے روپ میں ابھرا۔ مگر حیرت اس
پر ہوتی ہے کہ اردو کی رومانی شاعری میں اقبال کو چھوڑ کر کسی کے یہاں بھی تصوف کی گیرائی اور تہ داری نہیں
ہے۔ اسی وجہ سے اردو کی رومانی شاعری فکری اعتبار سے انتہائی تنگ دامن ہے۔ اس میں مرف
عنفوانِ شباب کی رنگین و رعنا جذباتیت ہے مگر اس میں جذبات کی وہ پیچیدگی نہیں ہے جو شاعری
ہمہ گیری عطا کرتی ہے۔ اردو کی رومانی شاعری اتنی شفاف اور سادہ ہے کہ وہ صرف ایک خاص ذہنی
عمر تک متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اس کے بعد وہ جذبات کی خارش سے زیادہ کچھ نہیں رہ
جاتی۔ رَوِش کی رومانی شاعری نہ تو سطحی ہے اور نہ ہی اس میں اثر انگیزی کی کمی ہے۔ ان کے عقائد
نے اس میں ایک مخصوص قسم کی تب و تاب پیدا کر دی ہے۔

رَوِش کی وطنی اور فکری نظموں کو میں رومانیت کی تردید نہیں اس کی توسیع سمجھتا ہوں۔ اس لیے
کہ ان کے شعری لہجے، مزاج اور تمثالوں کی فضا کو دیکھیے تو محسوس ہوگا کہ وہ رسم و رہِ رومانیاں سے
ہٹے نہیں بلکہ اس سے ایک نئے انداز سے ہم آہنگ ہو گئے ہیں۔ ان کی وطنی نظموں میں آزادی کا تصور
خاصا رومانی اور قدرے متصوفانہ ہے۔

رومانیت کا حسن بالعموم احساس کے ابہام سے پیدا ہوتا ہے۔ یہی رومانیت کی توانائی
ہے اور کمزوری بھی۔ توانائی ان معنوں میں کہ یہ ابہام شعری کارناموں کو بسیط رمزیت بخشتا ہے اور
معنی کی تہوں میں اضافہ کر دیتا ہے۔ کمزوری اس معنی میں کہ یہ پراگندگیٔ فکر کا غماز ہوتا ہے اور فنی ادراک
کی کمی یا عدم کا اظہار۔ مندرجہ بالا نظم کی رمزیت جہاں ایک طرف فنی جمال کی حامل ہے وہیں دوسری
اس کی معنوی فضا نے آزادی کے تصور کو ایک غیر ارضی حقیقت بنا دیا ہے۔ یہی رومانیت کی وہ
خوبی ہے جسے بعض لوگوں نے حقیقت کی خواب آفریں توسیع کا نام دیا ہے۔

رومانی مسلک میں عینیت یا مثالیت کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ رَوِش کی نظم 'روشنی' اس
مسلک کی انتہائی خوبصورت عکاسی کرتی ہے۔ اس نظم کے لہجے پر غور کیجیے تو آپ کو محسوس ہوگا کہ
کس طرح رومانیت اور ترقی پسندانہ اسالیب ایک دوسرے سے ہم آمیز ہو گئے ہیں اور جس کے نتیجے

یک طرح کی رومانی انقلابیت پیدا ہوئی ہے :

دیکھ کر دیدۂ گیتی میں فروغِ امید
مطمئن ہوں کہ بہت جلد وہ دور آئے گا
جسے گردوں نے ستاروں میں چھپا رکھا ہے
کہکشاں نے جسے اک راز بنا رکھا ہے
قدسیوں نے جسے انساں سے چھپا رکھا ہے
ہاں وہی دور وہی عہدِ مسرت بنیاد
جس کو روحِ غمِ پنہاں نے کیا ہے تعمیر
وہی عالم وہی مسجودِ جبینِ ایام
وہی آغاز کہ جس کا نہیں کوئی انجام
وہی جنّت وہی کیفِ ابدی کا پیغام
چشمِ آدم میں جو تھا صبحِ ازل سے آباد
مسکراتا ہے وہی خواب بہ شکلِ تعبیر

خوش ہوں اے دوست کہ وہ دورِ بہار آتا ہے
جس کو نزدیک خزاں کر نہ سکے گا انساں
شکلِ نفرت نہ جہاں میں نظر آئے گی کبھی
موجِ بیگانہ وشی سر نہ اٹھائے گی کبھی
غیریت آکے ہمیں منھ نہ دکھائے گی کبھی
اب زمیں پر درِ یزداں سے وہ پیار آتا ہے
کہ جسے نذرِ زیاں کر نہ سکے گا انساں

یہ نظم روش کی اچھی نظموں میں ہے۔ اس نظم میں امید پروری اور آزادیٔ انسان کا جو تصور ہے اور اس تصور کی جن الفاظ میں نقش گری کی گئی ہے اس کے رومانی ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ حال سے بیزاری اور ماضی اور مستقبل سے امید کی وابستگی رومانی مزاج کا خاصہ رہی ہے۔ یہاں مستقبل اپنے دامن میں جس دور کو چھپائے ہوئے ہے وہ گردوں کے ستاروں میں پلا ہے، کہکشاں نے اسے راز کی طرح چھپایا ہے، فرشتوں نے اسے انسانوں کی دسترس سے دور رکھنے کی کوشش کی ہے۔ یہ خواب چشمِ آدم میں روزِ ازل سے مسکراتا رہا ہے۔ وہ خواب تعبیر کی منزل تک پہنچ رہا ہے اور ایک ایسے دور کی بشارت دی جا رہی ہے جو بہارِ مجسم ہوگا، اسے کوئی نزدیکِ خزاں نہ کر سکے گا۔ نفرت ایک خواب فراموش ہو چکی ہوگی، موجِ بیگانگی کو سر اٹھانے کی اجازت نہ ہوگی اس نظم میں ایک نئے دور کی جو تخیلی نقش گری کی گئی ہے، وہ اپنے حسن کے باوجود کچھ مابعد الطبیعی سی ہو کر رہ گئی ہے۔ اس نظم کی رجائیت خواب پرور سہی، مگر حقیقت کی تابانیوں سے محروم ہے یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اس کی رومانیت میں جو انسان نوازی ہے وہ ہمیں مغربی رومانی فلسفے کی یاد دلاتی ہے جو انقلاب فرانس کے بعد ابھرا تھا اور جس نے یورپ کی رومانی شاعری کو انسانی عظمت کا رزمیہ بنا دیا تھا۔ انسانی عظمت کا یہی ادعا ہے روش کی رومانی شاعری کو متاعِ عزیز سمجھ کر محفوظ رکھنے کا حوصلہ عطا کرتا ہے۔ یہی شریف اور غیر جارحانہ مسلکِ انسانیت نوازی ان کی بعض اچھی غزلوں کی جان ہے۔ مغرب میں انسانیت نوازی کا مسلک نشاۃ الثانیہ کا رہینِ منت ہے جب وہ زندگی ختم ہوئی جو خدا مرکز GOD - CENTRED تھی اور ایک ایسی زندگی کا تصور عام ہوا جس میں انسان کو مرکزی حیثیت حاصل ہوئی۔ مغربی مسلکِ انسانیت نوازی دراصل غیر خدا پرستانہ ہے۔ روش نے کس مسلک کو قبول کیا ہے، اس کا پتہ لگانا مشکل بھی ہے اور آسان بھی۔ روش کی زندگی میں مذہبیت اور خدا پرستی کے رنگ بہت نمایاں تھے لہذا ان کے بارے میں یہ سوچنا کہ انہوں نے مغربی انسانیت نوازی کے ملحدانہ مسلک کو قبول کیا ہوگا، غلط ہوگا۔ اس کے علاوہ ان کی نظموں اور غزلوں کی داخلی فضا اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ ان کا وژن یا خواب عرفان مذہبی اور متصوفانہ رنگ لئے ہوئے ہے۔ غالباً ان کے تصورِ انسان میں تصوف کا عمل دخل زیادہ ہے۔ تصوف کے بعض ملفوظ

یسے بھی ہیں جو انسان کو کائناتِ اصغر کا درجہ دیتے ہیں۔ رَوش کسی ایسے ہی مکتبۂ فکر سے متاثر ہوئے ہوں ،ہ باشعور شاعر تھے ان کے بارے میں یہ کہنا کہ انھوں نے جوش اور ترقی پسند شعراء سے متاثر ہو کر کے طور پر انسانی عظمت کے گیت گانے شروع کر دئے تھے، کچھ مناسب نہیں ہے۔ میں ایسے ں کی رومانیت پر محمول کرتا ہوں۔ عُروجِ آدمؑ کے تصور کو بنیاد بنا کر انھوں نے ایک غزل کہی ں کے چند شعر ملاحظہ ہوں :

محبت کی جہاں بانی کے دن ہیں ۔۔۔ زمیں پر خلد سامانی کے دن ہیں
یہ ہے دورِ جلالِ ابنِ آدم ۔۔۔ نہ سلطانی نہ خاقانی کے دن ہیں
جو ہیں اپنی جگہ خورشید بنیاد ۔۔۔ اب ان ذروں کی تابانی کے دن ہیں
ہر اک زنجیر ہے اب پا شکستہ ۔۔۔ ہر اک زنداں کی ویرانی کے دن ہیں
زوال آمادہ ہے تعمیرِ اوہام ۔۔۔ کمالِ فکرِ انسانی کے دن ہیں

مشرق یا ایشیا کی بیداری کے موضوع پر انھوں نے جو نظمیں لکھی ہیں وہ بھی اپنے مزاج کے اعتبار مانی ہیں۔ ایشیا کی بیداری ان کے لئے تمام تر تہذیبی ورثے کی بھی بیداری ہے۔ یہ ،، بیداری سے زیادہ بازیافت ہے۔ نیا اور بیدار ایشیا 'قدامت زندگی کے سایۂ' میں ا ہے۔ اس میں شوکت پاستان بھی ہے اور جمالِ مستقبل بھی۔ ماضی کی زبونی کا احساس ، اور حال کی تبدیلیوں کا شعور بھی۔ ایشیا ان کے لئے صرف جغرافیائی خطّہ ہی نہیں بلکہ ملہ آفریں جذبہ بھی ہے۔ ان کی ایشیا سے وابستگی جذباتی ہے اور جذبہ کا سارا وفور رکھتی ، لئے اس میں ایک خوشگوار رومانیت ہے۔ ایک زمانے میں اردو کے ترقی پسند شعراء ر ایشیا کی بیداری سامراجی طاقتوں کی شکست کی علامت بن گئی تھی اور ایشیا کو موضوع بنا کر نوشب وستم کا ہدف بنایا گیا تھا اور اس طرح خطیبانہ اور غیر شاعرانہ لہجے میں اس بیداری گائے گئے تھے۔ ان شعراء کو 'بے خودی' میں 'اندازِ گفتار' پر قابو نہ رہا اور انھوں نے کے شعر کہے :

اب سے ہوگا ایشیا پر ایشیا والوں کا راج
دستِ محنت کو ملے گا دستِ محنت سے خراج
زندگی بدلی ہے، بدلا ہے زمانے کا مزاج
پھوڑ دیں گے ہم یہ آنکھیں ہم کو مت آنکھیں دکھاؤ

ــــــــــــ ایشیا سے بھاگ جاؤ

اسی موضوع پر روش صدیقی کی نظم دیکھئے کہ کس طرح ان کے رومانی اندازِ نظر نے ان کی نظم کو تجربے کا جمال عطا کیا ہے اس سے آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ موضوع کے عقلی ادراک اور جذباتی ادراک میں کیا فرق ہے۔ شعر کی شریعت میں جو کچھ جذبے کی وساطت سے نہ آئے، کفر ہے:

حسین خوابوں کی روشنی میں شبِ خیالات سے گذر کر
جہاں جہاں تھا گمانِ فردوس اُن حجابات سے گذر کر
غمِ وطن اور غمِ زمانہ کے تلخ لمحات سے گذر کر
غمِ بشر جاگ اٹھا ہے شاید
یہی مرا ایشیا ہے شاید

یہ ایشیا کی تڑپ نہیں ہے، حیات گر کر سنبھل رہی ہے
ضمیرِ انساں کی ہر صداقت نئے تصور میں ڈھل رہی ہے
قدامتِ زندگی کے سائے میں زندگی خود بدل رہی ہے
حباب سا اُٹھ رہا ہے شاید
یہی مرا ایشیا ہے شاید

نشاطِ پرویز سرنگوں ہے، ملالِ فرہاد جاگ اٹھا ہے
غیورِ محکوم جاگ اُٹھے ہیں، جہانِ آزاد جاگ اٹھا ہے
وہ صبح کی خلوتِ زر افشاں میں اک شفق زاد جاگ اٹھا ہے

یہ قاصدِ ارتقا رہے شاید
یہی مرا ایشیا ہے شاید

میرا ہمیشہ سے یہ خیال رہا ہے کہ تروش اپنی شاعری کے ہر دور میں رومانی شاعر رہے ہیں۔ یہ ضرور ہے
ان کی رومانیت کی حدیں برابر وسیع ہوتی رہی ہیں۔ ان کی رومانیت میں نئے رومانی رنگ شامل ہوتے
۔ پہلے یہ رومانیت کہرآلود چاندنی کی فضا لئے ہوئے تھی۔ بعد میں یہ چاندنی کبھی تاریک ہوئی اور
ی روشن۔ ان کی شاعری ذات کی توسیع کی بھی داستان ہے اور ذات میں توسیع کی بھی۔ وہ اپنے اندر
یلے اور گہرے ہوئے۔ اس لحاظ سے ان کا شعری ارتقا رداخلی ہے۔ ارتقائی اعتبار سے ان کی شاعری
ئیؔ ادبی اثرات کے دور میں پروان چڑھی۔ ان کی شاعری کی ابتدا ایسے دور میں ہوئی جب حفیظؔ اخترؔ
رساغر کے رومانی گیت فضا میں گونج رہے تھے اور اقبال کی شاعری عام ذہنوں پر چھائی ہوئی تھی۔
ید اس رومانیت کے خلاف ردعمل کے طور پر ترقی پسند شاعری نے اپنا پرچم بلند کیا اور اس نے
اعری سے سماجی اور تہذیبی آگہی کا مطالبہ کیا۔ ان کی شاعری کے آخری دور میں جدیدیت کا رنگ
یاں ہونے لگا تھا۔ اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کی شاعری نے تینؔ ادبی نسلوں کے درمیان اپنے
تقا کی منزلیں طے کیں۔ پہلے دور یا پہلی ادبی نسل کے اثرات نے ان کے تشکیل پذیر ذہن پر کئی گہرے
ش ثبت کئے۔ ترقی پسندی نے ان کے لہجے کو تھوڑا سا متاثر کیا اور ان کے موضوعاتِ شعری میں اضافہ
۔ جدیدیت ان کے لئے ایک ادبی نزاع سے زیادہ کچھ نہ تھی اس وجہ سے اس کے تخلیقی اثرات ان
یہاں کسی طور پر بھی تلاش نہیں کئے جا سکتے۔ اپنے شعری اسالیب اور لہجے کی حد تک وہ ادبی اثرات
ور قبول کرتے رہے مگر بنیادی طور پر ان کا اندازِ فکر یا ان کی حسیت رومانی رہی۔ ان کی شاعری
ی زبردست معنوی تبدیلی کی نشاندہی نہیں کرتی۔

ایک عرصے سے ان کی توجہ غزل کی طرف زیادہ ہو گئی تھی۔ غزلیں انھوں نے اپنی نظم نگاری کے
ور میں بھی کہی تھیں لیکن نظم ان کی تخلیق ترجمانی زیادہ کرتی ہے۔ غزل انتہائی انفرادیت کش صنفِ سخن
ہے اور انفرادیت ساز صنفِ سخن بھی۔ یہاں اچھے سے اچھا شاعر بھی آوازِ بازگشت بن کر رہ

جاتا ہے۔ روش نے بہت سی کامیاب غزلیں کہی ہیں مگر اس کے باوجود وہ اقبال، اصغر اور فا
کے اثرات سے دامن نہیں بچا سکے ہیں۔ وہ اپنی تمام تر رچی ہوئی فارسیت، ترصیع اور شادابی کے با
وہ انفرادیت حاصل نہیں کر سکے جو انھوں نے نظم کے میدان میں حاصل کر لی تھی۔ ان کی غزلیں پڑ
تو آپ محسوس کریں گے کہ وہ صرف اُن جذباتی مرحلوں پر کامیاب ہیں جہاں تصوف اور رومانیت
موضوعات شعری اظہار کی حدود میں آ گئے ہیں۔ اب تک ان کی نظموں کا کوئی مجموعہ منظر
پر نہیں آ سکا ہے۔ ضرورت ہے کہ ان کی نظموں کا کوئی نمائندہ مجموعہ شائع کیا جائے تاکہ مرحو
ادبی مرتبہ و مقام کے تعین میں آسانی ہو۔ ان کی زندگی میں ایک بدنصیبی یہ تھی کہ رومانیوں نے انھ
وسعت کی وجہ سے کم رومانی سمجھا اور ترقی پسندوں نے انھیں صرف رومانی اور صوفی قرار دیا۔
اس بات کی ہے کہ ان کی شعری حیثیت کا حقیقت پسندانہ تعین کیا جائے۔ اب موت نے انھیں
پسندوں کے ادبی تعصبات کی زد سے بہت دور کر دیا ہے۔ ممکن ہے کہ ان کی موت ہی ان کی ا
زندگی کی ضامن بن جائے۔

روش صدیقی (مرحوم)

غزل

…ن کہتا مجھے شائستۂ تہذیب جنوں
میں تری زلفِ پریشاں کو اگر چھیڑ نہ دوں

…ن حسرت زدۂ شوقِ تکلم ہے یہاں
لڑکھڑاتا ہے تری چشمِ سخن گو کا فسوں

…ہجومِ غمِ دوراں میں کہاں یاد رہا
داستانِ غمِ دل تیرے تغافل سے کہوں

…خبر، خیمۂ لیلیٰ کے نگہبانوں کو
کہ حریمِ دلِ لیلیٰ میں ہے مہمانِ جنوں

…ارہ رہ کے ترے رُخ کا اُڑا جاتا ہے
ورنہ میں اور تری محفلِ تمکیں سے اُٹھوں

…ہستی میں یہ اک گوشۂ دامانِ خیال
پھر غنیمت ہے کہ زنداں میں بھی آزاد تو ہوں

…سلیقے سے بہکنا تو مزہ دیتا ہے
میرے ساقی کو گماں ہے کہ بہت ہوش میں ہوں

…کی کوئی منزل جو نہیں ہے تو نہ ہو
ہمتِ عشق یہ کہتی ہے کہ بڑھتا ہی رہوں

…ترے حال پہ تجھ کو دلِ ناداں چھوڑا
سوچنا بھی تو قیامت ہے کہاں تک سوچوں

میں نے پہچان لیا اس کو سرِ بزم روشؔ
اس کی آنکھوں کو ہے اصرار کہ خاموش رہوں

ابوالحسن
مترجم: محمد خلیق صدیقی

جاپان کی مطبوعاتی صنعت

دانس اسمتھ نے اپنی کتاب "رہبرِ اشاعتِ کتب" میں کتابوں کی مثال اس چھوٹے سے سوئچ سے دی ہے جو زبردست مشینوں کو حرکت میں لاسکتا ہے اور انھیں کنٹرول کرسکتا ہے یا جس کی جنبش سے دور دراز علاقوں میں بجلی دوڑ سکتی ہے۔ جاپان اس کی ایک شاندار مثال ہے۔ جاپان کی مجموعی صنعتی پیداوار (۹ ار ۷ کروڑ ڈالر) میں کتابوں کا حصہ اگرچہ صرف ار ا فیصد ہے لیکن جاپان کے تعلیمی، سماجی اور معاشی ار میں کتابوں کی صنعت نے بنیادی رول ادا کیا ہے۔

یوں تو جاپان کے پاس دنیا کی قدیم ترین کتاب موجود ہے جو بدھ مذہب کی مقدس تعلیمات کے بارے میں ہے اور جو ۷۷۰ء میں شائع ہوئی تھی، لیکن طباعت کے جدید طریقے جاپان میں اب سے تقر سو برس پہلے اس زمانے میں رائج ہوئے جو "میجی دور" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ درست ہے کہ میجی دور میں جاپان نے جو غیر معمولی ترقی کی اُس میں کتابوں کی اشاعت کا بڑا ہاتھ ہے، لیکن خود میجی دور نے مطبوعاتی صنعت کی ترقی کے بے مثال مواقع فراہم کئے۔ احیائے میجی کے دوران اور سماجی اصلاحات اور مغرب کے زیرِ اثر تعلیمی اور معاشرتی ترقی کی وجہ سے کتابوں کی اشاعت کی ترقی بہرحال ہونی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں نے ایک دوسرے پر اثر ڈالا اور دونوں ایک دوسرے کی ترقی سے متاثر ہوئے۔ چنانچہ ۱۹۲۰ء تک جاپان دوسرے نمبر پر پہنچ گیا تھا جہاں انگ کے بعد سب سے زیادہ کتابیں چھپتی تھیں۔ ۱۹۲۶ء میں جاپان میں چھپنے والی کتابوں کی تعد بیس ہزار تک پہنچ گئی تھی۔

دوسری جنگ عظیم : ۱۹۴۱ء میں جاپان کے لڑائی میں شریک ہو جانے کی وجہ سے جاپان کی مطبوعاتی صنعت کو سخت صدمہ پہنچا اور اسے سخت کنٹرول کا سامنا کرنا پڑا۔ چھپائی کے کاغذ کی راشننگ اور مواد پر سنسرشپ نافذ کر دی گئی۔ ناشروں کی تنظیم کو کڑی نگرانی کے تحت لے آیا گیا اور کتابوں کی تقسیم ایک واحد ادارے کے سپرد کر دی گئی۔ ۱۹۴۴ء تک سارا کاغذ ختم ہو گیا اور ۱۹۴۵ء میں طباعت بالکل ٹھپ ہو گئی۔ اس کے علاوہ جاپانی شہروں کی بمباری کی وجہ سے بہت سے مکتبے اور چھپائی کے کارخانے تباہ ہو گئے۔ ۱۹۴۵ء میں لڑائی ختم ہوتے ہی جاپانی ناشروں نے جنگ سے پہلے کا اپنا معیار جلد ہی دوبارہ حاصل کر لیا۔ لڑائی کے دوران جاپان کے عوام کو شدید قلتوں کا سامنا کرنا پڑا تھا اور لوگ کتابوں کے اتنے بھوکے تھے کہ جیسے ہی کوئی نئی کتاب چھپتی دوکان کے سامنے خریداروں کی قطار لگ جاتی۔ سات برس کے اندر یہ صنعت پورے طور پر بحال ہو گئی اور نئی کتابوں کی تعداد ۱۹۴۶ء کی ۳۸۴۷ کے مقابلے میں ۱۹۵۳ء میں بڑھ کر ۲۵۴۲۱ ہو گئی۔ جس میں ۸۶۹۸ کتابوں کی دوبارہ اشاعت شامل تھی۔ مجموعی طور سے اِن کتابوں کی چھیالیس کروڑ چالیس لاکھ کاپیاں چھاپی گئیں۔ اِن میں ۲۴۳۹ یعنی دس فیصدی ٹائٹل بچوں کے لئے تھے۔ ان کے علاوہ دو ہزار درسی کتابیں اور پانچ ہزار سرکاری مطبوعات شائع ہوئیں اور اس طرح مطبوعات کی مجموعی تعداد ۳۲ ہزار تک پہنچ گئی۔ مطبوعات میں آج روس اور امریکہ کے بعد جاپان کا تیسرا نمبر ہے۔

جاپان کی مطبوعاتی صنعت کی ترقی کی بنیادی وجہ جاپان کا تعلیمی نظام ہے جس کے تحت چھٹے درجے تک کی ابتدائی تعلیم اور نویں درجے تک کی ثانوی تعلیم ایک مدت سے لازمی اور مفت ہے۔ جاپان میں مکمل خواندگی ہے۔ تخمینہ ہے کہ گیارہ کروڑ کی آبادی میں ۸ کروڑ کتابیں پڑھنے والی آبادی ہے۔ ریلوں، زمین دوز ٹیوب ٹرینوں، بسوں اور چائے خانوں میں نصف سے زیادہ آدمی مطالعے میں مصروف نظر آئیں گے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جاپان کے لوگ کتابوں کے بڑے رسیا ہیں۔ پچھلے دس برس میں مطبوعاتی صنعت کو جو ترقی ہوئی ہے اس کی کئی وجہیں ہیں۔ صنعتی ترقی کے ساتھ مشینوں کا استعمال بڑھ گیا ہے اور اوقات کار گھٹ گئے ہیں، عورتوں کو سماج میں مساوی درجہ حاصل ہے، لوگوں کی قوت خرید بڑھ گئی ہے اور اظہار خیال کی پوری آزادی ہے۔ رسالوں اور ٹیلی وژن کی وجہ سے علم کی پیاس اور بڑھ گئی ہے۔

ڈر تھا کہ کہیں اِن کی وجہ سے کتابوں کی مانگ کم نہ ہو جائے لیکن اس کے برعکس کتابیں پڑھنے کا شوق اور زیا
بڑھ گیا۔

رسالوں کا رول : رسالوں کی اشاعت جاپان کی مطبوعاتی صنعت کی ایک شاخ ہے۔ اب سے
پندرہ برس پہلے کے ایک سروے نے یہ ظاہر کیا تھا کہ جاپان کے لوگ کتابوں کے مقابلے میں رسائ
زیادہ پڑھتے ہیں۔ بہت سے ناشروں نے بڑے پیمانے پر ہفتہ وار رسائل نکالنے شروع کر دئے اور تین برس
اندر مختلف قسم کے تیس رسائل کا اجرا ہونے لگا۔ اِس وقت جاپان میں رسائل کا تخمینہ دس ہزار ہے جن میں کا
ہفتہ وار رسائل دس لاکھ سے زیادہ چھپتے ہیں۔ ۱۹۶۸ء میں رسائل کی ۱،۹۱،۵۲،۸۰،۰۰۰ کاپیاں چھپیں ج
کی مجموعی قیمت ۵۸،۶۹،۳۷،۰۰۰ ڈالر تھی۔ ہفتہ وار اور ماہانہ رسالوں کی کھپت ہفتہ وار رسالوں کی تین گ
ہے۔ بیشتر ماہانہ رسائل کتابوں کے پبلشر شائع کرتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ بہت سے ناشروں نے یہ کا
رسائل کی چھپائی سے شروع کیا۔ ۱۹۶۵ء کی شماری اوسط کے مطابق ہر جاپانی فی سال ۱۶ رسائل، ۷۵
کتابیں اور ڈیڑھ درسی کتابیں پڑھتا ہے۔

اشاعت کا انتظام : جاپان میں پبلشنگ فرموں کی تعداد دو ہزار سے اوپر ہے۔ ان میں سے بڑ
فرم اتنے بڑے ہیں کہ مجموعی کاروبار کا نصف حصہ ان کے پاس ہے۔ گیارہ فرم ہیں جو ہر سال دو سو سے زا
اور تیس ایسے فرم ہیں جو سالانہ ۱۲۰ کتابیں چھاپتی ہیں۔ گوکو شوکین کیوشا کمپنی میں کارکنوں کی تعداد سب سے زیاد
ہے۔ اس میں دو ہزار آدمی کام کرتے ہیں۔ اس کا مجموعی سرمایہ ۷۶،۲۳۰،۰۰۰ ین (yen) ہے (ایک
روپیہ ۴۸ ین کے برابر ہوتا ہے) اور یہ سالانہ ۲۶۰۰ کروڑ ین کا کاروبار کرتی ہے۔ سرمائے کے اعتبا
سے سب سے بڑی کمپنی کوڈانشا ہے جس میں ۹۲۰ آدمی کام کرتے ہیں اور جو سالانہ ۲۰۰۰ کروڑ ین کا
کاروبار کرتی ہے اور جس کا سرمایہ دائرہ ۲۴ کروڑ ین ہے۔

جاپان میں کتابوں کی اشاعت کا کام خالص تجارتی پیمانے پر ہوتا ہے۔ کسی ایک بھی یونیورسٹی کے
پاس اپنا پریس نہیں ہے۔ لیکن جاپان کے ناشروں کا مقصد صرف روپیہ کمانا نہیں ہے بلکہ ان کے سامنے
ایک معاشرتی مشن بھی ہوتا ہے۔ بڑی کمپنیوں نے ہمیشہ تخلیقی پہلو کو بھی اپنے سامنے رکھا ہے اور

باری ادارے ہونے کے باوجود انھوں نے عمدہ کتابیں غیر کاروباری بنیاد پر چھاپی ہیں۔ ناشروں
قہ تہذیبی قدروں کو عزیز رکھتا ہے اور غیر مادی صلہ پاکر مطمئن رہا ہے۔ ناشروں میں یہ بات ایک مسلّم
کی حیثیت رکھتی ہے کہ جو فرم اچھی ایڈیٹنگ کے مقابلے میں خریداروں کی تعداد بڑھانے پر زیادہ
دیتی ہے وہ زیادہ دن نہیں چل سکتی۔

مالی وسائل کی فراہمی: دوسرے ملکوں کی طرح جاپان میں بھی کتابوں کی اشاعت کا کاروبار
حیثیت رکھتا ہے۔ جوکھم زیادہ ہونے کی وجہ سے بینک قرض دینے میں ہچکچاتے ہیں۔ صنعت کو
کی طرف سے بھی نہ کسی قسم کا تحفظ حاصل ہے اور نہ امداد۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جاپانی پبلشر کو اگر
اد کی پیش کش بھی کی جائے تو یہ انکار کر دیں گے کیونکہ یہ اسے اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں اور
ہیں کہ اس سے اُن کی آزادانہ پالیسی متاثر ہوگی۔ بہر حال اخبارات کو بینکوں اور سیاسی پارٹیوں
امداد ملتی ہے اور اسی لئے یہ بیرونی اثرات قبول کرتے ہیں۔

جاپان کی مطبوعاتی صنعت اپنے وسائل خود فراہم کرتی ہے۔ جنگ کے بعد سے جاپان میں دو مالیاتی
ے ہیں جو کواپریٹو بنیاد پر قائم ہیں اور جو صنعت کو مالی وسائل فراہم کرتے ہیں۔ ان کا مجموعی سرمایہ ۶۰۰
ن ہے۔ یہ ادارے کواپریٹوز کے مرکزی بینک سے قرض لیتے ہیں لیکن اس سلسلے میں مطبوعاتی صنعت کو
ں ترجیح نہیں دی جاتی۔

۱۹۶۹ء میں پبلشرز کو مالی وسائل فراہم کرنے کی غرض سے دو اور ادارے قائم کئے گئے۔ ان میں
کا نام ٹوکیو کواپریٹو ایسوسی ایشن آف پبلشرز ہے جو اسمال بزنس کواپریٹو قوانین کے تحت
۱۳۰ ین کے معمولی سرمائے سے شروع کیا گیا تھا۔ دوسرا ادارہ بُک بینک ہے جو پبلشرز نے
نا مند ناشروں کی امداد کے لئے قائم کیا ہے۔

مصنّف کی حیثیت: جاپان میں ناشروں کے مقابلے میں مصنّف کی حیثیت زیادہ ہوتی تھی مصنف
ھا جاتا تھا جو ادب کی تخلیق کرتا تھا جبکہ ناشر محض تاجر تھا۔ لیکن اب تاجر بہت بڑے کاروباری لوگ
گئے ہیں جبکہ مصنف معاشی اعتبار سے خوشحال نہیں ہوتے۔ مصنفوں نے اپنا ایسوسی ایشن بنایا

ہے جس کا نام لٹریری آتھرس ایسوسی ایشن ہے۔

تخلیقی مصنف اب بھی بہت کم ہیں اور ۸۰ فیصدی کتابیں ترجمہ ہوتی ہیں، بیشتر انگریزی کا۔ مصنف کو ۱۰ فیصدی روائلٹی ملتی ہے۔ اول درجے کے مصنف چونکہ کم ہیں اس لئے روائلٹی کتا فروخت شدہ کاپیوں پر ملنے کے بجائے طبع شدہ کاپیوں کے مطابق ملتی ہے۔ کاپی رائٹ مصن ہے۔ جاپانی رسم الخط کی اپنی خصوصیات کی وجہ سے مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا مسودہ ناشر ہمیشہ سے محفوظ کر لیتے ہیں۔ اگر کسی کتاب کی دوبارہ طباعت ہونی ہوتی ہے تو پھر سے ٹائپ سٹ کر بجائے، چھپی ہوئی کتاب کا عکس لیکر چھاپنا زیادہ آسان سمجھا جاتا ہے۔

جاپان میں مترجم کو بھی ایک اہم مقام حاصل ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ جاپانی زبان میں ترجمہ مشکل کام ہے۔ مترجم کو سات سے لیکر دس فیصدی تک روائلٹی ملتی ہے۔ کتاب میں مترجم دیا جاتا ہے اور وہ ترجمہ کی اچھائی برائی کا پورا ذمہ دار ہوتا ہے۔

اڈیٹر کی اہمیت : دوسرے اہم ملکوں کی طرح جاپان میں بھی پبلشنگ ہاؤس کے اڈیٹنگ کو بہت اہم حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ کتاب کی کامیابی کا دارومدار اڈیٹر کی کارکردگی اور سوجھ بوجھ ہے۔ اڈیٹر کا مشاہرہ یونیورسٹی پروفیسر سے زیادہ ہوتا ہے۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ کسی کو براہ راست مقرر کر دیا جائے بلکہ پہلے اس کو ضمنی شعبوں میں کام کرنا ہوتا ہے اور کئی برسوں کی تجربے کے بعد اسے اڈیٹر بنایا جاتا ہے۔

جاپان میں باغبانی کی طرح اڈیٹنگ کے لئے بھی مخصوص صلاحیت اور سلیقہ ضروری سمجھا جاتا۔ اڈیٹر میں تخلیقی صلاحیت کے ساتھ انتظامی صلاحیت بھی ہونی ضروری ہے۔ چنانچہ کسی فرم میں چیف بھی انتظام کا اتنا ہی اہم جز ہوتا ہے جتنا کہ فرم کا مالک۔ فرم کی اڈیٹوریل پالسی، جس کا اعلان جاتا، اڈیٹنگ کے شعبے کے چیف اور پبلشنگ ہاؤس کے مالک کے باہمی مشورے سے متعین اشاعت کا منصوبہ، موضوع، مصنف کا انتخاب، کتاب کی ضخامت اور لے آوٹ اور اشاعت یہ سب اڈیٹوریل ڈپارٹمنٹ کے فرائض ہیں۔

اڈیٹر کی ذمہ داریوں کی پیچیدگیوں اور اہمیت کے پیش نظر جاپانی پبلشرز نے ۱۹۶۴ء میں ایک
ڈیل اسکول قائم کیا تاکہ ان اصولوں اور طریقوں کی تعلیم دی جا سکے جن پر جاپان کی بڑی پبلشنگ کمپنیاں
لفہ صنعتیں عمل کرتی رہی ہیں۔ اس اسکول میں پبلشنگ سے دلچسپی رکھنے والے گریجویٹوں کے لئے
ٰس چلائے جاتے ہیں، ایک تین مہینے کا ابتدائی کورس اور ایک سال بھر کا طویل کورس۔ جن موضوعات
دی جاتی ہے ان میں اڈیٹنگ، پروڈکشن، پروف ریڈنگ اور ڈیزائننگ شامل ہیں۔ برسرکار لوگوں
لئے ایک شفٹ رات میں ہوتی ہے۔ تعلیمی اسٹاف کو مختلف شعبوں کے ماہروں کی پوری مدد
ں ہوتی ہے۔

۱۹۶۹ء میں جاپان نے ایک اور بھی ادارہ قائم کیا جس کا مقصد اشاعت کے پورے میدان
العہ کرنا ہے۔ یہاں جن مضامین کی تعلیم دی جاتی ہے ان میں ادیٹولوجی بھی شامل ہے جو ابھی
پ اور امریکہ میں بھی نہیں ہے۔

کاپی رائٹ: جاپان ۱۸۹۹ء سے برن کنونشن کا ممبر رہا ہے لیکن اس کے حق میں ہے کہ یونیورسل
رائٹ کنونشن کو اس سے منسلک کر دیا جائے۔ جاپان کا خیال ہے کہ ان دونوں کنونشنوں کے الگ
قیام سے بے ضرورت پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔

ترقی پذیر ممالک سے متعلق اسٹاک ہوم پروٹوکول سے جاپان کو پوری ہمدردی ہے۔ اس کا
ہے کہ پروٹوکول کا حشر جو بھی ہو اس کے مقاصد پورے ہونے چاہئیں۔ وہ اس کے خواہشمند
ہ انٹرنیشنل کاپی رائٹ کی صورت حال کا تصفیہ ہونا چاہیئے اور ایک عالمی مصالحتی تنظیم قائم کی جانی
ئے جس میں ترقی پذیر ممالک کے مفاد کا خیال رکھنا چاہیئے۔

جہاں تک قومی کاپی رائٹ کا سوال ہے، جاپان کے کاپی رائٹ کے قوانین میں حال میں ترمیم
ہے۔ اس کے مطابق مصنف کی موت کے بعد کاپی رائٹ کے تحفظ کی مدت ۳۰ سال سے بڑھا کر
سال کر دی گئی ہے۔ ترجموں کے لئے اب تک ۱۵ برس کے کاپی رائٹ کا جو حق حاصل تھا اس کو ختم
یا گیا ہے۔

لیکن کاپی رائٹ سے متعلق نیا قانون دوبارہ نقل کے اُس طریقے کے بارے میں خاموش ہے جو جاپانی ناشروں کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ عکس لیکر نقل کرنے کا طریقہ اتنا سستا ہے کہ کوئی بھی شخص کسی کتاب کے حصوں کو قانون شکنی کئے بغیر نقل کر سکتا ہے اور ناشر کو اس کا علم بھی نہیں ہو پاتا۔ چنانچہ بہت سے ناشر مخصوص قسم کی روشنائی استعمال کرتے ہیں جس کی وجہ سے عکسی نقل ناممکن ہو جاتی ہے۔

پروڈکشن : پچھلے دس برسوں میں طباعت کی ٹکنیک میں زبردست ترقی ہوئی ہے جس کی وجہ سے جاپان میں طباعت دنیا میں سب سے سستی ہے۔ مشکل سے تین چار ایسے پبلشر ہوں گے جن کے اپنے پریس ہوں گے۔ ناشروں کی تمام تر توجہ اشاعت اور فروخت سے متعلق کاموں پر مرکوز رہتی ہے اور طباعت اور جلد بندی وغیرہ دوسری ایجنسیوں پر چھوڑ دی جاتی ہے۔

آف سیٹ اور لیتھو کا استعمال زیادہ ہے اور لیٹر پریس کے مقابلے میں یہ دونوں طریقے تیزی سے ترقی کرتے رہیں گے۔ رسالوں میں رنگ برنگی تصاویر کے بڑھتے ہوئے استعمال کے پیش نظر گریور مہنگا ہونے کے باوجود روز بروز زیادہ مقبول ہو رہا ہے۔ گریور کی مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس سے ہر قسم کی سطح پر چھپائی کی جا سکتی ہے۔ مثلاً کاغذ، فیتے، کپڑے اور مصنوعی کاغذ وغیرہ۔ لکڑی کے گودے کی کمی کی وجہ سے جاپان کو پلاسٹک پیپر زیادہ استعمال کرنا پڑے گا۔ پٹرولیم سے بنے مصنوعی کاغذ کے بارے میں حال میں ایک کتاب شائع ہوئی ہے۔ جس میں مصنوعی کاغذ کی ماہیت اور صفات بیان کی گئی ہیں۔

طباعت میں جدید ترقی یہ ہوئی ہے کہ جاپان کی دوسری صنعتوں کی طرح طباعت میں بھی کمپیوٹر استعمال ہونے لگے ہیں۔ ترقی کے جدید رجحانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ کمپیوٹر تصویریں بنانے کو کمپوز کرنے اور صفحات ترتیب دینے بلکہ موڑنے اور پوری کتاب یا رسالہ تیار کرنے کے لئے استعمال ہوں گے۔ ایسے مخصوص طریقے ہوں گے جن کے ذریعے ٹیپ کئے ہوئے مواد کو برقی رووں میں منتقل کر دیا جائے گا جو فوٹو کیمیکل طریقوں کو عمل میں لا کر خود بخود اور براہ راست پرنٹنگ پلیٹ تیار کر دیں گے۔ اس کے بعد دوسرا قدم یہ ہوگا کہ برقی طریقوں کو استعمال کر کے مواد کو براہ راست کاغذ پر چھاپ دیا جائے گا اور لیتھو کے طریقے کی ضرورت نہ رہ جائے گی۔ فی الحال ۱۹۸۵ء تک اس طریقے کے لاگو

امکان نہیں ہے لیکن دیر سویر جاپان کی چھپائی کی صنعت کو اس خطرے کا سامنا کرنا ہے۔

ایک اور رجحان جو آگے چل کر عملی شکل اختیار کر سکتا ہے یہ ہے کہ گرم ٹائپ کمپوزنگ کی جگہ سرد
پ کمپوزنگ استعمال کی جائے۔ حال میں ایک مشین تیار کی گئی ہے جس کا نام ٹیکم ہے۔ یہ مشین ہر ماہ ۰
ات ٹائپ سٹ کر سکتی ہے۔ سرد ٹائپ کمپوزنگ کا طریقہ سستا ہے اس میں کم آدمیوں اور کم جگہ کی
رت ہوتی ہے اور سیکھنے میں بھی کم وقت لگتا ہے۔ بہرحال اس درجہ خودکار ٹائپ سٹنگ کا استعمال
ا زیادہ نہیں ہے۔ لیکن ممکن ہے کہ اخبارات اس طریقے کو جلد ہی اپنالیں۔ اگر کامیابی ہوئی تو آگے
کمپوزنگ اور ٹائپ سٹنگ کا سارا کام اسی طریقے سے کیا جانے لگے گا۔

فروخت : جاپان میں کتابوں کی فروخت کا نظام بے مثال ہے۔ عام طریقہ یہ ہے کہ پبلشر کے
سے کتاب تھوک فروش کے پاس آتی ہے اور اس کے بعد کتب فروشوں کے ہاتھ سے گزر کر
ار کے پاس پہنچتی ہے۔ تھوک فروشوں کی تعداد تقریباً تین سو ہے ان میں سے چھ اتنے بڑے
زیادہ تر کاروبار انھیں کے ہاتھ میں ہے۔ کتب فروشوں کی تعداد بیس ہزار کے قریب ہے۔
ے آٹھ سو کے پاس کتاب کی دوکانیں ہیں اور یہ کتب فروشوں کے الیوسی ایشن کے ممبر ہیں۔
لئے یہ کام ضمنی کاروبار کی حیثیت رکھتا ہے۔

نشر و اشاعت پر تھوک فروش کا گہرا اثر ہوتا ہے۔ اگر تھوک فروش کسی کتاب کو نہ لینے کا فیصلہ کرلیں
تاب نہیں بکے گی۔ کتاب کی فروخت منظور کرلینے کے بعد کتاب کی ساری کاپیاں براہ راست ان
ں پہنچتی ہیں اور کتب فروشوں کے ذریعے بکنا شروع ہو جاتی ہیں۔

اہم بات یہ ہے کہ کتاب کی پبلسٹی کرنے اور نہ بکنے والے اسٹاک کی ساری ذمہ داری پبلشر
ا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پبلشر سے تھوک فروش اس شرط پر کتاب لیتا ہے کہ بکنے نہ بکنے کی
ی پبلشر کی ہے۔ صرف ایک فرم ایوانامی اس عام قاعدے سے مستثنیٰ ہے۔ تھوک فروش کو
ڈسکاؤنٹ ملتا ہے جس میں سے ۲۰ فیصد وہ کتب فروشوں کو دیدیتا ہے اس طرح تھوک فروش
۸ فیصد رہ جاتا ہے۔ باقی ۷۰ فیصد پبلشر کا حصہ ہوتا ہے۔ کتب فروش غیر فروخت شدہ کتابیں

تھوک فروش کے ذریعے پبلشر کو واپس کردیتے ہیں۔ واپسی کے اخراجات واپس کرنے والے کو برداشت کرنے ہوتے ہیں۔ غیر فروخت شدہ اسٹاک پبلشر کے لئے بڑا دردسر ہوتا ہے کیونکہ اس کے رکھنے کے لئے جگہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ یہی صورت رہ جاتی ہے کہ اس اسٹاک کو کاغذ بنانے والے کارخانے بھیج دیا جائے جہاں دوبارہ اسے صاف کاغذ میں تبدیل کردیا جائے۔ نہ بکنے والے اسٹاک کا تناسب کافی ہوتا ہے۔ ۱۹۶۸ء میں یہ تناسب ۲۷ فیصد تھا۔ اس طریقے کے تحت کتابیں فروخت کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ کتاب بیک وقت بہت سی دوکانوں پر پہنچ جاتی ہے اور جلد بکتی ہے۔ چونکہ خریدار دوکانوں پر کتابوں کو دیکھنے کے بعد خریدتے ہیں اس لئے اس طریقۂ فروخت کی وجہ سے کتابوں کی پبلسٹی اچھی ہوتا ہے، اگرچہ بعض اوقات بک اسٹال بہت سی کتابوں کی بہت بہت کاپیوں سے بھرے رہتے ہیں۔

جاپان کی حکومت نشر و اشاعت کی ہمت افزائی کرتی ہے۔ پچھلے بارہ برسوں سے جاپان کی قومی ریلوے نے رسالوں کو لیجانے کا کرایہ کم کردیا ہے۔ ڈاک سے بھیجنے کی بھی شرح حال میں کم کردی گئی ہے جاپان نے تعلیمی، سائنس اور کلچرل مواد کی درآمد سے متعلق یونسکو معاہدے کی تصدیق کردی ہے جسے عام طور سے فلورنس کنونشن کہا جاتا ہے۔

درآمد اور برآمد: جاپان کی ثانوی زبان انگریزی ہے اور درآمد کی جانے والی کتابوں میں ۸۳ فیصد امریکہ سے اور ۸ فیصد برطانیہ سے آتی ہیں۔ ۱۹۶۸ء میں جاپان نے باہر سے ۳ کروڑ ۲ لاکھ ڈالر کی قیمت کی کتابیں منگائیں جس میں ہندوستان کا حصہ صرف بہ ۲ ڈالر تھا۔ حال میں یہ رجحان رہا ہے کہ کتابیں مجلد منگانے کے بجائے ان کے چھپے ہوئے فارم درآمد کئے جاتے ہیں۔

جاپان میں چھپنے والی کتابوں میں سے ۰۸ء۱ فیصدی برآمد کی جاتی ہیں جس کی وجہ زبان کی دقت ہے کوریا اور چین کے علاوہ کوئی بھی ملک جاپانی زبان نہیں پڑھ پاتا۔ ۱۹۶۸ء میں جاپان نے ایک لاکھ بانوے ہزار ڈالر کی قیمت کی کتابیں باہر بھیجیں جس میں سے ۹۰، ڈالر کی کتابیں ہندوستان آئیں۔ برآمد کرنے والے ملکوں میں ہندوستان کا چوتھا نمبر تھا۔ جاپان اپنی داخلی مارکٹ سے اتنا مطمئن ہے کہ برآمد کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا لیکن دوسرے ملکوں خصوصاً ایشیائی ملکوں کے ساتھ ساجھے میں اشاعت

ے کاروبار کا خواہشمند ہے۔

کتابوں کی مقبولیت بڑھانا: جاپان میں لائبریری کا بہت ترقی یافتہ نظام قائم ہے اور کتب خانے ...ابوں کی مقبولیت بڑھانے میں مصروف ہیں۔ ۱۹۵۳ء کے اسکول لائبریری قانون کے مطابق ہر اسکول ...ں ایک لائبریری ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ جاپان کے ۴۰ ہزار اسکولوں کے پاس اپنی لائبریری ہے جس کا ...نظام اسکول کے کسی استاد کے سپرد ہوتا ہے۔ جاپان میں بچوں کے ادب کو بہت اہمیت دی جاتی ...ے کیونکہ کتابیں پڑھنے کی عادت بچپن ہی میں پڑتی ہے اور اسی زمانے میں بچہ آسانی سے اثرات ...ل کرتا ہے۔

"کانوں سے سن کر پڑھنا" جاپان کا نیا پروجکٹ ہے اور بہت کامیاب ہے۔ اس کے بجائے کر ...روع ہی سے بچوں پر کتابیں ٹھونسی جائیں اور انھیں زبردستی پڑھایا جائے، تین سے پانچ سال کے ...ں کو والدین کہانیاں پڑھکر سناتے ہیں اور اس طرح اُن میں کہانیاں پڑھنے کا شوق پیدا کرتے ...۔ چنانچہ پڑھنے کی عمر تک پہنچنے تک بچے کے پاس الفاظ کا کافی ذخیرہ بن جاتا ہے۔ پڑھکر سنانے ...ا یہ بھی فائدہ ہوتا ہے کہ بچے غیر محسوس طریقے سے کہانی کا پلاٹ سمجھنے لگتے ہیں جس کی وجہ سے آگے ...کر پڑھنے میں مدد ملتی ہے۔ ابتدائی اسکول میں داخلے کے بعد بچے اسکول کی لائبریری سے کتابیں ...لاتے ہیں اور روزانہ بیس منٹ اپنے والدین کو خصوصاً اپنی ماؤں کو ان کی مصروفیت کے باوجود ...تے ہیں۔ اس طرح ماں اور بچے کے درمیان گہرا تعلیمی تعلق قائم ہو جاتا ہے جو دونوں کو کتابیں ...ھنے پر اُکساتا ہے۔ والدین بچے کی ڈائری میں لکھ دیتے ہیں کہ اُس نے کتنے صفحات پڑھے۔ اُستاد ...ڑی دیکھتے ہیں اور جس بچے نے صفحات کی ماہانہ تعداد پوری کر لی ہوتی ہے اُس کی ڈائری پر امتیاز ...ثبت کر دیتے ہیں۔

۱۹۵۵ء سے جاپان میں ایک اور پروجکٹ چلا ہے۔ اس کی نوعیت ایک قومی مقابلے کی ہے جس ...بچے کتابوں کے بارے میں اپنے خیالات ظاہر کرتے ہیں۔ یہ پروجکٹ جاپان کے اسکول لائبریری ...ایشن اور مینچی اخبار نے شروع کیا ہے۔ ایسوسی ایشن چند بہترین کتابیں منتخب کر لیتا ہے

جن میں افسانوی اور غیر افسانوی ادب دونوں طرح کی کتابیں شامل ہوتی ہیں۔ یہ کتابیں پرائمری، جونیر
سینئر اسکولوں کے بچوں اور برسرکار نوجوانوں کے لئے ہوتی ہیں۔ ان منتخب کتابوں کو مینی چی اخبار شتہر
کرتا ہے جس کے لئے پبلشر اُسے معاوضہ دیتے ہیں۔ یہ کتابیں بڑی تعداد میں چھپتی ہیں۔ پرائمری معیار کی کتابوں
کی دو لاکھ کاپیاں، جونیر اسکول کے معیار کی ایک لاکھ بیس ہزار اور ہائی اسکول معیار کی ساٹھ ہزار کاپیاں چھاپی
جاتی ہیں۔ متعلقہ عمر کے بچوں سے ان کتابوں کے بارے میں رائے لکھنے کو کہا جاتا ہے۔ شہزادہ اور شہزادی بہتر
تبصرہ لکھنے والے بچوں اور ان کے اسکولوں کو انعامات دیتے ہیں۔ اس اسکیم کا پورا خرچ روزنامہ مینی چی اخبار
اٹھاتا ہے۔ بچوں کے پڑھنے کے شوق پر اس پروجکٹ کا کتنا گہرا اثر پڑتا ہے، اس کا اندازہ اس سے کیا
جاسکتا ہے کہ ۱۹۶۸ء کے مقابلوں میں ۱۶ لاکھ بچوں نے حصہ لیا۔

جاپان میں ایک اچھا رواج یہ بھی ہے کہ بچوں کو تہواروں اور اُن کی سالگرہ کے موقع پر کتابیں تحفے
میں دی جاتی ہیں۔ اس طرح بچوں کو پڑھنے سے دلچسپی پیدا ہوتی ہے اور اپنی لائبریری بنانے کی کوشش کرنے
لگتے ہیں۔ کبھی کبھی گرمیوں کی چھٹیوں کے وقت بچوں کو منتخب کتابوں کا تحفہ دیا جاتا ہے۔ تحفے دینے کے
اور بھی بہت سے مواقع آتے ہیں۔

پبلشنگ کوڈ : جاپان میں کتابوں پر کسی قسم کا سنسر شپ نہیں ہے اور نئے دستور میں خیالات
اور اظہار خیال کی آزادی کی پوری ضمانت موجود ہے۔

جاپانی پبلشر اس بات کو بخوبی سمجھتے ہیں کہ ملک کی معاشرتی ترقی میں کتابوں کی اشاعت نے بہت اہم
رول ادا کیا ہے۔ یہ لوگ اشاعت پر کسی قسم کی پابندی نہیں پسند کرتے لیکن انھوں نے خود ایک
پبلشنگ کوڈ بنا لیا ہے جس کی پابندی کرنے کی کوشش ہر پبلشر کرتا ہے۔ اس کوڈ کے مطابق کتاب
ایسی ہونی چاہئے جس سے انسانی ترقی میں، سائنسی اور اخلاقی اعتبار سے، مدد ملے۔ کتابوں میں کوئی
ایسی بات نہ ہونی چاہئے جس سے لوگوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچے یا عام مفاد کے خلاف ہو۔ رپورٹنگ
بالکل صحیح ہونی چاہئے اور اشاعت کا مقصد ترویج علم کے ذریعے سماج کو بہتر بنانا ہونا چاہئے۔ کتابیں
اور رسالے شائع کرنے والے ایسوسی ایشن نے اشاعتی اخلاقیات سے متعلق ایک کمیٹی قائم کی

دارا کین کے کاموں پر کڑی نظر رکھتی ہے تاکہ کوڈ کی خلاف ورزی نہ ہو۔

جاپان میں کتابوں کی صنعت بہت ترقی پر ہے جو اس سے ظاہر ہے کہ سنہ ۶۹ء میں اس صنعت
ملازموں کو جو بونس ملا وہ ۹۰۰ فیصدی تھا جو کسی بھی صنعت میں دیئے گئے بونس سے زیادہ ہے۔
پان کو اس منزل پر پہنچنے میں صدی لگ گئی اور اس دوران انھیں چار لڑائیاں بھی لڑنی پڑیں۔ ترقی کا کوئی
مان راستہ نہیں ہے لیکن ہم ترقی یافتہ ملکوں کے تجربوں سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں اور اُن کے اُن
بقوں سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو ہمارے حالات کے لئے موزوں ہوں۔

سید احمد علی آزاد

جامعہ میں ابتدائی تعلیم کے تجربے

سید احمد علی آزاد صاحب جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ۱۹۲۸ء سے کام کر رہے ہیں اور اس وقت مدرسہ ابتدائی میں سب سے زیادہ سینیر استاد ہیں۔ ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۵ء تک جامعہ کے طالب علم تھے اور قومی زندگی اور قومی تعلیم کے ان اعلیٰ مقاصد سے اچھی طرح روشناس ہو چکے تھے جن کے حاصل کرنے کے لئے جامعہ ملیہ اسلامیہ کا وجود عمل میں آیا تھا۔ آپ کی جوانی کا بہترین حصہ جامعہ کی خدمت میں گذرا اور اب پیری و ضعیفی کے قیمتی ایام یہیں استاد کی حیثیت سے گذار رہے ہیں۔ میں نے درخواست کی کہ آپ جامعہ میں ابتدائی تعلیم کے تجربوں کی ایک روداد قلمبند کر دیجئے تاکہ میں اسے رسالہ جامعہ میں جستہ جستہ چھاپوں، شاید کسی بندۂ خدا کے دل میں جو تعلیم کا کام کر رہا ہے، یہ خیال پیدا ہو کہ ان تجربوں سے فائدہ اٹھا کر قوم کے بچوں کی مفید تعلیم اور سچی تربیت کا کچھ نہ کچھ کام کیا جائے۔ سید احمد علی آزاد صاحب نے میری یہ درخواست منظور کرتے ہوئے روداد کی پہلی قسط چھاپنے کے لئے عنایت فرمائی۔ میں ان کا بہت ممنون ہوں۔

مدیر

جامعہ ملیہ اسلامیہ میں بہت سے تعلیمی تجربے ہوئے ہیں۔ یہ تعلیمی تجربات علاحدہ علاحدہ اساتذہ کئے ہیں اور تعلیم میں نئی نئی راہیں نکالی ہیں۔ ان تعلیمی تجربات کی خصوصیت یہ تھی کہ یہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم کی نگرانی میں بیس بائیس سال تک ہوتے رہے ہیں۔ ان تجربات میں ان کے مشورے

رہے ہیں، وہ برابر کام کرنے والوں کو دیکھتے رہتے تھے اور ان تجربات کے معیار کو بلند رکھنے
مسلسل صحیح رہنمائی کرتے رہتے تھے۔ وہ صرف آتے جاتے نہیں دیکھتے تھے بلکہ ابتدائی مدرسہ
ب پیریڈ بھی انگریزی کا لیتے تھے۔

ذاکر صاحب مرحوم کہا کرتے تھے:

"ہر کام کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں جو اگر پورے نہ ہوں تو کام کا حق ادا نہیں ہوتا۔ اس لئے جو کام آپ شروع کریں اُس کے تقاضوں کو پہلے سوچ لیں، پہلے سے تحریر کرلیں یعنی پہلے سے پلان کرلیں، تب ہی آپ اُس کے سارے تقاضوں کو پورا کرسکیں گے ورنہ کام ادھورا رہ جائے گا، اس کا معیار بلند نہ ہوگا، اس کا انجام وہ اثر پیدا نہ کرسکے گا جو دیکھنے والوں سے کام کرنے والوں کی محنت کی داد حاصل کرسکے۔ کام کام نہیں رہے گا بلکہ کھیل بن جائے گا، محنت زیادہ ہوگی نتیجہ کم نکلے گا۔"

ایک مرتبہ تعلیمی مرکز نمبر ا کے کچھ اساتذہ صاحبان نے تعلیمی مرکز نمبر ا کے ہال میں ایک ڈرامہ کرایا۔
حب مرحوم بھی پیچھے آکر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد ڈرامہ دیکھنے والے کھڑے ہوکر ڈرامہ
لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ذاکر صاحب کے سامنے ڈرامہ دیکھنے والوں کی ایک دیوار کھڑی ہوگئی لیکن ذاکر
مرحوم ڈرامہ ختم ہونے تک اپنی جگہ پر ہی بیٹھے رہے۔ جب ڈرامہ ختم ہوگیا اور لوگ چلے گئے
کرنے والوں سے کہا:

"آپ لوگوں نے اس ڈرامے کے انتظام کے سارے پہلوؤں پر غور نہیں کیا۔ اس کے انجام سے آپ کو بھی خوشی حاصل نہیں ہوئی۔ کام اگر بخوبی انجام پائے تو وہ خود اپنا انعام ہوتا ہے۔ کرنے والوں کو اس سے اطمینان اور مسرت حاصل ہوتی ہے۔ محنت آپ لوگوں نے بہت کی لیکن نتیجہ کم نکلا۔"

یہ تعلیمی تجربے مدرسہ ابتدائی قرول باغ اور بعد میں مدرسہ ابتدائی اوکھلا میں ہوتے رہے۔ مدرسہ
جب اوکھلے میں اپنی عمارت میں منتقل ہوگیا تو قرول باغ میں جامعہ کا ایک مدرسہ وہاں کے غیر مقیم

طلباء کے لئے تعلیمی مرکز نمبرا کے نام سے رہ گیا۔ بنیادی قومی تعلیم کا تجربہ اس مدرسہ میں ہوتا رہا تھا
مدرسہ کے کام کرنے والوں کو بھی ذاکر صاحب مرحوم کا مشورہ ملتا رہا۔ وہ روزانہ اپنے دفتر جاتے ہوئے
تعلیمی مرکز نمبرا سے ہو کر جاتے تھے اور ضروری ہدایات دے جاتے تھے۔ کاپیوں کی اصلاح کے کام
بہتر بنانے کے لئے انھوں نے پانچویں اور چھٹی جماعت کی کاپیاں جمع کرائیں اور خود ان میں اصلاح
اور استادوں کے لئے ہدایات لکھیں کہ اصلاح کا کتنا کام ان کی توجہ کا محتاج ہے۔ اس سے اس
صاحبان اصلاح کا کام روزانہ پابندی سے کرتے رہے۔

ان تعلیمی تجربات کی اس وقت بہت قدر اور پوچھ ہوتی تھی۔ ماہرین تعلیم کی آمد کا تانتا بندھا رہتا
تھا۔ ذاکر صاحب مرحوم صبح صبح کسی مہمان کے آنے کی اطلاع دیتے ہوئے دفتر جاتے تھے اور پھر
مقررہ پر ان مہمان صاحب کو لے کر آتے تھے اور کاموں کو دکھلاتے اور سمجھاتے تھے۔ لیکن تعریف
اور توصیف سے آگے کچھ نہ ہوا۔ جامعہ کے ان کاموں کو نہ کسی نجی تعلیمی ادارہ نے اور نہ کسی
کی حکومت نے اپنایا اور آزادی کے بعد تو کسی نے پوچھا تک نہیں۔ جس طرح موگا مشن اسکول فخر
کرسکتا ہے کہ اس کے تعلیمی تجربات کو جامعہ ملیہ نے اپنایا اور وسیع پیمانے پر وہاں کے کہانی کے طریقہ
اور پروجکٹ طریقہ تعلیم پر تجربہ کرکے آخری منزل تک پہنچا دیا اس طرح جامعہ ملیہ فخر نہیں کرسکتا کہ کسی
مدرسہ نے یا کسی صوبے کی حکومت نے یہاں کے طریقوں کو اپنایا ہو۔ حالانکہ یہ تمام تعلیمی تجربات ذاکر
صاحب مرحوم کی نگرانی میں ہوتے رہے۔ میری بات کی تصدیق شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب
کے ذیل کے جملے سے بھی ہوتی ہے:

"آزادی ملنے پر ان کاموں کو فروغ دینے اور جامعہ کو
ایک تعلیمی تحریک کا مرکز بنانے کے لئے کچھ نہیں کیا گیا۔"

(از تقریر شیخ الجامعہ ۲۹ راکتوبر ...)

ان تعلیمی تجربات کا سب سے نمایاں پہلو یہ تھا کہ تجربہ کرنے والے اساتذہ کو کئی کئی ماہ تک
تنخواہیں نہیں ملتی تھیں یا ملتی تھیں تو پوری نہیں ملتی تھیں۔ یہ ان تعلیمی تجربات میں اتنا کھوئے ہوئے

ر گھر کے تفکرات سے ان میں کوئی خلل نہیں پڑتا تھا۔ عبدالغفار صاحب، خاکسار، عبدالخالق صاحب،
جمل حسین صاحب، سید عروج الحسن صاحب، اختر حسین فاروقی مرحوم اور ماسٹر عبدالحئ صاحب
ی گھر کے کھاتے پیتے لوگ نہ تھے اور ان میں سے اکثر بال بچوں والے بھی تھے لیکن اپنے اپنے
وں میں ایسے منہمک نظر آتے تھے کہ دوسری تمام فکروں کا ان کے کاموں پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔
ہی تجربات کے اس زمانے کے بارے میں ذاکر صاحب کہا کرتے تھے :

"یہ تنگی کے دن کچھ اچھے ہی دن تھے۔ سامان نہیں تھا، ارمان تھا۔ دولت نہیں تھی ہمت تھی۔ سامنے ایک آدرش تھا۔ دل میں ایک لگن تھی۔ اختیار مانگنے کا کسے دھیان تھا۔ اپنا کام پورا کرنے کی دھن تھی۔ تنخواہ بڑھوانے کا موقع کہاں تھا۔ تنخواہ کٹوانے پر فخر کرتے تھے اور جان کھپانے میں جی سکھ پاتا تھا۔"

م کی ابتدار

یہ تعلیمی تجربے ۱۹۳۰ء سے شروع ہوئے۔ عبدالغفار صاحب مدہوںی موگا سے ٹریننگ لے کر
ئے تو اُن کو چار جماعتوں کا ایک مدرسہ جامعہ کی اپنی عمارت میں چلانے کے لئے دیا گیا۔ یہ عمارت
جو حافظ فیاض احمد صاحب مرحوم کی نگرانی میں تیار ہوئی تھی اور اس کا وسیع ہال جامعہ کے بیشتر
غل اور تعلیمی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔ یہ مدرسہ بہت جلد چھ جماعتوں کا مدرسہ ابتدائی بن گیا اور عبدالغفار
حب اس کے نگران مقرر کئے گئے۔

عبدالغفار صاحب رسمی طور پر بہت کوالیفائڈ استاد نہیں تھے۔ وہ تو میٹرک پاس بھی نہ تھے
لا وہ ایک بہت بلند پایہ معلم کا ذہن رکھتے تھے۔ ان کا ذہن تعلیم میں نئی نئی راہیں سوچتا رہتا تھا۔
ز اس کا سلسلہ ختم ہونے ہی میں نہیں آتا تھا۔ طلبا، اس طرح تعلیم دیئے جانے سے بہت خوش
ہ اُن میں بڑی جان نظر آتی تھی۔ نصابی تعلیم میں بچوں کو آمادہ اور تیار کرنے کے لئے جو طرح طرح
سب تدبیریں اختیار کرنی پڑتی ہیں اُن کی بالکل ضرورت ہی نہیں ہوتی تھی بلکہ کام خود اتنا

دلچسپ ہوتا تھا کہ بچے دل وجان سے سیکھنے کے لئے تیار نظر آتے تھے، اور بعض موقعوں پر بچوں کی اپنی تجویزیں استاد کی رہنمائی اور اقدام کا وسیلہ بن جاتی تھیں۔ طلبار ہر کام میں دل وجان سے لگ جاتے تھے وہ ہر نئے کام کے لئے آمادہ اور تیار نظر آتے تھے۔ عبدالغفار صاحب کو احباب جامعہ سے داد ملتی ہو یا نہ ملتی ہو لیکن طلبار کا مل کر دل وجان سے عبدالغفار صاحب کے ساتھ کام کرنا کام کو اتنا آگے بڑھا رہا تھا کہ اس داد کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ پھر کام خود اپنا انعام تھا۔ اس لئے کہ اچھے کام سے عبدالغفار صاحب اور طلبار دونوں کو خوشی ہوتی تھی۔

اس وقت اسٹاف میں زیادہ تر غیر تربیت یافتہ اساتذہ تھے اور گو وہ اپنے مضمون میں اچھا خاصا معیار اور استعداد رکھتے تھے لیکن طلبار ان کے گھنٹوں میں خوش نظر نہیں آتے تھے۔ طلبار ان کے گھنٹوں میں ادب سے خاموش تو بیٹھے نظر آتے تھے لیکن اس عمر کے بچوں میں جو زندگی اور ہماہمی ہے اس سے اس خاموشی کا کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ وہ مدرسہ کے بعد بھی طلبار سے کوئی لگاؤ نہیں رکھتے تھے عبدالغفار صاحب طلبار کے لئے تعلیم کے میدان میں نئے نئے منصوبے لا رہے تھے اور طلبار خوشی سے ان منصوبوں میں مصروف نظر آتے تھے۔ عبدالغفار صاحب صرف نئے نئے منصوبے ہی نہیں پیش کرتے تھے بلکہ جماعت میں بھی ان کا تعلیم دینے کا طریقہ بچوں کو پوری طرح آمادہ رکھتا تھا۔ جس میں ان کی تیاری اور زندہ دلی خاص انھیں کا حصہ ہوتی تھی۔ اس سے عبدالغفار صاحب طلبار کے ساتھی اور مددگار نظر آتے تھے۔

عبدالغفار صاحب بچوں کو جلسوں میں، ڈراموں میں، بچوں کی دکان میں، بچوں کے بنک میں اور باغبانی میں مصروف رکھتے تھے۔ اُس وقت بورڈنگ کے طلبار کی تعداد زیادہ تھی اور غیر مقیم طلبا کی تعداد بہت کم تھی۔ آس پاس مسلمانوں کی آبادیاں تو تھیں لیکن اُن میں تعلیم کا چرچا نہ تھا، یا وہ اپنے بچوں کو اس طرح کی تعلیم دلانا نہیں چاہتی تھیں۔ وہ اپنے بچوں کو مسجد کے مکتب میں بھیجتے تھے۔ مسلمانوں کی جو آبادیاں میل ڈیڑھ میل دور تھیں وہاں سے بچوں کے آنے میں دوری مانع تھی۔ اسی لئے سنہ ۱۹۲۶ء میں مدرسہ ابتدائی جب صرف غیر مقیم طلبار کے لئے رہ گیا تو لاری کا انتظام کیا گیا۔ بچا

طلبار اتالیق سے اجازت لے کر آتے تھے اور ان کاموں میں مصروف نظر آتے تھے۔ ان کاموں
اتنی کشش ہوتی تھی کہ طلبار کا دل بورڈنگ میں نہیں لگتا تھا۔

عبدالغفار صاحب یوں تو ٹائم ٹیبل کے مطابق پہلی جماعت اور چھٹی جماعت کو اردو پڑھاتے تھے
اصل میں وہ ایک معیاری مدرسہ کی داغ بیل ڈال رہے تھے جس کی ہر بات کو وہ عمل میں لاکر دکھانا
بھانا چاہتے تھے۔ انھوں نے اپنے زمانے کے ان تمام کاموں کو ایک معیار پر لاکر چھوڑا جو آئندہ
لئے سند کا کام دیتے رہے۔ اس زمانہ کا جلسہ جس کی صدارت خود بچے کیا کرتے تھے، اُس زمانے
ڈرامے جو بے سروسامانی کے باوجود ایک معیار رکھتے تھے، اُس زمانے کا صفائی کا معیار اور
زمانہ کی صبح کی حاضری اور ترانہ، غرض تمام کاموں کا معیار خاصہ بلند تھا اور یہ سب کام دیکھنے
ل پر خاص اثر ڈالتے تھے۔

جامعہ میں ذاکر صاحب کے خاص خاص ساتھیوں میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو اس وقت ابتدائی
ہ کے اِن کام کرنے والوں کو وہ درجہ نہیں دیتے تھے جو ذاکر صاحب اِن اُستادوں کو ان کے
ل وجہ سے دے رہے تھے بلکہ اِن تجربوں پر جامعہ میں لوگ ہنستے تھے۔ اس سلسلہ میں ذاکر
ب کا ایک ہی جواب ہوتا تھا: "اصل جامعہ تو یہ کام کرنے والے اور ان کا کام ہے"۔ اور بات
بھی تھی۔ اِن کام کرنے والے اساتذہ کے کام کو دیکھنے کے لئے ہندوستان کے اور ہندوستان
باہر کے سینکڑوں ماہرینِ تعلیم آتے تھے۔ کام دیکھ کر اپنے تاثرات "رائے کی کتاب" میں لکھتے
اور ان تاثرات کو ہندوستان کے اندر اور باہر لوگوں سے بیان کرتے تھے۔ اس طرح جامعہ اور
ہ کے کام کا چرچا ہندوستان اور ہندوستان کے باہر برابر بڑھتا رہا۔ یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ تمام
ٹھیک ٹھاک تعلیمی اصولوں پر ہو رہا تھا لیکن کام کرنے والوں میں جو لگن اور مقصد سے لگاؤ
ے میں آتا تھا وہ اپنی جگہ مثال تھا اور بچوں میں جو سیکھنے کی خواہش، آمادگی اور خوشی پائی جاتی تھی
ہندوستان کے کسی ابتدائی مدرسہ میں نہیں نظر آتی تھی۔ اس کے ثبوت میں پروفیسر محمد مجیب صاحب
بات پیش کی جاسکتی ہے جو وہ بار بار دہراتے ہیں:

"نیو ایجوکیشن فیلوشپ کے ممبران نے جب مدرسہ ابتدائی کو دیکھا تو یہ رائے ظاہر کی کہ انہوں نے دنیا کے بہت سے ممالک کا سفر کیا ہے لیکن کسی جگہ ایسا ابتدائی مدرسہ نہیں دیکھا۔ انہوں نے کہا کہ ہم مدرسہ کی عمارتیں اور فرنیچر دیکھ کر متاثر نہیں ہوتے، ہم بچوں کو دیکھتے ہیں اور اس اعتبار سے ہم نے جامعہ کے مدرسہ ابتدائی کے بچوں میں سیکھنے کی خواہش اور لگاؤ کو دوسرے مدرسوں سے کہیں زیادہ پایا ہے۔"

موگا کا مشن ٹریننگ اسکول تین باتوں کے لئے خاص اہمیت رکھتا تھا۔ ۱۔ کہانی کے طریقہ سے اردو پڑھانے کا طریقہ۔ ۲۔ پروجکٹ یا مقصدی طریقہ۔ ۳۔ تمام کاموں کو خود کرنے کی عادت عبدالغفار صاحب نے کہانی کے طریقے سے اردو پڑھانے میں بڑی کامیابی حاصل کی اور ان کے بعد نذیر تجمل حسین صاحب (موگا ٹرینڈ) نے اس کام کو بڑی کامیابی سے انجام دیا۔ کہانی کے طریقہ سے اردو پڑھانے کا طریقہ جمع اور بے معنی حروف سے شروع کرنے کے طریقے کے مقابلے میں بہت کامیاب رہا۔ کامیابی کا معیار یہ تھا کہ بچے شوق اور دلچسپی سے زبان سیکھتے تھے اور ان کا شوق اور دلچسپی آخر تک برقرار رہتی تھی۔ بچے روانی سے اردو پڑھنے لگتے تھے اور اچھا لکھنے کی شروع ہی سے عادت بنتی جاتی تھی، اور میں نے دیکھا ہے کہ بچے تیسری اور چوتھی جماعت سے ہی کہانی اور رسالے شوق سے پڑھا کرتے تھے۔ آگے چل کر بچوں میں تقریر کرنے کا سلیقہ اور کسی موضوع پر اپنے خیالات کا بخوبی ظاہر کرنا کافی ترقی پر ہوتا تھا۔ جناب حفیظ الدین صاحب کی نگرانی میں بچے اس کی بہت اچھی مشق کر لیا کرتے تھے۔ اس ابتدائی مدرسہ کے طلباء نے تقریری اور تحریری مقابلوں میں جہاں جہاں شرکت کی اول انعام حاصل کیا۔ مدرسہ ابتدائی کی چھٹی جماعت کا طالب علم مڈل اسکول اور ہائی اسکول کے طلباء سے تقریروں اور مضمونوں میں مقابلہ کرتا تھا اور اول آتا تھا۔ سامعین کو طلباء کے بے جھجک بولنے پر حیرت ہوتی تھی۔

پروجکٹ یعنی مقصدی طریقہ سے تعلیم دینے کے مدرسہ ابتدائی اور تعلیمی مرکز نمبر ۱ میں بہت سے تجربے ہوئے اور عبدالغفار صاحب کے بعد ان مدرسوں میں اساتذہ صاحبان نے بہت

جکٹ چلائے اور ان میں نئی نئی راہیں نکالیں۔ ان پروجکٹس میں کچھ تو وقتی ہوتے تھے، جیسے
پروجکٹ، آگرہ پروجکٹ۔ کچھ پروجکٹ سالانہ ہوتے تھے یعنی وہ مدرسہ کی سالانہ خصوصیت
گئے تھے جیسے میلاد النبیؐ اور یوم قرآن پروجکٹ۔ کچھ پروجکٹ کاروباری پروجکٹ کی حیثیت رکھتے
اور سال بھر چلتے تھے۔ اُن پر سال بھر کام ہوتا تھا۔ اور ان کی حیثیت مستقل کام کی ہوگئی تھی مثلاً
ں کا بینک، بچّوں کی دوکان، بچّوں کا خوانچہ، باغبانی اور جب مدرسہ جامعہ نگر میں آگیا تو مرغی خانہ۔
جے کسی ایک جماعت سے متعلق ہوتے تھے اور اس جماعت کے طلبا ر اپنے اُستاد جماعت کی
نا میں سال بھر کام کرتے اور تعلیمی فائدہ حاصل کرتے تھے۔ جو پروجکٹ وقتی طور پر چلتے تھے اُن کا
ب طلبا ر خود کرتے تھے اور ان کاموں میں دلچسپی ہونے کے سبب اِن کے سہارے اردو،
ب اور معلومات کی اکثر باتیں سیکھتے تھے۔ تعلیم دلچسپ انداز سے خود بچوں کے انتخاب کئے
ئے پروجکٹ کے ذریعہ ہوتی تھی۔

(باقی)

ڈاکٹر جعفر رضا بلگرامی

کیرلا

کہتے ہیں کہ ایک بار پرس رام نے، جو وشنو کے دس اوتاروں میں سے ایک ہیں، اپنی "پر (کلہاڑی) بحیرۂ عرب میں پھینک دی۔ جس جگہ پانی میں یہ کلہاڑی گری وہاں تک پانی پیچھے ہٹ گیا جو زمین نکل آئی وہی موجودہ کیرلا ہے۔ اس طرح کیرلا بحیرۂ عرب کا دیا ہوا پرس رام کو ایک تحفہ ہے علم ارضیات کے ماہرین کا خیال ہے کہ کیرلا کا موجودہ ساحل کسی وقت سمندر کا حصّہ تھا۔ کسی آتش فشاں سے سمندر کا پانی پیچھے ہٹ گیا اور زمین نکل آئی۔ پرس رام کی دیومالائی داستان اس ارضیاتی حقیقت میں مضمر ہے۔

کیرلا کی تاریخی داستان قدیم بھی ہے اور طویل بھی۔ کوئی تین ہزار قبل مسیح کیرلا مسالے کی تجا کا مرکز رہا ہے۔ چائے، پھل، لہسن، مرچ، الائچی اور دارچینی وغیرہ کی تجارت مشرقِ وسطیٰ سے ہو رہی ہے۔ بابل اور اسیریا کی تہذیبیں اِن مسالوں کے استعمال سے واقف تھیں۔ مصر کی ممیوں جس مسالے کا استعمال ہوتا تھا اُس میں دارچینی ایک خاص جُز تھی جو کیرلا ہی سے بھیجی جاتی تھی۔ روم سے بھی کیرلا کے تجارتی تعلقات اِتنے ہی پُرانے ہیں۔

کوئی پانچ سو قبل مسیح کا زمانہ کیرلا کی تاریخ میں "سنگم دور" کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ دور ہے جبکہ کیرلا کے قدیم دراوڑ نسل کے باشندے بُدھ اور جین مذہب اختیار کر رہے تھے لیکن اس دور کے اختتام پر بُدھ اور جین مذاہب کے تنزّل اور ہندو مذہب کے عروج کا دور شروع ہوا۔ اس کے بعد ہی کیرلا میں ہندو مذہب کے ماننے والوں کی اکثریت ہو گئی۔ ۸۲۵ء میں "مالابا

نام پر جو موجودہ کرانگنور کے قریب ہے سینٹ تھامس آئے تھے جنھوں نے بہت سے برہمن
اندانوں کو عیسائی بنایا تھا اور ملابار کے ساحل پر سات چرچ تعمیر کرائے تھے۔ اس کے بعد بہا
سائی مذہب کیرلا میں پھیل گیا۔ ۶۸ء میں یہودی آکر بس گئے۔ ۸۰۰ء میں مسلمانوں کا بھی ورود
روع ہوا۔ یہ لوگ "مزیریس" کے مقام پر بس گئے اور اپنی پہلی مسجد وہیں تعمیر کی۔ اس سلسلے میں بھی
ب داستان بیان کی جاتی ہے کہ کیرلا کے بادشاہ چیرامن پیرومل نے مذہب اسلام قبول کر لیا
اور حج کے لئے مکہ معظمہ تشریف لے گئے تھے۔ اگرچہ اس داستان میں کوئی تاریخی حقیقت نہیں
لیکن اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ اس بادشاہ کو مسلمانوں کا پورا اعتماد حاصل تھا۔ اس کا اندازہ
بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اُس کی بحری فوج کے زیادہ تر سپاہی مسلمان تھے۔

۸۰۰ء سے ۱۱۰۲ء تک "گلاسیکھرداس" کا زمانہ کہلاتا ہے جو کیرلا کی تاریخ میں سُنہرے دور
نام سے جانا جاتا ہے۔ ۱۱۰۲ء سے چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے قیام کا دور شروع ہوا۔ ۱۴۹۸
واسکو ڈیگاما کالی کٹ کے ساحل پر لنگر انداز ہوا جس کے بعد کیرلا میں پرتگالیوں اور ڈچوں نے
بت کی باگ ڈور سنبھالی۔ اٹھارویں صدی میں میسور کا حملہ ہوا جس کے بعد انگریز حکمرانوں کا دور شروع
جو آزادی کے وقت تک رہا۔ آزادی کے بعد کیرلا مختلف حکومتوں کی تجربہ گاہ رہی ہے۔ کانگریس،
یا سوشلسٹ اور کمیونسٹ پارٹیاں یا اُن پر مشتمل مخلوط حکومتیں کیرلا میں بنتی بگڑتی رہیں۔ ۱۹۶۷ء کے
شن میں ایک مخلوط حکومت کمیونسٹ (مارکسسٹ) پارٹی کی قیادت میں بنی۔ ۱۳۳ ممبروں کی اسمبلی
اس کو ۱۱۷ کی اکثریت حاصل تھی۔ ۶ رمارچ ۱۹۶۷ء کو یہ حکومت باقی نہ رہی۔ مارکسسٹ پارٹی
اکثریت سے ایک اور مخلوط حکومت بنی جس کے وزیر اعلیٰ نمبودری پد ہوئے۔ اکتوبر ۱۹۶۹ء میں
وزارت بھی ٹوٹ گئی۔ یکم نومبر ۱۹۶۹ء کو غیر کانگریسی اور غیر مارکسی پارٹیوں پر مشتمل ایک اور مخلوط
ت بنی جس کے وزیر اعلیٰ اچیوتا مینن ہوئے جو اب تک برسر اقتدار ہیں۔

کیرلا کئی اعتبار سے ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ قدرتی
گنجان آبادی، تعلیم کی اشاعت، پہلی کمیونسٹ حکومت، حکومتوں میں تغیر و تبدل، گاؤں کی

اور یہ مغرب کے ساحل پر سرحدی حفاظت کے لئے نصب کر دی گئی تھیں۔ اگرچہ اس داستان میں کو
تاریخی حقیقت نہیں ہے لیکن اس سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ نمبودری باہر کے برہمن تھے جن کو مقا
سے لڑنا پڑا تھا۔ جب انھوں نے آن پر مکمل اقتدار حاصل کر لیا تو اس حیثیت کو باقی رکھنے کے لئے
پات کی بنا ڈالی اور خود سماجی حیثیت سے اپنے آپ کو بلند رکھا۔ لیکن سماجی حیثیت بغیر اقتصادی حیثی
کے مضبوط نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لئے سماج میں اپنی پوزیشن ممتاز و موثر رکھنے کے لئے انھوں نے
طریقہ کو رواج دیا جس کی رو سے زمین افراد کی ملکیت سمجھی جاتی تھی نہ کہ سماج کی۔ یہی وجہ ہے کہ حکو
زمینوں سے کسی طرح کا ٹیکس یا لگان وصول نہیں کر سکتی تھی۔ دراصل یہ زمینیں شروع میں مندروں
انتظامی امور کے لئے دے دی گئی تھیں جن پر حکومت کو کوئی اختیار نہ تھا۔ مندر کا جب انتظام خرا
ہو گیا تو یہ زمینیں نمبودریوں کے ذاتی استعمال میں آگئیں۔ لیکن حکومت کی بے تعلقی اور بے اختیاری
ہی باقی رہی۔ اب موجودہ حکومت زمینوں کے متعلق کچھ قوانین وضع کر رہی ہے۔

زمین کو نسلاً بعد نسلٍ غیر منقسم اور متحد رکھنے کے لئے نمبودریوں کو اپنے خاندانی ڈھانچے میں کچھ تبد
کرنی پڑیں۔ نمبودری جس سوسائٹی سے تعلق رکھتے تھے وہاں زمین پر سماج کا اختیار سمجھا جاتا تھا اس
لئے یہ لوگ خاندانی جائیداد کو تقسیم ہونے سے اس وقت تک نہیں بچا سکتے تھے جب تک اس
روک تھام کے لئے رسم ورواج کی بنا نہ ڈالیں۔ اس کے لئے انھوں نے یہ طریقہ رائج کیا کہ
کا صرف بڑا لڑکا اپنی ذات کی لڑکی سے شادی کرے گا۔ دوسرے بھائی کمتر ذات میں شادی کری
تاکہ جائیداد کے حق سے محروم رہیں اور اس طرح جائیداد کی وراثت نمبودری خاندان کے بڑے
تک ہی محدود رہے۔ اس رواج سے جائیداد کی تقسیم تو رک گئی لیکن ایک نقصان یہ ہوا کہ نمبو
کی تعداد روز بروز گھٹتی رہی اور اسی اعتبار سے دوسری ذاتوں کی تعداد بڑھتی رہی۔ نوبت
تک پہونچی کہ نمبودری جو کبھی آبادی کا پچیس فیصدی تھے اب صرف دو فیصدی رہ گئے ہیں
جو لوگ کمتر ذات میں شادی کرتے ہیں وہی ناڑ کہلاتے ہیں۔ ---------

ناڑوں میں خاندان ماں کے رشتہ سے چلتا ہے۔ تہذیبی ارتقاء میں [illegible] خاندان پہلا

کڑی پیچھے ہے ۔موجودہ ترقیوں کے باوجود نائروں میں تہذیبی ترقی صرف مادری خاندان تک
ئی ہے ۔ موجودہ قوانین اس رواج کو ختم کر رہے ہیں لیکن اب تک اس کی جھلکیاں صاف طور پر
تی ہیں ۔ مادری خاندان کی وجہ یہ بتلائی جاتی ہے کہ نائر ہمیشہ ہی سے ایک جنگجو قوم رہی ہے ۔ جنگ
یہ قوم "سوسائیڈ اسکوئیڈ" کا کام کرتی رہی ہے ۔ اکثر خاندان کے تمام تندرست افراد جنگ میں بلائے
تے تھے جہاں موت یقینی تھی ، ایسی صورت میں عورتوں کی طرف سے وراثت کا رواج ہونا
ی تھا ۔ ایک اور رواج جس کو مادری خاندان کی ایک شق سمجھنا چاہئے ، نائروں میں صرف ایک نسل
تک پایا جاتا تھا وہ یہ کہ ایک بھائی کی بیوی تمام بھائیوں کی بیوی سمجھی جاتی تھی ۔ جنگ کی ضرورت اور
ئیداد کی یکجہتی نے اس رواج کو جنم دیا ۔ خاندان میں اگر ایک فرد بھی بچ گیا ہے تو عورت بیوہ نہیں
ائے گی اور بیوگی کی تمام مصیبتوں سے بچ جائے گی ۔ خاندان کے افراد اور ان کے بزرگوں کے درمیان
ب سازگار ماحول قائم رہے گا ۔ خاندانی جائیداد تقسیم ہونے سے بچ جائے گی ۔ اِس طرح اگر وہ ریلا
خاندان کے بڑے لڑکے کی شادی ہم ذات میں کرکے اور دوسروں کی شادی کم ذات میں کر کے
ئیداد کو تقسیم ہونے سے بچا لیا تو نائروں نے مادری خاندان کی بنا ڈال کر اور ایک بھائی کی بیوی کو
م بھائیوں کی بیوی بنانے کا رواج اپنا کر جائیداد کو محفوظ اور یکجا رکھا ۔ یہ رواج ایسی سوسائٹی کے لئے
بھی اہمیت رکھتے ہیں جہاں زمین سماج کی ملکیت کے بجائے افراد کی ملکیت سمجھی جاتی ہے ۔

ہندوؤں کے بعد کیرلا کے سب سے قدیم باشندے عیسائی ہیں ۔ یہ لوگ ابتدائی دور ہی میں عیسائی
ب قبول کر چکے تھے ۔ یہاں کے عیسائی روم کے مقابلہ میں کیرلا ہی کو عیسائی مذہب کا قدیم مرکز مانتے
کنیا کماری میں سمندر کے اندر کوئی دو فرلانگ کے فاصلے پر ایک بہت بڑی چٹان نظر آتی ہے اس
رت عیسیٰ کی چٹان کہا جاتا ہے ۔ عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ سنٹ تھامس سب سے پہلے اسی چٹان
ئے تھے ۔ اس لئے یادگار کے طور پر انھوں نے چٹان پر مقدس نشان بنا دیا ہے ۔ لیکن اس چٹان
ہندو طبقہ کی بھی ایک مذہبی عقیدت وابستہ ہے ۔ اِن کا عقیدہ ہے کہ سوامی وویکانند کو اسی
ِ گیان حاصل ہوا تھا جس کے بعد وہ شکاگو یونیورسٹی گئے اور وہاں انھوں نے مذہب اور

انسانیت پر بڑی بصیرت افروز تقریریں کیں۔ ہندوستان بھر سے کروڑوں روپیہ جمع ہوا ہے اور آج کل وہاں ایک مندر تعمیر ہو رہا ہے۔

یہاں کے مسلمان آبادی کا ۱۵ فیصدی ہیں جن کی مجموعی تعداد کشمیر کے مسلمانوں سے زیادہ ہے۔ یہ سب کے سب مالابار پہاڑیوں میں آباد ہیں اور پیشہ کے اعتبار سے یا تو کسان ہیں یا تاجر ہیں۔ ملیالم زبان میں مسلمانوں کو "موپلا" کہتے ہیں جس کے معنی باعزت کے ہیں۔ شاید مسالے کے قدیم تاجر ہونے کے باعث جو عزت ان کو سماج میں حاصل ہو گئی تھی اس بنا پر ان کو "موپلا" کہا جانے لگا۔ ملیالم زبان میں اس لفظ کے معنی داماد کے بھی ہوتے ہیں اور مقامی بول چال میں یہ لفظ شوہر کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ خیال ہے کہ شروع میں جب عرب سے یہ لوگ آئے تھے تو مقامی خاندانوں میں شادیاں کر لیں۔ خاندان کے دوسرے افراد نے ان کو "موپلا" کہہ کر پکارنا شروع کیا جو دھیرے دھیرے پوری مسلم قوم کے لئے استعمال کیا جانے لگا۔ مسالے کی تجارت کی غرض سے یہ لوگ مذہب اسلام سے قبل آ گئے تھے۔ جب ان کے آبا و اجداد نے مذہب اسلام قبول کیا تو یہ لوگ بھی مسلمان ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں کو مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ عربی النسل ہونے کا بھی شدید احساس ہے۔

ابھی حال ہی میں ترویندرم میں دوہری منزل کی ایک نئی مسجد تعمیر ہوئی ہے۔ ایک مینار کے اردگرد ابھی تک پاڑھ تک بندھا ہوا ہے۔ یہ دیکھ کر تعجب ہوا اور خیال پیدا ہوا کہ جبکہ مسلمان اتنے پرانے باشندے ہیں یہ مسجد اب کیوں بنی جبکہ کوئی اور قدیم مسجد ترویندرم میں موجود بھی نہیں ہے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ اس مقام پر ایک پرانی مسجد موجود تھی لیکن کچھ زمین شامل کر کے اس کو از سر نو تعمیر کیا گیا جس کی وجہ سے یہ پہلے سے زیادہ کشادہ ہو گئی ہے۔ کارپوریشن نے اس کا نقشہ پاس کیا۔ در کسان ہاؤسنگ کے غیر مسلم وزیر کی زیر نگرانی یہ پایہ تکمیل تک پہونچی۔ نقشہ میں غسل خانے، وضو خانے اور ایک مندر کی جانب تھے۔ احتراماً مسلمانوں نے یہ طے کیا کہ [illegible] جانے [illegible] کہ اس کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے مسجد اور [illegible] نے منع کیا کہ [illegible] مسجد کی کشادگی کو ختم کیا جائے [illegible] ہونے کی وجہ

ے ناپاک ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ پاخانے فلش سسٹم کے ہیں۔ یہ وسیع القلبی اور رواداری الی ہند میں ناپید ہے۔

یہاں کے مسلمان زیادہ تر شافعی سنی ہیں۔ کالی کٹ سے بیس میل دور کنڈوتی مقام پر ایک شیعوں درگاہ بھی ہے جس کے مجاور ایرانی خاندان کے سید ہیں۔ سیدوں کو یہاں کی زبان میں "تھانگلا" کہتے ہیں۔ لیکن یہاں کے مسلمانوں میں فرقہ وارانہ تفریق کا کوئی احساس نہیں ہے۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو یہ لوگ بعثتِ اسلام سے قبل آکر یہاں بس گئے تھے اور اسلام میں خلفاء راشدین کے بعد جو تفرقے یدا ہوئے اس کے مضر اثرات سے بچ گئے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ترویندرم جامع مسجد مسلمانوں کے جملہ مذہبی رسوم کی ادائیگی کا مرکز ہے۔ یہاں ہر فرقہ نماز پڑھتا ہے۔ تبلیغی جماعت یغ کرتی ہے۔ جماعتِ اسلامی کا اجتماع ہوتا ہے۔ میلاد النبی کی محفلیں ہوتی ہیں اور محرم میں تعزیے اُٹھتے ں۔ میں نے لوگوں سے دریافت کیا کہ جبکہ آپ لوگوں کی زبان ملیالم ہے تو آپ حضرات تقریریں کیسے ھتے ہوں گے۔ اس کا جواب یہ ملا کہ ہر تقریر کرنے والے کے ساتھ ایک مترجم ہوتا ہے جو ملیالم زبان ترجمہ کرتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ عیدین میں دورانِ نماز ملیالم زبان میں ترجمہ ہوتا جاتا ہے۔ پھر نے دریافت کیا کہ میلاد میں نعتیں اور قصیدے یا محرم میں مرثیے یا نوحے کیسے پڑھتے یا سمجھتے ہوں گے زیادہ تر لٹریچر اردو زبان میں ہے۔ اس کا جواب یہ ملا کہ کچھ قصیدے، نوحے اور مرثیے تو ملیالم زبان موجود ہیں لیکن زیادہ تر اردو سے ملیالم رسم الخط میں نقل کر لیے گئے ہیں جن کو احترام کے ساتھ لیکن مجھے ہوئے اسی طرح پڑھا اور سنا جاتا ہے جس طرح احترام کے ساتھ لیکن بغیر سمجھے ہوئے قرآن ا اور سنا جاتا ہے۔

کیرلا کے ہندوؤں، عیسائیوں اور مسلمانوں میں مذہبی تفریق کے باوجود مقامی تہذیب کی ایسی گہری پ ہے کہ سماجی اور لسانی اعتبار سے ان میں امتیاز کرنا ممکن نہیں ہے۔ کیرلا کے مختلف فرقوں کی ہنگی پورے ہندوستان کے لئے ایک مثال ہو سکتی ہے۔

سید حرمت الاکرام

زخمِ آگہی

سناتا ہوں ہر روز تجھ کو فسانے
رموزِ وفا کے رموزِ جہاں کے
غمِ دوستاں کے غمِ دلبراں کے
مرے ہم نشیں! میں بتاتا ہوں تجھ کو
تواریخ کے قہرمانوں کی باتیں
جو ہر گام پر علیشِ منزل سے کھیلے
جنھیں کھا گیا زعمِ عالم پناہی
جنھیں ڈس گئی اپنی ہی کج کلاہی
سناتا ہوں میں سوہنیوں کے قصے
جنھیں زندگی نے نشانہ بنایا
ڈبویا جنھیں دل کے کچے گھڑے نے

مری نکتہ دانی کا دلدار جادو
تری روح میں چاندنی گھولتا ہے
مرے تجربوں کا خوش آہنگ نغمہ
ترے زخمِ دل کا مداوا ہے لیکن
مری روح میں جھانک کر کوئی تجھے
سلگتی ہیں زخموں کی کتنی چتائیں!
پشیماں ہوں نیرنگِ دیدہ وری سے
پشیماں ہوں ادراک کی چاندنی سے
مرا خامۂ زر فشاں ہے پشیماں
مری فکر کا آسماں ہے پشیماں
تفوق کی ناز آفریں سرکشی سے

ہے آئینہ ہر پیچ و خم زندگی کا
مری فطرتِ راز جو کی نظر میں
رگوں میں مچلتا ہوا ایک سودا
کسی منزلِ بے نشاں کے شرارے
جگایا کیا سینۂ رہگزر میں

کوئی تجربہ کام میرے نہ آیا
مری نکتہ دانی نے مجھ کو ستایا
خود اپنے ہی زخموں کا مرہم نہ پایا

چارلس بودلیر

مترجم: اخیا ساحد

گھڑی

گھڑی! ڈراؤنی، منحوس اور سنگدل عفریت ہے

جس کی سوئی ہمیں دھمکاتی ہوئی کہتی ہے ــــــ "تجھے یاد ہے!

ترے خوفزدہ دل میں ــــــ ابھرتے ہوئے درد

عنقریب یوں نقش ہو جائیں گے جیسے وہ نشانہ پر آ کر لگے ہوں

غبار آلود خوشی افق کی جانب پرواز کر جائے گی

جیسے ہوا کی روح پس منظر میں اوجھل ہو جاتی ہے،

ہر لمحہ تجھے لقمۂ مسرت کھلاتا ہے

اور ہر انسان کو اس کے زمانہ کے اعتبار سے .....

تجھے یاد ہے کہ وقت ایسا ماہر کھلاڑی ہے

جو دھوکا دیئے بغیر جیت لیتا ہے* ـــــ ہر حملہ میں ! یہی قانون قدرت ہے

دن گھٹتا ہے ، رات بڑھتی ہے ـــــ یاد ہے !

خلا ہمیشہ پیاسا رہتا ہے ، پانی کی گھڑی ٹپکتی ہے

بہت جلد وہ وقت آئے گا جب وہ مقدس واقعہ

وہ پرشکوہ پاکیزگی ـــــ وہ کنوارپن ـــــ جو تجھے محبوب ہیں

اور وہ پشیانی بھی ـــــــــ (آہ ! ـــــ آخری آرام گاہ !)

ـــــ سب تجھ سے کہیں گے ـــــ "مرجا ، بزدل کہیں کے ! اب بہت

دیر ہو چکی ہے !"

(فرانسیسی سے ترجمہ)

"سیما کی تلاش"

عزیزم ڈاکٹر عابد رضا بیدار سلمہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

گذشتہ اکتوبر ۸۰ء کے آخری ہفتہ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے "جشن زریں" میں شرکت کا اتفاق میری زندگی کے مبارک مواقع میں سے تیسرا موقع تھا کہ ایسے ہمہ گیر جشنوں میں حاضری کی سعادت اصل ہوئی۔ یعنی ۱۹۲۵ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے "جشن زریں" میں شرکت۔ ۱۹۴۶ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ لی کے "جشن سیمیں" میں شرکت اور اکتوبر ۱۹۸۰ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے "جشن زریں" میں شرکت۔ ن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا۔

۱۹۲۵ء میں جوان تھا اور ۱۹۸۰ء میں تقریباً اسی برس کا بوڑھا ہو چکا ہوں۔ اگر زندہ رہا اور ہوش و اس بھی سلامت رہے تو ممکن ہے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ۷۵ سالہ "جوہری جشن" میں بھی شرکت کر سکوں۔ شاء اللہ۔ والعلم عند اللہ والعون بید اللہ القوی العزیز۔

ہاں تو جامعہ کے "جشن زریں" میں شرکت پرانی محبتوں اور تعلقات کی تجدید کے ساتھ نئی معلومات نئے تعلقات و روابط کا اضافہ بھی کم قابل قدر چیز نہیں۔ اس سلسلہ میں آپ سے ملاقات بھی غیر مترقبہ سے کم نعمت نہیں۔ نادیدہ ملاقات اور کسی قدر قلمی میل جول تو مدت سے تھا ہی۔ مگر جشن

ڈاکٹر عابد رضا بیدار کے نام یہ مکاتیب خط جامعہ میں اشاعت کے لئے بھیجا گیا ہے۔

جامعہ میں اچانک ملاقات اور آپ کے التفات نے دل خوش کر دیا۔ آپ حیران نہ ہوں گے اگر یہ کہوں کہ آپ کو دیکھ کر آپ کے تخلص "بیدار" کی حقیقت ایک اور رنگ میں واضح ہوئی۔ جو راتوں کو بیدار رہے وہی بلندی پائے۔ معنوی بیداری کے ساتھ جسمانی شب بیداریاں، جسم وجاں کی قربانیاں لیے بغیر کسی کو علم ہنر کی دنیا میں سربلندیاں نہیں دیتیں۔ آپ کا جسم نازک وناتواں اس مجاہدہ پر شاہد تھا۔ مگر آپ کی چشم بینا کی چمک گواہ تھی کہ آپ واقعی "بیدار" ہیں۔

آپ نے ازراہِ کرم اپنی دو تازہ تصنیفیں یا تالیفیں عنایت فرمائیں۔ یعنی (۱) سیا کی تلاش (۲) متاعِ فقیر اور تیسری تالیف جو مولانا آزاد مرحوم کے متعلق ہے، جسے میں مدت ہوئی پڑھ چکا ہوں اور جس کے صفحات میں میرا بھی ایک خاصہ لمبا مکتوب جگہ پا چکا ہے، اس کے بھیجنے کا آپ نے وعدہ کیا تھا۔ اس وعدے کے ایفا کا منتظر ہوں۔ مقدم الذکر دونوں کتابوں کو بمبئی میں آتے ہی پڑھا۔ آپ کی تلاش کا قائل اور آپ کے طرزِ نگارش کی رمزیت کی دلکشی کا بھی معترف ہوں۔ کچھ ایسا لگتا ہے کہ آپ کسی بتِ قیامت ساماں کی تلاش میں تو ہیں مگر بت شکنی کی طرف زیادہ مائل نظر آتے ہیں۔ ایسے اندازِ فکر اور اظہارِ خیال کا ایک نتیجہ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ بہت سے بت شکن خود ایک قسم کے بت بنکر اپنے پجاری آپ بن جاتے ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ یہ پیرایۂ فکر و بیان خالی از خطر پیرایۂ خیال اور اندازِ بیان نہیں، گو یہ بھی سچ ہے کہ ہماری "انا" کہاں ہمارا پیچھا چھوڑتی ہے۔ جہاں انا الحق کا نعرہ پھانسی پر چڑھاتا ہے، وہاں یوں بھی پایا گیا ہے کہ "انا العبد" کا اعلان بھی انا الحق سے کم پر از ادعا نہیں ہوتا۔ خیر۔

اس وقت آپ کی کتاب "سیا کی تلاش" پر اظہارِ خیال منظور ہے۔ مفصل تبصرہ مقصود نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ بحیثیت مجموعی مجھے آپ سے اتفاق ہے۔ آپ نے اپنی اس کتاب کا جو عنوان تجویز کیا ہے۔ وہ بہت ہی موزوں ہے۔ مشکل یہی ہے کہ ایک عالم کو سیا (حد) کی تلاش ہے۔ عالمِ خیال کی پرواز اور عالمِ آب وخاک کی پیمائش میں دنیا سرگرداں ہے۔ اپنے گرد و پیش نظر ڈالئے۔ عالمِ معنی میں اختلاف کا حد بندی پر تکرار ہے۔ عالمِ آب وخاک میں خون خرابہ اسی حد بندی کا ہے اور اختلاف ہے کہ سمٹنے کے بجائے اور پھیلتا چلا جاتا ہے تو کیا اس ناکامی سے مایوس ہو کر "سیا" کی تلاش و تعین کا خیال اور مخلصانہ کوششیں

چھوڑ دی جائیں۔ یا بہرحال اصل و فرضی بے شمار مشکلوں کے باوجود تلاش کو جاری رکھا جائے کیونکہ تقاضائے طرت و قدرت یہی ہے کہ اسے جاری رہنا ہی چاہیے۔

۱۔ یہ نکتہ ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہیے کہ باہمی بدگمانیوں کا علاج بدگمانیوں سے نہیں ہو سکتا بلکہ گمانیوں کو دور کرنے کے لئے صبر و سکون کی ضرورت ہے۔ سب انسانی گروہ نہ خراب ہیں نہ بدگمان۔ ب گروہوں کے اچھوں کی تلاش اور ان کی امداد کی ضرورت ہے۔ بدگمانیوں کی تنی ہوئی کمانیں آپ اختیار میں نہیں۔ مگر معاملہ فہمی کی مسکراتی ہوئی ڈھالیں سامنے رکھنے سے کبھی غافل نہ رہا جائے۔

۲۔ مسلمانوں میں اگرچہ عام خیال یہی ہے کہ "اسلام" نام کا مذہب ہی سب سے اچھا مذہب ہے نجات یافتہ وہی آدمزاد ہیں جن پر "اسلام" نام کی مہر لگی ہوئی ہے لیکن مسلمانوں کی اس کمزوری کی نشاندہی نے والے وسعت نظر سے کام لے کر خود ہی غور فرمائیں کہ دنیا میں وہ کونسی جماعت یا انسانی گروہ ہے خود ستائی" اور "خود فریبی" کی اس کمزوری میں مبتلا نہیں۔ قوموں کا اختلاف، مذہبوں کا اختلاف سیاست ختلاف، رنگوں اور نسلوں کا اختلاف، رسم و رواج کا اختلاف، غرض کونسا اختلاف ہے جس میں لوگوں کی وش نہ ہو کہ ہم اچھے اور بہت اچھے اور دوسرے اگر برے نہیں تو ہم سے گھٹیا ضرور ہیں۔ حکیم شیرازی غلط نہیں کہا کہ ہر کسی کو اپنا آپ عقیل اور اپنا بیٹا جمیل ہی نظر آیا کرتا ہے۔

۳۔ جامعۂ ملیہ کے جشن زرین کے موقع پر مسلمانوں کی پسماندگی وغیرہ کے مسائل پر غور کرنے کے جو گروپ بیٹھا تھا۔ اس کے شرکا میں سے بعض بار بار یہ سوال اٹھاتے تھے کہ یہ مسلمان مسلمان کی ٹ کیوں لگائی جاتی ہے۔ اس میں علاحدگی پسندی کی بو نہیں بدبو آتی ہے۔ (گو لفظ نہ تھے مفہوم یہی یسا ہی تھا) کئی دوستوں نے اس پر اظہار خیال کیا۔ ایک موقع پر میں نے بھی باجازت صدر لب ائی کی جرأت کی تھی کہ لفظ مسلمان پر گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ جس طرح ہمارے آپ کے گھروں افراد کے جدا جدا نام ہوتے ہیں، اسی طرح جماعتوں یا پارٹیوں یا قبیلوں کے بھی جدا جدا نام ہوتے ۔ یہ جدا جدا نام کسی بزرگی اور سربلندی کے اظہار کی بجائے صرف باہم ایک دوسرے سے امتیاز کے ے ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے خاندان یا گھر کے جس فرد کو تکلیف ہوگی وہی شکایت کرے گا۔ محض اس کے نام

کی وجہ سے اس کی تکلیف کی طرف سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی ۔

۴۔ میں مانتا ہوں کہ ہم مسلمانوں میں اکثریت ایسی جماعتوں یا افراد کی ہے جو ہندو دھرم سے بیگانگی اور بے خبری کے سبب سے ہندو دھرم کو آسمانی دھرم نہیں سمجھتے اور یہ بے خبری مسلمانوں سے خاص نہیں۔ ہم سب اہل مذاہب ایک دوسرے کے دین دھرم سے بے خبری کا شکار ہیں ۔ لیکن اس کے خلاف تمام مختلف مذاہب کے ماننے والوں میں ایسے افراد موجود ہیں جو اپنی معلومات کی روشنی میں دوسرے مذاہب سے بھی حسن ظن رکھتے ہیں ۔

حق یہ ہے کہ ہماری اکثریت کا خیال نہ صرف ہندو دھرم سے بے خبری کا نتیجہ ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ خود قرآن حکیم اور رسول کریم کے ارشادات اور اپنے مذہب کے اہل دل اور اہل حال بزرگوں کے ملفوظات و تعلیمات سے بھی نا آگاہی کا پھل ہے۔ قرآن حکیم میں صاف و صریح لفظوں میں کہا گیا ہے کہ (الف) ہر قوم و ملت میں خدا شناسی کی سچی راہ دکھانے والے آتے رہے ہیں (ب) ہر قوم میں انہی کا بھائی انہی کی زبان اور بول چال میں خدا کا سندیسہ لاتا ہے ۔ (ج) قرآن حکیم یہ بھی کہتا ہے کہ اگر خدا کی طرف سے کوئی خدا نما، خدا آگاہ مرد نہ آتا اور اس قوم سے اس قوم کی غلطیوں اور اور غلط کاموں کی پوچھ ہوتی، تو وہ قوم خدا سے یہ کہنے کا حق رکھتی تھی کہ خدا سے پوچھے کہ یہ کیسا انصاف ہے کہ ہمیں پہلے حق و ناحق کا فرق بتایا اور سمجھایا نہیں گیا اور اب ہماری نادانیوں پر ہمیں مستحق سزا ٹھہرایا جاتا ہے۔

۔ یہ بات کوئی آج نہیں کہی جا رہی کسی سے ڈر کر نہیں کہی جا رہی ہے، اسی ہندوستان میں مسلمانوں کے دور عروج میں مسلمان اہل اللہ اور اہل علم و بصیرت نے اپنے اپنے مقام علم و عرفان سے اپنی اپنی زبان اور پیرایہ میں کہی ہے، جو قرنوں سے ان کی کتابوں میں چھپی ہوئی نہیں چھپی ہوئی موجود ہے اور مسلمانوں کا روشن ضمیر طبقہ اسے دہراتا چلا آیا ہے ۔ حتیٰ کہ اہل دل اور اہل علم ہی نہیں بعض مسلمان صاحب تاج و تخت نے بھی اس حقیقت کو اپنے اپنے رنگ میں نہ صرف کہا بلکہ برت کر دکھایا لیکن تنگ نظر لوگ نے اسے ایک سیاسی چال کہہ کر ادھر سے چشم پوشی کر لی ۔

اہل شرع و تصوف میں حضرت شیخ احمد سرہندی المعروف مجدد الف ثانی اور ان کے بعد

اہل دل اور اہل حال بزرگ حضرت مرزا مظہر جان جاناں شہید نے اپنے اپنے مکاتیب و ارشادات میں اس بات کا اظہار کیا۔ ان کے بعد دینی علوم کے بحر ذخار علامہ نواب سید محمد صدیق حسن خاں قنوجی ثم بھوپالی نے اپنی مشہور کتاب "خطیرۃ القدس" میں ان بزرگانِ سلف کی پیروی کی اور اس حقیقت کو دہرایا۔ ان کے علاوہ اور چھوٹے بڑے صاحب نظر حضرات نے اس صداقت کا نہ صرف اقرار بلکہ اعلان کیا۔ حضرت علامہ سید صدیق حسن خاں کے ہمعصر مولانا شاہ فضل رحمان گنج مراد آبادی نے جو شریعت و طریقت کے پیشوا اور اپنے زمانہ میں باعلم و عقل مجذوب مرد خدا تھے، اپنی کشفی آنکھ سے ہندوستانی پیغمبروں کے مزارات پر انوار کی نشاندہی کی۔ جس کا ذکر ان کے مطبوعہ ملفوظات میں موجود ہے۔ اگر مولانا سید فضل الحسن حسرت موہانی کو صرف انتہا پسند سیاست داں اور محض خوشگو شاعر یا رئیس المتغزلین کہہ کر بات کو اڑانہ دیا جائے تو میں کہوں گا کہ جس طرح سالہا سال سے انھوں نے یہ روش اختیار کر لی تھی کہ ہر سال حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ منورہ کے لئے جایا کرتے تھے اسی طرح ان کا یہ بھی محبوب طریقہ تھا کہ ہر سال شری کرشن کی جنم اشٹمی کے موقع پر متھرا اور ورنداون کی زیارت کے لئے جایا کرتے تھے کہ ان کو اس سرزمین سے خدا کے ہندی نبی و ولی کے آثار کی وجہ سے مشام جان ممدوح کو معطر کر دینے والی خوشبوؤں کا احساس ہوا کرتا تھا۔ ان کے علاوہ اور ہمارے اسی ملک میں اور بہت سے معلوم و نامعلوم مسلمان اہل علم و نظر بزرگواروں کی کمی نہیں رہی جن کا یہی اعتقاد تھا اور ہے۔

خیر یہ تو دوسروں کی داستان ہے۔ اگر اسے جسارت اور چھوٹا منہ نہ سمجھا جائے تو میں خود برملا اس کا اعلان کرتا ہوں کہ میں جو مسلمان عوام میں سے ایک عام مسلمان اور اسلام کا ادنیٰ نام لیوا اور قرآن حکیم کا ابجد خوان طالب علم ہوں کہ شری رام چندر جی خدائے پاک کے نبی اور پیغمبر تھے۔ شری کرشن خدا کے بادشاہ اور اور پیغمبر تھے۔ مہاتما بدھ خدا کے پیام بر تھے۔ مہاویر سوامی خداوند عالم کے برگزیدہ پیغمبر تھے۔ میں نے چاروں مہاتماؤں رشیوں اور پیغمبروں کے ارشاد و کلمات کا خوب غور سے مطالعہ کیا ہے۔ ان کی کلمات و ارشادات سے وہی روشنی پھوٹ رہی ہے جو قرآن پاک سے پہلے ظاہر ہونے والے انبیاء کلمات کا جوہر رہی ہے۔

الحمدللہ اس خیال کا ماننے والا جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا، صرف اکیلا میں ہی نہیں بلکہ علم دلچسپ
رکھنے والے اور بھی ہیں۔ وہ کمیت میں کم ہو سکتے ہیں کیفیت میں کم نہیں۔

رہی یہ بات کہ قرآن حکیم میں ہندی نبیوں میں سے کسی کا نام کیوں نہیں لیا گیا، اس بارے میں عر
ہے کہ ہم مسلمانوں کے روایتی اعتقاد کے مطابق ابتدائے آفرینش سے نبی کریم صلعم کی بعثت سے پہلے تک ایک
لاکھ بیس یا چوبیس ہزار نبی اور پیغمبر ظاہر ہوئے ہیں۔ مگر آپ دیکھ رہے ہیں کہ ہزاروں تو کیا ایک سو نب
کے نام بھی قرآن پاک میں درج نہیں ہیں۔ قرآن کریم نے یہ بھی نہیں کہا کہ میں نبیوں اور پیغمبروں کی پورا
فہرست پیش کرتا ہوں۔ لے دے کے ۲۶ یا ۲۷ نبیوں کے نام قرآن حکیم میں آئے ہیں۔ نہ وہ یہ کہتا
ہے کہ دنیا میں صرف یہی چند نبی یا خدا والے ظاہر ہوئے ہیں جن کے نام میں نے گنوا دئے ہیں بلکہ ا
کے برخلاف اس کا دعویٰ یہ ہے کہ خدا کے پیغام بر ہر قوم میں اسی قوم کی زبان میں ظاہر ہوتے اور خدا
پیغام اپنی اپنی قوم کو سناتے رہے ہیں۔ مثال کے طور پر ان میں سے چند کا نام، کام اور پیغام بتا او
دکھا دیا ہے اور اسی کے ساتھ یہ بھی کہدیا ہے کہ ایسے ہی پیامبرانِ خدائی، خدائی پیام کے ساتھ دنیا م
آتے رہے ہیں مگر ہم نے ان کا نام تم سے بیان نہیں کیا۔ البتہ جن پیغمبروں کا نام لیا ہے اور جن
نہیں لیا ان کا ازلی ابدی پیام صداقت ایک ہے جیسا کہ خدا ایک ہے۔ ویسا ہی خدا کا پیام ایک ہے
لانے والوں کا نام جدا جدا ہے۔ اور ان کی زبانیں الگ الگ ہیں۔ مگر اپنی روح اور مقصد کے لحاظ
سے ایک اور صرف ایک ہیں۔ بُعدِ زمان و مکان و اختلافِ زبان کے باوجود حقیقت ایک، تعلیم ایک
دعوت ایک اور مقصد سب کا ایک ہے۔ گو چند نبیوں کے نام لئے گئے ہیں مگر اس کا مطلب
نہیں کہ بس اتنے ہی نبی دنیا میں آئے ہیں۔ بلکہ نام نمونے کے طور پر ہیں کہ ایسے مردانِ حق کوش ہر
دور میں آتے رہے ہیں۔ نبی و رسول عربی اور پیغام بر، پیام بر، پیغمبر یا پیمبر فارسی لفظ ہیں ان لفظو
دنیا کی زبانوں میں تلاش کرنا غلط ہے۔ ہاں ان لفظوں کا مفہوم ادا کرنے کے لئے دوسری زبانو
اپنے اپنے لفظ اور اصطلاحیں استعمال کی ہیں۔ مانا کہ زبانیں جدا جدا ہیں مگر مفہوم ایک اور و
ایک ہے۔

۵۔ یہ بے خبری مسلمانوں سے خاص نہیں۔ سبھی اہل مذاہب کی اکثریت دوسرے مذاہب کی
ٰلیمات اصلی سے بے خبری کی بنا پر ان کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتی ہے۔ دوسرے مذاہب تو کیا
ٰ پوچھئے تو لوگ اپنے مذہب کی مغز و روح سے بھی غافل اور مذہب کے نام سے عموماً کچھ اوہام و خرافات
ٰ بتلاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی مروجہ کمزوریاں محاسن اور دوسروں کی ویسی ہی کمزوریاں غلطیوں اور
ٰانیوں کا ہالہ نظر آتی ہیں اور خود فریبی کے پردے سے ذرا باہر آ کر دیکھا جائے تو سب کے بزرگ
ٰرگ اور سب کی اصلی تعلیمات حقائق کا سرچشمہ اور اصلی رسوم جانِ دین و ایمان محسوس ہونے لگیں گی۔
ٰبے خبری کی کمزوری سے نہ مسلمان بچے ہوئے ہیں نہ دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کی اکثریت۔
۶۔ میرے نزدیک حسب تصریح بالا ہندوستان کی نام بردہ جماعتیں بھی اہل کتاب ہیں جیسا کہ قرآن
ٰاصطلاح اور زبان میں مسلمان، عیسائی اور یہودی اور زرتشتی اہل کتاب ہیں۔ اور قرآن حکیم تمام اہل کتا
ٰعتوں کو کھلم کھلا دعوت دیتا ہے کہ:

> "اے اہل کتاب ہم سب کم سے کم اس بات پر اتفاق کریں
> جو تم میں اور ہم میں مسلمہ طور پر ایک ہے۔ یعنی جس بات میں
> تمام آسمانی کتابوں کا اتفاق ہے۔ وہی سب دین دھرم اور
> آئین اور دستور العمل ہو جانا چاہئے۔"

۷۔ عام طور پر اگرچہ ایسا ہی ہوتا ہے کہ مسلمان ہندو وفات یافتگان کو "آنجہانی" اور مسلمان مردگان
ٰرحوم کے نام سے یاد کرتے ہیں مگر یہ کوئی بدگوئی یا بدزبانی نہیں، صرف اظہارِ حقیقت کی کئی صورتوں میں
ٰدو صورتیں ہیں، مگر یہ کوئی قاعدہ کلیہ نہیں کہ ہر مسلمان دنیا سے گزر جانے والے ہر غیر مذہب یا ہندو ہی
ٰ وفات پا جانے والے کا ذکر "آنجہانی" کے لفظوں ہی سے کرتا ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ہندو مر جانے
کے لئے "مرحوم" بھی بولا اور لکھا جاتا ہے اور یہ کوئی آج کی بات نہیں سالہا سال سے ایسا ہوتا چلا
ٰ اور ایسے جذبات کا ظہور ذاتی واقفیت اور تعلق قلبی کی بنا پر ہوتا ہے۔ چنانچہ اس وقت میرے سامنے
ٰعلامہ مولانا حافظ خواجہ الطاف حسین حالی پانی پتی کی سوانح حیات بعنوان "تذکرۂ حالی" جلد اول مرتبہ

شیخ محمد اسماعیل صاحب پانی پتی جو مولانا حالی کے جشن صد سالہ کے موقعہ پر اکتوبر ۱۹۳۵ء میں حالی بک ڈپو پانی پت کی طرف سے شائع کی گئی تھی کھل پڑی ہے۔ اس کے صفحہ ۱۵۲-۱۵۳ پر مولانا حالی کا ایک تعزیتی خط درج ہے جو آپ نے اپنے ایک عزیز دوست لالہ بہاری لال مشتاق دہلوی کی وفات پر بطور تعزیت مرحوم کے لڑکے لالہ چندو لال کو لکھا تھا اور جو حسب ذیل ہے:

"عزیزی و شفیقی سلمہ اللہ

آپ کی تحریر سے میرے نہایت دل دوست لالہ بہاری لال مشتاق مرحوم کی وفات کا حال معلوم ہوا۔ جس کا صدمہ کبھی دل سے فراموش نہیں ہو سکتا۔ میرے دہلوی دوستوں میں سے افسوس ہے کہ ایک خالص اور مخلص دوست کم ہو گیا جس کا بدل ملنا مشکل ہے۔ ایسے وضعدار، محبت کے پتلے، حاضر و غائب یکساں اور اپنے سکول کے فدائی۔ بہت کم ہوتے ہیں۔ خدا تعالیٰ اپنی رحمت سے ان کو بخشے اور ان کے عزیزوں اور دوستوں کو صبر عنایت کرے ... زیادہ دعا۔

الطاف حسین حالی از پانی پت

یکم اکتوبر ۱۹۰۸ء"

اس موضوع پر اس سے زیادہ اور کیا عرض کیا جائے۔ "جنت مکانی"، "خلد آشیانی"، "مرگ باشی"، "مرحوم"، "مغفور"، "متوفی"، "آنجہانی" وغیرہ وغیرہ صرف اتنی بات کے اظہار کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں کہ شخص مذکور "اس جہان فانی" سے "اس جہان باقی" میں پہونچ گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا۔

راقم مہر محمد خاں شہاب مالیرکوٹلوی معرفت ی۔ آر۔ ڈی۔ بیکس ابراہیم رحمت اللہ روڈ۔ بمبئی ۳	۲۵ فروری (چہار شنبہ) ۱۹۷۱ء

Regd. No. D - 768 April, 1971

The Monthly JAMIA

JAMIA NAGAR, NEW DELHI-25

جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

جامعہ

سالانہ چندہ چھ روپے | قیمت فی پرچہ پچاس پیسے

جلد ۶۴ | بابت ماہ مئی سنہ ۱۹۷۱ء | شمارہ ۵

فہرست مضامین

مدیر

ضیاء الحسن فاروقی

خط وکتابت کا پتہ

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

طابع وناشر: عبداللطیف اعظمی　　مطبوعہ: یونین پریس دہلی　　ٹائیٹل: ویال پریس دہلی

شذرات

۲۶ مارچ کی رات سے مشرقی پاکستان میں جسے اب وہاں کے لوگ بنگلہ دیش کہتے ہیں اور جس کی ایک آزاد اور جمہوری حکومت کا اعلان بھی ہو چکا ہے، آتش و آہن اور کشت و خون کا ایک قیامت خیز ہنگامہ برپا ہے، نہیں معلوم کہ کب تک یہ ہنگامہ برپا رہے گا، بچے یتیم اور عورتیں بیوہ ہوتی رہیں گی اور انسانیت کی آبرو انسان ہی کے ہاتھ لٹتی رہے گی۔ کتنی مائیں اپنے جیالوں کے لئے تڑپتی رہیں گی، کتنے بے گناہ لنگڑے، لولے اور اندھے ہوتے رہیں گے، اور دنیا کا ضمیر سوچتا رہے گا کہ ایسی قیامت میں جسے انسان نے قیامت سے پہلے ہی برپا کر دی ہے، بیدار ہونا چاہئے یا نہیں۔ یہ قیامت اس قوم نے برپا کی ہے جسے دعویٰ ہے کہ کتاب وسنت کے ساتھ اسے قیامت کے دن پر بھی پورا یقین ہے، یعنی وہ قوم جو کتاب وسنت، انبیاء کرامؑ اور قیامت اور آخرۃ کے نام پر قائم کی گئی تھی اور جسے اسلامی مساوات کا بھی بہت دعویٰ ہے۔ ایک ہی وقت میں گفتار کی بلندی اور کردار کی پستی کے ایسے واقعات تاریخ انسانی میں روز روز نہیں بلکہ عرصہ کے بعد رونما ہوتے ہیں۔

مغربی پاکستان کے بہت سے 'پیرانِ حرم' یہ روایتی اور عہد وسطیٰ کا فقہی نظریہ پیش کرتے ہیں کہ مشرقی پاکستان میں بنگالیوں نے 'بغاوت' کی ہے اور شریعت میں حکومت کے خلاف بغاوت، اور وہ بھی جو "اسلامی حکومت" ہو، ایسا جرم ہے جو کسی طرح گوارا نہیں کیا جا سکتا۔ ہم اس تصور کو، جہاں تک کہ حکومت پاکستان کی نوعیت کا جو فوجی جبر وطاقت پر قائم ہے اور مشرقی پاکستان کے باشندوں کے جمہوری حقوق کا تعلق ہے، ان "حاملین شریعت" کے سینوں کی بے نوری سے تعبیر نہ کریں تو کیا کریں کہ

بنگلہ دیش کے لوگ اپنے قانونی اور اخلاقی حق کا مطالبہ پاکستان کے گزشتہ انتخابات کے نتائج کی بنیاد پر کر رہے تھے۔ ان انتخابات میں عوامی لیگ اپنے چھ نکاتی مینوفیسٹو کے ساتھ شریک ہوئی تھی، اور یہ بات روز روشن کی طرح عیاں تھی کہ عوامی لیگ کیا چاہتی ہے۔ پاکستان کے باشندوں کی اکثریت نے عوامی لیگ اور اس کے حق میں اپنا فیصلہ دیا تھا، اب اس کے بعد دیانتداری اور جمہوریت دوستی کا تقاضا یہ تھا کہ پاکستانی عوام کی ساورنٹی کو تسلیم کرتے ہوئے منتخب شدہ قومی اسمبلی کو دستور بنانے اور پھر اس کے مطابق سول گورنمنٹ کے قیام کا موقع دیا جاتا۔ اس لئے ہمارا خیال ہے کہ خالص شرعی نقطہ نظر سے بھی یہ بغاوت نہیں ہے، یہ پاکستان کے فوجیوں، کروڑپتی تاجروں اور قدیم طرز کی بیوریوکریسی کے حامیوں کی سازش ہے اور اس کا جواب بنگلہ دیش کے مجاہدین آزادی اپنے خون سے دے رہے ہیں۔

بنگلہ دیش کی جدوجہد آزادی نے اس نظریے کی بھی دھجیاں اڑا دی ہیں کہ قومیت کی بنیاد مذہب پر ہے اور چونکہ ہندوستان کے مسلمانوں کا مذہب دوسروں سے مختلف ہے اس لئے ان کا اپنا ایک الگ وطن ہونا چاہئے۔ مرحوم مسٹر جناح نے مسلم قومیت کی عجیب وغریب تعریف کرتے ہوئے یہ اعلان کیا تھا کہ ہندوستان میں اپنے اپنے مذہب کی بنا پر ہندو اور مسلمان دو قومیں ہیں، اُس وقت جن مسلم رہنماؤں نے اس دو قومی نظریے کی مخالفت کی تھی وہ مسلم لیگ مرحوم کے نزدیک مسلمانوں کے دشمن قرار دئے گئے تھے، علامہ اقبال نے اپنے رومانی جوش خروش اور مذہبی عینیت کے زعم میں شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رح کے اس بیان پر کہ اس زمانے میں قوموں کی بنیاد ادیان پر نہیں اوطان پر ہوتی ہے، جو قطعہ لکھا تھا وہ علامہ کی رومانیت پسندی پر ہمیشہ کے لئے شاہد کی حیثیت سے زندہ رہے گا۔ تقسیم سے پہلے جب مولانا مدنی رح مسلمانوں کو دو قومی نظریے اور مجوزہ قیام پاکستان کے نقصانات کی باتیں بتاتے تو انہیں مسلم دشمن کہا جاتا تھا۔ مولانا آزاد مرحوم آخر وقت تک تقسیم کے مخالف رہے، وہ بہت بولے، بہت کچھ مسلمانوں کو سمجھایا، لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ تقسیم ہند کے سلسلے میں بعد میں انہوں نے اپنی کتاب انڈیا ونس فریڈم میں جو کچھ لکھا، اس سے انکی سیاسی فراست اور دوراندیشی کا پتہ چلتا

ہے۔ انھوں نے تحریر فرمایا کہ مسٹر جناح اور ان کے پیرو غالباً یہ محسوس نہیں کر سکے کہ جغرافیہ ان کے خلاف تھا۔ مسلمانوں کی اکثریت کے علاقے ۔۔۔۔ شمال مغرب اور شمال مشرق میں واقع تھے۔ ان علاقوں کے درمیان کسی طرح کا طبعی اختلاط نہیں ہے۔ ان کے باشندے سوائے مذہب، ہر اعتبار سے ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہیں۔ یہ کہنا عوام کو بدترین دھوکا دینے کے مترادف ہے کہ مذہبی اتحاد ان علاقوں کو متحد کر سکتا ہے جو جغرافیائی، اقتصادی، لسانی اور ثقافتی اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہوں، پہلی چند دہائیوں یا زیادہ سے زیادہ پہلی صدی کے بعد اسلام صرف اپنی بنیاد پر سب مسلم ممالک کو ایک اسلامی ریاست میں متحد نہیں رکھ سکا۔" تقسیم ہند کے تیئیس ۲۳ برس بعد آج مشرقی پاکستان نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ مسٹر جناح کا نظریہ کس قدر مہمل اور غلط تھا اور قوم پرور مسلم رہنماؤں کا طرز فکر کتنا صحیح اور مبنی بر حقیقت تھا۔ یہ باتیں ہم نے اس لئے نہیں لکھی ہیں کہ اس سے پرانے زخموں کو کریدنا مقصود ہے، بلکہ صرف یہ مقصد ہے کہ مسلمانوں کو چاہیئے کہ صحیح، تعمیری اور حقیقت پسندانہ طرز فکر اختیار کریں، پُر جوش اور جذباتی نعروں کو خیرباد کہیں، منفی انداز نظر ترک کر کے اِثبات و اقدام کی روش اپنائیں اور اس طرح ماضی میں غلط فیصلوں سے جو نقصان پہونچا اُس کی تلافی حال میں مثبت طرز عمل اور صحیح انداز فکر سے کریں تاکہ ان کی آنے والی نسلوں کا مستقبل تو اچھا اور روشن بن سکے۔

یہ حقیقت ہے کہ مغربی پاکستان، خصوصاً پنجاب کے لوگوں نے بنگالیوں کو کبھی اپنے برابر نہ سمجھا، انسانی مساوات اور اسلامی مساوات، دونوں نعمتوں سے انھوں نے اہل بنگال کو محروم رکھا، بنگال کے عوام آج سے نہیں پچھلے دو سو برس سے ظلم و جبر، استحصال بالجبر، اور معاشی غارت گری سے لڑ رہے ہیں، حاجی شریعت اللہ اور دودو میاں کی تحریکوں سے جو لوگ واقف ہیں وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ بنگلہ دیش کے لوگ ظالم و جابر عناصر کے خلاف، چاہے وہ سرمایہ دار کی شکل میں ہوں، چاہے زمیندار اور پنڈی کے "فوجدار" کی صورت میں ظاہر ہوں، لڑتے آئے ہیں اور آج بھی لڑ رہے ہیں۔ مطالبۂ پاکستان سے متعلق لاہور ریزولیوشن (۱۹۴۰ء) پر اگر دیانتداری سے عمل ہوتا تو، ۱۹۴۷ء میں

'مشرقی بنگال' اور 'مغربی پاکستان' کی شکل میں دو آزاد مملکتیں قائم ہوتیں، مگر انگریزوں کی سازش اور مسلم لیگی لیڈروں کی جوشیلی اور جذباتی سیاست نے ایسا نہ ہونے دیا۔ پھر مشرقی بنگال کو ایک کالونی سمجھ کر اس کو لوٹا اور برباد کیا گیا۔ بنگالیوں کی زبان اور ثقافت کو بدلنے کی کوشش کی گئی، غرض اسلام کے نام پر مغربی پاکستان کے سرمایہ داروں، ارباب اقتدار اور سرکاری ملازموں نے جنھیں کبھی جماعت اسلامی اور کبھی علماء کی دوسری جماعتوں کی تائید حاصل ہوتی تھی، بنگالیوں کو خوب خوب لوٹا، لیکن وہ برداشت کرتے رہے، صبر کرتے رہے اور آخر جب ایک بار اپنی رائے کے اظہار کا موقع ملا تو انھوں نے اپنے مطالبات جمہوری طریقہ سے پیش کر دئے۔ لیکن یہ طریقہ مغرب والوں کی پسند کے مطابق نہیں تھا۔ اس لئے انھوں نے ایسی صورت حال پیدا کر دی کہ خود پاکستان کی قبر کھودی اور اب اس میں مذہب کی بنیاد پر نظریۂ قومیت اور پاکستان دونوں کو دفن کر رہے ہیں۔ بنگلہ دیش اور مغربی پاکستان کے بیچ اب نہتے اور بے گناہ بنگالیوں کی لاشوں کی ناقابل تسخیر دیوار حائل ہو گئی ہے۔ بنگلہ دیش بنگالیوں کی لاشوں سے اُبھر رہا ہے، ہو سکتا ہے کہ مغربی پاکستان اپنی موجودہ فوجی طاقت سے اس اُبھرتے ہوئے دیش کو کچھ دنوں تک اور دبائے رکھے، لیکن وہ دن زیادہ دور نہیں جب ایک نئی قوم نئی مملکت بن کر رہے گی۔ اور اس کا جھنڈا پدما ندی کی کشتیوں اور اسٹیمروں پر لہرائے گا جن کے مسافر 'آمار سونار بنگلہ ...' آزادی اور جذبے کی پوری شدت کے ساتھ گائیں گے اور فضا کو نغمہ زار بنا دیں گے۔

ذاکر صاحب کی ایک تقریر

محترم وائس چانسلر صاحب اور دوستو،

میں اپنے لئے بڑی سعادت سمجھتا ہوں کہ اس مبارک موقع پر آپ کے ساتھ ہوں۔ ناب وائس چانسلر صاحب کا ممنون ہوں کہ گرو گوبند سنگھ بھون کا سنگ بنیاد رکھنے کے لئے نوں نے مجھے منتخب فرمایا ہے۔ لیکن میں آپ سے اقرار کرتا ہوں کہ میں شرم کے مارے گڑ گیا ب انھوں نے میرے سلسلے میں اس مرد خدا، اس عارف کامل حضرت میاں میر ولی کا ذکر فرمایا ن کے دست مبارک سے دربار صاحب کا سنگ بنیاد امرتسر میں رکھا گیا تھا۔ مجھ حقیر گنہگار کا نام ں سلسلے میں کیسے لیا جا سکتا ہے،

چہ نسبت خاک را با عالم پاک

ا یقین اور ایمان کی دنیا میں بڑے اپنے بڑائی سے چھوٹوں کو اور اچھے اپنی اچھائی سے بروں کو برابر سہارا دیتے آئے ہیں۔ کاش آپ کی ذاکر نوازی کے طفیل میں مجھے بھی اس رگاہ سے خلوص اور دیانت اور خدمت خلق کے جذبے کی کچھ تھوڑی سی بھیک ارزانی دجائے۔

نوٹ: ۲۷ر دسمبر ۱۹۶۷ء کو پٹیالہ یونیورسٹی میں گرو گوبند سنگھ بھون کا سنگ بنیاد ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم نے رکھا تھا۔ اُن کی یہ تقریر اسی موقع کی ہے۔

وائس چانسلر صاحب، آپ نے مجھ پر ایسا بڑا اکرم فرمایا ہے اور مجھے ایسا شرف بخشا ہے کہ دل سے شکر گذار ہوں اور سوچتا ہوں کہ کاش اس کا کچھ تو مستحق ہوتا۔

بہرحال، میری دلی مبارکباد قبول فرمایئے کہ آپ نے ایک بہت اہم اور اچھے کام میں پہل کی ہے۔ مذہبوں کے تقابلی مطالعہ کا انتظام جس خوبی سے ہمارے ملک میں ہو سکتا ہے دوسری جگہ دشوار ہے، لیکن دوسرے بہت کچھ کام کر رہے ہیں اور ہم ابھی پہلا ہی قدم اٹھا رہے ہیں۔ لیکن جب قدم اٹھ جائے گا تو یقین ہے کہ ہم جلد جلد آگے بڑھیں گے، اس لئے کہ ہماری قومی سرشت میں کثرت کے اندر وحدت ڈھونڈنا، تضادوں کو مٹانا، یکجہتی پیدا کرنا ہے، اس لئے کہ ہمارے وطن، ہمارے گھر کی افتاد ہی کچھ ایسی ہے۔ بھارت جو ہمارا گھر ہے ہم اس کی ایک جھائی اس بھولے کے کام میں دیکھ پائیں گے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ اس دیش کے ہر بھارتی کا سمبندھ خود اس کی سمجھ میں جب آتا ہے جب وہ اس گھر کے معنی ٹھیک ٹھیک سمجھ لے، جان لے۔ گھر آدمی کے لئے رنگ رنگ کے معنی رکھتا ہے۔ بچے کا گھر اس کی ماں کی گرم گرم پیار سے بھری گود ہوتی ہے۔ بڑھتا ہے تو ماں باپ کی جھونپڑی ہو یا محل، بالک اور بالکا کا یہ گھر ہو جاتا ہے۔ پھر ہوتے ہوتے سارا گاؤں یا محلہ گھر گنے لگتا ہے۔ پھر آس پاس کی بہت سی چیزیں، دیکھے بھالے پیڑ، چہچہاتی چڑیاں، جانے بوجھے، پہچانے آدمی اور جانور، سب ہی اس گھر کا سامان بن جاتے ہیں۔ ہوتے ہوتے چیزوں سے آگے بڑھ کر یہ گھر اپنے اندر وچاروں اور آدرشوں کو سمیٹ لیتا ہے۔ سنسکرتی جس پر دوسرے آدمیوں نے، بھانت بھانت کے آدمیوں نے، اپنے مستشک کی، اپنی آتما کی، شکتیاں سلاری ہیں۔ دھارمک باتیں، کلائیں، ساہتیہ، اتہاس، اگلوں کی باتیں اور اگلوں کے کام کی یادیں، اور نہ جانے کیا کیا اس گھر کا سامان بن جاتا ہے۔ گھر کا آنگن ہوتے ہوتے سارے دیش کو گھیر لیتا ہے، سارے دیش کے بسنے والے اپنے ہی گھر کے رہنے والے بن جاتے ہیں۔ دیش کا راج نیتک سنگھٹن، نیائے اور نیکی پر چلنے والے راجیہ اپنے اتہاس کی ساری دولت کے ساتھ، اپنی سنسکرتی کے سارے انمول خزانوں کے ساتھ، اپنے بڑوں کی ساری بھلائیوں اور اپنے اچھوں کی سارا

اچھائیوں کے ساتھ اس گھر کا حصہ بن جاتے ہیں۔ ماں کی گود سے گاؤں اور محلہ، پاس والا ٹیلا اور نزدیک سے گذرنے والا نالہ، پھر پرانت، پھر اپنی بھاشا بولنے والے، ایک دھرم پر چلنے والے گھر میں آجاتے ہیں اور بڑھتے بڑھتے گھر میں کیا نہیں ہو جاتا ہے۔ ہمالیہ اور وندھیاچل، گنگا اور جمنا، برہمپتر، کرشنا اور کاویری، بدری ناتھ اور رامیشورم، دوارکا اور جگناتھ پوری، رام اور کرشن، گوتم بدھ اور بھگوان مہابیر، شنکراچاریہ اور رامانج، اشوک اور اکبر، نانک اور کبیر گوبند سنگھ، معین الدین اجمیری اور خواجہ نظام الدین، سورداس، تلسی داس اور میرابائی، کالیداس اور تلسی داس، غالب اور انیس، والٹ‌سول اور ٹیگور، گاندھی اور ابوالکلام، جواہرلال نہرو — یہ سب اور بہت سے اور ان کے نام، ان کے کام سب گھر بن جاتے ہیں اور ان سے وہی سکھ ملتا ہے، وہی گرمی ملتی ہے، وہی سہارا ملتا ہے، وہی شکتی ملتی ہے جو پہلے پہل ماں کی گود سے ملی تھی۔ اس بڑے گھر سے وہی محبت، وہی لگاؤ ہو جاتا ہے جو اس گود سے تھا، اس کی سیوا اور اس کی حفاظت کی وہی لگن دل میں لگ جاتی ہے جیسے ماں کی سیوا اور ماں کی رکھشا کی۔

مجھے پوری آشا ہے کہ اس بڑے گھر میں جس کا نام ہندوستان ہے، آپ کی اس پنجابی یونیورسٹی کا یہ نیا بھون، ”گرو گوبند سنگھ بھون“ آپ سب کے وچاروں میں بھی گھر کی اس کلپنا کو مضبوط بنائے گا۔ اس بھون کو جس عظیم شخصیت کے نام کے ساتھ آپ نے وابستہ کیا ہے، مجھے یقین ہے کہ اس میں کام کرنے والے اور اس سے فیض اٹھانے والے اس کا پورا پورا حق ادا کریں گے۔

گرو گوبند سنگھ جی کی ساری زندگی قربانی، محنت، تعلیمی سرگرمی اور فوجی قابلیت، انتظامی صلاحیت، بے مثال شجاعت، بے حساب شفقت، اتھاہ محبت، ان تھک ہمت کی انوکھی کہانی ہے۔ اس کہانی میں دل ہلا دینے والی سختیاں بھی ہیں اور دل بڑھانے والی کامرانیاں بھی، اور جو بھولے پن یا نادانی میں اپنے کو یہ دھوکا دینا چاہے کہ کامیابیاں سختیوں کے بغیر بھی حاصل ہو سکتی ہیں اسے یہ کہانی صاف صاف سمجھا دیتی ہے کہ اللہ والوں کی زندگی کا، اچھی، پاک، باعزت زندگی کا سودا اتنا سستا سودا نہیں ہوتا۔ گرو گوبند سنگھ جی جیسی سوجھ بوجھ، ہمت اور

قوت اور یقین کے لوگ دنیا میں روز روز پیدا نہیں ہوتے۔ پھر کون سی قربانی ہے جو اس مرد خدا نے بارگاہ الٰہی میں پیش نہیں کی۔ باپ کی قربانی پیش کی، اپنی آنکھوں کے تاروں اپنے دلاروں کی قربانی پیش کی، جاں نثار ساتھیوں جن پر بیٹوں سے زیادہ شفقت تھی، ان کی قربانی پیش کی، گردش میں رہے، مصیبتیں جھیلیں، کڑیاں بیلیں، بے وفائیاں سہیں، آخر اپنی جان کی قربانی دی۔ اور ساری زندگی میں ایک لمحے کے لئے، ہمت اور بہادری کے پُر شوکت پہاڑ کو بھلا جنبش تو ہوئی ہو۔ جو یوں اپنے مقصد پر اڑتا ہے، یوں مخالفتوں سے جم کر لڑتا ہے، تاریخ اسے کامیابی سے کب محروم رکھ سکتی ہے۔ پہاڑی راجاؤں کی آئے دن کی مخالفتیں اور عداوتیں اور مقامی عہدہ داروں کی سازشیں اور رقابتیں، بے رحمیاں اور سفاکیاں اور مغل سلطنت کی طاقت اور جبروت اور گھمنڈ اور غرور، سب ہی سے تو ٹکر لینی پڑی اس شیر کو، مگر اس نے جو ٹھانی تھی کہ نیکی اور سچائی کی حمایت کے لئے، غیروں تک کو ظلم اور دباؤ سے بچانے کے لئے، ایک خدا کے نام کا بول بالا کرنے کے لئے، اسی کے سامنے جھکنے اور کسی اور سے نہ ڈرنے والی خدا پرست اور خدا ترس جماعت بنا جائے، وہ بات اس نے پوری کر دی اور خالصہ کی بنیاد رکھ دی، پائدار اور نہ ہلنے والی بنیاد۔

یہ ایسا عظیم الشان کارنامہ ہے کہ اس کی وجہ سے تاریخ کے صفحوں پر گرو گوبند سنگھ جی کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا اور تاریخ کے صفحوں ہی پر نہیں بلکہ بے شمار انسانوں کے دلوں میں جن کو اس نام سے طاقت اور توانائی ملتی رہے گی، جن میں اس نام سے پاک امنگیں اور نیک حوصلے پیدا ہوتے رہیں گے، جن کو اس سے سچ پر اڑنے اور سوائے خدا کے اور کسی سے نہ ڈرنے کا سبق بھی ملتا رہے گا اور اس سبق پر چلنے کی ہمت بھی۔

جب تک ظلم اور زبردستی کے خلاف انسان کی طبیعت میں فطری نفرت زندہ ہے، جب تک ضمیر کی دھیمی دھیمی مگر صاف پکار کو کسی بڑی سی بڑی سیاسی طاقت کے ڈر اور دباؤ سے چپ نہ ہونے دینے کی ہمت آدمی میں ہے، جب تک حق پر اڑنا

ور انصاف کے لئے مرنے کی تڑپ آدمی کے دل میں ہے۔ جب تک سماجی ناانصافیوں
ور مذہبی لفظ پرستیوں سے، کھوکھلی رسم اور اندھے رواج سے بیزاری، اچھوں
ور سچّوں کا شیوہ ہے اس وقت تک دنیا گرو نانک جی اور ان کے اس
ظیم المرتبت جانشین گرو گوبند سنگھ جی کو نہیں بھول سکتی۔ آپ نے اس تھون
ران کا نام دیا ہے تو ان کی اچھائیوں کو اپنے کام کا مرکز بنائیے۔

عبدالحق عدنان ادیوار
تلخیص و ترجمہ : ضیاء الحسن فاروقی

ترکی میں مشرق و مغرب

پروفیسر عبدالحق عدنان ادیوار نے یہ مضمون ۱۹۴۷ء میں لکھا تھا اور اسی سال مڈل ایسٹ جرنل کے جولائی کے نمبر میں شائع ہوا۔ پروفیسر ادیوار انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے ترکی ایڈیشن کے اڈیٹر بھی تھے۔ ترکی کے صف اول کے عالموں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ اس مضمون کو میں نے پڑھا تو اپنے ملک کے مسلمانوں کی علمی تاریخ نگاہوں کے سامنے پھر گئی اور وہ فکری کشمکش بھی جو انیسویں صدی کے اواخر سے آج تک طبقۂ علماء اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں جاری ہے۔ قدامت اور تجدد کا کبھی دبی اور کبھی کھلم کھلا، یہ کشمکش کہاں جا کر ختم ہوتی ہے، نہیں معلوم۔ لیکن ہندی مسلمانوں کی نئی نسل کو یہ مسئلہ حل کرنا ہے۔ آزادی کے بعد اس نے کچھ اور نوعیت اختیار کر لی ہے، اس لئے اس مسئلہ کو نظرانداز کرنے کے بجائے اس سے نظر ملانی ہے اور مسلمان رہتے ہوئے عہد حاضر کے چیلنجوں کا جواب دینا ہے۔ شاید اس مضمون سے کسی کو کچھ روشنی مل سکے۔

'مدیر'

آج فکر اسلامی اور مغرب کے افکار کے باہم اثرانداز و اثرپذیر ہونے کے مسئلے نے خصوصی اہمیت حاصل کر لی ہے۔ لیکن یہ مسئلہ نیا نہیں ہے۔ ایک ہزار برس سے زیادہ کا عرصہ گذرا کہ یہ صورت حال رونما ہوئی تھی۔ عربوں ہی کی طرح ترک بھی اس مسئلے سے دوچار ہوئے، کیونکہ ترک تقریباً پانچ سو برس

ملک دنیائے اسلام کے صف اول کے مجاہد بن کر رہے ہیں۔ ایک لحاظ سے، ترک اسلامی تہذیب اور یوروپی تہذیب، دونوں کے لئے اجنبی تھے اور اس طرح اس پوزیشن میں تھے کہ ان دونوں تہذیبوں میں کسی حد تک ہم آہنگی اور مطابقت کی صورت پیدا کریں۔ لیکن ترک یہ تاریخی رول ادا نہ کر سکے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی مذہبی اذعانیت سے اپنے آپ کو آزاد نہ کر سکے۔ بہرحال یہ کوشش اب بھی جاری ہے اور پہلے کے مقابلہ میں آج اس کی ضرورت کا احساس اور کامیابی کی امید کچھ زیادہ ہے۔

گیارہویں صدی کے اوائل میں ترکوں نے اسلام قبول کیا اور اسی کے بعد وہ پہلی بار اُن فلسفیوں کی کتابوں کے وسیلے سے جو عربی زبان میں لکھتے تھے، یونانی، یعنی مغربی افکار سے روشناس ہوئے۔ اسلامی فتوحات کے شروع کے دنوں میں وہ اسلام کی مسلسل کامیابیوں کو پائدار تصور نہیں کرتے تھے، لیکن عرب اسٹیٹ نے اپنے سماجی اور معاشی امور کو جس خوبی اور مہارت سے منظم کیا، اس سے ان کے دل میں اسلام کی قدر کا جذبہ پیدا ہوا، اس کے علاوہ اسلام کا حقیقت پسندانہ کردار، اس کا عقیدۂ توحید اور فوجی نظم وضبط ترکوں کے مزاج کے عین مطابق تھا۔ جب وہ مسلمان ہوگئے تو دوسرے مذاہب کے مقابلہ میں وہ نہ صرف اپنے نئے مذہب کے پُرجوش محافظ بن گئے، بلکہ خود اسلام کے اندر جو فرقے اور آزاد خیال جماعتیں تھیں، اُن کے بھی سخت مخالف بن گئے۔

گیارہویں صدی کے مشہور ومعروف ریاضی داں ابوریحان البیرونی نے لکھا ہے کہ اُس وقت صورت یہ تھی کہ اسلامی تہذیب وتمدن ایک طرح سے یونانی تہذیب وتمدن کی توسیع بن کر رہ گیا تھا۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یونانی علوم وفنون کے اثرات کچھ زیادہ نتیجہ خیز نہیں ثابت ہوئے۔ فلاسفہ دینی اور فلسفیانہ مسائل پر تبادلۂ خیال کرتے اور کتابیں لکھتے تھے، لیکن فکر اسلامی نمایاں طور پر جامد ہو کر رہ گیا تھا، اس کے ارتقاء پر عام طور سے جیسے فنا کا سایہ پڑنے لگا تھا۔ ہاں، عقلیت پسند معتزلہ کے علاوہ کچھ دوسرے آزاد خیال اور آزاد رو فرقے ضرور تھے جن میں ذہنی ترقی کے آثار نظر آتے تھے۔ مسلم فلاسفہ میں فارابی نے جو ترک نسل سے تعلق رکھتا تھا، قرآن

میں بیان کئے گئے اسلامی تصورات اور ارسطوئی اور افلاطونی فلسفے میں تطابق پیدا کرنے کی کوشش کی ۔ مسلمان فلسفیوں میں وہ پہلا شخص تھا جس نے مشرق کے فلسفے میں نو افلاطونیت کو نمایاں جگہ دی اور اس مسئلہ کو بھی کہ وحی الہٰی کا علمی طرز استدلال سے کیا تعلق ہے، سب سے پہلے فارابی نے ہی اٹھایا ۔ اسی طرح وہ پہلا مسلم فلسفی ہے جس نے مذہب میں متصوفانہ تجربے کی اہمیت کا اعتراف کیا، یعنی اس نے فکر اسلامی کے دو اہم شعبوں، آرتھوڈوکسی اور تصوف، دونوں کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا ۔ بعد میں فارابی کے اپنے خیالات میں مذہبی اذعانیت نے جگہ لے لی اور اس سے اسلامی آرتھوڈوکسی کی بنیادیں بتدریج مضبوط ہوتی رہیں، یہاں تک کہ بارہویں صدی میں امام غزالی کے ہاتھوں اس فکری عمل کو تکمیل ہو گئی ۔ لیکن صوفیانہ افکار زمانہ حال تک ارتقاء و انحطاط کی منزلوں سے گذرتے رہے اور آخر میں وہ ایک طرح کے ہمہ اوست کے عقیدہ کی شکل میں سامنے آئے ۔ عقل سے قطع نظر وجدان و جذبات کے سہارے تصوف مختلف جماعتوں کی صورت میں ظاہر ہوتا رہا جو مواخاۃ کے اصول پر قائم تھیں اور جو اپنے اپنے طریقہ سے ترک دنیا کی تعلیم دیتی تھیں ۔ لیکن اس نے بھی انجام کار اپنے فلسفیانہ کردار اور توانائی کو کھو دیا اور بے جان اور جامد ہو کر رہ گیا ۔

تیرھویں صدی میں فکرِ اسلامی اس منزل میں تھا، جب ایشیائے کوچک (اناطولیہ) کے پلیٹو پر سلجوق پھیل گئے ۔ سلجوق ترک آج کے ترکوں کے مورثِ اعلیٰ کہے جا سکتے ہیں ۔ سلجوقیوں کے مدرسوں میں فقہ اور کلام کی تعلیم ہوتی تھی، دوسرے علوم کو کوئی اہمیت نہیں حاصل تھی ۔ اسی صدی کے دوسرے نصف میں، مشہور صوفی شاعر اور فلسفی مولانا جلال الدین رومی ، جو اس وقت قونیہ میں رہتے تھے، بڑے افسوس سے اس کا ذکر کیا کرتے تھے کہ فلسفیانہ مباحث کے سلسلے میں عام جہالت پھیلی ہوئی ہے ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ علوم عقلیہ اور یونان کا نظری فلسفہ دونوں کا اس علاقہ میں پتہ نہیں تھا جسے آج کا ترکی کہتے ہیں ۔

سلطنت عثمانیہ کے قیام کے کوئی ڈیڑھ سو برس بعد، یعنی پندرھویں صدی میں فکر اسلامی

جو درسوں میں پایا جاتا تھا، کلام، بلاغت و بیان اور فقہ و اصول فقہ کے علاوہ کچھ اور نہ تھا۔ نظری فلسفہ اور علوم عقلیہ فکر یونانی کے دو ستون تھے اور ان ستونوں کو نویں اور دسویں صدی میں مشرق کے فلسفیوں نے از سر نو تعمیر کیا تھا، تیرہویں صدی کے آخر میں یہ اگر پورے طور پر ڈھے نہیں گئے تھے تو کم از کم ان کی بنیادیں تو ہل ہی چکی تھیں۔ چند مستثنیات سے قطع نظر اس عہد میں ہمیں وہ تنقیدی، تحقیقی اور فلسفیانہ اسپرٹ کہیں دکھائی نہیں دیتی جو یونانی فلسفے کی بنیادی خصوصیت تھی۔

یہی وہ زمانہ ہے جب جواں سال[1] سلطان محمد فاتح نے ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ فتح کیا اور یہاں بیٹھ کر اپنے یوروپی ہمسایوں سے قریبی تعلقات قائم کئے۔ قدرت نے سلطان کے دل میں ذہن و فکر کے سہارے علمی تجسس کی تڑپ کوٹ کوٹ کے بھر دی تھی، پھر مسلمانوں کے ایک غیر روایتی اور بدعتی فرقے، حروفی، سے اس کا تعلق رہ چکا تھا اور اس تعلق کی وجہ سے بھی علمی تجسس اس کی طبیعت ثانیہ بن چکی تھی، قسطنطنیہ میں بساط سلطنت جماتے ہی اس نے فلسفے کے مشائی مکتب خیال اور علوم یونانی کی طرف توجہ کی جن کے اثر سے بعد میں مغربی یورپ میں حکمانہ فکر و نظر کی بنیادیں ہل گئیں۔ سلطان محمد نے عیسائی مذہب کا مطالعہ بھی شروع کیا اور اس سے مغرب میں یہ خیال پیدا ہوا کہ نوجوان سلطان عیسائی مذہب اختیار کرنے کا ارادہ رکھتا ہے لیکن اصلیت یہ ہے کہ سلطان محمد دو بڑے مذاہب اسلام اور عیسائیت کا تقابلی مطالعہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ مابعد الطبیعی علم میں بھی پوری مہارت حاصل کرنے کا آرزومند تھا، تاکہ وہ عقل اور وحی کے فرق کو سمجھ سکے۔ اس کے عہد حکومت میں ۔۔۔۔۔ کلامی فلسفے اور علوم یونانی کا بہت چرچا تھا اور شائقین علم کے لئے اس سلسلے میں بڑی آسانیاں مہیا تھیں۔ بحث و مباحثہ کی مجلسیں (سمپوزیم) برپا ہوتی تھیں، جن میں مقامی اور دوسرے ملکوں کے علماء مدعو کئے جاتے تھے،

۱۔ سلطان محمد فاتح کی عمر اس وقت تیئیس۲۳ سال تھی۔

ان مجلسوں میں تبادلۂ خیال اور بحث ونظر کے خاص موضوع مابعد الطبیعی اور فلسفیانہ مسائل ہوتے تھے اور اکثر یہ مجلسیں کئی کئی دن تک جاری رہتی تھیں۔ مختصراً یہ کہ سلطان محمد کی جسے ہم مشرق کی بھی ایک عظیم شخصیت کہہ سکتے ہیں اور مغرب کی بھی، کوشش یہ تھی کہ اسلامی اور مغربی تہذیب پر ایک دوسرے کے اثر سے کوئی نئی اور ترقی پذیر تہذیب ابھرے اور بندھے ٹکے نظام فکر کی جگہ کوئی تنقیدی فکر لے لے ——— لیکن ہمیں یہ تسلیم ہے کہ اس ذہین اور ذی علم سلطان کی کوششوں کا کوئی پائدار نتیجہ نہیں نکلا، اور ترکی ایک بار پھر عہد وسطیٰ کی ظلمت پسندی کی طرف لوٹ گیا اور یہ صورت حال انیسویں بلکہ بیسویں صدی کے اوائل تک باقی رہی۔ ۱۴۵۳ء سے لے کر ۱۶۹۹ء تک جب کارلووِٹز کا صلحنامہ ہوا، ترک فوجیں وسط یورپ تک پہونچ گئیں اور ترکوں نے مغربی یورپ کی قوموں سے تعلقات قائم کئے۔ لیکن ان فوجی فتوحات سے دونوں دنیاؤں میں کوئی ذہنی وفکری رابطہ نہیں ہو سکا۔

سلیمان اعظم کے عہد میں ترکی اپنی علاقائی توسیع کی معراج پر پہونچ گیا۔ اس کے باوجود، شوکت وعظمت کے اس دور میں بھی سیاسی اور انتظامی ترقیوں کے ساتھ فلسفے اور علمی نقطۂ نظر کی پرورش وپرداخت نہیں ہوئی۔ اور یہ ضروری بھی نہیں کہ قومی اور سیاسی ترقیات کے ساتھ تہذیب وتمدن کا سنہری دور بھی آئے۔ ان عظیم الشان فتوحات کے بعد بھی فکر اسلامی کا جمود جوں کا توں قائم رہا اور ترکی میں نشاۃ ثانیہ کے مہر امکان کا گلا گھونٹ دیا گیا۔ سترھویں صدی کے مشہور عالم کاتب چلبی نے جو مغرب میں حاجی خلیفہ کے نام سے مشہور ہیں، اپنی کتاب میزان الحق میں، جو درحقیقت قدیم فلسفے اور علوم کے دفاع میں قلمبند کی گئی تھی، ترکی کی اس ذہنی فضا کا بڑی تلخی سے ذکر کیا ہے جس نے وہاں کی دانش گاہوں سے ان علوم کو دیس نکالا دے دیا۔ اُس کے اس ایک جملہ ہی سے اِس ذہنیت کی سخت تنقید کا اندازہ ہو جائے گا: "اب لوگ کائنات کو بیل کی آنکھوں سے دیکھا کریں گے۔"

۱۷۱۶ء میں ترکی میں کچھ معمولی قسم کی اصلاحات کی گئیں، اور یہی وہ سال ہے جب

مغربی فکر سے نہیں تو کم از کم مغربی تکنیک سے ترکوں کی واقفیت کا آغاز ہوا۔ اس ابتدائی اصلاحی پروگرام کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے ملٹری انجینئرنگ اسکول کے نصاب میں جدید ریاضی کا مضمون شامل کیا گیا۔ ۱۷۲۸ء میں ترکی کے مشہور ایڈیٹر اور پرنٹر، ابراہیم متفرقہ نے ترکی کا پہلا مطبع (پرنٹنگ پریس) قائم کیا اور ڈپر ملرکر مغربی علوم وتمدن کے موضوع پر اپنی لکھی یا ایڈیٹ کی ہوئی کتابیں چھاپنی شروع کیں۔

دراصل انقلاب فرانس ہی وہ واقعہ ہے جس کی بدولت ایک نئی آئیڈیولوجی سامنے آئی۔ یہ انقلاب بظاہر سیاسی تھا لیکن اس کے پیچھے عہد جدید کی وہ پرزور تحریک تھی جس نے ارباب دانش کے ذہنوں میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا تھا۔ سلطان سلیم (سوم) اس سے متاثر ہوا اور اس نے مغربی تہذیب وتمدن کی طرف اپنی توجہ مبذول کی، اگرچہ اس کی یہ توجہ فن جنگ سے متعلق علوم ہی تک محدود رہی۔ انیسویں صدی کے اوائل میں جدید طرز کا میڈیکل کالج کھولا گیا۔ یہ بھی جدیدیت کی طرف ایک قدم تھا لیکن مغرب کے فکر وفلسفے کی ترجمانی کے لئے یہ بھی ناکافی تھا۔

آخرکار ۱۸۳۹ء میں بڑے پیمانے پر اصلاحات کا وہ دور شروع ہوا جسے ترکی کی تاریخ میں عہد تنظیمات کہا جاتا ہے۔ سیاسی زندگی کے تمام شعبوں میں اس کے اثرات محسوس کئے گئے، فرد کے حقوق سے لے کر عدالتوں کی تنظیم تک، ہر مرحلہ میں اصلاحات کا چرچا ہوا، یہاں تک کہ ترکوں کے سماجی رسم ورواج بھی اس کے اثرات سے محفوظ نہیں رہے۔ اسکولوں اور کالجوں میں سائنس کی تعلیم ہونے لگی اور اسلامی فکر وفلسفے اور مغرب کے فکر وفلسفے میں روابط بڑھے، لیکن اس کے باوجود دونوں انداز فکر میں کوئی مفاہمت نہ ہو سکی کیونکہ اسٹیٹ کی ماہیت میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی تو وہ یونی کی توں جبر اور تھیوکریسی کے نظریہ پر قائم رہی اور اس کی وجہ سے دونوں نظام فکر کے علمبرداروں کے مابین آزادانہ تبادلۂ خیال نہ ہو سکا۔ یہی نہیں بلکہ ۱۹۰۸ء کے نوجوان ترک انقلاب (YOUNG TURK REVOLUTION) تک کا یہ دور جدید سائنس کے مقابلہ میں اسلام کے دینی اصولوں کے پرجوش دفاع کا دور ہے، یہاں تک کہ دانشؤ

اور معذرت خواہانہ لٹریچر تیار کرنے میں وہ دانشور بھی شامل ہوگئے جنھوں نے مغرب کی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کی تھی، اُنھوں نے اُن مذہبی خیالات کی حمایت کی جن سے سائنس و علمی حقائق کی نفی ہوتی تھی۔ یہ وہ دانشور تھے جن کی زندگیوں میں مغربی تہذیب پورے طور پر داخل ہوگئی تھی، خیال ہوتا ہے کہ ان مصنفوں کے اصل خیالات وہ نہیں ہوتے تھے جن کی حمایت وہ اپنی معذرتی تحریروں میں کرتے تھے۔ غالبًا اس کی وجہ یہ تھی کہ حکومت کی سنسرشپ سخت تھی اور ترک معاشرہ کا یہ اجماع ہوگیا تھا کہ پرانے نظام کا دفاع بہر قیمت کرنا ہے۔ مغربی فکر و فلسفے کے نفوذ کے خلاف حکومت کا رویہ اتنا سخت تھا کہ سلطان عبدالحمید دوم کے دورِ حکومت کے آخری دنوں میں اور ۱۹۰۸ء کے انقلاب سے پہلے سرکاری حکم کے مطابق حکمت (PHILOSOPHY) کا لفظ لغات سے نکال دیا گیا تھا۔

لیکن جدید فلسفے اور سائنس اور آزادانہ مطالعہ کے خلاف ان مدافعتی تحریروں اور پُرجوش اعلانات کے باوجود، مغربی افکار کی اشاعت ہوتی رہی۔ احمد مدحت کی مثال لیجیے جو معذرتی لٹریچر تیار کرنے میں پیش پیش تھا اور جس نے جے۔ ڈبلیو۔ ڈریپر کی کتاب HISTORY OF THE CONFLICT BETWEEN RELIGION AND SCIENCE کا ترجمہ کیا تھا اس نے اس کتاب کے ضمیمہ میں جو ڈریپر کے خیالات کی تردید میں لکھا گیا تھا صاف صاف یہ دعویٰ کیا ہے کہ اسلام میں کوئی چیز ایسی نہیں جو سائنس کے خلاف ہو۔

اس طرح کی مثالوں سے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ عہدِ تنظیمات کے بیشتر ترک دانشور اپنی مشرقی ذہنیت اور تہذیب اور قدیم افکار و خیالات سے آزاد نہیں ہوسکے تھے اگرچہ انھوں نے عہدِ جدید کے تکنیکی عناصر کو اپنا لیا تھا۔ ایسے دانشور بہت کم تھے جنھوں نے یہ ہمت کی ہو کہ اسلامی عقائد اور جدید سائنس میں تطابق اور ہم آہنگی پیدا کریں، اور جن چند دانشوروں نے ایسا کیا وہ بدقسمتی سے کامیاب نہیں ہوسکے۔ ہاں، آٹومن سوسائٹی آف سائنس (۱۸۶۷-۱۸۶۱) جس کی عمر بہت مختصر ثابت ہوئی، ایک ایسا ادارہ ضرور تھا جو پورے طور پر مغربی افکار کا حامی

اور مبلغ تھا۔ اس نے تطابق اور ہم آہنگی کی کوشش نہیں کی بلکہ کھلے طور پر مغربی خیالات کی اشاعت کرتا رہا۔ اس سے کچھ ایسے ترک عالم وابستہ ہو گئے تھے جو کم از کم ایک یورپین زبان جانتے تھے اس سوسائٹی نے مجموعۂ فنون نام کا رسالہ جاری کیا، ترکی زبان کا یہ پہلا رسالہ تھا جس میں جدید فلسفے پر معیاری مضامین شائع ہوتے تھے۔ مجموعۂ فنون کے لکھنے والوں میں ممتاز افراد وہ تھے جنھوں نے انگلستان میں تعلیم حاصل کی تھی، اس لئے ان کے مضامین میں اینگلو سیکسن تصنیفات کے اثرات نمایاں تھے۔ علمار رسوم کے کٹرپن کا کچھ خیال کئے بغیر یہ لوگ علمی اور فلسفیانہ مباحث پر آزادی کے ساتھ اظہار خیال کرتے تھے۔ افسوس ہے کہ یہ سوسائٹی اور اس کا ترجمان مجموعۂ فنون دونوں بہت کم عمر نکلے۔ لیکن جب تک یہ علمی تحریک چلتی رہی، اس کی یہ خصوصیت برقرار رہی کہ مدرسوں کے ذریعہ پھیلنے پھولنے والی مذہبی تقلید سے آزاد ہو کر غور و فکر کیا جائے، اس نے قدیم وجدید میں تطابق اور ہم آہنگی کی ناکام کوشش سے بھی اپنے آپ کو الگ رکھا۔

مجموعۂ فنون کی اشاعت کے بند ہونے کے بعد سلطان عبدالحمید دوم کی حکومت نے فلسفیانہ خیالات کے اظہار پر، بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ فکر و فلسفہ پر، سخت پابندی عائد کر دی اور آزاد خیال اور روشن دماغ دانشوروں کو چن چن کر اپنے مظالم کا نشانہ بنایا۔ اس طرح ترکی میں عہد تنظیمات کے آخری برسوں میں مشرق اور مغرب کے افکار و خیالات میں باہم دگر اثرانداز اور اثرپذیر ہونے کی کسی علامت یا آثار کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ پھر بھی، ان تمام رکاوٹوں کے باوجود ادب میں مغرب کے افکار و نظریات اپنی جگہ پیدا کرتے رہے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ترکی زبان کے ثروت فنون نامی دبستان ادب اور اسی نام کے اس کے ادبی جریدے میں اس کی جد و جہد جاری رہی۔

۱۹۰۸ء میں نوجوان ترک انقلاب کا واقعہ رونما ہوا، اس کی نوعیت خالصتاً سیاسی تھی۔ لیکن اسی کے ساتھ اس وقت ذہنی و علمی سرگرمیاں بھی شروع ہو گئیں جب استنبول یونیورسٹی کا فنون و ادبیات کی فیکلٹی کے نصاب تعلیم میں فلسفہ اور مذاہب کے تقابلی مطالعے جیسے مضامین

کو جگہ دی گئی۔ سیاسی آزادی نے آزاد تحقیق کے لئے راہ ہموار کردی تھی، اس لئے اس کے امکان بھی پیدا ہوئے کہ مذہبی افکار کا تنقیدی مطالعہ کیا جائے۔ نئے دستوری نظام کے پہلے برس ہی میں نوجوان قلم کاروں نے انیسویں صدی کے سادہ لوح مادہ پرست مصنفین، مثلاً لڈوگ بخنر اور ارنسٹ ہیکل کی کتابوں کے ترجموں کا کام شروع کر دیا۔ والٹیر اور روسو اور اسی طرح اٹھارہویں صدی کے دوسرے انسائیکلو پیڈیا والے مفکرین و مصنفین کا بھی خوب چرچا ہوا اور ان کے خیالات و نظریات پر آزادی کے ساتھ بحث ہونے لگی۔

اسی زمانے میں دانشوروں کے قدامت پرست طبقہ میں مذہبی احیاء کا رجحان پیدا ہونے لگا۔ ان کی ہمنوائی معذرتی و مدافعتی لٹریچر لکھنے والوں کے ایک نئے مکتب خیال نے بھی کی۔ اس سے صاف ظاہر ہوگیا کہ قدیم و جدید میں جو اب تک ایک دوسرے سے دور ہی رہے تھے، سخت قسم کا اختلاف اور تصادم شروع ہونے والا ہے۔ ابھی تک یہ تصادم کچھ دبا دبا سا تھا اگرچہ ایک حد تک یہ کہا جاسکتا ہے کہ مغربی فکر نے اسلامی فکر کے خلاف ایک جارحانہ رویہ اختیار کر رکھا تھا۔

تذبذب اور غیر یقینی کی اس فضا میں ترک ماہر عمرانیات ضیا گوکلپ نے دونوں جماعتوں کے مابین، جو ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہوگئی تھیں، فکری مفاہمت کی ایک معقول راہ نکالنے کی کوشش کی۔ اس نے اپنی تحریروں کے ذریعہ مغرب کے علمی نظریات اور مسلمانوں کے مذہبی افکار میں تطابق پیدا کرنا چاہا۔ وہ فرانسیسی ماہر عمرانیات، دُرخائم (DURCKHEIM.) کا سچا پیرو تھا۔ اس نے کہا کہ سویلزیشن (تمدن) اور کلچر (تہذیب) میں فرق ہے۔ اس کا خیال تھا کہ دونوں میں کمی بیشی کئے بغیر، مغربی تمدن اختیار کر لینا اور اپنی قومی تہذیب کو برقرار رکھنا چاہئے۔ اس نے اپنے ہموطنوں سے بار بار کہا کہ ہمیں نہ تو اسلام اور اسلامی تہذیب کو نظر انداز کرنا ہے اور نہ مغربی تمدن کو۔ گوکلپ نے صاف صاف لکھا کہ ثبوتی سائنس اور اس کی تکنیک کو اختیار کرنا ضروری ہے۔ لیکن فلسفے کے بارے میں اس کا ذہن صاف نہیں تھا۔ اس

نے یہ تو کہا کہ ترکوں کا اپنا ایک قومی فلسفہ ہونا چاہیے لیکن یہ نہیں بتایا کہ وہ فلسفہ کیا ہے۔ اس
نے درخائم کی عمرانیات اور برگساں کے روحانی فلسفے سے پوری طرح استفادہ کیا تھا، لیکن
بی اس نے ان دونوں میں تطبیق کرنے کی کوشش نہیں کی اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ کام
سان بھی نہیں تھا۔

ترک نوجوانوں کی جماعت اتحاد و ترقی کی مرکزی کمیٹی کے بہت سے اراکین اس کے ہم خیال
ر دوست تھے، اُن پر اور اس کے اپنے شاگردوں پر اس کے افکار و خیالات کا بھرپور اثر
ا۔ اُسی کے اثر سے ترکوں کے عائلی قوانین میں جو فقہ حنفی کے مطابق تھے، اس سے پہلے کے
لمان فقہاء کی تعبیرات کے مطابق جو زیادہ لبرل تھیں، ضروری تبدیلیاں کی گئیں۔ وہ ترک معاشرہ
ں اصلاح، اور خاص طور سے مذہبی اصلاح کا حامی تھا اور اس نے یہ بات چھپائی نہیں۔ بہت
ے موقعوں پر اس نے کہا کہ ریفارمیشن سے پہلے عیسائی مذہب بھی جدید تمدن کو گوارا کرنے
لئے آمادہ نہیں تھا۔ ضیا گوکلپ کی اس اصلاحی تحریک کا ترجمان اتحاد و ترقی کی مرکزی کمیٹی کی
ادے سے نکلنے والا جریدہ ینی مجموعہ (YENI MEJMUA) تھا، اگرچہ اس وقت بھی
ے اسٹیٹ کا کیریکٹر دینی تھا، خلیفہ اس کا مقتدر اعلیٰ تھا جس کی شخصیت دینی اور دنیوی دونوں
ح کے پورے اختیارات کا مرکز تھی۔

ضیا گوکلپ سے ایک افسوسناک غلطی سرزد ہوئی اور وہ یہ کہ اس نے 'عنعا' لفظ کا
بہ 'لادینی' کیا۔ اس غلطی کا نتیجہ یہ ہوا کہ شیخ الاسلام کی قیادت میں علماء کی جماعت ان تمام
وں کی مخالف ہو گئی جنھیں گوکلپ پھیلانا چاہتا تھا۔ صراط مستقیم نام کا جریدہ جو اس وقت شائع
ا تھا رجعت پرستوں کے نقطۂ نظر کا ترجمان بن گیا۔ بعد میں اس جریدہ کا نام سبیل الرشاد ہو گیا۔
ں میں گوکلپ کی لبرل تحریک کے حامیوں پر طنز و تشنیع اور دشنام طرازی کی بھرمار ہوتی تھی۔ اُن
خیالات کو اسلام دشمن بتایا جاتا تھا اور کفر و الحاد کے فتوے دیے جاتے تھے۔ تاریخ ترکی
اس مخصوص دور میں حکومتیں بدلتی رہیں، اور اصلاح دشمن جماعتوں نے بغاوتیں بھی کرائیں، مقصد

یہ تھا کہ اتحاد و ترقی کے اراکین و رہنماؤں کو مسلمانوں کا دشمن قرار دیا جائے کیونکہ وہ تجدد و اصلاح کا کچھ کام کرنا چاہتے تھے۔ لبرل عناصر پر جتنی سختیاں ہوئیں اتنی ہی اشاعت ان کے خیالات کی ہوئی اور یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس دور میں فکر اسلامی اور فکر مغرب کے ایک دوسرے پر اثر انداز ہونے کے آثار نظر آنے لگے۔

۱۹۱۲ء کے بعد طرابلس اور بلقان کی جنگیں ہوئیں اور پھر ساری دنیا جنگ کے نرغے میں آگئی، ان حالات کی وجہ سے ینی مجموعہ سے متعلق نوجوان لبرل گروپ کو اس کا موقع نہیں ملا کہ فکر و دانش کی سرگرمیوں کے لئے کچھ وقت نکال سکتا۔ جنگ عظیم کے خاتمہ کے بعد عارضی صلح کے زمانے میں ہر چیز کی طرف سے بے حسی اور بے نیازی کی کیفیت تھی، جیسے ترک قوم ہر بات سے اکتا گئی ہو۔ اس زمانے کے ترک مصلحین میں ہمیں ایک طرح کی موقع پرستی کا احساس بھی ہوتا ہے۔ اس وقت ترکی پر مغربی یورپ کی قابض فوجوں کا غلبہ تھا۔ قابض فوجوں نے اگرچہ ایک طرف عورتوں کی آزادی اور جائز انسانی حقوق کے نظریے کی بہت افزائی کی، لیکن دوسری طرف اس نے سیاسی اور مذہبی حلقوں کے رجعت پرستوں سے مفاہمت بھی کرلی اور اسلام کے نام پر ایسے اصولوں کی تائید کی جو تعصب اور تنگ نظری پر مبنی تھے، مسلسل تین جنگوں کی ماری ہوئی قوم کو اس کے مصائب و آلام کے دنوں میں مذہب ہی سے روحانی تقویت مل سکتی تھی، خواہ وہ مذہب کی غلط تعبیر اور مذہبی اصولوں کی گمراہ کن تاویل ہی کیوں نہ ہو۔

استنبول میں ترکوں کی جو حکومت تھی، وہ قابض فوجوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کی مانند تھی۔ اس حکومت نے ترک دشمن اقوام کے ایجنٹوں کی مدد سے عوام کے مذہبی جذبات کو بھڑکایا تاکہ ترکی کے مختلف صوبوں میں قابض فوجوں اور کمزور اور محکوم سلطان و خلیفہ کے خلاف جو شورش برپا ہوگئی تھی اُسے دبایا جاسکے۔ چند ہی دن بعد عوام کی یہ شورش آزادی اور خود مختاری کی مضبوط اور منظم تحریک بن گئی جو چار سال کی اَن تھک جدوجہد اور بے پناہ قربانی کے بعد ترکوں کی فتحمندی کی صورت میں ظاہر ہوکر رہی۔ ظاہر ہے کہ زندگی اور موت کی اس کشمکش میں ترک قوم تہذیبی و تمدنی مسائل

غور و فکر نہیں کر سکتی تھی، آزادی کی تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے مشرق و مغرب کے تصادم یا ان میں ہم آہنگی کا قصہ آنے والے عہد امن و سلامتی پر ملتوی کر کے، تحریک کے سربراہوں کو اکثر ان علماء سے بھی رواداری اور نرمی برتنی پڑی جو ترکی کو ظلمت پسندی کی راہ سے کسی قیمت پر ہٹنے نہیں دینا چاہتے تھے۔

انقرہ میں جب ترکوں کی نئی حکومت مستحکم ہو گئی تو اس نے ۱۹۲۳ء میں "سلطنت" کا خاتمہ کر دیا۔ لیکن استنبول میں ابھی خلیفہ باقی رہا اگرچہ دنیوی اقتدار سے اس کو محروم کر دیا گیا۔ دو برس بعد خلافت کا بھی خاتمہ ہو گیا اور اسی کے ساتھ مذہبی عدالتوں اور دوسرے اداروں کو ختم کر دیا گیا۔ مدرسے اور خانقاہیں بند کر دی گئیں اور ترک جمہوریہ کے دستور کی ایک دفعہ کے ذریعہ LAICISM (سیکولرزم) کے اصول کو ریاست کی بنیاد قرار دیا گیا۔ وہ مسلم دانشور بھی جو اسلام کے لئے معذرت خواہانہ رویہ اختیار کئے ہوئے تھے، متحرک تھے، وہ ایک طرف تو مذہب اسلام اور فکر اسلامی کی مدافعت کر رہے تھے اور دوسری طرف ان کی یہ کوشش بھی تھی کہ فکر اسلامی کو نیچرل اور سائنٹفک قوانین کے مطابق ثابت کریں۔ وہ LAICISM کے صحیح معنی بھی تلاش کرنے میں مصروف تھے۔ یہ بات ایک طرح سے قابل تحسین تھی کیونکہ اس سے مخالفت کے بجائے دونوں طرف سے رواداری کی فضا پیدا ہوئی۔ لیکن نئی نویلی ترک جمہوریہ کسی طرح اس کے لئے آمادہ نہیں تھی کہ فکر اسلامی کے ساتھ کوئی رعایت کی جائے۔ اس نے اگرچہ ترک عوام کی قدیم مذہبی روایات اور رسوم کو برداشت کر لیا، مگر سیاست کو مذہب سے بالکل الگ تھلگ رکھنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ اس وقت مغرب ذہنوں پر اس طرح غالب تھا، بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ مغرب کا ثبوتی فلسفہ (POSITIVISM) اس طرح چھایا ہوا تھا کہ اسے ہم اس وقت کی "حکومت کا لامذہبیت کا عقیدہ" کہہ سکتے ہیں۔ اس وقت سے لے کر اب تک ترک جمہوریہ کی فکری اساس سائنٹفک ثبوتی فلسفہ رہا ہے۔ ریاست و حکومت کے پورے تانے بانے میں اور ان کے مختلف اداروں میں ثبوتیت کے تین بنیادی اصول — خیر، حق اور حسن — ہی کارفرما نظر آتے ہیں۔ ترکوں کی دو نسلوں کی پوری ذہنی تربیت

اسی ماحول میں ہوئی ہے، ان کی اکثریت سرکاری طور پر مذہبی تعلیم سے محروم رہی ہے اور جس طرح ماضی میں اسلامی عقائد پر ترک بچوں اور نوجوانوں کا یقین ہوتا تھا کہ وہ مسلم خاندانوں میں پیدا ہوتے تھے اسی طرح مغرب کا اثباتی فلسفہ ان نسلوں پر ریاست کے جبر اور حکومت کی سیاسی پالیسی نے لاد دیا ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ آج بھی ترکی کی تاریخ فکر و نظر میں کسی ایسے دور کا سراغ نہیں ملتا جب مسلسل ایک معقول مدت تک آزاد اور تنقیدی نقطۂ نظر نے مغرب کے افکار اور اسلامی نظریات کے باہم اثر انداز اور اثر پذیر ہونے کے عمل کو جاری رکھا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ ترکی میں صحیح معنوں میں یہ عمل وجود ہی میں نہیں آیا، بلکہ جو کچھ اثر ہوا ہے وہ یکطرفہ ہوا ہے اور مغرب کے فکر و فلسفے ہی کا اثر ہوا ہے۔

ڈاکٹر شانتی رنجن بھٹاچاریہ

ہندوستان میں میڈیکل تعلیم کی ابتدار

اگر ہندوستان کے کسی شہر کو جدید ہندوستان کا تاریخی شہر قرار دیا جاسکتا ہے تو وہ شہر بیشک کلکتہ ہے۔ یہی وہ شہر ہے جو ہندوستان میں انگریزوں کا پہلا پایۂ تخت بنا اور جہاں سے یورپی علوم سائنس تہذیب و تمدن، سماجی اور سیاسی تحریکیں ابھریں اور پورے ہندوستان کو متاثر کیا۔ یہ شہر جدید ہندوستان کا معمار قرار دیا جاسکتا ہے۔

جدید ہندوستانی زبانوں کی نثر کی ترقی میں بھی اِسی شہر نے ابتدائی حصّہ لیا۔ ان زبانوں میں مقامی زبان بنگلہ کے علاوہ اردو اور ہندی بھی شامل ہیں۔ انگریزوں کو چونکہ ہندوستانی زبانیں سیکھنے کی ضرورت تھی اس لئے انھوں نے کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم کیا جہاں ہندوستانی زبانوں کے عالم اور پنڈت انگریز طلبار کو سول سروس کے لئے اردو، ہندی، بنگلہ، تلگو، مراٹھی وغیرہ عوامی زبانوں کے علاوہ سنسکرت، عربی و فارسی زبانوں کی تعلیم دیتے تھے۔ اس کالج کے نصاب تعلیم کے لئے جدید ہندوستانی زبانوں میں سینکڑوں کتابیں لکھی گئیں۔ ہندوستان کے کونے کونے سے ہندوستانی زبانوں کے عالم اِس شہر میں آکر بس گئے اور یہ شہر علم و ادب کا مرکز بنا۔

انگریزوں کو ہندوستانی زبانوں سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ نہ وہ ہندوستانی عوام کی فلاح و بہبود کے خواہاں تھے اور نہ ہی ہندوستان کی ترقی سے انھیں کوئی دلچسپی تھی۔ وہ اس کے

بھی خلاف تھے کہ ہندوستانیوں کو یورپی علوم کی تعلیم دی جائے۔ انگریز تو صرف یہی چاہتے تھے کہ ان کی حکومت کے قدم مضبوط ہوں اور ہندوستانی اتنی انگریزی سیکھ لیں کہ وہ کلرکی کا کام انجام دے سکیں۔ لارڈ میکالے نے اپنی تعلیمی رپورٹ (فروری ۱۸۳۵ء) میں واضح الفاظ میں ان خیالات کا اظہار کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے "ہمیں ہندوستان میں ایک ایسی جماعت تیار کرنی ہے جو ہمارے اور ہماری رعایا (جن پر ہم حکومت کرتے ہیں) کے درمیان ترجمان کا کام انجام دے کے اور یہ جماعت ایسی ہونی چاہیے جو خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو لیکن مذاق، رائے، خیالات، اخلاق اور سوجھ بوجھ کے اعتبار سے انگریز ہو۔" یعنی انگریز ہندوستانیوں کو محض غلامانہ ذہنیت والے کلرک بنا کر رکھنا چاہتے تھے۔ اس کے باوجود ہندوستانی عوام نے جدوجہد کے بل پر نہ صرف اپنے وجود کو برقرار رکھا بلکہ علم وفن کے ہر میدان میں ترقی کی۔

ہندوستانی عوام کی جدوجہد اور اُن کی ترقی میں چند مخلص انسان دوست غیر ملکیوں نے بھی ہاتھ بٹایا ہے۔ اس حقیقت سے اِنکار کرنا تاریخی ناانصافی ہوگی، مثلاً ڈیروزیو، انڈروس، اینی بسنت اور بہن نیویدیتا وغیرہ، جن کا نام ہمیشہ عزت واحترام سے لیا جائے گا۔ ان مخلص انسان دوستوں کے علاوہ سیکڑوں ایسے غیر ملکی بھی ہیں جنھوں نے حالات اور ضرورت کے تحت ایسے کام انجام دیئے ہیں جن سے مجموعی طور پر ہندوستانی سماج کو فائدہ پہونچا اور ترقی کے لئے راستہ ہموار ہوا ہے۔

جب وارن ہیسٹنگز نے کلکتہ کو برطانوی ہندوستان کا پایۂ تخت قرار دیا اس وقت سے کلکتہ کی رفتارِ ترقی تیز ہوئی، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ انگریزوں نے جان بوجھ کر ترقی کے سامان پیدا کئے۔ جیسا کہ کہا جا چکا ہے، انگریز ہندوستانیوں کو کسی طرح کی جدید تعلیم دینے کے خواہاں نہیں تھے اور ظاہر ہے وہ ہندوستانیوں کو یورپی میڈیکل تعلیم دینا بھی نہیں چاہتے تھے لیکن جس طرح آدمی کے لئے یہ ضروری ہے کہ جس گائے کا وہ دودھ پینا چاہے، اس کی تندرستی پر بھی نظر رکھے، کیونکہ اگر گائے کی صحت سلامت نہ رہے، اُسے مستقل غذا نہ ملے، تو وہ زیادہ

دودھ نہیں دے گی۔ بالکل اسی طرح اپنے اغراض کے تحت انگریز بھی ہندوستانیوں کو جدید میڈیکل
تعلیم دینے پر مجبور ہوئے۔

آج جس جگہ کلکتے کا عالی شان اور ہنگامہ خیز شہر آباد ہے، وہاں سترھویں صدی کی ابتدا میں
ایک گھنا جنگل کھڑا تھا جو کہ بنگال کے مشہورِ عالم جنگل "سندربن" کا ایک حصہ تھا جس جنگل کے شیر
آج بھی "شیر بنگال" کے نام سے مشہور ہیں۔ اس گھنے جنگل کو کاٹ کر کلکتہ آباد ہوا۔ انگریزوں کا پایۂ تخت
اور تجارتی مرکز ہونے کی وجہ سے اس شہر کی آبادی دیکھتے دیکھتے بڑھ گئی۔ نہ صرف اطراف کے
اضلاع سے بلکہ ہندوستان کے کونے کونے سے لوگ روزگار کی تلاش میں یہاں آ کر بس گئے۔
لیکن ابتدائی ترقی کے زمانہ میں یہاں صحت عامہ کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ سندربن کا علاقہ ہونے
کی وجہ سے یہاں مچھر حد سے زیادہ تھے اور بخار سے سیکڑوں جانیں ہر سال موت کی نذر ہو جاتی تھیں۔
اس علاقے میں زہریلے سانپ بھی بکثرت تھے اور سانپ کے کاٹے سے بھی ہزاروں جانیں جاتی
تھیں۔ یہاں چند انگریز ڈاکٹر تھے لیکن عوام اُن کی فیس ادا کرنے کے قابل نہیں تھے قدیم کلکتہ کے
حالات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف چند رئیس ہی اِس لائق تھے کہ انگریز ڈاکٹروں سے علاج
کرائیں، مثلاً جب راجا رام موہن رائے بیمار ہوئے تب ڈاکٹر ہالڈ (ایم۔ ڈی) نامی ایک انگریز
نے ان کا علاج کیا تھا۔

راجا رام موہن رائے پہلے ہندوستانی ہیں جن سے ہندوستان کا "دورِ بیداری" شروع ہوتا
ہے۔ آپ ہندوستانیوں میں سب سے پہلے سماج سیوک، صحافی اور عوامی رہنما ہیں۔ راجا رام موہن
رائے کی علم دوستی، زبان دانی، سماجی اور صحافی خدمات، رسم ستی کے خلاف تحریک اور سفرِ انگلستان
وغیرہ کے حالات سے تو کم و بیش ہر طالب علم واقف ہے لیکن صحت عامہ کے لئے انھوں نے
جو کیا ہے اُس پر کسی نے خاص توجہ نہیں دی ہے، حالانکہ ہندوستان میں میڈیکل تعلیم کو پھیلانے
اور ہندوستانی زبانوں میں جدید یورپ کی میڈیکل تصانیف کا ترجمہ کرنے پر سب سے پہلے
راجا رام موہن رائے نے ہی توجہ دیا تھا۔ انھوں نے ہی وہ منصوبہ تیار کیا تھا جس پر عمل

کر کے انگریزی ادویات پر ہندوستانی زبانوں میں انگریزی کتابوں کا ترجمہ شروع کیا گیا اور اس سلسلے کی پہلی کڑی "اوشد سار سنگراہ" نامی بنگالی زبان کی کتاب ہے جو ۱۸۱۹ء میں چھپی اور جس کے ترجمہ کا شرف رام کمل سین کو حاصل ہے۔ ہندوستانی زبانوں میں یہی سب سے پہلی میڈیکل کتاب ہے۔ اس میں ۶۵ طرح کی انگریزی ادویات پر اعداد ان کے طریقہ استعمال، مقدار خوراک، اور کن کن امراض میں وہ کام آتی ہیں، ان سے متعلق تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ رام موہن رائے نے اپنے بنگلہ اخبار "سنباد کومودی" (۲۰ دسمبر ۱۸۲۱ء) میں یہ تجویز رکھی کہ ہندوستانی ویدوں کو چاہئے کہ دیسی ادویات کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ لوگ کچھ عرصہ کسی انگریز ڈاکٹر کے تحت کام کریں تاکہ انگریزی طریقہ علاج سے بھی واقف ہو جائیں اور اس طرح دیسی اور انگریزی ادویات سے واقف ہو کر دیسی طبیب بہتر طور پر عوام کی خدمت کر سکیں گے۔ رام موہن رائے اور ان کے ساتھیوں کی جدوجہد اور کوشش سے آخر دسمبر ۱۸۲۶ء میں کلکتہ سنسکرت کالج کا ایک خاص آیورویدک شعبہ کھولا گیا جس میں آیورویدک طریقہ علاج کی تعلیم دی جانے لگی۔ پہلے سال میں طلباء کی تعداد صرف سات تھی۔ یہاں کھودی رام بشارد نامی ایک تجربہ کار کوی راج طلباء کو تعلیم دیتے تھے۔

۱۸۲۳ء تک اردو اور ہندی میں میڈیکل کتابیں لکھنے یا ترجمہ کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی اور نہ ہی کسی نے اردو یا ہندی میں انگریزی ادویات پر قلم اٹھایا۔ اس سلسلے میں جس نے سب سے پہلے اردو اور ہندی میں میڈیکل کتابیں لکھی ہیں وہ ہیں ڈاکٹر پیٹر بریٹن۔ اُن کے بعد جن حضرات نے اردو میں یہ کام کیا ہے اُن میں ڈاکٹر شاما چرن دت، مسٹر ہا کنگ اور جے۔ ایم۔ گبس وغیرہ شامل ہیں۔ لیکن اولین مصنف ہونے کا سہرا ڈاکٹر پیٹر بریٹن کے سر ہے۔

یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ ڈاکٹر بریٹن نے اردو اور ہندی میں [illegible] کتابیں لکھی ہیں لیکن حسب ذیل اردو تصانیف میری نظر سے گذری ہیں [illegible] کتاب ہندی میں بھی موجود ہے۔

۱۔ بیان بعض اُن زہروں کا جو نباتات سے علاقہ رکھتے ہیں۔

۲۔ بیان ٹاکسکالجی یعنی بیان زہروں کا

۳۔ بیان ماہیت اور تاثیر ہوا کا

۴۔ بیان اُذن یعنی کان کا

۵۔ بیان تپ نوبت کا۔

۶۔ بیان ہیڈروسیل کا

۷۔ بیان موتیا بند کا

۸۔ بیان سانپ کے بِلہ کا

۹۔ رسالہ بیان میں ہڈیوں کے اکھڑنے کا

۱۰۔ رسالہ بیان۔ ویکسینیشن یعنی گو تھن سیتلا کا بیان

۱۱۔ رسالہ ہیضے کا بیان

۱۲۔ رسالہ بیان ماہیت ڈوبنے اور پھانسی ہونے کی

۱۳۔ تشریح گردوں کی

۱۴۔ تشریح پینیس یعنی قضیب کی

۱۵۔ تشریح دماغ کی اور جو چیزیں کہ ساتھ اُس کے علاقہ رکھتی ہیں۔

۱۶۔ تشریح ہڈیوں کی

۱۷۔ علم تشریح

۱۸۔ بات کے مرض کی ماہیت اور علامات اور اقسام اور معالجات

۱۹۔ پیٹ کے اندر کی چیزوں کا بیان

۲۰۔ آنکھ کی تشریح [illegible] رکھتی ہیں۔

۲۱۔ چھاتی کے اندر کی چیزوں کا بیان

۲۲۔ لندن فارماکوپیا یعنی قرابادین

افسوس ہے کہ ہم اردو اور ہندی کے ان اولین میڈیکل تصانیف کے مصنف کے حالات زندگی سے واقف نہیں ہیں۔ کسی محقق کی نظرِ کرم اُن پر نہیں پڑی۔ میں نے جو کچھ حالات یہاں قلم بند کئے ہیں وہ اُس دور کے چند انگریزی اور بنگلہ اخبارات و تصانیف کے رہینِ منت ہیں۔ ڈاکٹر برٹن کی مذکورہ تمام تصانیف کو کتابیں نہیں کہا جاسکتا۔ چونکہ حجم کے اعتبار سے ان میں سے اکثر محض کتابچے یا رسالے ہیں۔ صرف اِن دو کو کتاب کہہ سکتے ہیں :

۱۔ لندن فارماکوپیا یعنی قرابادین :

یہ مصنف کی انگریزی تصنیف کا اردو ترجمہ ہے اور یہ اردو ترجمہ جنوری ۱۸۲۴ء میں دیسی میڈیکل طلبار کے لئے گورنمنٹ لیتھو پریس کلکتہ میں چھاپ کر شائع کیا گیا۔ اس میں ۲۵۴ صفحات ہیں۔

۲۔ بیان بعض اُن زہروں کا جو نباتات سے علاقہ رکھتے ہیں :

اس کے صفحات ۱۷۶ ہیں اور یہ بھی گورنمنٹ لیتھو پریس کلکتہ میں چھاپی گئی۔ ا ہندی ایڈیشن بھی میری نظر سے گزرا ہے۔ اردو ایڈیشن جولائی ۱۸۲۶ء اور ہندی ایڈیشن ا ۱۸۲۷ء میں شائع ہوا۔

یہ وثوق سے نہیں کہا جاسکتا کہ ڈاکٹر پیٹر برٹن نے اردو کیونکر سیکھی تھی اور کہاں تک تعلیم حاصل کی تھی ؟ لیکن ان کی تصانیف کے مطالعہ سے یہ صاف ہوجاتا ہے کہ وہ اردو ہندی میں اچھی خاصی صلاحیت رکھتے تھے اور وہ نہ صرف اردو اور ہندی کے عالم تے سنسکرت، عربی، فارسی، انگریزی اور لاطینی کے علاوہ بنگلہ زبان بھی جانتے تھے۔ اپنی تصانیف میں انھوں نے امراض کے نام مذکورہ مختلف زبانوں میں لکھے ہیں۔

اردو میں یہ میڈیکل کتابیں لکھ کر ڈاکٹر برٹن نے اردو زبان کی جو خدمت کی ہے اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے کیونکہ گزشتہ ۱۵۰ سال کے عرصہ میں اردو نثر نے نہا

تیزی سے ترقی کی ہے اور آج اس کے دامن میں سیکڑوں ایسے الفاظ ہیں جن کی مدد سے خیال کو واضح طور پر ادا کرنے میں کسی مصنف کے لئے دشواری پیش نہیں آتی۔ ڈاکٹر پیٹر برٹن کی زبان کی کمزوریوں پر نظر ڈالنے سے قبل ہمیں کئی باتیں یاد رکھنی چاہئیں۔ ان کے یہاں تذکیر و تانیث اور واحد و جمع کی خامیاں ہیں لیکن ہمیں یہ سب کچھ نظر انداز کرنا ہوگا کیونکہ وہ دور جبکہ ڈاکٹر موصوف نے یہ میڈیکل کتابیں تالیف کی ہیں اردو نثر کی نشوونما کا ابتدائی دور تھا اور اس عہد میں نثر کی جو کتابیں تھیں وہ عموماً داستانیں تھیں۔ یہ بات بھی یاد رکھنی ہوگی کہ اردو مصنف کی مادری زبان نہیں تھی۔ اردو یا ہندی میں تذکیر و تانیث کا مسئلہ اتنا پیچیدہ ہے کہ آج تک کئی الفاظ پر اردو کے عالموں میں بھی اختلافات ہیں اور دیگر زبان والوں کے لئے (جن زبانوں میں کہ بے جان چیزوں کے لئے تذکیر و تانیث کا مسئلہ ہی نہیں ہے) یہی سب سے اہم اور دشوار مسئلہ ہے۔ مثلاً کسی بنگالی کو یہ سمجھانا مشکل ہے کہ اگر وہ "کھانا کھایا" کہے، تو پھر "روٹی کھائی" کیوں کہے جبکہ دونوں چیزیں کھائی جاتی ہیں یا پھر یہ کہ سورج اور چاند دونوں ہی مذکر کیوں ہیں؟ اس عہد میں انگریز صرف کام چلانے کے لائق اردو زبان کا علم حاصل کر لیتے تھے۔ اس عہد کی زبان میں کئی ایسے الفاظ پائے جاتے ہیں جو آج متروک ہیں یا جن کے معنی بدل گئے ہیں اور جن کے استعمال کو آج فصیح قرار نہیں دیا جائے گا۔ لیکن ان تمام تبدیلیوں کے باوجود جب ہم ڈاکٹر برٹن کی زبان و بیان پر غور کرتے ہیں تو اس کی تعریف کرنی ہی پڑتی ہے۔ اُن کے بیان کی صفائی و سادگی دیکھئے۔

"بیان ٹاکسیکالجی یعنی بیان زہروں کا" میں رسالہ لکھنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے آپ رقمطراز ہیں:

> "جو جو معدنی زہر کہ انگریزی طبیبوں کی دواؤں میں اکثر کام آتے ہیں اور ایک دوسرے کے دھوکے سے کھانے میں آجاتے ہیں اور ان کے اندازہ سے زیادہ کھانے سے بہت اذیت ہوتی ہے بلکہ کبھی آدمی ہلاک ہو جاتا ہے۔ اُن ہی زہروں کا بیان اِس

رسالے میں کیا گیا ہے تاکہ ہندوستان کے بیدوں کو معلوم ہو کہ ان ہر ایک چیزوں کے کھانے سے کیا کیا واردات ہوتے ہیں اور آدمیوں کی جان بچانے کے واسطے کیا کیا علاج کئے جاتے ہیں۔ جن زہروں کا بیان اس رسالے میں ہوا ہے ان زہروں کے سوائے اور بھی بہت معدنی زہر ہیں کہ انگریزی طبیبوں کے دواؤں کے کام آتے ہیں چونکہ اُن کے کھانے میں اتنی جوکھم نہیں ہے جو اس رسالے کے زہروں میں ہے۔ اس لئے اس رسالے میں کہ نوسکھو لوگ بشکہ علم طب کے مدرسہ کے طالب علموں کے سیکھنے کے واسطے تصنیف کیا گیا ہے۔ اُن زہروں کا احوال نہیں لکھا گیا ہے تاکہ رسالہ بڑھ نہ جاوے۔"

ایک اور تصنیف "علم تشریح" میں علم تشریح کی تعریف آپ نے یوں کی ہے:

"جاننا علم تشریح کا مانند گھڑی کی بناوٹ کے جاننے کے ہے یعنی جب تلک ہر ایک پرزہ کہ جس سے گھڑی بنائی ہوئی ہے جُدا جُدا نہ ہووے اور نہ آزمایا جاوے، تب تک کسی کو نہ معلوم ہووے کہ گھڑی کے اندر کونسی چیز ہے اور کس طرح گھڑی آپ سے چلتی ہے چنانچہ جب تک طالب علم طب دریافت نہ کرے کہ آدمی کا جسم کس طرح سے بنا ہوا ہے اور ہر ایک شئے کہ جس سے سارا بدن بنا ہوا ہے علیحدہ اور ٹھیک چیر چاڑ یعنی امتحان نہ کرے تب تلک اُس طالب علم کو کچھ ظاہر نہ ہوگا کہ آدمی کی جان اور تمام بدن کی حرکت اور مرض کس طور سے ہوتا ہے۔"

اب دیکھنا یہ ہے کہ انگریزوں کو کیوں اور کب یہ ضرورت پیش آئی کہ وہ ہندوستانی زبانوں میں انگریزی ادویات اور طریقہ علاج پر کتابیں لکھیں یا لکھوائیں اور ہندوستانی کو میڈیکل تعلیم دیں۔

ڈاکٹر برٹن کے زمانہ تک انگریز پورے ہندوستان کے حاکم نہیں ہوئے تھے اور کے قدم ہندوستان میں مضبوطی سے جمے نہیں تھے۔ یہ زمانہ ہندوستان کے مختلف حکمرا کے خلاف انگریزوں کی جنگ کا دور تھا۔ ان جنگوں میں حصہ لینے والے سپاہی سب ا

نہیں تھے بلکہ انگریز سپاہی برائے نام ہی تھے اور عام سپاہی زیادہ تر اس ملک کے باشندے تھے۔ مختلف جنگوں میں جو سپاہی زخمی ہو جاتے تھے انگریزوں کو ان کی مرہم پٹی اور علاج کی ضرورت پیش آتی تھی۔ اس مقصد کے تحت انگریزوں نے چند فوجی ہسپتال قائم کئے تھے جہاں چند انگریز ڈاکٹر تھے لیکن ان چند انگریز ڈاکٹروں سے یہ تمام کام ممکن نہیں تھا چونکہ یہ دور ہی لگاتار جنگ و جدل کا دور تھا۔ سیکڑوں کی تعداد میں سپاہی ان جنگوں میں زخمی ہوتے تھے۔ لہٰذا انگریزوں نے مرکز کلکتہ میں ملٹری بیرکوں میں فوجی ہسپتال قائم کئے گئے۔ ان ہسپتالوں کو چلانے کے لئے ڈاکٹروں کی ضرورت پیش آئی اور ڈاکٹر بنانے کے لئے ڈاکٹری تعلیم دینا ضروری تھا۔ اسی مقصد کے پیش نظر ۱۸۲۲ء میں "نیٹو میڈیکل انسٹی ٹیوشن" کے نام سے ایک تعلیم گاہ دیسی طلبا کے لئے قائم کی گئی۔ اس میڈیکل تعلیم گاہ میں سال اول میں اندازاً بیس طلبا تھے جن کو آٹھ روپیہ ماہوار وظیفہ ملا کرتا تھا۔ ان طلبا میں زیادہ تر سپاہیوں کے لڑکے یا رشتہ دار تھے چونکہ سپاہیوں میں زیادہ تعداد غیر بنگالیوں کی تھی جن کی مادری زبان اردو یا ہندی تھی لہٰذا طلبا کے لئے اردو یا ہندی میں میڈیکل کتابوں کی ضرورت پیش آئی۔ اس نیٹو میڈیکل انسٹی ٹیوشن کے پہلے ناظم اور پروفیسر ڈاکٹر پیٹر بریٹن تھے۔ ڈاکٹر موصوف کا ذکر کرتے ہوئے سریرامپور مشن والوں کے بنگلہ اخبار "سماچار درپن" (۱۸ اگست ۱۸۲۵ء) نے لکھا کہ "آپ ایک لائق ڈاکٹر ہیں اور ایسٹ کمپنی کے ڈاکٹر ہیں۔ نیٹو میڈیکل انسٹی ٹیوشن کے نام سے جو میڈیکل اسکول دیسی طلبا کو انگریزی کے بجائے اردو اور ہندی میں تعلیم دینے کے لئے قائم ہوا ہے آپ اس کے نگراں ہیں۔"

ہم اس میڈیکل اسکول کے طریقہ تعلیم کے سلسلے میں بہت کم جانتے ہیں۔ بنگلہ اخبارات کے مطابق علم تشریح کی عملی تعلیم دینے کے لئے بکرے یا کتے کا ڈسکشن (Dissection) کیا جاتا تھا۔ اس کے پہلے میڈیکل پروفیسر ڈاکٹر پیٹر بریٹن تھے اور ان کے بعد ڈاکٹر ٹائٹ لار اور پھر ڈاکٹر ڈونالڈرس پروفیسر ہوئے۔ پروفیسروں کو آٹھ سو روپیہ ماہوار تنخواہ ملا کرتی تھی۔

سنسکرت کالج کلکتہ کے "شعبۂ وید" اور مدرسہ عالیہ کلکتہ کے "شعبۂ طب" کو اس عہد میں حکومت

کی طرف سے گرانٹ ملا کرتی تھی۔ لیکن جب نیٹو میڈیکل انسٹی ٹیوشن نے ترقی کی اور دیسی طلبا کو میڈیکل تعلیم سے دلچسپی پیدا ہوگئی تب انگریز حاکموں نے دیکھا کہ اگر ہندوستانی میڈیکل تعلیم حاصل کر لیتے ہیں تو نہایت کم تنخواہ پر یہ دیسی ڈاکٹر بخوبی علاج کر سکتے ہیں اور حکومت کے لئے یہ ضروری نہیں رہتا کہ وہ انگلستان سے ڈاکٹروں کو بھاری تنخواہ دے کر ہندوستان لائے۔ اس فائدہ کو سامنے رکھ کر حکومتِ وقت نے اسی میں بھلائی سمجھی کہ ہندوستانیوں کو ضروری میڈیکل تعلیم دی جائے۔ آخر کار ۲۸؍جنوری ۱۸۳۵ء میں لارڈ ولیم بنٹنک نے حکم دیا کہ کلکتہ میں ایک میڈیکل کالج قائم کیا جائے اور اس کے اخراجات کو پورا کرنے کے لئے حکومت وقت نے سنسکرت کالج اور مدرسہ عالیہ کلکتہ کے شعبۂ وید اور طب کی گرانٹ بند کر دی۔ اس طرح سنسکرت کالج کے شعبۂ آیور وید اور مدرسہ عالیہ کے شعبۂ طب یونانی کی قیمت پر کلکتہ میڈیکل کالج ۲۰؍فروری ۱۸۳۵ء کو قائم ہوگیا اور اس کے ساتھ ہی نیٹو میڈیکل انسٹی ٹیوشن کا دروازہ بھی ہمیشہ کے لئے بند ہوگیا۔

سید احمد علی آزاد

جامعہ میں ابتدائی تعلیم کے تجربے

(۲)

اس ابتدائی دور میں عبدالغفار مدھولی صاحب نے بچوں کا بینک قائم کیا۔ پہلے تو ماہانہ کی آمدنی کو محفوظ رکھنے کی ضرورت نے، بینک کی ضرورت کو محسوس کرایا۔ اس کے بعد بورڈنگ کے بچوں کے ذاتی روپے محفوظ رکھنے کی ضرورت نے اس کے قیام کو اور بھی ضروری بنا دیا۔ بچوں کے بینک میں بچے ہی ایک اُستاد کی نگرانی میں تمام کام کرتے تھے اور اب تک کرتے ہیں۔

بچوں کے اس بینک میں کیش بک، چیک بک، کھاتے، پاس بک اور روپے جمع کرانے کی کاپی سلپ چھپی ہوئی صورت میں موجود رہتی تھیں اور یہ چیزیں اب بھی بینک میں موجود ہوتی ہیں .... کیش بک اور کھاتوں میں بچے خود اندراجات کرتے تھے۔ بچے اس کام کو نہایت صفائی اور صحت کے ساتھ کرتے تھے۔ یہ بینک سالانہ منافع بھی تقسیم کرتا تھا اور شروع میں تو بچوں کے اس بینک نے پچاس فیصدی تک منافع تقسیم کیا ہے۔ منافع تقسیم کرنے کے لیے ہر سال، سال کے آخر میں ایک صاف ستھرا اور بہت سلیقہ کا جلسہ بھی ہوتا تھا جس کا انتظام خود بچے اُستاد کی نگرانی میں کرتے تھے۔ اس جلسہ میں سال بھر بینک نے کیا کیا کام کیا، بینک میں کل کتنے روپے جمع ہوئے، کتنے روپے نکلوائے گئے اور بینک کی تحویل میں سال کے آخر میں کتنی رقم بچی، ان سب کی رپورٹ ہوتی تھی۔ بچوں کے بینک نے اتنا اعتماد حاصل کر لیا تھا کہ اکثر اساتذہ کی بھی اس میں رقمیں جمع تھیں۔

جن بچوں کا بینک میں حساب ہوتا تھا ان کو سالانہ منافع پاکر بڑی خوشی ہوتی تھی۔ یہ بچے پاس بک کے اندراجات کو اچھی طرح سمجھنے لگے تھے لیکن جس جماعت کے بچے ان پاس بکوں کو کھاتوں کے مطابق تیار کرتے تھے وہ عملی طور پر بامقصد جمع مرکب اور تفریق مرکب کی مشق کرتے تھے۔ وہ مجرد ہندسوں اور عددوں کو جمع کرنے کی بجائے اصل رقومات کا اندراج کرتے تھے بچے اس بامقصد کام میں دل و جان سے لگے ہوئے تھے۔ وہ اپنے شوق اور دلچسپی سے بینک کے کام کرنے کے طریقہ کو سیکھ رہے تھے۔ بچوں کا بینک چلاکر ایک طرف تو بچوں میں کچھ بچانے کی عادت پیدا ہو رہی تھی اور دوسری طرف دیانت داری اور صفائی سے کام کرنے کی عادت بن رہی تھی۔

سوال یہ ہے کہ بچوں کا بینک اپنے ممبران کو منافع کہاں سے تقسیم کرتا تھا۔ بچوں کا بینک اپنا روپیہ بچوں کی دکان میں لگاتا تھا اور دکان میں جو منافع حاصل ہوتا تھا اس سے بچوں کا بینک ممبران کو منافع تقسیم کرتا تھا۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ بچوں کے بینک نے معمولی شرح سود پر جامعہ کو قرض دیا ہے۔ کبھی کبھی استادوں کو بھی کتابیں چھپوانے کے لئے اس بینک نے قرض دیا۔ ان تمام آمدنیوں سے بچوں کے بینک کے ممبران کو منافع تقسیم ہوتا تھا۔ جس جماعت کے پاس بینک کا کام ہوتا تھا اس کے طلبا میں سے چار یا پانچ ممبروں کا انتخاب کرکے ایک بینک کمیٹی بنادی جاتی تھی۔ جماعت کا استاد ناظم بینک کے فرائض انجام دیتا تھا، وہی اس کمیٹی کا صدر ہوتا تھا۔ قرض دینے کا معاملہ اس کمیٹی کے سامنے پیش ہوتا تھا اور یہ کمیٹی فیصلہ کرتی تھی کہ بینک سے قرض دیا جائے یا نہیں اور اگر دیا جائے تو شرح سود کیا ہو۔ یہی کمیٹی فیصلہ کرتی تھی کہ کتنے فی صدی منافع بچوں کے بینک کے ممبران کو تقسیم کیا جائے۔ بینک پروجکٹ کے سلسلے میں بچے شہر کے مختلف بینکوں میں گئے اور وہاں کاروبار ہوتے ہوئے دیکھا۔ بچوں نے بینک دیکھنے کے بعد بہت سے سوالات کیے جن کے جوابات لکھوائے گئے۔

شیخ الجامعہ جناب پروفیسر محمد مجیب صاحب نے بچوں کے بینک کے بارے میں

رپورٹ میں لکھا ہے :

"جامعہ کا ایک پرائمری اسکول قائم ہوگیا۔ اس میں بیشتر تعلیم پروجکٹ طریقہ کے ذریعہ ہوتی ہے۔ اس کا ایک پروجکٹ 'بچوں کا بنک' تھا جو چالیس سال ہوئے تیس روپے کے سرمایہ سے قائم ہوا تھا اور اب تک کامیابی سے چل رہا ہے۔ اس نے بچوں کے مختلف کاروباری منصوبوں میں اپنا روپیہ لگایا۔ ایک دو بار اس نے جامعہ کو بھی قرض دیا۔ اسے پریزیڈنٹ سوکارنو، شہنشاہ ایران۔ پریزیڈنٹ جمال عبدالناصر اور بہت سے تعلیم کے ماہروں نے دیکھا اور بہت پسند کیا لیکن افسوس دوسرے اسکولوں نے اس مثال سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔"

بچوں کی دکان

بچوں کی دکان بھی، بچوں کے بینک کی طرح، ایک جاندار پروجکٹ کی حیثیت سے چلتا رہا ہے۔ عبدالغفار صاحب نے بینک کے روپے کو کسی مفید کاروبار میں لگانے کے خیال سے بچوں کی اسٹیشنری اور کتابوں کی دکان کا کام شروع کیا۔ مدرسہ میں اس کی ضرورت تھی اور یہ بڑی کامیابی سے چلتا رہا اور اب تک چل رہا ہے۔ ہر بچہ کے لیے بچوں کی دکان سے اسٹیشنری اور کتابیں خریدنا ضروری تھا۔ دکان میں مدرسہ کے ہر بچہ کا کھاتہ کھلا ہوا تھا۔ ہر بچہ سے شروع سال میں داخلہ کے وقت فیس کے ساتھ ایک رقم لے لی جاتی تھی اور اس کے کھاتہ میں جمع کر دی جاتی تھی۔ اس طرح ہر طالب علم ضرورت کے مطابق، استاد جماعت کی تصدیق کے بعد، دکان سے اسٹیشنری اور کتابیں سال بھر خریدتا رہتا تھا۔ چونکہ سب بچوں کی فیس داخلہ کے وقت جمع نہیں ہوتی تھی یا جزوی طور پر جمع ہوتی تھی اس لیے عبدالغفار صاحب بچوں کے بینک سے روپیہ قرض لے کر تمام بچوں کے لیے اسٹیشنری اور کتابیں خرید لیتے تھے اور جولائی میں مدرسہ کھلنے سے پہلے، پہلی جماعت سے لے کر چھٹی جماعت تک کے طلبار کے لیے بستے

تیار کروا کر رکھ لیتے تھے جس میں ہر جماعت کے بچوں کے لیے اُس جماعت کے سامان کے مطابق چیزیں ہوتی تھیں۔ یہ بستے طلبار کو پہلے ہی دن مل جاتے تھے۔ اس طرح جماعت میں تعلیم شروع کرانے میں دیر نہیں ہوتی تھی۔

جس جماعت کے پاس دکان کا شعبہ ہوتا تھا (عام طور سے پنجم یا ششم کے پاس دکان ہوتی تھی) وہ حساب کی ساری تعلیم اس عملی حسابی کام سے مربوط کر لیتی تھی۔ بچے دکان کے کام میں حساب کی ضرورت عملاً محسوس کرتے تھے اور رسیدوں کے مطابق گاہکوں سے پیسے وصول کرتے تھے جن طلبار کے کھاتے کھلے ہوئے تھے ان کے کھاتوں میں سامان کی قیمتیں درج کرتے تھے۔ اُدھار فروخت میں بل بناتے تھے اور یوں بل بنانا سیکھتے تھے۔ دو چار لڑکے استاد کی نگرانی میں باری باری کتابیں اور اسٹیشنری کا سامان خریدنے شہر جاتے تھے اور سامان خرید کر لاتے تھے۔ وہ اسٹیشنری کی بہت سی چیزوں کے نرخ سے واقفیت رکھتے تھے اور اس پر منافع رکھ کر چیزوں کی قیمت مقرر کرتے تھے اور اس قیمت پر طلبار کو سامان فروخت کرتے تھے اسٹیشنری کی دکان چلا کر طلبار، اکائی، تجارت، نفع نقصان اور فی صدی کے سوالات کی عملی مشق کرتے تھے۔

تعلیم کا کام کرنے والے جو اساتذہ یہ کہتے ہیں کہ پروجکٹ طریقۂ تعلیم کے ذریعہ حساب کی تعلیم نہیں دی جا سکتی اور اس کی مشق تو بالکل ہو ہی نہیں سکتی، وہ دیکھیں کہ کیا باغبانی، بچوں کے بنک اور بچوں کی دکان کے پروجکٹس کے ذریعہ سود، اکائی، تجارت، نفع نقصان، فی صدی اور رقم کے قاعدوں کے سکھانے کی ضرورت ہوتی ہے یا نہیں۔ ہاں استاد کو اُن مواقع کے مطابق سوالات بنانے کی ضرورت ہوتی ہے اور اچھا خاصہ کام کرنا پڑتا ہے۔ اُس وقت کے اساتذہ میں کام کرنے کی دُھن تھی اور وہ سب کام کرتے تھے۔ وہ کام کو تنخواہ سے نہیں ناپتے تھے۔ وہ ان کاموں کے ذریعہ بچوں کی زندگیاں بنانے کا ایک منصوبہ رکھتے تھے اور طلبار بھی استادوں کے ان کاموں میں دل و جان سے مدد کرتے تھے۔ وہ طلبار اُستادوں کے ساتھی اور مددگار

بن گئے تھے ۔ اس زمانہ میں جن استادوں نے بچوں سے مدرسہ ابتدائی کی طرف سے ہونے والے کھلی ہوا کے مدرسہ میں کام لیا ہے وہ طلبار کے کام کرنے کی اس روح کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں ۔

پروجکٹ کی مختلف حیثیتیں

عبدالغفار صاحب کے چلائے ہوئے پروجکٹوں کی حیثیت اجتماعی پروجکٹ کی ہوتی تھی یا مستقل پروجکٹ کی ۔ اجتماعی پروجکٹس میں مدرسہ کی تمام جماعتیں مل کر ان پروجکٹس پر اپنی اپنی جماعت کے معیار کے مطابق کام کرتی تھیں اس وقت کے حالات کے مطابق ایسا کرنا ٹھیک بھی تھا اس لیے کہ اکثر اساتذہ ٹرینڈ نہیں تھے اور دو ایک ہی استاد موگا ٹرینڈ تھے لیکن جب موگا سے ٹریننگ لے کر کئی اساتذہ آگئے تو یہ اجتماعی حیثیت قائم نہ رہ سکی اور ہر جماعت نے اپنے اپنے پروجکٹس چلائے کسی جماعت نے صفائی پروجکٹ چلایا، کسی نے عید پروجکٹ چلایا اور کسی نے آگرہ پروجکٹ چلایا۔ اُس وقت مستقل پروجکٹ اور سالانہ پروجکٹس کے ساتھ ساتھ ہر جماعت میں علٰحدہ علٰحدہ پروجکٹ چلے تو اتنے زیادہ پروجکٹس چلانے پر جامعہ کی معائنہ کمیٹی نے اعتراض کیا اور ہدایت کی کہ کم سے کم پروجکٹس چلائے جائیں ۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ تمام اساتذہ اپنے اپنے پروجکٹس کی صحیح پلیننگ نہیں کرتے تھے بلکہ بعض جماعتوں میں سرے سے پلیننگ ہوتی ہی نہ تھی اس لیے تعلیمی کام کم ہوتا تھا اور نمائشی کام زیادہ نمایاں ہوجاتا تھا۔ ڈرائنگ کے استاد کا کام بہت بڑھ جاتا تھا۔

پورے مدرسہ کے لیے یوم قرآن پروجکٹ اور میلاد النبیؐ پروجکٹ چلائے جاتے رہے۔ ان پروجکٹس میں مدرسہ کی تمام جماعتیں حصہ لیتی تھیں ۔ مضامین اور نظموں کے عنوانات جماعت وار تقسیم کر دیے جاتے تھے اور اسی طرح آرائش اور سجاوٹ کا کام بھی جماعت وار تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ سورہ النجم کا ترجمہ مولانا شرف الدین مرحوم نے ایسی سادہ اور آسان زبان میں چھوٹے چھوٹے

جلوں میں لکھا تھا کہ اسے پہلی جماعت کے ایک بچہ نے بڑے موثر انداز میں جلسہ میں پڑھ کر سنایا۔
ان دو پروجکٹس کے ذریعہ اسلامیات کی تعلیم بہت موثر انداز سے دی جاتی رہی ہے۔ آنحضرتؐ سے متعلق بچے معلومات حاصل کرتے تھے اور ان تعلیمات کو مختلف کتابوں سے پڑھ کر اپنا مفروضہ تیار کرتے تھے جو کتابچوں کی صورت میں ہوتا تھا۔ یوم قرآن اور میلاد النبیؐ پروجکٹ پر ایک ڈیڑھ ماہ خوب کام ہوتا تھا اور کام ختم ہونے کے بعد ایک جلسہ ہوتا تھا۔ جلسہ کے دن تعلیمی مرکز نمبرا کا وسیع ہال بچوں کے تیار کئے ہوئے طغروں، چارٹوں اور ڈرائنگ سے سجا ہوتا تھا۔ تمام مضامین اور نظمیں بچے نہایت موثر انداز میں پڑھتے تھے۔ آخر میں مہمان خصوصی کی تقریر ہوتی تھی۔ جلسہ کی صدارت بچہ ہی کرتا تھا۔ آخر میں مہمانوں کا شکریہ ادا کیا جاتا تھا۔

وقتی پروجکٹ پر جب ہر جماعت اپنا کام مکمل کر لیتی تھی تو ایک جلسہ کرتی تھی۔ جلسہ میں طلباء مضامین اور نظمیں سناتے تھے۔ "پروجکٹ پر کام کس طرح ہوا"، "پروجکٹ کیوں چنا گیا"، "اس پروجکٹ میں اردو، حساب، معلومات اور دینیات کا کتنا کام ہوا"، "کہاں کہاں کی سیریں کیں"، "کیا کیا دشواریاں پیش آئیں"، "بچوں نے کن کتابوں کا مطالعہ کیا"۔ یہ تمام تفصیلات مختلف رپورٹوں کی شکل میں پڑھ کر سنائی جاتی تھیں۔ ہال میں بچوں کا کیا ہوا کاپیوں میں کام، چھوٹے چھوٹے کتابچے، بچوں کی ڈرائنگ، بچوں کے لکھے ہوئے چارٹس اور جمع کی ہوئی تصویریں لگا دی جاتی تھیں۔ جلسہ میں آنے والے حضرات میں بیشتر تعداد جامعہ کے اساتذہ اور مقامی بچوں کے سرپرستوں اور والدین کی ہوتی تھی۔ اساتذہ صاحبان، والدین اور سرپرست جلسہ کے بعد تعلیمی کاموں کو دیکھتے تھے۔ جلسہ کے بعد یہ تمام تعلیمی کام تعلیمی نمائش کے کمرے میں لگا دیا جاتا تھا۔ اس خیال سے کہ ان کا کیا ہوا کام لوگ دیکھتے ہیں، بچے اسے بہت صحت اور صفائی کے ساتھ پورا کرتے تھے۔ ٹائٹل پیج، پمفلٹ کی لکھائی، چارٹس کی لکھائی اور حاشیے پوری توجہ اور لگن سے لکھتے اور بناتے تھے۔

ڈرائنگ سے کام میں جان پیدا ہو جاتی ہے۔ اختر حسین فاروقی مرحوم طلباء کی بولا

طرح مدد کرتے تھے۔ بچوں کی ڈرائنگ میں ان کی اصلاح سے جان پڑ جاتی تھی۔ وہ پمفلٹ کے ٹائٹل پیج اور چارٹوں کے حاشیے بنانے میں نئے نئے ڈزائن بچوں کو سکھلاتے تھے۔ ڈرائنگ کا کام پروجکٹ کے نمائشی پہلو کو اجاگر کرنے کے لیے تو ہوتا ہی تھا لیکن پروجکٹوں میں بیان ہونے والی باتوں کی وضاحت کے لیے بھی کرایا جاتا تھا۔ مثلاً پرند پروجکٹ میں چونچ اور پنجے کی قسموں کی وضاحت کے لیے ڈرائنگ سے مدد لی گئی۔ باغبانی پروجکٹ میں قسم قسم کے پھولوں کی ڈرائنگ بنوائی گئی۔ کسی پروجکٹ کی دلچسپی کو آخر تک قائم رکھنے کے لئے ڈرائنگ اور حرفوں میں وضاحتی کام ہونا بے حد ضروری ہے۔

باغبانی پروجکٹ

باغبانی کا کام ۱۹۳۰ء میں قرولباغ میں شروع ہوا۔ جامعہ کی اپنی عمارت کے ساتھ ایک گلی چھوڑ کر ایک کافی لمبا پلاٹ تھا۔ اسی میں بچے باغبانی کرتے تھے۔ یہ کام بھی بچوں کے لیے بڑا دلچسپ اور جاندار تھا۔ پھر بچے اس میں اس لیے بھی دلچسپی لیتے تھے کہ اس کی آمدنی سے آدھا منافع ان بچوں کو بھی ملتا تھا۔ بچے اپنا بیشتر وقت باغبانی کے کام میں صرف کرتے تھے۔ اس معروفیت کی وجہ سے اُن کو اِدھر اُدھر کے فضول کاموں میں پڑنے کا بالکل موقع نہیں ملتا تھا۔ کیاریاں کھودنا، اُس میں کھاد ڈالنا، کہیں سے کھاد لانا (اُس وقت کھاد خریدی نہیں جاتی تھی بلکہ دلی کی عیدگاہ کے قریب جو کھتہ پڑتا تھا اُس میں سے لڑکے ٹینوں اور تسلوں میں بھر بھر کر اپنے سروں پر لاتے تھے۔ یہ کام بڑی محنت کا تھا) کیاریاں تیار کرنا، کھاد ملانا، بیج بونا، پانی دینا، پودے نکل آئیں تو گوڑی کرنا، گھاس پھوس نکالتے رہنا وغیرہ کاموں میں بچے لگے رہتے تھے۔ وہ باغبانی کے گھنٹوں میں اور مدرسہ ختم ہونے کے بعد بھی کام کرتے رہتے تھے۔ بیجوں کے پھوٹنے، پودوں کے نکلنے اور بتدریج بڑھنے، اُن کے پھول اور پھل لانے کا مشاہدہ ان کے لیے بڑا دلچسپ معلومات افزا ہوتا تھا۔ پھر جب سبزیاں تیار ہو جاتی تھیں تو انھیں گھر گھر فروخت بھی کرتے تھے۔

اتنی زیادہ سبزیاں نہیں پیدا ہوتی تھیں کہ کوئی ایک بورڈنگ کا کچن باغبانی کی سبزیاں خری(د) (قرولباغ میں علیٰحدہ علیٰحدہ بورڈنگوں کے اپنے اپنے کچن تھے) لیکن یہی باغبانی کا کام جب جا(معہ) میں مدرسہ ابتدائی میں کرایا جانے لگا تو یہاں کافی زمین ہونے اور پانی کی آسانی کی وجہ سے اتنی (زیادہ) سبزیاں پیدا ہونے لگیں کہ مرکزی مطبخ کو فروخت کی جانے لگیں، چنانچہ بیس بیس سیر اور تیس تیس (سیر) شلجم، پالک، آلو اور گوبھی مطبخ کو فروخت ہوتی تھیں۔ قرولباغ میں زمین کم تھی اس لیے ایک (ایک) دو جماعتیں باغبانی کرتی تھیں۔ لیکن مدرسہ ابتدائی جامعہ نگر میں زمین زیادہ تھی اس لیے اول سے لے کر ششم جماعت تک ہر جماعت باغبانی کرتی تھی۔ اول، دوم اور سوم کے پاس کم زم(ین) ہوتی تھی اور چہارم پنجم اور ششم کے پاس زیادہ زمین ہوتی تھی۔

باغبانی پروجکٹ پر کافی تحریری کام کرایا گیا اور بچوں نے باغبانی پر کئی اچھی نظمیں بھی لکھ(یں) بچے ایک ایک دو دو اشعار لکھتے تھے۔ اُستاد اِن اشعار کی اصلاح کرکے انھیں ترتیب دے دیتا تھا۔ اس طرح ایک اچھی خاصی نظم تیار ہو جاتی تھی۔ نمونے کے طور پر ایک نظم نیچے لکھ(ی) جاتی ہے:

بُھٹے

کچھ کیاری میں بُھٹے تھے ۔۔۔ رکھوالی ہم کرتے تھے
بُھٹے اِن میں بوئے ہوئے تھے ۔۔۔ طوطے کھیت میں آئے ہوئے تھے
بھینس بھی اِن میں آجاتی تھی ۔۔۔ بُھٹے سب کے کھا جاتی تھی
سب نے مل کر تار لگائے ۔۔۔ تاکہ اِس میں کوئی نہ آئے
صبح کو بُھٹے توڑے جاتے ۔۔۔ پھر تفریح میں بیچے جاتے
بھونا، اس میں نمک لگائے ۔۔۔ اور مزے لے لے کر کھائے
کام یونہی ہم کرتے رہے ۔۔۔ بُھٹے ہمارے بکتے رہے

سبزیوں کو فروخت کرنے میں اور اُن کے پورے پورے دام لاکر اُستاد جماعت کو دینے میں بچے جس دیانتداری کا ثبوت دیتے تھے وہ اپنی مثال آپ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ اُن کی اپنی باغبانی ہے اور یہ اُن کا اپنا کاروبار ہے۔ نہ کبھی سبزی کھانے کی شکایت سنی (جیسے بھٹے، مولی، شلجم اور گوبھی وغیرہ) نہ کبھی پیسوں کے گڑبڑ ہونے کی شکایت آئی اور نہ کبھی کسی اور نقصان کی۔ اگر دوسری جماعت کے طلبا کبھی کوئی گڑبڑ کرتے تھے تو فوراً جرمانہ وصول کرتے تھے۔ سبزی فروخت کرنے پر بھی ایک نظم تیار ہوئی ملاحظہ ہو:

سبزیوں کی فروخت

باغبانی میں ذرا آ جائیے — دوستوں کو بھی یہاں لے آئیے
تازہ تازہ سبزیاں تیار ہیں — دام دیجے اور انھیں لے جائیے
اچھی اچھی مولیاں لے جائیے — مشورہ اِس میں ہمیں دے جائیے
ہر طرح کی سبزیاں تیار ہیں — کچھ پکا کر کچھ یونہی کھا جائیے
لیجئے ہم سے ٹماٹر سُرخ سُرخ — دام اس کے پھر کبھی دے جائیے
دھوپ کی تیزی، زمیں کا کھودنا — اتنی محنت کا صلہ دے جائیے
کچھ نہیں لیتے تو اتنا ہی سہی — آپ ہیں شاباش ہی دے جائیے

آرزو ہم سب کی پوری کیجئے
کچھ کھائیے، کچھ لیجئے، لے جائیے

قرولباغ کے مدرسہ تعلیمی مرکز نمبر ۱ میں سبزیوں کے ساتھ ساتھ موسمی پھولوں کی باغبانی بھی ہوتی تھی۔ بچے طرح طرح کے پھولوں کے بیج بوکر ذخیرے تیار کرتے تھے اور جب پودے بڑے ہوجاتے تھے تو ان کو دیواروں سے متصل اونچی اونچی کیاریوں اور گملوں میں لگاتے تھے۔ مارچ کا مہینہ پھولوں کے پودوں کی بہار کا زمانہ ہوتا تھا۔ بڑی بہار ہوتی تھی، خوب

پھول کھلتے تھے، بچے ان پھولوں کے اچھے اچھے گلدستے بناتے تھے۔ ان گلدستوں میں جو سب سے اچھا ہوتا تھا اسے گلدان میں لگا کر روزانہ صبح کو آپا جان (مس فلپس بورن) کی میز پر آتے تھے۔ یہ جرمن خاتون ہمارے اسٹاف میں تھیں اور اس زمانہ میں بیمار تھیں اور قرولباغ کے ایک اسپتال میں داخل تھیں۔ چاروں طرف پھولوں کی بہار دیکھ دیکھ کر چھٹی جماعت کے بچے بہت خوش ہوتے تھے اور اس کا تذکرہ آپس میں بڑے فخر سے کرتے تھے۔ ان پھولوں میں سے ہر ایک کا حال مشاہدہ کے مطابق لکھ کر قلمی صورت میں تیار کیا تھا اور ٹائٹل بہت عمدہ بنایا تھا۔ ڈرائنگ کا استاد اِس کام میں اُن کی پوری مدد کرتا تھا۔ پھولوں کی باغبانی کے سلسلے میں بچوں نے دہلی کی کئی مشہور نرسریاں دیکھیں۔

پھولوں کی بہار کے بعد پھولوں میں بیج آنے لگے تو بچوں نے بیج جمع کرنا شروع کردیا اس سے بچوں کی شناخت اچھی طرح ہوگئی۔ اس کے لیے چھوٹی چھوٹی شیشیاں خریدی گئیں اور ہر شیشی پر کسی ایک پھول کا نام لکھا گیا۔ اُس میں اِسی پھول کے بیج جمع کئے گئے۔ اِن شیشیوں کو جماعت کی الماریوں میں رکھ دیا گیا۔ شیشیوں میں نیم کی سوکھی پتیاں ڈالدی گئیں تاکہ بیج خراب نہ ہوں اور اگلے موسم میں کام آئیں۔ اگلے سال سے ہمیں بیج خریدنے کی ضرورت نہیں ہوئی۔

ایک سال مارچ میں، جبکہ شفیق الرحمٰن قدوائی مرحوم نگران مدرسہ تھے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کی صدارت میں ایک معائنہ کمیٹی تعلیمی مرکز نمبرا کا کام دیکھنے کے لئے آئی۔ اس کے ممبران خواجہ عبدالحیٔ مرحوم، ڈاکٹر سلامت اللہ صاحب اور پروفیسر محمد عاقل صاحب تھے۔ معائنہ کمیٹی نے پہلا پروجکٹ کا کام دیکھ کر مدرسہ اور میرے کام کے بارے میں ذیل کا نوٹ لکھا:

> اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اِس مدرسہ کے پُرانے معیار کو دیکھتے ہوئے اس کی حالت آج کل کچھ زیادہ تسلی بخش نہیں ہے۔ لیکن موجودہ حالت میں بھی اس کا معیار کئی لحاظ سے دوسرے اداروں سے یقیناً بلند ہے۔ اس معیار کے بلند رکھنے میں سید احمد علی صاحب کا بڑا حصّہ ہے۔ غیرنصابی دلچسپیوں کے علاوہ انھوں نے اپنے درجہ کے کام کا معیار

ہمیشہ بلند رکھا۔"

(معائنہ کمیٹی جامعہ، ۱۰-۱۳ مارچ ۱۹۳۵ء)

باغبانی کا کام شعبہ کی حیثیت سے بچوں سے کرایا جاسکتا ہے۔ اگر زمین کافی ہو اور پانی کا ول انتظام ہو تو تیسری جماعت سے چھٹی جماعت تک کے بچے اچھا کام کرسکتے ہیں۔ باغبانی کا کام ب شعبہ کی حیثیت سے ہوتا ہے تو اُس کام سے مربوط تعلیم بہت کم ہوتی ہے۔ بچے صرف سبزی اکرتے ہیں اور فروخت کرتے ہیں۔ بچے منافع کی رقم سے کہیں سیر کر آتے ہیں۔ یہ کام بحیثیت جکٹ کے بھی کرایا جاتا رہا ہے (چوتھی جماعت سے چھٹی جماعت تک)، اس پروجکٹ کے یہ اُردو، حساب اور عام سائنس کا کام دلچسپ طریقے سے کرایا جاسکتا ہے۔ حساب میں رقبہ، نقصان، فی صدی اور اکائی کے قاعدے سکھائے جاسکتے ہیں اور مشق کے لیے بھی سوالات ر دئے جاسکتے ہیں۔ تعلیمی مرکز نمبرا میں یہ کام بہت بڑے پیمانے پر ہوتا تھا۔

بچوں کو باغبانی کے کام میں نہ صرف تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملتا تھا بلکہ اُن کو اچھی، مفید دلچسپ مصروفیت بھی ملتی تھی۔ اِن کے علاوہ لگاتار محنت اور دیانتداری سے کام کرنے کی ت بھی بن جاتی تھی۔ اِن بچوں میں سلیقہ نظر آتا تھا۔ باغبانی اُن کے لیے بچوں کا کھیل نہیں بلکہ بچے اس کام کو بڑوں کی طرح سنجیدگی اور ذمہ داری سے انجام دیتے تھے۔ پروجکٹ یہ تعلیم بچوں کو زندگی کے لیے تیار کرتا ہے اور اس سے محنت اور دلچسپی سے کام کرنے کا ان پیدا ہوتا ہے۔

اختر انصاری

ایک شخص

میرے دوست حامد حسین ایک معمولی انسان کی طرح جیے، لیکن ایک قطعی غیر معمولی انسان ہو کر مرے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک معمولی حیثیت، معمولی تعلیم، معمولی شکل و صورت اور معمولی مزاج و طبیعت کے آدمی تھے۔ لیکن جب پینتالیس سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا تو ہر شخص نے بے اختیار یہ محسوس کیا کہ وہ ہرگز کوئی معمولی آدمی نہیں تھے بلکہ اِس حد تک غیر معمولی واقع ہوئے تھے کہ ان کو بآسانی عجیب الخلقت اور نادر الوجود خیال کیا جا سکتا تھا۔

انھوں نے دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں بی اے پاس کیا۔ فلسفے میں ایم اے کرنا چاہتے تھے کیونکہ علم کی اس شاخ سے بہت دلچسپی تھی اور یہ ان کا پسندیدہ مضمون تھا۔ لیکن اُن دنوں جنگ سے متعلق دفاتر میں نوجوانوں کو دھڑا دھڑ نوکریاں مل رہی تھیں، اور اِدھر ان کی مالی حالت بھی کچھ بہت اچھی نہیں تھی۔ اِس لیے مزید تعلیم کا ارادہ ترک کر کے محکمۂ فوج کے کسی دفتر میں ملازم ہو گئے۔ گویا فلسفے کے شوق کو بالائے طاق رکھا اور جلبِ زر کے آگے گھٹنے ٹیک دیے۔ لڑائی ختم ہوئی تو رجسٹریشن کے محکمے میں نوکری مل گئی اور جلد ہی سب رجسٹراری کے عہدے تک پہنچ گئے۔ خاصے مزے کے ساتھ زندگی بسر ہوتی تھی۔ آگے پیچھے کوئی تھا نہیں۔ بے اولاد تھے۔ بیوی بالکل نوعمری ہی میں داغِ مفارقت دے چکی تھیں، اور دوسری شادی بس ٹلتی ہی رہتی تھی۔ ماں باپ بھی خدا کو پیارے ہو چکے تھے۔ افرادِ خاندان کے نام پر لے دے کے ایک بیوہ بھاوج اور ان کے دو یتیم بچے تھے جو حامد حسین کے بڑے بھائی صاحب مرحوم کی یادگار نشانیاں تھیں۔ اور اِس نسبت سے اُن کو عزیز تھیں۔ گاؤں میں جو آبائی مکان

تھا اُس کی رکھوالی اِنھیں کے سپرد تھی اور اِنھیں کی کفالت حامد حسین کی تنہا اقتصادی ذمہ داری بھی تھی۔ ہر ماہ باقاعدگی کے ساتھ اُن کو خرچ بھیجا کرتے تھے۔ لیکن ان کو دے دلا کر بھی اتنا بچ رہتا تھا کہ اُن کے عیش و آرام میں کوئی خلل نہیں پڑتا تھا۔ سیر و شکار، پینا پلانا اور ادب اور فلسفے کا مطالعہ ان کی زندگی کے تین اہم مشغلے تھے۔ اگر کوئی غم تھا تو صرف یہ کہ فلسفے میں ایم اے نہیں کر سکے۔ یا پھر یہ کہ بدن کا مٹاپا روز افزوں ترقی پر تھا اور ذیابطیس کے ساتھ ضعفِ بصارت کا مرض بھی لاحق ہو چکا تھا۔

اب یہاں سے حامد حسین کی زندگی کا وہ دور شروع ہوتا ہے جس میں انھوں نے پے بہ پے قلابازیاں کھائیں، اور عجیب الخلقت یا نادر الوجود ہونے کے واضح ثبوت فراہم کیے۔

مکانی فاصلے کے باوجود دیری ان کی ملاقات دوسرے چوتھے مہینے ہوتی ہی رہتی تھی۔ کبھی وہ میرے یہاں اور کبھی میں اُن کے یہاں۔ ——— ایک مرتبہ آئے تو یہ خبر سنائی کہ میں ملازمت چھوڑ رہا ہوں۔

"ملازمت چھوڑ رہے ہو؟ آخر کیوں؟" میں نے سوال کیا۔

"اس لیے کہ میں ایم اے کرنا چاہتا ہوں۔" انھوں نے بڑی سادگی کے ساتھ جواب دیا۔

"مگر ایم اے کرنے کے لیے ملازمت چھوڑنا کیا معنی؟"

"ملازمت چھوڑے بغیر میں ایم اے نہیں کر سکوں گا،" وہ بولے "میں نے پری میچور رٹائرمنٹ کی درخواست دے دی ہے۔ جو کچھ تھوڑی بہت پنشن ملے گی وہ لے لوں گا اور نوکری سے سبک دوش ہو جاؤں گا۔ یونیورسٹی میں باقاعدہ داخلہ لیکر ایم اے کروں گا اور ایم اے کے بعد فلسفے میں ریسرچ کا بھی ارادہ ہے۔"

یہ سب سُن کر میں سناٹے میں آگیا۔ مزید پوچھ گچھ کی تو بولے، "میرے پاس تین چار سال سے زیادہ وقت نہیں ہے۔ اِس تین چار سال میں مَیں ایم اے اور ریسرچ دونوں مکمل کر لینا چاہتا ہوں۔"

تین چار سال کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ پوچھا تو انھوں نے بتایا: "میری بینائی بہت تیزی کے ساتھ زائل ہو رہی ہے۔ آنکھ کا آپریشن کرایا، مگر کچھ نہیں ہوا۔ داہنی آنکھ تو بالکل بیکار ہے ہی۔ بائیں

آنکھ کی بھی ایک چوتھائی روشنی ختم ہو چکی ہے۔ صرف تین چوتھائی باقی ہے جو تین چار سال سے زیادہ نہ چلے گی۔ ڈاکٹروں نے یہی کہا ہے۔"

مجھے اپنے حواس غائب ہوتے ہوئے معلوم ہوئے۔ لیکن انھوں نے پوری سنجیدگی کے ساتھ مطلع کیا: "میں نابینا ہونے سے پہلے ایم اے اور ڈاکٹریٹ دونوں سے فارغ ہو جانا چاہتا ہوں"۔

اس گفتگو کے بعد میرے اور اُن کے درمیان ردو قدح اور بحث و تمحیص کا جو معرکہ گرم ہوا اُس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ وہ اپنے فیصلے پر اٹل تھے۔ بلاشبہ وہ قبل از وقت پنشن لیکر ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ ایم اے کا دو سال کا کورس پورا کیا۔ امتحان دیا اور امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ اس کے بعد ریسرچ کا نمبر تھا۔ لیکن اس کی نوبت نہیں آئی۔ شاید قدرت ان کے ساتھ اتنی دور تک جانے کے لیے تیار نہیں تھی!

ہُوا یہ کہ ایک دن ریل کے سفر میں اُن پر فالج گرا۔ گھر پہنچائے گئے اور پھر اسپتال منتقل کیے گئے۔ مجھے اِس حادثے کی اطلاع ذرا دیر سے ملی، اور جس ذریعے سے ملی اُسی ذریعے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حامد حسین شادی کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اور بہت جلد! یعنی اِسی بیماری کی حالت میں!

میں بدحواس ہو کر گھر سے نکل پڑا۔ سیدھا اُن کے یہاں پہنچا۔ اسپتال سے واپس آچکے تھے۔ لیکن حالت خراب تھی۔ دونوں ٹانگوں پر فالج کا اثر تھا۔ بغیر کسی دوسرے شخص کے سہارے کے نہ اُٹھ سکتے تھے نہ چل پھر سکتے تھے۔ اُن کا حال شاعر کے اس شعر کا مصداق تھا ؂

بیٹھا تو عجزِ نقشِ کفِ پا لیے ہوئے
اٹھا تو دردِ دل کا سہارا لیے ہوئے

بات چیت ہوئی تو کوشش کے باوجود مَیں شادی کے بارے میں کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں کر سکا۔ بہت دیر تک وہ بھی نہیں کھلے۔ جس سے خیال ہوا کہ شاید وہ اطلاع جو مجھے ملی تھی غلط تھی۔ لیکن پھر جلد ہی وہ اس موضوع کی طرف آئے۔ اور پتا چلا کہ مجھ تک جو اطلاع پہنچی تھی وہ بالکل صحیح تھی۔ حامد حسین نے شادی رچانے کا فیصلہ کر چکے تھے اور اُن کی بیوہ بھاوج اُن کی عمر بھر کی خدمت اور مالی امداد کے صلے

ہی اُن کے ساتھ نکاح پڑھوانے پر تیار ہو گئی تھیں۔ مجھ میں اتنا دم نہیں تھا کہ میں اُن کے اِس اقدام کی مخالفت کرتا، لیکن اس قدر جاننے کی خواہش ضرور تھی کہ اس شادی کا محرک کون سا جذبہ ہے اور اس میں کون سی علتِ غائی کارفرما ہے۔ معلوم ہوا کہ شادی رچانے میں اُن کے پیشِ نظر جو مقصد تھا وہ یہ تھا کہ اولاد کے ذریعے اُن کا اِس دنیا سے تعلق قائم رہے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ موت ان کے سلسلۂ حیات کو منقطع کر دے اور آنے والی نسلیں اُن کے وجود کے اثرات سے بالکل خالی اور تہی دست ہوں! کہنے لگے، "اگر میں اولاد چھوڑے بغیر اس دنیا سے اُٹھ جاؤں گا تو قیامت تک نسلِ انسانی کا مقروض رہوں گا اور میری روح اِس بوجھ کے نیچے ہمیشہ ہمیشہ کراہتی رہے گی۔"

میں اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر بیٹھ گیا۔ پھر میرے اندر کے عام دنیادار انسان نے سر اُٹھایا اور میں نے دبے لفظوں میں کہا، "یہ سب تو درست ہے، لیکن صحت اِن سب باتوں پر مقدم ہے۔ میرے خیال میں جب تک مکمل تندرستی حاصل نہ ہو جائے اس وقت تک تو شادی کو ملتوی ہی رکھنا چاہیئے۔"

انھوں نے کہا، "اس منصوبے کی تکمیل کے لیے میرے پاس صرف دو سال ہیں۔ مجھے جو کچھ کرنا ہے انھیں دو سالوں میں کرنا ہے۔"

"کیوں؟ اِنھیں دو سالوں میں کیوں؟" میں نے پوچھا۔ "دو سال بعد کیوں نہیں؟"

"دو سال بعد میں مر جاؤں گا۔" انھوں نے جواب دیا۔ آواز سادہ، سپاٹ، بے رنگ اور ہر جذبے سے خالی تھی۔

پھر انھوں نے خود ہی اِس کی تفصیل اِن الفاظ میں بتائی، "میرے اوپر جس فالج کا اثر ہے وہ ایک ترقی پذیر فالج ہے۔ ابھی صرف ٹانگیں متاثر ہیں۔ اوپر کا جسم بتدریج زد میں آئے گا۔ جب یہ اثر قلب تک پہنچے گا تو میری موت واقع ہو جائے گی۔ اس میں دو سال لگیں گے۔ ڈاکٹروں نے یہی بتایا ہے۔"

میں خاموش رہا۔ میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت گویا ختم ہو چکی تھی۔ کچھ توقف کے بعد حامد حسین نے پھر کہا، "میرے پاس صرف دو سال ہیں۔ مجھے جو کچھ کرنا ہے انھیں دو سالوں میں کر ڈالنا ہے۔ اُس

جامعہ میں محفل مشاعرہ

بزم شنکر و شاد کا مشاعرہ دہلی کی ثقافتی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس مشاعرے میں ملک کے بہت سے ممتاز شعراء شرکت کرتے ہیں۔ جامعہ میں اس مشاعرے کے بعد اُن تمام شعراء کو مدعو کیا جاتا ہے جن کی رنگین نوائی اور خوش فکری سے بزم شنکر و شاد جگمگا چکی ہوتی ہے۔ عرصے سے جامعہ میں مشاعرے کی یہ روایت قائم ہے۔ شعرائے کرام یہاں کے مشاعرے میں بڑی خوشی سے شریک ہوتے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ عوامی مشاعروں کی داد و بیداد سے اکتا کر شعراء ایسی محفلوں کے متلاشی رہتے ہیں جہاں سکوت سخن شناس ہو تو ہو مگر تحسین ناشناس نہ ہو۔ اردو کے عوامی مشاعروں میں اکثر شاعروں کو عوام کے ذوق سے سستی مفاہمت کرنی پڑتی ہے اس لئے کہ ان میں سامعین شاعری کو نشاط یا نشے کا مترادف سمجھ کر شریک ہوتے ہیں۔ جامعہ کا مشاعرہ ہمارے شعراء کو ایک ایسا موقع فراہم کرتا ہے جہاں وہ اپنے جوہر فن کو نمایاں کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہاں جسے بھی اعتبار و افتخار حاصل ہو جاتا ہے، وہ صحیح معنوں میں مطمئن و مسرور ہو جاتا ہے۔ اس سال ۱۵ مارچ کو جامعہ کے اوپن ائر تھیٹر میں مشاعرے کا اہتمام کیا گیا جس میں جمیلہ بانو، کامل چاند پوری، شمیم جے پوری، ملک زادہ منظور احمد، سلام مچھلی شہری، کلیم عاجز، نازش پرتاب گڑھی، انور مرزا پوری، نشور واحدی، حسن نعیم، غلام ربانی تاباں اور جاں نثار اختر نے شرکت کی۔ ملک کے ممتاز ادیب اور دانشور جناب ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے مشاعرے کی صدارت فرمائی۔ شعراء کے تعارف و تحسین کا فرض جناب

نور صدیقی نے انجام دیا۔ اس مشاعرے میں جو چیزیں پڑھی گئیں اور جو کلام ہمیں حاصل ہو سکا اس
ایک انتخاب ہم قارئین جامعہ کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔

(ادارہ)

جمیلہ بانو

سوز کی لے میں شکستِ ساز سنتے جائیے — زندگی کی آخری آواز سنتے جائیے
یہ ستارے ہیں ہمارے نقشِ پا کی جھلکیاں — مختصر ہے قصۂ پرواز سنتے جائیے
ہم الجھ کر رہ گئے راہوں کی دار و گیر میں — منزلیں دیتی رہیں آواز سنتے جائیے

کمال چاند پوری

لوگ جس راہ میں جی چھوڑ کے جاں چھوڑ چلے — ہم اسی راہ پہ قدموں کے نشاں چھوڑ چلے
اب کوئی یاد کرے یا نہ کرے، اے ساقی! — ہم تو پیالوں پہ ہونٹوں کے نشاں چھوڑ چلے

شمیم جے پوری

ہزار اہلِ جنوں حلقۂ رسن میں رہے — مگر خیالِ پرستاریِ چمن میں رہے
ترے خیال کے احساں رہیں گے یاد ہمیں — جس انجمن میں رہے تیری انجمن میں رہے
مزہ تو جب ہے رہیں روحِ گلستاں بن کر — ہمارے بعد ہماری مہک چمن میں رہے

ملک زادہ منظور احمد

دل کا ہر قطرۂ خوں رنگِ حنا سے مانگو — خوں بہا دوستو قاتل کی ادا سے مانگو
مت بناؤ یدِ بیضا کو گدا کا کشکول — وقتِ فرعون ہو جب، ضربِ عصا سے مانگو

کب تلک شاخِ وفا لائیگی زخموں کے گلاب — کوئی تاثیر نئی آب و ہوا سے مانگو

کلیم عاجز

انھیں زلفوں کا افسانہ کہیں گے — بلا سے لوگ دیوانہ کہیں گے
ہمیں میخانے کی چشم و زباں ہیں — ہمیں رودادِ میخانہ کہیں گے
فقیرانہ صدا ہوگی ہماری — مگر ہم بات شاہانہ کہیں گے
جو ہم کہتے ہیں ساقی کل وہ سنیں، — سبو و جام و پیمانہ کہیں گے
گریباں چاک کل اُن کا بھی ہوگا — وہ کب تک ہم کو دیوانہ کہیں گے

نازش پرتاب گڑھی

یوں لوگ چونک چونک کر انگلی اٹھائے ہیں — جیسے ہم آج پہلے پہل مسکرائے ہیں
فرصت کہاں نصیب قیام و قرار کی — ہم لوگ وقتِ شام درختوں کے سائے ہیں
چہرے پہ پڑ رہی ہے تری بے رخی کی دھوپ — سینے میں ہر طرف تری یادوں کے سائے ہیں

انور مرزاپوری

بات بھی تیری رکھنی ہے ساقی، ظرف کو بھی نہ رسوا کریں گے
ہم تڑپ کر بھی ہنستے رہیں گے، وہ سکوں پا کے تڑپا کریں گے
اِس طرف اپنا دامن جلے گا اُس طرف اُن کی محفل سجے گی
ہم اندھیرے کو گھر میں بلا کر، ان کے گھر میں اجالا کریں گے

نشورؔ واحدی

غمِ خاموش جو با اشکِ چکاں رکھتا ہوں — ایک ٹھیرے ہوئے دریا کو رواں رکھتا ہوں

ظر ہیں حرم و دیر کے گوشے یعنی — میں نے جو شمع جلائی ہے کہاں رکھتا ہوں
منزل ہو مجھے آبلہ پائی سے ہے کام — کچھ زمیں کہتی ہے میں پاؤں جہاں رکھتا ہوں

ں کی طرح ہم اسیرانِ گلشن — خود اپنے لہو میں نہائے ہوئے ہیں
رہبر تمہارے تو سو جاتے کب کے — ہمیں ہیں جو اِن کو جگائے ہوئے ہیں

ن نعیم

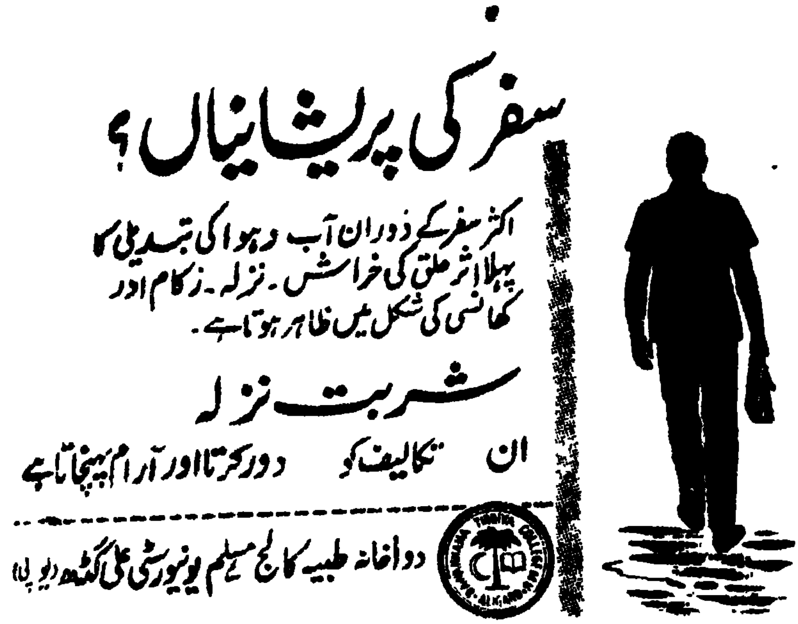
ایک بھی حرف نہ تھا خوش خبری کا لکھا — نامۂ وقت ملا اور کسی کا لکھا
آ بسے کتنے نئے لوگ مکانِ جاں میں — بام و در پر ہے مگر نام اسی کا لکھا
موجۂ اشک سے بھیگی نہ کبھی نوکِ قلم — وہ انا تھی کہ کبھی درد نہ جی کا لکھا
کوئی جدت تو کوئی حسنِ تغزل سمجھا — مرثیہ جب بھی کوئی اپنی صدی کا لکھا

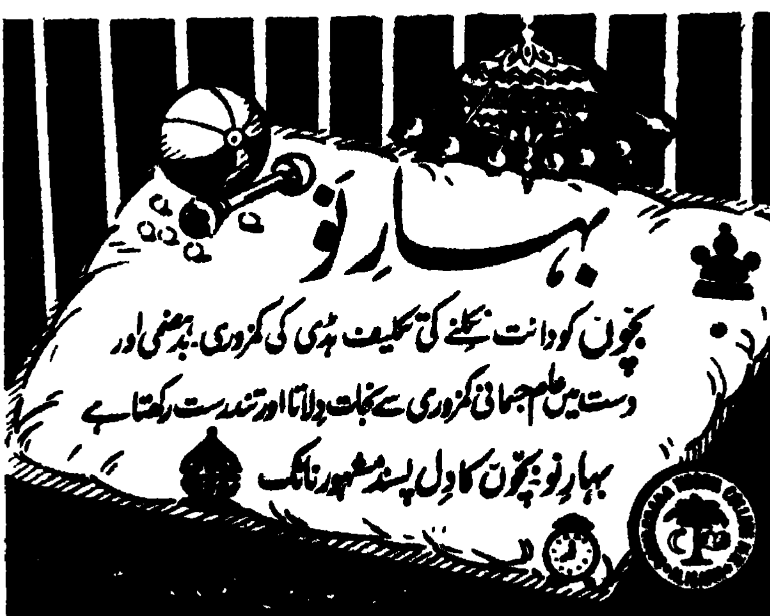
ام مچھلی شہری

خواب اور حقیقت میں جب بھی چھیڑ ہوتی ہے، خواب ہار جاتے ہیں
اور یوں بھی ہوتا ہے، تلخئ حقائق میں، خواب یاد آتے ہیں

ل نثار اختر

ے بھاگا نہ کرو دور غزالوں کی طرح — ہم نے چاہا ہے تمہیں چاہنے والوں کی طرح
ے مایوس نہ ہو اے شبِ دوراں کہ ابھی — دل میں کچھ درد چمکتے ہیں اُجالوں کی طرح
ے نظریں تو ملاؤ کہ ہزاروں چہرے — میری آنکھوں میں سلگتے ہیں سوالوں کی طرح
ز مجھ کو ملا کیا، مری محنت کا صلہ — چند سکے ہیں مرے ہاتھ میں چھالوں کی طرح
ملا جس کو ترا پیار ملا، وہ جانے — ہم تو ناکام رہے چاہنے والوں کی طرح


سفر کی پریشانیاں ؟
اکثر سفر کے دوران آب و ہوا کی تبدیلی کا پہلا اثر حلق کی خراش۔ نزلہ۔ زکام اور کھانسی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔
شربت نزلہ
ان تکالیف کو دور کرتا اور آرام پہنچاتا ہے
دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڈھ (یو پی)


بہارِ نو
بچوں کو دانت نکلنے کی تکلیف ہڈی کی کمزوری۔ بدہضمی اور دست میں عام جسمانی کمزوری سے نجات دلاتا اور تندرست رکھتا ہے
بہارِ نو بچوں کا دل پسند مشہور ٹانک

Regd. No. D - 768 May, 1971

The Monthly JAMIA

JAMIA NAGAR, NEW DELHI-25

جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

جامعہ

سالانہ چندہ
چھ روپے

قیمت فی پرچہ
پچاس پیسے

جلد ۶	بابت ماہ جون ۱۹۷۱ء	شمارہ ۶

فہرست مضامین

مُدیر

ضیاء الحسن فاروقی

خط و کتابت کا پتہ:

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

طابع و ناشر: عبد اللطیف اعظمی مطبوعہ: یونین پریس دہلی ٹائیٹل:

شذرات

اس وقت جبکہ یہ شذرات لکھے جا رہے ہیں، مشرقی بنگال سے آنے والے پناہ گزینوں کی تعداد
ں لاکھ سے اوپر پہنچ چکی ہے، ان میں ہر مذہب و ملت کے لوگ ہیں اور وہ ستم رسیدہ لوگ بھی جو بنگالی
ں ہیں اور جنہیں "بہاری" کہا جاتا ہے۔ ان غیر بنگالیوں میں اکثریت اُن مسلمانوں کی ہے جو تقسیم
بعد بہار، اتر پردیش اور دوسرے علاقوں سے ہجرت کر کے، اپنے وطن، عزیز و اقارب، مسجدیں اور
م بارٹے، غرض اپنا سب کچھ چھوڑ کر خداداد مملکت میں اپنی زندگی بنانے اور اپنے بچوں کا مستقبل
دارنے گئے تھے، ایک ایسے دیس میں جہاں کی آب و ہوا مختلف، ندی نالے، پہاڑیاں اور وادیاں
ی زبان و ثقافت بالکل الگ، مشترک کوئی چیز اگر ہے تو صرف مذہب، ہزاروں لاکھوں مسلمان
، اہلِ وطن کو خیرباد کہہ کر جا بسے، اور گزشتہ تیئس برس میں اس نئے ملک کی بود و باش، زبان و معاشر
، اپنے آپ کو ہم آہنگ نہ کر سکے، اس نئے دیس کے اصلی باشندوں یعنی بنگالیوں پر کیا گزر رہی ہے،
طرح وہ اسلام کے نام پر بنائے گئے پاکستان میں معاشی استحصال (جو سراسر غیر اسلامی ہے) اور
لمانہ لوٹ کھسوٹ کا شکار ہیں اور دولت سمٹ کر مغربی پاکستان کے اُن چند خاندانوں میں مرتکز
رہی ہے جنہیں اپنے غریب عوام سے کوئی تعلق نہیں، ان امور سے مہاجرین نے کوئی سروکار
یں رکھا، اور ایک طرح سے بنگالیوں کے استحصال میں یہ بھی شریک رہے، اس کا نتیجہ جو ہونا تھا
منے ہے۔ ہم کسی طرح ان پر کئے گئے مظالم کے حق میں نہیں ہیں، ہم اس کی بھی مذمت کرتے
للم ظلم ہے خواہ وہ کہیں ہو اور کرنے والا کوئی ہو۔ بنگالیوں کے ایک بڑے طبقے میں انتہا پسندا
تی کا جذبہ کار فرما ہے اور یہ بات خود ان کے حق میں اچھی نہیں، غیر بنگالیوں پر ستم ڈھا کر انہوں
نے کیس کو کمزور کر لیا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے اور بہت بڑا سوال کہ آخر یہ سب کیوں ہوا اور

اس انتہائی المناک صورتِ حال کی ذمہ داری کس پر ہے؟ اس سوال کا جواب پاکستان کے اربابِ حل وعقد، اصحابِ شریعت اور اُن زعمائے ملت پر ہے جنھیں اپنے ملک کی علاقائی سالمیت کا بہت زیادہ خیال ہے، ایسی علاقائی سالمیت جو ہر طرح کے ظلم وجور کو روا رکھے اور حریتِ فکر وآزادیٔ ضمیر کا گلا گھونٹ دے۔

پس، لاکھوں پناہ گزینوں میں وہ غیر بنگالی بھی ہیں جنھیں جیتے جی، بے گور وکفن اُس میت سے تشبیہ دی جاسکتی ہے جس کا وطن بھی چھوٹا اور جسے غریب الوطنی بھی راس نہیں آئی۔ اور اب برسوں کے بعد تباہ وبرباد ہوکر ایک بار پھر وہ اپنے اصلی وطن کو لوٹتے ہیں تو یہاں یہ نہیں ہونا چاہیے کہ انھیں شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھا جائے۔ یہ بھی مظلوم ہیں، خود اپنے ہاتھوں انھوں نے اپنے کو تباہ کیا ہے اور بنگال میں بھی اِن پر ظلم ہوا ہے، اس لئے انسانیت اور شرافت کے تقاضوں کا بہر حال خیال رکھنا چاہیئے۔ اُدھر بنگلا دیش کے رہنماؤں کا فرض ہے کہ وہ مشرقی بنگال میں ان مظلوموں کے خلاف مسموم فضا کو ہموار اور خوشگوار بنانے کی کوشش کریں۔ یہاں اس بات کو صاف کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ غیر بنگالیوں کی ستم رسیدگی سے مغربی پاکستان کی فوج کے ظلم وجور بربریت ودحشت کے گناہ کا بوجھ ہلکا نہیں ہوتا، اس نے حیوانیت اور درندگی کا جو مظاہرہ کیا ہے اور جو کچھ وہ کررہی ہے، اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ یہ فوج دینِ مصطفٰےؐ کے ناموس کو عارضی اقتدار کے لئے مشرقی بنگال میں بیچ رہی ہے اور اس فریب میں مبتلا ہے کہ بے گناہ انسانوں کا خون بہاکر وہ اسلام کی عظیم الشان خدمت انجام دے رہی ہے۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد چشمِ فلک نے یہ بھی دیکھا کہ انسانوں کی ایک بڑی تعداد مختلف ملکوں میں بے وطن کردی گئی اور وہ اپنے باپ دادا کے گھر سے، اُن گلی کوچوں، شہروں اور دیہاتوں سے نکال دیئے گئے ہیں جہاں وہ پیدا ہوئے، بچپن گزرا، جوان ہوئے، شادی بیاہ ہوا اور ان کا گھر بسا

دن معلوم ہوا کہ وہ اپنے ہی وطن میں بے وطن اور اپنے ہی دیس میں اجنبی ہیں۔ پھر وہ دوسرے علاقوں میں دھکیل دیئے گئے، یا خود جان بچا کر چلے گئے، ۱۹۴۷ء میں یہی صورت برصغیر ہند و پاکستان میں پیش آئی اور اُدھر وطن سے محرومی مغربی ایشیا میں دس بارہ لاکھ فلسطینی عربوں کی تقدیر بن گئی، اب پھر بائیس تیئس سال بعد مشرقی بنگال میں پاکستان کی فوجی کارروائی کی وجہ سے تیس لاکھ سے زیادہ انسانوں کو اسی المناک غریب الوطنی کا سامنا ہے۔ اندیشہ ہے کہ اگر روک تھام نہ ہوئی تو جلد ہی یہ تعداد ساٹھ ستر لاکھ تک پہنچ جائے گی۔ ہندوستان میں انسانیت کا وجود نہ ہوتا تو وہ ان مظلوم اور تباہ حال پناہ گزینوں پر اپنی سرحدیں بند کر دیتا۔

لیکن رامؔ اور گوتمؔ، چشتیؔ اور نانکؔ کی سرزمین ایسا نہیں کر سکتی تھی، مشرقی بنگال والوں سے ہمارا ایک رشتہ تو خون کا ہے اور دوسرا انسانیت کا، ہم ان دونوں رشتوں کو کیسے رسوا کر سکتے تھے مگر اتنی بڑی تعداد میں پناہ گزینوں کی آمد سے اب یہ مسئلہ ساری دنیا کا مسئلہ بن گیا ہے، حکومتِ پاکستان بڑی دیدہ دلیری سے بار بار یہ کہتی رہتی ہے کہ مشرقی بنگال میں جمہوریت کشی، نسل کشی اور فوجی مظالم پاکستان کا گھریلو معاملہ ہے، لیکن انسانیت اور انجمن اقوامِ متحدہ کی کئی بین الاقوامی دستاویزوں، دونوں کا تقاضا ہے کہ نہ صرف ہندوستان اسے اپنا معاملہ سمجھے بلکہ دنیا کے دوسرے ملک اور بین الاقوامی ادارے پاکستان کو اس الجھن سے جسے اس نے خود پیدا کیا اور جس پر اب اُسے قابو نہیں، نکالنے میں مدد دیں۔

فلسطینی عربوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا اور ہم دیکھتے ہیں کہ مغربی ایشیا کے بحران میں اضافہ ہی ہوتا رہا، مشرقی پاکستان سے آئے ہوئے پناہ گزینوں کی وجہ سے آسام اور مغربی بنگال کے علاقے میں امن و سلامتی کو خطرہ پیدا ہو گیا ہے، اس حقیقت سے چشم پوشی کی جائے گی تو بین الاقوامی امن درہم برہم ہو سکتا ہے۔

حکومتِ پاکستان کی بے رحمی اور شقی القلبی کا یہ حال ہے کہ وہ برملا تیس لاکھ سے زیادہ ان پناہ گزینوں کو ہندستانی مداخلت کا کہتی ہے۔ اس نے اعلان کیا ہے کہ لاکھوں نفوسِ انسانی کو بھگا کر اس نے ارضِ پاک

کو ہندوستان کے بھیجے ہوئے تخریب کاروں اور دراندازوں سے پاک کر دیا ہے۔ کاش، وہ اپنے دامن اور بندِ قبا سے ٹپکتے ہوئے اُن بے گناہ انسانوں کا خون دیکھ سکتے جن میں معصوم بچے، بے سہارا لڑکیاں، ضعیف ناتواں عورتیں، کمزور اور بوڑھے مرد بہت بھاری تعداد میں ہیں، کیا یہ سب ہندوستان کے بھیجے ہوئے مداخلت کار ہیں؟ کتنی جوان لڑکیاں ہیں جن کے ماں باپ بھائی مارے گئے، اب ان کو کون سہارا دے گا، وہ پاکستان جائیں بھی تو کس کے پاس جائیں، سوگوار مائیں جو اپنے شوہروں اور جیالے بیٹوں کو کھو کر ادھر آگئی ہیں، ان کی پہاڑ سی زندگی کیسے کٹے گی، دودھ پیتے بچے جنہیں اپنے باپ کا سایہ کبھی نہ مل سکے گا۔ اور یہ سب بے گناہ انسان حکومتِ پاکستان کی نظر میں ہندوستان کے ایجنٹ ہیں۔ کیا چشمِ گردوں نے اس سے پہلے بھی کبھی شیطنت کا ناچ اس زمین پر اس انداز کا دیکھا تھا؟ پاکستان کے رہنما بظاہر اسلام کا نام بڑی عقیدت سے لیتے ہیں، اسلام کے نام ہی پر ہندوستان کے مسلمانوں کو مسلم لیگی رہنماؤں کے نظریے کے مطابق یرغمال بنا کر چھوڑ دیا گیا۔ اُس وقت وہ کتاب سنت کا نام بہت لیتے تھے اور پاکستان میں ایک اچھی زندگی کا فریب دیتے تھے، لیکن طاقت ملتے ہی ان رہنماؤں اور ان کے حاشیہ نشین پاکستانیوں نے نہ کتاب سے واسطہ رکھا اور نہ سنت ہی سے کوئی تعلق رکھا۔ ایسے ہی لوگوں کے لئے جو اس وقت اسلام اور پاکستان کی علاقائی سالمیت کو اپنی غرض کے لئے مترادف قرار دیتے ہیں، اور اسی نعرہ کے ساتھ مشرقی پاکستان میں لاکھوں انسانوں کا خون بہا رہے ہیں، قرآن شریف میں کہا گیا ہے:۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۙ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ۝ وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۗ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ۝ (اور دیکھو) بعض آدمی ایسے ہیں کہ دنیوی زندگی کے بارے میں ان کی باتیں تمہیں بہت ہی اچھی معلوم ہوتی ہیں اور وہ اپنے ضمیر کی پاکی پر اللہ کو گواہ ٹھہراتے ہیں، حالانکہ فی الحقیقت وہ دشمنی اور خصومت میں بڑے ہی سخت ہیں۔ جب انہیں حکومت مل جاتی ہے تو ان کی تمام سرگرمیاں ملک میں اس لئے ہوتی ہیں تاکہ خرابی پھیلائیں اور انسان کی زراعت اور محنت کے نتیجوں کو اور اس کی نسل کو ہلاک کر دیں، حالانکہ اللہ یہ کبھی پسند نہیں کر سکتا کہ (زندگی و آبادی کی جگہ) ویرانی اور خرابی پھیلا دی جائے ـــــ البقرۃ: ۲۰۴ و ۲۰۵، ترجمہ از مولانا آزاد)

سیّد جمال الدین افغانی
ترجمہ: ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی

اسلام اور سائنس

موسیو رینان کی تقریر کا جواب

مارچ ۷۱ء کی اشاعت کے شذرات میں ہم نے لکھا تھا کہ اسلام اور سائنس کے موضوع پر سوربون یونیورسٹی (پیرس) میں فرانس کے مشہور عالم رینان نے جو تقریر کی تھی اس کا جواب سیّد جمال الدین افغانی نے ۱۸ مئی ۱۸۸۳ء کے Journal Des Debates میں شائع کرایا تھا، آئندہ کسی اشاعت میں اس کا ترجمہ "جامعہ" میں دیا جائے گا۔ ہمارے ساتھی اور جامعہ کالج میں اُردو ادب کے اُستاد جناب ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی نے ہماری درخواست پر اس کا ترجمہ کیا ہے۔ اصل مضمون فرانسیسی میں ہے، اس کا انگریزی ترجمہ پروفیسر این، آر، کیڈی نے اپنی کتاب An Islamic Response to Imperialism میں چھاپا ہے اسی انگریزی ترجمہ کا یہ اُردو ترجمہ ہے۔ ہمیں سیّد جمال الدین افغانی کی کئی تشریحات وتعبیرات سے اتفاق نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ افغانی کی اس تحریر میں مدافعت، معذرت اور مرعوبیت کا رنگ غالب ہے اور اسلوب مناظرانہ ہے۔ اور یہی اس کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ ہمیں اس بات سے بھی اختلاف ہے کہ مذہب اور فلسفہ وسائنس ایک دوسرے کی ضد ہیں، علوم سے متعلق جدید نظریئے کچھ اور کہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں کا دائرۂ کار الگ الگ ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ دونوں ایک دوسرے سے متعارض ہیں۔ اس سلسلہ میں غبارِ خاطر کے ایک خط میں مولانا آزاد نے لکھا ہے: "..... علم اور مذہب کی جتنی نزاع ہے فی الحقیقت علم اور مذہب کی نہیں ہے۔ مدعیانِ علم کی خامکاریوں اور مدعیانِ مذہب کی ظاہر پرستیوں اور قواعد سازیوں

کی ہے۔ حقیقی علم اور حقیقی مذہب اگرچہ چلتے ہیں الگ الگ راستوں سے، مگر بالآخر پہنچ جاتے ہیں ایک ہی منزل پر۔ علم عالمِ محسوسات سے سروکار رکھتا ہے۔ مذہب ماورائے محسوسات کی خبر دیتا ہے۔ دونوں میں دائروں کا تصادم ہوا، مگر تعارض نہیں ہوا۔ جو کچھ محسوسات سے ماوراء ہے ہم اُسے محسوسات سے معارض سمجھ لیتے ہیں اور یہیں سے ہمارے دیدۂ کج اندیش کی ساری درماندگیاں شروع ہو جاتی ہیں :

برچہرۂ حقیقت اگر ماند پردۂ
جرم نگاہ و دیدۂ صورت پرست ماست"

بہرحال سید جمال الدین افغانی کے مضمون کا اُردو ترجمہ آپ کے سامنے ہے۔ آپ کو بھی اس کی کئی باتوں سے اختلاف ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہمیں ان کے فرمودات کو غور سے پڑھنا چاہئے۔ جہاں تک میرا خیال ہے، اُردو میں افغانی کی یہ تحریر پہلی بار شائع ہو رہی ہے۔"
'مدیر'

جناب عالی،

میں نے آپ کے موقر جریدے Journal Des Debates مورخہ ۲۹ مارچ میں اسلام اور سائنس پر وہ خطبہ پڑھا جو ہمارے عہد کے ایک بڑے مفکر یعنی گرامی قدر موسیو رینان نے جن کی شہرت نہ صرف دنیائے مغرب میں پھیلی ہوئی ہے بلکہ مشرق کے دور دراز ممالک میں بھی پہنچ چکی ہے سوربون یونیورسٹی میں ممتاز لوگوں کے ایک مجمع کے سامنے دیا تھا۔ چونکہ اس خطبہ سے میرے دل میں چند خیالات پیدا ہوتے ہیں اس لئے میں آپ کے نام اس خط میں انھیں پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں اور گزارش ہے کہ آپ انھیں اپنے جریدہ میں جگہ دیں۔

موسیو رینان کا مقصد یہ تھا کہ وہ عربوں کی تاریخ کی ایک ایسی بات کی وضاحت کریں جو ابھی تک غیر واضح تھی اور وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ اُن کے ماضی پر بھرپور روشنی ڈالیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس سے ان لوگوں کو تکلیف ہو جو عربوں کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ لیکن یہ کوئی اہمیت

کہہ سکتا کہ موسیو رینان نے عربوں کو اُس مقام سے گرا دیا ہے جو اس سے پہلے ان کو دنیا میں حاصل تھا۔ نہیں یقین ہے کہ موسیو رینان نے یہ کوشش ہرگز نہیں کی کہ وہ عربوں کی اس شان و شوکت پر پانی پھیر دیں جو حقیقت میں شائی نہیں جا سکتی۔ انھوں نے تو تاریخی صداقت کی دریافت کی کوشش کی ہے تاکہ وہ لوگ جو ناواقف ہیں اِسے جان لیں اور ان لوگوں کو بھی یہ تاریخی صداقت معلوم ہو جائے جو قوموں کی تاریخ میں اور بالخصوص تاریخ تہذیب میں مذاہب کے اثرات کا مطالعہ کرتے ہیں۔ میں یہ پہلے ہی کہہ دوں کہ موسیو رینان نے چند ایسے حقائق کا ذکر کیا ہے جن پر اب تک توجہ نہیں دی گئی تھی اور وہ اس مشکل کام سے ایسی حیرت انگیز کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے ہیں کہ تعجب ہوتا ہے۔

مجھے اس خطبہ میں چند قابلِ غور مشاہدات، نئے تصورات اور ایک ناقابلِ بیان دلکشی کا احساس ہوا۔ لیکن میرے سامنے تو اس خطبہ کا محض سیدھا سادہ ترجمہ ہے، اگر مجھے اس کے فرانسیسی متن کے مطالعہ کا موقع ملتا تو میں اس عظیم مفکر کے خیالات کو بہتر سمجھ سکتا۔ بہر حال میرا سر عقیدت سے اس کے سامنے جھک جاتا ہے، اس کا وہ مستحق ہے اور یہی میرے جذبۂ تحسین کا مخلصانہ اظہار بھی ہے۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر میں آخری بات وہی کہوں گا جو فلسفی شاعر المتنبی نے صدیوں پہلے اپنے زمانہ کی ایک بڑی شخصیت سے جو اس کی ممدوح تھی، کہی تھی، یعنی: "وہ تعریف و توصیف جو میں پیش کر سکتا ہوں اُسے شرفِ قبول بخشئے اور مجھے اس بات پر مجبور نہ کیجئے کہ میں آپ کے لئے وہ کلماتِ تحسین استعمال کروں جس کے آپ اصل میں مستحق ہیں۔"

موسیو رینان کے خطبہ میں دو اہم نکات تھے۔ اس ممتاز فلسفی نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مذہبِ اسلام کی فطرت ہی میں یہ بات ہے کہ وہ سائنس کی ترقی کی مخالفت کرے۔ اور دوسری بات یہ کہ عرب طبعاً مابعد الطبیعی علوم اور فلسفے کو ناپسند کرتے ہیں۔ موسیو رینان غالباً یہ سمجھتے ہیں کہ یہ بیش بہا پودا عربوں کے ہاتھوں میں اسی طرح خشک ہو گیا جیسے کوئی پودا ریگستان کی بادِ سموم سے مُرجھا جائے۔ لیکن اس خطبہ کے مطالعہ کے بعد کوئی بھی یہ سوال دل میں لائے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ رکاوٹیں بذاتِ خود خاص مسلمانوں ہی کے مذہب کی پیدا کردہ ہیں یا یہ اس طریقۂ کار

کا نتیجہ جو اسلام کی تبلیغ کے لئے اختیار کیا گیا، یا یہ اُن قوموں کے کردار، طرزِ معاشرت اور اقتصادِ طبع کا نتیجہ تھا جنھوں نے یہ مذہب قبول کر لیا تھا، یا اُن قوموں کی سیرت، معاشرت اور مزاج کا جو اسے قبول کرنے کے لئے مجبور کی گئی تھیں۔ بلاشبہ وقت کی کمی کے باعث موسیو رینان اِن نکات کی وضاحت نہیں کر سکے لیکن اس سے جو نقصان ہونا تھا وہ تو بہرحال ہوا، اور اگر ان اسباب کو جامع اور ناقابلِ تردید شواہد کے ذریعہ متعین کرنا مشکل ہے تو اس سے زیادہ مشکل ہے اس نقصان کی تلافی کرنا۔

جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ کوئی قوم اپنی ابتدائی حالت میں اس لائق نہیں ہوتی کہ عقلِ محض کو اپنا رہنما بنائے۔ اُسے دہشت اور خوف گھیرے رہتے ہیں جن سے وہ نکل نہیں سکتی اور اس لئے اس میں نیک و بد کی تمیز کر سکنے کی صلاحیت نہیں ہوتی اور نہ یہ سمجھ سکتی ہے کہ کون سی باتیں اس کے لئے باعثِ رحمت ہوں گی اور کونسی باعثِ زحمت، مختصراً یہ کہ وہ علّت و معلول کے سلسلے کو سمجھنے سے یکسر قاصر ہوتی ہے۔

اِس کمی کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ نہ تو طاقت سے اور نہ ترغیب سے اُسے ایسے عمل پر آمادہ کیا جا سکتا ہے جو غالباً اس کے لئے بہت زیادہ نفع بخش ہوں گے اور نہ اُن اعمال سے بچایا جا سکتا ہے جو اس کے لئے مضر ہوں گے۔ لہٰذا یہ ضروری ہو گیا کہ انسان اپنی ذات سے ہٹ کر ایسی جائے پناہ یا پُرسکون گوشہ تلاش کرنے کی کوشش کرے جہاں اس کا بے چین ضمیر سکون پا سکے۔ پھر یہ ہوا کہ انسانوں میں کوئی نہ کوئی معلم پیدا ہو جاتا اور چونکہ اس کے پاس جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں ایسی کوئی طاقت نہ ہوتی تھی کہ انسان کو صرف عقل کی روشنی میں چلائے، اس لئے اس نے ان کے سامنے نامعلوم (دنیا) کے دروازے کھول دیئے، ایسی دنیا جو تصورات کی ہو، جس میں اگرچہ اس (انسان) کی ساری آرزوئیں پوری نہ ہوں مگر کم از کم وہاں اس کی اُمیدیں پوری ہونے کا لامحدود امکان تو ہو۔ چونکہ ابتدا میں انسان واقعات کے اسباب اور اشیاء کی ماہیت سے واقف نہیں تھا اس لئے اسے اپنے معلمین کی ہدایات اور احکامات پر عمل کرنا ہی پڑتا تھا۔ اور یہ اطاعت اس ایک اعلیٰ و برتر ہستی کے نام پہ ہوتی تھی جس سے معلم تمام واقعات کو منسوب کرتا تھا اور لوگوں کو اس عقیدے

افادیت و مغفرت پر بحث کی اجازت نہیں تھی۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ بلاشبہ یہ انسان پر ایک بہت بھاری اور اہانت آمیز بوجھ ہے لیکن اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اسی مذہبی تعلیم کے وسیلے سے، خواہ یہ تعلیم اسلام کی ہو، خواہ عیسائیت یا کسی غیر اہلِ کتاب کے مذہب کی، دنیا کی تمام قومیں بربریت کی منزل سے نکل کر ترقی اور تہذیب کی طرف آگے بڑھی ہیں۔

اگر یہ سچ ہے کہ مذہبِ اسلام علوم کے فروغ میں ایک رُکاوٹ ہے تو کیا کوئی وثوق سے کہہ سکتا ہے کہ یہ رُکاوٹ کسی دن دور نہ ہوگی اور کس طرح اس بات میں مذہبِ اسلام دیگر مذاہب سے مختلف نظر آتا ہے؟ تمام مذاہب اپنے اپنے طور پر (اس سلسلے میں) ناروادار ہیں۔ عیسائی مذہب یعنی وہ سماج جو اس کے فیضان کا مرہونِ منت ہے، جو اس کے احکامات پر عمل کرتا ہے اور جس نے اسی سانچے میں اپنے آپ کو ڈھالنے کی کوشش کی ہے، وہ بھی اُس عہد سے گزر چکا ہے جس کی طرف میں نے ابھی اشارہ کیا ہے، اور پھر آزاد اور خود مختار ہو کر ترقی و سائنس کی راہ پر تیزی سے گامزن نظر آتا ہے جبکہ مسلم سماج نے ابھی تک اپنے آپ کو مذہب کی فرمانروائی سے آزاد نہیں کیا ہے۔ پھر بھی یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ عیسائی مذہب دنیا میں مذہبِ اسلام سے کئی صدی پہلے آیا ہے، میں یہ اُمید کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ کسی نہ کسی دن مسلم سماج اپنی تمام بندشوں کو توڑ کر مغربی سماج کے طرز پر ایک عزم کے ساتھ، اس تہذیب کی شاہراہ پر چلنے میں کامیاب ہوجائے گا جس میں عیسائی مذہب اپنے کٹرپن اور ناروا داری کے باوجود ناقابلِ عبور رُکاوٹ نہیں بن سکا۔ نہیں! میں یہ نہیں مان سکتا کہ اسلام کے سلسلے میں ہم ایسی اُمید نہ کریں۔ میں اس موقع پر موسیو رینان کے سامنے مذہبِ اسلام کی حمایت نہیں کر رہا ہوں بلکہ ان کروڑوں... انسانوں کی طرف سے بول رہا ہوں جو اس طرح بربریت اور جہالت کی زندگی گزار دینے پر مجبور ہوں گے۔ یہ سچ ہے کہ مذہبِ اسلام نے علم و سائنس کو دبانے اور اس کی ترقی کو روکنے کی کوشش کی ہے اور اس طرح اُسے فکر و فلسفے اور دانش و حکمت کی تحریکوں کو روکنے اور علمی سچائیوں کی ان سے ذہنوں کا رُخ موڑنے میں کامیابی ہوئی ہے۔ اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو اسی طرح کی کوشش

عیسائی مذہب نے بھی کی تھی اور جہاں تک میرے علم میں ہے کیتھولک چرچ کے برگزیدہ رہنما اب بھی اپنی اس کوشش میں مصروف ہیں۔ وہ علمی کاوشوں کو گناہ اور خرافات سے تعبیر کرتے اور پوری طاقت سے علم اور سائنس کی مخالفت کرتے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ فلسفیانہ استدلال اور علمی و تحقیقی طریقۂ کار کی مدد سے سچائی تک پہنچنے کی راہ مسلمانوں پر مسدود ہے، اس لئے مجھے اُن دشواریوں کا علم بھی ہے جن پر انھیں تہذیب و تمدن کی اسی سطح پر آنے کے لئے قابو حاصل کرنا ہوگا۔ یورپ میں کم سے کم کچھ لوگوں کا یہ خیال ضرور ہے کہ ایک راسخ الاعتقاد آدمی کو ایسی علمی کاوشوں کی طرف رُخ نہ کرنا چاہئے جن کا مقصد علمی صداقت کی دریافت ہو۔ اُسے ہل میں جُتے ہوئے بیل کی مانند اپنے عقیدے کا جُوا، جس کا وہ غلام ہے گردن پر رکھے، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس لیک پر چلنا چاہئے جس کی نشاندہی پہلے ہی سے قانون کے ترجمان کر چکے ہیں۔ مزید برآں، اس یقین کے ساتھ کہ اس کا مذہب تمام اخلاقی اصولوں اور علوم پر محیط ہے وہ اس سے پوری قوتِ ایمانی کے ساتھ وابستہ رہے اور آگے جانے کی کوئی جدوجہد نہ کرے۔ وہ کیوں بیکار کوششوں میں اپنی جان کھپائے؟ اُسے صداقت کی کھوج سے کیا فائدہ ہوگا۔ جبکہ اُسے یقین ہے کہ یہ اس کے پاس پہلے ہی سے پوری کی پوری موجود ہے؟ کیا وہ اس وقت زیادہ خوش اور مطمئن ہوگا جب وہ اپنے عقیدے سے محروم ہو جائے اور اُس کا یہ یقین فنا ہو جائے کہ دوسرے مذاہب کے مقابلے میں اُس کا اپنا مذہب ہر لحاظ سے مکمل ہے۔ پھر وہ سائنس سے کیوں نفرت کرے؟ میں یہ سب جانتا ہوں لیکن اس کے ساتھ یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ مسلمان اور عرب جس کی موسیو رینان نے بلند آہنگ الفاظ میں تصویر کھینچی ہے اور جو آگے چل کر سخت متعصب بن جاتا ہے اور اس لایعنی غرور میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ صداقتِ مطلق اسی کے پاس ہے، اس کا تعلق اس نسل و قوم سے ہے جس نے آگ اور خون سے نہیں بلکہ انتہائی شاندار اور نتیجہ خیز کارناموں سے تاریخِ عالم کی گزرگاہوں میں اپنے پائیدار نقوش چھوڑے ہیں۔ اِن کارناموں سے ثابت ہے کہ اس کو سائنس اور جملہ علوم (بشمول فلسفہ) سے گہرا تعلق رہا ہے (جہاں تک فلسفے کا تعلق ہے، مجھے تسلیم ہے کہ زیادہ عرصے تک یہ

تعلق باقی نہیں رہا۔)

اب میں اس دوسری بات کے بارے میں کچھ عرض کرتا ہوں جسے موسیو رینان نے اپنے خطبہ
میں ناقابل تردید اسناد کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس سے کوئی بھی منکر نہیں ہے کہ عرب قوم جبکہ ابھی
وہ تہذیب و تمدن کے ابتدائی مرحلوں ہی میں تھی، اپنی فتوحات ہی کی طرح تیز رفتاری کے ساتھ
ذہنی اور علمی ترقی کی راہ پہ گامزن ہوگئی تھی، کیونکہ سو برس کے عرصے میں ہی اس نے ان تمام یونانی اور
ایرانی علوم کو جنھوں نے اپنی سرزمین پر آہستہ آہستہ کئی صدیوں میں ترقی کی تھی، اسی طرح جذب اخذ
کرلیا جس طرح اس نے اپنے سیاسی اقتدار کو جزیرہ نمائے عرب سے ہمالیہ کے کوہستانی سلسلوں
در بدر ہی نیز کی بلند و بالا چوٹیوں تک پہنچا دیا تھا۔

کہا جاسکتا ہے کہ اس تمام عرصے میں عربوں میں اور اُن کے زیر اقتدار دوسرے ملکوں میں
علوم نے حیرت انگیز ترقی کی۔ اس وقت روم اور بازنطین دینی اور فلسفیانہ علوم کے مرکز تھے۔
یونانیوں اور رومیوں نے صدیوں تہذیب و تمدن کی راہ پر چلنے کے بعد سائنس اور فلسفے کے
اس وسیع میدان کو طے کیا تھا، لیکن ایک وقت ایسا آیا جبکہ ان کی علمی تحقیقات کو پس پشت
ڈال دیا گیا اور ان کی علمی کاوشوں کی رفتار روک دی گئی۔ انھوں نے سائنس کی جو یادگاریں
قائم کی تھیں نیست و نابود ہوگئیں اور اُن کی بیش بہا کتابیں نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہوکر رہ گئیں۔
عربوں نے جو ابتدا میں جاہل اور تہذیب و تمدن سے بیگانہ تھے، ان چیزوں کو جنھیں مہذب
قوموں نے ترک کردیا تھا اپنا کر ان علوم کی بجھی ہوئی شمعوں کو نہ صرف روشن کیا بلکہ ان کو ترقی
دی اور ایسی تابناکی عطا کی جو ان علوم کو اس سے قبل کبھی نصیب نہ ہوئی تھی۔ کیا یہ بات علوم
سے ان کی طبعی محبت کی آئینہ دار اور دلیل نہیں ہے؟ یہ سچ ہے کہ عربوں نے یونانیوں سے
ان کا فلسفہ اسی طرح لیا جیسے یونانیوں نے ایرانیوں سے ان کی وہ چیز لی تھی جس سے زمانۂ قدیم
میں ان کی عظمت قائم تھی۔ لیکن ان علوم کو جو عربوں کو فتوحات کے سلسلے میں مالِ غنیمت کے
طور پر ہاتھ لگے انھوں نے ترقی دی، آگے بڑھایا، واضح کیا، سنوارا، درجۂ کمال کو پہنچایا اور وسعت

اور قطعیت عطا کی۔ مزید براں فرانسیسی، جرمن اور انگریز، روم اور بازنطین سے اتنی دور نہیں تھے جتنے کہ عرب جن کا دار الخلافہ بغداد تھا لہٰذا اول الذکر کے لئے ان علمی خزینوں سے فائدہ اٹھانا کہیں زیادہ آسان تھا جو ان دو عظیم شہروں میں مدفون تھے۔ لیکن انھوں نے اس ضمن میں اس وقت تک کوئی کوشش نہیں کی جب تک عربی تہذیب و تمدن کی چمک دمک نے پیرینیز کی چوٹیوں کو روشن اور مغرب کو اپنے نور سے منور اور اپنی متاع سے مالامال نہ کر دیا۔ اہلِ یورپ نے ارسطو کو اس وقت قطعی کوئی اہمیت نہیں دی جبکہ وہ ان کا پڑوسی اور یونانی تھا لیکن جب وہ وہاں سے ہجرت کر کے عرب بن گیا تو انھوں نے اس کا استقبال کیا۔ کیا اس سے عربوں کی ذہنی برتری اور فلسفے سے ان کے فطری لگاؤ کا مزید ثبوت نہیں ملتا؟ یہ تو سچ ہے کہ مغرب کی طرح مشرق میں بھی عرب سلطنت کے زوال کے بعد عراق اور اندلس جیسے علوم کے عظیم مرکز پھر جہالت کی تاریکی میں چھپ کر مذہبی جنون کا مرکز بن گئے لیکن اس افسوسناک واقعے سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ عہدِ وسطیٰ کی علمی اور فلسفیانہ ترقی اُن عربوں کا کارنامہ نہیں تھی جو اس وقت مشرق سے مغرب تک حکمراں کی حیثیت سے پھیلے ہوئے تھے۔

موسیو رینان بہرحال عربوں کے اس کارنامہ کو تسلیم کرتے ہیں۔ وہ مانتے ہیں کہ صدیوں تک عربوں نے ہی علم اور سائنس کو محفوظ اور زندہ رکھا۔ ایک قوم کے لئے زندگی کا اس سے زیادہ بہتر نصب العین اور کیا ہو سکتا ہے! وہ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ تقریباً ۷۷۵ء سے لگ بھگ تیرھویں صدی کے وسط تک یعنی کوئی پانچ سو برس تک مسلم ممالک میں ممتاز علماء اور مفکرین کی خاصی تعداد مسلسل موجود رہی اور اس عہد میں اسلامی دنیا ذہنی و فکری طور پر عیسائی دنیا سے افضل اور بہتر تھی، لیکن اسی کے ساتھ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ تاریخ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں جو فلسفی اور مدبر مشہور ہوئے وہ زیادہ تر حران، اندلس اور ایران سے تعلق رکھتے تھے۔ اور ان میں ماوراء النہر اور شام کی وہ مذہبی شخصیتیں بھی تھیں جو بودھ رہبان اور عیسائی کلیسا سے متعلق پروہتوں اور پادریوں کے طبقے سے تعلق رکھتی تھیں۔ مجھے ایرانی علماء کی اعلیٰ صفات اور رعب

دنیا ہیں ان کی خدمات سے انکار نہیں ہے لیکن میں یہ کہنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ حرانی عرب
تھے اور یہ کہ اسپین اور اندلس کی فتح کے بعد بھی وہاں کے عرب عرب ہی رہے۔ اسلام سے کئی سو
برس پہلے سے حرانیوں کی زبان عربی ہی تھی اور اس واقعے سے کہ انھوں نے بعد میں اپنے آبائی
مذہب (صائبین کے مذہب) کو برقرار رکھا، یہ مطلب نہیں نکالا جاسکتا کہ انھیں عرب قومیت
سے خارج سمجھا جائے اسی طرح وہ شامی پادری بھی جنھوں نے عیسائی مذہب قبول کر لیا تھا
بڑی حد تک غسانی عرب ہی تھے۔

جہاں تک ابن ماجہ، ابن رشد اور ابن طفیل کا تعلق ہے کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ چونکہ وہ
عرب میں پیدا نہیں ہوئے اس لئے الکندی کی طرح عرب نہیں ہیں، خصوصاً جب کوئی یہ غور
کرنے پر تیار ہو کہ انسانی نسلیں اپنی اپنی زبانوں سے پہچانی جاتی ہیں اور اگر زبان کا یہ فرق
مٹ جائے تو قوموں کو اپنی اپنی مختلف اصلیتوں کو بھول جانے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔
عربوں نے اپنی جانبازانہ صلاحیتیں اسلام کی خدمت کے لئے وقف کر دی تھیں۔ لڑائی کے میدان
میں اگر وہ اپنے اسلحوں سے کام لیتے تھے تو ساتھ ہی ساتھ اسلام کے مبلغ بھی تھے۔ انھوں نے مفتوحین
پر اپنی زبان نہیں لادی اور جہاں جہاں انھوں نے اپنا اقتدار جمایا اپنی زبان کو انتہائی احتیاط
سے اپنے تک ہی محدود رکھا، حالانکہ اس میں شک نہیں کہ مفتوح ملکوں میں کشت و خون ہوا
اور اسلام نے وہاں اپنی زبان، طرزِ معاشرت اور عقائد کا بیج بویا اور اس طرح یہ ملک ان چیزوں
سے متاثر ہوئے۔ مثلاً ایک مثال ایران کی ہے جہاں ممکن ہے کہ کوئی اسلام سے پہلے کی صدیوں
کا جائزہ لے تو یہ پتہ چلے کہ اس وقت ایرانی عالموں کے لئے عربی زبان قطعی طور پر غیر متعارف نہیں
تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ اسلام کے فروغ نے عربی زبان کو ایک نئی وسعت عطا کی اور جن
ایرانی عالموں نے اسلامی عقیدے کو قبول کر لیا وہ قرآن کی زبان میں کتابیں لکھنا باعثِ فخر
سمجھنے لگے۔ بلاشبہ عرب اس عظمت کے دعویدار نہیں ہوسکتے جس کی وجہ سے یہ مصنفین ممتاز
ہیں لیکن ہمیں یقین ہے کہ انھیں اس کی ضرورت بھی نہیں کیونکہ خود ان کے یہاں کافی تعداد میں ممتاز

عالم اور مصنف موجود ہیں۔ کیا نتیجہ ہوگا اگر ہم عرب اقتدار کے دورِ اوّل پر نظر ڈالیں اور اس پہلی جماعت کو نظر میں رکھیں جس میں ایسے فاتحین تھے جنھوں نے دنیا بھر میں اپنی عظمت کا ڈنکا بجا دیا؟ اور کیا نتیجہ ہوگا اگر ہم ہر اس چیز کو جس کا تعلق اس جماعت اور اس کے جانشینوں سے نہیں ہے نظر انداز کر کے ان اثرات کا خیال نہ کریں جو اس جماعت نے ذہنوں پر ڈالا اور جن کی وجہ سے علوم کی ترقی کے سامان پیدا ہوئے؟ کیا ہم اس سے اس نتیجہ پر نہیں پہنچیں گے کہ فاتحین میں کوئی ایسی خوبی اور صلاحیت نہیں تھی جس کا تعلق فتح کی مادّی حقیقت سے نہ ہو؟ اگر یہ صحیح ہے تو پھر تمام مفتوحہ قومیں دوبارہ اپنی اخلاقی خود مختاری حاصل کر کے تمام عظمت کا سہرا اپنے سر باندھیں گی اور اس طاقت کو جس نے عظمت کے عناصر کو پروان چڑھایا اس میں جائز طور پر کسی طرح شریک نہیں سمجھا جائے گا۔ اس طرح تو اٹلی فرانس سے یہ کہے گا کہ مازارین اور بونا پارٹ فرانس کے نہیں تھے، جرمنی یا انگلینڈ ان عالموں کو اپنا کہیں گے جنھوں نے فرانس آکر یہاں کی علمی ترقی کو چار چاند لگائے اور اس کی علمی شہرت میں اضافہ کیا۔ اس کے جواب میں فرانس ان ممتاز خاندانوں کی اولاد کی عظمت کو اپنی عظمت قرار دے گا جو Nantes کے فرمان کی تنسیخ کے بعد ہجرت کر کے تمام یوروپ میں پھیل گئے تھے، اور اگر اہلِ یوروپ ایک ہی نسلی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اسی طرح سامی النسل حرّانی اور شامی عظیم عرب خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔

بہرحال، اگر کوئی اپنے آپ سے یہ پوچھے کہ عرب تہذیب کی تابانی دنیا کو اس قدر تابناک بنانے کے بعد اچانک ماند کیسے پڑگئی تو اسے اس کی اجازت ہونی چاہئے۔ کیا وجہ ہے کہ پھر یہ مشعل روشن نہ کی جاسکی؟ کیوں ایسا ہے کہ عالمِ عرب پر تاریکی کی چادر آج بھی پڑی ہوئی ہے؟

اس مقام پر پوری ذمّہ داری مسلمانوں کے مذہب کی معلوم ہوتی ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ جہاں کہیں بھی اس کے قدم جمے اس نے علوم کی ترقی کو روکنے کی کوشش کی اور اسے اس کام میں ملوکیت و استبداد سے حیرت انگیز مدد ملی۔

السیوطی کا کہنا ہے کہ خلیفہ الہادی نے بغداد میں پانچ ہزار فلسفیوں کو صرف اس لئے

کرادیا تھا کہ مسلم ممالک میں علم و سائنس کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا جائے۔ اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ
مورخ نے مقتولین کی تعداد بتانے میں مبالغہ سے کام لیا ہے تب بھی یہ حقیقت ہے کہ یہ ظلم
اور یہ کسی مذہب کی تاریخ پر اسی طرح ایک بدنما داغ ہے جس طرح کسی قوم کی تاریخ کے لئے۔
عیسائی مذہب کے ماضی میں بھی اس طرح کے واقعات ملتے ہیں۔ مذاہب چاہے انھیں کسی
ام سے پکارا جائے اس سلسلے میں ایک دوسرے کے مشابہ ہیں۔ مذہب اور فلسفے کے درمیان
قسم کی مفاہمت اور سمجھوتے کا امکان نہیں ہے۔ مذہب کا تقاضا ہوتا ہے کہ انسان اسی کے
رے اور نظریئے کو بے چون و چرا مان لے جبکہ فلسفہ انسان کو مذہب کے اثر سے کُلی یا جزوی
پر آزاد کرتا ہے۔ پھر کوئی یہ توقع کیسے کرسکتا ہے کہ ان دونوں (مذہب اور فلسفہ) میں ہم آہنگی
ہو سکے گی۔ عیسائی مذہب انتہائی منکسر اور دلفریبانہ لباس میں ایتھنز اور اسکندریہ میں
ل ہوا۔ ہر شخص جانتا ہے کہ یہ دونوں شہر فلسفہ اور سائنس کے اہم ترین مرکز تھے اور
دونوں شہروں میں عیسائی مذہب نے اپنا عمل دخل قائم کرنے کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ علوم
یہ اور فلسفہ کو الگ رکھا اور اس بات کی کوشش کی کہ ان دونوں کو تثلیث، تجسیم اور استحالہ
انی کے ناقابلِ فہم اسرار سے متعلق دینی مباحث میں الجھا کر ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا جائے۔ یہ
ورتِ حال ہمیشہ رہے گی۔ جب کبھی مذہب کو بالادستی حاصل ہو گی وہ فلسفہ کو جلاوطن کرے گا اور
فلسفہ کو اقتدار حاصل ہوگا، حالات اس کے برعکس ہوں گے۔ جب تک انسان زندہ ہے،
وقت تک عقیدے اور آزاد تحقیق، مذہب اور فلسفے کی کشمکش ختم نہ ہوگی ـــ ایسی قیامت
کشمکش جس میں مجھے ڈر ہے کہ آزاد خیالی کی جیت ہوگی۔ کیونکہ عوام الناس استدلالِ عقلی سے
فرت کرتے ہیں۔ اس کی قدر تو صرف اوپر کے طبقے کے منتخب لوگوں کو ہی ہوتی ہے، اور یہ وجہ
ہے کہ سائنس سے چاہے وہ کتنی ہی دلکش کیوں نہ ہو، انسان کو مکمل طور پر تسکین نہیں ہوتی۔ طبعی
پر انسان ایک آئیڈیل کے لئے بیقرار رہتا ہے اور ایک مبہم اور دھندلی دنیا کے تصور میں گم رہنا چاہتا ہے
جسے فلسفی اور عالم نہ تو دیکھ سکتے ہیں اور نہ وہاں تک پہنچ سکتے ہیں۔

روش صدیقی

غزل

بادۂ گل کو سب اندوہ ربا کہتے ہیں
اشکِ گلرنگ میں ڈھل جائے تو کیا کہتے ہیں

فرصتِ بزم بھی معلوم کہ اربابِ نظر
شعلۂ شمع کو ہمدوشِ صبا کہتے ہیں

یہ مسلسل ترا پیماں، تری پیماں شکنی
ہم اسے حاصلِ پیمانِ وفا کہتے ہیں

قصرِ آزادیٔ انساں ہی سہی، میخانہ
درِ میخانہ کی زنجیر کو کیا کہتے ہیں

یہ رہِ غم کے خم و پیچ عجب ہیں، جن کو
خوش نظر، سایۂ گیسوئے رسا کہتے ہیں

عشق خود اپنی جگہ مظہرِ انوارِ خدا
عقل اس سوچ میں گم کس کو خدا کہتے ہیں

کوئی کس دل سے بھلا، ان کا برا چاہے گا
جو بھلے لوگ بروں کو بھی بھلا کہتے ہیں

دل نشیں تیرے سوا کوئی نہیں کوئی نہیں
کون ہیں وہ جو تجھے دل سے جدا کہتے ہیں

یہی دیوانہ جو پھولوں سے بھی کتراتا ہے
کیا اسی کو روشِ آبلہ پا کہتے ہیں

سید احمد علی آزاد

جامعہ میں ابتدائی تعلیم کے تجربے

(۳)

تعلیمی مرکز نمبر ۱ کے کام

مدرسہ ابتدائی جب ۱۹۳۶ میں اپنی نئی عمارتوں میں اوکھلے منتقل ہوگیا تو قرول باغ دہلی میں تعلیمی مرکز نمبر ۱ کے نام سے ایک مدرسہ وہاں کے غیر مقیم طلباء کے لیے رہ گیا۔ یہ مدرسہ میری نگرانی میں دے دیا گیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ ذاکر صاحب کی نظر انتخاب میرے اوپر کیوں پڑی؟ اس لیے کہ جامعہ میں عام طور سے اس انتخاب کی مخالفت تھی اور میں بھی اپنے آپ کو اس قابل نہیں سمجھتا تھا کہ نگرانی کے فرائض انجام دے سکوں۔ بہرحال ذاکر صاحب کا حکم تھا۔ وہ معمولی قابلیت کے آدمی سے اچھا خاصا کام لے لیتے تھے اس لیے میں راضی ہوگیا۔ اس کی روئیداد کچھ اس طرح ہے۔ ایک دن دفتر میں ذاکر صاحب سے کسی کام کے سلسلہ میں ملنے گیا تو فرمانے لگے، مدرسہ ابتدائی اپنی نئی عمارت میں اوکھلے منتقل ہو رہا ہے اور آپ کو یہاں کے مدرسہ کا کام سنبھالنا ہے۔ مدرسہ کی عمارت میں اوپر ایک کمرہ ہے اُس میں اپنا سامان لے آئیے۔ اس گفتگو کے بعد میں وہاں منتقل نہیں ہو سکا۔ ذاکر صاحب کو شبہ ہوا کہ شاید یہ اس ذمہ داری کو نہیں لینا چاہتا۔ ایک دن راستہ میں مل گئے، فرمایا" آپ ابھی تک منتقل نہیں ہوئے۔ دیکھیے، کل آپ ضرور منتقل ہو جائیں۔"

میرے ساتھ کام کرنے کے لیے عبدالخالق صاحب، سید نورحسین شاہ صاحب ہا
سندھی صاحب اور نذیر حسین تجمل صاحب بی۔ ٹی تھے۔ یہ نگران بننے کی کوشش کر رہ
تھے لیکن نہ معلوم کیوں اِن کا انتخاب نہ ہو سکا۔ حافظ فیاض احمد مرحوم بھی اِن کے لیے کوش
کر رہے تھے۔ سال شروع ہوتے ہی رشید لقمانی صاحب اور سید عروج الحسن صاحب
لیے گئے۔ پہلا سال ختم ہوتے ہوتے نذیر صاحب میرٹھ بیسک ٹریننگ اسکول میں چلے گئے
سید نور شاہ صاحب بھی چلے گئے۔ ان دونوں اساتذہ صاحبان کی جگہ نذیر تجمل صاحب
موگا ٹرینڈ (یہ پنجاب کے ٹریننگ اسکول کے طلبا میں اول آئے تھے) اور محمد شفیع صاحب
موگا ٹرینڈ رکھ لیے گئے۔

پرندہ پروجکٹ

باغبانی کا کام تمام جماعتیں کرتی تھیں۔ تھوڑی تھوڑی زمین ہر جماعت کے حصہ میں تھ
بچوں کی دکان کا کام سید عروج الحسن صاحب کے سپرد کیا گیا اور بنک کا کام محمد شفیع صا
نے سنبھالا۔ یہ تینوں کام اسی طرح ہوتے رہے جیسے عبدالغفار صاحب کے زمانہ میں ہو
تھے لیکن مسلم بینک کے فیل ہو جانے کی وجہ سے، جہاں بچوں کے بینک کی تمام رقم جمع تھی
بچوں کے بینک کا کام بند ہو گیا۔ اجتماعی طور پر پرندہ پروجکٹ چلایا گیا اور اس پروجکٹ پر تمام
جماعتوں کے طلبا نے مضامین لکھے۔ پہلی اور دوسری جماعت کے طلبا نے کاغذ سے کا
کر پرندے بنائے اور ان کے چارٹس تیار کئے۔ چارٹس پر بچوں نے پرندوں کے نام
لکھے۔ تیسری جماعت سے پانچویں جماعت تک کے طلبا نے اپنی جماعت کے پرندوں کا
لکھا اور چھٹی جماعت کے طلبا نے پرندوں کے متعلق عام باتیں لکھیں۔ مثلاً پرندوں کا
پرندوں کا انتقال مکانی کرنا، پرندوں کی چونچیں، پرندوں کے پنجے اور پرندوں کا کھانا
وغیرہ۔ جماعتوں میں پرندوں کی نظمیں بھی پڑھائی گئیں۔ جلسہ کیا گیا اور اس میں مضا

اور نظمیں پڑھی گئیں۔ بہت سے چھوٹے بڑے پرندے جمع کئے گئے جو دہلی کے مختلف گھروں سے پنجروں میں تھوڑی دیر کے لئے مانگ لئے گئے تھے۔ بڑے پرندوں میں مور، شکرے اور چیلیں بھی تھیں۔ تعلیمی مرکز نمبرا کا ہال چڑیا خانہ معلوم ہوتا تھا۔ ان تمام مضامین اور نظموں کو جمع کرکے جلد بند ھوا دی گئی۔ اس میں پرندوں کے بارے میں پوری معلومات جمع ہیں۔

یوم قرآن پروجکٹ

رمضان شریف کی آخری تاریخوں میں جلسۂ یوم قرآن ہوا۔ اس کی تیاری ڈیڑھ مہینہ پہلے شروع کی گئی۔ میلاد النبیؐ پروجکٹ مدرسہ میں ہر سال چلتا تھا اس سال اس کی جگہ یوم قرآن پروجکٹ پر کام ہوا۔ یہ بچوں کے لیے، استادوں کے لیے اور آس پاس کی بستی کے لوگوں کے لئے بالکل نیا منصوبہ تھا۔ مولانا فضل الرحمٰن صاحب استاد دینیات سے تمام اساتذہ مشورہ لیتے رہے۔ نظموں اور مضامین کے عنوانات کو ابتدائی سوم سے ابتدائی ششم تک تقسیم کر دیا گیا۔ ان جماعتوں میں مضامین تمام طلبا نے لکھے لیکن جس کا مضمون ہر جماعت میں سب سے اچھا تھا وہی مضمون پڑھوایا گیا۔ جو مضامین اور نظمیں جلسے کے لیے منتخب کیے گئے ان کی عبدالخالق صاحب کی نگرانی میں کافی مشق کرائی گئی۔ آرائش بھی خاص ڈھنگ سے کی گئی۔ عربی آیتیں گتوں پر کٹوا کر اور ابری لگا کر دیواروں پر آویزاں کی گئیں۔ کافی طغرے اور چارٹس جو جماعت وار بنے تھے ہال میں لگا دیے گئے۔ لمبی اور اونچی میزوں پر میز پوش بچھا کر طلبا کے مضامین جماعت وار رکھ دیے گئے۔ جن کو جلسہ ختم ہونے کے بعد جلسہ میں شریک لوگوں نے پڑھا۔ قرآن شریف اپنے ابتدائی دور میں کن کن چیزوں پر لکھا گیا اسے بھی لکھوا کر پیش کیا گیا۔ تعلیمی مرکز نمبرا کے صحن میں ایک اونچی جگہ پر تعلیمی مرکز نمبرا جامعہ ملیہ اسلامیہ لکھوا کر اس میں پانچ دن پہلے سرسوں کے بیج ڈالدیے گئے۔ پانچ دن کے بعد تمام بیج پھوٹے اور پودوں کے زمین سے ابھرنے سے کافی مٹی پھٹی۔ یہ منظر تھا کہ یہ آیت لکھ کر وہاں رکھی گئی۔ ثُمَّ شَقَقْنَا الْأَرْضَ شَقًّا ٥

فَاَنْبَتْنَا فِيهَا حَبًّا سورۃ ۸۰ آیت ۲۷ اس آیت اور زمین کے پھٹنے نے جو تال میل پیدا کیا تھا اس کے دیکھنے کے لیے بہت لوگ آئے اور دیر تک اس بات کو سمجھنے کی کوشش کرتے رہے۔ لوگوں کے لئے یہ چیز نئی تھی۔ ایک چارٹ دنیا کے کھنڈرات کا بھی تھا اور اس کے نیچے بھی ایک آیت کھنڈرات کے سلسلہ کی لکھی گئی تھی۔ جب ہم اپنے کام دوسروں کو دکھلاتے ہیں تو اس کے معیار کو بہت بلند رکھنا پڑتا ہے، اور اس کی صحت کا سو فیصدی خیال بھی رکھنا پڑتا ہے۔ یوم قرآن کے جلسہ میں اس کا ہر طرح خیال رکھا گیا تھا۔

شعبہ اور پروجکٹ میں فرق۔

میں نے مستقل پروجکٹس کا، جن کی حیثیت بعد میں کاروباری شعبوں کی ہو گئی تھی، ذکر کیا ہے۔ یعنی باغبانی، بچوں کا بینک اور بچوں کی دکان۔ ان پر سارا سال کام ہوتا تھا۔ اگر کوئی جماعت ان کاموں کو اپنا مقصد بنالیتی تھی تو ان کاموں سے پوری جماعت تعلیمی فائدہ بھی حاصل کرتی تھی۔ استاد حساب کے نصاب کا زیادہ حصہ ان شعبوں میں کام کرانے کے دوران مربوط کرا کے پڑھا لیتا تھا۔ اردو اور معلومات کی تعلیم بھی دیتا تھا۔ اگر جماعت ان کاموں کو اپنا مقصد نہیں بناتی تھی تو ان کاموں کے کرنے کا ڈھنگ اور طریقہ سیکھ لیتی تھی۔ کام کرنے کے دوران کام کا تجربہ ہوتا رہتا تھا، اور ہر آنے والی جماعت کے لیے چونکہ یہ کام نیا ہوتا تھا اس لیے شوق اور دلچسپی سے کرتے تھے اور یہی دلچسپی تدریس کی جان ہوتی تھی۔ مثلاً تیسری جماعت سے جب بچے چوتھی جماعت میں آتے تھے تو بچوں کے بینک میں کام کرتے تھے اور ایک سال کام کرنے کے بعد جب اگلے سال پانچویں جماعت میں آتے تھے تو بچوں کی دکان میں کام کرتے تھے اور پھر اگلے سال بچوں کے خوانچہ میں کام کرتے تھے اس طرح ایک ایک سال ان کاروباری شعبوں میں وقت گذارتے تھے۔ سالانہ پروجکٹ میں میں نے یوم قرآن پروجکٹ کا ذکر کیا ہے۔ اس کا وقت شروع سال ہی میں طے کر لیا جاتا تھا۔ مقررہ تاریخ سے مہینہ

ڈیڑھ مہینہ پہلے جماعت وار کام تقسیم ہو جاتا تھا اور اس ایک ڈیڑھ مہینہ میں ہر جماعت اپنے حصہ کا کام مکمل کرتی تھی۔ ان کی حیثیت چونکہ مذہبی ہوتی تھی اس لیے انتخاب کا سوال نہیں پیدا ہوتا تھا بلکہ بچوں کو انتظار رہتا تھا کہ میلاد النبیؐ اور یوم قرآن کا پروگرام کب شروع ہوگا؟

پروجکٹ طریقۂ تعلیم یا مقصدی طریقۂ تعلیم میں پہلا اصول 'مقصد کا انتخاب' ہے۔ جسے خود بچے استاد کی نگرانی میں انتخاب کرتے ہیں۔ دوسرا اصول صحیح پلیننگ کا ہے کہ کس مضمون کی کتنی تعلیم اس پروجکٹ پر کام کرانے کے دوران ہوگی۔ پروجکٹ کی وضاحت کے لیے ڈرائنگ اور دفتر میں کیا کیا چیزیں بنیں گی۔ تیسرا کام جانچ کہ جتنا کام کرانا چاہتے تھے وہ کام ہو گیا یا نہیں ہو سکا، چھوٹ گیا اور کس وجہ سے نہ ہو سکا۔ کن کن کتابوں سے مدد لی گئی۔ ذاکر صاحب کو پروجکٹ چلانے والے اساتذہ صاحبان سے یہ شکایت رہتی تھی کہ وہ کام کی پوری پلیننگ نہیں کرتے ہیں۔ پہلے سے کاغذ پر کاموں کی تفصیل نہیں لکھتے ہیں اور اکثر حالتوں میں ایسا ہی ہوتا تھا اس لیے پروجکٹ کھیل بن کر رہ جاتا تھا۔

نقشہ بنا کر کام کرنے کا اصول بچوں کے بینک، بچوں کی دکان اور باغبانی میں نہیں ہوتا تھا جناب عبدالغفار صاحب مدہولی نے اِن کاموں کو کئی سال تک کرا کے واضح طور پر اِن کی یادداشت تیار کر دی تھی جس کی وجہ سے کوئی استاد بھی ان کاموں کو بالکل اسی طرح کرا سکتا تھا جس طرح عبدالغفار صاحب کرایا کرتے تھے۔ اور یہی صورت میلاد النبیؐ اور یوم قرآن کے جلسوں کی تیاری کے سلسلہ میں تھی۔ لیکن جو پروجکٹ وقتی طور پر چلتے تھے ان کی پلیننگ کے لیے ذاکر صاحب بہت زور دیتے تھے۔ چنانچہ ۱۹۳۷ کی معائنہ کمیٹی نے جبکہ میں نگران مدرسہ تھا، صاف صاف اس بات کی ہدایت دی تھی اور جب دوسرے سال معائنہ کمیٹی ذاکر صاحب کی صدارت میں آئی تو اس نے اس بات کو پھر دہرایا۔ اس نے لکھا:

"مدرسہ کی عام حالت قابل اطمینان ہے۔ نصاب کی پابندی ہوتی ہے۔ تحریری کام بھی باقاعدہ مکمل ہے۔ معلومات میں حیوانات کے حصہ کی طرف نسبتاً زیادہ توجہ

دی جاتی ہے جو مناسب نہیں معلوم ہوتی۔ اس سال دو پروجکٹ کئے گئے۔ ایک صفائی پروجکٹ دوسرا عید پروجکٹ۔ پروجکٹ کے متعلق جو سفارش گذشتہ سال کی معائنہ کمیٹی نے کی تھی اس پر اس حد تک تو عمل ہوا ہے کہ اس سال صرف دو پروجکٹ ہوئے ہیں لیکن سفارش کے اس حصہ پر عمل نہیں ہوا ہے کہ جو پروجکٹ تیار کیے جائیں وہ شیخ الجامعہ اور ماہروں کو بھی دکھلا لیے جائیں۔" (معائنہ کمیٹی، تعلیمی مرکز نمبر ۱، مئی ۱۹۳۰ء)

پروجکٹ کی قسمیں

How we Learn کے مصنف ڈبلو۔ ایچ۔ کلپیٹرک نے پروجکٹ کی چار قسمیں کی ہیں: (۱) بنایا جانے والا پروجکٹ جس میں دماغ کسی ایک چیز کے بنانے اور تیار کرنے میں مصروف ہو جیسے گھر بنانا یا باغبانی میں کچھ پیدا کرنا (۲) خرچ کرنے والا پروجکٹ یعنی کسی غزل یا گیت کو سن کر حظ اٹھانا یا خوبصورت مناظر سے لطف اٹھانا (۳) مسئلی پروجکٹ یعنی کسی سوال یا مسئلہ کے حل کرنے میں مصروف ہو جانا، اس کی دھن میں لگ جانا مثلاً ایورسٹ کی چوٹی کو کیوں فتح کرنا چاہتے ہیں یا چاند پر کیوں پہونچنا چاہتے ہیں (۴) مخصوص تعلیم کا پروجکٹ۔ مدرسہ ابتدائی میں سب ہی طرح کے پروجکٹ چلائے گئے اور ان سے تعلیمی فائدہ اٹھایا گیا لیکن اس میں جامعہ کا اپنا رنگ صاف جھلکتا تھا۔ موگا اسکول میں جو جماعتیں پروجکٹ چلاتی تھیں اس میں جلسہ والا حصہ بالکل نہیں ہوتا تھا۔ پروجکٹ کے کام کی نمائش والا حصہ بھی نہیں ہوتا تھا۔ موگا اسکول کی جماعتیں پروجکٹ چلا کر اس سے تعلیمی فائدہ اٹھاتی تھیں اور اس کے بعد اس کی ایک رپورٹ مرتب کرتی تھیں۔ وہ رپورٹ موگا جرنل (ماہواری تعلیمی رسالہ) میں شائع ہو جاتی تھی۔ جامعہ کے مدرسہ ابتدائی نے اپنے خاص حالات کے مطابق اس میں دو باتوں کا اضافہ کیا۔ جلسہ کر کے پروجکٹ کے کام کی رپورٹ پیش کرنا اور تعلیمی کام کی نمائش کرنا۔ گو ان دو باتوں کی وجہ سے خاصہ کام بڑھ جاتا تھا لیکن بچوں کو ان میں بہت

دلچسپی ہوتی تھی۔ مدرسہ میں پروجکٹ کا ماحول بنا رہتا تھا۔ لوگوں کی تعریف اور اعتراضات سے بچے سیکھتے تھے اور اگلے کام کو اور زیادہ بہتر بناتے تھے۔ پھر جب ہر جماعت کا کام نمائش کے کمرے میں آتا تھا تو سب جماعتوں کا کام دیکھ کر معلومات میں خاصہ اضافہ ہوتا تھا اور اگلے کام کو بہتر طریقہ پر کرنے کا خیال پیدا ہوتا تھا۔

ان تمام قسم کے پروجکٹس میں بنائے جانے والے پروجکٹ میں بچوں کو نسبتاً زیادہ دلچسپی ہوتی ہے۔ میں نے اس کا تجربہ کاغذسازی، باغبانی اور خوانچہ میں کیا ہے۔ جس لگن، دلچسپی، محنت اور انہاک سے بچے اِن میں کام کرتے ہیں وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ غالباً اس وجہ سے کہ ان کاموں میں ایک نتیجہ بچوں کے سامنے آتا ہے اور اس نتیجے سے وہ اپنی محنت اور سیکھنے کی صلاحیت کو ناپتے ہیں۔ ابری اور ٹِھکلی بنتی جاتی ہے تو خوشی بھی بڑھتی جاتی ہے۔ بچوں کی زندگی چونکہ متحرک ہوتی ہے اور وہ کچھ نہ کچھ کرنے کے لئے بیتاب رہتے ہیں اس لیے وہ فوری نتیجے سے مطمئن ہوتے ہیں اور شوق سے کام میں لگے رہتے ہیں۔ یہی شوق تعلیم میں وسیلہ کا کام دیتا ہے۔

سوالات کے پروجکٹ کا تجربہ

بچوں میں تجسس اور تلاش کا جذبہ ہوتا ہے۔ اس جذبہ کے تحت وہ سوالات کرتے رہتے ہیں بچوں کے سوالات کرنے سے استاد کو اپنے علم کے ذخیرہ کا اندازہ ہوتا رہتا ہے۔ پانچویں جماعت کے بچوں سے کہا گیا کہ وہ اپنے سوالات لکھ کر پوچھا کریں تو ان کے جوابات سے ان کو اطمینان بھی ہوگا اور اِن کے جوابات محفوظ بھی رہیں گے۔ شروع میں تو چند ہی لڑکوں نے اس پر عمل کیا لیکن بعد میں خاصے سوالات پوچھے جانے لگے۔ روزانہ دس پندرہ سوالات ہوتے تھے۔ یہ سوالات زیادہ تر ان کے ماحول کی چیزوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے سلسلے میں ہوتے تھے۔ بچے ان کے بارے میں جاننا چاہتے تھے۔ مثلاً بجلی سے لوگ

کیوں مرجاتے ہیں ؟ نل میں پہلے ہوا آتی رہتی ہے پھر پانی آتا ہے ؟ آسمانی بجلی کیسے بنتی ہے ؟ اس کام کے لیے ایک علحٰدہ کاپی بنوادی گئی۔ طلبار اِن پر سوالات لکھ کر پوچھتے تھے۔ دوسرے دن اِن کاپیوں پر جوابات لکھ کر انھیں طلبار کو واپس کردیا جاتا تھا تاکہ وہ اپنے سوالات کے جوابات پڑھ لیں۔ یہ جوابات جماعت میں بھی سنائے جاتے تھے تاکہ تمام طلبار کی معلومات بڑھے اس طرح نئے نئے سوالات آنے لگے اور اِن کے جوابات دئے جانے لگے۔ میں ان سوالات کے جوابات کی تیاری جامعہ لائبریری میں جاکر کیا کرتا تھا لیکن بعض سوالات بہت مشکل ہوتے تھے۔ اِن کے بارے میں مجھے کچھ بھی معلومات نہیں ہوتی تھی تو میں برکت علی صاحب (ریاضی) سے اُن کے جوابات معلوم کرکے لکھتا تھا۔ وہ اِن سوالات کے جوابات لکھوا دیتے تھے۔ سوالات اور جوابات کے اس طریقہ سے بچوں میں بڑی دلچسپی پیدا ہوگئی۔ بچے بڑی بے چینی سے دوسرے دن کا اور آخری گھنٹے کا انتظار کرتے تھے۔ اِن سوالات کے ذریعہ یہ بھی معلوم ہوا کہ اس عمر کے بچے کس قسم کی معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

گاؤں کا مشاہدہ

ہم نے گاؤں کے مشاہدہ کا بھی ایک پروگرام بنایا تھا۔ ہمیں لاری کی سہولت حاصل تھی اس لیے لاری کے ذریعہ ہم طلبار کو لے کر جاتے تھے۔ یہ مشاہدہ اس لیے کرایا جاتا تھا کہ شہر کے بچے گاؤں کی زندگی کے طریقوں کو بھی سمجھیں۔ یہ جانیں کہ گاؤں کے لوگ اپنی زندگی کس طرح بسر کرتے ہیں۔ اُن کی سادہ زندگی میں کیا خوبیاں ہیں ؟ بچوں کو دہلی سے دادری جاتے ہوئے گروپ میں تقسیم کرکے اُستاد کے ہمراہ مختلف گاؤں میں چھوڑ دیا جاتا تھا۔ اسی طرح دہلی سے مودی نگر تک یہ مشاہدہ کرایا جاتا تھا۔ یہ ۱۹۳۷ کا زمانہ تھا۔ گاؤں کے لوگوں نے ہمارے بچوں کی بڑی خاطر کی۔ رس، گنے، رس کی کھیر، گڑ اور چبینے سے ہر گاؤں میں خاطر کی گئی کہیں کہیں دودھ بھی پیش کیا گیا۔ طلبار گاؤں میں اپنے سوالات کے مطابق پوچھ پوچھ کر جوابات

لکھتے تھے اور پھر جماعت میں آکر انھیں کاپی پر صاف صاف لکھتے تھے۔ ایک مرتبہ کچھ منتخب طلبار تین دن کے لیے گڑگاؤں کی طرف مختلف گاؤں میں گئے تھے۔ محمد اکرام خاں کی جماعت نے کئی گاؤں میں صفائی کا خاصہ اچھا کام کیا تھا۔ دو جگہ ڈرامے بھی پیش کئے گئے تھے۔ اس طرح کے مشاغل میں طلبار میں زندگی اور زندہ دلی نظر آتی تھی اور وہ کچھ کرنے کے لئے بے تاب نظر آتے تھے۔ اس سفر میں ہم سوہنا تک گئے تھے۔ بچوں نے سوہنا کے پہاڑوں پر چڑھائی میں بڑی دلچسپی لی اور وہاں کے گندھک کے تالاب میں نہائے بھی۔

عوام سے رابطہ

اس سال (۱۹۳۷) یہ نئی بات ہوئی کہ بقرعید کے موقع پر قربانی کا کافی گوشت آگیا۔ ہم اساتذہ صاحبان نے اس کا یہ مصرف سوچا کہ دوسرے دن تمام طلبار اور ان کے سرپرستوں کو مدرسہ میں آنے کی دعوت دی جائے اور اُن کے کھانے کا انتظام کیا جائے۔ کچھ اساتذہ اور طلبار نے سرپرستوں کو اطلاع دینے کا کام اپنے ذمہ لے لیا۔ کچھ اساتذہ صاحبان اور طلباء نے بھنے گوشت اور کلیجی پکانے کا کام اپنے ذمہ لے لیا اور رات میں دیر تک اس میں لگے رہے اور کچھ اساتذہ صاحبان اور طلبار نے تعلیمی مرکز نمبر ۱ کے ہال میں نشست کا انتظام کیا۔ دس بجے دن سے پروگرام شروع ہونے والا تھا۔ روٹی کا انتظام بازار سے کیا گیا۔

تعلیمی مرکز نمبر ۱ کے ڈائس پر کھلانے اور نچلے حصہ میں نشست کا انتظام تھا۔ ملنے ملانے اور کھانے پینے کا یہ پروگرام ڈھائی بجے تک چلتا رہا۔ شفیق الرحمٰن صاحب مرحوم نے اس اجتماع کے پروگرام کو بہت پسند کیا۔ لیکن ہمارے اس پروگرام کو کھجور روڈ کے ڈاکٹر قریشی نے اپنا لیا اور اجمل خاں پارک میں بہت بڑے پیمانے پر یہ اجتماع عید اور بقرعید کے دوسرے دن ہونے لگا لہٰذا تعلیمی مرکز نمبر ۱ کا یہ پروگرام دو سال چل کر بند ہو گیا۔

ہم میں سے اکثر اساتذہ صاحبان کو کھانا پکانے کا عملی تجربہ تھا۔ موگا میں تمام طلبار کا

کھانا لڑکے ہی مل کر پکاتے تھے۔ اس لیے عبدالخالق صاحب، نذیر تجمل صاحب، محمد شفیع صاحب اور خاکسار کے لیے کوئی دشواری نہیں تھی۔ پھر قومی ہفتہ کے موقع پر ۱۳ اپریل کو بورڈنگ کے باورچیوں کو چھٹی دے دی جاتی تھی اور ہم اساتذہ مل کر تمام طلبا اور اسٹاف کے لیے کھانا پکاتے تھے۔ ذاکر صاحب بھی اپنے ذمہ کچھ نہ کچھ پکانے کا کام لے لیتے تھے۔ اُس دن دوپہر کا کھانا تمام اساتذہ، طلبا اور ملازمین ساتھ مل کر کھاتے تھے۔ ابتدائی کی ہر جماعت میں بھی کوئی ایک کھانا پکانا نصاب میں شامل تھا۔ اپریل میں ہر جماعت ایک ایک دن کچھ نہ کچھ پکاتی تھی اور جامعہ سے مہمانوں کو بلا کر کھلاتی تھی۔ اس لیے بقرعید کے موقع پر اس قدر بڑے پیمانہ پر کھانا پکانے میں ہم لوگوں کو کوئی دشواری نہیں ہوتی تھی۔ اساتذہ اور طلبا مل کر اس کام کو بخوبی انجام دے لیتے تھے۔

نصابی تعلیم کی خرابی

نصابی تعلیم کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ مدرسہ کے مقررہ اوقات کے علاوہ طلبا کے لیے مصروفیت نہیں ہوتی ہے۔ کسی کسی اسکول میں گھر کا کام دینے کی پابندی ہوتی ہے، لیکن اکثر اسکولوں کے بچوں کا فاضل وقت بے کار اور غلط کاموں اور مشاغل میں گذرتا ہے۔ کوئی گلی ڈنڈا کھیلتا ہے، کوئی پتنگ اُڑاتا ہے، کوئی تاش کھیلتا ہے، کوئی بے مقصد پھرتا ہے اور اگر گھر سے پیسہ ملتا رہتا ہے تو بچے سنیما کا شوق کرنے لگتے ہیں اور تعطیلات میں تو بچوں کو وقت گذارنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اِن تمام مشاغل میں اتنی کشش ہوتی ہے کہ نصابی تعلیم سے کوئی دلچسپی قائم نہیں رہتی۔ یہ غلط مشاغل طالب علم پر بے طرح مسلط ہو جاتے ہیں اور تعلیم میں رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ جماعتوں کی تعلیم بھی بار بن جاتی ہے۔ اِن کھیلوں اور غلط مصروفیتوں کی وجہ سے جماعت کی تعلیم میں دل نہیں لگتا۔ اِن کھیلوں اور شغلوں میں طلبا جو لب و لہجہ اختیار کرتے ہیں اور جو زبان بولتے ہیں وہ ان کے خیالات اور اخلاق کو بھی بگاڑ دیتی ہے۔

اس کے برعکس جامعہ ملیہ نے جو طریقہ تعلیم اپنے مدرسہ ابتدائی اور تعلیمی مرکز نمبرا میں اختیار کیا تھا اُس نے اس مدرسہ میں آنے والے بچوں کو خراب مشاغل سے بچالیا اور انھیں مدرسہ اور مدرسہ کے اساتذہ سے لگاؤ پیدا ہو گیا۔ اپنے فاضل اوقات میں کچھ بچے اساتذہ کی نگرانی میں باغبانی میں معروف ہوتے تھے، کچھ بچے خوانچہ کی چیزیں تیار کرنے میں لگے ہوتے تھے، اگر دکان کا سامان لانا ہوتا تھا تو مدرسہ کے بعد استاد کی نگرانی میں دکان کی چیزیں خریدنے جاتے تھے۔ ابری بنانے اور کاغذ بنانے کا کام مدرسہ کے بعد ہی ہوتا تھا طلبا اس میں لگے ہوتے تھے۔ ان مصروفیتوں کی وجہ سے بچوں کو خراب قسم کی مصروفیت میں پڑنے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا۔ مدرسہ بچوں کی مصروفیت کا مرکز بن گیا تھا اور اُن کی تعلیم اور تربیت پر اچھا اثر ڈال رہا تھا۔ جب جلسہ ہوتا تھا تو بچوں کا استادوں سے لگاؤ اور ان کی مصروفیت اور بڑھ جاتی تھی۔

(باقی آیندہ)

سلام مچھلی شہری

غزل

ہم نے منزل کی بہاروں کا نشاں جیت لیا
حسنِ مہتاب و دلِ کاہکشاں جیت لیا
جون آف آرک! مبارک ہو کہ تیری خاطر
خواب کا شہر، امیدوں کا جہاں جیت لیا
وہ بھی چند ابر کے ٹکڑوں پہ ہوئے ہیں قابض
ہم نے سورج کے نکلنے کا سماں جیت لیا
وہ بھی جیتے ہیں مگر سرد صنم خانوں میں
ہم نے چشم و لب و گیسوئے بتاں جیت لیا
بات بس یہ تھی کہ موسم کا تقاضہ کیا ہے
اور پھر ہم نے دلِ پیرِ مغاں جیت لیا
شوق سے جتنا بھی جی چاہے سنور لو، گا لو
آئینہ کیا ہے، دلِ شیشہ گراں جیت لیا
ہم سے دل والے جہاں بھی ہیں، وہ خوش ہیں کہ ہم نے
نغمۂ بربطِ دورِ گزراں جیت لیا
اب سلام! اس کی امنگوں کا بھرم رکھنا ہے
ہم نے حالانکہ دلِ نسلِ جواں جیت لیا

ڈاکٹر سید احتشام ندوی

ادب اور آزادی

ادب آزادی کا قائل ہے مگر وہ ادیب پر چند پابندیاں عائد کرتا ہے۔ ادیب کے لئے اعلیٰ اقدار کی عظمت ضروری ہے۔ اس کو محض مقصد کی بلندی بلند نہیں کرسکتی جب تک کہ وہ فنی بلندی حاصل نہ کرے۔ اس لئے جو ادیب نظریاتی و تبلیغی راہ اختیار کرتے ہیں ان کے لئے سب سے اہم چیز فنی بلندی ہے۔ بقول اینگلز جو کچھ وہ پیش کریں وہ در پردہ ہو، فن کے پردوں میں اپنی بات کہیں۔ کھل کر کہنے سے نظریہ پروپگنڈا بن جاتا ہے اسی لئے فن کی تہوں میں نظریہ کی روح پیش کرنی ادب میں عظمت کی راہ ہے۔

اِبسن نے اگرچہ تمام اصلاحی و اجتماعی مسائل پیش کئے ہیں مگر ابسن کے ڈراموں میں فنی عظمت ہے ورنہ وہ ادب کے میدان سے غائب ہو چکے ہوتے۔ ادیب پر یہ لازم ہے کہ وہ بلند اور اعلیٰ اسلوب میں اپنی بات کہے۔ مثال کے طور پر اِبسن کو لیجئے، یہ حقیقت ہے کہ جو مسائل اور سیاسی امور اس نے اپنے ڈراموں میں پیش کئے تھے وہ سب اس دور میں محض عبث ہیں مگر اس کی اعلیٰ ادبی قیمت، فکر، اور اس کے اشعار آج بھی لذت و مسرت کا باعث ہیں اور یہ کیفیت ہمیشہ مصنف کو عزت و عظمت بخشے گی۔ ادب اپنے زمانہ اور اپنے سماج کا التزام کرتا ہے اور اسے پیش کرتا ہے۔ ادیب اپنے افکار سے انھیں امور میں ابدیت و جاودانی قوت کو جنم دیتا ہے۔

بہرحال یہ امر یقینی ہے کہ ادیب کو کچھ امور کا التزام کرنا چاہئے اور کچھ معاملات میں حریت پسندی

اختیار کرنی چاہیے۔ جمہوری ملکوں میں ادیب شخصی طور پر اپنے اصول بناتے ہیں اور ان کا التزا
کرتے ہیں، مثلاً سارتر کا التزام جو اس نے اپنے ادب میں کیا ہے محض اس کی ذات اور اس کی تجر
سے مستعار ہے نہ کہ حکومت کی منشار سے۔ وہ کہتا ہے کہ اجتماعی زندگی کے حوادث ہم
فکر کا مطالبہ کرتے ہیں۔ گذشتہ جنگ نے ہمارے ضمیر کو آزادی کے بارے میں جگا دیا۔ ا
طرح ایک دوسرا فرانسیسی ادیب کاموس کہتا ہے کہ میرا فکر فن سے وابستہ ہے اور فن کے ا
یہی بلند فکری مجھے مجبور کرتی ہے کہ میں کچھ خدمت کروں۔ اس طرح اس کے افکار کی گہرائی ا
کے لئے ادبی التزام کی محرک ثابت ہوتی ہے، اگرچہ وہ خود اس کو پسند نہیں کرتا کہ وہ کم
خاص ادبی طریقہ کا پیرو ہو۔

موجودہ جمہوری ملکوں میں اجتماعیت کے بجائے انفرادیت کے رجحانات غالب ہیں
مشہور فرانسیسی ناقد و ڈرامہ نگار جبرئیل مارسیل کہتا ہے کہ یہ تعجب کا مقام ہے کہ فرانسیسی اسٹیج
سے موجودہ اجتماعی زندگی کے مظاہر غائب ہوتے جاتے ہیں حالانکہ ہر شخص کو اجتماعی مشکلات
سے سابقہ پڑتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اشخاص اپنا ذاتی غم پیش کر کے تسکین حاصل
کرتے ہیں اور عوام اس کو اسٹیج پر دیکھ کر یا پڑھ کر اپنے اندر کے غموں کا حقیقی عکس محسوس
کرتے ہیں۔

امریکہ میں آزادی کا عالم یہ ہے کہ ایک مشہور امریکی ناقد کہتا ہے کہ امریکہ میں فکری و فنی
سطح گہری نہیں۔ لوگ ایسے افکار سے خائف نظر آتے ہیں جو ان کو خطرہ میں ڈال دیں۔ خود
کا یہی عالم روس میں بھی ہے۔ اسی بنا پر اکثر ترقی یافتہ ممالک کے ڈرامہ نگار یہ سوچتے ہیں کہ ایسے
ڈرامے لکھے جائیں جن میں معاشرہ پر تنقید نہ ہو، اکثر موسیقی سے پُر کامیڈی لکھی جاتی ہیں جو
کامیاب ہوتی ہیں اور نفع پہنچاتی ہیں۔

اتنی بات یقینی ہے کہ ادیب کے لئے اور ادب کے لئے آزادی درکار ہے۔ آزادی
سے زندگی کے صحیح مرقعے اور فکر کے اعلیٰ نمونے سامنے آسکتے ہیں۔ غلامی سے فکر گھٹ کے ایک

ے کم آب رہ جاتی ہے۔ ادیب معاشرہ، سماج، فن اور فکر کی جو قیدیں اپنے اوپر عائد کرتا
، درحقیقت وہ پابندیاں نہیں ہوتیں بلکہ وہ اس کی فطرت ثانیہ بن جاتی ہیں۔ مثال کے طور
اردو شاعری خصوصاً غزل کو لیجئے۔ غزل میں پابندیاں ہیں مگر ردیف، قافیہ اور دوسری
بندیاں درحقیقت شاعر کے خمیر اور ضمیر میں اتر جاتی ہیں، اس میں اس کو آزادی اور مسرت
دولت عطا ہوتی ہے۔ اس لئے جو پابندیاں ادیب پر ہیں وہ بالآخر اس کی فطرت
جاتی ہیں حتیٰ کہ وہ ان کو محسوس بھی نہیں کرتا۔ اس لئے ادب اور ادیب کو آزادیٔ افکار
کار ہے تاکہ وہ اپنے وجود کی عظمت کو ابدیت کے قالب میں ڈھال کر حسن و نور کی ایک
دنیا پیدا کرسکے۔

واقعہ یہ ہے کہ ہر بڑا ادیب اپنے افکار سے ایک فکری کائنات قائم کرتا ہے اس
اس کا اپنا ماحول، اصطلاحات (جو اکثر خود اس کی ایجاد کردہ ہوتی ہیں) اور نظام فکر
تا ہے جس کے سہارے وہ ایک آزاد، وسیع اور مادی کائناتوں سے بلند ہو کر نئی دنیا
ق کرتا ہے۔ شعر و ادب آزاد ماحول اور آزاد فضا میں اس طرح پنپتا ہے جیسے بارش میں
سبزہ زار۔ ادیب کا سرمایہ تخیل ہے اس پر وہ کوئی پابندی برداشت نہیں کرسکتا۔ اس کے
خودکشی آسان ہے مگر پابندیٔ افکار آسان نہیں، چنانچہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں لکھتے ہیں:

"آرٹسٹ اپنے موضوع کی مناسبت سے اپنے دل میں تخیلی پیکروں کی ایک دنیا آباد کرلیتا ہے اور اپنے خون سے ان کی پرورش کرتا ہے.... آرٹسٹ شدت احساس کی حالت میں اپنے تئیں ان تخیلی پیکروں سے وابستہ کرلیتا ہے اور پھر انھیں ایک ایک کرکے لحن و صوت کی قبا میں چھپا کر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ شاعر یا آرٹسٹ کا تخیل اس کی زندگی کی وسعت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ وہ تخیل کی راہ سے اپنی فطرت اور تقدیر کی منزل طے کرتا ہے اور جن بلندیوں تک انسانی روح کی رسائی ممکن ہے وہاں تک پہونچتا ہے۔ اس کا تخیل ایسے ایسے عالموں کی سیر کراتا ہے کہ جنھیں ظاہری آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔ تخیل

کی قوت کی کوئی انتہا نہیں، وہ عقل سے زیادہ قدیم اور قوی ہے۔"

اب اگر آرٹسٹ کی "تقدیر کی منزل" اس سے زبردستی طے کرائی جائے تو پھر اس کے اندر چھپے ہوئے جوہر نکھر نہیں سکتے۔ آزادی اور امید ادیب کے فن کے تارِ حریر دو رنگ ہیں جن سے اس کی ذات قبائے صفات تیار کرتی ہے۔ اس کے یہاں امید اور آزادی دو شمع فروزاں ہیں جن کی وجہ سے اس کے فن میں نورِ عظمت پیدا ہوتا ہے۔ آزادی ادب کی روح ہے۔ آزادی سے ادب اس طرح ترقی کرتا اور نشوونما پاتا ہے جیسے تیل سے چراغ جلتا ہے۔

علی عباس امید

لمحوں کی شام

"آپا!"

"پھر آپ نے مجھے آپا کہا؟"

"مجھے پسند ہے۔"

"لیکن مجھے اچھا نہیں لگتا۔"

"اور لوگ بھی تو کہتے ہیں!"

"اس سے کیا؟"

"تو گویا صرف میرے ہی منہ سے اچھا نہیں لگتا۔"

"یوں ہی سمجھئے۔"

"پھر کیا کہوں؟"

"کچھ بھی کہئے لیکن خدا کے لئے یہ نہ کہا کیجئے۔"

"اس کی کوئی وجہ تو ہوگی؟"

"بہت بڑی وجہ ہے لیکن آپ نہ سمجھیں تو کوئی کیا کرے۔"

"تو پھر سمجھا دو نا!"

"آپ خود ہی سمجھ جائیں گے۔"

"پھر بھی کوئی سمجھانے والا تو چاہئے ہی۔"

"باتیں کرنی تو کوئی آپ سے سیکھے، اتنی دیر ہو گئی اور کام کچھ بھی نہ کیا۔"

"تمھیں دیکھ کر سب کچھ بھول جاتا ہوں۔"

"ہٹئے!" اور وہ بھاگ گئی۔

آج سے پانچ سال پہلے جب میں علی گڑھ میں تھا تو کسی پرچے کے سالنامہ میں میری تصویر شا ہوئی تھی۔ میرے پاس بہت سارے پڑھنے والوں کے خطوط آئے تھے۔ انھیں میں ایک خط بھی تھا جو کسی نوعمر لڑکی نے لکھا تھا۔ آج بھی وہ میرے پاس محفوظ ہے۔ لکھا تھا "محترم جناب میں بہت سارے رسالے پڑھتی ہوں۔ ممی جو پرچے میرے لئے خریدتی ہیں وہ تو پڑھتی ہوں، جو وہ اپنے لئے منگاتی ہیں انھیں بھی پڑھ ڈالتی ہوں۔ ممی کے پرچوں میں کبھی آپ کہانی، کبھی شاعری پڑھتی تھی۔ نام تو یاد ہو گیا تھا، آج تصویر بھی دیکھی۔ بہت اچھی تصویر تصویر دیکھ کر ممی کہنے لگیں کہ "یہ تو تمھارے بڑے بھائی ہیں"۔ میں نے پوچھا "سچ مچ کے؟" وہ ب "تو کیا بھائی بھی جھوٹ موٹ کے ہوتے ہیں!" مجھے کچھ یقین آتا ہے کچھ نہیں۔ اب آپ ہ بتائیے کہ کیا آپ میرے بھائی ہیں۔ فوراً لکھئے تاکہ میں اپنے اسکول میں شاہدہ کو اور بہ کو بتا سکوں۔ فقط آپیا۔"

میرے چھوٹے چچا جو لکھنؤ میں پروفیسر ہیں ان کی بڑی بچی نے مجھے یہ خط لکھا تھا۔ م نے اسے دیکھا تھا لیکن اس وقت وہ چھوٹی تھی۔ اس کے بعد ہی میرا داخلہ علی گڑھ میں ہو گیا اور تعلیمی مصروفیتیں اس قدر بڑھیں کہ گھر جانے کا اتفاق کم ہی ہوا۔ چچا جان بھی کافی دنوں گھر نہیں آسکے تھے، اس لئے ان کے بچے میرے لئے اور میں ان کے لئے اجنبی ہی رہا۔

تعلیم مکمل کرکے میں نے ملازمت کرلی۔ کچھ دنوں اِدھر اُدھر گھومنے کے بعد میرا تبا لکھنؤ کے لئے کردیا گیا۔ چونکہ وہاں چچا جان رہتے ہی تھے اس لئے مجھے کوئی زحمت نہ ہوئی ان کی موجودگی میں الگ رہنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ چچی جان کی شفقت ممی سے ک

نہیں تھی۔ ویسے تو ان کے سبھی بچے مجھ سے ہل گئے تھے۔ لیکن آپا خصوصیت سے مانوس تھی۔ سارا گھر آپا ہی کہتا تھا۔ اب وہ بڑی ہو گئی تھی۔ میرا بہت خیال رکھتی تھی۔ میری تمام تر ذمہ داریاں اس نے اپنے سر لے رکھی تھیں۔ میں کیا کھاؤں گا، کیا پہنوں گا۔ میرا کیا پروگرام ہے یہ سب باتیں مجھ سے زیادہ اسے معلوم رہتیں۔ اگر زیادہ عرصے تک میں کوئی نئی چیز نہ لکھتا تو وہ لکھنے کے لئے مجبور کرتی۔ اس کا یہ انداز تو بہت ہی پیارا ہوتا۔ اچانک میں دیکھتا کہ میرا بستر شکن آلودہ ہے، کتابیں بکھری پڑی ہیں اور کھانا آپا کے بجائے چچی جان خود لا رہی ہیں۔ میں سمجھ جاتا کہ آپا نے احتجاج کیا ہے چنانچہ سارے کام چھوڑ کر لکھنے بیٹھ جاتا اور کچھ نہ کچھ لکھ کر اس کے کمرے میں پہنچ جاتا اور حالات معمول پر آجاتے، اس کی شگفتگی لوٹ آتی اور مجھے کچھ عجیب سی طمانیت کا احساس ہونے لگتا۔

آپا کالج میں پڑھتی تھی۔ ادبیات کی دلدادہ تھی، گھنٹوں مجھ سے گفتگو کرتی رہتی۔ ویسے تو میں مشاعروں وغیرہ میں شرکت سے گریز کرتا تھا۔ لیکن اس کے کالج کے فنکشنوں میں مجھے جانا ہی پڑتا کیونکہ ہفتوں پہلے سے وہ دباؤ ڈالنا شروع کر دیتی "دیکھئے آپ کو چلنا پڑے گا، یہ میری عزت کا سوال ہے، میں وعدہ کر چکی ہوں، آپ کا کوئی بہانہ میں نہ مانوں گی" کالج میں ہونے والے تمام پروگراموں کی ذمہ داری اس نے اپنے سر لے رکھی تھی۔ ڈرامہ ہو، گیت ہو، تقریریں ہوں، سب مجھے لکھنی پڑتیں۔ میں گھبرا کر کہتا "تمہارے کالج میں اتنی استانیاں ہیں، اتنی لڑکیاں ہیں کیا تمام ذمہ داری تمہارے ہی سر پر ہے" اور وہ بڑے گمبھیر لہجے میں کہتی "یوں تو پورا کالج ہی ہے لیکن یہ تو اپنی قسمت ہے! کسی اور کے یہاں آپ جیسا کوئی ہے ہی نہیں" اس اعزاز کے بعد انکار کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا اپنی مصروفیات کو بھول کر اس کے کام میں لگ جاتا۔

کلب میں ایک بڑا مشاعرہ تھا۔ ملک کے سبھی اچھے شعراء آئے تھے۔ مشاعرے کے دوسرے دن کچھ شناسا حضرات کو میں نے گھر پر مدعو کیا۔ آپا نے بھی اپنی کچھ دوستوں کو بلا لیا۔ کھانے کے بعد ادبی موضوعات چھڑے، گیارہ بجے رات تک شعر و شاعری کا دور چلتا رہا۔ سب کو

رخصت کر کے جب میں اپنے کمرے میں پہنچا تو آپا کے کمرہ سے دبی دبی ہنسی کی آواز سنائی دی،
کوئی دلچسپ موضوع ہاتھ آگیا تھا۔ چند لمحوں بعد پتہ چلا کہ موضوع میں ہی ہوں۔

"سچ تمہارے بھیا تو بہت ہی شاندار ہیں۔ ان کے گیت نے تو میرے دل کے تار وا
جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔"

"آواز کس غضب کی تھی، گیت ہی کی طرح سوز میں ڈوبی ہوئی۔"

"سچ کہتی ہوں صنوبر میں تو بالکل مبہوت ہو کر رہ گئی تھی۔"

"خدا تم لوگوں کی نظر سے بچائے۔" یہ آواز آپا کی تھی۔

"اچھا جی، اب ہماری نظر بھی لگنے لگی۔ سنتی ہو قمر! ہاں بھئی! ان کی نظر کیوں لگنے لگی۔
نے تو انھیں آنکھوں میں ہی بسایا ہوا ہے۔"

ہاں بسایا تو ہے، پھر تمھیں کیوں حسد ہو رہا ہے۔ آپا کی آواز پھر میں نے پہچان لی۔

"سچ بتانا اکیلے میں بھی تم انھیں بھیا ہی کہتی ہو یا کچھ اور؟"

"وہ بولی" ابھی تک تو بھیا ہی کہتی ہوں۔"

"ابھی تک تو، کیا مطلب..... آئندہ کچھ اور کہنے کا ارادہ ہے کیا؟ دیکھا نہ شاہدہ کو
میں نے اس کے دل کے چور کو پکڑ لیا۔"

حقیقت کہیں چھپ سکی ہے۔ اچھا کل اسے کالج میں بتائیں گے۔"

"میں رات کو دیر تک سوچتا رہا لیکن کسی طرح 'بھیا' کے علاوہ کسی اور رشتے کے لئے تیا
کر سکا۔"

گھر گیا تو می نے کہا کہ "اب اللہ کے فضل سے اچھے بھلے عہدے پر فائض ہو چکے ہو،
پریشانی نہیں ہے۔ میری خواہش ہے کہ گھر میں بہو آجائے۔"

میں نے کہا "جیسا آپ مناسب سمجھیں۔"

"تمہاری نظر میں کوئی لڑکی ہے؟"

میں نے انکار کیا تو وہ بولیں "کچھ دن ہوئے تمہاری چچی جان نے مجھے لکھا تھا۔ میں بھی اسے مناسب سمجھتی ہوں۔ گھر کی لڑکی ہے اور پھر وہ بھی تو ہماری ذمہ داری ہے۔"

میں چونک پڑا "لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"کیوں؟"

"میں اسے اپنی بہن کے برابر سمجھتا ہوں۔"

"برابر کیوں، بہن ہی سمجھنا چاہئے۔ شرفاء کا یہی چلن ہے۔"

"تو پھر اس رشتے کی گنجائش کہاں ہے؟"

"کیوں نہیں ہے۔ جس بات کی اجازت خدا اور اس کے رسول نے دی ہے اس میں کیا پس وپیش؟"

"لیکن ممی....."

"اب میں کچھ نہیں سنوں گی، تمہارا عذر فضول ہے۔"

"لیکن یہ تو سوچئے کہ وہ مجھ سے کافی چھوٹی ہے۔"

"نہیں زیادہ نہیں۔ تمہاری اور اس کی عمر میں صرف دس سال کا فرق ہے۔"

"لیکن ممی، دس سال تو بہت ہوتے ہیں۔"

"کچھ بھی نہیں ہوتے۔ اتنا فرق تو ہونا ہی چاہئے۔ کیا چاہتے ہو کسی برابر والی کو لاکر بٹھادوں تاکہ لوگ اسے بہو کے بجائے میری بہن سمجھیں۔"

"نہیں ممی، میرا یہ مقصد نہیں ہے۔ پھر بھی آپا کے بارے میں، میں نے ایسا کبھی نہیں سوچا۔"

"تو اب سوچ لو نہ۔ وہ میری بچی ہے۔ اس کا بھلا برا میں تم سے بہتر سوچ سکتی ہوں۔ اب اسے طے سمجھو۔" پھر وہ سمجھانے لگیں "بیٹے یہ نفسی نفسی کا زمانہ آگیا ہے ورنہ فرض تو یہ تھا کہ اس

سلسلہ میں پہلے ہم انھیں لکھتے۔ اگر اتنا بھی نہ سوچا جائے تو پھر اپنے اور غیر میں فرق ہی کیا ہو۔ اور پھر ایسے رشتوں سے پرانے تعلقات استوار ہوتے ہیں۔"

دوسرے ہی دن ممی نے چچی جان کو لکھ دیا اور ان کے جواب نے بات پختہ کر دی۔ میں سوچتا رہا کچھ عجیب سے متضاد خیالات ذہن میں آتے رہے، کوئی واضح نقش نہ ابھر سکا سب کچھ دھندلا دھندلا غیر واضح۔

چھٹیاں ختم ہوگئیں۔ کچھ بے ربط سے احساسات لئے ہوئے میں لکھنؤ پہنچا۔ شروع شروع میں عجیب عالم رہا۔ آپا میرے سامنے آتے ہوئے شرماتی تھی، مجھے بھی جھجک ہوتی لیکن رفتہ رفتہ حجاب جاتا رہا اور شگفتگی واپس آگئی۔ آپا اب میرے بہت قریب آچکی تھی۔ اتنے قریب کہ اس کے دل کی دھڑکنوں میں ایک حسین پیغام سنائی دینے لگا تھا اور میں اس کی نغمگی میں کھو کر مستقبل کی خوشگوار وادیوں میں سانس لینے لگا تھا۔ عادت کے مطابق میں اسے آپا کہتا لیکن اب وہ معترض ہوتی۔ وہ ایک خالص مشرقی لڑکی کی طرح مجھے چاہتی تھی اور میں اس کی محبت کے تقدس سے سرشار تھا۔

ایک روز آفس میں سکریٹری نے مجھ پر اعتراض کیا، چونکہ میں صحیح تھا اس لئے میں نے اس کی بات رد کر دی۔ بات کافی بڑھ گئی اور اس نے اسے وقار کا مسئلہ بنا لیا۔ اسی درمیان میں میرے پروموشن کا معاملہ پیش ہوا۔ میرے محکمہ کے وزیر ذاتی طور پر ایک اور صاحب میں دلچسپی لے رہے تھے۔ سکریٹری نے میرے پاس کہلایا کہ اگر میں آفس میں اس سے معافی مانگ لوں تو وہ میری مدد کرے گا۔ میرے ضمیر نے یہ سودا نامنظور کر دیا اور میرا پروموشن روک دیا گیا۔ کچھ ہی دنوں میں حالات اتنے زیادہ خراب ہوئے کہ میں نے دوستوں کی مخالفت کے باوجود استعفار دے دیا۔ خوشامد مجھ سے ممکن نہ تھی اور وہاں صورت یہ تھی کہ بغیر اس کے ملازمت برقرار رکھنا ناممکن تھا۔ اپنے مزاج اور اصول کے خلاف کچھ کرنا میرے اختیار سے باہر تھا۔ استعفار دینے کے بعد لکھنؤ میں رہنے کا کوئی سوال

نہیں پیدا ہوتا تھا۔ میں وطن لوٹ آیا۔

بڑی ملازمت کرنے کے بعد چھوٹی ملازمت کرنا بڑی جرأت کا کام ہے اور میرے اندر یہ جرأت ہی نہ تھی۔ یوں بھی ملازمت سے اس قدر دل برداشتہ تھا کہ باوجود تمام پریشانیوں کے دل ادھر رخ ہی نہ ہوتا تھا۔ کچھ نہ کچھ کرنا ضروری تھا چنانچہ میں نے اپنے ذوق کو پیشہ بنا لیا اور آزادانہ لکھنے لگا۔ اس تمام عرصہ میں آپا کے خطوط مجھے سہارا دیتے رہے، اس کی تحریریں مجھے حالات سے لڑنے کا حوصلہ دیتی رہیں۔

ممی کی خواہش تھی کہ جلد از جلد شادی ہو جائے۔ انھوں نے چچی جان کو لکھا لیکن ان کے جواب نے یکبارگی میرے خوابوں کو لہولہان کر دیا۔ انھوں نے لکھا تھا "...... سبھی بچے میرے لئے برابر ہیں ...... میں نے خود ہی راشد سلمہٗ کو آپ سے مانگا تھا...... ویسے تو ماشاء اللہ وہ لاکھوں میں ایک ہیں، اتنے قابل ہیں، مشہور ہیں لیکن مزاج کے ذرا تیز ہیں۔ انھیں غصہ بھی بہت جلد آتا ہے، ضدی بہت ہیں...... ان کے علاوہ کسی اور بچے کے ساتھ اگر آپ یہ رشتہ کر سکیں تو بہتر ہو......" خط مجھے دے کر ممی بولیں "میں سمجھ گئی۔ شادی وہ تمھاری ملازمت کے ساتھ کرنا چاہتی تھیں۔ میں نے اپنا سمجھ کر منظور کر لیا تھا ورنہ مجھے رشتوں کی کمی ہے۔ درجنوں لوگ نہ جانے کہاں کہاں سے آتے رہتے ہیں، میں تو جواب دیتے دیتے تھک جاتی ہوں۔"

میری زبان گنگ ہو گئی۔ میں چچی جان کو ممی سے کسی طرح کم نہیں سمجھتا تھا۔ اتنے عرصہ کے قیام نے اور بھی اعتماد پیدا کر دیا تھا۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اپنی بنیاد پر بنی ہوئی تعمیر کو وہ اس طرح ڈھا دیں گی۔ میرے حسین تصورات میں ایک انقلاب پیدا ہو گیا تھا۔ میرے گمان میں بھی نہ تھا کہ جس نے آپا کو میرے دل کی دھڑکنوں میں سمو دیا وہی اچانک اسے اس قدر دور کر دے گا ــــ آپا نے مجھے چاہا تھا لیکن وہ تحریر اس کی محبت پر طنز کر رہی تھی، ممی کے خلوص کا تمسخر اڑا رہی تھی۔ میرے ذہن میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا تھا ــــ میں بہاروں کے گیت گانے والا مغنی، چاند تاروں کی حسین راہوں سے گزرنے والا راہی، غنچوں کے تبسم سے زندگی میں رنگ بھرنے

مالانکہ ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے طوفانوں کے درمیان گھر گیا ہوں۔ میں جس کی محبت کا گواہ اس کا نا ہے، جس کے خلوص کی راوی اس کی تعلیقات ہیں، جس کا فن سورج کی طرح تابناک ہے، آج اپ چاروں طرف اتھاہ تاریکی دیکھ رہا تھا اور لمحہ بہ لمحہ اندھیرے کے اس سمندر میں ڈوبتا جا رہا تھا۔

مجھے یقین تھا کہ آپیا مزید کچھ لکھے گی لیکن چچی جان کے اس خط کے بعد اس کی کوئی تحریر نہ ملی۔ یہ کہ خیال آتا کہ کہیں وہ بھی چچی جان کی ہم خیال نہ ہو گئی ہو اور میری بیکاری سے اس کی محبت کا چراغ بجھ گیا ہو۔ دل اسے قبول نہ کرتا لیکن اس کی خاموشی اس خیال کو تقویت پہنچا رہی تھی۔ وقت گزر گیا اور میں اس کی جانب سے مایوس ہونے لگا پھر بھی اس کی یاد ایک لمحہ کے لئے بھی میرے ذہن سے محو نہ ہو سکی۔

محبت کی کہانی آنسوؤں سے ہی لکھی جاتی ہے۔ اس کا انجام ہمیشہ المناک ہوتا ہے۔

آج ایک عرصہ بعد چچی جان کا خط آیا ہے لیکن لکھنؤ کے بجائے بھوالی سینی ٹوریم سے۔ انہوں نے مجھے بلایا ہے۔ آپیا کی حالت مایوس کن ہے، اس نے آخری بار مجھے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ آج میری بدگمانی مجھ پر طنز کر رہی ہے۔ ایک بار پھر میں وقت کے تمسخر کا نشانہ بنا ہوں۔ میرے گیت مجروح ہیں، میرے خوابوں کا ساز شکستہ ہو چکا ہے، میرے گرد مایوسیوں کا ہجوم ہے۔ آخر تو آپیا مشرقی لڑکی تھی نہ، اس نے دوسروں کی نادانی کا انتقام اپنے آپ سے لیا۔

رات کا سینہ چیرتی ہوئی گاڑی تیزی سے بھاگ رہی ہے۔ ایک ایک لمحہ صدیوں سے بڑا ہو گیا ہے۔ بغل میں اونگھتے ہوئے مسافر کو جھنجھوڑ کر شاید چوبیسویں بار میں پوچھتا ہوں "یہ گاڑی بھوالی کتنے بجے پہنچ جائے گی؟" وہ حیرت اور غصہ سے پہلے مجھے گھورتا ہے لیکن نہ جانے کیوں ترحم آمیز نظروں سے دیکھنے لگتا ہے۔ کیا اتنی جلدی میرا چہرہ بدل گیا ہے، کیا واقعی میری حالت قابل رحم ہو گئی ہے...... اگر ہاں تو آپیا نے مجھ سے بہت بڑا انتقام لیا ہے.... لیکن .... یہ فیصلہ کرنا بھی تو مشکل ہے کہ آپیا کے اس انتقام کی زد میں میں ہوں، اس کی اپنی ذات ہے یا پھر چچی جان!

تعارف و تبصرہ

(تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں بھیجنا ضروری ہے)

ذوقِ سفر (مجموعۂ کلام)

شاعر: غلام ربانی تاباں ، قیمت: پانچ روپے

ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

ملک کے ممتاز و نامور شاعر جناب غلام ربانی تاباںؔ کا یہ تیسرا مجموعۂ کلام ہے۔ ان کا پہلا مجموعہ 'سازِ لرزاں' جو نظموں پر مشتمل تھا ۱۹۵۰ء میں شائع ہوا تھا۔ غزلوں کا ایک انتخاب 'حدیثِ دل' ۱۹۶۱ء میں چھپا تھا۔ موجودہ انتخاب غزلیات پورے دس سال بعد منظرِ عام پر آیا ہے۔

تاباںؔ صاحب کی شعری عمر اپنے ہم عصروں کے مقابلے میں زیادہ نہیں ہے۔ انھوں نے شعور کے ایک بڑے سفر کے بعد قریب ۱۹۴۲ء میں شعرگوئی کی ابتدا کی۔ مگر ابتدا کرنے کے بعد انھوں نے مشقِ سخن کی منزلیں حیرت انگیز تیزی سے طے کرلیں۔ اردو اور فارسی ادب کے شعری کارناموں کی زندہ آگہی کے ساتھ ساتھ انھوں نے اپنے خلاق ذہن کی مدد سے اردو کے شعری اسالیب اظہار پر قدرت حاصل کرلی۔ انھوں نے ترقی پسند ادب کی تحریک سے فکر و فن کے معیار اخذ کئے مگر انھیں اس بات کا بھی احساس رہا کہ روایت کے ایک زندہ احساس کے بغیر نئے ادبی امکانات کی نقش گری نہیں کی جا سکتی۔ وہ روایت اور روائیت کے فرق سے آگاہ ہیں۔ اسی وجہ سے ان کی غزلوں میں کلاسیکی غزل کے تقاضے بھی ہیں اور نئی غزل کا جذباتی دکرب بھی۔ وہ مروجہ سخن کی پاسداری کرتے ہیں مگر انھیں اس بات کا بھی خیال رہتا ہے کہ اسے وہ کچھ منفرد رنگ بھی بخشیں۔

روایتی غزل کہنا آسان ہے مگر طبیعت کا غزل آشنا ہونا بہت ہی مشکل ہے۔ تاباںؔ صاحب کا بنیادی مزاج غزل سے ہم آہنگ ہے، اس مزاجی ہم آہنگی کا شعور انھیں کچھ دیر سے ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ وہ ابتداءً نظم گوئی کی طرف مائل ہوئے ــــ اور وہ بھی ترقی پسند نظم گوئی کی طرف۔ ترقی پسند نظم نگار اپنے فنی سفر کی ایک منزل پر شاعری کو اپنے مخصوص نظریۂ حیات کا گویا دستہ سمجھتے تھے۔ فن سے وابستگی کم تھی اور نظریئے سے وابستگی زیادہ۔ شعری تجربے کا اظہار جو ارتکاز چاہتا ہے وہ بیشتر شعراء کے یہاں مفقود تھا۔ تاباںؔ صاحب بھی اس غوغا آرائی کے شکار ہوئے اور ان کی ادبی نسل میں کم لوگ ایسے تھے جو فنی اور لسانی بے اعتدالی میں مبتلا نہ ہوئے ہوں۔ فن کے لازماتی اور زمانی مطالبات میں فرق کرنا ہمارے شاعروں نے دیر سے سیکھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی بیشتر تخلیقات انگریز شاعر، اسپنڈرؔ کے لفظوں میں Period Literature کے زمرے میں آگئیں۔ ادب کو آفاقیت، رمزیت اور ایمائیت سے نصیب ہوتی ہے۔ راست اندازِ بیان فن کو مقامی، وقتی اور ہنگامی بنا دیتا ہے۔ اچھا اور زماں گیر فن ترچھا یا نیم نگاہی کا فن ہوتا ہے۔ اس نکتے کو جن ترقی پسند شاعروں نے جلد محسوس کر لیا اُن میں تاباںؔ صاحب بھی ہیں۔ وہ اپنے اور اپنے ہم عصروں کے کلام سے ناآسودہ ہوئے اور اس ناآسودگی نے انھیں اپنے ادبی رویے پر نظرِ ثانی کرنے کا موقعہ دیا۔ اس نظرِ ثانی کو معنی خیز بنانے میں ان کے حادثۂ اسیری نے بڑی مدد کی۔ جیل میں انھوں نے اردو کی کلاسیکی غزل کے عظیم سرمائے کا بڑی توجہ اور تخلیقی انہماک سے مطالعہ کیا۔ کلاسیکی ادب سے اُس کسبِ نور کے عمل نے ان پر تخلیقی اور غیر تخلیقی اظہار کا امتیاز واضح کیا۔ ان کے مزاج کی وہ غزلیت جو ان کی نظموں کے بہت سے مصرعوں میں خوابیدہ تھی، جاگ اٹھی۔ اس لحاظ سے غزل کی طرف واپسی تاباںؔ صاحب کے لئے اپنی اور اپنے مزاج کی بازیافت کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے بعد سے تاباںؔ صاحب غزل کے اور غزل تاباںؔ صاحب کی ہو کر رہ گئی ہے۔ اب ان کا ایک زمانے سے غالب وسیلۂ اظہار غزل ہے۔ اس عرصے میں انھوں نے جو نظمیں لکھی ہیں ان میں بھی غزل کا دروبست ہے۔ غزل کے بارے میں کسی کا خیال

ہے کہ وہ ترکِ نسب گرد ایتی ہے۔ تاباں صاحب نے فنی آداب کی حد تک تو ترکِ نسب کیا ہے، جو نظریہ، نظریں کہ ان کی غزلوں میں ضرور جلوہ گر ہے۔ وہ اس نکتے سے بخوبی واقف ہو چکے ہیں کہ خیال کی خاک افسردہ کو شرر ریز کر کے جذبہ بنا لینے کے بعد ہی وہ غزل کے قابل بن پاتی ہے۔ کسی خیال کا فکری ادراک غزل کیا اچھی شاعری کی کسی بھی صنف میں فنی اظہار کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتا۔ خیال کا جذباتی ادراک ہی تمثالوں، استعاروں اور علامتوں کی طلسم بندی کرتا ہے۔ مجرّد خیال کو عریانی پسند ہوتی ہے مگر جذبہ ہمیشہ پیرہن کا متلاشی رہتا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ دنیا کی اچھی اور بڑی شاعری سترپوش رہی ہے۔ 'حدیثِ دل' کے دیباچے میں تاباں صاحب نے اس نکتے کی اہمیت کا اعادہ کرتے ہوئے 'رمز و ایما' کو فنی اظہار کی جان قرار دیا ہے۔ اقبال نے اسی خیال کو یوں ادا کیا ہے:

برہنہ حرف نہ گفتن کمالِ گویائی است

حدیثِ خلوتیاں جز بہ رمز و ایما نیست

غزل انسان کے بنیادی جذبات کی صوت گری کا نام ہے۔ اس صوت گری اور صورت گری کے کچھ آداب و اصول متعین ہیں۔ اسی کو ہم غزل کی روایت بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس روایت میں تجربے کے کیا اور کیسے امکانات ہیں اسے وہی جان سکتا ہے جو ایک طرف مبہم سے مبہم جذبے کے خد و خال پہچانتا ہو اور دوسری طرف الفاظ اور استعاروں کا مزاج آشنا ہو۔ غزل میں لفظ، لفظ نہیں ہوتا ایک شخصیت ہوتا ہے اپنی تمام تر پیچیدگیوں اور تہ داریوں کے ساتھ۔ اس کی ہر علامت میں جہانِ معنی آباد ہوتا ہے۔ صوت و صدا کی اس کائنات میں تلازمات کی ایک اور کائنات ہوتی ہے۔ غزل کا اچھا شاعر ان علامتوں میں تلازمات کا اضافہ بھی کرتا ہے اور نئی علامتیں بھی وضع کرتا ہے جو اوّلاً استعارہ ہوتی ہیں اور بعد میں علامت بن جاتی ہیں۔ تلازمات کا توسیع اور علامت سازی کا عمل انتہائی مشکل اور صبر آزما ہوتا ہے:

سخن کی راہ میں دل خون کر لیا تاباںؔ　　　بڑے مراحلِ کسبِ ہنر سے گزرا ہوں

غزل کو کسی نے آوازِ بازگشت کا سلسلہ کہا ہے اس بازگشت کے سلسلے میں کھو نہ جانا اور اس سلسلے میں اپنی آواز میں شامل کر دینا منفرد طرزِ احساس بھی چاہتا ہے اور اپنا مخصوص لب و لہجہ بھی اس لحاظ سے غزل شاعر کی انفرادیت کے لئے ایک چیلنج ہوتی ہے۔ تاباں صاحب نے اس چیلنج کو بڑی ہمت اور فن کاری سے قبول کیا ہے اور جدید اردو غزل کو تازہ و توانا شعر دئے ہیں:

لائی ہے تری یاد بہت دل پہ خرابی
گو دل کی خرابی نے سنوارا بھی بہت ہے

نہ کوئی راہ سے نسبت بجز خرابیٔ راہ
نہ کوئی ربط ہے منزل سے فاصلے کے سوا

جنوں وہ خام جو بن جائے انجمن کا چراغ
ہوا کی زد پہ رہو، شمعِ رہگذر کی طرح

آتی ہے نظر حسن کی نسبت سے حسیں بھی
دنیا جو خرابی میں مرے دل کی طرح ہے

رہِ طلب میں کسے آرزوئے منزل ہے
شعور ہو تو سفر خود سفر کا حاصل ہے

وہی ہے انجمنِ انتظار کی رونق
ہوئے ہیں ختم کہاں مرحلے جدائی کے

کس کو خبر ہوئی راہ میں مقتل کہاں کہاں
یہ جانتا ہوں دور تلک روشنی سی ہے

کیوں سجائے بیٹھے ہو انتظار کی محفل
کس کو اتنی فرصت ہے، کون روز آتا ہے

یہ چار دن کی رفاقت بھی کم نہیں اے دوست
تمام عمر بھلا کون ساتھ دیتا ہے

سوچئے کیا ہو جلاتے رہو زخموں کے چراغ
دیکھئے کیا ہو ابھی صبح کے آثار کہاں

زندگی درد کے سائے میں سکوں پاتی ہے
ورنہ حالات تو وہ ہیں کہ جہنم بن جائے

مندرجہ بالا اشعار میں نے بغیر کسی منصوبہ بندی کے ان کے نئے مجموعۂ کلام سے منتخب کرلئے ہیں۔ ان اشعار سے آپ کو تاباں صاحب کے لہجے کی شائستگی، غنائیت کی زیریں لہر، انتخاب الفاظ، غزل کی لفظیات کا سلیقہ مندانہ استعمال، استعارہ سازی و پیکر تراشی، امید پروری، نشاط سفر کی راحت منزل پر ترجیح، حسن و عشق کے معاملات میں حقیقت پسند رویہ اور تنقید حیات کا اندازہ ہوگا۔ زندگی کے بارے میں تاباں صاحب کا نظریۂ حیات انھیں مایوس نہیں ہونے دیتا۔ وہ زندگی کو جہد پیہم اور سفر مسلسل سمجھتے ہیں۔ اس بنیادی خیال نے ان کی مختلف غزلوں کو انتہائی خوبصورت استعارے بخشے ہیں۔ خود ان کے مجموعۂ کلام کا نام ان کے نظریۂ زندگی کی علامت

ہے۔ سفر کے استعارے ان کی غزلوں میں کلیدی الفاظ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ شاید اسی تصور حیات نے انھیں عہد جدید کے تہذیبی بحران اور حیات شکن ماحول میں بھی مایوس نہیں ہونے دیا ہے۔ لیکن اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ ان کا رجائی نقطۂ نظر انھیں زمانہ و زندگی کے حقیقی ادراک سے روکتا ہے۔ ان کی رجائیت جذباتی اور سطحی نہیں بلکہ فکری ہے اگر یہ بات نہ ہوتی تو ان کی غزلوں کا آہنگ اتنا دھیما، پُراثر اور سوچتا ہوا نہ ہوتا۔ ان کے لہجے کی شائستگی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ زندگی پر دیر تک سوچنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ترقی پسند غزل میں جیسی 'شائستگی' 'دیدہ تر' تاباں صاحب کے یہاں ہے ویسی کم لوگوں کے یہاں ملتی ہے۔ کسی کے یہاں اگر احساس کی شائستگی ہے تو بھی غزل ناآشنائی کی وجہ سے اس کا لہجہ بگڑ گیا ہے۔ تاباں صاحب کی غزل کی شعری زبان پر جو گرفت ہے وہ ان کے حلقے کے کم شعرا کو نصیب ہے۔ اس شعری زبان کی تشکیل میں وہ غالب، فانی اور مومن سے فیض یاب ہوئے ہیں۔ اس فیضیابی کے باوجود وہ اپنا منفرد لب و لہجہ بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ انھوں نے غالب سے فکر کو لہو بنا لینے کے آداب سیکھے۔ وہ فانی کے فلسفۂ حیات سے متفق نہیں مگر ان کی فنکارانہ چابکدستی سے خاصے متاثر ہیں۔ مومن سے انھوں نے خوبصورت تراکیب تراشنے کا ہنر سیکھا ہے۔ مومن کی بہت سی تراکیب ان کی غزلوں کی زینت ہیں مثلاً رقیبِ اثر، فتنہ گرِ ناز، جذبۂ غماز وغیرہ۔ انھوں نے ایک شعر میں اعتراف کیا ہے:

دولتِ فکرِ رسا، طبعِ رواں پائی ہے
غالب و میر کی ورثے میں زباں پائی ہے

اس شعر میں روایت، تجربے اور انفرادیت کی تعمیر کے اس عمل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس کے بغیر کم از کم غزل کی شاعری ممکن نہیں ہے۔ غزل روایت کا احساس بھی ہے اور اس کی توسیع بھی۔

ذوقِ سفر کی کتابت اور طباعت معیاری اور مثالی ہے۔ مگر جو کتاب کے پروف بڑی

توجہ سے پڑھے گئے ہیں پھر بھی صفحہ ۱۰۷ پر ایک شعر اس طرح لکھا گیا ہے:

فضول ہے کسی ناکام زندگی کی تلاش
غریب نظرِ خرابات ہو گئی ہو گی

اس میں املا کی غلطی رہ گئی ہے "نذرِ خرابات" لکھنا چاہیے تھا۔ صحت کتابت پر اتنا زور دینے کے باوجود ایک غلطی کا بھی رہ جانا تکلیف دہ ہے۔

تاباں صاحب کا مجموعۂ کلام 'ذوق سفر' ایک ممتاز و معتبر شعری آواز کی دستاویز ہے۔

(انور صدیقی)

عبداللطیف اعظمی

کوائف جامعہ

مرحوم ذاکر صاحب کی دوسری برسی

۳ر مئی کو بڑی سادگی کے ساتھ مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی دوسری منائی گئی۔ صبح پونے نو بجے جامعہ کے اساتذہ، طلبار اور بہت سے معززین شہر مثلاً مولانا مفتی عتیق الرحمان عثمانی، چودھری محمد طیب (ایم پی گڑگاؤں) اور میر مشتاق احمد صاحب وغیرہ مرحوم ذاکر صاحب کی قبر کے پاس اور خوبصورت لان پر جمع ہوئے اور فاتحہ پڑھی۔ وزیر اعظم محترمہ مسز اندرا گاندھی، صدر جمہوریہ کے ملٹری اے ڈی سی اور دہلی کے بعض اداروں کے نمائندوں نے مرحوم کی قبر پر پھول چڑھائے۔ اس موقع پر خاصی تعداد میں غیر مسلم حضرات بھی تشریف لائے تھے۔ محمد علی ہال میں مردوں کے لیے اور مرحوم کے مکان پر عورتوں کے لیے قرآن خوانی کا انتظام کیا گیا تھا۔ مسز اندرا گاندھی تھوڑی دیر کے لیے مرحوم کے مکان پر بھی تشریف لے گئیں اور بیگم ذاکر حسین صاحبہ سے ملیں۔ قرآن خوانی میں شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب، خازن جامعہ کرنل بشیر حسین زیدی صاحب، ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب اور جامعہ کے طلبار، اساتذہ و کارکنوں کے علاوہ مرکزی حکومت کے سابق وزیر ریاست جناب محمد یونس سلیم صاحب نے بھی شرکت کی۔

۵ر مئی کو، جس دن مرحوم سپرد خاک کئے گئے تھے، نائب صدر جمہوریہ جناب گوپال سروپ پاٹھک کی صدارت میں وٹھل بھائی پٹیل ہاؤس (نئی دہلی) میں ایک عام جلسہ منعقد ہوا، جس

یں صدر جلسہ کے علاوہ پروفیسر محمد مجیب صاحب، خواجہ غلام السیدین صاحب اور بعض دوسرے حضرات نے تقریریں کیں اور جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، جناب انور صابری، جناب بشیر جھنجھانوی اور جناب گلزار دہلوی نے منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔

شہادت امام حسینؑ کی یاد

ناظم دینیات مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی کے اعلان پر استاد دینیات مولانا قاضی زین العابدین صاحب سجاد میرٹھی کی صدارت میں ایک جلسہ منعقد ہوا، جس میں امام حسین علیہ السلام کی شہادت پر ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب، خواجہ غلام السیدین صاحب اور صدر جلسہ قاضی زین العابدین صاحب نے تقریریں کیں جن کے خلاصے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب

کوئی ۴۴-۴۵ سال پہلے کا واقعہ ہے۔ الہ آباد میں اورنٹیل کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوا۔ اس میں ایک نوجوان مولوی صاحب نے ایک مقالہ پڑھا، جس میں یہ دعویٰ تھا کہ امام حسینؑ کی شہادت ایک معجزۂ باہرہ ہے۔ اس کی دلیل یہ پیش کی کہ موت سے بچنے کی کوشش کرنا انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ امام حسین نے شوق شہادت میں موت کی پروا نہیں کی اور ان کا عزم فطرت کے تقاضے پر غالب آگیا۔ یہی وہ چیز ہے جو معجزہ کہلاتی ہے، اس لیے کہ عقل یہ سمجھنے سے عاجز ہے کہ انسان کا عزم و ارادہ قانون فطرت پر کس طرح غالب آگیا۔ مولوی صاحب کا یہ دعویٰ اپنی جگہ صحیح تھا، مگر جو دلیل انہوں نے دی وہ بظاہر کمزور معلوم ہوتی تھی۔ دل میں یہ شک پیدا ہوتا تھا کہ یوں تو خودکشی کا فعل بھی جو اکثر دیکھنے میں آتا ہے قانون فطرت کے مقتضا کے خلاف ہے اس لئے معجزہ کہلانے کا مستحق ہے۔ یہاں مغالطہ اس وجہ سے ہوتا ہے کہ محض جذبات کے جوش میں خودکشی کرنا یا لڑکر جان دینا بھی فطرت کے مقتضا کے خلاف معلوم ہوتا

ہے، لیکن حقیقت میں وہ بھی فطرت حیوانی کا ایک مظاہرہ ہے، اس لیے اس میں ایسی کوئی بات نہیں جس سے عقل حیران رہ جائے۔ حیرت تو اس وقت ہوتی ہے جب کوئی فرد خدا سمجھ بوجھ کر کسی اخلاقی مقصد کے لیے جان دیتا ہے جس پر فطرت حیوانی کبھی آمادہ نہیں ہو سکتی۔ یعنی دراصل وہ فطرت حیوانی کو فطرت ملکوتی کی بلند سطح پر پہنچا دیتا ہے۔ یہ وہ کارنامہ ہے جسے شہادت کہتے ہیں اور جس میں معجزے کی شان پائی جاتی ہے۔

امام حسینؑ کی شہادت کی کیا اہمیت ہے کہ آج چودہ سو سال کے بعد بھی اس کی یاد منائی جاتی ہے؟! اسے اس طرح سمجھئے کہ کسی بلند اخلاقی مقصد کے لئے خود جان دینا معجزے کی شان رکھتا ہے تو پھر اپنے جان سے زیادہ پیارے بال بچوں کو ایسے مقصد کی خاطر قربان کر دینا اور اپنے بہتّر رفیقوں کے دل میں اس قربانی کی آرزو پیدا کر دینا کتنا بڑا معجزہ ہے!

یزید جب تخت حکومت پر بیٹھا تو صرف دنیاوی حکومت کے لیے نہیں بلکہ خلافت کا مدعی تھا یعنی آنحضرت صلعم کی جانشینی کا مدعی تھا۔ یزید کی زندگی اخلاقی زندگی نہیں تھی۔ اس کے اکثر اعمال سراسر اسلامی تعلیم کے منافی تھے۔ اس کی حکومت اسلامی حکومت نہیں بلکہ استبدادی شاہی حکومت تھی۔ ایسے شخص کا مسند خلافت پر بیٹھنے میں مسلمانوں کی گمراہی کا کتنا بڑا خطرہ تھا۔ اگر امام حسینؑ اسے چیلنج نہ کرتے تو ممکن ہے کہ مسلمان مجموعی طور پر اس کی خلافت کو تسلیم کر لیتے۔ اس خطرے کا مقابلہ کرنے سے بڑھ کر اخلاقی مقصد اُس وقت اور کیا ہو سکتا تھا اور پھر مقابلے کی صورت حال کو دیکھئے۔ امام حسینؑ کی فوج میں بہت تھوڑے سے لوگ ہیں، دوسری طرف جو فوج ہے اس کی تعداد کم سے کم کئی ہزار ہے، گویا اس لڑائی میں زندہ بچ رہنے کا کوئی امکان نہیں، موت یقینی ہے مگر اس کے باوجود وہ باطل [illegible] کا مقابلہ کرتے ہیں اور خوشی خوشی جان دے کر سچائی کے علم کو بلند رکھتے [illegible] پیدا کر سکے، اپنے مقصد کے لیے تکلیفیں اٹھاتے [illegible] پڑنے پر اپنی اور اپنے عزیز ترین ساتھیوں کی جان [illegible] کی حمایت پر

ہمارے تو امام حسینؑ کی شہادت کا اصل مقصد پورا ہوگا۔

خواجہ غلام السیدین صاحب

امام حسینؑ نے جن کی شہادت کے واقعات کو ہم ہر سال محرم کے مہینے میں یاد کرتے ہیں، اپنی زندگی اس شان کے ساتھ بسر کی اور اس شان کے ساتھ جان آفریں کے سپرد کی کہ اس میں ہمیں ایک مثالی زندگی کا عکس نظر آتا ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ جب انسانی شخصیت اپنی پوری بلندی کو پہنچتی ہے تو اس میں کس قدر شرافت اور قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ وقت کے دھارے کو تن تنہا موڑ دیتی ہے۔ آیئے آپ کو اس ایمان کامل، اس نیک عملی، اس حق پرستی اور صبر جمیل کی چند جھلکیاں دکھاؤں۔

کربلا کے میدان میں امام حسینؑ کا یہ مختصر گروہ، جس کی کل تعداد بہتّر بیان کی جاتی ہے اور جس میں بچے، نوجوان اور بوڑھے سب شامل ہیں، کیوں یزید کی زبردست فوج کا مقابلہ کر رہا ہے جبکہ عرف عام میں ان کی شکست یقینی معلوم ہوتی ہے؟ اس لیے کہ ان کے سامنے ایک بڑا مقصد ہے جس کی اہمیت اور سچائی پر ان کو پورا بھروسہ ہے، یعنی زندگی کی ان قدروں اور شرافتوں کی اہمیت جن کو ان کے نانا حضرت محمد مصطفیٰ صلعم نے دنیا کے سامنے پیش کیا تھا اور جس کو یزید کی ناپاک طاقت کچلنا چاہتی تھی۔ یزید نے جو ایک نہایت ظالم اور ذلیل شخص تھا اور آداب دین و شرافت سے بے بہرہ، جبر کے ذریعہ بہت سے لوگوں سے بیعت حاصل کر لی تھی۔ امام حسینؑ اس وقت مدینہ میں قیام پذیر تھے اور دین کی اشاعت اور لوگوں کی ہدایت میں مشغول تھے، وہ ایک فرض شناس شوہر، ایک مشفق باپ، ایک محبت کرنے والے بھائی، ایک شریف پڑوسی ... مدینہ کے لوگ اس بات ...

... کا انسان ملی رتعنی اور فاطمہ ...

... میں ایک ایسا ہوتا ہوتا ہے کہ وہ ...

اس کو دبانا چاہتا ہے۔ یزید کو یہ اندیشہ تھا اور اس کے دل میں یہ خلش تھی کہ جب تک نور اور ہدایت کا یہ مینار روشن ہے، وہ لوگوں کے دل میں اپنا سکہ نہیں جما سکتا ہے۔ وہ لوگوں کے دلوں پر اپنا سکہ نہیں جما سکتا ہے۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ ساری دنیا کا اندھیرا بھی ایک شمع کو نہیں بجھا سکتا، اس لیے اس نے اپنے عامل کے ذریعہ حسین ابن علیؑ کو یہ پیغام بھیجا کہ یا تو میری بیعت کرو یعنی مجھے رسول خدا کا خلیفہ برحق تسلیم کرو، یا اپنے سر کی قربانی دینے کے لئے تیار ہو جاؤ۔

اس وقت امام حسینؑ کے سامنے بظاہر دو راستے تھے، وہ یزید کی بیعت کر لیں اور مدینہ میں چپ چاپ اپنی نیکی اور شرافت کی زندگی بسر کرتے رہیں۔ اس وقت یزید ان کے خون کا خواہاں نہ ہوتا۔ دوسرا راستہ یہ تھا کہ وہ یزید سے کہ باطل کا نمایندہ تھا، سمجھوتہ کرنے سے بالکل انکار کر دیں اور اس کے لیے جو قیمت ادا کرنی ہو اس کو خندہ پیشانی سے ادا کرنے کو تیار ہو جائیں۔ یہ زبردست سوال، ہاں یا نہیں، کبھی نہ کبھی، کسی نہ کسی شکل میں، کسی نہ کسی حد تک ہر انسان کے سامنے آتا ہے۔ بزدل، کم ہمت، دنیادار لوگ، جن کی کثرت ہے، "ہاں" میں اپنی عافیت تلاش کرتے ہیں، حق کے علمبرداروں کا جواب ہمیشہ "نہیں" ہوتا ہے۔ حسینؑ کی جو تربیت، جو نسلی میراث، جو شخصیت تھی، اس کو دیکھتے ہوئے ان کے سامنے در اصل دو راستے نہیں تھے بلکہ ایک ہی راستہ تھا۔ حسین کیسے برداشت کر سکتے تھے کہ اسلام کے چہرۂ زیبا پر یزید کی مکروہ چھاپ لگ جائے۔ اسلام جس نے انسانیت کو اخوت، مساوات، انصاف، رواداری، محبت اور پاکبازی کا سبق سکھایا تھا، اگر وہ "ہاں" کر دیتے تو صدیوں بعد آنے والی نسلوں کو شاید یہ بھی پہچاننے میں دقت ہوتی کہ محمدؐ کا اسلام کونسا ہے اور یزید کا کونسا! اس لیے حسینؑ یہی فیصلہ کر سکتے تھے کہ باطل کے ساتھ کسی سمجھوتے کو حقارت کے ساتھ رد کر دیں اور حق کی حمایت میں اپنی اور اپنے پیاروں اور ساتھیوں کی جان کی بازی لگا دیں۔
حضرت عیسیٰ نے کہا تھا کہ شہیدوں کا خون ہی مذہب کی جڑوں کو مستحکم کرتا ہے۔ اب حسینؑ روز

عاشورہ اپنے مختصر سے گروہ کے ساتھ، جس میں سیرت کے اعتبار سے چوٹی کے افراد شامل ہیں، یزید کی بہت زیادہ فوج کا مقابلہ کرتے ہیں ان کو یقین ہے کہ یہ ان کی اور ان کے دوستوں اور عزیزوں کی زندگی کا آخری دن ہے، وہ جانتے ہیں کہ ان کے بعد ان کے خاندان کی معزز خواتین اور بچوں کو اسیر کیا جائے گا اور یہ لٹا ہوا قافلہ شہر بہ شہر پھرایا جائے گا، لیکن حسینؑ نے وہ دامن پکڑا ہے اور اس ذات سے لو لگائی ہے کہ خوف اور پریشانی ان کے پاس نہیں پھٹکتی، وہ اطمینان انھیں نصیب ہے، جس کو شکست ہلا نہیں سکتی، موت چھین نہیں سکتی، ہر نئی آزمائش ان کی آتشِ شوق کو اور تیز کر دیتی ہے....

حسینؑ کی شہادت نے فضیلتِ انسانی کے دروازے کھول دیے، ان کی آوازِ حق رفتہ رفتہ عرب ہی میں نہیں بلکہ سارے اسلامی ملکوں میں پھیل گئی اور جوں جوں زمانہ گذرتا گیا ان کا پیغام دنیا کے کونے کونے میں پہنچ گیا اور انسانی فکر کی سعادت اور بلندی کا جزو بن گیا۔ اس پیغام کا ماحصل کیا ہے؟ یہی کہ حق کی حمایت ہر شریف انسان کا فرض ہے، خواہ اس کی عمر اور منصب، اس کا رنگ اور نسل اور مذہب اور وطن کچھ بھی ہو۔

آخر میں صدر جلسہ، مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی نے مختصر سی تقریر کی۔ انھوں نے فرمایا کہ اسلام میں شہادت کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ اسلام کی بنیاد ہی شہادت پر ہے۔ شہادت کی ایک صورت یہ ہے کہ ایک آدمی حق کی راہ میں اپنی جان دیدے۔" یزید کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا کہ "وہ ایک دنیادار آدمی تھا۔ اس میں خوبیاں بھی تھیں، مثلاً وہ بہت بڑا شاعر تھا، مگر اسے نہ صرف یہ کہ دورِ نبوت نصیب نہیں ہوا تھا بلکہ اس نے خلافت راشدہ کا زمانہ بھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کی زندگی بڑی حد تک اسلام سے ہٹی ہوئی تھی، اسی لیے جب اس نے خلافت کے لئے بیعت لینی چاہی تو بہت سے صحابہ کرام نے اس کی خلافت تسلیم کرنے اور اس کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے انکار کر دیا۔"

جلسے میں شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب اور اساتذہ و طلباء کے علاوہ جامعہ نگر کے بہت سے معززین نے بھی شرکت کی۔ جلسے کا آغاز قرآن حکیم کی تلاوت اور نظم سے کیا گیا، جنھیں نوعمر طالب علموں نے پیش کیا۔

خط کتابت اُردو کورس

وہ لوگ جو اُردو نہیں جانتے ہیں اور گھر بیٹھے اُردو سیکھنا چاہتے ہیں اُن کے لیے جامعہ ملیہ اسلامیہ نے "خط کتابت اردو کورس" جاری کیا ہے۔ آپ ہماری ہدایات کے مطابق ہندی یا انگریزی کے ذریعہ اُردو آسانی سے سیکھ سکتے ہیں۔ اس کام کی کوئی فیس نہیں ہے۔ کتابیں بھی مفت دی جائیں گی۔

مندرجہ ذیل پتے سے نصاب تعلیم اور داخلہ فارم حاصل کرنے کے بعد داخلہ فارم بھر کر بھیج دیجیے۔ ہم ایک ایک کر کے کتابیں مفت بھیجا کریں گے۔

پتہ

ناظم خط کتابت اُردو کورس۔ دفتر شیخ الجامعہ
جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

Regd. No. D - 768 June, 1971

The Monthly JAMIA

JAMIA NAGAR, NEW DELHI-25



جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

جامعہ

سالانہ چندہ		قیمت فی پرچہ
چھ روپے		پچاس پیسے
جلد ۶۴	بابت ماہ جولائی ۱۹۷۱ء	شمارہ ۱

فہرست مضامین

خط و کتابت کا پتہ

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی　　مطبوعہ: یونین پریس دہلی　　ٹائیٹل: دیال پریس دہلی

شذرات

۲۲ر جون ۱۹۷۱ء کی رات میں ۸ بجے دل کے دورہ میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ہردلعزیز استاد اور مشہور مورخ پروفیسر محمد حبیب کا انتقال ہوگیا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین۔ مرحوم لکھنؤ کے ممتاز ماہر قانون اور قومی کاموں میں شریک رہنے والی معروف شخصیت، جناب محمد نسیم صاحب مرحوم کے فرزند تھے، ان کے بڑے بھائی مرحوم محمد وسیم صاحب پاکستان چلے گئے تھے، چھوٹے بھائی پروفیسر محمد مجیب جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سربراہ اور شیخ الجامعہ ہیں۔ اب مجیب صاحب تنہا رہ گئے ہیں، ہم سب ان کے غم میں شریک ہیں، اللہ تعالیٰ انھیں، مرحوم کے بیٹے کمال حبیب، پروفیسر عرفان حبیب اور بیگم حبیب اور خاندان کے دوسرے افراد کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔

پروفیسر محمد حبیب مرحوم جو اپنے شاگردوں اور دوستوں کے وسیع حلقے میں، عام طور پر حبیب صاحب کے نام سے مشہور تھے، ۲ر جون ۱۸۹۵ء کو پیدا ہوئے۔ ۵-۱۹۰۴ء تک لکھنؤ میں تعلیم حاصل کی۔ پھر ۱۹۰۷ء میں ایم، اے، او، کالجیئٹ اسکول (علی گڑھ) میں داخلہ لیا۔ وہ ۱۹۱۶ء تک علی گڑھ میں زیر تعلیم رہے۔ بی اے فرسٹ ڈیویژن میں پاس کیا اور اس کے بعد آکسفورڈ گئے۔ یہاں سے ۱۹۲۲ء میں بی اے آنرز (ہسٹری) کی ڈگری لے کر وطن واپس ہوئے اور مادر درسگاہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ میں بحیثیت ریڈر کام کرنے لگے۔ ۱۹۲۴ء میں جب ان کی کتاب سلطان محمود آف غزنہ شائع ہوئی، تو چونکہ یہ کتاب سلطان سے متعلق عقیدتمندانہ طرز فکر سے ہٹ کر مورخانہ معروضیت کے ساتھ لکھی گئی تھی، اس لئے تعلیم یافتہ مسلمانوں کے ایک مخصوص حلقے میں ان پر ایسی نکتہ چینی کی گئی جس کا علم اور علمی معروضیت سے کوئی دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ بہرحال اس کتاب کی اشاعت سے حبیب صاحب

بہت جلد علمی حلقوں میں مشہور ہو گئے، شہرت کی ایک وجہ اُن کا گہرا مطالعہ، خاص طرزِ تعلیم اور دلکش اسلوبِ بیان تھا جو طلبار کو نہ صرف مسحور کر دیتا تھا بلکہ ان کے دل میں علم کا شوق اور اپنے استاد کی محبت کا جذبہ پیدا کر دیتا تھا، حبیب صاحب کے طالب علموں کو میں نے انھیں جس محبت کے انداز سے یاد کرتے دیکھا ہے اُسے بیان کرنا آسان نہیں ہے۔ مرحوم طالب علموں کے دکھ درد میں شریک رہتے تھے، اس میں اس کی تخصیص نہیں تھی کہ وہ تاریخ ہی کے طالب علم ہوں، یونیورسٹی کے کسی کلاس یا شعبہ کا کوئی طالب علم پہونچ جاتا تو حتی القدور، دامے، درمے، قدمے، سخنے، جو کچھ کر سکتے ضرور کرتے، اور اس طرح کرتے کہ علم اور طالب علم کا مرتبہ بلند تر محسوس ہوتا۔

مرحوم کی دوسری خصوصیت جس کی یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبار دونوں میں یکساں قدر تھی، حق گوئی اور جرارت اخلاقی تھی، یونیورسٹی میں ۱۹۲۲ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک اور اس کے بعد بھی نظریاتی کشمکش کے نہ معلوم کتنے نشیب و فراز آئے، لیکن انھوں نے علم اور سیاست میں اپنے مطالعہ اور غور و فکر سے جو نظریہ قائم کر لیا تھا اس پر سخت سے سخت آزمائش میں بھی جمے رہے، اور اس کی پروا نہیں کی کہ دوستوں، عقیدتمندوں اور طالب علموں کی بھیڑ کدھر جارہی ہے۔ ۱۹۴۵ سے ۱۹۴۷ء تک کا دور یونیورسٹی کا پُر آشوب دور تھا، قوم پرور نوجوانوں کی تعداد بہت کم تھی، لیکن جو کچھ بھی تھی اس لئے مضبوطی سے اپنے مسلک پر قائم رہی کہ اُسے حبیب صاحب سے انسپریشن ملتا رہا۔ اُن کے دوستوں اور طالب علموں کی طرح اس دور کے نیشنلسٹ مسلم طالب علم بھی مرحوم کو کبھی نہیں بھول سکتے:

آسماں ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے　　　سبزۂ نورستہ اس در کی نگہبانی کرے

حبیب صاحب کا اسلامی تصوف کا مطالعہ خاصا وسیع تھا، ان کے افکار و اعمال میں اس کا صحتمند روایات کا بھرپور احترام ملتا ہے، طبیعت میں مروّت بہت زیادہ تھی، دل میں نرمی اور ایک طرح کا گداز تھا، گفتگو نرم اور آہستہ لہجے میں کرتے، کلاس روم لکچر میں بھی یہی انداز رہتا، لیکن اس طرح

ہر بات دلنشیں ہوجاتی ۔ غصہ بہت کم آتا تھا، اور آتا تھا تو اس طرح ضبط کر لے جاتے تھے کہ لوگوں و پتہ بھی نہیں چلتا تھا۔ چند ہی موقعے ایسے آئے ہوں گے جب غصہ پر ضبط نہ کر سکے ہوں۔ دوسروں کا ام کر کے انھیں بہت خوشی ہوتی تھی، لیکن اس خوشی کا اندازہ صرف چہرے سے کیا جا سکتا تھا کیونکہ بان پر لانا گناہ تصور کرتے تھے۔ قدیم علی گڑھ اور آکسفورڈ کی علمی اور شریفانہ روایات کا ایک تابندہ نقش ان کی پرکشش شخصیت تھی۔ افسوس کہ اب وہ سانچہ ہی ٹوٹ گیا جس میں اس طرح کی شخصیتیں ڈھلتی نہیں، اس لئے بھی حبیب صاحب ہم سب کو یاد آتے رہیں گے اور ہم اُن کے حق میں دعائے خیر کرتے رہیں گے کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمتوں سے ان کی نئی زندگی کی منزلیں آسان کر دے۔ آمین۔

ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ خالص انسانیت کے ناتے سے ایک تنظیم انسانی برادری کے نام سے قائم کی گئی تھی، جس جلسے میں اسکا دستور منظور کیا گیا اور کچھ عہدہ دار منتخب کئے گئے، اس میں بعض لوگوں نے جنھیں فرقہ وارانہ ذہنیت کا خاصا تجربہ ہے، احتجاج کیا تھا اور یہ کہکر تنظیم سے اپنے آپ کو الگ کر لیا تھا کہ چونکہ اس میں فرقہ پرستوں کو شامل کیا جا رہا ہے اس لئے اس تنظیم کے اغراض و مقاصد کے حصول میں رکاوٹیں ہوں گی اور تنظیم خود اندرونی تضادات کا شکار ہوکر ختم ہو جائے گی۔ یہ بھی کہا گیا تھا کہ اس تنظیم سے فرقہ پرست عناصر ضرورت پڑنے پر اپنی فرقہ پرستی کو جو سراسر انسانیت دشمنی ہے، چھپانے کا کام لیں گے۔ لیکن اس وقت جے پرکاش جی اور دوسرے احباب نے اس نکتے کو سمجھنے سے انکار کر دیا، اور اس طرح اس تنظیم کی تعمیر میں شروع ہی سے خرابی کی ایک صورت مضمر ہو گئی، خرابی کی یہ صورت بنگلہ دیش کے مسئلہ پر بہت جلد ظاہر بھی ہو گئی۔ نہیں معلوم کہ یہ لنگڑی لولی تنظیم آئندہ کس طرح چلے گی۔

کہا جاتا ہے کہ جب بنگلہ دیش میں پاکستانی فوج کے بے پناہ مظالم کی خبریں ہندوستان پہونچنی شروع ہوئیں، تو انسانی برادری کی مجلس عاملہ کی میٹنگ میں ان مظالم کی مذمت سے متعلق ایک تجویز منظور کرنے کی بات آئی لیکن یہ تجویز منظور نہ ہو سکی کیونکہ بعض لوگوں نے جن کا شمار ہمارے "زعمائے ملت" میں ہوتا ہے،

اس کی شدید مخالفت کی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ دلیل یہ دی گئی کہ یہ پاکستان کا اندرونی معاملہ ہے، انسانی برا
کو اس سے کیا تعلق، اور یہ کہ ہم نے جب علی گڑھ اور مرادآباد کے فسادات (جو لوک سبھا کے الیکشن
موقع پر ہوئے تھے) سے متعلق جن سے ہمارا براہ راست تعلق ہے، کوئی تجویز منظور نہیں کی تو بنگلہ دیش
متعلق تجویز منظور کرنے کا کیا موقع ہے۔ اس بات کا جناب نعیم سین سچر صاحب پر اتنا اثر ہوا کہ کہا جاتا ہے کہ ا
نے انسانی برادری سے استعفا دے دیا۔ افسوس کہ تجویز کے نہ منظور کرنے کے لئے جو عذر لنگ تلاش کیا گیا
انسانیت کے نام پر ایک بدنما دھبہ ہے کسی نے کہا تھا کہ علی گڑھ اور مرادآباد کے فسادات سے متعلق تجویز نہ منظور کی جا
وہ لوگ یہ بھی کر سکتے تھے اور اس کے ساتھ بنگلہ دیش کے مظلوموں سے ہمدردی اور پاکستانی ظالموں کی مذمت
بھی کر سکتے تھے۔

ذرا غور کیجئے کہ انسانی برادری کے سب سے بڑے لیڈر جے پرکاش نرائن جی محض انسانیت کے نام
بنگلہ دیش کے جہاد آزادی کے حق، ظالموں کی مذمت اور پناہ گزینوں کی ہمدردی میں دنیا کی رائے عامہ کو
کرنے کیلئے کیا کچھ نہیں کر رہے ہیں، کہاں کہاں وہ پہونچے اور کس کس طرح سے انہوں نے اس عظیم انسانی ا
کی طرف دنیا کی توجہ مبذول کرانے کی کوشش کی، اور دوسری طرف انسانی برادری کے ان کے وہ سا
ہیں جو اسلام کا نام بہت لیتے ہیں، مسلمانوں کی ہمدردی کا راگ بڑے زور سے الاپتے ہیں، اقبال کے
مردمومن کی تلاش میں سرگرداں و پریشان نظر آتے ہیں اور اس حیرانی و سرگشتگی میں بانگ درا، بال جبریل
اور ضرب کلیم وغیرہ کے بہت سے اشعار پڑھتے ہیں، لیکن بنگلہ دیش کے کھیتوں سے وہاں کے کسانوں
کو روزی نہ ملنے پر اقبال ہی کی زبان میں یہ نہیں کہتے کہ ایسے کھیت سے کسانوں کے بجائے جن دوسرے
لوگوں کو فائدہ پہونچ رہا ہے انھیں اقتدار سے محروم کر دینا اور ایک نئے دور کا آغاز کرنا چاہئے۔ یہ لوگ
اپنی تقریروں میں قرآن حکیم کی آیات مقدسہ کے حوالے بڑے زور شور سے دیتے ہیں، لیکن قرآن حکیم
میں ظالموں کے لئے، خواہ یہ ظالم کہیں کے ہوں اور کسی نسل و مذہب سے تعلق رکھتے ہوں، جو کچھ کہا گیا
ہے، اسے یکسر فراموش کئے ہوئے ہیں۔ انسانیت ذبح ہو، بچوں کی معصومیت اور عورتوں کی عصمت رہ
ہو، ان سے انھیں کوئی واسطہ نہیں، یہ لوگ ہمدردی کے دو بول کا انفاق بھی اپنے اوپر گراں سمجھتے ہیں
اور یہ لوگ ہیں، بزعم خود، ہندوستانی مسلمانوں کے قائد، اور انسانی برادری کے نیتا۔ دیکھئے راہ کا تفاوت
کہاں سے کہاں تک ہے۔

ایرک سٹوکس
تلخیص وترجمہ: ڈاکٹر ماجد حسین

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی

سہارن پور اور مظفر نگر کے دیہی علاقوں کی بغاوت

(۱)

پروفیسر ایرک سٹوکس (سینٹ کیتھرینز کالج، کیمبرج) کا یہ مضمون کیمبرج یونیورسٹی کے سہ ماہی جریدے دی ہسٹریکل جرنل کے دسمبر ۱۹۶۹ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ جامعہ کالج کے استاد جناب ڈاکٹر ماجد حسین صاحب نے اس کی تلخیص وترجمہ سے ہمیں نوازا، ہم ان کے شکریے کے ساتھ اسے قارئین جامعہ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

(ادارہ)

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں دیہی علاقوں کی بغاوت کے جو حالات قلمبند کئے گئے ہیں، ان میں مہاجنوں اور بنیوں کا رول غیر شریفانہ دکھایا گیا ہے۔ برطانوی حکومت کی پہلی نصف صدی میں شمال مغربی صوبہ میں ہونے والے زرعی انقلاب میں سب سے زیادہ فائدہ مہاجنوں اور بنیوں کو پہونچا۔ اسی زمانے میں کسانوں کی زمین کا خاصا بڑا حصہ قصبات میں رہنے والے بنیوں اور مہاجنوں کے نام منتقل ہوا۔ مہاجنوں اور بنیوں کو اس طرح فائدہ پہونچنے کی خاص وجہ وہ تبدیلیاں تھیں جو سرکار نے بعض اداروں میں کی تھیں۔ مثلاً مالگذاری وصول کرنے کے حق کو قابل انتقال ذاتی ملکیت میں

تبدیل کرنا، بھاری اور مستقل نقد مالگذاری کا قاعدہ نافذ کرنا، اور مالگذاری ادا نہ کر سکنے یا قرضوں عدم ادائیگی پر مہاجنوں اور بنیوں کو کاشتکاروں کی زمین نیلام کرانے کا حق ملنا، قابل ذکر اداراتی تبدیلیاں تھیں۔ پروفیسر چودھری کا خیال ہے کہ "جائداد کی نیلامی کے قانون سے چھوٹے کاشتکار اپنی آراضی سے ہاتھ دھو بیٹھے اور زمیندار طبقہ بھی تباہ ہوگیا۔ برطانوی سرکار کے دیوانی قانون کی زد میں آکر چھوٹے کاشتکاروں اور زمینداروں نے مل کر ۱۸۵۷-۵۸ء میں انگریزوں کے خلاف بغاوت کی تاکہ اپنی کھوئی ہوئی جائداد اور حیثیت حاصل کر سکیں[۱]"

پروفیسر چودھری نے ایک اور جگہ نظام مالگذاری میں تبدیلی اور مہاجنوں اور بنیوں کے ساتھ انگریزوں کے غیر دانشمندانہ سمجھوتے کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

"زیادہ تر مہاجنوں اور بنیوں نے لالچ، حرص اور شوق میں زمینداروں اور غریب کاشتکاروں کی زمین اس وقت خریدنی شروع کی جب عدالت کے ذریعے ان کو قرضوں کی عدم ادائیگی پر زمین نیلام کرانے کا حق مل گیا۔ اس طرح بہت سے مہاجنوں نے بہت سی زرعی جائداد خریدلی اور بہت سے کاشتکار اور زمیندار اپنی آراضیات سے محروم ہوگئے۔ کاشتکاروں کی بستیوں میں بنیا ہی وہاں کا مہاجن ہوتا تھا۔ ان بنیوں نے بہت اونچی شرح پر کاشتکاروں کو روپیہ ادھار دینا شروع کردیا۔ جاہل کاشتکاروں کے خلاف انگریزی عدالتوں میں ظالم مہاجنوں کی معمولی رقم کے قرضوں پر مقدمے چلائے جانے لگے اور بیچارے کاشتکاروں کی آراضیات نیلام ہونے لگیں اور سماجی ڈھانچہ غیر متوازن ہونے لگا۔ آراضیات کی نیلامی اور زمینوں کے بنیوں اور مہاجنوں کے نام منتقل ہونے پر کاشتکاروں میں سخت برہمی پیدا ہوئی۔ اونچی شرح پر سود لینے والے مہاجنوں اور بنیوں کے قرضوں کا سرکاری طور پر تحفظ ہی ایک ایسی وجہ معلوم ہوتی ہے جس کے سبب غریب مزدور کاشتکار

۱۔ ایس، بی، چودھری، سول ریبلین ان انڈین میوٹنیز، کلکتہ، ۱۹۵۷ء، صفحہ ۲۱

"(جن کا سہارا ہی صرف قرض تھا) جنگ آزادی کے وقت انگریزوں کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہوئے۔ وہیں علاقے کے رہنے والوں نے انگریزوں کے خلاف اس لئے بغاوت نہیں کی کہ انھیں عیسائی مذہب اختیار کرنے پر مجبور کئے جانے کا ڈر تھا بلکہ ورثہ میں ملی ہوئی جائداد کو جاتے دیکھ کر وہ خاموش نہ رہ سکے[۱]"

اس بیان اور مہاجنوں اور بنیوں کے کردار کو پرکھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کا تفصیلی جائزہ لیا جائے، اور گاؤں کے رہنے والوں کی بغاوت میں شرکت اور بنیوں اور مہاجنوں کے رول کو جانچنے کے لئے ضروری ہے کہ ضلع سہارنپور اور مظفر نگر کے ان علاقوں کا جائزہ لیا جائے جہاں اُدھار دینے والوں کا اثر زیادہ تھا۔

۱۸۳۸ء کے ایڈورڈ تھارنٹن کے زرعی لگان کے بندوبست میں مالگذاری کی شرح اونچی کردی گئی تھی، جس سے کاشتکاروں کی پریشانیاں بڑھ گئیں اور مالگذاری میں اضافہ اور اناج کی شکل میں مالگذاری کی ادائیگی کے سبب کاشتکار زیادہ تر مہاجنوں کا سہارا لینے لگے تھے۔ مالگذاری اور مہاجنوں کے قرضوں سے پریشان ہوکر جب ۱۸۵۷ء میں بدامنی پھیلی تو کاشتکاروں نے بنیوں اور مہاجنوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ تاہم یہ کہنا مشکل ہے کہ کسانوں کے قرضوں اور بغاوت میں براہ راست کوئی تناسبی تعلق تھا۔ اس وقت کے ملنے والے اعداد و شمار کو اگر معتبر تسلیم کر لیا جائے تو نتائج اس کے برعکس معلوم ہوتے ہیں۔ بغاوت کی جغرافیائی تقسیم سے اندازہ ہوتا ہے کہ جن علاقوں میں بنیے اور تاجر پیشہ لوگوں کا اثر تھا وہاں بغاوت کم ہوئی۔ بغاوت زیادہ تر ضلع سہارنپور کے جنوبی پرگنوں، مثلاً نکوڑ، گنگوہ اور دیوبند میں ہوئی، جہاں پر شرح رہن آراضی اور زمین کی قیمت کم تھی، نیز بنیوں کی جائدادیں بھی بہت کم تھیں۔ اگرچہ انگریزوں کے خلاف بغاوت پورے ضلع میں پھیلی، مگر بغاوت ان حصوں میں زیادہ پروان چڑھی اور دیرپا رہی جو علاقے

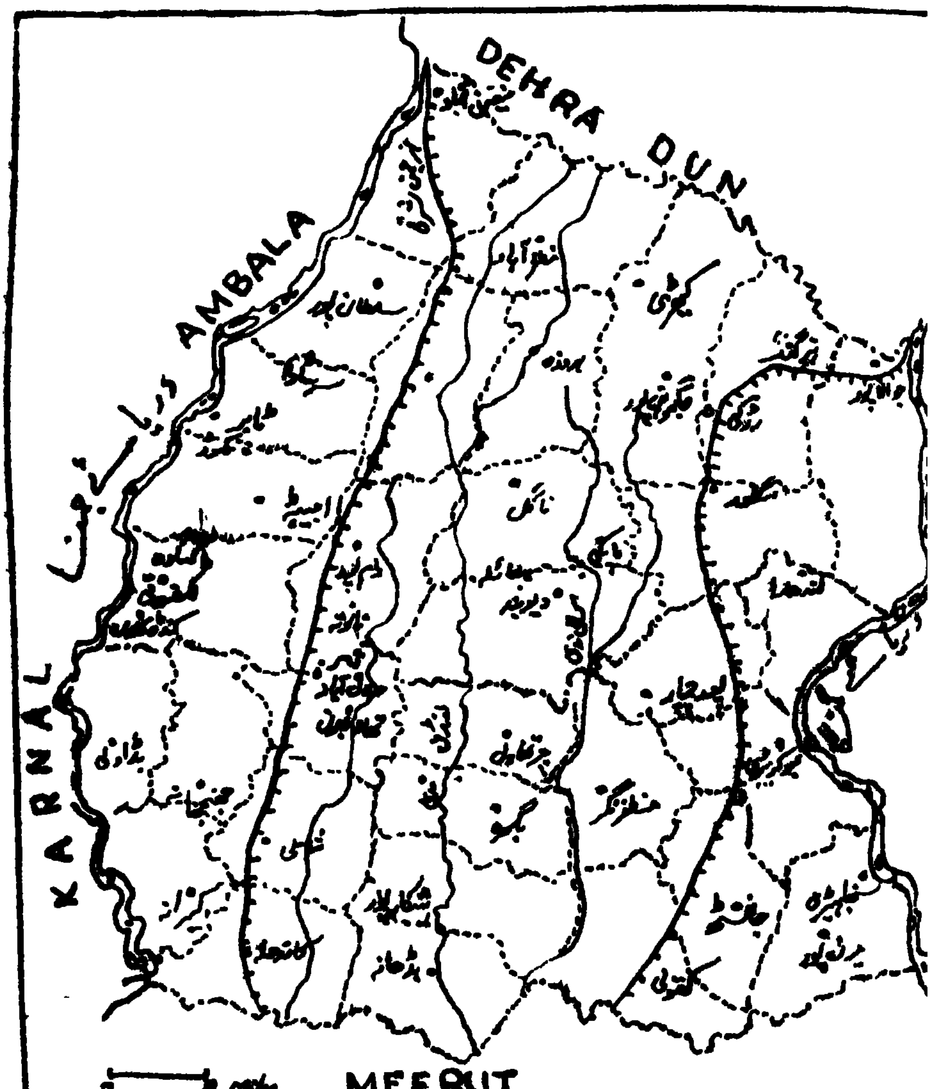
۱۔ ایس۔ بی۔ چودھری، تھیوریز آف انڈین میوٹینی (کلکتہ ۱۹۶۵ء) صفحہ ۳۶—۳۵

انگریزی حکومت کے مراکز سے دور ضلع کی سرحدوں پر تھے۔ ابتدا میں بغاوت کے بہت سے واقعات سہارنپور کے آس پاس اور شہر میں ہوئے لیکن ان پر جلد ہی قابو پالیا گیا۔ ضلع سہارنپور کے شمالی حصے کے جغرافیائی حالات، ذرائع آمد و رفت کی کمی اور باغیوں کو منظم کرنے کی دشواری وہاں پر بغاوت کی ناکامی کا سبب بنی۔ گوجر، راجپوت اور رانگھڑ جیسی لڑاکو اقوام ضلع سہارنپور کے شمالی حصے میں بہت کم ہیں اور بکھری ہوئی ہیں، جس کی وجہ سے انگریزوں کو یہاں بغاوت کو دبانے میں زیادہ معرکے پیش نہیں آئے۔ ۲۳ر مئی کو اسسٹنٹ مجسٹریٹ، ایچ، ڈی رابرٹسن جب پرگنہ بھگواپور کے کھیڑی گاؤں میں موہنڈ سڑک کو بنجارہ ڈاکوؤں کے تسلط سے آزاد کرانے کے لئے پہنچا تو اس نے محسوس کیا کہ وہاں کی دیہاتی آبادی پوری طرح حکومت کی وفادار نہیں ہے۔ درحقیقت ۱۸۴۱ میں کھیڑی گاؤں کے رانگھڑوں کی بہت سی جائداد سرکار نے ضبط کر لی تھی اور بعد میں انھوں نے خود بہت سی آراضی فروخت کر دی یا ان کی زمینیں نیلام کر دی گئیں۔ رابرٹسن کے مذکورہ دورہ کے بعد ضلع سہارنپور کے اس حصہ میں بغاوت کی کوئی واردات نہیں ہوئی۔ یہاں پر امن رہنے کی دو خاص وجوہ ہیں: (۱) اس حصے میں گھنے جنگلات ہیں اور ذرائع آمد و رفت کی کمی ہے۔ (۲) سہارنپور کے جنوب کے باغی علاقوں اور جنگلات والے حصے کے درمیان ضلع کا صدر مقام تھا جس کی وجہ سے دونوں حصوں کے باغیوں کے درمیان رابطہ پیدا نہ ہو سکا۔

سرکار کے ذریعہ تیار کردہ جنگ آزادی کے ابتدائی احوال اور اسباب کے بارے میں اختلاف رائے ہے۔ تاہم اس بات پر سب متفق ہیں کہ مہاجنوں اور بنیوں کے خلاف عوام کا غم و غصہ اس بغاوت کی بڑی وجہ رہی ہے۔ مجسٹریٹ اسپانکی نے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ابتدا میں باغی بغاوت کے لئے تیار نہ تھے۔ اس نے لکھا ہے:

> لوٹ مار کرنے والی اقوام گوجر اور رانگھڑ اس بغاوت میں پیش پیش تھیں۔ بہر کیف بغاوت اس وقت تک نہیں پھیلی جب تک مظفر نگر میں (غالباً ۱۲ مئی) بدامنی نہ پھیلی۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے پورے ضلع میں بغاوت اور فسادات کی لہر پھیل گئی۔۔۔ گوجروں اور عیسری

قوموں کے مجمعے ہونے لگے۔ قدیم قبائلی یا ذات پات کے جھگڑے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ باری باری کرکے گاؤں لوٹے گئے۔ ادھار دینے والے بنیوں کی جائدادوں پر قبضہ کیا گیا۔ یا سیران کو اپنے تحفظ کی خاطر بھاری جرمانے دینے پڑے۔ لاقانونیت اور طوائف الملوکی کے اس دور میں زمینداروں اور کاشتکاروں نے موقع غنیمت پاکر اپنے قرضوں سے متعلق



map of saharanpur & muzaffarnagar districts

دستاویزات اور کاغذات بنیوں سے واپس لے لئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ بغاوت سرکار کے خلاف نہیں بلکہ مخصوص اشخاص اور اقوام کے خلاف تھی۔ جب دہلی میں انگریزوں کے اقتدار کا خاتمہ مشتبہ اور غیر یقینی نظر آنے لگا تو کاشتکار طبقے نے مقامی سرکاری خزانوں کی طرف توجہ کی اور سرکاری افسران اور افواج کے خلاف شورش برپا کی گئی۔"

بہرحال، سرکار انگریزی کے خلاف مزاحمت کا سلسلہ پہلے ہی سے شروع ہو چکا تھا۔ ۲۱ مئی کو اسپانکی ایک فوجی دستہ لیکر روڑکی سڑک سے گذرتا ہوا سہارنپور سے سات میل مشرق میں واقع گورہو گاؤں میں پہنچا۔ اس گاؤں کے باغی کاشتکاروں نے ایک بنیئے کا گھر لوٹ لیا تھا۔ موقع پر پہنچ کر اسپانکی نے کنکوری اور بھورور گاؤں کے نمبرداروں کو گرفتار کیا، کیونکہ ان گاؤں کے کاشتکاروں نے مالگذاری ادا کرنے سے انکار کر دیا تھا اور بغاوت پر آمادہ تھے۔

چند روز بعد اسسٹنٹ مجسٹریٹ رابرٹسن کو سپاہیوں کے ساتھ دیوبند قصبہ کے ہندو تاجروں کی حفاظت کے لئے روانہ کیا گیا۔ لیکن اس دستے کو دیوبند سے چار میل مشرق میں کالی ندی کے کنارے پر واقع دیہات، بابوپور، سانپلہ، باکل اور فتح پور کے گوجروں کے سخت مخالفانہ رویے کا سامنا کرنا پڑا۔ اس واقعہ سے صرف چھ ہفتے پہلے ہی رابرٹسن نے بندوبست پر نظر ثانی کے کام کے لئے اس علاقے کا دورہ کیا تھا۔ اُس وقت صورت حال ایسی نہ تھی، اب ان بدلے ہوئے حالات کو دیکھ کر وہ متعجب اور حیرت زدہ رہ گیا۔ رابرٹسن کی رائے میں فوج تو بغاوت کر سکتی تھی لیکن امن پسند کسانوں کے برتاؤ میں یہ حیرت انگیز تبدیلی اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ کسانوں کی بغاوت کی شدت کو دیکھتے ہوئے اس نے کاٹھا (دیوبند سے مغرب کی جانب) کے پنڈیر راجپوتوں کو دبانے کے لئے اپنی نیم تربیت یافتہ فوج کو بھیجنا مناسب نہ سمجھا۔ اس علاقے میں پہلے ہی دن کے تجربے سے اندازہ ہوا کہ یہاں پر زمیندار بھی بغاوت میں شامل ہیں اور باغیوں سے آبادی کے ایک بڑے حصہ کو ہمدردی ہے۔ انھیں ایام میں دیوبند سے ۱۲ میل شمال مشرق میں واقع مانک پور گاؤں

۱۔ ایچ، ڈی، رابرٹسن۔ ڈسٹرکٹ ڈیوٹیز، پیرا ۳۴۳۔

موجودہ مانک پور آدم پور میں بغاوت ہوئی ۔ مانک پور کے امراؤ سنگھ نے اعلان کیا کہ وہ اس علاقے کا راجا ہے اور اس نے مالگذاری وصول کرنی شروع کر دی اور اس طرح وہ اپنے علاقے کے سب گوجروں کا سردار بن گیا[1]۔

رابرٹسن کی رائے میں سرکاری دفاتر اور قصبات پر دیہاتیوں کے حملے محض لوٹ مار کی خاطر نہ تھے، بلکہ یہ لوٹ مار شعوری طور پر دیہاتی باغیوں کا حکومت برطانوی کے خلاف ایک زبردست مظاہرہ تھا۔ گاؤں کے عوام میں حکومت برطانیہ کے خلاف نفرت پھیلانے کا خاص سبب بنیوں، مہاجنوں اور تاجر طبقہ کی دست درازیاں تھیں، کیونکہ اصلیت میں گاؤں والے انگریزی سرکار کو مہاجنوں، بنیوں اور تاجروں کی حکومت سمجھتے تھے۔ غریب کاشتکاروں کو روپیہ ادھار دینے والے بنیے اور مہاجن قصبات میں رہتے تھے۔ ملک کے داخلی انتظام میں انتشار پیدا ہوا تو ان قصبات پر دیہاتیوں نے حملے کئے۔ رابرٹسن کے قول کے مطابق کسی بھی طبقہ نے سرکار کی اتنی مخالفت نہیں کی جتنی مخالفت دیہی علاقوں کے ان لوگوں نے کی جن کی زمین وجائداد برطانوی عدالتوں کے ذریعہ نیلام ہو کر بنیوں اور مہاجنوں کے پاس پہنچ گئی تھیں[2]۔

رابرٹسن نے ضلع سہارنپور کے جنوبی پرگنوں کے اندرونی حصوں کی طرف خصوصی توجہ دلائی، جہاں بنیوں اور مہاجنوں کا اثر بہت کم تھا۔ جون کے آخر تک بغاوت اور لوٹ مار کا مرکز گنگا کے کھادر کا زرخیز میدان بن گیا تھا۔ گنگا کے کھادر میں لوٹ مار کا کام دیہاتوں میں آباد عوام کے بجائے خانہ بدوش بنجاروں نے کیا۔ اس کے علاوہ کاٹھا، نکوڑ اور گنگوہ لوٹ مار کرنے والوں کا گڑھ تھے، یہ پرگنے گوجروں کے اقتدار میں تھے۔ یہاں پر قبائلی بنیاد مستحکم تھی جس سے باغیوں کو تقویت پہنچی۔ یہاں پر واقع بتار گوتر کے گوجروں کے باون گاؤں خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔

۱۔ ایچ۔ڈی۔ رابرٹسن، ڈسٹرکٹ ڈیوٹیز صفحہ ۴۵

۲۔ " " " صفحات ۷-۱۳۴

ضلع سہارنپور کے مغربی حصے میں لوٹ مار اور بغاوت سب سے پہلے جمنا کے کھادر میں واقع تاہر گاؤں سے شروع ہوئی، جو قصبہ نکوڑ سے چار میل مغرب میں واقع ہے۔ اس گاؤں میں بخشی نام کے رانگھڑ نے ہم خیال لوگوں کی ایک بڑی جماعت تیار کی اور ان کو لیکر نکوڑ اور سرساوہ پر حملہ کرنے کی دھمکی دی۔ ۱۷ مئی کے آس پاس بخشی رانگھڑ جمنا کی دوسری طرف چلا گیا اور جون ۱۸۵۷ء کو گوجروں کی اس بغاوت میں مدد پہنچانے کے لئے واپس آیا جس میں انھوں نے نکوڑ کی لوٹ مار کی تھی۔ ۱۷ جون کو رابرٹسن نکوڑ پہنچا تو اس نے تحصیل اور تھانے کی عمارت میں آگ لگی ہوئی دیکھی۔ سرکاری ریکارڈ، مہاجنوں کے رقعے اور قرضے کے کاغذات باغیوں نے پھاڑ کر آس پاس کے باغوں اور باغیچوں میں بکھیر دئے تھے۔ نکوڑ کے آس پاس کے دیہاتوں کو سزا دیتے ہوئے رابرٹسن، بانگر کے علاقے سے گذرتا ہوا گنگوہ پہنچا۔ بغاوت کی آگ ضلع کے اس حصے کے ہر کونے میں بھڑک چکی تھی۔ اور سرکار کے لئے، اپنی فوج کی محدود تعداد کے پیش نظر یہ ممکن نہ تھا کہ ہر ایک گاؤں کے باغیوں پر قابو پا لیا جائے۔[۱] اس لئے انتظامیہ کو یہ طے کرنا پڑا کہ کونسے باغیوں کو پہلے دبایا جائے تاکہ دوسرے حصہ کے باغی خاموش ہو جائیں۔ گھاٹ پور اور امبیٹہ کے قرب وجوار کے دیہاتوں کو چھوڑتے ہوئے (جہاں بغاوت زوروں پر تھی) رابرٹسن نے بڈھا کھیڑہ کے باغیوں پر دھاوا بولا۔ بڈھا کھیڑہ کے فتح نامی شخص نے بغاوت کر کے یہ اعلان کر دیا تھا کہ وہ گوجروں کا راجہ ہے۔ لیکن یہاں باغیوں کا سردار سرکاری فوج سے لڑنے کے لئے نہیں آیا۔ اسی لئے رابرٹسن نے گنگوہ کا رخ کیا جہاں کنڈہ کلاں گاؤں میں تقریباً تین ہزار رانگھڑ باغی جمع ہو رہے تھے۔ ان رانگھڑوں کا ارادہ لکھنوتی اور گنگوہ پر حملہ کرنے کا تھا۔ باغیوں کی ان مزاحمتی کارروائیوں کے بارے میں رابرٹسن کا تجزیہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ برطانوی افسران کی طرح رابرٹسن کا بھی خیال تھا کہ اس بغاوت کی بنا سیاسی تھی، جس میں مسلمانوں

۱۔ رابرٹسن، ڈسٹرکٹ ڈیوٹیز صفحہ ۱۴۰

نے بڑے پیمانہ پر انگریزی حکومت کے خلاف سازش کی، اور اس بغاوت کو معاشی بحران میں مبتلا ہندو عوام کی زبردست حمایت میسّر رہی۔

ان تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ اس علاقے میں باغیوں کو شہ دینے میں مسلمانوں کا زبردست ہاتھ تھا۔ زیادہ تر ہندو کاشتکار مہاجنوں کے مقروض تھے۔ ان کاشتکاروں نے اپنے قرضہ کے کاغذات کو تباہ کرنے کے لئے موقع سے فائدہ اٹھا کر لوٹ مار کی[1]۔

رابرٹسن کے مطابق امبیٹھہ اور گنگوہ کے بااثر مسلمانوں نے بنیوں اور مہاجنوں کو لوٹنے اور سود کے کاغذات کو تباہ کرانے کے لئے ہندو گوجروں کو بغاوت کے لئے اُکسایا تھا۔ فتح نامی مسلمان گوجر نے کاشتکاروں کی جائداد پھر سے ان کے نام پر منتقل کر دی تھی۔ کنڈہ کلاں کے رانگھڑ البتہ پھر سے ہندوؤں پر.......... اپنا تسلط قائم کرنا چاہتے تھے، جس کے سبب بغاوت نے وہاں پر فرقہ وارانہ رنگ اختیار کر لیا تھا۔ رابرٹسن کی نظر میں کنڈہ کلاں میں اس کے علاوہ اور کوئی بنائے مخاصمت معلوم نہیں ہوتی تھی۔ یہاں پر گوجروں کی طرح رانگھڑوں کی بستیاں بھی گنجان تھیں، اس لئے محض لوٹ مار رانگھڑوں کا مقصد نہیں تھا۔ رانگھڑوں اور گوجروں کا باہمی تعصب ہی اس حصے میں لوٹ مار کا سبب بنا[2]۔

دیوبند تحصیل کے دیگر علاقوں میں بھی رابرٹسن نے لوٹ مار کے ایسے ہی اسباب بیان کئے۔ لکھا کے کھادر میں بنجاروں کی بغاوت کی مہم سے جب رابرٹسن واپس لوٹ رہا تھا تو معلوم ہوا کہ دیوبند کے آس پاس کے تمام دیہات کے لوگ دیوبند پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ اسی لئے ۲۲ر جولائی کو رابرٹسن گوجروں اور کاٹھا کے راجپوتوں سے دیوبند کو بچانے کے لئے وہاں پہنچا۔ دیوبند پہنچکر معلوم ہوا کہ اس قصبہ کا تقریباً ایک تہائی حصہ باغیوں نے لوٹ مار کر کے

۱۔ رابرٹسن، ڈسٹرکٹ ڈیوٹیز صفحہ ۱۳۳

۲۔ " " " صفحہ ۴-۱۳۳

تباہ کر دیا ہے۔

دیوبند میں بھی نکوڑ جیسا ہی منظر پیش آیا۔ یہاں پر بنیوں کے بہی کھاتے، قرضے کے کاغذ تباہ کرنا باغیوں کا اصل مقصد تھا۔ ان واقعات سے واضح ہو جاتا ہے کہ بنیوں اور مہاجنوں کے خلاف کاشتکاروں کی عداوت نے ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں زبردست رول ادا کیا۔ اگرچہ بنیوں اور مہاجنوں کا باغیوں کے خاص مراکز پر کم اثر تھا، تاہم متعلق پرگنوں میں آراضیات کی تقسیم کی نوعیت کا بغور مطالعہ کرنے سے تصویر کا صحیح رُخ سامنے آجاتا ہے۔

ضلع سہارنپور کے جنوبی پرگنوں کے حالات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ بغاوت زیادہ ان غیر آبی علاقوں میں محدود تھی جہاں پر نہریں نہیں تھیں اور کنوؤں میں اتنا پانی نہ تھا کہ آبپاشی کے کام آسکے۔ غدر کے بعد افسرانِ بندوبست اور تحصیلداروں نے ان علاقوں کا دورہ کیا اور سفارش کی کہ یہاں کاشتکاروں کی آراضیات پر شرح مالگذاری کم کی جائے۔ ان دشواریوں کے باوجود بھی ان حصوں میں ضلع کے دوسرے علاقوں کے مقابلے میں بنیوں اور مہاجنوں کا اثر بہت کم تھا۔ پرگنہ نکوڑ اور گنگوہ کے بانگر کے دیہاتوں میں جہاں گوجروں کی آبادی ہے اور جہاں ذرائع آبپاشی نہیں تھے، بنیوں کا اثر سب سے کم تھا۔

پرگنہ نکوڑ میں ۱۸۶۴-۵ء تک کل زیر کاشت آراضی کا تقریباً ۱۲ فیصدی حصہ بنیوں کے پاس پہنچ گیا تھا، لیکن بانگر میں بنیوں کا حصہ صرف ۵ فیصدی تھا، جبکہ گوجروں کے پاس اس پرگنے میں مجموعی طور پر ۵۸ فیصدی آراضی تھی۔ گنگوہ میں بنیوں اور مہاجنوں کے پاس اور بھی زیادہ زمین پہنچ گئی تھی۔ تاہم بانگر کے غیر آبی علاقے میں بنیوں کے پاس صرف ۱۲ فیصدی اور گوجروں کے پاس ۵۷ فیصدی آراضی تھی جبکہ پورے پرگنہ میں مہاجنوں کا حصہ ۱۸ فیصدی تھا۔

گنگوہ پرگنے کی آراضی پر کافی عرصے سے شرح مالگذاری بہت اونچی رہی تھی۔ اس اونچی شرح مالگذاری کو کاشتکار برداشت نہ کرسکے اور اس کی وجہ سے پندرہ دیہاتوں سے آبادی دوسرے علاقوں کو منتقل ہوگئی اور اس طرح یہ گاؤں ویران ہوگئے۔ یہ سمجھ میں آنے والی بات ہے کہ

الگذاری ادا کرنے کے لئے کاشتکاروں نے مہاجنوں سے قرضے لئے اور قرض ادا نہ ہو سکنے کی ورت میں ان کی زمینیں بنیوں اور مہاجنوں نے نیلام کرا کے خود حاصل کرلیں۔ گنگوہ کے مغربی حصے کے بانگر کھادر کی آراضی کے ملے جلے علاقہ میں گوجروں کی آبادی کم تھی اور مہاجن زیادہ آباد تھے۔ گنگوہ کے کھادر میں جہاں گوجر زمیندار نہیں تھے وہاں ۳۶ فیصدی آراضی بنیوں کے قبضہ یں آچکی تھی۔ اس سے بھی زیادہ جمنا کے کھادر میں بنیے اور مہاجن ۴۵ فیصدی آراضی حاصل کرنے یں کامیاب ہو گئے تھے۔ پرگنہ نکوڑ میں حالات اور بھی زیادہ خراب تھے۔ اس پرگنہ کے بانگری لاقے میں، اگرچہ بنیے صرف ۵ فیصدی زمین پر قابض تھے، مگر کھادر بانگر کے حصے میں ان کا حصہ ۱ فیصدی ہو گیا تھا جبکہ گوجروں کے پاس یہاں پر صرف ۴۰ فیصدی زمین تھی۔ نکوڑ کے کھادر یں بنیوں کے پاس ۱۷ اور گوجروں کے پاس صرف ۱۸ فیصدی زمین تھی۔ مذکورہ اعداد و شمار ر حقیقت غدر سے دس سال بعد کے ہیں اور ان کی بنیاد پر غدر کے وقت کی صحیح تصویر کا ندازہ لگانا مشکل ہے۔ تاہم ان اعداد و شمار کی مدد سے اتنا ضرور اندازہ ہوتا ہے کہ گوجروں و اپنی جائداد برقرار رکھنے ہی کا نہیں بلکہ ان کی اپنی بقا کا سوال آپڑا تھا۔ مہاجنوں سے زیادہ خطرہ ان گوجروں اور دیگر ہمعصر برادریوں کو تھا۔۔ جو گوجروں کے گڑھ کے باہری حصول یں آباد تھیں۔ یہاں گوجروں کے قرب میں مہاجنوں کے پاس ۱۲ فیصدی اور رانگھڑوں کے لاقے میں مہاجنوں کے پاس تقریبًا ۵۰ فیصدی آراضی تھی۔ اس جائدادی نقصان کا گوجروں اور انگھڑوں پر زبردست اثر پڑا، نتیجہ یہ ہوا کہ ان برادریوں نے بنیوں اور مہاجنوں کے خلاف بردست احتجاج کیا۔

یہاں ایک اہم سوال یہ سامنے آتا ہے کہ گوجروں کی بغاوت کا سبب بنیے اور مہاجن تھے ا بنیے اور مہاجن ان اسباب میں سے ایک تھے جن کی زد میں آکر گوجروں کا قدیم سماجی اور معاشی ھانچہ منتشر ہو رہا تھا۔ ملنے والی شہادتوں سے پتہ چلتا ہے کہ گوجروں کی بغاوت کی خاص وجہ ن کا بدلتے ہوئے معاشی نظام سے مطابقت پیدا نہ کر سکنا تھا۔ اس بیان کی تصدیق پرگنہ گنگوہ

اور نکوڑ کے ان گوجر کاشتکاروں سے ہوتی ہے جہاں نہری آبپاشی کے دیہاتوں نے بغاوت میں حصہ نہیں لیا اور اس طرح وین (Wynne) کی ۱۸۶۷ء کی رپورٹ بہت حد تک صحیح معلوم ہوتی ہے۔

جانوروں کا چرانا گوجروں کا خاص پیشہ رہا ہے لیکن رامپور کے نہری دیہاتوں کے گوجروں کا خاص پیشہ جانوروں کا چرانا نہیں رہ گیا تھا۔ یہاں فصلوں کو نہری پانی ملنے سے پیداوار اتنی یقینی ہو گئی تھی کہ پورے جنوب مغربی سہارنپور میں آبیار ہونے والے دیہاتوں کے گوجر مطمئن اور خوش حال ہو گئے تھے۔[1]

(باقی)

۱۔ بندوبست رپورٹ، ضلع سہارنپور ۱۸۷۱ء، پیرا ۸۹، صفحہ ۹۹۔

روش صدیقی

غزل

عشق کی شرح مختصر کے لئے
سِل گئے ہونٹ عمر بھر کے لئے
زندگی دردِ دل سے کترا کر
دردِ سر بن گئی بشر کے لئے
دل ازل سے ہے شعلہ پیراہن
شمع جلتی ہے رات بھر کے لئے
اس نے دل توڑ کر کیا ارشاد
اب تسلّی ہے عمر بھر کے لئے
ابرِ رحمت ہے عشق کا دامن
آتشِ رزمِ خیر و شر کے لئے
ہم بھی کوئے بتاں کو جاتے ہیں
اے صبا! قصد ہے کدھر کے لئے
وہ تجلّی ہے منتظر اب تک
کسی شائستۂ نظر کے لئے
خونِ دل صرف کر رہا ہوں روش
خوب سے نقشِ خوبتر کے لئے

پروفیسر میر حسین شاہ
ترجمہ: محمد خلیق صدیقی

امیر امان اللہ خاں کی اصلاحات

حضرات، مجھے اجازت دیجئے کہ میں آپ سب کا شکریہ ادا کروں کہ مجھے آج پھر جامعہ آنے کا موقع عطا ہوا۔ جامعہ ہمارے لئے کوئی نیا نام نہیں ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ جامعہ کی تعمیر میں مہاتما گاندھی، مولانا ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر ذاکر حسین جیسے ممتاز رہنماؤں نے کتنی بڑی خدمت انجام دی اور اب کس طرح پروفیسر محمد مجیب جامعہ کو ترقی دینے میں مصروف ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ہم افغانیوں کے لئے ہندوستان کوئی اجنبی ملک نہیں ہے۔ کابل کے ایک عام آدمی سے لیکر یونیورسٹی کے علمی حلقے تک تمام لوگ ہندوستان کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور جانتے ہیں، اور اس یگانگت سے واقف ہیں جو دونوں ملکوں کے بیچ رہی ہے۔ میں تاریخ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے بخوبی جانتا ہوں کہ ہمارے ملکوں کے درمیان ماضی میں کتنا قریبی تعلق رہا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہماری تہذیب پر ہندوستانی تہذیب نے کتنا گہرا اثر ڈالا ہے اور خود ہم نے ہندوستان کی عظیم تہذیب کے ارتقا میں کیا رول ادا کیا ہے۔ پروفیسر محمد مجیب کی نوازش ہے کہ انھوں نے مجھے امان اللہ خاں اور اُن کی اصلاحات کے بارے

نوٹ: پروفیسر میر حسین شاہ کابل یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر اور فیکلٹی آف آرٹس کے نائب ڈین ہیں۔ مارچ ۱۹۶۸ء میں وہ ہندوستان کے تعلیمی دورہ پر تشریف لائے تھے۔ اس سلسلہ میں وہ جامعہ میں دوبار آئے اور ۱۸ مارچ کو جامعہ میں یہ تقریر کی۔

ں آج تقریر کرنے کی دعوت دی۔ آپ جیسے ذی علم لوگوں کے سامنے تاریخ کے کسی موضوع پر تگو کرنا 'اُلٹے بانس بریلی' کے مترادف ہے۔ لیکن میرے ہندوستانی دوستوں کی جو عنایات مجھ پر ہی ہیں اُن کے سہارے میں اُس کہانی کو دہرانے کی کوشش کر رہا ہوں جس سے آپ سب اقف ہیں۔ آج میں آپ کے سامنے ان اصلاحی کوششوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو امان اللہ ران کے والد کے عہدِ حکومت میں کی گئیں۔ میں خاصکر اُن کوششوں کا ذکر کروں گا جو تعلیم کے یدان میں کی گئیں اور جن میں ہندوستان کا بھی ہاتھ تھا۔

شاہ حبیب اللہ بیسویں صدی کے بالکل آغاز میں تخت نشین ہوئے۔ ۲ر اکتوبر ۱۹۰۱ء کو بل میں ایک مخصوص دربار منعقد ہوا جس میں نئے امیر نے افغانستان کی سالمیت برقرار رکھنے، ارحیت کو ختم کرنے اور دینی احکامات کے مطابق عمل کرنے کا عہد کیا۔ اُس وقت ان کی عمر رف ۲۷ سال تھی۔ جیسا کہ انھوں نے اپنی تخت نشینی کے وقت اعلان کیا، ان کے بنیادی ناصد میں سے ایک مقصد اصلاحات نافذ کرنا تھا۔ انھیں جدید سائنس اور یورپ کی جدید جادات سے بہت دلچسپی تھی۔ وہ مذہبی رہنماؤں کو یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ دین اور جدید لیم میں کسی قسم کا تضاد نہیں ہے۔ ۱۹۰۷ء میں ہندوستان کے سرکاری دورے کے وقت انھوں نے اپنی ایک اہم تقریر میں اپنے خیالات کی وضاحت کی۔ علی گڑھ کے طالب علموں سے خطاب کرتے وئے انھوں نے اعلان کیا:

"اگر اب بھی کچھ لوگ ایسے ہیں جو ایمانداری سے یہ سمجھتے ہیں کہ مذہب اور تعلیم ایک دوسرے کی ضد ہیں اور تعلیم کے فروغ کا مطلب مذہب کا زوال ہے تو انھیں اس کالج میں لائیے تاکہ وہ بھی میری طرح دیکھ سکیں کہ نئی نسل کے مذہبی عقائد کے سلسلے میں تعلیم کیا کام انجام دے رہی ہے۔ میں نے سُنا ہے کہ بہت سے ہندوستانی مسلمان اس مخصوص قسم کی تعلیم کے شدید مخالف ہیں جس کو ہم مغربی تعلیم کہتے ہیں۔ یہ بہت بڑی غلطی ہے۔ میں اس مغربی تعلیم کے بہت بڑے حامی کی حیثیت سے آپ کے سامنے کھڑا ہوں۔

اس تعلیم کو برا سمجھنا تو درکنار میں نے خود افغانستان میں حبیبیہ کالج کے نام سے ایک درس گاہ قائم کی ہے جہاں مغربی طرز پر مغربی تعلیم دینے کی ہر ممکن کوشش کی جائے گی لیکن مجھے اس بات پر اصرار ہے کہ تعلیم کی کوئی بھی قسم ہو اس کی بنیاد مذہبی تعلیم ہونا چاہیئے۔"

ایک دوسری تقریر میں جو امیر حبیب اللہ نے لاہور میں اسلامیہ کالج کا سنگ بنیاد رکھنے وقت کی انھوں نے فرمایا:

"علم حاصل کرنے کی کوشش کرو تاکہ تمھیں لباسِ جہل نہ پہننا پڑے۔ علم حاصل کرنا تمھارا فرض ہے۔ جب تمھارے بچے مذہبی اصول اور قوانین سے پورے طور پر واقف ہو جائیں تو انھیں نئی سائنسوں کی تعلیم کی طرف لاؤ کیونکہ مغربی تعلیم حاصل کئے بغیر تم نادار اور مفلس رہو گے۔"

تخت نشینی کے وقت یہ اعلان کرنے کے بعد کہ ان کے بنیادی مقاصد میں سے ایک مقصد جدیدیت تھا، انھوں نے ہندوستانی ماہروں کی مدد سے جدید طرز کے اسکولوں کی تعمیر کا کام شروع کیا۔ ۱۹۰۴ء میں حبیبیہ کالج کے قیام کو افغانستان میں جدید تعلیم کے دور کا آغاز تصور کرنا چاہئے۔ ابتداً روایتی مضامین کے ساتھ ساتھ حساب، جغرافیہ، انگریزی، اردو اور جسمانی ورزش کی تعلیم کا انتظام کیا گیا۔ پشتو اور ترکی زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو اور انگریزی کی ہمت افزائی خاص طور پر کی جاتی تھی۔ حبیبیہ کالج کے تمام مصارف مع اساتذہ اور عملے کی تنخواہ شاہی خزانے سے پورے ہوتے تھے۔ حبیبیہ کالج کے علاوہ ایک فوجی کالج بھی کابل میں قائم کیا گیا۔ امیر نے بڑے پیمانے پر مغرب کے طبی اور جراحی طریقے رائج کئے۔ صحت کے میدان میں سب سے اہم قدم ۱۹۱۳ء میں سرکاری اسپتال کا قیام تھا۔ اس وقت تک ملک میں صرف ایک افغان ڈاکٹر تھا جس کی جدید تربیت ہوئی تھی۔ چنانچہ نئے اسپتال کا عملہ ہندوستانی ڈاکٹروں اور طبیبوں پر مشتمل تھا امیر کا ذاتی طبیب بھی ایک ہندوستانی تھا۔

امیر نے ایک فارسی رسالہ سراج الاخبار جاری کیا جو مہینے میں دو بار شائع ہوتا تھا اور جس کے مدیر افغانستان کے مشہور مصنف اور سیاستدان محمود طرزی تھے۔ یہ رسالہ خارجی آزادی اور اندرونی اصلاحات کا حامی تھا جس نے ملک میں یوروپی سامراج کے خلاف قوم پرستی کی تحریک شروع کی، اور اس میں اسے کافی کامیابی ہوئی۔ امیر کو خفیہ اور جاسوسی کارروائیوں سے سخت نفرت تھی اور ان کے والد کے زمانے میں لوگوں کو جو سخت سزائیں دی گئیں انھیں بہت ناپسند کرتے تھے۔ غیر مسلم افغانوں کے ساتھ انصاف اور نرمی کا برتاؤ کیا جاتا تھا۔ ملک کے دروازے کھلے رکھنے کی پالسی پر عمل کیا گیا اور ملک کے مختلف حصوں کو ایک دوسرے سے جوڑنے کے لئے سڑکیں تعمیر کی گئیں۔ حبیب اللہ نے افغانستان اور ہندوستان کے درمیان تجارت کو فروغ دینے کی پوری کوشش کی۔ بیرونی تجارت کی ہمت افزائی کے لئے بہت سی پابندیاں ہٹا لی گئیں جو ہندوستان سے لین دین کے سلسلے میں نافذ تھیں۔ چنانچہ کابل اور قندھار سے برآمدات کافی بڑھ گئیں۔ جدید آسائشات فراہم کرنے کے اقدام کئے گئے۔ مثلاً موٹر گاڑیاں، بجلی اور پائپ کے ذریعے آب رسانی کی سہولتیں دارالخلافہ میں فراہم کی گئیں۔ مغربی کھیل رائج کئے گئے جن میں سے بعض میں خود امیر شریک ہوتے تھے۔ ان کا بندوق کا نشانہ بہت اچھا تھا اور مشینوں سے انھیں بے حد دلچسپی تھی۔

اگرچہ امیر حبیب اللہ کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا لیکن جدید افغانستان کو وجود میں لانے میں اُن کا بہت اہم حصہ ہے۔ انھوں نے افغانوں کی پہلی تعلیم یافتہ اور سماجی شعور رکھنے والی نسل کی پرورش کی جس نے آگے چل کر ملک کی ترقی میں بہت بڑا رول ادا کیا۔ ۲۰ر فروری کی شب میں لغمان کی شکارگاہ میں امیر حبیب اللہ کے انتقال کے بعد اُن کے تیسرے بیٹے امان اللہ خاں جو اس وقت کابل میں امیر کی نیابت کر رہے تھے، تخت نشین ہوئے۔ نئے امیر کے لئے کابل کا تخت پھولوں کی سیج نہیں تھا۔ انھیں ایک پس ماندہ قوم کو ترقی اور خوشحالی کی راہ پر ڈالنا تھا۔

جونہی امان اللہ نے مستحکم طریقے سے اقتدار سنبھال لیا، انھوں نے اپنے عوام کی دیرینہ آرزو پوری کرنے کے لئے یعنی ملک کی آزادی کے لئے آواز بلند کی۔ امان اللہ نے ملک کی مکمل داخلی اور خارجی آزادی کا اعلان کر دیا۔ انھوں نے اپنا فیصلہ ہندوستان کی برطانوی حکومت تک پہنچا دیا اور یہ خواہش ظاہر کی کہ دونوں ملکوں کے درمیان روایتی دوستی کے رشتے برقرار رہیں لیکن ساتھ ہی افغانستان کی آزاد حکومت تسلیم کی جائے جو برطانوی حکومت سے ایسے معاہدے کرنے کے لئے آمادہ ہے جو فریقین کے لئے مفید ہوں۔ وائسرائے نے اصل مسئلے کو نظرانداز کرتے ہوئے جواب دیا: "آپ کے پیغام سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ افغانستان کی تجارتی ضروریات کے لئے برطانوی حکومت سے کوئی ایسا معاہدہ ضروری سمجھتے ہیں جو دونوں ملکوں کے درمیان موجودہ معاہدے کی حیثیت رکھتا ہو۔" اس موقعے پر میں افغانوں کی جنگ آزادی کی تفصیلات میں نہیں جانا چاہتا۔ اس سلسلے میں موجودہ شاہی خاندان نے بہت اہم رول ادا کیا۔ ۲۲ جنوری ۱۹۲۱ء کو امان اللہ کی آزادی کی آرزو پوری ہوئی۔ برطانوی سامراج کے خلاف ہماری جدوجہد پر ہندوستان کی تحریکوں کا جو اثر پڑا اُس کو ہم نظرانداز نہیں کر سکتے۔ یہی وہ ملک تھا جہاں سے سب سے زیادہ لٹریچر افغانستان پہنچ رہا تھا اور ہندوستانی تصنیفات کا گہرا اثر افغانوں کے خیالات پر پڑ رہا تھا۔ ان میں سب سے اہم الہلال اور اس کے بعد البلاغ اخبار تھا جو کلکتے سے مولانا ابوالکلام آزاد شائع کرتے تھے۔ دوسرے اخبارات میں ظفر علی خاں کا زمیندار تھا جو لاہور سے نکلتا تھا اور جو برطانیہ کا بے حد مخالف تھا، اور مولانا محمد علی کا سرگرم جوشیلا اخبار ہمدرد تھا۔ افغانوں کے خیالات پر ہندوستانی خیالات کے دوررس اثرات مرتب ہو رہے تھے۔

امیر امان اللہ نے آزادی حاصل کرنے کے بعد دوسرے ملکوں کے ساتھ معاہدوں کے ذریعے تجارتی اور سیاسی تعلقات مستحکم کرنے کی کوشش شروع کی۔ اُس وقت کی افغانستان کی خارجہ پالیسی کے تین خاص مقاصد تھے، سویٹ روس سے سفارتی تعلقات کا قیام، برطانیہ کے ساتھ

اقتصادی تعلقات کو رفتہ رفتہ معمول پر لانا اور ایشیائی ملکوں کے مسلمانوں کے ساتھ یگانگت اور اخوت کا رشتہ قائم کرنا۔ امان اللہ نے افغانستان کی آزاد بیرونی پالیسی کی تمہید کی اور طاقت کے توازن کو دوبارہ قائم کیا جو ۱۹۰۷ء کے روسی برطانوی کنونشن نے درہم برہم کر دیا تھا۔ اس وقفے پر میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ امیر حبیب اللہ نے اس کنونشن کی کبھی تصدیق نہیں کی تھی۔ افغانستان کی آزادی نے امان اللہ کو اس بات کا موقع فراہم کیا کہ وہ روس اور برطانیہ کو ایک دوسرے کے خلاف استعمال کر کے افغانستان کے خلاف دونوں کے عزائم کا سدباب کر سکیں۔

تخت نشینی کے بعد امان اللہ نے لینن کو ایک ذاتی خط لکھا جس میں انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ افغانستان ایک آزاد اور خود مختار ملک ہے اور یہ کہ افغانیوں کی ذہنیت ہمیشہ مساوات، انسانیت اور آزادی کے خیالات سے متاثر رہی ہے۔ لینن نے اپنے ایک خط میں جو فارسی زبان میں تھا اور جس پر لینن کے دستخط تھے، امیر سے درخواست کی کہ وہ سامراج کے خلاف ایشیائی عوام کی رہنمائی کریں۔ ۲۸ فروری ۱۹۲۱ء کو افغانستان اور روس نے دوستی کے ایک معاہدے پر دستخط کیے جس کے تحت سفارتی تعلقات کے قیام کا اہتمام تھا۔ جس وقت اس صلح نامے کے سلسلے میں گفت و شنید ہو رہی تھی اسی وقت ایک افغان سفارتی مشن یورپ کے دارالخلافوں کا دورہ کر رہا تھا جس کا مقصد ان ممالک سے افغانستان کی آزادی تسلیم کرانا، غیر ملکی استادوں کو افغانستان آنے کی دعوت دینا اور تجارتی تعلقات قائم کرنا تھا لیکن لندن میں وزارت خارجہ نے اس مشن کا خیر مقدم نہیں کیا بلکہ اس سے یہ کہا گیا کہ وہ انڈیا آفس سے رجوع کرے۔ ۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۷ء کے درمیان افغانستان نے بہت سے ایشیائی اور یوروپی ملکوں کے ساتھ معاہدوں پر دستخط کیے۔

امان اللہ کے اصلی کام کو اب شروع ہونا تھا۔ انھوں نے اپنے ملک کے ناخواندہ عوام کو خوشحالی کی راہ پر ڈالنے کو اپنا مشن بنایا۔ ان کے والد کے زمانے میں ۹۰ فیصدی افغان ناخواندہ تھے۔ خود ان کے زمانے میں حالت کچھ زیادہ بہتر نہیں ہوئی۔ محمود طرزی کے قول کے مطابق

۱۹۱۸ء میں پورے افغانستان کے مقابلے میں پنجاب کے کسی ایک شہر میں پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد زیادہ تھی۔ امان اللہ کا دس سالہ عہد حکومت اصلاحات کا زمانہ تھا۔ فروری ۱۹۱۹ء میں انھوں نے واضح طور سے اعلان کیا کہ میرا اصل مقصد افغانستان کو ایک جدید ریاست بنانا ہے۔

"خدا کے فضل و کرم سے ہماری اعلیٰ اور برتر حکومت ایسی اصلاحات کے لئے اقدام کرے گی جو ملک کے لئے مفید ہوں تاکہ ملک و قوم اس دنیا میں شہرت حاصل کر سکے اور مہذب اقوام کے درمیان اپنا مقام حاصل کر سکے۔"

امان اللہ کے والد کے زمانے میں صرف ایک کالج تھا۔ امان اللہ نے اپنی تعلیمی اصلاحات شروع کرنے کے لئے تین اور کالج قائم کئے۔ یہ کالج بھی حبیبیہ کالج کے طرز پر تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ ان میں تین مختلف زبانوں کی تعلیم دی جاتی تھی، یعنی فرانسیسی، جرمن اور انگریزی۔ ان کے علاوہ دوسرے اسکول بھی قائم کئے گئے۔ ۱۹۲۴ء میں مکتب حکام قائم کیا گیا جہاں پبلک ایڈمنسٹریشن کی تعلیم و تربیت دی جاتی تھی۔ یہ نصاب چار سال کا تھا۔ استادوں کو بہتر بنانے اور نئے استادوں کی تربیت کے لئے حبیب اللہ کے قائم کئے ہوئے تربیتی مرکز کی توسیع کی گئی اور نیا نصاب جاری کیا گیا۔ اس مرکز میں ذریعہ تعلیم انگریزی زبان تھی۔ اس کے علاوہ اور کئی پیشہ ورانہ اسکول قائم کئے گئے۔ ان میں غیر ملکی زبانوں کی تعلیم کا اسکول، ٹیلی گرافی، شیشہ گری، محاسبی اور عمارت سازی کے اسکول شامل تھے۔

امان اللہ کو تعلیم بالغاں سے بہت دلچسپی تھی اور اس مقصد کے لئے مدرسوں اور مسجدوں میں کلاس ہوتے تھے۔ کبھی کبھی خود امیر اپنے ہاتھ میں چاک لے کر پڑھانے کے لئے آجاتے تھے۔

امان اللہ کی ناقابل فراموش خدمت وہ کوشش تھی جو انھوں نے خواتین کی آزادی و حقوق نسواں کے سلسلے میں کی۔ یہ پروگرام ۱۹۲۱ء میں "عصمت" کے قیام سے شروع ہوا۔ اس

کو امیر کی بیگم ملکہ ثریا کی سرپرستی اور رہنمائی حاصل تھی۔ 'عصمت' کی رسم آغاز کے موقعے پر ملکہ نے اس بلند سماجی مرتبے کا ذکر کیا جو تاریخ میں عورتوں کو حاصل رہا ہے۔ ملکہ نے امید ظاہر کی کہ افغانی خواتین کی تعلیم سے اُن کا سماجی رتبہ بلند ہوگا، وہ سماج کی ترقی میں مفید رول ادا کرسکیں گی۔ امان اللہ کی تخت نشینی کے وقت افغانستان کی خواتین کو چند ہی حقوق حاصل تھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے جو اصلاحات کیں ان میں سب سے اہم ۱۹۲۱ء کے عائلی قوانین کا نفاذ تھا جن کے تحت شادی بیاہ اور منگنی کو منظم اور منضبط کیا گیا اور افغانی خواتین کو زیادہ حقوق اور رعایتیں دی گئیں۔

افغانی خواتین میں سماجی شعور کو ترقی دینے کے مقصد سے ملکہ نے ۱۹۲۱ء میں خواتین کے پہلے رسالے 'ارشاد نسواں' کا اجرا کیا۔ جس کی مدیر ملکہ کی والدہ بیگم محمود طرزی تھیں۔ امان اللہ کو یقین تھا کہ نئے افغانستان کے مستقبل کی تعمیر کا سنگ بنیاد خواتین کی آزادی ہی ہوگی۔ افغانستان کے پریس نے آزادیٔ نسواں کی اس تحریک میں نمایاں حصہ لیا۔ اکتوبر ۱۹۲۸ء میں ملکہ ثریا اور کچھ دوسری افغانی خواتین نے پردے کو خیرباد کہدیا۔ جن لڑکیوں نے کابل کے اسکولوں سے اپنی تعلیم مکمل کر لی تھی انھیں مزید تعلیم کے لئے باہر بھیجا گیا۔

اِن اسکولوں کے لئے جو ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے تھے۔ امیر نے ہندستانی استادوں اور ماہرین تعلیم کی خدمات حاصل کیں۔ امان اللہ کے نزدیک تعلیمی انتظام کی نگرانی کی بڑی اہمیت تھی اور اس کام کے لئے انھوں نے ایک ہندوستانی ماہر تعلیم کو مقرر کیا۔

پنجاب کے محمد حسین خاں وزارت تعلیم میں پبلک ایڈمنسٹریشن کے بورڈ کے افسر اعلیٰ تھے۔ اس بورڈ میں کئی اور ہندوستانی تھے جو مختلف کالجوں کے پرنسپل کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔

اس محب وطن فرمانروا کی بیشتر اصلاحات ترقی پسندانہ تھیں، لیکن اس کے ملک کے عوام سماجی شعور کی اس منزل تک نہیں پہنچ سکے تھے کہ اِن اقدام کی قدر کرتے۔ صرف چند افغان تھے جو جدید افغانستان اور امیر کے پروگرام کے حامی تھے۔ اِن مشکلات کے باوجود

امیر نے اپنے ملک کی خوشحالی کے لئے جو کچھ کیا وہ ناقابل فراموش ہے۔ اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ انھوں نے ملک کی ترقی کے لئے اپنی زندگی وقف کردی۔ اُن کی ناکامی کا سبب یہ تھا کہ اُن کے مشیروں میں خلوص کی کمی تھی۔ اُنھیں خود اپنے اغراض پورے کرنے تھے۔ اس کے علاوہ کچھ غیر ملکی عناصر ملک کی رجعت پسند جماعت کے تعاون سے امیر کے زوال کے لئے کوشاں تھے۔

سید احمد علی آزاد

جامعہ میں ابتدائی تعلیم کے تجربے

۴

تعلیمی مرکز نمبر ۱ میں بنیادی قومی تعلیم کا تجربہ

۱۹۳۸ء میں سید عروج الحسن صاحب تعلیمی مرکز نمبر ۱ سے گرمیوں کی تعطیلات میں واردھا بھیجے گئے۔ آپ وہاں دو مہینے رہے اور اس عرصہ میں بڑی محنت اور لگن سے کارڈ بورڈ ماڈلنگ، ابری سازی اور کاغذ سازی کا کام سیکھا۔ اسی سال سے تعلیمی مرکز نمبر ۱ میں بنیادی قومی تعلیم کے نصاب کے مطابق تعلیم شروع ہوئی۔ حرفہ میں باغبانی، کارڈ بورڈ ماڈلنگ، کاغذ سازی اور ابری بنانا رکھا گیا۔ پہلی جماعت کے بچے کاغذ سے مختلف چیزیں بناتے تھے، دوسری جماعت کے بچے کارڈ بورڈ سے مختلف چیزیں بناتے تھے، تیسری جماعت کے بچے باغبانی کرتے تھے، چوتھی جماعت کے بچے کاغذ سازی اور کارڈ بورڈ ماڈلنگ کرتے تھے۔ پانچویں جماعت کوئی حرفہ نہیں کرتی تھی، اس لیے اس کے ذمہ بچوں کی دکان چلانا اور بینک کا کام کرنا تھا۔ چھٹی جماعت کے بچے ابری سازی کیا کرتے تھے۔ ان حرفوں کے ذریعہ اُردو، حساب، معلومات اور عام سائنس کا کام کرایا جاتا تھا۔ بعض اسباق جن کی حرفوں کے کرانے کے دوران ضرورت پڑتی تھی۔ لکھوائے جاتے تھے۔ ان اسباق کے لکھنے کا کام عبدالخالق صاحب، سید عروج الحسن صاحب اور میرے ذمہ تھا اور ان کی اصلاح کا کام جناب پروفیسر محمد مجیب صاحب کے ذمہ تھا اور

چھپائی کا کام مکتبہ جامعہ کے سپرد تھا۔ کاغذ بنانے کی ابتدا، مصر کا جغرافیہ، پریس کی ابتدا، لکھائی کی ابتدا وغیرہ اسباق لکھوائے گئے۔ جو تعلیم حرفہ سے مربوط نہیں ہو سکتی تھی اس کے سکھانے اور مشق کرانے کے پرانے طریقے کو بھی برتا جاتا تھا تاکہ نصاب مکمل ہو اور اردو، حساب، معلومات کا معیار کم نہ رہ جائے۔ اردو کا کام کافی ہو جاتا تھا بلکہ زیادہ ہی ہو جاتا تھا اور معلومات میں بھی کافی واقفیت حاصل کر لیتے تھے۔ نصاب کی معلومات کے علاوہ حرفہ کے سلسلہ میں کافی معلومات لکھائی جاتی تھیں۔ ہاں یہ کمی تھی کہ کتاب نہیں تھی اس لیے استاد کو کافی محنت کرکے حرفہ کے سلسلہ کی معلومات تیار کرنی پڑتی تھیں تیاری کرنے کے بعد اس معلومات کو بچوں کو لکھا دیا جاتا تھا۔

حرفوں کے ذریعہ جو تعلیم بچوں کو دی گئی وہ پروجکٹ کے ذریعہ دی جانے والی تعلیم سے بالکل مختلف تھی۔ حرفہ کسی جماعت کے لیے ایک مستقل کام ہوتا تھا۔ بچوں کے انتخاب کرنے کا کوئی سوال نہیں ہوتا تھا لیکن بچوں کو ہاتھ سے کام کرنے میں دلچسپی ہوتی ہے، اس لیے بچے شوق اور محنت سے کام کرتے تھے اور ان کی یہ دلچسپی تعلیم میں بھی برقرار رہتی تھی۔ کارڈ بورڈ ماڈلنگ کے سلسلہ میں بچوں نے صدر بازار میں مختلف کارخانوں میں ڈبوں کے بننے کا مشاہدہ کیا۔ بچے عملی طور پر جو کچھ کرتے تھے یا بناتے تھے اُس کو لکھتے بھی تھے اور اس سلسلہ کی تمام معلومات کو بھی قلمبند کر لیتے تھے اور یہ سارے کام اُن کی کاپیوں میں محفوظ رہتے تھے۔ مثال کے طور پر جب لڑکے تیل کی ابری بناتے تھے تو اُس کے طریقوں کو کاپی میں لکھتے تھے۔ جب ابری بن جاتی تھی تو اُس کی پشت پر لکھتے تھے کہ پہلے فلاں رنگ ڈالا، پھر فلاں رنگ لئی کی سطح پر کشتی میں ڈالا اور برش سے اس طرح پھیلایا تب جاکر یہ ابری بنی۔ اس یادداشت سے اچھی ابری بننے لگی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم پوچھ بیٹھتے تھے کہ اس ابری میں کون کون سے رنگ ہیں تو اس کی پشت الٹ کر دکھلا دی جاتی تھی۔ اس سے ان کے سوال کا جواب ہو جاتا تھا اور وہ کام میں پلیننگ کی داد دیتے تھے۔ یہ ساری یادداشتیں ابری کے شیٹ

پر نمبر ڈال کر بچوں کی کاپیوں میں لکھوا دی جاتی تھیں۔ ایری سازی پر میں نے ان جمع کی ہوئی معلومات کی مدد سے ایک کتابچہ تیار کیا تھا اور ذاکر صاحب کو دیکھنے اور اصلاح کرنے کے لئے دیا تھا۔ وہ یہ مسودہ ۱۹۴۷ء میں اپنے ہمراہ کشمیر لے جا رہے تھے۔ راستہ میں جالندھر اسٹیشن پر ان کے تمام سامان کے ساتھ یہ بھی لٹ گیا۔

کارڈ بورڈ کے کام میں ٹرے، فائل، ڈبے اور لائٹ شیڈ وغیرہ کے بنانے میں سارا کام پیمائش کے مطابق ہوا اس لیے بچوں نے رقبہ کے سوالات کی حرفہ کے کام سے عملی مشق کی اور جب یہ چیزیں کافی بن گئیں تو ان سب کی قیمتیں اکائی سے نکالیں کہ اتنی مالیت کا سامان تیار ہوا اور انھیں اسٹاک رجسٹر میں لکھا۔ ہر چیز پر بچوں نے چھپی ہوئی پرچیاں چپکا کر قیمت بھی لکھی تاکہ فروخت کرنے میں آسانی ہو۔ نفع اور نقصان کے سوالات بھی کرائے گئے۔ رنگوں کی خریداری کے سلسلے میں بھی اکائی کے سوالوں کی مشق کرائی گئی۔

بنیادی قومی تعلیم میں جہاں مربوط تعلیم پر زور تھا وہاں اس پر بھی زور دیا جاتا تھا کہ حرفوں کے ذریعہ کچھ آمدنی بھی ہو اور گاندھی جی تو مدرسہ کا خرچ نکالنے کی بات کہتے تھے اور ماہرین تعلیم اس کو ناممکن خیال کرتے تھے لیکن ان اعتراض کرنے والے ماہرین تعلیم کو کیا معلوم تھا کہ موگا مشن اسکول میں اس طرح کا تجربہ ہو رہا تھا اور وہ تجربہ پوری طرح کامیاب تھا۔ حکومت پنجاب کی مدد نکالنے کے بعد (جو اس وقت غالباً ۷۵٪ تھی) موگا کا آٹھ جماعتوں کا اسکول فارم کی آمدنی اور سبزیوں کی کاشت کی آمدنی سے چلتا تھا۔ مسٹر ہارپر اور مسٹر ڈف ایسے ماہرین تعلیم ڈیوی اور کلپیٹرک کے بنائے ہوئے طریقہ پر کام کرا رہے تھے۔ پورے مدرسہ میں کوئی ملازم نہیں تھا۔ یہاں تک کہ کچن میں بھی جہاں ڈیڑھ سو لڑکوں کا کھانا پکتا تھا، کوئی ملازم نہیں تھا۔ سارا کام اسکول کے بچے کرتے تھے۔ ہر چھوٹے بڑے بچے کے پاس چھپی ہوئی نوٹ بک تھی جس میں وہ روزانہ لکھتا تھا: ۱۔ تاریخ ۲۔ کیا کام کیا ۳۔ کہاں کام کیا ۴۔ کس کی نگرانی میں کیا ۵۔ دستخط جس نے کام دیا ۶۔ اُجرت ۷۔ دستخط طالب علم۔ دو آنے فی گھنٹہ

اُجرت اس زمانے میں لگتی تھی۔ طالب علم یہ عملی حساب روزانہ کرتا تھا۔ بڑی جماعتوں کے بچے تیس روپے ماہوار تک اس طرح کام کرکے پیدا کر لیتے تھے۔ چھ روپے ماہوار کچن کی فیس ادا کرکے باقی رقم اپنے حساب میں بینک میں جمع کرا دیتے تھے۔ ہر جماعت کی باری باری ایک دن پڑھائی نہیں ہوتی تھی۔ اس جماعت کے پچیس تیس بچے مختلف کاموں کو کرتے تھے۔ ٹیچرس ٹریننگ کے کلاس کے لڑکوں کی باری پیر کو ہوتی تھی۔ جس جماعت کی باری ہوتی تھی اس کے آٹھ لڑکے کچن میں کام کرتے تھے اور روٹی، دال، سبزی، سالن پکاتے تھے۔ چھ لڑکے پورے مدرسہ کی صفائی یعنی جھاڑو وغیرہ لگانے کا کام کرتے تھے۔ ایک لڑکا پانی نکالنے کے رہٹ پر رہتا تھا۔ ایک دو لڑکے گئوشالہ صاف کرتے تھے۔ ایک دفتر میں ہوتا تھا اور گھنٹہ بجاتا تھا۔ غرضیکہ مدرسہ کے تمام کاموں کو ایک جماعت کے طلبا میں بانٹ دیا جاتا تھا۔ باغبانی کا اُستاد اِن طلبا کی نگرانی کرتا تھا۔ بچے سات آٹھ سال کی عمر سے ہی زندگی کے کاموں میں داخل ہوجاتے تھے اور اس کی ذمہ داریوں کو سنبھالتے تھے اور اِن ذمہ داری کے کاموں کے دوران تعلیم بھی حاصل کرتے تھے۔ عملی زندگی کے کاموں کے تجربوں اور نصاب دونوں کی تعلیم ہوتی تھی۔ یہاں کے بچوں کا وقت مفید کاموں کے کرنے میں گذرتا تھا۔ اس لئے گاندھی جی اگر تعلیم کے دوران خرچ نکالنے کی بات کہتے تھے تو ٹھیک ہی کہتے تھے۔ لیکن ملک پر انگریزی تعلیمی ڈھانچہ کی چھاپ کچھ ایسی پڑی ہوئی تھی کہ ملک کے ماہرین تعلیم نے اسے مان کر نہ دیا اور جنھوں نے مانا انھوں نے تجربہ کرکے نہ دیا۔

تعلیمی مرکز نمبر میں آمدنی کے پہلو سے باغبانی کی سبزیاں بکتی رہیں۔ منافع ہوتا رہا، بچوں کی اسٹیشنری کی دکان میں بھی منافع ہوتا رہا۔ کارڈ بورڈ کے بیشتر ماڈل نہ بک سکے اور وہ ایک کمرے میں جمع ہوتے رہے۔ کاغذ جو بنا وہ دفتر میں کام آتا رہا اور ابریاں کتب خانہ کی کتابوں کی جلدوں پر چڑھائی گئیں۔ ماڈل بنانے کے کام بھی آئیں۔ دوسری جنگ عظیم کے شروع ہوجانے کی وجہ سے باہر کے ملکوں سے ٹیوب کے رنگ آنا بند ہوگئے اس لیے

ابری بنانے اور کارڈ بورڈ سے ماڈل بنانے کا کام بھی بند ہو گیا۔

مربوط تعلیم اور آمدنی کے پہلو کو سمجھنے کے لئے مدرسہ کی طرف سے حافظ ضمیر الدین صاحب بی۔ اے جامعی کو موگا بھیجا گیا۔ انھوں نے وہاں ایک ہفتہ قیام کرکے ان دونوں باتوں کو سمجھا۔ اس کے بعد محمد اکرام خاں صاحب کو، جنھوں نے پہلے سال جامعہ سے بیسک ٹریننگ کا امتحان پاس کیا تھا، موگا بھیجا گیا۔ اس وقت اسٹاف میں عبدالخالق صاحب، نذیر تحمل صاحب محمد شفیع صاحب بی۔ اے جامعی اور میں موگا ٹرینڈ تھے۔ ہم لوگ مربوط تعلیم کو نہ صرف سیکھ کر آئے تھے بلکہ برت کر آئے تھے۔ کافی لٹریچر بھی پڑھا تھا اور آمدنی کے بارے میں بھی موگا کا طریقہ ہمارے سامنے تھا۔ پھر بھی دوسرے اساتذہ صاحبان کو، جن سے اس طریقہ کے مطابق کام لینا تھا، موگا بھیج کر اس کے طریقوں کو سمجھنے کا موقع دیا گیا۔ ذاکر صاحب نے بڑی فراخدلی سے اس سفر کے سلسلہ میں اخراجات کی منظوری دلوائی۔ پھر اکتوبر ۱۹۳۹ء کے آخر میں بیسک تعلیم کی جو کانفرنس پونا میں ہوئی، اس میں نمائش لے جانے اور اساتذہ کے پونا جانے کے سلسلہ میں بھی ہدایت دے کر جرمنی تشریف لے گئے۔

اس کانفرنس میں پروفیسر محمد مجیب صاحب، غلام السیدین صاحب اور ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے بحیثیت وار دھا تعلیمی کمیٹی کے رکن کے شرکت کی اور ہم کام کرنے والوں میں جناب ماسٹر عبدالحئی صاحب، سید عروج الحسن صاحب، عبدالخالق صاحب اور حافظ ضمیر الدین صاحب نے شرکت کی۔ اس کانفرنس میں جناب ہارپر صاحب پرنسپل موگا ٹریننگ اسکول نے بھی شرکت کی۔ اس کانفرنس میں مربوط تعلیم کے عنوان سے میں نے بھی ایک مضمون پڑھا تھا جو اکتوبر ۱۹۳۹ء کے رسالہ جامعہ میں چھپا تھا۔

بنیادی قومی تعلیم کو اس کے مجوزہ طریقوں کے مطابق چلانے کے ذاکر صاحب دل سے خواہاں تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ہمیں کر کے دیکھنا چاہیئے۔ دوسرے لوگ کہتے تھے کہ اس طریقہ سے ہاتھ کا کام بہت ہوگا اور تعلیم کا نقصان زیادہ ہوگا۔ ذاکر صاحب کہتے تھے کہ جو نقصان

اب تک ہوا ہے اس سے زیادہ نقصان نہیں ہوگا۔ انھوں نے جامعہ میں بیسک کے استادوں کی ٹریننگ کے لئے ٹریننگ اسکول کھولا۔ عبد الغفار مدہولی صاحب کو اور مجھے اس ٹریننگ اسکول میں کہانی کے طریقہ کو بتلانے اور پروجکٹ طریقہ تعلیم کو سمجھانے کے لیے مقرر کیا۔ ہم لوگ ایک ایک پیریڈ روزانہ لیتے تھے۔ تعلیمی مرکز نمبر ا میں اس کا تجربہ کرنے کا موقع دیا گیا اور مدرسہ تعلیمی مرکز نمبر ا کے کئی اُستادوں کو ملک کے بیسک ٹریننگ سنٹرز کو دیکھنے کے لئے بھیجا۔ چنانچہ میں نے اور عبد الخالق صاحب، نذیر تجلی صاحب، حافظ ضمیر الدین صاحب نے واردھا، جلگاؤں، الہ آباد اور بنارس کے ٹریننگ سنٹرز میں کام ہوتے ہوئے دیکھا۔ ان جگہوں کا کام دیکھنے کے بعد اندازہ ہوا کہ ملک میں ابتدائی تعلیم کا کام کرنے والوں کا ذہن صاف نہیں تھا اور ایک عام بے دلی چھائی ہوئی تھی۔ نئے طریقہ سے تعلیم دینے کا ذہنوں میں تصور ہی نہیں تھا۔ اس کے مقابلہ میں موگا، غازی آباد، آسن سول مشن اسکولوں میں اور شانتی نکیتن میں کام کرنے والے بڑی سنجیدگی سے تعلیمی تجربوں میں لگے ہوئے تھے اور شانتی نکیتن کے تجربوں کا تو ویم کلپیٹرک صاحب نے بھی اپنی کتاب حصول تعلیم کے اصول (How We Learn) میں خاص طور سے ذکر کیا ہے۔ اس بے دلی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۳۹ء میں صوبوں کی حکومت کے مستعفی ہو جانے کے بعد بنیادی تو تعلیم کا سارا ڈھانچہ ہی بکھر گیا اور تعلیمی مرکز نمبر ا کو بھی نصابی طریقہ کے مطابق کام کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔

بچوں کا خوانچہ

تعلیمی مرکز نمبر ا میں بینک اور دکان کے شعبے کام کر رہے تھے لیکن ایک خوانچہ کی کمی برابر محسوس ہو رہی تھی، اس لیے کہ تمام بچے غیر مقیم تھے اور تفریح میں کھانے کے لئے گھر سے پیسے لاتے تھے اور اجمل خاں روڈ پر سڑک کے خوانچہ والوں سے چیزیں خریدتے تھے۔ اس وقت شیخ شفیق الرحمٰن مرحوم مدرسہ کے نگران تھے۔ انھوں نے اس بات کا مجھ سے ذکر کیا۔ میں

چھٹی جماعت کے بچوں سے مشورہ کیا۔ بچوں نے بڑے جوش سے خوانچہ چلانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ میں نے بچوں کے بینک سے گیارہ روپے قرض لیے اور خوانچہ قائم کرنے کا کام شروع کر دیا۔ ایک انگیٹھی اور ایک کڑھائی مع چھننا خریدلی گئی۔ لکڑی کا کوئلہ اس وقت پانچ روپے من تھا۔ کوئلہ خریدا گیا اور روزانہ پھلکی پک کر بکنے لگی۔ ایک سل بھی خریدی گئی اور روزانہ چٹنی تیار ہونے لگی۔ ایک طالب علم نے اپنے ذمہ یہ کام لے لیا۔

پروگرام اس طرح تھا کہ تفریح سے پہلے میرے دو گھنٹے خالی ہوتے تھے۔ میں ان دو خالی گھنٹوں میں آکر انگیٹھی جلاتا تھا اور بیسن تیار کرتا تھا۔ کچھ پھلکی بھی بنا دیتا تھا۔ تفریح ہوتے ہی لڑکے آجاتے تھے۔ ان کی باریاں مقرر ہوتی تھیں۔ جس لڑکے کی پھلکی بنانے کی باری ہوتی تھی وہ تفریح میں پھلکی بناتا تھا، اور دوسرا لڑکا پھلکی فروخت کرتا تھا۔ دو ہی تین ہفتوں میں دو دو سیر بیسن کی پھلکیاں تیار ہو کر بکنے لگیں اور گرم گرم پکوڑیوں کی مانگ برابر بڑھتی رہی۔ دو ہفتوں میں اتنا منافع ہوا کہ ہم نے بینک کے گیارہ روپے واپس کر دیے۔ اس کے بعد پھلکی کے لیے چینی کی تشتریاں خریدی گئیں اور شیشے کے مرتبان خرید لیے گئے اور ان میں نمکین چنے، نمکین دال، دال سیو، گجک، ریوڑیاں اور گڑ کے سیو وغیرہ چیزیں رکھ کر فروخت ہوتی رہیں۔ بچے یہ چیزیں بہادر گڑھ روڈ سے خرید لاتے تھے اور منافع رکھ کر بیچتے تھے۔ پھلکیاں جب ختم ہو جاتی تھیں تو یہ چیزیں بچے خرید لیتے تھے۔ دو لڑکے باری باری برتن دھونے پر مقرر کیے جاتے تھے۔ کام اس طرح تمام بچوں میں تقسیم تھا کہ جماعت کے تمام بچوں کی دلچسپی قائم رہے۔ مرتبانوں کی چیزیں فروخت کرنے پر جس لڑکے کی باری ہوتی تھی وہ ایک چوکی پر تمام مرتبان لگا کر بیٹھ جاتا تھا اور تفریح کے ختم ہونے تک چیزیں فروخت کرتا رہتا تھا۔ چیزیں فروخت ہونے کے بعد نقد رقم میرے پاس جمع ہوتی رہتی تھی اور میں ہی بچوں کے ذریعہ آمدنی اور خرچ کا حساب کیش بک میں لکھواتا رہتا تھا آمدنی اور خرچ کی اطلاع جماعت میں طلبا کو دی جاتی تھی۔

پھلکی بنا کر فروخت کرنے سے یہ تجربہ ہوا کہ خود چیزیں بنا کر فروخت کرنے سے زیادہ نفع ہوتا ہے۔ چنانچہ بچوں نے دال سیو، دہی بڑے، آلو چھولے، سموسے، برفی اور بیسن کے لڈو بنانا سیکھے اور انھیں فروخت کرنا شروع کر دیا۔ بازار کی چیزیں لاکر فروخت کرنا بند کر دی گئیں۔ آلو کے چپس بنانا بچوں کے لیے نسبتاً آسان تھا۔ بچوں نے خوب بنائے اور خوب بیچے۔ اِن چیزوں کے بنانے کے لیے بچے سہ پہر میں آنے لگے اور جو چیزیں ختم ہو جاتیں یا کم رہ جاتیں وہ بنا لیتے۔ چیزوں کی تیاری کے لیے بازار سے جو چیزیں منگائی ہوتی تھیں وہ بھی بچے سہ پہر میں خرید لاتے تھے اور چیزوں کی خریداری کا اُن کو عملی تجربہ ہوتا جا رہا تھا۔

اس کام میں بچوں کو دلچسپی تھی۔ انھیں چیزیں تیار کرنے میں اور چیزیں فروخت کرنے میں بڑی خوشی ہوتی تھی اور وہ دیر تک کام کرتے رہتے تھے، تھکتے نہ تھے۔ اگر کوئی چیز اچھی نہیں بنتی تھی اور خریدار اعتراض کرتے تھے تو اُن کو رنج ہوتا تھا اور پھر آئندہ بہتر چیزیں بنانے کی خواہش ہوتی تھی۔ بچی ہوئی چیزوں کو، جن کے دوسرے دن خراب ہونے کا اندیشہ ہوتا تھا، کام کرنے والے بچوں میں بانٹ دیا جاتا تھا اور ان سے اس کی کوئی قیمت نہیں لی جاتی تھی۔ بعض بچے اپنی اُن چیزوں کو جو ٹھیک نہیں بنتی تھیں خود خریدنا چاہتے تھے لیکن میں نے اس کی اجازت نہیں دی۔ بچوں نے اس پروجکٹ کے ذریعہ چیزوں کا بنانا، اس کے ذریعہ تعلیم حاصل کرنا اور چیزوں کو منافع رکھ کر فروخت کرنا تو سیکھا ہی لیکن انھوں نے دیانتداری سے کام کرنا بھی سیکھا۔ کبھی چوری چھپے چیزوں کے کھانے یا پیسوں میں گڑبڑ ہو جانے کی شکایت نہیں آئی۔ وہ دیکھتے تھے کہ جب استاد چکھنے کے طور پر بھی کوئی چیز نہیں کھاتا ہے تو ہم کیوں کھائیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تین چار مہینوں میں چار سو روپے منافع میں جمع ہو گئے اور پچاس روپے کا اثاثہ بھی تھا۔ اس منافع سے سردیوں کی تعطیلات میں چھٹی جماعت کے بیس طلبا کو پٹنہ لے جانے کا پروگرام بنایا گیا۔ اس طرح کہ جو لڑکا پندرہ روپے دے گا اسے خوانچہ کی آمدنی سے پندرہ روپے دئے جائیں گے گویا ہر طالب علم کا

تیس روپے سفر خرچ ہوگا اس وقت دہلی سے پٹنہ تک کرایہ ریل مبلغ گیارہ روپے فی شخص تھا۔ چھوٹے بچوں کا اس کا آدھا کرایہ لگتا تھا۔ یہ دسمبر ۱۹۴۵ء کی بات ہے۔ انگریزی حکومت جامعہ کو تسلیم نہیں کرتی تھی اس لیے ہمیں ریلوے کنسیشن نہیں مل سکتا تھا۔ سفر کے اخراجات کو مزید کم کرنے کے لیے یہ طے کیا گیا کہ اسٹیشنوں پر خود سامان اٹھائیں گے اور ضرورت ہوئی تو پیدل چلیں گے۔

لڑکوں نے صبح کے ناشتہ کے لیے تین ڈبے سموسے ساتھ لے لیے تھے۔ آگرہ میں صبح ہوئی تو لڑکوں نے سموسے کھائے اور چائے پی۔ یہ اُن کا ناشتہ تھا۔ اس سفر میں بچوں نے آگرہ، کانپور، لکھنؤ، بنارس اور پٹنہ کی سیر کی۔ اِن جگہوں کی مشہور عمارتیں اور دوسری چیزیں دیکھیں۔ سفر سے واپسی پر ہر بچہ نے علٰحدہ علٰحدہ سفر کے حالات لکھے۔ ہر بچہ کو دس عنوان دیے گئے تھے جن پر اُن کو مضامین لکھنے تھے اور کتابچوں کی صورت میں تیار کرنا تھا۔ کل ۲۰ مجلد کتابچے تیار ہوئے جن پر بچوں کی بنائی ہوئی عمدہ ابریاں لگی ہوئی تھیں اور اِن میں مختلف شہروں کے خود کھینچے ہوئے فوٹو لگے ہوئے تھے۔ بچوں نے بڑی محنت اور لگن سے ان کتابچوں کو تیار کیا تھا۔ یہ اُن کے تحریری کام کا اچھا نمونہ تھا، لیکن افسوس ہے کہ ۱۹۴۷ء کے فسادات میں یہ سب کتابچے ضائع ہوگئے۔

اس پروجکٹ میں حساب کی تعلیم چھٹی جماعت کے معیار کے مطابق دی گئی۔ نصاب میں اکائی، رقبہ، فی صدی، نفع نقصان اور اوسط کے قاعدے تھے۔ رقبہ کے قاعدے کو چھوڑ کر تمام قاعدوں کو اس پروجکٹ سے مربوط کر کے سکھایا گیا اور مشق بھی کرائی گئی۔ جغرافیہ میں اجناس کی پیداوار مربوط کی گئی۔ اردو کا کام تعلیمی سفر کے حالات لکھوا کر کرایا گیا۔ تاریخی عمارتوں کے دکھلانے کے بعد تاریخ کا حصہ پورا کرایا گیا۔ بچوں نے نئے الفاظ کا املا لکھنا سیکھا۔ سفر کے مشاہدات نے اُن میں معلومات کا اچھا ذخیرہ جمع کر دیا جو اُن کی آگے کی تعلیم میں مددگار ثابت ہوا۔

دکان، بینک، اور باغبانی پروجکٹ کی طرح بچوں کا خوانچہ بھی ایک جاندار پروجکٹ ہے۔ اس پروجکٹ کو چوتھی جماعت، پانچویں جماعت اور چھٹی جماعت میں چلایا جا سکتا ہے۔ اس پروجکٹ سے ذیل کے فائدے حاصل کیے جا سکتے ہیں:

۱۔ بچے باہر کی خراب چیزیں خریدنے سے محفوظ رہتے ہیں۔

۲۔ عملی طور پر دکانداری کی مشق ہوتی ہے۔ پیسوں کا لین دین آتا ہے۔

۳۔ کافی منافع ہوتا ہے جس سے تعلیمی سفر کا پروگرام بن سکتا ہے۔ جو بچوں کی تعلیم میں مددگار ہوتا ہے۔

۴۔ اکثر بچے طرح طرح کی چیزوں کا بنانا سیکھ لیتے ہیں۔

۵۔ سلیقہ سے ایک جگہ بیٹھ کر کھانے پینے کی عادت بنتی ہے۔

۶۔ نفع نقصان، فی صدی، اکائی، اوسط اور تجارت کے قاعدوں کی بخوبی مشق ہو سکتی ہے۔

۷۔ بچوں کو دلچسپ تعمیری مشاغل میں لگنے کا موقع ملتا ہے۔

آزادی کے بعد

آزادی کے بعد جب تعلیمی مرکز نمبر ۱ کا مدرسہ ختم ہو گیا تو یہ پروجکٹ باڑہ ہندوراؤ کے مڈل اسکول میں میری نگرانی میں پھر شروع ہوا۔ یہاں پانچویں جماعت کے بچوں نے یہ کام کیا۔ ان بچوں میں پاکستان سے آئے ہوئے ہندو بچے بھی تھے۔ اگست ۱۹۴۹ء میں جب دہلی میں بھوجلہ پہاڑی کے مرکز سے شفیق الرحمٰن مرحوم نے مجھے اس اسکول میں منتقل کیا تو میں نے دیکھا کہ اس جماعت کو مدرسہ کا کوئی استاد پڑھانے کے لئے تیار نہیں تھا۔ جو مسلمان بچے اس جماعت میں تھے ان کے والدین پاکستان جانے کی سوچ رہے تھے اس لیے بچوں کا دل بھی تعلیم میں نہیں لگتا تھا اور وہ استادوں کو خاطر میں نہیں لاتے تھے اور توڑ پھوڑ کرتے رہتے

تھے اس لیے یہی زیادہ تکلیف دہ تھے اور شرنارتھی بچوں کو بھی نہیں پڑھنے دیتے تھے۔ اس جماعت کو قابو میں کیا گیا۔ سزا سے نہیں، کام سے۔ شرنارتھی بچوں نے ہمیں سو فیصدی تعاون دیا۔ مسلمان بچوں میں بھی دو تین بچے کام کے نکل آئے جن کے سرپرستوں نے ہندوستان میں رہنے کا ذہن بنا لیا تھا۔

بچوں کی اسٹیشنری کی ذمہ داری اس جماعت کو سونپی گئی۔ یہ دکان تین سو روپے کی مقروض تھی۔ دکان چلا کر یہ قرضہ ادا کر دیا گیا اور اسٹیشنری کے مزید منافع سے دوسرے سال بچوں کا خوانچہ قائم کر دیا گیا۔ پنجم کے بچے دوسرے سال کامیاب ہو کر ششم میں آ گئے اور انھوں نے بچوں کی دکان اور بچوں کا خوانچہ بڑی کامیابی سے چلایا۔ بچوں نے خوانچہ کے منافع سے علیگڈھ کی سیر کی، ذاکر صاحب اُس زمانہ میں علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ اُس زمانہ میں وہاں کانووکیشن ہو رہا تھا، اس لیے ملے نہیں لیکن ٹھہرنے کا انتظام فرما دیا۔ بچوں نے جغرافیہ کلاس میں کئی ملکوں کے سلائڈز دیکھے اور وہاں کے حالات معلوم کیے۔ اس سفر میں کسی بچے سے کوئی رقم نہیں لی گئی۔ شرنارتھی بچے قلیل سے قلیل رقم بھی نہیں دے سکتے تھے۔ پھر منافع کی رقم سے تمام بچوں نے مُغل گارڈن دیکھا اور دہلی کی تاریخی عمارتوں کی سیر کی۔ تمام بچے (تعداد ۳۵ تھی) بس سے گئے اور آئے۔ ۳۴ سال کے اس کام میں اس مدرسہ میں میرے یہ دو سال سنہری سال تھے۔ جہاں نگران مدرسہ، مدرسہ کے اساتذہ، سرپرست اور تمام طلبار سے مجھے تعاون ملا اور جہاں اچھے کام کی قدر تھی۔

(باقی)

قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی

ذکرِ شہادتِ حسین رض

(جامعہ ملیہ اسلامیہ کے محمد علی ہال میں گزشتہ ماہ جو جلسہ "شہادت حسین رض" کے سلسلہ میں منعقد ہوا، اس میں رفیق محترم مولانا عبد السلام صاحب قدوائی کے اصرار پر جو چند جملے خاکسار نے کہے وہ محض رسمی حیثیت رکھتے تھے اور اپنی جگہ خود موضوع پر روشنی ڈالنے کے لیے کافی نہ تھے۔ پھر مکرمی عبد اللطیف اعظمی صاحب نے ان کا جو خلاصہ جلسہ کی رپورٹ تحریر فرماتے ہوئے "جامعہ" جون ۱۹۷۱ء میں درج فرمایا ہے اس سے میرے الفاظ نہ صرف تشنہ بلکہ موہم ہوگئے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ حادثہ فاجعہ شہادت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق میرے نقطۂ نظر کی تعبیر غلط کی جائے۔ اس لیے سطور ذیل میں اپنی تقریر کا مضمون اپنی یادداشت کے مطابق پیش کر رہا ہوں)

اسلام کی بنیاد ہی شہادت پر ہے اور تاریخ اسلام میں شہادت کوئی نئی چیز نہیں۔ اس کا ہر صفحہ خونِ شہداء سے رنگین نظر آتا ہے۔ حدیث صحیح میں فرمایا گیا ہے:

بُنی الاسلامُ علیٰ خمس شہادۃ ان لا الٰہ الا اللہ و ان محمداً عبدہ و رسولہ الخ	اسلام کی بنیاد پانچ باتوں پر قائم کی گئی ہے۔ (پہلی بات) اس امر کی شہادت دینا ہے کہ خدائے واحد کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور یہ کہ محمد اس کے بندے اور رسول ہیں۔

اس شہادت یا گواہی کا ادنیٰ درجہ جو شرط ایمان ہے، یہ ہے کہ زبان سے اس کے الفاظ

کو ادا کیا جائے اور دل سے اس کے مفہوم پر یقین کیا جائے اور اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ زبان ملقوم سے خون کے اچھلتے فوارے اس گواہی کا اعلان کریں اور خون شہادت کے قطرے، جبیدۂ عالم پر دین حق کی حقانیت وصداقت کے نقوش ثبت کر دیں۔

یہ درجہ جن خوش نصیب لوگوں کو نصیب ہوتا ہے وہ چمنستان دین کو بھی اپنے خون کی آبیاری سے سرسبز و شاداب بناتے ہیں اور خود بھی حیات چند روزہ کے بدلہ حیات دوام حاصل کر لیتے ہیں۔

ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللّٰہ اموات ٥	جو لوگ اللہ کے راستہ میں قتل کیے جاتے ہیں
بل احیاء ولکن لا تشعرون	ان کو مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں مگر تم کو ان کی
(البقرہ)	زندگی کا شعور نہیں۔

پھر شہادت کے اس درجہ کی بھی اس کی نوعیت وکیفیت کے اعتبار سے مختلف منزلیں ہیں۔ غزوۂ احد میں ستر حق پرست صحابہ کرام راہ خدا میں خاک وخون میں تڑپے۔ قرآن کریم میں ان کے مدارج عالیہ کا بڑی شان سے تذکرہ کیا گیا۔ مگر حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت جس جگر دوز طریقہ پر واقع ہوئی، آپ کے مختلف اعضاء جسم کو جس طرح الگ الگ کیا گیا اور آپکے سینے سے کلیجہ نکال کر جس وحشیانہ طریقہ سے اسے چبایا گیا اس کی مثال زمانہ نبوت کی قربانیوں میں نہیں ملتی۔ اسی لیے زبان رسالت سے ان کی اس عظیم قربانی کو خاص طور پر خراج تحسین ادا کیا گیا اور فرمایا گیا:

سَیِّدُ الشہداء حمزہ	حمزہ شہداء کے سردار ہیں۔

وفات نبوی کے نصف صدی بعد، حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعۂ شہادت بھی تاریخ اسلام میں اپنی دلدوزی اور المناکی میں اپنی مثال نہیں رکھتا۔ ان کے مقدس خاندان کے ایک ایک فرد کو، یہاں تک کہ شیر خوار بچوں تک کو، ان کی آنکھوں کے سامنے دردناک طریقہ پر ذبح کر دیا جاتا ہے۔ پھر شیر بیشۂ کربلا جب تنہا رہ جاتا ہے تو اسے دشمن ہتھیاروں کے جھرمٹ میں لے لیتے ہیں اور اس طرح اس کے مقدس جسم کو گلزار بنا دیتے ہیں کہ ہر بن مو لالہ صحرا

بن جاتا ہے۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند این عاشقانِ پاک طینت را

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اگر اس عالم ناسوت میں ہوتے تو خدا بہتر جانتا ہے کہ وہ اپنے پیارے نواسے کی اس عظیم قربانی کی کن الفاظ میں داد دیتے۔

امام بخاری کی ایک روایت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات حسنین کے متعلق ارشاد فرمایا:

هما ریحانتای من الدنیا — یہ دونوں میرے لیے دنیا کے دو مہکتے ناز بو ہیں۔

ترمذی کی ایک روایت میں فرمایا گیا

الحسن والحسین سیدا شباب اهل الجنة — حسن اور حسین جوانان جنت کے سردار ہیں۔

بے شک حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی یہ عظیم قربانی حقانیت اسلام اور صداقت نبوت کی بہترین شہادت ہے اور جب کہ یہ واقعہ ہے کہ اولاد کی نیکیوں میں ان کے بزرگوں کا بھی حصہ ہوتا ہے جیسا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

اذا مات ابن آدم انقطع عمله الا من ثلاث صدقة جارية او علم ينتفع به او ولد صالح يدعو له (مسلم)

جب آدمی مرجاتا ہے تو اس کے (نیک) عمل کا سلسلہ ختم ہوجاتا ہے مگر تین ذرائع سے جاری رہتا ہے کوئی صدقہ جاری رہنے والا چھوڑا یا علم جس سے دوسروں کو نفع پہنچتا ہو یا نیک اولاد جو اس کے لیے دعا کرتی رہے۔

تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی راہ حق میں اس عظیم قربانی کو بھی آپ کے مقدس نانا کے لیے باعث افتخار و ابتہاج اور کمالات نبوت کا تتمہ و معراج کہا جاسکتا ہے۔

یزید اور اس کی بیعت کے متعلق بھی چند الفاظ عرض کر دینا مناسب ہیں۔ یہ ایک تاریخی

حقیقت ہے کہ یزید ایک فاسق و فاجر نوجوان تھا۔ اس کی زندگی کے صبح و شام ساغر گلفام کی گردشوں میں گزرتے تھے اور اس کا مقصد حیات عیش کوشی و بادہ نوشی کے سوا کچھ نہ تھا۔ عہد نبوت سے تو وہ بہت بعد پیدا ہوا تھا، مگر عہد خلافت راشدہ کی مقدس فضاؤں سے بھی وہ دور ہی دور رہا تھا۔ اس کی پیدائش اور تربیت شام کے صحراؤں میں ایک نصرانی الاصل ماں (میسون) کی گود میں ایک ایسے معاشرہ میں ہوئی تھی جس کو اسلامی نظریات و آداب زندگی سے دور کا واسطہ بھی نہ تھا۔ ملحد و زندیق شعراء کا گروہ اس کا ندیم و جلیس اور آوارہ و رند مشرب مصاحبین کی جماعت اس کی رفیق و انیس تھی۔ ان میں مشہور آوارہ مزاج مسیحی شاعر اخطل خاص طور پر اس پر چھایا ہوا تھا۔ بس اس میں یہی ایک خوبی تھی کہ وہ بہترین شاعر تھا چنانچہ کہا گیا ہے کہ شاعری ایک بادشاہ (امرؤ القیس) سے شروع ہوئی اور ایک بادشاہ (یزید) پر ختم ہو گئی۔ مگر یہ کمال شعر و سخن اس کو بزم شاعری کا امیر مجلس تو بنا سکتا تھا مگر خلافت نبوت کی مسند رفیع پر اسے فائز نہیں کر سکتا تھا۔

اسی لیے حضرت معاویہ نے اپنے آخری زمانہ میں جب اسے ولی عہد بنانا چاہا تو عالم اسلام کے ممتاز افراد نے جن میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس صحابی حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن زبیر اور حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہم پیش پیش تھے اسے خلفاء راشدین کا جانشین تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

بلکہ واقعہ یہ ہے کہ شروع شروع میں خود حضرت معاویہ کے سامنے جب یہ تجویز پیش کی گئی تو انھوں نے بھی اسے قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ مگر خوشامدیوں کے گروہ نے جو ہر صاحب اقتدار کے ساتھ لگے رہتے ہیں اور اپنے ناجائز مقاصد کے حصول کے لیے ارباب اقتدار کی عزت و حرمت کے دامن کو داغدار کرنے میں تامل نہیں کرتے مصلحتوں اور حالات کے تقاضوں کے سبز باغ دکھا کر انھیں ایک ایسی عظیم غلطی پر آمادہ کیا جس نے اسلام کے مقدس تصور خلافت و امامت کی قبا کی دھجیاں اڑا دیں اور اسے کسرویت و قیصریت کے ہمدوش

کردیا۔

تخت وتاج کا مالک بننے کے بعد یزید نے جو کچھ کیا وہ اس جیسے شخص سے غیر متوقع نہ تھا۔ جس شخص کا کیریکٹر یہ ہو کہ اس کا مشفق باپ بستر مرگ پر نزع کی ہچکیاں لے رہا ہو اور اس کی پتھرائی ہوئی آنکھیں اپنے عزیز بیٹے کی صورت دیکھنے کے لیے دروازہ پر لگ رہی ہوں اور بیٹا مرغزاروں میں سیر وشکار کے لطف اڑا رہا ہو اور بادہ گلگوں کے جام لنڈھا رہا ہو، اس سے دین کی سربلندی اور ملت کی دردمندی کی توقع رکھنا دیوانہ کے خواب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔

یہ ہے میرے مختصر بیان کی تعبیر۔ ہو سکتا ہے کہ الفاظ بدل گئے ہوں مگر مجھے یقین ہے کہ مفہوم یہی تھا۔ (باقی)

امیر عارفی

نیاز فتحپوری کی عقلیت پسندی

ابتدا ہی سے اسلام کو عقلی بنیادوں پر سمجھنے والوں کی کمی نہیں رہی۔ ہر دور میں لوگوں نے مروجہ اصولوں سے ہٹ کر اور نزولِ قرآن کے دور کو سامنے رکھکر ہر مسئلہ کو جاننے اور سمجھنے کی کوشش کی۔ ان میں معتزلہ کو اولیت حاصل ہے جو بعد میں اسلامی فکر کی عقلیت پسند روایت کے بانی قرار پائے۔

ہندوستان میں شاہ ولی اللہ، سرسید، شبلی، ابوالکلام آزاد اور نیاز فتحپوری نے عقل پرستی کی اسی روایت کی توسیع کی۔ ہندوستان میں عقلیت پرستی کی شمع صحیح معنی میں سرسید نے روشن کی۔ انھوں نے علم و ادب، تہذیب و تمدن، معاشرت اور تعلیم کے ساتھ ساتھ مذہبی اصلاح کے لئے بھی بہت سے مضامین لکھے کیونکہ ۱۸۵۷ء کے بعد زندگی کے تمام شعبوں کا ازسرِنو جائزہ لیا جا رہا تھا اور معاشرتی و معاشی زندگی میں آہستہ آہستہ تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔ اس لئے مذہبی نقطۂ نظر میں بھی اصلاح ضروری ہو گئی۔ اس تبدیلی کا احساس اس وقت شدید ہو گیا جب کہ ہندوستانیوں کو اس بات کا اندازہ ہوا کہ اب سابقہ ایک ایسی قوم سے ہے جو دنیا کی ترقی یافتہ قوموں میں ایک نمایاں امتیاز رکھتی ہے۔ ہندوستان میں انگریز جہاں اور بہت سی نعمتیں لائے وہاں ایک نعمت سائنس کی ہمیں دے گئے۔ سائنس کی بدولت یورپ کے نظامِ مذہب میں ایک زبردست انقلاب پیدا ہو گیا تھا اور ہندوستان میں بھی جدید علوم جن میں سائنس بہت زیادہ اہم تھی پرانے تصورات

اور توہمات کے پردے چاک کر رہے تھے۔ ایسے پرآشوب زمانے میں سرسید نے مذہب کو نئے حالات اور تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی اور یہی کوشش عقلیت پسندا کی روایت بن گئی۔ اگر سرسید اس دور میں ایسا نہ کرتے تو خدا جانے ہم ابھی اور کتنے پس ماندہ رہتے اور ہمارا کیا حشر ہوتا۔

سرسید سے پہلے شاہ ولی اللہ نے "حجۃ اللہ البالغہ" میں مذہب کو عقل کی بنیاد پر سمجھنے کی کوشش کی، لیکن یہ کوشش عام نہ ہوسکی، کیونکہ اس کا دائرہ وسیع نہ تھا۔ شبلی نے "کلام اور علم الکلام" لکھکر عقلیت پسندی کی روایت کو آگے بڑھایا۔ مولانا آزاد نے مذہبی مسائل پر عقلی اور مدلل طریقے پر بحثیں کیں، عوام اور پڑھے لکھے طبقے کے سوئے ہوئے تاریک ذہنوں کو اپنی شعلہ نوا تقریروں اور تحریروں سے جگایا اور مسلمانوں کو ہر مسئلہ پر آزادی کے ساتھ اظہار خیال کی دعوت دے کر ان میں ایک نئی زندگی پیدا کی۔ مذہب کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے مولانا آزاد نے بھی عقل کو بنیاد بنایا۔ "ترجمان القرآن" نئے علوم کی روشنی میں مذہب کو سمجھنے کی ایک بہترین کوشش ہے۔ اس طرح سے عقلیت پسندی کی روایت نیاز فتحپوری تک پہونچتے پہونچتے زیادہ وسیع ہوچکی تھی اور ذہن نئی بات سننے اور قبول کرنے کے لئے تیار ہوچکے تھے، یہی وجہ ہے کہ نیاز نے مذہبی مسائل پر جی کھول کر لکھا اور اپنے خیالات کے اظہار میں کبھی کسی رکاوٹ کی پروا نہیں کی، کفر کے فتوے تو معمولی بات تھے، جان کے لالے پڑنے پر بھی ان کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی۔ یہی وجہ ہے کہ نیاز کا قلم مسلسل ۵۰ سال تک مذہب کے غیر عقلی استدلال کے خلاف جہاد کرتا رہا۔ نیاز کے اس قلمی جہاد نے ایک طرف مذہبی اجارہ داری کی عقل دشمنی کا پردہ چاک کیا تو دوسری طرف ذہنوں کو نئے خیالات و تصورات کے لئے ہموار کیا۔ اس طرح ان کی یہ کوشش جو انفرادی تھی ایک اجتماعی تحریک کا لازمی حصہ بن گئی۔

نیاز نے اپنی تحریروں کے ذریعہ روشن خیالی، عقلیت پرستی اور سائنسی رویے کے لئے وہ فضا تیار کی جو مذہب کی غلط تعبیرات کے سبب عرصہ سے ناپید تھی۔

نیاز کی ادبی تحریروں سے زیادہ مذہبی تحریروں کی اہمیت ہے۔ انہی تحریروں نے نوجوان نسل کے ذہنوں میں آزادیٔ فکر کی شمع روشن کی۔

نیاز کے مذہبی مضامین کی تعداد بہت زیادہ ہے لیکن ان میں سب سے زیادہ اہم وہ مضامین ہیں جو "من ویزداں" کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔ "من ویزداں" کی بدولت لاکھوں ذہنوں میں مذہب کو صحیح طور سے سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہوئی۔ اس نے قرآن شریف اور رسول اکرمؐ کی عظمت کے تصورات کو صحیح طور سے رسم و روایت سے ہٹ کر مستحکم کیا اور عقلیت پسندی کا ایک نیا معیار قائم کیا۔

نیاز کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے اندر سچے مذہبی انسان کی روح موجود تھی۔ انھوں نے خدا، توحید، حدیث، فقہ، حیات بعد الموت، معاد، کرامات، معجزہ اور خلق قرآن جیسے اہم مسائل پر صرف گرمیٔ بازار کے لئے قلم نہیں اٹھایا بلکہ انھوں نے عقلیت کی بنیادوں پر ان کی عظمت کو مستحکم کیا ہے اور اسلام کی اصلی اور سچی روح کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہماری یہ بدقسمتی رہی ہے کہ ہم نے جب کبھی مذہب کی روح کو سمجھنے کی کوشش کی تو مولویوں کی جماعت نے اس کو ممنوع قرار دیا اور سوچنے، سمجھنے کے سارے دروازے کفر کے فتوے لگا کر بند کر دیئے۔ کیونکہ ہماری مذہبی تعلیم کا مرکز مسجد یا خانقاہ تک محدود رہا ہے۔ تقلید کی وجہ سے علمی ماحول میں تنگی کا غلبہ رہا۔ مذہب کو سمجھنے سمجھانے کا کام صرف ایک جماعت تک محدود ہو گیا جو نئی تبدیلیوں اور نئے تقاضوں سے یکسر نا آشنا تھی۔ یہ جماعت نقل کو عقل پر، رسم کو اجتہاد پر، ظاہر کو روح پر اور تقلید کو اصل مذہب پر ترجیح دیتی تھی۔ ایسے ماحول میں مذہب کو عقل سے سمجھنا بہت دشوار مرحلہ تھا۔

نیاز کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے نگار اور مذہبی مضامین کے ذریعہ مذہب کے غلط تصور اور تقلیدی رجحانات کے خلاف جہاد کیا۔ اس جہاد میں کامیابی ان کے سر رہی۔

نیاز کے یہاں مذہب کا تصور بہت وسیع ہے، لکھتے ہیں: "لفظ مذہب کا مفہوم

طریقِ حیات یا طریق عمل ہے۔" (من ویزداں صفحہ ۱۰۰)

اسلام کے متعلق نیاز کا یہ نظریہ ملاحظہ کیجئے: "اسلام نام ہے ترک رسوم کا، تفریق قومی کے محو کردینے اور انسانیت کو ایک مرکز پر جمع کر دینے کا۔" (من ویزداں صفحہ ۳۹)

خدا کی خوشنودی اور خفگی کے متعلق نیاز کی رائے کس قدر عقلی بنیادوں پر قائم ہے، سنیئے:

"خدا کی ذات ہمارے فلسفۂ مسرت والم سے بلند ہے، اس لیے ظاہر ہے کہ اس کی خوشنودی اور برہمی کا مفہوم بھی کچھ اور ہوگا پھر اس مفہوم کی جستجو کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے جس امر کو اپنی خوشنودی سے تعبیر کیا ہے وہ حقیقتاً ہماری بہتری سے متعلق ہے اور جس امر کو وہ اپنی برہمی سے تعبیر کرتا ہے اس کا واسطہ بھی ہماری فطرت سے ہے...... اسلام اور توحید نام ہے صرف عمل کا، بلندی اخلاق کا، اخوت عامہ کا، اور کفر وشرک کہتے ہیں نظم ونسق سے منحرف ہوجانے کو، ترک علم کو، انحطاط اخلاق کو، انتشار وافتراق کو، فرقہ بندی کو، تفریق جامعہ انسانیت کو اور انسانی اجتماعیت کے خراب کرنے کو۔" (من ویزداں)

میں اب ایک طویل اقتباس پیش کرنا چاہتا ہوں جس سے نیاز کی عقلیت اور مولویوں کے روایتی مذہب پرستی کا موازنہ ہوجاتا ہے۔ اس سے نیاز کے انداز فکر کا بخوبی اندازہ ہوجائے گا۔ اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

"آیئے میں بتادوں کہ مجھ میں، آپ میں کیا اختلاف ہے، میں کہتا ہوں کہ اسلام ہی وہ مذہب ہے جو ہر زمانہ، ہر ملک اور ہر قوم کے لئے موزوں ہوسکتا ہے، اس لیے اس میں ہر زمانہ کا ساتھ دینے کی لچک پائی جاتی ہے اور اس کی تعلیم ہر شخص کے لئے قابل قبول ہے، لیکن آپ کہتے ہیں کہ نہیں، اسلام کسی کی سمجھ میں آئے کہ نہ آئے، وہی ہے جو آپ فرماتے ہیں یعنی اسلام صرف اہل عرب کے لئے تھا......... میں کہتا ہوں کہ اسلام نام ہے تکمیلِ اخلاق کا،

لیکن آپ کہتے ہیں کہ نہیں، اخلاق ہو یا نہ ہو صرف ارکان مذہب کی پابندی کافی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ خدا سے محبت کرنا سیکھو۔ آپ فرماتے ہیں کہ اس سے ڈرو۔ میں کہتا ہوں کہ اخلاق نبویؐ کو انسانیت کا بہترین نمونہ سمجھ کر اس کا اتباع کرو، لیکن آپ فرماتے ہیں کہ پہلے اس کے معجزات اور محیر العقول باتوں کو باور کرو۔ میں کہتا ہوں کہ اسلام صرف روزہ نماز کا نام نہیں ہے لیکن آپ فرماتے ہیں کہ اسلام صرف اسی کا نام ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ملائکہ نام ہے اُن قوائے کاملہ کا جن کو خدا نے انسان کی فطرت میں ودیعت کر دیا ہے۔ لیکن آپ کہتے ہیں کہ ملائکہ ایک مخلوق ہے جو ہاتھ پاؤں رکھتی ہے جس کے بال و پر بھی ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ جنت و دوزخ نام ہے انفرادی، قومی اور روحانی احساس عروج و زوال کا۔ لیکن آپ کہتے ہیں کہ نہیں، ان کا تعلق مادی لذائذ سے ہے، میوہ دار درختوں سے ہے۔ شہد کی نہروں سے ہے، خوبصورت عورتوں اور لڑکوں سے ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اچھا کام خود آپ اپنی جزا اور بُرا کام خود آپ اپنی سزا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ اچھے کام کا عوض حور و قصور ہونا چاہئے اور بُرے کام کی پاداش میں نارِ جہنم۔ میں کہتا ہوں کہ خدا کی عظمت و بزرگی اس سے بہت زیادہ بلند ہے کہ وہ ہمارے افعال سے متاثر ہو کر جذبۂ تحسین و انتقام اپنے اندر پیدا کرے۔ آپ کہتے ہیں کہ وہ دنیاوی بادشاہوں کی طرح خفا بھی ہوتا ہے اور خوش بھی۔" (سید سلیمان ندوی اور میں۔ من و یزداں صفحات ۱۴۲-۱۴۳)

اس طویل اقتباس سے نیازؔ کی عقلیت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ نیازؔ نے خدا، توحید، اسلام اور کفر و شرک کی نئی تعبیر کی ہے اور اسلام کو عام فہم بتایا ہے اور ہر شخص بلا خوف اسلام کی روح تک پہونچ سکتا ہے۔ جو اصطلاحات صدیوں سے ڈر، خوف اور عذاب کی علامت بنی ہوئی تھیں، نیازؔ نے ان کو نئے مفہوم سے روشناس کرایا، اور ان میں وسعت پیدا کی۔

اسلام میں اجتہاد کی ترغیب دی گئی ہے لیکن صدیوں سے اجتہاد کا دروازہ بند ہے۔ کیا خلفائے راشدینؓ کے زمانے میں اجتہاد نہیں ہوا؟ کیا امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ،

امام حنبلؒ نے اجتہاد نہیں کیا؟ یقیناً فقہ کے چاروں اماموں نے اجتہاد کیا ہے ورنہ بعض مسائل میں ان میں اس قدر اختلاف نہ ہوتا۔ کیا فقہ کے ان بزرگ ومحترم اماموں نے اپنے ملک کے تاریخی، جغرافیائی، تہذیبی وتمدنی روایات کو سامنے رکھ کر فقہ کی تدوین نہیں کی؟ لیکن آج اجتہاد کا نام لیجئے تو روشن خیالی کا الزام لگایا جاتا ہے۔ اجتہاد کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے نیاز لکھتے ہیں:

"محض خدا کو ایک کہنا سود مند نہ ہوسکتا تھا اس لیے اصلاح معاشرت کے لئے وہ تدبیریں اختیار کی گئیں جو اس سے قبل مفید ثابت ہوئی تھیں، عذاب وثواب، جنت ودوزخ، حشر ونشر وغیرہ کے تمام عقائد قائم رکھے گئے جس کے بغیر اصلاح ناممکن تھی، اگر جاہل عربوں کے سامنے اظہار حقیقت کے طور پر بہشت ودوزخ کا مفہوم صرف روحانی مسرت یا روحانی اذیت بتایا جاتا تو ظاہر ہے ان پر اس کا کوئی اثر نہ ہوتا کیونکہ ان مفہوم سے وہ آشنا نہ تھے اور ان کے ذہن اس قدر ترقی یافتہ نہ تھے کہ وہ اس بلندی کو سمجھتے....

اس لیے مذہبی معتقدات کے متعلق گفتگو کرنا کہ وہ حقیقتاً لغو وباطل تھے ان معتقدات کی اہمیت کو کم نہیں کرسکتا، کیونکہ ان سے جو کام لینا مقصود تھا وہ پورا ہوکر رہا، اگر آج ان معتقدات سے ہٹ کر کوئی دوسرا ذریعہ اصلاح اعمال واخلاق کا اختیار کیا جاسکتا ہے تو مذہب کے حقیقی مقصود کے منافی نہیں ہے اور یہ ایسا باریک نکتہ ہے جس کو سب سے پہلے اسلام اور بانئ اسلام نے ظاہر کیا۔" (دشمن اسلام کون ہے، من ویزداں صفحات ۱۸ — ۲۱۷)

لیکن آج ہماری یہ حالت ہے کہ ہم اجتہاد سے گھبراتے ہیں اپنے اسلاف کے کارناموں کی قدر وقیمت کا ہمیں صحیح طور سے اندازہ نہیں ہے اس لیے ہم اپنے میں وہ جرأت نہیں پاتے جو اسلاف میں تھی۔ نیاز نے مذہبی مسائل پر قلم اٹھا کر بندھے ٹکے اصولوں اور قاعدوں کی مخالفت کی اور عقل وذہن کو کام میں لاکر مذہب کو سمجھنے کی ترغیب دی۔ آج پہلے سے زیادہ نیاز کے فکری استدلال کو اپنانا ضروری ہے تاکہ ہم اسلام کی بہتر خدمت کرسکیں۔ آج ہمیں عزم محکم کی ضرورت ہے اگر عزم محکم پیدا ہوجائے تو یقین کی منزل قریب ہوجاتی ہے۔

معیاری ادب شائع کردہ مکتبہ جامعہ

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے بھیجنا ضروری ہے)

مکتبہ جامعہ نے حکومت جموں و کشمیر کے مالی تعاون سے، اردو ادب کی قدیم معیاری کتابوں کے نئے ایڈیشن شائع کرنے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ اس سلسلے کا نام "معیاری ادب" رکھا ہے۔ متن اور املا کی صحت کے لیے ایک بورڈ مقرر کیا گیا ہے جس کے موجودہ اراکین حسب ذیل ہیں:
(۱) ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب (صدر) (۲) مالک رام صاحب (۳) ضیاء الحسن فاروقی صاحب (۴) ڈاکٹر محمد حسن صاحب (۵) ڈاکٹر قمر رئیس صاحب (۶) رشید حسن خاں صاحب (۷) ڈاکٹر صدیق الرحمان قدوائی صاحب (۸) غلام ربانی تاباں صاحب (۹) شاہد علی خاں صاحب (کنوینر)

اس سلسلے کی پانچ کتابیں پہلے شائع ہو چکی ہیں، جن پر جامعہ میں تبصرہ کیا جا چکا ہے، اب حسب ذیل نو کتابیں تبصرے کے لیے موصول ہوئی ہیں:

نیرنگ خیال (اول و دوم) از شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد

حجم ۲۱۵ صفحات، قیمت ۹.۰/۱، لائبریری اڈیشن ۲/۲۰، تاریخ طباعت: جون ۱۹۷۰ء
اس سلسلے کا یہ چھٹا نمبر ہے اور اس کی تصحیح وغیرہ کا کام مالک رام صاحب نے انجام دیا ہے۔ موصوف نے اس کے تعارف میں فاضل مصنف کے بارے میں لکھا ہے:
"محمد حسین نے ابتدائی تعلیم اپنے دادا مولوی محمد اکبر سے پائی اور تکمیل قدیم دلی کالج میں کی۔ آزاد

تخلص اختیار کیا اور اپنے کلام پر استادِ زمانہ شیخ محمد ابراہیم ذوق سے اصلاح لینے لگے۔ ذوق کے انتقال (نومبر ۱۸۵۴ء) کے بعد وہ حکیم آغا خاں عیش سے مشورہ کرتے رہے۔ تلاش روزگار میں ۱۸۶۱ء میں لاہور میں وارد ہوئے۔ ابتدا ڈاک خانے میں ملازمت ملی اور پھر محکمۂ تعلیم میں پہنچے۔ ۱۸۶۹ء میں عارضی طور پر گورنمنٹ کالج لاہور میں ۷۰ روپے ماہانہ پر عربی کے استاد مقرر ہوئے۔ اگلے ہی برس (۱۸۷۰ء میں) وہ اس جگہ مستقل کر دئے گئے، اب مشاہرہ ۱۵۰ روپیہ ہو گیا۔"

"آزاد کی دماغی حالت بہت دن سے مخدوش چلی آرہی تھی، اب اس میں شدت آگئی اور ان میں جنون کے آثار نمایاں ہوگئے۔ اس پر انھوں نے ۱۸۹۲ء میں پنشن لے لی۔ آخری بیس سال اسی طرح اندھیرے اجالے میں گذرے۔ ۲۲ جنوری ۱۹۱۰ء کو لاہور میں انتقال ہوا اور وہیں دفن ہوئے۔"

کتاب کے بارے میں فاضل مرتب نے لکھا ہے :

"نیرنگ خیال میں جتنے مضمون شامل ہیں یہ دراصل انگریزی سے ترجمہ کیے گئے ہیں، ان میں سے چھ مضمون جانسن کے ہیں، تین ایڈیسن کے اور بقیہ دوسرے انگریزی ادیبوں کے؛ لیکن ان ترجموں میں آزاد نے اپنی ذہانت اور سحر بیانی سے اتنا رد و بدل کر دیا ہے کہ ان کا درجہ ترجمے سے بڑھ کر تخلیق کا ہو گیا ہے..."

آزاد نے یہ مضمون ۱۸۷۵ء میں لکھنا شروع کئے تھے۔ ان میں سے بعض انجمن مفید عام قصور (ضلع لاہور) کے ماہانہ پرچے 'رسالہ' میں ۱۸۷۵ء سے لے کر ۱۸۷۷ء تک کے متفرق شماروں میں شائع ہوئے تھے۔ ان کا مجموعہ حصہ اول کی شکل میں ۱۸۸۰ء میں شائع ہوا۔ آزاد کا ارادہ حصہ دوم بھی مرتب کرنے کا تھا، افسوس کہ وہ مکمل نہیں کر سکے تھے کہ اختلال دماغ کے عارضے میں مبتلا ہو گئے اور یہ کام ادھورا رہ گیا۔ ان کی وفات کے بعد ان کے کاغذات میں سے صرف پانچ اور مضمونوں کے مسودے دستیاب ہوئے۔ ان کے پوتے آغا محمد طاہر نے انھیں اپنے دیباچے اور بقائے دوام کے عنوان سے ایک اختتامیے کے ساتھ مرتب کر کے پہلی مرتبہ ۱۹۲۳ء میں شائع کیا۔ ہم نے یہ دونوں حصے اس مجلد میں یک جا کر دیے ہیں۔ آغا محمد طاہر کی دونوں تحریریں البتہ خارج کر دی ہیں۔"

فسانۂ آزاد (تلخیص) از رتن ناتھ سرشار

حجم ۵۰۸ صفحات، قیمت ۶/۲۰، لائبریری اڈیشن ۷/۵۰، تاریخ طباعت: جولائی ۱۹۷۰ء

یہ اس سلسلے کی ساتویں کڑی ہے۔ اس کی تصحیح وغیرہ کا کام ڈاکٹر قمر رئیس صاحب نے انجام

ا ہے، انھوں نے فاضل مصنف کے بارے میں لکھا ہے:

"چکبست نے لکھا ہے کہ ۵۵ - ۵۶ برس کی عمر میں سرشار نے وفات پائی۔ ان کی تاریخ وفات ۲۷ر جنوری ۱۹۰۲ء ہے۔ اگر چکبست کے بیان کو صحیح مانا جائے تو سرشار کا سنہ پیدائش ۱۸۴۶ء یا ۱۸۴۵ء قرار پائے گا۔ سرشار کے والد پنڈت بیج ناتھ در، کشمیری برہمن تھے اور بہ سلسلہ تجارت کشمیر سے لکھنؤ آکر بس گئے تھے۔ مدرسہ میں انھوں نے دستور کے مطابق فارسی اور عربی کی تعلیم بھی حاصل کی، پھر اسکول کی تعلیم ختم کرکے لکھنؤ کے مشہور کیننگ کالج میں داخلہ لیا، لیکن بعض حالات کی بنا پر تعلیم ادھوری چھوڑ کر ملازمت اختیار کرلی۔ مدرسی کی یہ ملازمت انھیں لکھنؤ سے دور ضلع کھیری میں ملی ۔۔ ملازمت کے ساتھ تصنیف و ترجمہ کا کام کرنے لگے۔ اودھ پنچ، مراسلۂ کشمیر اور دوسرے اخبارات میں ان کے متعدد مضامین شائع ہوئے۔ ان کی شہرت سن کر منشی نول کشور نے اپنے اخبار "اودھ پنچ" کی ادارت کا کام انھیں سونپ دیا۔ ۱۸۷۸ء میں انھوں نے یہ ذمہ داری سنبھالی اور اس اخبار میں اپنا قصہ "فسانۂ آزاد" قسط وار شائع کیا۔ ۱۸۹۵ء سے اپنی وفات تک وہ حیدرآباد میں رہے۔ قیام حیدرآباد میں وہ دوسرے تصنیفی مشاغل کے علاوہ ایک رسالہ "دبدبۂ آصفی" کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ یہیں ۱۹۰۲ء میں ان کا انتقال ہوا۔

ب کے بارے میں فاضل مرتب نے لکھا ہے:

"فسانۂ آزاد پنڈت رتن ناتھ سرشار کی پہلی تصنیف ہے۔ اس کے بعد اگرچہ انھوں نے 'سیر کہسار' اور 'جام سرشار' جیسے متعدد ناول لکھے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بھی 'فسانۂ آزاد' کی شہرت اور بلندی کو نہ پہنچ سکا۔ یہ قصہ پہلے نول کشور کے 'اودھ اخبار' لکھنؤ میں دسمبر ۱۸۷۸ء سے دسمبر ۱۸۷۹ء تک قسط وار شائع ہوا۔ اس کے بعد ۱۸۸۰ء میں یہ طویل افسانہ بڑی تقطیع کی چار ضخیم جلدوں میں مطبع نول کشور سے طبع ہوا۔"

بصرہ کتاب طویل افسانہ کی تلخیص ہے۔ اس کے بارے میں فاضل مرتب نے لکھا ہے:

"اردو کا یہ ضخیم ناول، جسے ادب عالیہ کا درجہ حاصل ہے، عرصے سے نایاب تھا۔ موجودہ حالات میں کسی پبلشر کے لیے اس کی موجودہ جلدوں کو شائع کرنا کم و بیش اتنا ہی دشوار ہے جتنا اس تیز رفتار زندگی اور کم فرصتی میں اس کا پڑھنا۔ اس خیال کے پیش نظر صرف ایک جلد میں اس کا خلاصہ پیش کیا جارہا ہے ۔۔۔ یہ کوشش ضرور کی گئی ہے کہ لکھنوی معاشرت کی نمائندگی

کرنے والے اہم مناظر خلاصہ میں شامل رہیں۔ دوسرے خلاصہ سرشار کے منفرد اسلوب تحریر کے کمالات اور خصوصیات کا آئینہ دار ہو۔"

فردوس بریں از مولانا عبدالحلیم شرر

حجم ۱۷۶ صفحات، قیمت ۲/۱۰، لائبریری اڈیشن ۲/۴۰، تاریخ اشاعت: جولائی ۱۹۷۰ء

پیش نظر کتاب کی تصحیح ڈاکٹر قمر رئیس صاحب نے کی ہے، انھوں نے کتاب کے تعارف اور مصنف کے بارے میں لکھا ہے:

"مولانا عبدالحلیم شرر ۱۸۶۰ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد حکیم تفضل حسین اودھ کے آخری تاجدار واجد علی شاہ کے ملازم تھے، واجد علی شاہ کی معزولی کے بعد وہ ان کے ساتھ مٹیابرج چلے گئے اور وہیں اقامت اختیار کر لی۔ نو سال کی عمر میں عبدالحلیم شرر بھی مٹیابرج چلے گئے۔ وہاں انھوں نے اپنے والد اور بعض دوسرے علماء سے عربی اور فارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ فن شاعری میں علی حیدر نظم طباطبائی کے شاگرد ہوئے، اس کے بعد انھوں نے لکھنؤ اور دہلی میں مزید تعلیم حاصل کی اور انگریزی میں بھی اچھی دستگاہ پیدا کی۔ تعلیم کے ساتھ تصنیف و تالیف کا شغلہ جاری تھا، ان کی صلاحیتوں کو دیکھکر ۱۸۸۰ء میں منشی نولکشور نے انھیں 'اودھ اخبار' کا نائب اڈیٹر بنا دیا.... ۱۸۸۶ء میں جب انھوں نے اپنا رسالہ 'دلگداز' جاری کیا تو اس میں اپنا پہلا تاریخی ناول 'ملک العزیز ورجنا' قسط وار شائع کیا۔ اس کے بعد انھوں نے 'حسن انجلینا' اور 'منصور موہنا' لکھے جو بے حد مقبول ہوئے۔ ۱۸۹۲ء میں شرر نواب وقار الملک کے لڑکے کے اتالیق ہو کر انگلستان چلے گئے۔ واپس آکر کچھ عرصے حیدرآباد میں رہے اور پھر ۱۸۹۹ء میں لکھنؤ آ گئے۔ لکھنؤ پہنچ کر انھوں نے پھر 'دلگداز' جاری کیا۔ ناول 'فردوس بریں' انھوں نے قیام حیدرآباد کے زمانہ میں ہی مکمل کیا تھا۔"

زیر تبصرہ کتاب کے بارے میں فاضل مرتب نے لکھا ہے کہ:

"ان کے ناولوں میں صرف ایک 'فردوس بریں' ایسا ناول ہے جو فنی تکمیل کے اعتبار سے کامیاب کہا جا سکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اسے نہ صرف ان کے بلکہ اردو کے تمام تاریخی ناولوں میں نمایاں مقبولیت حاصل ہوئی اور کم و بیش تمام نقادوں نے اس کے پلاٹ کی دلکشی اور کردار نگاری کو سراہا۔ اس ناول کی منظر نگاری اور ماحول کشی میں شرر کی صناعی درجۂ کمال پر نظر آتی ہے۔ ان کے

تمام کردار منفرد اور جاندار ہیں اور اس کے پلاٹ کی تعمیر انتہائی فطری اور متوازن ڈھنگ سے ہوئی ہے۔"

اس اڈیشن کے بارے میں فاضل مرتب نے لکھا ہے کہ

"اس ناول کا اولین اڈیشن تو دستیاب نہیں ہو سکا، لیکن تین قدیم اور مستند اڈیشنوں سے موازنہ کرنے کے بعد اس نسخے کا متن تیار کیا گیا ہے۔"

شریف زادہ از مرزا محمد ہادی رسوا

حجم ۲۰۰ صفحات، قیمت ۲/۵۰، لائبریری اڈیشن ۳/-، تاریخ اشاعت: جولائی ۱۹۷۰ء

اوپر کی دو کتابوں کی طرح زیر تبصرہ کتاب کی تصحیح کا کام بھی ڈاکٹر قمر رئیس صاحب نے انجام دیا ہے۔ موصوف نے مصنف کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"مرزا محمد ہادی (رسوا) ۱۸۵۸ء میں لکھنؤ کے ایک علم دوست اور معزز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے اسلاف مغلیہ دور میں ماژندران سے دہلی آئے اور اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے۔ جب دہلی کی سلطنت کا شیرازہ بکھرنے لگا تو آصف الدولہ کے عہد میں لکھنؤ آکر آباد ہو گئے۔ مرزا کے والد محمد تقی ایک علم دوست اور شریف النفس رئیس تھے۔ علم و ادب سے گہرا شغف مرزا کو ورثہ میں ملا تھا۔ فارسی، حساب، اقلیدس اور بعض دوسرے علوم کی ابتدائی تعلیم مرزا نے اپنے والد سے حاصل کی، انگریزی خود اپنے شوق سے پڑھی۔ پرائیویٹ طور پر میٹرک کا امتحان پاس کر لیا تھا، انجینرنگ کی تعلیم کے لیے انھیں رڑکی انجینرنگ کالج میں داخلہ مل گیا۔ اس کورس کی تکمیل کے بعد سب اوورسیر کی حیثیت سے کوئٹہ میں ان کا تقرر ہو گیا۔ یہیں کے دور قیام میں انھیں علم کیمیا کے مطالعہ کا شوق ہوا اور ملازمت ترک کر کے وطن واپس آ گئے۔ گزر اوقات کے لئے مشن کالج لکھنؤ میں فارسی کے استاد کی حیثیت سے ملازمت کر لی اور کیمیا کے تجربے کرنے لگے۔ اس سے جی بھر گیا تو حکمائے یونان کے مطالعہ کا جنون ان پر طاری ہوا۔ مئی ۱۸۸۴ء میں "اشراق" نام کا ایک رسالہ جاری کیا، جس کا مقصد حکیمانہ خیالات کی اشاعت تھا، کم و بیش ڈیڑھ سال تک یہ رسالہ نکلتا رہا۔ اگست ۱۹۱۹ء میں مرزا رسوا حیدر آباد (دکن) چلے گئے اور وہاں دار الترجمہ میں ۲۷۵ روپیہ ماہانہ کے ملازم ہو گئے۔ فلسفہ، نفسیات اور بعض دوسرے سماجی علوم کی متعدد کتابیں مرزا نے انگریزی سے اردو میں منتقل کیں۔ آخر ۲۱ اکتوبر ۱۹۳۱ء کو ٹائیفائڈ کا شکار ہو کر رحلت کی۔"

کرنے والے اہم مناظر خلاصہ میں شامل رہیں۔ دوسرے خلاصہ سرشار کے منفرد اسلوب تحریر کے کمالات اور خصوصیات کا آئینہ دار ہو۔"

فردوس بریں از مولانا عبدالحلیم شرر

حجم ۱۷۶ صفحات، قیمت ۲/۱۰، لائبریری اڈیشن ۲/۴۰، تاریخ اشاعت: جولائی ۱۹۷۰ء

پیش نظر کتاب کی تصحیح ڈاکٹر قمر رئیس صاحب نے کی ہے، انھوں نے کتاب کے تعارف میں مصنف کے بارے میں لکھا ہے:

"مولانا عبدالحلیم شرر ۱۸۶۰ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد حکیم تفضل حسین اودھ کے آخری تاجدار واجد علی شاہ کے ملازم تھے، واجد علی شاہ کی معزولی کے بعد وہ ان کے ساتھ مٹیابرج چلے گئے اور وہیں اقامت اختیار کرلی۔ نو سال کی عمر میں عبدالحلیم شرر بھی مٹیابرج چلے گئے۔ وہاں انھوں نے اپنے والد اور بعض دوسرے علماء سے عربی اور فارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ فن شاعری میں علی حیدر نظم طباطبائی کے شاگرد ہوئے، اس کے بعد انھوں نے لکھنؤ اور دہلی میں مزید تعلیم حاصل کی اور انگریزی میں بھی اچھی دستگاہ پیدا کی۔ تعلیم کے ساتھ تصنیف و تالیف کا مشغلہ جاری تھا، ان کی صلاحیتوں کو دیکھ کر ۱۸۸۰ء میں منشی نولکشور نے انھیں اودھ اخبار کا نائب اڈیٹر بنا دیا۔۔۔ ۱۸۸۶ء میں جب انھوں نے اپنا رسالہ 'دلگداز' جاری کیا تو اس میں اپنا پہلا تاریخی ناول 'ملک العزیز ورجنا' قسط وار شائع کیا۔ اس کے بعد انھوں نے 'حسن انجلینا' اور 'منصور موہنا' لکھے جو بے حد مقبول ہوئے۔ ۱۸۹۲ء میں شرر نواب وقار الملک کے لڑکے کے اتالیق ہو کر انگلستان چلے گئے۔ واپس آکر کچھ عرصے حیدرآباد میں رہے اور پھر ۱۸۹۹ء میں لکھنؤ آگئے۔ لکھنؤ پہنچ کر انھوں نے پھر 'دلگداز' جاری کیا۔ ناول 'فردوس بریں' انھوں نے قیام حیدرآباد کے زمانہ میں ہی مکمل کیا تھا۔"

زیر تبصرہ کتاب کے بارے میں فاضل مرتب نے لکھا ہے کہ:

"ان کے ناولوں میں صرف ایک 'فردوس بریں' ایسا ناول ہے جو فنی تکمیل کے اعتبار سے کامیاب کہا جاسکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اسے نہ صرف ان کے بلکہ اردو کے تمام تاریخی ناولوں میں نمایاں مقبولیت حاصل ہوئی اور کم و بیش تمام نقادوں نے اس کے پلاٹ کی دلکشی اور کردار نگاری کو سراہا۔ اس ناول کی منظر نگاری اور ماحول کشی میں شرر کی صناعی درجۂ کمال پر نظر آتی ہے۔ ان کے

تمام کردار منفرد اور جاندار ہیں اور اس کے پلاٹ کی تعمیر انتہائی فطری اور متوازن ڈھنگ سے ہوئی ہے۔"

اڈیشن کے بارے میں فاضل مرتب نے لکھا ہے کہ

"اس ناول کا اولین اڈیشن تو دستیاب نہیں ہو سکا، لیکن تین قدیم اور مستند اڈیشنوں سے موازنہ کرنے کے بعد اس نسخے کا متن تیار کیا گیا ہے۔"

شریف زادہ از مرزا محمد ہادی رسوا

ضخامت ۲۰۰ صفحات، قیمت ۲/۵۰، لائبریری اڈیشن ۳/-، تاریخ اشاعت: جولائی ۱۹۷۰ء

اوپر کی دو کتابوں کی طرح زیر تبصرہ کتاب کی تصحیح کا کام بھی ڈاکٹر قمر رئیس صاحب نے انجام دیا ہے۔ موصوف نے مصنف کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"مرزا محمد ہادی (رسوا) ۱۸۵۸ء میں لکھنؤ کے ایک علم دوست اور معزز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے اسلاف مغلیہ دور میں ماژندران سے دہلی آئے اور اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے۔ جب دہلی کی سلطنت کا شیرازہ بکھرنے لگا تو آصف الدولہ کے عہد میں لکھنؤ آکر آباد ہو گئے۔ مرزا کے والد محمد تقی ایک علم دوست اور شریف النفس رئیس تھے۔ علم و ادب سے گہرا شغف مرزا کو ورثہ میں ملا تھا۔ فارسی، حساب، اقلیدس اور بعض دوسرے علوم کی ابتدائی تعلیم مرزا نے اپنے والد سے حاصل کی، انگریزی خود اپنے شوق سے پڑھی۔ پرائیویٹ طور پر میٹرک کا امتحان پاس کر لیا تھا، انجینرنگ کی تعلیم کے لیے انھیں رڑکی انجینرنگ کالج میں داخلہ مل گیا۔ اس کورس کی تکمیل کے بعد سب اوورسیر کی حیثیت سے کوئٹہ میں ان کا تقرر ہو گیا۔ یہیں کے دور قیام میں انھیں علم کیمیا کے مطالعہ کا شوق ہوا اور ملازمت ترک کرکے وطن واپس آ گئے۔ گزر اوقات کے لئے مشن کالج نخاس میں فارسی کے استاد کی حیثیت سے ملازمت کر لی اور کیمیا کے تجربے کرنے لگے۔ اس سے جی بھر گیا تو حکمائے یونان کے مطالعہ کا جنون ان پر طاری ہوا۔ مئی ۱۸۸۴ء میں "اشراق" نام کا ایک رسالہ جاری کیا، جس کا مقصد حکیمانہ خیالات کی اشاعت تھا، کم و بیش ڈیڑھ سال تک یہ رسالہ نکلتا رہا۔ اگست ۱۹۱۹ء میں مرزا رسوا حیدر آباد (دکن) چلے گئے اور وہاں دار الترجمہ میں ۴۷۵ روپیہ ماہانہ کے ملازم ہو گئے۔ فلسفہ، نفسیات اور بعض دوسرے سماجی علوم کی متعدد کتابیں مرزا نے انگریزی سے اردو میں منتقل کیں۔ آخر ۲۱ اکتوبر ۱۹۳۱ء کو ٹائیفائڈ کا شکار ہو کر رحلت کی۔"

زیر تبصرہ کتاب کے متعلق فاضل مرتب نے لکھا ہے کہ:

"ان کا دوسرا اہم ناول "شریف زادہ" ہے (پہلا امراؤ جان ادا ہے۔ اعظمی)، جو پہلی بار ۱۹۰۰ء میں شائع ہوا۔ فنی نقطۂ نظر سے نذیر احمد کے ناولوں کی طرح اس میں بہت سے نقائص ہیں۔ اس کا پلاٹ غیر دلچسپ اور میکانکی ہے، اس کے بیشتر کردار بھی مثالی اور بے جان ہیں۔ اس کے باوجود یہ ناول اردو کے اُن چند ناولوں میں سے ہے جنہوں نے بیسویں صدی میں متوسط طبقہ کے اردو داں نوجوانوں کی سیرت کو متاثر کیا ہے۔ شریف زادہ کی زبان نذیر احمد اور سرشار کے ناولوں کی زبان کے مقابلے میں جدید بلکہ عصری معلوم ہوتی ہے۔"

اس اڈیشن کے بارے میں لکھا ہے کہ:

"راقم الحروف کو اس کا اولین اڈیشن تو دستیاب نہیں ہو سکا، لیکن دو قدیم نسخوں سے موازنہ کر کے امکانی صحت کے ساتھ یہ متن پیش کیا جا رہا ہے۔"

خود فاضل مصنف نے اس کتاب کے بارے میں لکھا ہے کہ:

"اگرچہ میری تالیفات میں 'شریف زادہ' یعنی مرزا عابد حسین کی سوانح عمری کا تیسرا نمبر ہے، لیکن میرے خیالات کے سلسلے میں یہ پہلا ناول ہے جو میں نے بطور سوانح عمری کے تحریر کیا ہے۔ اگرچہ حجم اس کا تقریباً اسی قدر ہے جتنا کہ میرے پہلے دو ناولوں کا ہے، لیکن پھر بھی بہ نظرِ طول بہت سے امور فروگذاشت ہو گئے۔ خصوصاً مکتوبات میں سے صرف چند خطوط لے لیے گئے ہیں۔"

"ہماری یہ تحریر اکثر صاحبوں کو جو اس حال سے باخبر نہیں ہیں، مجذوب کی بڑ معلوم ہوگی مگر ہم ان کو صدقِ دل سے یقین دلاتے ہیں کہ مرزا عابد حسین کے سے اخلاق والے ان سب امور کا تجربہ کر چکے ہیں، ہم ایک جنٹلمین کے کہنے پر اس کو مان چکے ہیں، آپ چاہے مانیں چاہے نہ مانیں۔" (باقی آئندہ)

(عبداللطیف اعظمی)

Regd. No. D - 768 July, 1971

The Monthly JAMIA

JAMIA NAGAR, NEW DELHI-25

جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

جامعہ

سالانہ چندہ
چھ روپے

قیمت فی پرچہ
پچاس پیسے

جلد ۶۴	بابت ماہ اگست ۱۹۷۱ء	شمارہ ۲

فہرست مضامین

مجلسِ ادارت

پروفیسر محمد مجیب　　ڈاکٹر سید عابد حسین

ڈاکٹر سلامت اللہ　　ضیاء الحسن فاروقی

مدیر

ضیاء الحسن فاروقی

خط و کتابت کا پتہ

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی　　مطبوعہ: یونین پریس دہلی　　ٹائیٹل: دیال پریس دہلی

شذرات

یہ خبر کہ صدر نکسن پیکنگ جائیں گے، بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ جس ڈرامائی انداز میں یہ خبر آئی، اس سے بھی امریکی ڈپلومیسی، خاص طور سے صدر نکسن کے عزائم کا پتہ چلتا ہے۔ عام طور پہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ سب کچھ اچانک ہو گیا، اور ہمارا اردو خواں طبقہ، جس کے پاس عالمی سیاست سے متعلق بہت محدود معلومات اور اس کے لئے بہت کم وسائل ہیں، یہ سمجھ بیٹھا ہے کہ امریکہ اور چین کی مجوزہ چوٹی کانفرنس میں پاکستان کا بھی کچھ دخل ہے۔ جو لوگ عالمی سیاست اور امریکی ڈپلومیسی سے کچھ واقفیت رکھتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ جس دن صدر نکسن وہائٹ ہاؤس میں داخل ہوئے، اسی دن سے اُن کی خارجہ پالیسی کے اہم مقاصد میں سے ایک مقصد یہ بھی تھا کہ کس طرح عالمی برادری سے کمیونسٹ چین کی علاحدگی کا دور ختم ہونا چاہیئے، اس لئے کہ انہیں یقین ہے کہ سوویٹ یونین سے کوئی مفاہمت ہو جانے کے بعد بھی عالمی امن کی ضمانت اسی وقت ہو سکتی ہے جب چین بھی اس طرح کی مفاہمت میں شامل ہو۔ دوسرے یہ کہ ویٹ نام سے باعزت نکل آنے کے لئے ضروری ہے کہ چین سے جو دوری ہے وہ قرب میں بدل جائے۔ یہی وجہ ہے کہ صدر نکسن نے کئی جرارت مندانہ اقدامات کئے، ان میں زیادہ تر خفیہ تھے، اور اب ڈاکٹر کسنگر کے خفیہ سفر پیکنگ اور صدر کے نام حکومت چین کی دعوت کی صورت میں ان کی کوششیں کامیاب ہوئیں۔ عجیب بات ہے کہ ایک ایسا ملک دوسرے ملک کے سربراہ ریاست کو بلا رہا ہے اور وہ وہاں جانے کے لئے آمادہ ہے جس کے اس ملک سے ڈپلومیٹک تعلقات نہیں ہیں۔

صدر نکسن کے اس تاریخی اقدام کی دوسری وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ماسکو اور پیکنگ
اختلافات کے ختم ہونے کی فی الحال کوئی امید نہیں، اور کریملین وہ کام کر نہیں سکتا تھا جسے
نکسن نے انجام دیا ہے۔ تین سال پہلے سنڈے ٹائمس کے کالم نویس ہنری برینڈن سے نک
نے کہا تھا کہ سوویٹ یونین سے مل کر چین کو قابو میں رکھنے کے لئے کوئی منصوبہ بنایا جائے تو
کے ممالک ہم پر نسل پرستی کا الزام لگائیں گے۔ مزید براں بنیادی طور پر صدر نکسن لچک دار ڈپلوم
حامی ہیں، ان کو یقین ہے کہ اگر ان کی کوشش سے چین دنیا کے ڈپلومیٹک اسٹیج پر آجائے، تو
عالمی سیاست میں مزید امکانات کے ساتھ اپنی لچک دار ڈپلومیسی کو کامیاب بنانے میں بھی مدد
گی۔ خیال ہے کہ گفت وشنید کے ذریعہ ویٹ نام کے مسئلہ کے حل کے سلسلہ میں ان کے خیالات
کچھ اور کشادگی پیدا ہوئی ہے، کہا جاتا ہے کہ جنوری ۱۹۶۹ء ہی میں انھوں نے سوویٹ یونم
مدد سے ہنوئی سے بات چیت کرنے کی کوشش کی تھی مگر اندازہ ہوا کہ ہنوئی سے معاملہ کر
روس کچھ زیادہ معاون ومددگار ثابت نہیں ہو سکتے۔ اس لئے اسی زمانے میں انھوں نے ڈاکٹ
کو ہدایت کی کہ وہ خفیہ طور پر پیکنگ سے سلسلہ جنبانی کریں۔ ظاہر ہے کہ یہ بڑا مشکل اور پیچ
کام تھا، اس لئے اس معاملہ میں پوری رازداری سے کام لیا گیا، اور اب جبکہ اس چوٹی کانفر
کے انعقاد کی بات طے ہو گئی ہے، عالمی سیاست سے دلچسپی رکھنے والے قیاس آرائیاں کر

واشنگٹن اور یورپ، ایشیا اور افریقہ کی بیشتر راجدھانیوں میں تخمین وظن کا ایک سل
جاری ہے لیکن پیکنگ کے حکمراں ایک شان بے نیازی میں مبتلا نظر آتے ہیں، ڈپلومیسی
اندازیہ بھی ہے۔ اس کے علاوہ چین کی وزارت خارجہ کے افسران اپنی گفتگو میں ان دنوں
زیادہ نرم اور خلیق ہو گئے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ چین بڑا لیکن غریب ملک ہے، چین وہی چاہتا
اس کا ہے، یعنی تیوان (فارموسا)، لیکن وہ اس کے لئے جنگ کا خطرہ نہیں مول لے گا
یہ بھی جانتا ہے کہ جنوب مشرقی ایشیا پر وہ اپنا سماجی اور سیاسی نظام نہیں لاد سکتا۔ اس

پر چین کا یہ محتاط رویہ خود اپنی جگہ اہمیت رکھتا ہے

یہ بات بھی بڑی دلچسپ ہے کہ صدر نکسن کے اعلان سے چند ہی گھنٹے قبل یو، این، او میں حکومت البانیا کے نمائندوں نے، جس کی چین سے بڑی گہری دوستی ہے، ایک تجویز رکھی کہ چین کو اقوام متحدہ کا ممبر بنا لیا جائے اور تیوان کو اس کی رکنیت سے محروم کر دیا جائے۔ البانیا پہلے بھی یہ کر چکا ہے، لیکن اس بار لہجہ ذرا سخت اور بدلا ہوا تھا، اس وجہ سے بعض سیاسی مبصرین کا خیال ہے کہ البانیا کو چین نے مطلع کر دیا تھا کہ صدر نکسن کا اعلان آنے والا ہے۔ البانیا کی اس تجویز کی وجہ سے آئندہ نومبر میں جب اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے سامنے یہ مسئلہ آئے گا، ایک عجیب وغریب صورت حال کے پیش آنے کا امکان ہے۔ یعنی یہ کہ بھاری اکثریت سے اقوام متحدہ میں چین کی شمولیت کا ریزولیوشن منظور ہو گا لیکن وہ اس وقت تک اپنی سیٹ نہیں لے گا جب تک ساتھ ہی یہ ریزولیوشن نہ منظور ہو کہ تیوان کی رکنیت ختم کی جاتی ہے۔

جہاں تک موجودہ صورت حال کا تعلق ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس وقت ہم مشرق بعید میں امریکہ کی پالیسی کو "دو چین" کی پالیسی سے تعبیر کر سکتے ہیں اور اسی بات سے امریکی سیاست کی دو عملی کا پتہ چلتا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ایک طرف وہ پاکستان کی فوج کو مسلح کر رہا ہے اور دوسری طرف آن پناہ گزینوں کے لئے بھی بے چین ہے جو پاکستانی فوج کے مظالم سے بچ کر ہندوستان کا رخ کرتے ہیں۔ بہر حال ستمبر میں جب جنرل اسمبلی کا اجلاس شروع ہو گا، ڈپلومیٹک چالیں بہت پیچیدہ ہوں گی۔ یہ یاد رہے کہ امریکہ میں ایک موثر طبقہ ایسا ہے جو "دو چین" کی پالیسی کے حق میں ہے۔ اسی طرح جاپان نے بھی اپنے طور پر اقوام متحدہ کے ممبروں میں "دو چین" کی پالیسی کو قابل قبول بنانے کے لئے پوری کوشش کی ہے۔ صدر نکسن کی کوشش یہ ہو گی کہ یہ بات پیکنگ بھی مان لے، نظری طور پر نہ سہی، عملی طور پر سہی، لیکن اندازہ ہے کہ انہیں اس میں

کامیابی نہ ہوگی۔

ہمارے ملک میں ایک لابی ایسی ہے جو اس واقعہ سے بہت پریشان ہے۔ وہ امریکہ اور چین کے متوقع قرب کو ہندوستان کے لئے خطرہ تصور کرتی ہے، خاص طور سے اس لئے بھی کہ پاکستان کے چین اور امریکہ سے قریبی تعلقات ہیں، ایک طبقہ وہ ہے جو اس واقعہ کو ہندوستان کی خارجہ پالیسی کی ناکامی سمجھتا ہے۔ ہمارے خیال میں یہ دونوں باتیں انتہا پسندانہ ہیں، ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ آسمانِ سیاست کیا کیا رنگ بدلے۔ اگر امریکہ اور چین کے قریب آنے سے امن عالم کے پائدار قیام کے امکانات روشن ہوتے ہیں تو اصولی طور پر ہمیں خوش ہونا چاہیئے۔ اگر ویٹ نام کا معاملہ طے ہو جاتا ہے اور امریکی فوجی وہاں سے واپس چلے جاتے ہیں تو اس سے ہمیں خوشی ہونی چاہیئے، لیکن ہوشیار رہنا چاہیئے کہ امریکی فوجی ویٹ نام سے نکل کر بنگلہ دیش کو اپنی جولانگاہ نہ بنالیں۔ اس امکان پر بھی غور کرنا چاہیئے کہ باوجود اس کے کہ چین نے ہمیں دھوکا دیا ہے، کیا چین سے ہمارے تعلقات بہتر نہیں ہو سکتے؟ آج کی ڈپلومیسی کی دنیا میں دوستی اور دشمنی کے پیمانے مختلف ہیں، ہاں قومی مفاد کا خیال ہر حال میں مقدم ہے۔

ایرک سٹوکس
تلخیص و ترجمہ : ڈاکٹر ماجد حسین

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی

سہارن پور اور مظفر نگر کے دیہی علاقوں کی بغاوت

(۲)

رامپور پرگنہ بغاوت کے دوران نسبتاً پُرامن رہا۔ اس پرگنہ کے نانوتہ قصبہ کے (جہاں غریب سید اور سود خور بنیے رہتے تھے) عنایت علی خاں نے ستمبر، ۱۸۵۷ء کو ہرا جھنڈا بلند کیا اور تھانہ کو کر کے شاملی کی سرکاری عمارت پر پتھراؤ کیا۔[۱] پرگنہ نکوڑ اور گنگوہ کے مشرق میں واقع پرگنہ رامپور سے ہو کر نہر جمن شرقی گزرتی ہے۔ رامپور کے نہری آبپاشی کے دیہات کے رہنے والے گوجر بھی بہت خوش حال تھے، اگرچہ ان کے پاس کل زیر کاشت آراضی کا صرف ایک تہائی حصہ ہے۔ وین نے رپورٹ کیا کہ ان دیہاتوں میں شرح مالگذاری بہت کم ہے اور ۲۶ فیصدی مالگذاری بڑھانے کی سفارش کی۔ اس حصے میں مہاجنوں کے پاس صرف ۱۰ فیصدی آراضی تھی۔

رامپور کے جنوب مشرق میں کاٹھا کا حصہ ہے جو مشرق میں دیوبند اور شمال میں نانگل تک پھیلا ہوا ہے۔ کاٹھا میں زیادہ تر آبادی پنڈیروں کی ہے۔ ان پنڈیروں پر کبھی بھی سرکار کڑی نظر نہ رکھ سکی۔ پنڈیر ایک خود بین اور جفاکش قوم ہے، جن کی عورتیں بھی راجپوت خواتین کی

۱۔ آر اسپانکی، کمشنر میرٹھ، ۲۲ مارچ ۱۸۵۸ء۔ یوپی، اسٹیٹ آرکائیوز، الہ آباد

طرح کھیتوں میں کام کرتی ہیں۔ پنڈیروں کی ایک پرانی سرکش تاریخ ہے۔ یہ پنڈیر ۱۸۶۰ء میں بھی مشہور مویشی چور تھے۔ پنڈیروں نے اپنے دیہاتوں میں بنیوں اور مہاجنوں کو بسنے اور ٹھہرنے نہ دیا تھا۔

راجپوت قوم میں گوجروں سے بھی زیادہ اتفاق ہے۔ اسی اتحاد کے سبب راجپوت اپنی آراضیات پر قابض رہے۔ اس علاقے میں دیگر ہمعصر برادریوں نے بنیوں اور مہاجنوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تھے لیکن راجپوتوں نے اپنی زمین وجائداد کو بچانے کے لئے تحصیلدار اور پولس کا کئی بار مقابلہ کیا[۱]۔

یہ پنڈیر اس قدر خوفناک تھے کہ ان کے دیوبند پر حملہ کرنے کے باوجود، سرکار نے ان کو سزا نہیں دی، اور ان کو انھیں کے حال پر چھوڑ دیا۔ ان پنڈیر راجپوتوں کی آراضی غیر آبی تھی تاہم کاٹھا کے مغربی حصے کے پنڈیر کافی خوشحال تھے۔ مغربی کاٹھا میں رامپور پرگنہ کا بھی کچھ حصہ شامل ہے۔ رامپور پرگنہ کے مشرق میں ہنڈن ندی کے پاس پنڈیر راجپوتوں کے چند دیہات ہیں ان دیہاتوں کی مٹی نہایت زرخیز ہے اور یہاں پر آبادی بھی گنجان ہے۔ ہنڈن ندی کے پاس دس بارہ گاؤں اور ہیں جہاں کی زمین کم زرخیز ہے لیکن وین کے مطابق ان کے باشندوں کی مالی حالت بھی بہت بہتر تھی۔ ان دیہاتوں کی آراضیات پر بھی ۱۰ فیصدی مالگذاری بڑھائی گئی تھی۔ ہنڈن کے کنارے، ان دیہاتوں میں بنیوں کے پاس صرف ۷ فیصدی اور پنڈیروں کے پاس ۳۴ سے ۷۵ فیصدی تک زمین زیر کاشت تھی۔

اس کے برعکس ہنڈن اور کالی ندی کے درمیان واقع کاٹھا کے حصے کے حالات پرگنہ نکوڑ اور پرگنہ گنگوہ کے بانگر سے مشابہ تھے۔ یہاں فصلوں کے لئے آبپاشی کے ذرائع میسر نہ تھے اور آبادی بھی کم گنجان تھی۔ اس مشرقی کاٹھا کے صرف مغربی حصے میں پنڈیر برادری آباد

۱۔ وین، پیرا ۱۰۵

تھی، جن کے پاس کل زیر کاشت زمین کا ۲۲ فیصدی اور مہاجنوں کے پاس ۸ فیصدی آراضی تھی۔ ۱۸۶۰ء کے بندوبست میں تبدیلی کر کے یہاں کی مالگذاری کی شرح نیچی کی گئی۔ اس کم زرخیز علاقے کے پنڈیروں نے بغاوت کی اور دیوبند پر حملہ آور ہوئے۔ باغیوں کا خاص مرکز بھائلہ کلاں اور بھائلہ خورد تھا۔ ان دیہاتوں میں کاٹا گوت کے پنڈیر زیادہ ہیں (اس گوت کے بھائلہ کے آس پاس ۲۳ گاؤں ہیں) اور ان میں رانگھڑ کمیوٹ داروں کی تعداد بھی خاصی ہے۔ بھائلہ گاؤں سرکاری افسران کی توہین کے لئے مشہور رہا ہے۔ یہیں سے دلیپ سنگھ نے سر اٹھا کر دیوبند قصبہ کی لوٹ مار میں حصہ لیا تھا، جس کو بعد میں انگریزوں نے گرفتار کر کے پھانسی پر لٹکا دیا تھا۔ سرکار کے مطالبہ پر یہاں کے کاشتکاروں نے اپنے اسلحے جمع کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ان کی اس ضد کو دیکھتے ہوئے مجسٹریٹ اسپانکی نے بھائلہ گاؤں کے ایک حصہ کو تباہ کر دیا تھا۔

قصبہ دیوبند پر گوجروں نے بھی حملے کئے۔ ان کے حملہ آور ہونے کے اسباب بھی پنڈیر راجپوتوں جیسے ہی تھے۔ دیوبند کے آس پاس کی زمین نہایت زرخیز ہے۔ یہ زرخیز زمین مسلمان گوجر اور شیوخ حضرات کے ہاتھ میں تھی، جو خاصے خوشحال تھے۔ البتہ یہ شیوخ خود کاشت نہ کر کے اپنی زمین کاشتکاروں کو لگان پر دیا کرتے تھے۔ اس بڑے قصبے کے چاروں طرف مہاجنوں کی آراضیات کاشتکاروں کے مقابلے میں زیادہ ہو گئی تھی جو کل آراضی کا تقریباً ۱۴ فیصدی تھا۔ دیوبند قصبہ میں تاجر پیشہ اور دولتمند لوگوں کی موجودگی نے یقیناً گوجروں کو لوٹ مار کرنے پر اکسایا تھا۔ لیکن قابل غور امر یہ ہے کہ جن گوجروں نے دیوبند پر چڑھائی کی وہ دیوبند کے آس پاس کے زرخیز دیہاتوں کے رہنے والے نہیں تھے بلکہ مئی ۱۸۵۷ء سے پہلے دورہ پر رابرٹسن نے باغیوں کو سزا دینے کے لئے بھاؤپور، سانپلہ بقال، فتح پور (موجودہ فتح گڈھ سانپلہ ڈیرہ) اور جولائی کے آخر میں اپنے دوسرے دورہ پر چھوٹا سانپلہ (سانپلہ کھتری) نبہیڑہ خاص، دگچارہ، صالحاپور اور مالکی کے دیہاتوں سے باغیوں کی فہرست تیار کی تھی۔

مذکورہ دیہاتوں کی مٹی ریتیلی ہے جس پر شرح مالگذاری اونچی تھی، علاوہ ازیں یہاں پر مہاجنوں کے پاس صرف ، فیصدی آراضی تھی[1]۔ ان دیہاتوں کے شمال میں مانک پور مشہور بستی ہے۔ مانکپور گاؤں پرگنہ بھگوانپور کے جنوبی حصے میں کالی ندی کے کنارے واقع ہے، جس کی شرح مالگذاری وین کے مطابق بہت اونچی تھی[2]۔ اس گاؤں میں مہاجنوں کے پاس ۱۲ فیصدی آراضی تھی۔ مانک پور کے امراؤ سنگھ گوجر نے خود کو اس علاقہ کا راجہ بنالیا، اور سرکار کے خلاف باغیوں کا ایک زبردست محاذ تیار کرلیا تھا۔

۱۸۵۷ء کی بغاوت کے لئے ان اضلاع کے بنئے اور مہاجن بہت حد تک ذمہ دار ہیں، لیکن ان کے رول کا تعین کرنا بہت مشکل ہے۔ ۱۸۶۰ء میں مہاجن لوگ کل آراضی کے ۱۸ فیصدی پر قابض تھے لیکن ان کے پاس زیادہ تر آراضی ۱۸۵۷ء سے پہلے آچکی تھی۔ ان مہاجنوں کے پاس سب سے پہلے امیر و خوشحال زمینداروں کی جائدادیں پہنچیں۔ ۱۸۵۷ء کے گزٹ میں امراء کے بارے میں درج ہے کہ ان لوگوں کی مالی حالت خراب ہو چکی تھی اور اثر زائل ہو چکا تھا۔ چند ہی خاندان تھے جن کے پاس ایسی زمین بچ رہی تھی جو مہاجنوں کے یہاں گروی نہ رکھی گئی ہو۔ مہاجنوں کا کاشتکاروں پر زبردست تسلط ہو گیا تھا۔ شمال مغربی صوبہ کے کاشتکاروں کی بگڑتی ہوئی حالت کو دیکھکر سرکار نے ۱۸۵۲ء میں ایک تحقیقاتی کمیٹی کی تشکیل کی تھی۔ ضلع سہارنپور کے کلکٹر مسٹر راس نے خصوصی توجہ دلائی کہ کاشتکاروں کے خلاف غلط رقعے اور غلط قرضے کے کاغذات کی وجہ سے ان کی زمین پر مہاجن قابض ہوتے جارہے ہیں اور اس کے خلاف کاشتکاروں میں زبردست غم و غصہ پایا جاتا ہے۔ ۱۸۶۰ء میں رابرٹسن اور وین نے سرکار کو دھیان دلایا کہ کاشتکاروں کے دشمن وہ مہاجن اور بنئے ہیں جو قصبات میں رہتے ہیں اور ان کی زمین کو

۱۔ وین کی رپورٹ، پیرا ۳۶—۱۲۴

۲۔ ایضاً پیرا ۱۴۰

نیلام کرانے کے لئے جھوٹے کاغذات تیار کرتے ہیں۔ کچھ عرصہ بعد جی، ولیم نے انکشاف کیا کہ سہارنپور اور مظفر نگر کے کاشتکار مہاجنوں کی رعایا بنتے جا رہے ہیں[1]۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ گوجر اور راجپوت برادریوں نے مہاجنوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا، ان کو لوٹا مارا اور اپنی آراضی کی قیمت اور زمین کے نیلام کی شرح اونچی کرانے میں کامیابی حاصل کی۔ ۱۸۶۳ء میں والنس اگینیو نے سب سے پہلے اس بات پر توجہ دلائی کہ زمین کی قیمت ضلع کے ان حصوں میں سب سے زیادہ ہے جہاں مالگذاری کی شرح کم ہے ـــــ مذکورہ بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ۱۸۵۷ء میں کاشتکاروں کی بغاوت ان دیہاتوں سے شروع ہوئی جہاں مہاجنوں کا اثر کم تھا اور زمین پر شرح مالگذاری اونچی تھی۔ علاوہ ازیں کاشت میں پچھڑے ہوئے غیر آبی علاقے بغاوت میں پیش پیش رہے۔

یہ کہنا غلط ہوگا کہ کاشتکاروں کا بدلتے ہوئے حالات سے مطابقت پیدا نہ کرنا (مثلاً گنے کی کاشت نہ کرنا) بغاوت کی سب سے بڑی وجہ رہی ہے۔ ضلع سہارنپور کے جنوب میں واقع مظفر نگر اور میرٹھ اضلاع سے ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ نہر جمن شرقی سے آبیار ہونے والے جاٹ برادری کے نہایت خوش حال دیہات بھی سرغنہ گوجروں کے مقابلے میں زیادہ باغی تھے۔

بہترین کاشتکار ہونے کے باوجود، مظفر نگر ضلع کے مغربی حصے میں جاٹ برادری کی کچھ آراضی غدر سے پہلے نیلام ہو کر مہاجنوں کے قبضے میں آگئی تھی۔ مظفر نگر کے مشرقی حصے میں سیدوں کی زمینداری تھی۔ سیدوں کے علاقے میں مہاجنوں کا بہت زیادہ اثر تھا اور سیدوں کی زیادہ تر زمین بنیوں کے پاس پہنچ چکی تھی، تاہم اس حصے میں سید برادری آزادی کی جنگ کے وقت خاموش رہی۔ مہاجنوں سے کاشتکاروں کا بغض مظفر نگر میں بھی بغاوت کا خاص سبب بنا۔ لیکن یہاں کے جاٹوں پر تعزیری ٹیکس لگا کر باغیوں کو دبا لیا گیا تھا۔ ۱۸۴۰-۴۱ء کے بندوبست میں

۱۔ گزیٹیر، شمالی مغربی صوبہ، جلد دوم، حصہ اول، صفحہ ۲۲۷

جاٹ برادری کی شرح مالگذاری اونچی کردی گئی تھی، جس کا اصل مقصد قصبہ شاملی، بوڑھانہ کاندھلہ اور شکارپور کے جاٹ کاشتکاروں کو دبانا تھا۔ لیکن جاٹوں نے اپنے نمایاں فنِ کاشت سے پیداوار کو اتنا بڑھایا کہ ٹیکس اور اونچی شرح مالگذاری کو برداشت کرسکیں۔ دوسری اقوام کے مقابلہ میں جاٹوں پر اونچی شرح مالگذاری اور تعزیری ٹیکس کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ ضلع مظفرنگر کے مشرقی حصہ کے زرخیز پرگنوں (کھتولی اور جانسٹھ) میں شرح مالگذاری جاٹوں کے مقابلے میں بہت کم تھی[1]۔ پرگنہ کھتولی اور جانسٹھ کے چند جاٹ خاندان خوشحال ہو رہے تھے۔ ۶۱-۱۸۶۰ء کے بندوبست میں امن پسندی کے سبب اس حصہ کے جاٹوں کو خاص طور سے فائدہ پہنچا تھا[2]۔ دوسرے اس حصہ میں جاٹ زمیندار کم تھے اور زیادہ تر جاٹ کاشتکار تھے جن کو سستے لگان پر زمین جوتنے کو مل جاتی تھی[3]۔ ۱۸۴۰ء تک مغربی مظفرنگر کی تقریباً پوری قابل کاشت زمین جتائی میں آچکی تھی[4]۔ اس طرح مظفرنگر کے جاٹوں کی بغاوت کی وجہ مہاجنوں کا زمین پر قبضہ نہیں بلکہ ذرائع آبپاشی اور پیداوار میں فرق معلوم ہوتا ہے۔ اس علاقے میں بغاوت کی سب سے بڑی وجہ بھاری مالگذاری کا وزن تھا جس کو کاشتکار اٹھانے میں دشواری محسوس

۱۔ شرح مالگذاری فی ایکڑ:

		روپیہ	آنہ	پائی
	کاندھلہ	۲	۴	۸
	بوڑھانہ	۲	۳	۷
	شاملی	۲	۱۰	۰
	شکارپور	۲	۶	۷
	کھتولی	۱	۱۱	۶
	جانسٹھ	۱	۴	۶
	مظفرنگر	۱	۸	۲

۲۔ گزیٹیر، شمالی مغربی صوبہ، جلد سوئم۔ حصہ ۲ (۱۸۷۶) صفحہ ۵۵۴

۳۔ رپورٹ علاقہ نہر گنگ ــــ ، صفحہ ۱۲

۴۔ ایس، این، مارٹن، بندوبست رپورٹ مظفرنگر (الہ آباد ۱۸۷۳)

کر رہے تھے۔ اس طرح یہاں مہاجن اور سرکار دونوں ہی کاشتکاروں کی بغاوت کے لئے ذمہ دار ٹھہرائے جاسکتے ہیں اور یہ طے کرنا مشکل ہے کہ بنیوں کی ذمہ داری کس حد تک ہے۔ علاوہ ازیں دیہاتوں کی اس بغاوت کو خالص معاشی پیمانے پر نہیں ناپا جاسکتا۔ دیہاتیوں کی جائداد کا ان کے ہاتھ سے نکلنا، ان کے اقتدار کو خطرہ اور ان کے اتحاد اور تنظیمی صلاحیت کا بھی بغاوت میں بڑا دخل رہا ہے[1]۔ مثال کے طور پر منظم گوجروں کے لئے ان کی آراضی کا صرف ۱۰ فیصدی حصہ بنیوں کے پاس پہنچنا، اشتعال پیدا کرنے اور بغاوت کرنے کے لئے کافی تھا جبکہ غیر منظم سیدوں کی ۶۰ فیصدی جائداد مہاجنوں کے پاس پہنچ گئی تھی اور وہ باغی نہ ہو کر خاموش بیٹھے رہے تھے۔ یہاں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اگرچہ دیہاتیوں کی آراضیات نیلام ہو کر بنیوں اور مہاجنوں کے پاس پہنچی تھیں لیکن ان کا غم و غصہ سرکار کے تئیں ہوتا تھا۔ معاشی دشواریوں کے سبب یہ دیہاتی ہر جگہ سرکار سے براہ راست ٹکر نہ لے کر مہاجنوں کی لوٹ مار کرنا اپنا مقصد بنا لیتے تھے۔

تحصیل میرٹھ کے مشرقی پرگنوں میں زمینداروں کے پاس زیادہ جائداد تھی۔ سرکاری عدالتوں کے ذریعہ مہاجنوں کو زمین نیلام کرانے کی سہولت اس حصے میں بغاوت کی بڑی وجہ بنی تھی۔ ایلن کیڈل نے ۱۸۷۰ء کے سیدوں کے بارے میں تحریر کیا ہے کہ اگرچہ ان میں سے زیادہ تر لوگوں کی جائداد ۱۸۰۶ تا ۱۸۴۰ء کے دوران مہاجنوں کے قبضے میں آگئی، تاہم چند ایسے با اثر سید جو سرکاری ملازمتوں میں تھے انھوں نے اپنی آراضی میں زبردست اضافہ کیا۔ مثال کے طور پر جانسٹھ کے سید حسین علی خاں اور سنبھلیڑہ کے ان کے بھتیجے سید امیر حسن اور جولی کے سید غلام حسن نے بڑی جائدادیں خریدیں[1]۔ ان حضرات کو اپنی آراضیات میں اضافہ کرنے کا موقع صرف اس لئے ملا کہ یہ سرکاری ملازم تھے۔ ۱۸۵۷ء میں حسین علی خاں (ایک بڑے زمیندار کے بیٹے)

۱۔ پی، سی، پردھان، شمالی ہند کے جاٹوں کی سیاسی تنظیم (دہلی ۱۹۶۱ء)، صفحات ۹ ـ ۱۰۷

۲۔ اے، کیڈل، مظفر نگر ضلع کے شہر گنگ کے علاقے پر بندوبستی رپورٹ (الہ آباد، ۱۸۵۷)، پیرا ۵۹، صفحہ ۵۳۔

خورجہ کے تحصیلدار تھے۔ میرنپور کے سید فاضل حسین تحصیل ہاپوڑ کے تحصیلدار تھے اور امداد حسین مظفرنگر تحصیل میں تحصیلداری کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ ان سب نے مل کر اپنے اثر سے اپنے سید بھائیوں کو بغاوت میں شریک ہونے سے روکا[1]۔ ایسے ہی کرنال کے راجپوت نواب بھی تھے جنھوں نے سیدوں کی بہت سی جائداد حاصل کرلی تھی۔ کرنال کے نواب نے بھی سرکار کی زبردست حمایت کی تھی۔

ضلع سہارنپور میں بڑی جائداد مہاجنوں ہی کے پاس تھی۔ اس ضلع کے مشرقی حصہ میں گوجروں کا اقتدار تھا اور وہی مالگذاری (مقرری) وصول کرتے تھے۔ سرکار کسی طرح سے اس حصے سے گوجروں کے اقتدار کو ختم کرنے کی سوچ رہی تھی۔ گوجروں کو ایک بڑی جائداد اس حصہ میں وراثت میں راجہ رام دیال سے ملی تھی۔ اس جائداد میں سب سے پہلے لنڈھورہ ریاست کی حدود قائم کی گئیں، جس میں ۵۰۵ گاؤں اور ۳۱ پوروہ شامل تھے۔ کچھ عرصے بعد لنڈھورہ ریاست کو بھی ٹکڑوں میں تقسیم کردیا گیا تھا اور آخر میں اس ریاست میں صرف ۳۸ گاؤں بچ رہے تھے، جو ایک معمولی راجہ رگھوبیر سنگھ کے تحت میں تھے۔ اس ریاست کے زیادہ تر دیہات سرکار نے ریاست لنڈھورہ کے راجہ کے چچا پردھان صاحب سنگھ کی تحویل میں دے دئے تھے، جس نے ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کی زبردست حمایت کی[2]۔ اگرچہ ریاست لنڈھورہ کے راجہ کو انگریزوں کے خلاف بغاوت کرنی چاہئے تھی مگر یہ ریاست اتنی مختصر ہوچکی تھی کہ یہ خود انگریزوں کی پروردہ ہوگئی تھی اور اس ریاست کے توسط سے بہت سے زمیندار سرکار کی حمایت کرنے لگے تھے ریاست لنڈھورہ کے زیادہ تر دیہات پرگنہ منگلور میں واقع تھے، جہاں پر ۱۸۶۸ء تک

۱۔ آر، ایم، ایڈورڈ، ۳ر اپریل ۱۸۵۸ء، یو۔پی آرکائیوز، الہ آباد

۲۔ جے، وانس اگیٹیو بنام الیف، ولیم، ۲۸ر جنوری ۱۸۶۳ء، پیرا ۵۔۴۴، اور سہارنپور بندوبست رپورٹ ۱۸۷۱، صفحہ ۱۷

گوجروں کے پاس اس پرگنہ کی کل آراضی کا ۴۸ فیصدی تھا۔ پدھان صاحب کے توسط سے اس ریاست کے کل وسائل مجسٹریٹ کو میسّر رہے اور گوجر ہونے کے ناتے اثر ڈال کر راجہ نے اپنی برادری کے معزز اور بااثر عناصر کو سر اٹھانے سے باز رکھا۔ پدھان صاحب سنگھ کے سرکار کے ساتھ سازباز کا اور بھی زیادہ انکشاف اس وقت ہوا جب اگست ۱۸۵۷ء میں تھانہ بھون (مظفرنگر) میں لوٹ مار شروع ہوئی اور پدھان صاحب تقریباً تین سو اشخاص اور کچھ چھوٹی بندوقیں ساتھ لے کر رامپور پہنچے تاکہ ضلع مظفرنگر کے باغی رامپور (ضلع سہارنپور) پر حملہ نہ کرسکیں۔

ضلع سہارنپور کے جنوب مغربی حصے میں سیاسی حالات بہت مختلف تھے۔ یہاں کے باتر گوجروں (جن کا گوت لنڈھورہ کے گوجروں سے مختلف ہے) مسلمان گوجروں، ترک اور شیوخ کے ساتھ مل گئے تھے، ان کے جنوب میں واقع کنڈہ کلاں رانگھڑوں اور راجپوتوں کے باغیوں کا علاقہ تھا۔ پرگنہ گنگوہ میں مسلمانوں کی مالی حالت بہت خراب ہوچکی تھی اور وہ مفلسی میں مبتلا تھے۔ جس سے فرقہ وارانہ انتہاپسندی اور سیاسی خلفشار کو تقویت پہنچی۔ لکھنوتی میں شیعہ ترک آباد تھے۔ گنگوہ میں ان شیوخ کی آبادی تھی جو پیرزادے کہلاتے ہیں۔ ۱۸۶۰ء میں جب وین نے گنگوہ کا دورہ کیا تو اس کو حیرت ہوئی کہ گنگوہ کے شیوخ اور پیرزادے زندہ کیسے ہیں؟ کیونکہ ان کی جائداد بکھر چکی تھی اور ہاتھ سے کام کرنے کی ان کو عادت نہ تھی۔ اس نے گنگوہ کو وہابیوں کا گڑھ بتایا۔ بہرکیف امبیٹھ کے پیرزادگان کا معیار زندگی بہتر تھا۔ ان کی خوش حالی کا راز ان کے جدِامجد شاہ ابوالمعالی (رحمۃ اللہ علیہ) کا شاندار مقبرہ تھا جس کی زیارت کے لئے ہر سال بڑی تعداد میں عقیدتمند آتے تھے اور اس سے پیرزادوں کو بڑی آمدنی ہوجاتی تھی۔ اس آمدنی کے باوجود وین نے ان کو مقروض پایا اور اسپانکی اور رابرٹسن کو پورا یقین تھا کہ بھوٹ کے مہاجنوں پر حملہ کرنے کے لئے انھوں نے ہی گوجروں کو اکسایا تھا۔ گنگوہ اور لکھنوتی کی مسلم آبادی نے کنڈہ کلاں کے رانگھڑوں کو بھی اسی طرح

بغاوت پر آمادہ کر رکھا تھا۔ یہ رانگھڑ بھی گنگوہ اور نکھنوتی پر حملہ کرنے کا منصوبہ تیار کر رہے تھے۔
اس طرح ایسے ثبوت موجود ہیں جن سے انگریزوں کے خلاف ایک منظم جہاد کا پتہ چلتا ہے۔ دارالعلوم دیوبند کی بنیاد ہی انگریزوں کی مخالفت پر رکھی گئی تھی، جس کی تنظیم مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی نے تھانہ بھون کے سرکش باغیوں سے مل کر کی تھی[1]۔ یہ کہنا درست نہیں ہے کہ سب ہی مسلمان بغاوت میں شریک تھے۔ لوہاری اور جلال آباد کے مسلمان راجپوتوں نے تھانہ بھون کے باغیوں کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ شاملی میں باغی مسلمانوں نے اپنے مسلمان بھائیوں کو مسجدوں تک میں گھس کر بے رحمی سے قتل کیا[2]۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی شروع ہونے تک تھانہ بھون کی بغاوت اور شاملی کی لوٹ مار میں بھی مسلمان راجپوت گوجروں کے ساتھ نہ تھے اور اس طرح جنوب کی طرف سے آنے والے باغی جاٹ اور سہارنپور کے سرکش گوجروں کے درمیان یہ مسلمان راجپوت حائل رہے۔ ۱۸۵۷ء میں جب دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہوا تو سب ہی باغیوں کی نقل و حرکت پر قابو پا لیا گیا اور دوآبے کے اس علاقے میں باغی جلد ہی ہمت ہار بیٹھے۔

مذکورہ تجزیہ سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ جن حصوں میں زمین کی ادل بدل ہوتی رہی وہاں مہاجنوں کی جائداد میں اضافہ ہوا۔ تنزل پذیر اقوام میں سے سرکار کی حمایت کرنے والے بھی زیادہ جائداد حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔ مثال کے طور پر سید حضرات سرکاری ملازمتوں میں کافی تھے اور نیلامی کے وقت یہ سرکاری ملازم نیلام اپنے نام چھڑا لیتے تھے[3]۔ سرکاری ملازمین کا یہ طبقہ اپنی غریب برادری پر اثر پذیر رہا۔ زیادہ تر مسلمان زمینداروں میں سرکار کی مخالفت یا موافقت کا

۱۔ ضیاء الحسن فاروقی، دی دیوبند اسکول اینڈ دی ڈیمانڈ فار پاکستان (بمبئی، ۱۹۶۳) صفحات ۲۱-۲۰

۲۔ آر، ایم، ایڈورڈ، مجسٹریٹ بنام الف، ولیمس، ۳ر اپریل ۱۸۵۸ء

۳۔ رپورٹ علاقہ مظفر نگر، پیرا ۲۳-۲۱، صفحہ ۹۸

انحصار ان کی داخلی سیاست پر تھا۔ سیدوں کے بگڑتے ہوئے اقتصادی حالات کے باوجود ان میں سرکار کا پروردہ ایک طبقہ ابھر رہا تھا۔ لیکن مظفر نگر ضلع کے مغربی حصہ میں شیوخ، بلوچ، افغان اور سیدوں میں ایسی شخصیات نہ ابھر سکیں[1]۔ یہاں کے مسلمان زمینداروں نے (جو غریب گوجروں اور رانگھڑوں کے درمیان رہتے تھے) بغاوت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ کاشتکاروں میں بغاوت کی بڑی وجہ اونچی شرح مالگذاری معلوم ہوتی ہے لیکن یہی وجہ مسلمان زمینداروں کے متعلق نہیں کہی جا سکتی کیونکہ زیادہ تر مسلمان زمینداروں (خاص طور سے تھانہ بھون میں) کے پاس معافی زمین تھی۔ یہاں پر قرض، جائداد کا وارثان کے درمیان تقسیم ہو کر ٹکڑے ٹکڑے ہونا اور کم پیداوار، ایسی وجوہات معلوم ہوتی ہیں جن کے سبب ان میں مہاجنوں اور سرکار کے خلاف نفرت پیدا ہو گئی تھی۔

جاٹ برادری کے داخلی اختلاف کا بھی ان کی باغیانہ سرگرمیوں پر زبردست اثر پڑا۔ مظفر نگر کے مشرقی حصے میں جاٹ ایک خوش حال برادری تھی اور ۱۸۵۴ء میں نہر گنگ کے جاری ہو جانے سے یہاں بھی گورنمنٹ کی حمایت کرنے والا طبقہ پیدا ہو گیا تھا۔ کیڈل کے وقت تک مظفر نگر اور کھتولی کے جاٹوں میں بہت سے خاندان خوش حال ہو چکے تھے، جن کے پاس مجموعی طور پر نہر گنگ کی آبپاشی کے علاقے تھے۔ اس بات کی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ ان خوش حال جاٹ خاندانوں نے اپنی برادری کو سرکار کے خلاف بغاوت کرنے سے روکا لیکن

۱۔ مجسٹریٹ ایڈورڈ نے منصور علی خاں اور ان کے بیٹے محمد علی (جو بعد میں تھانہ بھون کے تحصیلدار مقرر ہوئے) کی خدمات کا شکریہ ادا کیا کیونکہ انھوں نے جلال آباد کے دیگر رؤساء کو بغاوت میں حصہ لینے سے روکا تھا اور اس بغاوت پر قابو پانے کے لئے سرکار کی مدد کی تھی۔ لوہاری کے رہنے والے سعادت اللہ خاں آفریدی جس کا بھتیجا احمد علی خاں باغی ہو گیا تھا اس نے بھی سرکار کی مدد کی۔ ایڈورڈ بنام ولیمس، یکم ستمبر ۱۸۵۸ء۔

جنوب کی طرف میرٹھ اور بلند شہر میں خوش حال جاٹ افراد نے اپنی برادری کو بغاوت کرنے سے باز رکھا۔ اس سے زیادہ تضاد اور کیا ہو سکتا ہے کہ میرٹھ کے مغربی حصہ میں جاٹ برادری نے بے رحمی سے بنیوں کی خونریزی کی اور مشرقی میرٹھ اور ضلع بلند شہر میں وہ انگریزوں کے وفادار بنے رہے۔ اس تضاد کی سب سے معقول وجہ مالگذاری کی شرح میں فرق کے علاوہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ میرٹھ کے مغربی حصے میں جاٹ قوم کی برادری کی تنظیم مضبوط تھی، جبکہ میرٹھ کے مشرقی حصے میں وہ زمینداروں کے کاشتکار تھے جن میں گلاب سنگھ جاٹ کی آبائی جائداد بہت بڑی تھی اور کچیسر کا جاٹ راجہ گورنمنٹ کا بڑا وفادار تھا۔ لیکن مشرقی اور مغربی میرٹھ کے جاٹوں کے متضاد کردار میں مہاجنوں کا شاید ہی کوئی دخل رہا ہو۔ یہاں بغاوت میں مہاجنوں کا رول برائے نام معلوم ہوتا ہے۔

غلام ربانی

اجنتا کا تحفظ

ہمارے ملک میں پہاڑوں میں تراشے ہوئے مندروں کی کمی نہیں۔ اب تک کوئی ایک ہزار معلوم ہو چکے ہیں۔ اس خصوص میں دنیا کا کوئی خطہ مہاراشٹر کا مقابلہ نہیں کر سکتا، یہاں اورنگ آباد، ایلورہ، پٹیل کھورا، ناسک، کارلا، جماجا، الی فنٹا وغیرہ مقامات پر بہت سے خوبصورت مندر موجود ہیں۔ ان میں غارہائے اجنتا کی شان نرالی ہے۔ یہ مقام سنگ تراشی، بت تراشی، نقاشی اور آرکی ٹکچر کے اعلیٰ نمونوں کا خزانہ ہے۔ کوئی شخص اجنتا کو دیکھ لے تو سمجھ لینا چاہئے کہ اس نے اس قسم کے سارے مندر دیکھ لئے۔

اس بندۂ خدا کے انتخاب کی داد دینی پڑتی ہے جس نے گیان دھیان کے لئے یہ وادی پسند کی۔ دو متوازی پہاڑ دور تک بل کھاتے چلے گئے ہیں ان کے درمیان ندی بہتی ہے، جس مقام پر یہ دونوں پہاڑ ملے ہیں، وہاں ایک آبشار ہے۔ اسی جگہ بدھ مت کے پیروؤں نے اپنے عبادت خانے اور خانقاہیں تراشی ہیں۔ سرسبز پہاڑ، پانی کی روانی، سبزہ کی فراوانی، پھولوں کی رنگینی، آبشار کا ترنم، کوئل کی کوک، موروں کی جھنکار نے وہ سماں پیدا کر دیا ہے کہ انسان خواہ مخواہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہ منظر اتنا دلکش ہے کہ صرف اس کو دیکھنے کے لئے انسان سفر اختیار کر سکتا ہے۔

بُدھ مت کے یہ غار دوسری صدی قبل مسیح کی یادگار ہیں۔ اس مذہب کی اٹھان اچھی رہی۔ مہاتما بُدھ کی تعلیم سیدھی سادی تھی جو لوگوں کے دلوں پر اثر کرتی تھی۔ اشوکِ اعظم

کے عہد میں اس مذہب کو فروغ ہوا۔ راجا اور پرجا بودھی عقیدہ کے ہوگئے۔ یہ سب کچھ ہوا مگر ساتویں صدی میں یہ مذہب بلبلے کی طرح بیٹھ گیا، ہندوستان کے مورخ اس باب میں کچھ زیادہ نہیں لکھتے کہ آخر اتنا بڑا مذہب یکایک ہندوستان سے کس طرح غائب ہوگیا۔ ان کے عبادت خانے اور خانقاہیں ویران ہوگئیں۔ غارہائے اجنتا کا بھی یہی حال ہوا۔ یہاں کے مندر تیرہ سو برس تک گمنامی کی حالت میں پڑے رہے، اس طویل مدت میں ان غاروں کی حالت ناگفتہ بہ ہوگئی۔

راقم نے پہلی بار ۱۹۱۶ء میں ان غاروں کو دیکھا تھا۔ اس وقت یہ کیفیت تھی کہ جگہ جگہ چھتوں میں شگاف تھے جن سے پانی رستا تھا۔ بعض غاروں میں ٹخنے ٹخنے پانی کھڑا تھا۔ نمی کی وجہ سے دیواروں کے نچلے حصے اور ستونوں کے پائے گل گئے تھے۔ بعض ستون غائب ہوگئے تھے۔ سب سے زیادہ نقصان ان تصویروں کو پہونچا جن سے یہاں کی دیواریں، چھتیں اور ستون لپے ہوئے تھے۔ موسمی اثرات سے تصویریں بوسیدہ ہوکر جھڑ رہی تھیں۔ پلاسٹر اس قدر خستہ ہوگیا تھا کہ ہاتھ لگانے سے تصویریں ریزہ ریزہ ہوئی جارہی تھیں۔ سیلانی جو یہاں آتے تھے، ان پر اپنے نام لکھ دیتے تھے جس سے تصویریں چھل جاتی تھیں۔ ان کی دیکھ بھال کا کوئی معقول انتظام نہیں تھا۔ ان تصویروں کی قدر و قیمت کا اندازہ یوں لگایا جاسکتا ہے کہ کپتان ولیمس کسی تصویر کا ایک انچ مربع ٹکڑا کھرچ کر انگلستان لے گیا، جو لندن میں ایک ہزار پونڈ میں نیلام ہوا۔ اس وقت یہ ٹکڑا بوسٹن (امریکہ) کے عجائب خانے میں موجود ہے۔

غرض اجنتا کی نقاشی تباہی کے کنارے آلگی تھی، اب اسے مہاتما بودھ کا چمتکار سمجھیے یا کچھ اور کہ عین اس وقت حکومت حیدرآباد کو ان غاروں کے تحفظ کا خیال پیدا ہوا، اس وقت یہاں کے سررشتہ آثار قدیمہ کو قائم ہوئے دو سال ہوئے تھے، ڈاکٹر غلام یزدانی اس کے ناظم تھے۔ انھوں نے غاروں کے تحفظ کے سلسلہ میں بڑی سرگرمی دکھائی۔ چھتوں میں جو دراڑیں پیدا ہوگئی تھیں ان کو گرڈنگ مشین کے ذریعہ پُر کر دیا گیا۔ ستونوں کے پایوں کی مرمت

کرائی اور جہاں جہاں وہ گر گئے تھے جدید ستون تعمیر کیے گئے۔ چھتوں پر سے جو پانی بہ کر آتا تھا۔ نالیوں کے ذریعہ اس کے بہاؤ کا رخ بدل دیا گیا۔ طوفانی بارش میں بڑے بڑے پتھر لڑھک کر نیچے آ گرتے تھے جس سے برآمدوں اور اُن کے ستونوں کو نقصان پہونچتا تھا۔ ان بڑے پتھروں کو توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا۔ تصویروں کی درستی کا معاملہ بہت ٹیڑھا تھا ان کے تحفظ پر حکومت حیدرآباد نے جس دریا دلی سے خرچ کیا اس کی نظیر دوسری جگہ مشکل سے ملے گی۔ ڈاکٹر یزدانی نے سرجان مارشل (ڈائرکٹر جنرل آف آرکیالوجی) سے مشورہ کیا اور طے پایا کہ اٹلی سے ماہر بلائے جائیں۔ اس سلسلہ میں لارڈ کرزن نے بھی مدد کی۔ ان کی کوششوں سے روم کے برطانوی سفیر نے پروفیسر چکوِنی اور کونٹ ارسِنی کو اجنتا روانہ کیا۔ ان دونوں ماہروں کی تنخواہ ہزار ہزار پونڈ ماہانہ تھی۔ اس کے علاوہ روم سے اجنتا تک آمد و رفت کے اخراجات حکومت حیدرآباد کے ذمہ تھے۔ اجنتا میں ان کے ٹھہرنے اور کھانے پینے کا انتظام کیا گیا۔ ان کی روحانی غذا کا بھی انتظام کیا گیا جس کے لئے ایک پادری اتوار کو سروس کرانے آتا تھا۔

یہ دونوں اطالوی دیواری تصویریں جوڑنے کا تجربہ رکھتے تھے۔ انہوں نے ایک کیمیائی مرکب تیار کیا جو تحفظ کے کام میں بہت کامیاب ثابت ہوا۔ نوعیت کے لحاظ سے جن طریقوں پر کام کیا گیا وہ یہ ہیں:

۱۔ نقاشی کے جو حصے سطح سے ابھر آئے تھے ان کو مسالے سے جمانا۔

۲۔ تصویروں میں جہاں جہاں خلا پڑ گئے تھے ان کے کناروں کو مسالے سے محفوظ کرنا۔

۳۔ کیڑے جابجا تصویروں میں گھر بنا رہے تھے ان کو ختم کیا گیا۔

۴۔ ان غاروں میں عرصہ دراز تک جوگی اور سنیاسی بھی رہے تھے، ان کے رہنے سے گرد اور دھوئیں کی تہ تصویروں پر جم گئی تھی، اس کو صاف کیا گیا۔

۵۔ صدیوں سے چمگادڑوں کی بیٹیں تصویروں پر جم گئی تھیں ان کو ایک خاص قسم کے مرکب

سے دھویا گیا۔

ان اطالوی ماہروں نے غاروں میں دو موسم سرما گزارے، اس دوران میں انھوں نے ایک کام یہ بھی کیا کہ سررشتہ کے دو آدمیوں کو تصویریں جمانے کا طریقہ سکھا دیا۔ چنانچہ جب یہ اطالوی چلے گئے تو محکمہ نے اس کام کو سالہا سال تک جاری رکھا اور تصویروں کا تحفظ اس خوبی سے کیا کہ ان میں نئی جان پڑ گئی۔ گرد کی تہ کو اس طرح صاف کیا کہ رنگ کھل اٹھے۔

چٹانوں پر دو ہزار برس تک تصویروں کا قائم رہنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اس کی سطح اس طرح تیار کی جاتی تھی کہ چٹان کو کھردرا کر کے اس پر گلاوا پھیر دیا جاتا تھا۔ اس گلاوے میں مٹی، گوبر، دھان کا بھوسا اور دوسرے نباتی ریشے ہوتے تھے۔ اس پر مہین چونے کی تہ جمادی جاتی تھی۔ اس طرح زمین تیار ہونے کے بعد اس پر تصویر کا خاکہ بنایا جاتا اور پھر رنگ آمیزی کی جاتی۔

آج کل واٹر کلر ہو یا روغنی تصویر، رنگوں کے لحاظ سے زیادہ پختہ نہیں ہوتیں پچاس ساٹھ سال میں اس کے رنگ مدھم ہو جاتے ہیں۔ غارہائے اجنتا کی تصویریں ہزاروں موسموں کا مقابلہ کر چکی ہیں مگر ان کے رنگوں میں چمک باقی ہے۔ سفیدہ، کاجل، گیرو، پیلی مٹی، ہری مٹی اور ہار سنگار کے پھول اس وادی میں موجود ہیں انہی سے یہ نقاشی کی جاتی تھی۔

ہر چند تصویروں کو محفوظ کر دیا گیا ہے مگر زمانہ بہت بے رحم ہے۔ کون جانتا ہے کہ یہ تصویریں کب تک باقی رہیں گی۔ اس لئے سررشتہ نے یہاں کی تمام تصویروں کی نقلیں تیار کرالی ہیں۔ اور ایک بڑا کام یہ کیا کہ حکومت نے غارہائے اجنتا پر ڈاکٹر یزدانی سے کتاب لکھوائی جس پر دو لاکھ کے اخراجات ہوئے۔ اس معرکۃ الآرا کتاب نے دنیائے فن میں ایک ہنگامہ پیدا کر دیا۔ ہندوستان کے علمی رسالوں کے علاوہ لندن کے برلنگٹن میگزین، لندن ٹائمز، انڈین انٹی کیوری اور نیو یارک ٹائمز نے اس کتاب پر جو تبصرے کئے ہیں وہ حکومت حیدرآباد کی تعریف میں قصیدے ہیں اور بعض رسالوں نے تحفظ کے کام پر اعلیٰ حضرت حضور نظام

کا شکریہ ادا کیا ہے۔

ڈاکٹر یزدانی کی یہ کتاب لنڈن اور نیویارک کی نمائشوں میں رکھی جاتی ہے۔ کسی ہندوستانی کتاب کو یہ عزت شاید ہی نصیب ہوئی ہو۔

ہندوستان کی قدیم تاریخ چٹانوں، پتھروں، دیواروں اور ستونوں پر لکھی ہوئی ہے، چنانچہ ان کی مدد سے قدیم تہذیب پر بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن پرانے کلچر کو اگر آنکھوں سے دیکھنا ہو تو اس کے لئے اجنتا کے غاروں میں جانا پڑے گا۔ یہاں پہلے لوگوں کی وضع قطع، ان کا لباس، مکان، کھانا پینا، برتن بھانڈے، تخت چوکیاں، اوزار، گلی کوچے، بازار، شادی بیاہ، رسم و رواج، پوجا پاٹ، ناچ رنگ کے جلسے، مے نوشی کی محفل، طرح طرح کے ساز، میدان جنگ، ہاتھیوں کی ریل پیل، لڑائی کے ہتھیار، سمندری سفر، جہاز کی رقابی، راجاؤں کے دربار، عورتوں کے سنگار، جوڑوں کی بندشیں، ان کے زیور، غرض کونسی چیز ہے جو یہاں پیش نہیں کی گئی ہے۔ یہاں قدیم ہندوستان زندہ ہے۔

سید احمد علی آزاد

جامعہ میں ابتدائی تعلیم کے تجربے

(۵)

میں نے انھیں تجربات کا ذکر کیا ہے جن کو میں نے خود کیا ہے یا جو میری نگرانی میں ہوتے رہے ہیں، انھیں تجربات کے بارے میں میں پوری طرح بیان بھی کرسکتا ہوں۔ دوسروں کے کیے ہوئے تجربوں کو اگر میں بیان کرنے کی کوشش کروں تو اُن تجربوں کی ساری باتیں میں بیان بھی نہیں کرسکتا گو وہ مشاہدہ میں آتے رہے ہیں۔ عبدالغفار صاحب کے جن کاموں کا میں نے ذکر کیا ہے ان کاموں کی ابتدا کرنے کا سہرا عبدالغفار صاحب کے سر ہے۔ لیکن میں نے بھی بینک، دکان، باغبانی، میلاد النبی اور یوم قرآن کے جلسوں کے پروجکٹ پر کام کرایا ہے اس لئے ان کے سارے تعلیمی اور عملی پہلوؤں کو میں بھی صحت کے ساتھ بیان کرسکتا ہوں۔ مدرسہ کے اجتماعی کاموں میں میری جماعت بھی شریک رہی ہے اس لیے اُنھیں بھی میں نے بیان کیا ہے۔

شہر دہلی میں جامعہ کے کئی ابتدائی اور مڈل اسکول قائم ہوئے اور اتفاق سے میں نے ان تمام مدرسوں میں کام کیا ہے۔ جامعہ کا ایک سات جماعتوں کا مدرسہ بارہ ٹوٹی صدر بازار میں ایک چارمنزلہ عمارت میں تھا۔ خواجہ حافظ فیاض احمد مرحوم اس مدرسہ کے منیجر تھے۔ ۱؍اگست ۱۹۲۸ء کو میں اسی مدرسہ میں بحیثیت استاد مقرر ہوا۔ جناب فیاض حسین صاحب اس مدرسہ کے نگران تھے۔ پھر میں نگران مدرسہ مقرر ہوا۔ دو سال کے بعد میں جامعہ کی طرف سے موگا

ٹریننگ کے لیے بھیج دیا گیا۔ واپسی پر قرول باغ کے جامعہ کے مدرسۂ ابتدائی میں کام کرنے کا حکم دیا گیا، اس لیے کہ بارہ ٹوٹی کا مدرسہ بند کر دیا گیا تھا۔ یہ مدرسہ ابتدائی جناب عبدالغفار صاحب کی نگرانی میں تھا۔ اس مدرسہ میں پہلے مدرس اور بعد میں نگران مدرسہ کی حیثیت سے کام کرتا رہا کہ ۱۹۴۷ کے فسادات کے بعد یہ مدرسہ بھی بند ہو گیا اور جب دہلی کے حالات ٹھیک ہوئے تو ایک مدرسہ باڑہ ہندو راؤ میں جناب شمس الرحمٰن صاحب کی نگرانی میں قائم ہوا۔ اس مڈل اسکول میں میں نے دو سال تک کام کیا۔ جامعہ نے یہ مدرسہ دہلی کالج کو دیدیا۔ مجھے اس مڈل اسکول سے مدرسہ ابتدائی جامعہ نگر اس لیے منتقل کر دیا گیا کہ کارپوریشن میں اس وقت میری تنخواہ کے مطابق کوئی گریڈ نہیں تھا۔

مرغی خانہ

جامعہ نگر میں مدرسہ ابتدائی کے کئی نگران بدلے گئے۔ اکبر علی مرحوم کے بعد سعید انصاری صاحب، عتیق احمد صاحب مرحوم اور سید حسن صاحب نگران مدرسہ رہے۔ میں جب ۱۹۵۱ء میں اس اسکول میں آیا ہوں تو سید حسن صاحب مدرسہ ابتدائی کے نگران تھے۔ مجھے انھوں نے چھٹی جماعت اور مرغی خانہ کا شعبہ چلانے کی ذمہ داری سونپی۔ مرغی خانہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم کی خواہش اور تحریک پر قائم ہوا تھا۔ انھیں ان چیزوں کا بے حد شوق تھا اور وہ بورڈنگ کے بچوں کے لیے اس قسم کی ہابی کو بے حد ضروری خیال کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ مدرسہ ابتدائی جامعہ نگر میں خرگوش خانہ، کبوتر خانہ اور چڑیا خانہ بھی قائم تھے۔ بچوں کو پالتو جانوروں سے قدرتی لگاؤ ہوتا ہے اور وہ فاضل وقت میں ان میں مصروف بھی رہتے ہیں۔

مدرسہ کی جماعتوں میں اگر پروجکٹ طریقہ پر کام ہوتا ہے تو بچوں کا جماعتوں میں دل لگتا ہے اور استاد سے گہرا لگاؤ پیدا ہوتا ہے۔ تعلیم دلچسپ طریقہ سے ہوتی رہتی ہے

اور بورڈنگوں میں مدرسہ کے اوقات کے بعد اگر غیر نصابی دلچسپیاں پھیلی ہوتی ہیں تو بچوں کا فاضل وقت تعمیری کاموں میں صرف ہوتا رہتا ہے۔ عتیق احمد صاحب مرحوم نے اپنی نگرانی کے زمانہ میں "سورج کا خاندان" کا ماڈل ایک وسیع حصہ زمین پر بناکر بورڈنگ کے اکثر بڑے لڑکوں کو بڑی اچھی مصروفیت دی تھی اور اس ویران جگہ سے بڑے چھوٹے سانپوں، بچھوؤں اور سینکڑوں کیڑے مکوڑوں کو جمع کر کے ایک میوزیم کی شکل دیدی تھی۔ ان کا بنایا ہوا 'سورج کا خاندان' حوادث زمانہ کا شکار ہو گیا اور اب ذاکر صاحب مرحوم وہاں دفن ہیں لیکن ان کا قائم کیا ہوا میوزیم آج بہت ترقی پر ہے۔

اس مرغی خانہ کے سب سے پہلے ناظم جناب عبدالرؤف صاحب مقرر کیے گئے۔ مرغیوں کے رہنے کے لئے ایک کشادہ زمین پر چار پختہ کمرے بنے ہوئے تھے اور عمدہ قسم کی جالیوں سے اسے گھیر گیا تھا۔ دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ جگہ تقریباً سو مرغیوں کے لیے کافی ہوگی۔ مرغی خانہ پلیننگ کے مطابق بنوایا گیا تھا۔ دو تین سایہ دار درخت بھی تھے تاکہ مرغیوں کو لو کے زمانہ میں تکلیف نہ ہو۔ عبدالرؤف صاحب مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے امریکہ چلے گئے۔ اُن کے جانے کے بعد یہ شعبہ جناب آزاد رسول صاحب موجودہ نگران مدرسہ ابتدائی کے سپرد ہوا۔ میں نے اس شعبہ کا چارج آزاد رسول صاحب سے لیا۔ اس کام سے میں بالکل ناواقف تھا۔ یہ کام بچوں کے بلنیک، بچوں کی دکان، بچوں کے خوانچہ اور باغبانی کے کام کے مقابلہ میں، جن کا مجھے کئی کئی سال تک کراتے رہنے کا تجربہ تھا، بے حد مشکل تھا۔ اس لیے کہ اس میں زندہ اور جاندار چیزوں کی دیکھ بھال کرنی تھی۔

بہرحال میں اس میں لگا اور ابتدائی ششم کے طلبا کو بھی اس میں لگایا۔ ذاکر صاحب مرحوم کی یہ بات میرے ذہن میں تھی "اگر کوئی کام اس قابل ہے کہ کیا جائے تو وہ اس قابل بھی ہے کہ اسے دل سے کیا جائے۔" جس وقت میں نے چارج لیا ہے اس وقت اتنے بڑے مرغی خانہ میں کل ۱۴۱ مرغیاں تھیں۔ اِن مرغیوں کے کھانے کا انتظام اس طرح تھا کہ مطبخ کا

بچا ہوا جھوٹا کھانا ایک تسلے میں ان مرغیوں کے لئے ڈالدیا جاتا تھا اور ہر مرغی اپنا اپنا حصہ لیکر سارے مرغی خانہ میں گھوم گھوم کر کھاتی پھرتی تھی۔ گرمیوں میں یہ کھانا سڑجاتا تھا اور بدبو پھیلتی رہتی تھی۔ یہ بات سمجھ میں نہ آسکی کہ ایسے اچھے مرغی خانہ میں مرغیوں کے کھانے کا ایسا خراب انتظام کیوں رکھا گیا۔ اس کھانے کو کوے بھی کھاتے تھے جو مرغیوں کے دشمن ہیں۔

سید حسن صاحب نے بتلایا کہ تقریباً ۶۰ عدد روڈ اور لیگ ہارن چوزوں کا دہلی پولٹری فارم کو آڈر دے دیا گیا ہے۔ آپ کا انتظار تھا۔ اب آپ آگئے ہیں تو ان چوزوں کو دہلی پولٹری فارم سے منگوا لیجئے۔ یہ چوزے جب آگئے تو مرغی خانہ میں رونق نظر آنے لگی اور چھٹی جماعت کے طلبار کا مرغی خانہ میں کام کرنے کا شوق اور بڑھا۔ چوزوں کے آنے کے بعد مرغیوں کے کھانے کا پرانا انتظام ختم کر دیا گیا اور لکڑی کے نئے میش اسٹینڈ بنوا کر ان میں مرغیوں کو (میش مرغیوں کی بھوسی کو کہتے ہیں جس میں کئی چیزیں ملی ہوئی ہوتی ہیں) میش دیا جانے لگا۔ آزادی کے بعد دہلی کی حکومت اپنے پولٹری فارم سے مرغی خانہ قائم کرنے والوں کو کم قیمت پر چوزے دیتی تھی۔ دوسری سہولتیں اور مشورے بھی دیتی تھی۔ ایک آدمی باری باری آتا تھا اور مرغی خانہ کے بارے میں مشورہ دیتا تھا۔ "رانی کھیت" کی پھیلنے والی بیماری کے ٹیکے بھی مرغیوں کو مفت لگا دیتا تھا۔

مرغی خانہ مدرسہ میں بچوں کی دلچسپی، شوق اور مصروفیت کے لئے قائم کیا گیا تھا۔ جیسے اور دلچسپیاں تھیں ویسے ایک مرغی خانہ بھی تھا لیکن جب یہ ابتدائی ششم کے بچوں کے لیے مخصوص کر دیا گیا تو اس کی نوعیت بھی بدل گئی۔ جماعت کے ہر طالب علم کا عملی طور پر مرغی خانہ میں کام کرنا ضروری ہوگیا تاکہ اس کی دلچسپی قائم رہے اور مرغیوں کے بارے میں عملی طور پر جانکاری حاصل کرے۔ چنانچہ باری باری سے آٹھ لڑکے ایک مہینہ کے لیے مقرر کیے جانے لگے۔ صبح صبح فجر کی نماز کے بعد بورڈنگ کے دو طلبار مرغیوں کو کھولتے تھے اور انھیں سوکھی بھوسی، بھوسی کے برتنوں میں دیتے تھے اور پانی کے برتنوں کو دھوکر اس میں

پانی بھر دیتے تھے ۔ صبح کے وقت بورڈنگ کا ایک لڑکا ان لوگوں کو انڈے تقسیم کرنے چلا جاتا تھا جن لوگوں کے انڈے جاری ہوتے تھے ۔ ان لوگوں کے نام ایک رجسٹر میں لکھے جاتے تھے اور روزانہ انڈے پہونچنے کی حاضری اس رجسٹر میں لگتی رہتی تھی ۔ ان انڈوں کی قیمت گاہکوں سے مہینے کے آخر میں وصول ہوتی تھی ۔ اگر کسی کو مرغی خانہ میں کم انڈے ہونے کی وجہ سے، نہیں جاتے تھے تو رجسٹر میں غیر حاضری بنا دی جاتی تھی ۔ اس رجسٹر کے اندراجات سے یہ پتہ چلتا رہتا تھا کہ روزانہ مرغی خانہ میں کتنے انڈے ہوئے اور کتنے تقسیم ہوئے ۔ اگر انڈے کم ہوتے تھے تو کئی ممبران کو انڈے نہیں پہونچتے تھے ۔ اگر مرغی خانہ میں زیادہ انڈے ہوتے تھے تو انڈے مشین میں رکھنے کے لیے بچا لیے جاتے تھے ۔ ہر مہینہ کے پہلے ہفتہ میں انڈوں کی اوسط نکالی جاتی تھی ۔ اس اوسط کے مطابق انڈے تقسیم ہوتے تھے ۔ اس طرح انڈے پانے والوں کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی تھی ۔ عام طور سے اوسط سے کم انڈے جاری کیے جاتے تھے، باقی انڈے مشین کے لئے رکھ لیے جاتے تھے ۔

گیارہ بجے جب مدرسہ کی تفریح ہوتی تھی تو غیر مقیم طلباء کام کرتے تھے ۔ اگر چھٹیاں ہوتی تھیں تو بھی وہ ادھر کھیلے سے آکر کام کر جاتے تھے ۔ اس وقت وہ مرغی خانہ میں پانی کا برتن دھو کر اس میں پانی بھر دیتے تھے (مرغیاں پانی گندہ کر دیتی ہیں اس لیے تین مرتبہ بدلا جاتا تھا) اور اس وقت تک جن مرغیوں نے انڈے دئے ہوتے تھے وہ نکال لاتے تھے ۔ مرغی خانہ میں اوپر بھی جالی لگی ہوئی تھی پھر بھی کوّے آجاتے تھے اور انڈے لے کر بھاگ جاتے تھے ۔ یہ لڑکے کوؤں کو گھیر کر پکڑ لیتے تھے اور مار کر مرغی خانے میں لٹکا دیتے تھے تاکہ پھر کوّے نہ آئیں ۔ بعض مرغیوں میں یہ عادت ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے اور دوسری مرغیوں کے انڈے توڑ کر کھا جاتی ہیں، یہ لڑکے ایسی مرغیوں کو بھی پکڑ لیتے تھے اور علاحدہ بند کر دیتے تھے ۔ ایسی مرغیاں بعد میں فروخت کر دی جاتی تھیں ۔ لڑکے یہ سب تجربے دیکھتے جاتے تھے اور اپنی کاپی میں لکھتے جاتے تھے ۔

انڈوں سے چوزے نکالنے کی مشین پچاس انڈوں کی تھی۔ یہ مشین لکھنؤ کے ایک تمباکو کے تاجر صاحب نے مدرسہ کو عنایت کی تھی۔ مجھے مشین سے چوزے نکالنے کی واقفیت نہیں تھی لیکن شوق نے یہ کام بھی سکھلا دیا۔ اکتوبر، نومبر، فروری اور مارچ میں مشین سے چوزے نکالے جاتے تھے اور دسمبر، جنوری میں سخت سردی کی وجہ سے مشین میں انڈے نہیں رکھے جاتے تھے۔ جب چوزے نکل آتے تھے تو انھیں بجلی کے بلب سے گرمی پہونچاکر بروڈر میں پالا جاتا تھا۔ میں نے اپنے گھر میں بروڈر بنا لیا تھا۔ ابتدائی ششم کے بچے ہی سب کام کرتے تھے۔ پہلی مرتبہ تو ۳۰ انڈوں سے صرف دو چوزے نکلے۔ لیکن بعد میں تیس سے چالیس تک چوزے نکلتے رہے۔

عصر کی نماز کے بعد مرغیوں کو پھر بھوسی (میش) اور پانی بدل کر دیا جاتا تھا تاکہ کھا پی کر مرغیاں بند ہو جائیں۔ جن کمروں میں مرغیاں بند ہوتی تھیں اُن میں بغیر بان کی چارپائیاں پڑی ہوئی تھیں۔ ان چارپائیوں کی پٹیوں پر مرغیاں بیٹھتی تھیں تاکہ مرغیوں کی بیٹ نیچے گریں۔ چارپائیوں کے پائے کے نیچے پانی کے برتن رکھے جاتے تھے تاکہ ٹکس چارپائیوں پر چڑھ کر مرغیوں کو پریشان نہ کریں (ٹکس کھٹملوں کی طرح کا ایک کیڑا ہوتا ہے جو مرغیوں کا خون چوستا ہے، دن کو نظر نہیں آتا رات کو حملہ کرتا ہے۔) اس وقت بھی دو لڑکے کام کرتے تھے۔ یہی لڑکے مرغیوں کے لیے جالی میں پالک باندھ دیتے تھے تاکہ مرغیاں اُچک اُچک کر کھائیں اور ورزش بھی کریں۔ مغرب سے پہلے ایک لڑکا دروازے بند کر دیتا تھا اور تالے لگا دیتا تھا۔ گرمیوں کی تعطیلات میں جبکہ مدرسہ بند ہو جاتا تھا اور تمام طلبا اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے تھے یہ سارے کام مدرسہ کا مالی انجام دیتا تھا۔ اُس کو اس کام کا معاوضہ دیا جاتا تھا۔ مرغی خانہ سے قریب ایک کنواں تھا جس سے مرغی خانہ میں پانی کا اچھا انتظام رکھا جاتا تھا تاکہ لو کے زمانہ میں مرغیوں کو تکلیف نہ ہو۔

مرغی خانہ میں لڑکے اور لڑکیاں بڑے شوق سے کام کرتے تھے۔ باغبانی اور خوانچے

کے منافع سے تو بچوں کو کچھ منافع مل جاتا تھا یا نقد نہیں ملتا تھا تو کوئی تعلیمی یا تفریحی سیر کر لیتے تھے لیکن مرغی خانہ میں کام کرنے میں اس قسم کا کوئی لالچ نہیں تھا۔ یہاں بچوں کا شوق سے کام کرنا بلاواسطہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ ان کا اپنا کام ہے۔ مرغی خانہ میں کام کرنے کے بعد کتنے ہی لڑکوں نے اپنا مرغی خانہ قائم کر لیا۔ کام اس انداز سے ہوتا رہا کہ مرغی خانہ کے سلسلہ میں بچوں کے تجربہ میں بہت سی باتیں آئیں اور نئی نئی معلومات ہوتی رہیں مثلاً ولایتی مرغیوں کی مشہور نسلیں، سفید لیگ ہارن، روڈ، آئی لینڈ، سسکس اور منارکا ہیں۔ بچوں کو بتلایا گیا کہ یہ نام ان نسلوں کے اس لیے پڑے کہ یہ مرغیاں مشہور جزیرہ منارکا اور مشہور بندرگاہ لیگ ہارن اور سسکس سے دنیا کے مختلف حصوں میں بھیجی گئیں روڈ جزیرہ امریکہ میں ہے یہ نسل وہاں سے مختلف ممالک کو بھیجی گئی ۔

مشین سے چوزے نکالنے کے کام نے تو بچوں کے شوق کو اور ابھار دیا۔ بچے بلب کی روشنی میں انڈے کے اندر بچوں کے بتدریج بننے اور خول کے اندر گردش کرنے کا بڑے شوق سے مشاہدہ کرتے تھے۔ دہلی کے اچھے اچھے پولٹری فارم دیکھنے لاری سے جاتے تھے۔ مدرسہ کی طرف سے لاری کا انتظام ہوتا تھا۔ اس مشاہدہ کے پروگرام میں پوری جماعت شریک ہوتی تھی۔ مرغی خانہ دیکھنے کے لیے پہلے سے خط وکتابت ہوتی تھی۔ بچے اردو میں خط لکھتے تھے اور مدرسہ کی طرف سے اس کا انگریزی ترجمہ ہو کر ٹائپ ہو جاتا تھا۔ یہ ٹائپ کیا ہوا خط اور بچوں کا لکھا ہوا خط دونوں اجازت حاصل کرنے کے لیے ڈاک سے روانہ کر دئے جاتے تھے۔ جب اجازت آجاتی تھی تب طلبا مرغی خانہ دیکھنے جاتے تھے۔ تبتی بچوں کا جو گروپ موسم سرما اور موسم گرما کی تعطیلات میں سفر پر جاتا تھا اس گروپ نے بھاگلپور، پٹنہ، پونا، بریلی، لکھنؤ اور رانی کھیت کا مرغی خانہ میری نگرانی میں دیکھا اور معلومات جمع کیں۔ ان مرغی خانوں سے اردو، ہندی اور انگریزی میں خاصہ لٹریچر بھی جمع کیا اور اسے پڑھا

جن لوگوں نے جامعہ نگر میں چھٹی جماعت کے بچوں کو مرغی خانہ میں کام کرتے ہوئے دیکھا

ہے وہ جانتے ہیں کہ بچوں نے کتنی مستعدی، کتنی وقت کی پابندی اور کتنی دیانت داری سے مرغی خانے میں کام کیا ہے۔ کیا نصابی تعلیم یہ بات پیدا کرسکتی ہے؟ جو طالب علم سخت سردی میں صبح صبح کو انڈے تقسیم کرنے جاتا تھا یا سخت بارش میں بھی انڈے تقسیم کرنے سے نہیں رکتا تھا وہ پوری ذمہ داری سے کام کرنے کا عملی نمونہ ہوتا تھا۔ عبدالغفار صاحب مدہولی نے بچوں کی اس پابندی اور مستعدی پر کئی مرتبہ انعام دیا ہے۔ جو لڑکیاں مرغی خانہ میں مرغیوں کے لیے اوجھڑی اُبال کر کوٹتی تھیں اور مرغیوں کو کھلاتی تھیں اُن کی محنت اور مستعدی واقعی قابل تعریف تھی۔ اس کام میں ان کو بالکل کراہت نہیں ہوتی تھی۔ اسی طرح مرغیوں کو بھوسی دینے، سردیوں میں برتنوں کو دھو کر پانی دینے، انڈے نکالنے اور مرغیاں ٹھیک سے بند کرنے پر جو لڑکے اور لڑکیاں مقرر ہوتے تھے وہ پوری ذمہ داری اور وقت کی پابندی سے کام کرتے تھے۔

مرغی خانہ سے لگاؤ اور کام کی ذمہ داری کی صرف دو مثالیں بیان کروں گا۔ ایک طالب علم انور نعمانی انڈے تقسیم کرنے پر مقرر تھا۔ عام طور سے بورڈنگ کے طلباء صبح کے وقت لوگوں کو انڈے تقسیم کرنے جایا کرتے تھے۔ لیکن انھوں نے اپنی خواہش سے انڈے تقسیم کرنے کا کام لیا۔ چونکہ یہ صبح نہیں آسکتے تھے اس لیے انھوں نے صبح انڈے تقسیم کرنے کی بجائے شام کو انڈے پہونچانا شروع کئے۔ ایک دن یہ پروفیسر محمد عاقل صاحب کے یہاں انڈے پہونچانے جارہے تھے کہ راستہ میں کتوں نے اِن کو گھیر لیا۔ دوڑ بھاگ میں ٹوکری ہاتھ سے چھوٹ گئی اور سارے انڈے ٹوٹ گئے۔ دوسرے دن یہ تمام انڈوں کی قیمت لے کر آئے۔ میں نے قیمت واپس کردی اور اُن کی ذمہ داری اور نقصان ہو جانے پر اتنے شدید احساس کی تعریف کی۔

دوسرا واقعہ اس طرح ہے کہ مشین میں رکھنے کے لئے ۵۰ انڈے ایک ٹوکری میں رکھے ہوئے تھے۔ کشور سلیم یہ انڈے مشین میں رکھنے کے لئے دوسرے کمرے میں لیے جارہی

تھیں کہ ٹوکری کا پیندا نکل گیا اور سارے انڈے گر کر ٹوٹ گئے۔ پھر کیا تھا کشور سلیم پر سکتہ طاری ہو گیا۔ میں نے دلاسا دینے کی کوشش کی تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ جماعت میں آئیں تو اور بھی روئیں۔ احساس زیاں شدید تھا۔ اُن کو سمجھایا گیا اور کوئی قیمت نہیں لی گئی۔

علی گڑھ یونیورسٹی کی وائس چانسلری سے استعفیٰ دے کر جب ذاکر صاحب مرحوم جامعہ نگر میں اپنی کوٹھی میں آ گئے تو ایک دن صبح سعید انصاری صاحب کے ساتھ ٹہلتے ہوئے مدرسہ ابتدائی میں مجھ سے ملنے اور مرغی خانہ دیکھنے تشریف لائے۔ اس وقت میں مرغی خانہ میں صبح کے کاموں کی نگرانی میں مصروف تھا۔ میں نے دیکھا تو مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ فرمایا "واہ، بہت دنوں کے بعد ملاقات ہوئی ہے اس لیے معانقہ ہوگا" چنانچہ معانقہ ہوا۔ پھر فرمایا کہ سعیدہ نے بھی ایک مرغی خانہ کھولا ہے۔ انھیں بھی مشورہ دیجئے۔ مرغی خانہ سے اُن کو خاصہ لگاؤ تھا۔ دیگر شوقوں کی طرح مرغیاں پالنے کا بھی شوق تھا۔ بہار میں گورنری کے زمانہ میں فارم منیجروں سے وہ کبھی کبھی ایسے سوالات کر لیتے تھے کہ فارم منیجر کو حیرت میں ڈال دیتے تھے۔ لیکن یہ سوالات تجربہ پر مبنی ہوتے تھے۔ ایک دفعہ پٹنہ سے خط میں لکھا: "کبھی علی گڈھ جانا ہو تو وہاں پروفیسر حبیب الرحمٰن صاحب کا مرغی خانہ بھی دیکھئے گا۔ انھوں نے بہت سی نئی نئی قسمیں جمع کی ہیں۔"

میں نے مرغی خانہ پر ایک کتاب لکھی۔ اس کتاب کو میرے ایک شاگرد عمرالٰہی صاحب نے پاکستان میں چھپوا دیا اور کچھ نسخے میرے پاس بھی بھیج دیے۔ اس میں سے ایک نسخہ میں نے پٹنہ میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کے پاس بھیج دیا جہاں اس وقت وہ بہار کے گورنر کی حیثیت سے مقیم تھے۔ انھوں نے کتاب ملنے پر مجھے ذیل کا خط لکھا:

"مرغی خانہ" کتاب کا ایک نسخہ ملا۔ خط اور نسخہ دونوں کا شکریہ قبول فرمائیں۔ "مرغی خانہ" کتاب چھپی بہت اچھی ہے۔ بس اتنا ہی دیکھ پایا تھا کہ سعیدہ کی لڑکی نیلوفر جس نے ابھی ایک مرغی بٹھائی تھی اور پرسوں اس کے لو بچے نکلے ہیں، کتاب اُڑا لے

گئی۔ آپ نے دیکھا، کام اور کتاب کا ربط، اب تک وہ کتاب انھیں کے تصرف میں ہے۔"

'مرغی خانہ' پانچویں اور چھٹی جماعت کے لیے بہت دلچسپ پروجکٹ ہے۔ اس کام میں دلچسپی ہی دلچسپی ہے اور اگر انڈے سے بچے نکالنے کی مشین بھی ہو تو بچوں کی دلچسپی کے کیا کہنے! یہ تعلیمی فائدوں سے بھرپور ہے اور نت نئے تجربے ہوتے رہتے ہیں۔ آج مرغی خانہ کا کام اعلیٰ سائنسی اصولوں پر ہو رہا ہے اور یہ غریب مسلمانوں کے مرغیاں پالنے اور بھنگیوں کے مرغیاں پالنے سے نکل کر بڑے بڑے فارم کی صورت اختیار کر چکا ہے لیکن اگر مرغی خانہ کسی مدرسہ کی ہابی ہے تو اس سے مالی فائدہ نہیں ہو سکتا کوئی منافع نہیں ہوگا۔ مدرسہ کے بچوں نے ذیل کے تجربات حاصل کیے:

۱۔ بعض بڑے انڈوں میں دو زردی نکلی۔

۲۔ بڑے سے بڑا انڈا ۶ تولے کا ہوا۔

۳۔ بغیر مرغ کے بھی مرغیاں انڈے دیتی رہیں لیکن ان انڈوں سے بچے نہیں نکل سکتے۔ ان کو خاکی انڈے کہتے ہیں۔

۴۔ دو غلی مرغیوں نے زیادہ انڈے دیے۔

۵۔ فروری سے مئی تک مرغیوں نے زیادہ انڈے دیے۔

۶۔ مرغی خانہ اعلیٰ پیمانہ کی صفائی چاہتا ہے۔ کھٹمل اور جوؤں سے بچانے کے لیے یہ بےحد ضروری ہے۔

مدرسہ ابتدائی ۱۹۳۶ء میں قرولباغ دہلی سے اوکھلے منتقل ہوا۔ میں اس ابتدائی مدرسہ میں ۱۹۵۱ء میں آیا۔ اس پندرہ سال کی مدت میں مجھے کچھ ایسا نظر آیا کہ اس مدرسہ کا کوئی نہج نہیں بن سکا ہے، جیسا کہ قرولباغ کے مدرسہ ابتدائی کا عبدالغفار صاحب کی نگرانی میں بن گیا تھا۔ اس کے کچھ اسباب ہوں گے۔ سب سے بڑا سبب تو جگہ کی وسعت تھی

اور شہر سے دوری تھی۔ بڑی جگہ کے سنبھالنے میں وقت لگتا ہے اور دوری کی وجہ سے ضروریات زندگی کی فراہمی میں خاصی پریشانی ہوتی تھی۔ ہر استاد اپنی اپنی جماعت میں خاصا کام کرتا تھا لیکن پھر بھی انتشار تھا۔ مدرسہ کے کاموں میں اجتماعی رنگ نظر نہیں آتا تھا۔ میں نے ایک ہی سال کام کیا تھا کہ سید حسن صاحب نے نگرانی کے کام سے استعفا دے دیا اور جناب آزاد رسول صاحب نگران مدرسہ مقرر ہوئے۔

آزاد رسول صاحب کے نگرانی کا کام سنبھالتے ہی کام رفتہ رفتہ جمنے لگا، انتشار میں کمی آتی گئی اور کام کا ایک نہج بننے لگا۔ کئی اجتماعی کام شروع ہوئے مثلاً بچوں کی حکومت کا الیکشن بچوں کی حکومت کے عہدے داروں کی مسند نشینی، میلے کے موقع پر کوئی پروگرام، جوہر ٹرافی کے مقابلے، بعد میں نہرو ٹرافی کے مقابلے، ایک دن کا مدرسہ، سالانہ سپورٹس اور سالانہ جلسے وغیرہ۔ ان میں سے کچھ کام نئے تھے اور کچھ کام پہلے سے ہوتے آرہے تھے اور انھیں بہتر طریقہ پر انجام دیا جانے لگا تھا۔ نگران مدرسہ، استادوں کے مشورہ کے بعد ان غیر نصابی دلچسپیوں کو سال بھر پر پھیلا دیتا تھا اور یہ پروگرام اپنے مقررہ وقت پر شروع ہو جاتے تھے۔ بچوں کی حکومت کا الیکشن کرانے کا ایک استاد ذمہ دار ہوتا تھا وہ الکشن کمشنر کے انتخاب سے لے کر مسند نشینی کے جلسہ تک تمام کام کی نگرانی کرتا تھا، میلے کے پروگراموں کی تیاری خود نگران مدرسہ چند استادوں کو ساتھ لے کر کراتا تھا۔ ایک دن کے مدرسہ کی تمام ذمہ داری بچوں کی حکومت کے ممبران کی ہوتی تھی لیکن اس میں تمام جماعتیں نقلوں کی تیاری اور کمروں میں تعلیمی سامان کے لگانے میں لگتی تھیں۔ کھلی ہوا کے مدرسہ میں ہر جماعت کے استاد کو پوری طرح لگنا پڑتا تھا۔ اس طرح ہر جماعت کے استاد کو مہینے کچھ نہ کچھ غیر نصابی دلچسپیوں میں طلبا کی مدد کرنی پڑتی تھی۔ یہ سارے اجتماعی کام ان کاموں کے علاوہ ہوتے تھے جو اس مدرسہ کا مستقل منصوبہ تھے مثلاً بچوں کا بینک، بچوں کی دکان، بچوں کا خوانچہ، باغبانی اور مرغی خانہ۔ کام خاصا بڑھا ہوا تھا لیکن اساتذہ لگ کر کرتے تھے۔

مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی

ذکرِ شہادتِ حسین رضؓ

(۲)

اب میں تاریخ کی روشنی میں اپنے بیان کی مزید وضاحت کرنا چاہتا ہوں :

یزید کی آزاد منشی، آوارہ مزاجی، لہو ولعب اور عیش و طرب سے دلچسپی تاریخ کا کھلا ہوا صفحہ ہے اس سے انکار ممکن نہیں۔

حافظ عماد الدین ابن کثیرؒ جیسے صاحب نظر معتدل مورخ البدایہ والنہایہ (جلد ہفتم ص ۲۲۶/۲۳۶) میں لکھتے ہیں :

"طبرانی نے کہا ہے کہ یزید اپنی نوجوانی کے زمانہ میں شراب پیتا تھا اور آزاد طبع نوجوانوں کی زندگی بسر کرتا تھا۔ اس کے والد حضرت معاویہ کو اس کا احساس ہوا اور اسے نرمی سے اس طرح سمجھایا۔" اے بیٹے تمہارے لیے یہ بھی تو ممکن ہے کہ تم اپنی ضرورت اس طرح پوری کر لیا کرو کہ تمہارا پردہ فاش نہ ہو۔ جس سے تمہاری قدر و منزلت جاتی رہے اور تمہارے دشمن خوش اور تمہارے دوست غمگین ہوں۔"

پھر یہ شعر پڑھے :

"دن کے وقت عزت کی طلب میں کمربستہ ہو جاؤ۔ اور چہیتے محبوب کی جدائی پر صبر کرو۔
یہاں تک کہ جب رات تاریکی کا پردہ ڈال دے اور رقیب کی آنکھ جھپک جائے تو

اس وقت اپنی حسرتیں دل کھول کر نکالو کیونکہ رات عقلمند آدمی کا دن ہے۔"

آگے لکھتے ہیں:

"یزید میں کچھ اچھی خصلتیں بھی تھیں۔ یعنی کرم، حلم، فصاحت، شاعری، شجاعت اور تدبیر مملکت ـــ وہ حسین اور عمدہ معاشرت والا تھا مگر خواہشات نفسانی کا رسیا تھا اکثر نمازیں قضا کر دیتا تھا اور بعض اوقات چھوڑ بھی دیتا تھا۔"

حافظ ابن کثیر پھر لکھتے ہیں:

"بیان کیا گیا ہے کہ یزید گانے بجانے، شراب پینے، شکار کھیلنے اور باندیوں، غلاموں اور کتوں کو جمع کرنے کے شوق میں مشہور تھا۔ مینڈھوں، ریچھوں اور بندروں کو لڑایا کرتا تھا۔ ہر صبح بادۂ گلگوں کے ساغر لنڈھاتا، گھوڑوں کی پشت پر بندروں کو رسیوں سے بندھوا کر دوڑاتا۔ بندروں کو سونے کے تاج پہناتا اور ایسے ہی غلاموں کو۔ گھوڑ دوڑ میں دلچسپی لیتا۔ جب اس کے طویلے کا کوئی بندر مر جاتا تو اس کا سوگ مناتا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دن وہ اپنے پالتو بندر کو اٹھا کر کدانے لگا۔ بندر نے کاٹ لیا۔ یہی اس کی موت کا سبب بنا۔"

یزید کی یہ عیش کوشی اور بادہ نوشی دمشق کی مجالس نشاط تک ہی محدود نہ تھی۔ بلکہ اس نے سرزمین حرم کا بھی احترام نہ کیا۔

مورخ ابن اثیر نے الکامل ج ۴ ص ۵۰ میں، اس کی سیرت بیان کرتے ہوئے یہ واقعہ لکھا ہے:

یزید نے حضرت معاویہ کی زندگی میں سفر حج کیا۔ مدینہ منورہ پہنچ کر اس نے مجلس شراب منعقد کی۔ حضرت ابن عباس اور حضرت امام حسین اس سے ملنے گئے اور اندر داخل ہونے کی اجازت چاہی۔ یزید سے کہا گیا ابن عباس تو شراب کی بو کو پہچان لیں گے۔ لہٰذا اس نے ان کو تو روک دیا اور حضرت حسین کو بلا لیا۔ امام حسین کو جب دوسری خوشبو وں

کے ساتھ شراب کی بو محسوس ہوئی تو انھوں نے فرمایا سبحان اللہ، یہ بو کیسی ہے! یزید نے کہا یہ ایک خاص عطر ہے جو شام میں بنتا ہے۔ پھر ان کے سامنے ہی شراب منگا کر پی اور حضرت امام کو بھی پینے کی دعوت دی۔ امام صاحب نے فرمایا تم اپنی شراب اپنے ہی پاس رکھو۔ میں تمھاری جاسوسی بھی نہ کروں گا۔

یزید نے یہ شعر پڑھے:

"اے دوست سخت تعجب ہے کہ میں تجھکو دعوت دیتا ہوں اور تو نہیں مانتا۔ میں تجھے مست شباب حسینوں، دل کی آرزؤں، شراب ناب عیش وطرب اور مربع خم کی طرف بلاتا ہوں جس پر سرداران عرب جمع ہیں۔ ان ہی نازنیں عورتوں میں وہ بھی ہے جس نے تمھارے دل کو موہ لیا ہے۔ پھر بھی تم (اپنی خشک مزاجی سے) باز نہیں آتے۔"

حضرت امام حسین یہ سن کر کھڑے ہو گئے اور فرمایا "اے ابن معاویہ وہ تو تمھارے ہی دل پر قابض ہوئی ہے۔"

پروفیسر فلپ حتی یزید کی رنگین مزاجی اور اس آزاد معاشرہ کی جس میں اس نے نشو ونما پائی ان الفاظ میں تصویر کشی کرتے ہیں:

"امیر معاویہ کی کئی بیویاں تھیں۔ ان میں وہ میسون کو سب سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ وہ شامی عرب کلبیوں کے قبیلہ بنو بحدل کی تھی اور دمشق کی درباری زندگی کی ذرا پروا نہ کرتی تھی۔ بلکہ صحرائی آزادی کی دلدادہ تھی۔ جو اشعار اس سے منسوب کیے جاتے ہیں ان میں وطن کی یاد اور دوری کی شکایت کے وہی جذبات بیان کئے گئے ہیں جو اکثر ان بدوؤں کے دل میں جو شہری زندگی کی طرف منتقل ہو رہے تھے موجزن ہوتے ہوں گے۔

میسون اپنی پیش رو اور حضرت عثمان کی بیوی نائلہ کی طرح کہ وہ بھی کلبی قبیلہ سے تعلق رکھتی تھیں، اصل میں یعقوبی فرقہ کی مسیحیہ تھی۔ وہ اپنے لڑکے یزید کو جو امیر معاویہ کا جانشین

ہوا اکثر بادیہ یعنی صحرائے شام خصوصاً تدمُر کے نواح میں لے جاتی تھی۔ اسی صحرا میں اس کے قبیلے کے بدو گھومتے پھرتے تھے۔ یہیں نوجوان ولی عہد نے گھوڑے دوڑانے، شکار کھیلنے اور شراب پینے کی عادتیں سیکھیں۔ عربوں کے حملہ کے وقت دمشق کے سقوط میں جن دغا بازوں کا ہاتھ تھا ان میں منصور ابن سرجون کا نام آتا ہے یہ شخص ایک ممتاز مسیحی گھرانے کا فرد تھا۔ بائزنطہ کی حکومت کے آخری زمانہ میں اس خاندان کے لوگ نظارت خزانہ کے عہدوں پر فائز تھے۔ عربوں کے دور میں یہ عہدہ سپہ سالاری کے بعد سب سے زیادہ اہم ہو گیا تھا۔ غرض اسی منصور کا پوتا وہ مشہور یوحنا دمشقی (سینٹ جون ڈمے سین) گزرا ہے جو اپنی جوانی میں یزید کا خاص ندیم تھا۔ اسی طرح اس فرماں روا کا طبیب ابن اُثال مسیحی تھا کہ شروع میں امیر معاویہ نے اسے صوبہ حمص کا دیوان مالیات بنا دیا تھا۔ اور یہ وہ عزت ہے جو کسی دوسرے مسیحی کو اسلامی تاریخ میں حاصل نہ ہوئی۔

یزید کا ایک اور یار غار درباری شاعر الاخطل حیرہ کے تغلبی عرب قبیلہ کا فرد اور یوحنا کا دوست تھا۔ یہ درباری شاعر خلیفہ کے محل میں صلیب گلے میں لٹکائے آجاتا اور اپنے اشعار سے مسلم خلیفہ اور اس کے درباریوں کو مسرور و محظوظ کرتا تھا۔

(تاریخ ملت عربی از حتی ترجمہ سید ہاشمی فرید آبادی ص۳۰۲)

الغرض یزید نے جس آزاد ماحول میں پرورش پائی جن رنگین مجلسوں میں اس نے جوانی کا زمانہ گزارا اور جن آوارہ مزاج اور عیاش طبع مصاحبین کو، تخت حکومت پر فائز ہونے کے بعد، اس نے اپنا ندیم و جلیس بنایا اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ حکومت کو اس نے مطلق العنان بادشاہوں کی طرح، عیش پرستی، ہوسناکی اور کام جوئی کا ذریعہ سمجھا۔ خلفاء راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کی خشیت، تقویٰ اور جذبۂ خدمت خلق کی اسے ہوا بھی نہ لگی۔

تین سال کی مختصر مدت حکومت میں اس نے تین ایسے لرزہ انگیز اقدامات کیے جس سے انسانیت کی روح کپکپا اٹھی۔ (۱) فرزند نبی کا قتل (۲) مدینۃ النبی کی غارت گری (۳) بیت اللہ

کی بے حرمتی۔ حضرت امام رضی اللہ عنہ کی شہادت کی ذمہ داری سے اس کی برائت ممکن نہیں۔ اس نے ابن زیاد کو اس فعل شنیع کا حکم نہ بھی دیا ہو تب بھی بہرحال وہ اس کا نامزد گورنر تھا۔

بے شک طبری نے ۶۴ھ کے حوادث میں یہ روایت نقل کی ہے کہ جب دربار یزید میں شمر ذی الجوشن شہدائے کربلا کے سر لے کر پہنچا اور اپنے لشکر کے کارنامے فخریہ انداز میں بیان کر چکا تو یزید نے کہا:

> "افسوس تم پر، میں تمہاری فرماں برداری سے حسین کے قتل کے بغیر بھی راضی تھا۔ اللہ کی لعنت ہو ابن سمیہ (ابن زیاد) پر واللہ اگر میں اس کی جگہ ہوتا تو ضرور حسین کو معاف کر دیتا۔"

مگر سیاسی بازیگروں کے لیے ایسی شاعرانہ چالیں بچوں کا کھیل ہیں۔ کیا تاریخ میں متعدد ایسے واقعات نہیں ملتے کہ ظالم بادشاہوں اور جابر سیاست دانوں نے بیش قرار انعام و اکرام کے لالچ دیکر اپنے حریفوں کو تہ تیغ کر دیا اور پھر ان قاتلوں کو بھی ہاتھوں ہاتھ ان کے ساتھ آغوش لحد میں سلا دیا۔ پھر مدینۃ النبی کی غارت گری (واقعہ حرہ) کی تو کوئی تاویل ہی نہیں ہو سکتی۔ واقعہ کربلا سے جب تمام عالم اسلام میں آگ لگ گئی اور مدینہ منورہ میں اس کے نتیجہ میں، یزید کے خلاف نفرت و عداوت کے شعلے بھڑک اٹھے تو یزید نے مسلم بن عقبہ مری کو بارہ ہزار کا لشکر دے کر مدینہ منورہ پر چڑھائی کے لیے بھیجدیا اور اسے حکم دیا کہ اگر باشندگان مدینہ تین دن تک اطاعت قبول نہ کریں تو مدینہ کو بزور شمشیر فتح کر لینا اور تین دن تک فوج کو آزاد چھوڑ دینا کہ شہر کے باشندوں کی جان، مال، عزت اور آبرو کے ساتھ جس طرح چاہیں کھیلیں۔ چنانچہ یہی ہوا۔ امام زہری رح کی روایت کے مطابق دس ہزار اہل مدینہ جن میں سات سو اکابر علم و دین شامل تھے تہ تیغ کر دیے گئے اور گھروں میں گھس گھس کر بے دریغ باعصمت عورتوں کی آبروریزی کی گئی۔ چنانچہ حافظ ابن کثیر (صاحب البدایہ والنہایہ) روایت بیان کرتے ہیں کہ ان دنوں ایک ہزار عورتیں بے شوہر کے حاملہ ہوئیں۔ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ

"جو شخص مدینہ منورہ کے ساتھ برائی کا ارادہ کرے گا اللہ تعالیٰ اسے جہنم کی آگ میں سیسہ کی طرح پگھلا دے گا۔"

مدینہ منورہ کی غارت گری کے بعد یہی فوج مکہ معظمہ کی طرف بڑھی جہاں حضرت عبداللہ بن زبیر نے اپنی حکومت قائم کر لی تھی اور شہر میں محصور ہو بیٹھے تھے۔ اس فوج نے منجنیقیں لگا کر خانہ کعبہ پر پتھر برسائے جس سے کعبہ شریف کی ایک دیوار شکستہ ہو گئی اور کہتے ہیں کہ بیت اللہ الحرام میں آگ بھی لگ گئی۔ (مسعودی ج ۲ ص ۹۷)

اگر واقعہ شہادت امام حسین رضی اللہ عنہ کی ذمہ داری سے کوئی راہ فرار اختیار بھی کی جا سکتی ہو تو حرمین شریفین کی اس بے حرمتی کی ذمہ داری سے جس کی تاریخ اسلام میں (قرامطہ کی غارتگری کے سوا) نظیر نہیں ملتی کس طرح انکار کیا جا سکتا ہے؟

کیا اس سے بھی زیادہ بدقسمت کوئی اسلام کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرنے والا ہو سکتا ہے جس نے اپنے اقتدار حکومت کی سہ سالہ قلیل مدت میں تین ایسے گناہ ہائے عظیم کا ارتکاب کیا ہو جن کے تصور سے بھی انسانیت و شرافت کی گردن جھک جاتی ہے۔

یزید کے حق میں سب سے اہم بات یہ کہی گئی ہے کہ اس نے ۵۰ھ یا ۵۲ھ میں تاریخ اسلام میں سب سے پہلے قسطنطنیہ پر چڑھائی کی اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بروایت بخاری ارشاد فرمایا ہے:

اول جیش من امتی یغزون مدینۃ قیصر مغفور لھم	میری امت کا سب سے پہلا لشکر جو قیصر کے شہر پر جہاد کرے گا اس کے گناہ بخش دیے جائیں گے۔

تو اول توجیہ یہ کہ ان الحسنات یذھبن السیئات کی تفسیر میں کہا گیا ہے صرف صغیرہ گناہوں کی معافی ہی مراد لی جائے گی۔ دوم حافظ ابن حجرؒ نے بحوالہ ابن التین و ابن المنیر لکھا ہے کہ اہل علم کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ بشارت اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ نمازی مغفرت

کا اہل بھی ہو یعنی عدم مغفرت کا کوئی اہم سبب موجود نہ ہو۔ مثلاً ان میں سے اگر مرتد ہو جائے تو ظاہر ہے کہ مغفرت کا کوئی سوال ہی باقی نہیں رہتا لہٰذا اگرچہ یزید نے یہ نیک کام کیا جو اس کی نجات کا سبب بن سکتا تھا مگر بعد کے عظیم گناہوں نے اس کا یہ حق ساقط کر دیا۔

اس کی مثال ایسی ہی ہے کہ جیسے کوئی طبیب حاذق کہے کہ خمیرہ مروارید کمزور سے کمزور آدمی کے دل و دماغ کو طاقت دے کر اسے تندرست بنا دیتا ہے۔ مگر کوئی عقلمند اگر خمیرہ مروارید کے استعمال کے بعد تھوڑا سا زہر بھی کھا لے تو ظاہر ہے کہ وہ موت کے منہ میں چلا جائے گا۔

افسوس ہے کہ گزشتہ چند سالوں سے ہندوستان اور پاکستان میں تاریخ اسلام کے قرن اول کے واقعات کے سلسلہ میں بڑی افراط و تفریط سے کام لیا جا رہا ہے۔ ایک طرف خلافت راشدہ کے عہد زریں کی عظیم الشان فتوحات اور ان کے نتیجہ میں اسلام کی عالمگیر اشاعت کو جس کی قرآن کریم میں مسلمانوں کو بشارت دی گئی تھی، قیصر و کسریٰ کی لشکر کشی کا ہم رنگ بنا کر پیش کیا جا رہا ہے جس سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اپنے قریب ترین ساتھیوں پر بھی اپنا اخلاقی و روحانی اثر قائم نہ کر سکے اور کوہ صفا سے بلند ہونے والی صدائے حق اس کی چوٹیوں سے ٹکرا کر رہ گئی حرمین سے باہر اس کی صداء بازگشت نہ سنی جا سکی اور اسلام خیر القرون میں بھی مظلوم انسانیت کے درد کا درماں نہ بن سکا اور کوئی عظیم معاشرتی اقتصادی اور سیاسی نظام نمونہ کے طور پر بھی قائم کرنے سے قاصر رہا۔

دوسری طرف یزید جیسے ظالم و جابر بادشاہ کو بھی "امیر المومنین" اور "رشید ابن الرشید" کا لقب دے کر اور اس کے ظالمانہ و سفاکانہ بلکہ بہیمانہ افعال کی رکیک تاویلات کر کے ظالم

عہ راقم الحروف نے اپنی کتاب تاریخ ملت ج ۳ (مطبوعہ ندوۃ المصنفین دہلی) میں تصریح کی ہے کہ یزید اس غزوہ میں اپنی مرضی کے خلاف حضرت معاویہ کے جبر سے شریک ہوا تھا۔

جابر حکمرانوں کے لیے اسلام کے دائرہ میں رہتے ہوئے، ہر قسم کے ظلم و جبر اور ناانصافی و بدکرداری کے دروازے کھولے جا رہے ہیں اور اسے اسلام کا مثالی حکمران قرار دیکر اسلام کی اعلیٰ اخلاقی قدروں کی بے قدری کی جا رہی ہے اور تاریخ اسلام کی تصریحات کو جھٹلا کر یزید کے دامن سے خون شہداء کے دھبے دھونے کے لیے اس عظیم تاریخی سرمایے کو مشکوک بنایا جا رہا ہے جس پر ملت اسلامیہ بجا طور پر ناز کر سکتی ہے۔

ضرورت ہے کہ دونوں طرف سمجھ بوجھ سے کام لیا جائے، انصاف کے دامن کو ہاتھ سے نہ دیا جائے اور اسلام اور تعلیمات اسلام اور اکابر اسلام کے تابناک چہروں کو داغدار نہ بنایا جائے۔

عبداللطیف اعظمی

اردو صحافت نگاروں کا سمینار

ایک رپورتاژ

اردو صحافت نگاروں کا ایک کل ہند سمینار ۲۵ر سے ۲۷ر جون تک تین روز نئی دہلی وگیان بھون میں منعقد ہوا۔ یہ اجتماع صحیح معنی میں اردو صحافت نگاروں کا نمایندہ اجتماع تھا اور آزادی کے بعد پہلی مرتبہ اردو اخبارات و رسائل کے اڈیٹروں اور نمایندوں کو اتنی بڑی تعداد میں کسی جگہ اکٹھا ہونے اور تبادلۂ خیال کا موقع ملا۔ اس لیے سمینار کے داعی محترمہ منورما دیوان (اڈیٹر پریس ایشیا انٹرنیشنل) اور جناب احمد رشید شروانی (صدر آل انڈیا اسمال اینڈ میڈیم نیوز پیپرز فیڈریشن) ہمارے شکریے کے مستحق ہیں۔

سمینار کا موضوع تھا: "ہند و پاک تعلقات اور اردو پریس کا رول"۔ اس موضوع پر خاص طور پر وقت کے سب سے اہم مسئلہ یعنی بنگلہ دیش کی تحریک آزادی اور مغربی پاکستان کی فوجی حکومت کے مظالم کی روشنی میں بحث و گفتگو کرنی تھی۔ اگرچہ، جیسا کہ سمینار میں مختلف مواقع پر کہا گیا کہ اردو کے اہم اور قابل ذکر اخبارات و رسائل اس مسئلے میں بنیادی طور پر متفق ہیں اور ایک دو کو چھوڑ کر، اردو کے سبھی اخبارات نے قومی پالیسی کا ساتھ دیا ہے اور مغربی پاکستان کی فوجی حکومت کے مظالم کی مذمت کی ہے اور بنگلہ دیش کے مظلومین کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا ہے مگر پھر بھی اس لحاظ سے یہ سمینار بہت ضروری اور بر وقت تھا کہ اردو کے بہت سے صحافت نگاروں کا ذہن پوری طرح صاف نہیں تھا اور ان کو صحیح صورت حال کا پوری طرح اندازہ

نہیں تھا۔ افسوس کہ چند اخبارات کے اڈیٹر اس سیمینار میں شرکت نہ کر سکے، جن کی شرکت ان کے لیے بھی مفید ہوتی اور ان کے قارئین کے لیے بھی۔ اگرچہ ایسے اخبارات کی تعداد بہت کم ہے، مگر ان کی غیر حاضری مجھ جیسے اور لوگوں کو بھی محسوس ہوئی۔ ممکن ہے ان کی عدم شرکت کی وجہ ان کی کوئی مجبوری رہی ہو، مگر شرکائے سیمینار میں سے بعض لوگوں کا خیال تھا کہ انھیں اپنے کمزور موقف کا اندازہ تھا اور انھوں نے قصداً شرکت نہیں کی ہے اور ان کا شرکت نہ کرنا ہی بہتر تھا، کیونکہ اگر وہ قومی پالیسی سے پوری طرح اپنے آپ کو ہم آہنگ نہ کر سکے اور ظالموں کی کھل کر مذمت نہیں کی اور مظلومین کے ساتھ غیر مشروط ہمدردی کا اظہار نہیں کیا تو اس کے لیے ان کے پاس کوئی عقلی دلیل نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ ان کی مخصوص مصلحتیں اور ان کے ذاتی مفادات ہیں۔ اس لیے ان کی شرکت سے صورت حال میں کوئی خاص تبدیلی کی امید نہیں کی جا سکتی۔

افتتاحی جلسے کی صدارت پروفیسر نہار رنجن رے نے کی۔ پروفیسر رے کا خاص مضمون تاریخ ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اپنے مضمون پر ان کی نظر بہت وسیع ہے اور ان کا ذہن ہر قسم کے تعصبات سے پاک ہے، اس سیمینار کے افتتاحی جلسے کی صدارت کا جواز شاید یہ تھا کہ وہ بنگالی ہیں اور کبھی اس علاقے سے وطنی تعلق رکھتے تھے، جسے اب بنگلہ دیش کہا جا رہا ہے۔
افتتاحی تقریر کے لئے اردو کے مشہور صحافی جناب حیات اللہ انصاری صاحب سے درخواست کی گئی۔ یہ انتخاب جتنا اچھا تھا اتنی ہی اچھی انھوں نے تقریر کی۔ انھوں نے اردو صحافت کے متعلق ایک بڑے پتے کی بات کہی۔ انھوں نے فرمایا کہ "صرف اردو صحافت میں یہ خوبی ہے کہ اس میں ہر قسم کے اور جملہ خیالات مل جاتے ہیں، اس میں جن سنگھ بھی ہے، مسلم لیگ بھی ہے، مسلم مجلس بھی ہے، مجلس مشاورت بھی ہے اور قوم پرور اور سیکولر جماعتیں اور اشخاص بھی ہیں۔ یہ خصوصیت ہندوستان کی کسی اور زبان کی صحافت کو حاصل نہیں ہے۔" مغربی پاکستان کی فوجی حکومت کے مظالم اور اس کے نتائج کے سلسلے میں انھوں نے جس چیز پر

خاص طور سے زور دیا یہ تھی کہ "ساٹھ لاکھ پناہ گزینوں کا مسئلہ بے حد سخت مسئلہ ہے، یہ ایک آتش فشاں ہے، اگر پھٹا تو جانے کہاں تک جائے۔ اس آتش فشاں کو ہندو مسلم فساد کی شکل دینے سے اگر کوئی چیز روک سکتی ہے تو وہ ہے شیخ مجیب الرحمان کا نام اور بنگلہ دیش کا نعرہ، جب تک شیخ مجیب الرحمان سے ہندوستان اور پناہ گزینوں کو محبت ہے، ہندوستان فرقہ واریت کا شکار نہیں ہو سکتا۔" حیات اللہ انصاری صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ "اردو کے اخبارات ورسائل نے بحیثیت مجموعی، ایک دو کو چھوڑ کر، بنگلا دیش کے سلسلے میں حکومت ہند کی پالیسی اور طرز عمل کی تائید کی ہے۔"

سہ پہر کو ایک پریس کانفرنس کا انتظام کیا گیا تھا، جس میں وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے اڈیٹروں سے خطاب کیا اور اڈیٹروں کے مختلف سوالات کے جواب دئے۔ اس قسم کی پریس کانفرنس میں راقم الحروف کو پہلی مرتبہ شرکت کا موقع ملا تھا، یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ وزیر اعظم صاحبہ نے بڑی وضاحت کے ساتھ بنگلا دیش کے مسائل پر روشنی ڈالی اور بڑی صفائی کے ساتھ حکومت کی پالیسی بیان کی۔ ایک سوال کے جواب میں اردو کے بارے میں فرمایا کہ انھوں نے یوپی کے وزیر اعلیٰ سے بات کی ہے اور انھوں نے اپنی ریاست میں اردو کو ضروری سہولتیں دینے کا وعدہ کیا ہے، انھوں نے یہ بھی کہا کہ اس طرح کی گفتگو وہ جلد ہی بہار کے وزیر اعلیٰ سے بھی کریں گی۔

دوسرے روز، ۲۶ رجون کو، صبح اور سہ پہر کے جلسوں کی صدارت دو موقر رسالوں کے مدیر جناب ضیاء الحسن فاروقی صاحب، مدیر ماہنامہ جامعہ اور جناب مالک رام صاحب مدیر تہماہی تحریر نے کی۔ ان جلسوں میں بنگلا دیش کے مسائل اور اس سے پیدا ہونے والی سیاسی و معاشی صورت حال پر مقالے پڑھے گئے اور تقریریں کی گئیں۔ سب سے پہلے حیدرآباد کے موقر روزنامہ "سیاست" کے مدیر جناب عابد علی خاں صاحب نے تقریر کی۔ انھوں نے اس پر اظہار افسوس کیا کہ اردو اخبارات کی اہمیت کو تسلیم نہیں کیا جاتا۔ ارباب اختیار ان

کے خیالات کی اہمیت کو اس وقت تک محسوس نہیں کرتے جب تک ان کو کسی اور زبان میں ترجمہ نہ کیا جائے۔ انھوں نے شکایت کی کہ اردو اخبارات حکومت پر تنقید کرتے ہیں تو ان کی وفاداری ہی کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، حالانکہ وہ بھی اتنے ہی محب الوطن ہیں جتنے ملک کی دوسری زبانوں کے اخبارات ہو سکتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ اردو کے اخبارات ورسائل بنگلا دیش کے معاملات اور مسائل میں اتنی ہی دلچسپی لے رہے ہیں، جتنی ہندوستان کے کسی شہری کو لینی چاہیئے۔ ممکن ہے کہ بعض اخبارات ورسائل کی روش نامناسب رہی ہو مگر ایسی مثالیں دوسری زبانوں کے اخبارات میں بھی مل جائیں گی۔ موصوف کی تقریر ختم ہوئی تو کلکتہ کے اخبارات کے اڈیٹروں نے مطالبہ کیا کہ زیر بحث مسئلے کا ان سے سب سے گہرا تعلق ہے، اس لیے سب سے پہلے انھیں بولنے کا موقع دیا جائے۔ چنانچہ صدر جلسہ کی اجازت سے جناب احمد سعید ملیح آبادی صاحب، مدیر روزانہ آزاد ہند اور جناب فریدی صاحب اڈیٹر روزانہ ہند نے تقریریں کیں۔ انھوں نے فرمایا کہ مشرقی بنگال سے سب سے پہلے بہت بڑی تعداد میں مسلمان مہاجرین آئے اور اس کے بعد بڑی کثرت کے ساتھ مسلمان مہاجرین آئے اور اس کے بعد بڑی کثرت کے ساتھ ہندو پناہ گزیں آئے۔ اس کی وجہ سے ایسی صورت حال پیدا ہو گئی تھی کہ ہر وقت فرقہ وارانہ جھگڑے کا بہت بڑا خطرہ پیدا ہو گیا تھا، مگر اخبارات کی احتیاط اور حکومت کی بیدار مغزی کی وجہ سے یہ خطرہ ٹل گیا۔

یہ دونوں تقریریں ختم ہوئیں تو پٹنہ کے روزنامہ "سنگم" کے اڈیٹر جناب غلام سرور صاحب نے مطالبہ کیا کہ کلکتہ کے بعد بہار کو موقع ملنا چاہیئے، کیونکہ بنگلا دیش کے واقعات سے مغربی بنگال کے بعد اگر کسی علاقے کے لوگ سب سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں تو وہ بہاری ہیں۔ وہ ایک طویل مقالہ لکھ کر لائے تھے، جس کے لیے وقت نہیں تھا، اس لیے انھوں نے ایک مختصر جذباتی تقریر کی۔ انھوں نے فرمایا کہ ہم نے یحییٰ خاں کی کبھی تائید نہیں کی، ہمیشہ کھل کر شیخ مجیب کی تعریف کی اور ان کے اقدامات کی حمایت کی اور فوجی حکومت نے وہاں جو مظالم کیے ہیں، ان کی

غیر مشروط مذمت کی ہے۔ مگر جب ہمیں مصدقہ اطلاعات ملیں کہ بنگلا دیش کی تحریک کے دوران ہم میں سے کسی کا بھائی مارا گیا، کسی بہن کی عزت لوٹی گئی، کسی کا باپ اور کسی کی ماں قتل ہوئی، کسی کی لڑکی یا بہن بیوہ ہوگئی تو ہم نے چند آنسو بہانے کی یقیناً غلطی کی ہے، کیا کیا جائے ہم انسان ہیں اور ہم ان مظالم پر صبر و ضبط سے کام نہ لے سکے۔ انھوں نے ذرا اور اونچی آواز میں کہا کہ میرے پاس ان مظالم کے ناقابل تردید ثبوت ہیں۔ اس موقع پر بہار ہی کے ایک اور اڈیٹر، جناب انیس الرحمان، مدیر ہفتہ وار "پرچم ہند" اور روزنامہ "ملک وملت" نے کھڑے ہوکر سوال کیا کہ آپ کے پاس کون سے ثبوت ہیں، مگر فاضل مقرر نے پھر اسی جملے کو دہرایا کہ میرے پاس ناقابل تردید ثبوت ہیں تو انیس الرحمان صاحب نے قریب کے لوگوں سے کہا کہ یہ بہاری بھی خوب ہیں، جب تک ہندوستان میں رہے یہاں کی اکثریت کی مخالفت کرتے رہے اور جب مشرقی پاکستان گئے تو وہاں کی اکثریت کی مخالفت کرتے رہے۔

لنچ کے لیے یہ سیشن ختم ہونے کو آیا تو صدر جلسہ جناب ضیاء الحسن فاروقی صاحب نے حسب ذیل صدارتی تقریر کی:

"مجھے کہنا تو بہت کچھ تھا مگر وقت کی تنگی کے سبب صرف دو تین باتیں بہت اختصار سے کہوں گا۔ میرا احساس یہ ہے کہ آزادی کے بعد اردو صحافت، خاص طور سے مُسلم صحافت نے مسلمانوں یا اردو داں طبقے کے ذہن کو جدید نظریات سے ہم آہنگ بنانے کا وہ تعمیری رول نہیں ادا کیا جو ملک کے بدلے ہوئے حالات میں خاص طور سے اولین اہمیت کا حامل تھا، بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ بعض تصورات کو، دانستہ یا نادانستہ، بعض جماعتی اخباروں نے غلط اور گمراہ کن تعبیرات سے مسخ کر کے مُسلم عوام کے سامنے پیش کیا۔ اس سلسلے میں میں صرف ایک مثال پیش کروں گا۔ اردو اخباروں میں "سیکولر" لفظ کا ترجمہ برسوں 'لادینی' یا غیر مذہبی کیا جاتا رہا اور اس پر طنز و تشنیع کے ساتھ لکھا جاتا رہا، یہ وہ غلطی تھی جو ساٹھ پینسٹھ برس پہلے ترکی کے مفکر ضیا گوکلپ نے

فرانسیسی لفظ جو سیکولر کے تقریباً ہم معنی ہے، یعنی .... کا ترجمہ لادینی کر کے ترکی کے رجعت پرستوں کو جدیدیت کے خلاف ایک محاذ بنانے کے لئے سہولت بہم پہونچائی تھی، اردو اخبارات آج بھی نیشنلزم کی صحیح تصویر پیش نہیں کرتے اور ڈیموکریسی، سوشلزم اور سیکولرزم کی اشاعت دل کے یقین کے ساتھ نہیں کرتے۔ بعض اخباروں میں تو آج بھی ان جدید تصورات کے حامی مسلمانوں کو واوین میں سیکولر مسلمان اور نیشنلسٹ مسلمان کہہ کر مطعون کیا جاتا ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ مسلم پریس کو چاہئے کہ ظلمت پسندی کے اس رویے کو ترک کر کے نئے ہندوستان اور نئی نسل کی امنگوں سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کرے اور سیکولرزم، سوشلزم اور ڈیموکریسی کے تصورات کی اشاعت کرے کہ اس میں ملک کا اور خاص طور سے مسلمانوں کا فائدہ ہے۔

جہاں تک بنگلہ دیش کی تحریک کا تعلق ہے، اردو پریس کے ایک خاص حصہ کا رول درست نہیں رہا ہے۔ اردو پریس جس نے جنگ آزادی میں نمایاں حصہ لیا تھا، بنگلہ دیش کی تحریک آزادی کی مخالفت کیسے کر سکتا ہے، یا اس کی طرف سے چشم پوشی کیسے روا رکھ سکتا ہے۔ اس تحریک کو اس طرح دیکھنا چاہئے کہ یہ جمہوریت، سوشلزم اور سیکولرزم کی جنگ ہے ظلم، اجارہ داری اور استحصال کے خلاف، اس طرح یہ درحقیقت نظریات کی جنگ ہے۔ جب دنیا کے کسی حصہ پر ظلم ہوتا ہے تو ہمارے ملک کا باشعور طبقہ جس میں اردو والے اور مسلمان بھی ہوتے ہیں، تڑپ اٹھتا ہے، پھر کیسے پڑوس میں ہونے والے انسانیت سوز مظالم کے خلاف ہم رہ سکتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ سارا اردو پریس بنگلہ دیش کے کاز اور تحریک کی کھل کر حمایت کرے گا۔

سہ پہر کے اجلاس کی صدارت جناب مالک رام صاحب نے کی۔ تقریروں کا سلسلہ جو صبح کے اجلاس میں شروع ہوا تھا وہ جاری رہا۔ اس اجلاس میں سب سے اہم تقریر سری نگر کے ہفتہ وار "آئینہ" کے اڈیٹر جناب شمیم احمد شمیم نے کی۔ روزنامہ "قومی آواز" کے مدیر جناب

بات اللہ انصاری صاحب کی افتتاحی تقریر کے بعد جو فضا پیدا ہوئی تھی کہ اردو اخبارات و
مائل، چند کو چھوڑ کر بحیثیت مجموعی سب نے بنگلا دیش کے سلسلے میں قومی پالیسی اور حکومت
ے اقدامات کی حمایت کی ہے، شمیم صاحب کی تقریر سے، بڑی حد تک ختم ہو گئی۔ انھوں نے یہاں
ک کہا کہ بعض اخبارات میں ایسے ادارتی نوٹ لکھے جاتے ہیں جیسے خود یحییٰ خاں بول رہے
رں، اگر ان اخبارات پر مقام اشاعت درج نہ ہو تو ایسا ہی معلوم ہوگا جیسے یہ لاہور سے
لتے ہیں۔

تیسرے اور آخری دن کے اجلاس کی صدارت جناب یونس سلیم صاحب نے کی۔ یہ
جلاس اردو اخبارات و رسائل کے مسائل کے لیے مخصوص تھا۔ بیشتر اڈیٹروں نے اردو اخبارات
کی مشکلات کا ذکر کیا اور حکومت ہند سے مختلف قسم کی مراعات اور سہولتوں کا مطالبہ کیا۔ دوسرے
دن کے اجلاس میں ڈاکٹر انور معظم صاحب (عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد) نے "ہندوستان کے
اردو قارئین کا مسئلہ" کے عنوان سے ایک مقالہ پڑھا تھا۔ یہ مقالہ دراصل تیسرے دن کے
اجلاس کے موضوع سے تعلق رکھتا تھا، اس لیے اس مقالہ کی تجاویز کو اس اجلاس میں بھی دہرایا
گیا۔ موصوف نے اس مقالے میں بڑی صفائی کے ساتھ اردو اخبارات کی خامیوں پر اظہار
خیال کیا ہے۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

> "اگر ہم آج کے اردو اخبارات و رسائل کو دیکھیں تو بڑی مایوسی ہوتی ہے۔ عام طور پر
> اردو پریس حقائق حاضرہ سے بے خبر نظر آتا ہے اور اپنے پڑھنے والوں کی آراء کی تشکیل
> کی عظیم ذمہ داری کا احساس بھی بڑی حد تک مفقود ہے ..."
>
> "اردو روزنامے اور ہفتہ وار اپنے لکھنے والوں میں اچھے تبصرہ نگاروں، فیچر نگاروں،
> دانش وروں اور عالموں کی غیر موجودگی کی وجہ سے ممتاز نہیں اور یہی اچھے تبصروں، فیچرز
> اور مضامین کی کمی ہے، جس کی وجہ سے اردو پڑھنے والے انگریزی اخبارات کا رخ
> کرتے ہیں۔ اردو پریس نے عام طور سے اپنے کو محض مسلمانوں کی تاریخ، جغرافیہ، مذہب،

ادب اور تعلیم کے مسائل تک محدود رکھا ہے۔ کوئی نہیں سوچتا کہ ایسا کر کے ہم اردو قارئین کو جاہل سے جاہل تر بناتے جا رہے ہیں، انھیں اپنے حال سے اور زیادہ بے خبر اور مستقبل سے اور زیادہ مایوس کر رہے ہیں۔"

ڈاکٹر عابد رضا بیدار (نہرو یونیورسٹی دہلی) نے اپنی مختصر تقریر میں فرمایا کہ اردو کے بیشتر اخبارات و رسائل کی مالی حالت ایسی نہیں ہے کہ وہ بیرونی اخبارات و رسائل کو یا حالات حاضرہ پر جو اہم کتابیں وقتاً فوقتاً چھپتی ہیں، انھیں خرید سکیں، اس کی وجہ سے وہ اپنے قارئین کو اہم مسائل پر اچھا مواد پیش کرنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ مگر افسوس ناک بات یہ ہے، انھوں نے مزید فرمایا کہ لائبریریوں میں مفید اخبارات و رسائل اور کتابوں کے جس قدر انتظامات ہوتے ہیں، ان سے بھی اردو کے اخبارات و رسائل پوری طرح فائدہ نہیں اٹھاتے۔ انھوں نے فرمایا کہ سپرو ہاؤس کی لائبریری میں بہترین بیرونی اخبارات و رسائل آتے ہیں اور حالات حاضرہ پر اچھی سے اچھی کتابیں چھپنے کے فوراً بعد مہیا کی جاتی ہیں، ان سے دہلی کے اخبارات و رسائل آسانی سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ دوسری جگہوں کے اڈیٹروں کو جب بھی دہلی آنے کا موقع ملے، جس طرح اس وقت تشریف لائے ہیں وہ ان قیمتی خزانوں سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔" روزنامہ الجمعیۃ (دہلی) کے سب اڈیٹر جناب سلیمان صابر صاحب نے ورکنگ جرنلسٹوں کے حقوق کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرمایا کہ اردو میں اتنے زیادہ اخبارات کے بجائے اگر چند نکالے جائیں تو اس سے اردو صحافت کا معیار بھی بلند ہوگا اور قوم و ملک کو بھی فائدہ پہنچے گا۔

وقت کم تھا اور مقررین کی تعداد زیادہ، اس لیے یہ اجلاس زیادہ تر انتشار کا شکار رہا، مگر اسی میں وہ تجویز پیش کی گئی جو اس سہ روزہ سمینار کا حاصل کہی جا سکتی ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ یہ تجویز بغیر کسی اختلاف کے بالاتفاق منظور کر لی گئی۔ سمینار میں ہر خیال کے لوگ تھے، نرم بھی گرم بھی، جماعتی بھی قوم پرور بھی، اور ایسے بھی جو اپنی رائے کے علاوہ کسی کی رائے نہیں مانتے، مگر پھر بھی بغیر کسی بحث مباحثہ اور بغیر کسی اختلاف کے یہ قرارداد منظور کر لی گئی۔

یہ بڑی بات ہے اور سیمنار کی بہت بڑی کامیابی ہے۔ قرارداد اخبارات میں چھپ چکی ہے اس لیے میرے خیال میں یہاں درج کرنے کی ضرورت نہیں۔

اس سہ روزہ سمینار میں بعض وزیروں اور نائب وزیروں نے بھی تقریریں کیں۔ افتتاحی اجلاس میں وزیر ریاست برائے اطلاعات و نشریات شریمتی نندنی ستپتی نے، دوسرے دن کے صبح کے اجلاس میں وزیر داخلہ جناب کے سی پنٹ نے اور سہ پہر کے اجلاس میں جناب گجرال صاحب نے اور آخری دن شام کو جناب ایف ایچ محسن صاحب نے تقریریں کیں۔ یہ تقریریں بہت مفید اور معلوماتی تھیں۔ امید ہے کہ ان سے اُن اڈیٹروں کو ضرور فائدہ ہوا ہوگا جن کا ذہن صاف نہیں تھا اور ملک کے موجودہ مسائل کو پوری طرح سمجھنے اور سمجھانے سے قاصر تھے۔ یہ تمام تقریریں، سوائے شریمتی نندنی ستپتی کی تقریر کے، اردو میں تھیں اور بہت اچھی اردو میں۔ دو انگریزی روزناموں کے اڈیٹر، جناب کلدیپ نیّر، اڈیٹر روزنامہ "اسٹیٹس مین" (نئی دہلی) اور جناب عبیدالرحمان اڈیٹر روزنامہ "پیوپل" (ڈھاکہ) کو بھی بطور خاص تقریر کی دعوت دی گئی تھی۔ کلدیپ نیّر صاحب نے اردو میں تقریر کی۔ انھوں نے اصل موضوع پر کچھ کہنے سے پہلے فرمایا کہ انھوں نے اپنی جرنلزم کا آغاز ایک اردو اخبار سے کیا۔ انھوں نے فرمایا کہ جب وہ پاکستان کے قیام کے بعد اپنا وطن چھوڑ کر دہلی آئے تو "انجام" (دہلی) میں کام شروع کیا، تنخواہ سو روپے ماہانہ تھی اور اخبار میں کام کرنے کے علاوہ اخبار کے مالک کے بچوں کو انگریزی بھی پڑھانی پڑتی تھی۔ ان کی تقریر کے اسی حصہ سے فائدہ اٹھاکر فرقہ پرستی کو ہوا دینے کی کوشش کی گئی۔ آخری دن جب جناب محمد یونس سلیم صاحب کی صدارت میں جلسہ منعقد ہوا تو رام پور کے ایک روزنامہ کے فاضل مدیر نے اس حصے کا حوالہ دے کر فرمایا کہ پاکستان سے ہجرت کرکے ایک کلدیپ نیّر صاحب آئے جنھوں نے اردو کے ایک معمولی اخبار سے اپنی صحافت کا آغاز کیا، مگر آج وہ ایک بلند مرتبہ انگریزی اخبار کے اڈیٹر ہیں اور ان کا جرنلزم کی دنیا میں ایک اونچا مقام ہے، دوسری طرف پاکستان

سے ہجرت کر کے مولانا محمد عثمان فارقلیط صاحب تشریف لائے، مسلمان ہونے کے باوجود پاکستان پر ہندوستان کو ترجیح دی۔ جرنلزم کی دنیا میں پہلے سے وہ بلند مرتبہ کے مالک تھے، مگر کچھ عرصہ ہوا جب انھیں ان کے کسی ادارتی نوٹ کے خلاف دفعہ ۱۵۳ الف کے تحت عدالت سے سزا سنائی گئی تو باوجود اس کے کہ وہ کافی ضعیف ہیں، طویل عرصے سے بیمار تھے، کمزوری سے کمر جھک گئی ہے، مگر پھر بھی ہتھکڑی پہنا کر انھیں جیل لے جایا گیا۔ یہاں کلدیپ نیر صاحب اور مولانا محمد عثمان فارقلیط صاحب کے موازنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی، مگر کیا کیا جائے اردو اخبارات کے اڈیٹروں کا ذہن عام طور پر اسی طرح کام کرتا ہے۔ چاہے اس کی وجہ فرقہ پرستی ہو یا تنگ نظری یا علم کی کمی یا فرسٹریشن، مگر ان کے سوچنے کا انداز یہی ہے۔ الّاماشاءاللہ

"پیوپل" (ڈھاکہ) کے اڈیٹر عبیدالرحمان صاحب نے انگریزی میں تقریر کی۔ ان کی تقریر سن کر مجھے مرحوم بھولابھائی ڈیسائی یاد آ گئے۔ خطابت، سلاست اور زبان کے لحاظ سے بہت عمدہ تھی۔ انھوں نے بنگلا دیش کی صحیح صورت حال بیان کی اور خاص طور پر ان شکایتوں کی تردید کی جن میں کہا گیا تھا کہ بنگالیوں نے غیر بنگالیوں پر مظالم ڈھائے۔ انھوں نے بڑے اعتماد اور یقین کے ساتھ فرمایا کہ ۲۵ مارچ سے قبل کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا، اس کے بعد جب وہاں امن وامان ختم ہو گیا تھا، اس وقت اگر کچھ ہوا ہو تو اس کی ذمہ داری تحریک بنگلادیش پر نہیں آتی۔ ان کے ارشاد پر شیخ مجیب الرحمان کی ایک تقریر کا ریکارڈ بھی سنایا گیا، جس میں انھوں نے پٹھانوں، بہاریوں، مسلمانوں، ہندوؤں اور دوسرے تمام لوگوں سے اپیل کی تھی کہ ان سے تعاون کریں اور ان کی تحریک کو طاقتور بنائیں۔ اس موقع پر راقم الحروف کو جناب تاج الدین احمد کا ایک بیان یاد آیا، جس میں انھوں نے کہا ہے کہ "قتل وغارت گری سے کچھ عرصہ پہلے، ایک الیس الیس جی کمانڈو گروپ کو، جو توڑ پھوڑ اور قتل کی پوشیدہ کارروائیاں کرنے کے لیے خاص طور پر تربیت دی گئی ہے، بنگلا دیش کے کلیدی مرکزوں پر پھیلا دیا گیا۔ غالباً یہی گروپ ۲۵ مارچ سے دو دن پہلے ڈھاکہ اور سیدپور میں بنگالیوں پر حملہ کا ذمہ دار تھا تاکہ مقامی اور غیر مقامی لوگوں میں تصادم

کرا کر فوجی مداخلت کا جواز پیدا کیا جائے۔"

چاٹگام یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر عبدالرؤف ملک نے بھی اپنے مختلف بیانات میں ۲۵؍مارچ سے قبل غیر بنگالیوں کے قتل عام کی تردید کی ہے۔ انھوں نے ایک سوال کے جواب میں فرمایا کہ "بہاریوں نے جب فوجی حکمرانوں کا ساتھ دینا شروع کیا تو ان کے خلاف بنگالیوں میں نفرت کے جذبات پیدا ہوئے، لیکن ۲۵؍مارچ سے قبل بہاریوں کے خلاف ایک بھی واقعہ نہیں ہوا۔"

اس کانفرنس میں بہاریوں کے خلاف بنگالیوں کے مظالم کا سوال باقاعدہ طور پر روزنامہ "سنگم" (پٹنہ) کے محترم اڈیٹر نے اٹھایا تھا، جن کے بارے میں روزنامہ "قومی آواز" (لکھنؤ) کے فاضل مدیر نے، اس کانفرنس کے مباحث پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "وہ اپنی فرقہ واریت کے لیے مشہور ہو چکے ہیں۔"[1] مگر انھوں نے کوئی ثبوت نہیں پیش کیا تھا، صرف دعویٰ کیا تھا کہ میرے پاس ناقابل تردید ثبوت ہیں۔ مگر اس سلسلے میں عام طور پر لوگ نجی خطوط کا ذکر کرتے ہیں۔ اگرچہ ذکر کرنے والوں سے ... پوچھا جائے کہ کیا انھوں نے خود ان خطوط کو دیکھا ہے تو نفی میں جواب دیں گے اور اگر پوچھا جائے کہ یہ خطوط بنگلا دیش کے کن علاقوں سے لکھے گئے ہیں اور کن تاریخوں میں ..... تو بڑی ہی معصومیت کے ساتھ اپنی ناواقفیت کا اعتراف کریں گے، مگر یہ واقعہ ہے کہ بنگلا دیش کے خلاف پروپگنڈے کا یہ طریقہ بہت باقاعدگی کے ساتھ جاری ہے۔ مجھے جب معلوم ہوا کہ "سنگم" میں اس طرح کے خطوط شائع کیے جاتے ہیں، تو اس سے خیال آیا کہ شاید ان ہی خطوط کو "ناقابل تردید ثبوت" کہا گیا تھا، چنانچہ ان کو دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ ایک مقامی روزنامے کی مدد سے "سنگم" کے کچھ شمارے دیکھنے کو ملے۔ خوش قسمتی سے ان میں ایک ایسا شمارہ بھی تھا، جس میں بہت ہی جلی اور متعدد عنوانات کے تحت کچھ خطوط شائع ہوئے ہیں۔ یہ ۸؍جولائی کا شمارہ تھا اور کل چھوٹے

---

[1] قومی آواز ـــــ اداریہ، مورخہ یکم جولائی ۱۹۷۱ء

بڑے چار خط تھے۔ پہلا خط کراچی سے ۲۶ جون کا، دوسرا چاٹگام سے ۲۴ مئی کا، تیسرے پر نہ تاریخ درج تھی اور نہ مقام، چوتھا بہار کے ایک صاحب کا تھا جو موضع سید آباد ضلع گیا سے لکھا گیا تھا کہ فلاں سلمہٗ کا خط ڈھاکہ سے بذریعہ کراچی موصول ہوا، جس میں لکھا ہے کہ .... ان خطوط کو میں نے غور سے پڑھا، ان میں کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نہیں تھا جو ۲۵ مارچ سے پہلے پیش آیا ہو۔ پہلا خط سب سے بڑا ہے، مگر اس میں کسی واقعہ کے ساتھ سرے سے کوئی تاریخ ہی درج نہیں ہے، مگر "سانتاہار" اور "سید پور" کے فسادات یا حملوں کا ذکر ہے، اس سے خیال ہوتا ہے کہ شاید ان ہی حادثات کا ذکر ہے، جن کا چوتھے خط میں ذکر ہے اور جو ۲۶ مارچ سے ۳ اپریل تک واقع ہوئے۔ دوسرے خط میں لکھا ہے کہ "۲۵ مارچ کے بعد سے جن جن حالات سے ہم سب گزرے ہیں، اگر اسے قلمبند کروں تو ایک طویل داستان بن جائے۔" تیسرے خط میں ہے۔ "مورخہ ۴ اپریل کے ہنگامے میں مقامی آبادی نے مسلح ہو کر تمام کارخانے کو محاصرہ میں لے لیا اور پھر...." چوتھے خط میں درج ہے کہ "وہ ۲۴ مارچ اپنے حوالدار کے ساتھ سید پور جا رہے تھے۔ راستہ میں سانتاہار میں ٹھہر گئے۔ ۲۶ مارچ کو... کے مکان پر... حملہ ہوا اور سب ۳ اپریل تک مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہوئے۔"

مختلف قابل اعتماد ذرائع سے مجھے جو کچھ معلوم ہو سکا یہ ہے کہ غیر بنگالیوں کے خلاف بنگالیوں کے جن مظالم کا بڑی کثرت سے ذکر کیا جاتا ہے، چاہے وہ اتنے ہی بھیانک اور وحشیانہ ہوں، جن کا پروپگنڈہ کیا جاتا ہے، مگر اغلباً وہ ۲۵ مارچ کے بعد کئے گئے ہیں اور جس انداز سے ان کا ذکر کیا جاتا ہے اس سے یہ تاثر بھی پیدا ہوتا ہے کہ ان کے ذکر سے مغربی پاکستان کی فوجی حکومت کے بہیمانہ مظالم پر پردہ ڈالنا یا ان کی شدت کو کم کرنا ہے۔ اس سہ روزہ سیمینار سے جسے بجا طور پر کانفرنس کہنا چاہیئے، اس پروپگنڈے کی تردید کا اچھا موقع ملا اور وہ اخبارات و اشخاص جو اس پروپگنڈے میں پیش پیش ہیں، بے نقاب ہوگئے۔

عبداللطیف اعظمی

کوائف جامعہ

پروفیسر محمد حبیب کی وفات

۲۲ جون کو رات کے وقت علی گڑھ سے ٹیلیفون کے ذریعہ پروفیسر محمد حبیب صاحب کے انتقال کی اطلاع ملی۔ دوسرے روز بعد دوپہر یونیورسٹی کے قبرستان میں سپرد خاک کیے گئے۔ نماز جنازہ اور تدفین میں یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبا نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ جامعہ سے مرحوم کے چھوٹے بھائی، پروفیسر محمد مجیب صاحب اور بیگم آصف مجیب نے شرکت کی، مرحوم کے چھوٹے صاحبزادے، پروفیسر عرفان حبیب اُس وقت شملے میں تھے، بارش کی وجہ سے راستہ خراب تھا مگر پھر بھی کسی نہ کسی طرح وہ ۲۳ کو علی گڑھ پہنچ گئے اور نماز جنازہ اور تدفین میں شرکت کی۔

جامعہ میں انتقال کی افسوسناک اطلاع، خاص خاص لوگوں کو ۲۲ کی رات ہی کو معلوم ہو گئی تھی عام لوگوں کو دوسرے روز اخبارات اور ریڈیو سے معلوم ہوئی۔ تعطیلات گرما کی وجہ سے تعلیمی ادارے بند تھے اور اساتذہ میں سے بہت کم لوگ جامعہ میں موجود تھے۔ اس لیے انجمن انتظامی اسٹاف کے سکریٹری جناب ضمیر حسن صاحب کی دعوت پر ۲۳ کی سہ پہر میں ایک تعزیتی جلسہ منعقد ہوا اور جناب مسجل صاحب جامعہ کی طرف سے سوئم کے دن (۲۴ جون) محمد علی ہال میں قرآن خوانی کا انتظام کیا گیا جس میں جامعہ کے استادوں، کارکنوں اور طالب علموں نے شرکت کی

تعزیتی جلسے کی صدارت جناب سید مجتبیٰ حسین زیدی صاحب نے کی اور راقم الحروف نے مرحوم کے بارے میں ایک مختصر تقریر کی۔ راقم الحروف نے کہا کہ مرحوم ایک بہت بڑے اسکالر اور بلند پایہ مورخ تھے۔ انھوں نے ہندوستان کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں اور شخصیتوں پر متعدد مضامین اور چھوٹی چھوٹی کتابیں لکھی ہیں، جو حجم کے لحاظ سے اگرچہ بہت مختصر ہیں، مگر علمی اور تاریخی نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت رکھتی ہیں اور بہت سی ضخیم کتابوں پر بھاری ہیں۔ ۱۹۲۴ء میں علمی و تعلیمی دنیا میں عمل قدم رکھنے کے دو ہی سال کے اندر جب ان کی پہلی کتاب "سلطان محمود آف غزنہ" شائع ہوئی تو اگرچہ بہت مختصر تھی، مگر ان کے گہرے مطالعہ، مورخانہ معروضیت اور دلکش اسلوب بیان کا سکہ لوگوں کے دلوں پر بیٹھ گیا۔ ان کی آخری کتاب[1] بہت بڑا تاریخی کارنامہ ہے،

---

[1] پروفیسر محمد مجیب صاحب علی گڑھ سے واپس آئے تو انھوں نے فرمایا کہ مرحوم کو اپنی زندگی کے آخری حصے میں جبکہ ان کی صحت کافی گر گئی تھی، ضیاء الدین برنی کی مشہور کتاب "تاریخ فیروز شاہی" کا انگریزی میں ترجمہ کرنے کا خیال آیا۔ انھوں نے یہ کام شروع کیا اور ایسی حالت میں بھی کرتے رہے جب انھیں سخت بخار تھا اور دوسری ایسی تکلیفیں تھیں جن کی وجہ سے ان کے لیے تھوڑی دیر کے لیے بھی بیٹھنا مشکل تھا، مگر اس کے باوجود انھوں نے اس کتاب کا ترجمہ مکمل کر لیا۔ یہ ترجمہ ان کی وفات سے صرف چار روز پہلے مکمل ہوا تھا۔ لطیف اعظمی

یہ کتاب تاریخ ہند کے سلسلہ کی کڑی ہے اور ہندوستان کے عہد سلطنت (۱۵۲۶-۱۲۰۶ء) پر مشتمل ہے اور پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحب کے اشتراک میں لکھی گئی ہے۔ پچھلے چند برسوں میں جب بھی میں ان سے ملنے کے لیے گیا تو صحت کی خرابی کے باوجود ان کو اس کتاب کے لکھنے میں مصروف ومشغول پایا۔ وہ فرماتے میں اسے جلد سے جلد مکمل کرنا اور اپنی زندگی میں اسے مطبوعہ شکل میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ یہ کتاب واقعی ان کی زندگی کا قابل فخر اور یادگار کارنامہ ہے۔

راقم الحروف نے اپنی تقریر کو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ مرحوم کو اپنے شاگردوں اور طالب علموں سے بڑی محبت اور گہرا لگاؤ تھا۔ ان کے بارے میں مشہور ہے کہ جب کوئی طالب علم ان سے ملنے کے لئے جاتا اور اطلاع کرواتا تو وہ دو چیزیں اپنے ساتھ لیکر آتے، جیب میں روپے اور ہاتھ میں قلم اور پیڈ۔ کیونکہ وہ یا تو اپنے تعلیمی اخراجات اور یونیورسٹی کے بقایا کے لیے روپے کے لیے آتا یا کسی ملازمت کے لیے سفارشی خط کے لیے۔ اور دونوں معاملے میں مرحوم بہت فیاض تھے۔ دل کھول کر طالب علموں کی امداد کرتے اور سفارشی خطوں میں پوری دریادلی کے ساتھ اسمائے صفات کا استعمال کرتے۔ اس کی وجہ سے ان کی سفارشوں کی اہمیت کچھ لوگوں کی نظر میں کم ہوگئی تھی اگر ان کی اسی صفت کی وجہ سے ان کے دل کی بڑائی اور نوجوانوں سے ان کی انتہا محبت کے نقوش اتنے گہرے ہوگئے کہ زمانہ شاید انھیں مٹانے میں کامیاب نہ ہوسکے گا۔ ان کے شاگردوں کی بہت بڑی تعداد برصغیر ہند و پاک میں پھیلی ہوئی ہے۔ ان کی وفات کا جس قدر غم انھیں ہوا ہوگا وہ ایسے ہی استادوں کو نصیب ہے تا ہر جو پروفیسر حبیب صاحب کی طرح اپنے شاگردوں سے محبت کرتے ہیں۔

پروفیسر حبیب صاحب نے، جہاں تک مجھے معلوم ہے، عملی سیاست میں کبھی حصہ نہیں لیا، مگر وہ شروع سے نیشنلسٹ اور سیکولر تھے اور آخر دم تک اس پر قائم رہے۔ آزادی سے قبل جب مسلم لیگ کا عروج تھا، مسلم یونیورسٹی میں یہ بڑی جرأت اور خطرے کا کام تھا کہ کوئی شخص قومی تحریک کی حمایت کرے یا قوم پرور رہنماؤں سے کسی قسم کا تعلق رکھے۔ مگر اس معاملے میں مرحوم نے مصلحت اور حالات سے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا اور یہ بھی واقعہ ہے کہ ان کے قوم پرور اور ترقی پسند خیالات کی وجہ سے ان کی ہر دلعزیزی پر کبھی کوئی آنچ نہیں آئی۔

پروفیسر حبیب کو اپنی یونیورسٹی اور اپنے طالب علموں سے اس قدر محبت اور لگاؤ تھا کہ ریٹائر ہونے کے بعد بھی ان کی خدمت کے لیے ان کا پورا وقت صرف ہوتا۔ البتہ عمر کے آخری زمانے میں انھوں نے لکھنے کی طرف توجہ کی جس کے نتیجہ کے طور پر انگریزی کتاب تاریخ ہند عہد سلطنت شائع ہوئی اور تاریخ فیروز شاہی کا انگریزی ترجمہ مکمل ہوا۔ یہ دونوں کارنامے ان کو حیات جاوید عطا کرنے کے لیے کافی ہیں۔

آخر میں صدر جلسہ نے تعزیتی تجویز پڑھکر سنائی، جس میں مرحوم کی علمی وتعلیمی خدمات کا اعتراف اور اس عظیم حادثے پر رنج وغم کا اظہار کیا گیا تھا اور مرحوم کے لیے دعائے خیر کی گئی تھی۔ حاضرین جلسہ نے کھڑے ہو کر اس تجویز کو منظور کیا۔

Regd. No. D - 768 August, 1971

The Monthly JAMIA

JAMIA NAGAR, NEW DELHI-25

جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

مُدیر

ضیاء الحسن فاروقی

خط وکتابت کا پتہ

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

طابع وناشر: عبداللطیف اعظمی　　مطبوعہ: یونین پریس دہلی　　ٹائیٹل: ڈیال پریس

شذرات

بنگلہ دیش کی تحریک آزادی پر جون اور جولائی کے شماروں میں ہمارے شذرات پڑھ کر ایک کرم فرما کو یہ شکایت ہے کہ رسالہ جامعہ 'سیاسی' بنتا جارہا ہے، قطع نظر اس سے کہ خود موصوف کے تحفظات ذہنی بنگلہ دیش کے سلسلہ میں کیا ہیں، ہم ان سے یہ عرض کریں گے کہ جب دنیا کے ایک حصہ میں خود مسلمانوں کے ہاتھوں اسلام رسوا ہو رہا ہو، انسان انسانیت کو ذبح کر رہا ہو، لاکھوں انسان، ہندو، مسلمان، عیسائی سب دھرم کے ماننے والے اور بوڑھے، جوان، عورتیں، بچے ہر عمر کے، اسلام اور اسلامی قدروں کے تحفظ کے نام پر بے گناہ قتل کئے جائیں، گولیوں کا نشانہ بنیں، اپنا وطن چھوڑنے پر مجبور ہوں، جب ساری دنیا کا ضمیر اس ظلم وجور پر تھرا اٹھے، جب شیخ مجیب الرحمن اور ان کے ساتھیوں پر اس لئے مقدمہ چلے اور انھیں دار پر لٹکانے کے منصوبے ہوں کہ اُن کی پارٹی انتخابات میں کیوں کامیاب ہوئی اور انھوں نے انصاف اور جمہوری حقوق کا کیوں مطالبہ کیا، تو معاملہ سیاسی نہیں رہ جاتا، انسانی بن جاتا ہے اور انسانی معاملہ کے تہذیبی، اخلاقی اور مذہبی پہلو بھی ہوتے ہیں (ویسے میرے نزدیک سیاست ایسی چیز بھی نہیں کہ اس سے متعلق کسی مسئلہ پر اظہارِ خیال نہ کیا جائے)۔ ہمارے یہ کرم فرما اسے بھی یاد رکھیں کہ ہمارے اکثر علماء اور اسلام پسند دانشور (صحیح ہو یا غلط اس سے بحث نہیں) مذہب اور سیاست کو الگ الگ خانوں میں نہیں رکھتے اور جب اپنی بات ثابت کرنا چاہتے ہیں تو بڑے ذوق شوق سے اقبال کا یہ مصرع پڑھتے ہیں:

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

(اس موقع پر 'چنگیزی' کی جگہ 'بیمائی' رکھنے کے لئے تیار نہیں ہوں گے کہ ان کی اپنی ذہنی وجذباتی الجھنیں ہیں۔) امید ہے کہ ان سطروں کو پڑھنے کے بعد موصوف کا ذہن کچھ ضرور صاف ہوگا۔

ہمارا جی چاہتا تھا کہ اس بار ہم ۹ اگست کے ہند روس معاہدے پر کچھ لکھیں، اس لئے کہ اس معاہدے میں کچھ نیا پن ہے، ورنہ لوگ جانتے ہیں کہ دونوں ملکوں میں امن، دوستی اور

تعاون کے تعلقات نئے نہیں ہیں، دونوں ملک ایک عرصے سے تہذیبی اور تجارتی لین دین کرتے رہے ہیں اور امن عالم کے قیام کے لئے دونوں کی کوششیں مشترکہ رہی ہیں، ہماری یہ خواہش بھی تھی کہ اس مرتبہ ہندوستانی پارلیمنٹ کے پاس کئے ہوئے دستور میں ترمیم سے متعلق ان دونوں بلوں پر کچھ لکھا جائے جو بڑے دوررس نتائج کے حامل ہیں اور جن پر عمل درآمد سے ہماری قومی زندگی میں انقلاب آسکتا ہے، لیکن ایک تو اس خیال سے کہ ہمارے قارئین ان مسئلوں کے بارے میں بہت کچھ پڑھ چکے ہوں گے اور دوسرے یہ کہ کم ازکم اس بار تو ہمارے کرم فرما کی دل آزاری نہ ہو، سیاسی نوعیت کے ان مسئلوں پر کچھ لکھنے سے احتراز کیا جاتا ہے اور ہم آپ کو پریس ایشیا انٹرنیشنل کی طرف سے دی جانے والی یہ خبر سناتے ہیں کہ پاکستان میں اُردو کا مستقبل روشن سمجھ کر مادر وطن سے بے وفائی کرنے والے اردو کے ایک بڑے شاعر جوش ملیح آبادی پر زندگی کے آخری دن سخت گزر رہے ہیں۔ وہاں انھوں نے اپنی سوانح عمری 'یادوں کی برات' کے عنوان سے شائع کی، لیکن جیسے ہی یہ کتاب شائع ہوئی فوجی حکومت کے حامی حلقوں، خاص طور سے دائیں بازو کے اخبارات نے مطالبہ کیا کہ جوش کی کتاب پر پابندی عائد کی جائے۔ جوش پر الزام لگایا گیا ہے کہ انھوں نے اپنی کتاب میں اسلام کی توہین کی ہے اور یہ کہہ کر کہ وہ مسلمانوں کی ایک علاحدہ قومیت کے نظریے پر یقین نہیں رکھتے، پاکستان کے بنیادی تصور پر کیچڑ اچھالنے کی کوشش کی ہے۔ ان پر یہ الزام بھی ہے کہ انھوں نے اپنی کتاب میں گاندھی اور نہرو جیسی شخصیتوں کا تعریفی انداز میں ذکر کیا ہے۔ علمار کی ایک جماعت نے مانگ کی ہے کہ جوش پر مارشل لا قوانین کی خلاف ورزی کرنے کے جرم میں فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا جائے اور سخت سے سخت سزا دی جائے۔ اُن پر کراچی کی ایک عدالت میں ہتک عزت کا ایک مقدمہ بھی چل رہا ہے، دعویٰ کرنے والے ریاست حیدرآباد کے سابق ہاؤسنگ منسٹر نواب کمال یار جنگ کے نواسے ہیں، کراچی میں بقول جوش کے وہ اب بے یار و مددگار ہیں اور انتہائی غربت کی زندگی گذار رہے ہیں، حال ہی میں کراچی کے ایک اجتماع میں جو اُن کی سوانح عمری کی اشاعت کے سلسلہ میں منعقد کیا گیا تھا (یہ سوانح عمری جو پاکستان میں تمام بک اسٹالوں سے یکایک غائب ہوگئی ہے۔) جوش نے کہا تھا کہ اردو کا مستقبل جتنا تاریک پاکستان میں ہے اتنا برصغیر کے کسی اور حصے میں نہیں ہے' انھوں نے یہ رائے بھی ظاہر کی کہ مغربی پاکستان کے سارے صوبوں میں علاقائی زبانوں کو قومی زبان کا درجہ دینے کی مانگیں دن بدن شدت اختیار کرتی جارہی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیچاری اردو ایک بار پھر پاکستان سے بھی بے گھر ہونے والی ہے۔ اس پر کہنا چاہیے کہ

ایک بے درد طنز نگار نے لکھا ہے کہ "شاید جوش اب افغانستان یا ایران میں رہائش اختیار کرنے کی سوچ رہے ہیں، اس لئے ایسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں" ——— یہ خبر نظر سے گذری تو جوش کے مرحوم دوست فانی بدایونی کا یہ شعر یاد آگیا:

فانی ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

پچھلے دو مہینوں میں کئی نامور ہستیاں ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئیں، ان میں سے ایک سری پرکاش جی تھے۔ مرحوم مشہور فلسفی و صوفی ڈاکٹر بھگوان داس کے فرزند تھے۔ علم و سیاست دونوں میں پیش پیش تھے اور زندگی کے ہر شعبہ میں بے تعصبی، فراخ دلی اور اخلاقی بلندی ان کی شخصیت کی بنیادی خصوصیات تھیں، وہ ہماری مشترکہ تہذیب کے ممتاز نمائندے اور مشترک قومی زندگی کے بہترین ترجمان تھے۔ ہندو مسلم اتحاد کی قدر اُن کو ورثے میں ملی تھی اور اِسے انھوں نے اپنے سینے سے لگا کر رکھا، افسوس کہ ایسی شخصیتیں اب اٹھتی جا رہی ہیں، اور چند جو رہ گئی ہیں وہ جانے کے لئے تیار بیٹھی ہیں۔

خیر بہوروی بھی اللہ کو پیارے ہوئے، مرحوم اردو کے قدیم خدمتگزاروں میں تھے اور آخر وقت تک وہ اپنے اس وظیفۂ بنیادی کو پورا کرتے رہے۔ مولوی عبدالحق اور قاضی عبدالغفار کے رفیقِ خاص کی حیثیت سے انھوں نے برسوں اردو زبان کی ترویج و اشاعت کے لئے جد و جہد کی، انجمن ترقی اُردو سے تعلق منقطع ہوا تو زبان و ادب کی خدمت کے لئے اور راہیں تلاش کر لیں، لکھنؤ میں وہ میر اکادمی کے روحِ رواں تھے، اس دور میں انھوں نے جو کام کئے وہ ہر حیثیت سے نمایاں کام کہے جا سکتے ہیں۔ مرحوم کی علالت کا سلسلہ عرصہ سے جاری تھا، لیکن کام کرتے رہتے تھے۔ ہمت انھوں نے کبھی نہیں ہاری اور ادبی و تحقیقی کام کرنے والے ان سے فیض حاصل کرتے رہے۔

اردو کے مشہور شاعر اور ممتاز غزل گو جناب تسکین قریشی سے کون ناواقف ہے، ۲۵ جون کو اردو کی بزم اُن سے بھی محروم ہو گئی، مرحوم کی وفات آگرے میں ہوئی جہاں وہ کینسر کے علاج کے سلسلے میں گئے تھے، انتقال کے وقت ان کی عمر ۷۰ سال تھی۔ وہ سوروں (ضلع ایٹہ) کے رہنے والے

تھے۔ محکمہ پولیس میں ملازم تھے، ۱۹۵۲ء میں پنشن لے کر میرٹھ میں رہنے لگے۔ وہ مذہبی انسان تھے طبیعت درد مند پائی تھی، شرافت، وضعداری، خلوص اور بلند ہمتی شخصیت میں رچی بسی تھی، جگر مرادآبادی مرحوم سے والہانہ محبت تھی، انھیں کی کوششوں سے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے کتب خانے میں گوشہ جگر، قائم ہوا جس میں جگر کی تحریروں وتصنیفوں کے علاوہ ان کی ذات سے متعلق کئی اور چیزیں محفوظ ہیں۔ تسکین صاحب کے کلام کے تین مجموعے "سرمایۂ تسکین"، "گلگونہ" اور "متاعِ تسکین" شائع ہو چکے ہیں، ایک کتاب "مکاتیب جگر" بھی انھوں نے چھپوائی تھی۔ مرحوم کی شخصیت اور شاعری میں گہرائی اور گیرائی تھی، ہم انھیں آسانی سے بھلا نہیں سکتے۔

جناب محمد یٰسین نوری گجرات کے رہنے والے تھے، خلافت تحریک میں شریک ہو کر انھوں نے قومی وملی زندگی کی سرگرمیوں میں حصہ لیا اور پھر برابر کسی نہ کسی حیثیت سے ان میں شریک رہے۔ وہ ایک کامیاب بیرسٹر اور ہوشیار قانون داں تھے۔ تحریک آزادی میں قید وبند کے مراحل سے بھی کامیاب گذرے اور آخری وقت تک سرگرم رہے، آخری دنوں میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے معاملات کو سلجھانے میں لگے رہے اور اس طرح یونیورسٹی کے اولڈ بوائے ہونے کی حیثیت سے ان پر یونیورسٹی کا جو حق تھا وہ حسن تدبیر اور خوش سلیقگی سے ادا کیا۔ اللہ تعالیٰ آخرت کی منزلیں آسان کردے۔

---

۲۶ جولائی کو مولانا ابوالفضل عبدالحفیظ بلیاوی نے بھی سفر آخرت اختیار کیا۔ عمر ستّر سال سے زائد ہی تھی، لیکن آخر وقت تک علم وطالبانِ علم کی خدمت کرتے رہے مرحوم دارالعلوم دیوبند کے فاضل اور حدیث میں مولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ کے شاگرد تھے۔ اِدھر کوئی بائیس تیئیس سال سے دارالعلوم ندوہ (لکھنؤ) سے وابستہ تھے۔ وہ عربی زبان وادب اور دوسرے دینی علوم کے بہت اچھے اور مستند استاد تھے۔ علم ہی اوڑھنا تھا اور علم ہی بچھونا۔ مشہور ومتداول کتاب مصباح اللغات ان کے عربی زبان وادب میں رسوخ وکمال پر سب سے بڑی شہادت ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور کتاب عربی لغت ہے، شاگردوں سے وہ اس قدر قریب رہتے تھے کہ وہ ہر وقت مرحوم سے فیض حاصل کرتے اور باپ کی سی محبت پاتے۔ افسوس، عزیزانِ ندوہ ایسے فاضل اور شفیق استاد سے محروم ہو گئے، اللہ تعالیٰ انھیں صبر دے اور مرحوم کے مراتب بلند کرے۔

پروفیسر آل احمد سرور

تراجم اور اصطلاح سازی کے مسائل

زبان کی سہولت کے لئے، تین قسمیں کی جاسکتی ہیں۔ ایک کاروباری زبان جس میں اپنا مطلب کسی طرح نکالنا ہوتا ہے، جس میں معنی کی ایک ہی سطح پر توجہ ہوتی ہے، جس میں منطقی ترتیب، بہترین لفظ یا موزوں ترین لفظ کی قید نہیں ہے۔ یہ زبان اسم، صفت یا فعل کے سیدھے سادے استعمال سے کام چلاتی ہے۔ دوسری قسم ادبی زبان کی ہے جس میں لفظ کا تخلیقی استعمال شاعری میں اور تعمیری استعمال نثر میں ہوتا ہے۔ ادبی زبان میں ماورائے سخن بھی بات ہوتی ہے۔ یہ زبان تشبیہ، استعارے، علامت اور رمز و ایما کی وجہ سے گنجینۂ معنی کا طلسم ہوتی ہے۔ یہاں کیا کہا ہے سے زیادہ کیسے کہا گیا ہے پر توجہ ہوتی ہے۔ بقول مڈلٹن مرے کے یہاں الفاظ پر فتح کا ایک منظر سامنے آتا ہے کیونکہ لفظ ایک پہلو دار ہیرے کی طرح بہت سی شعاعیں دیتا ہے اور ایک سے زیادہ معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ یہاں پیچیدگی، ابہام، اندیشہ ہائے دور دراز کی کافی گنجائش ہے۔ تیسری قسم علمی زبان کی ہے جس سے ہمیں اس وقت بحث ہے۔ علمی زبان میں اظہار منطقی ہوتا ہے، حقیقی مفہوم ادا

نوٹ: جولائی ۷۱ء کے دوسرے ہفتہ میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ترقی اردو بورڈ کی طرف سے اسی موضوع پر ایک سمینار ہوا تھا۔ یہ مضمون اسی سمینار کے لئے لکھا گیا تھا۔ ادارہ پروفیسر آل احمد سرور کا شکرگزار ہے کہ انھوں نے اسے جامعہ کے لئے عنایت فرمایا۔

کرنے پر توجہ ہوتی ہے، کاروباری زبان میں سیدھے سادے خیال اور فوری مطلب کو ادا کرنے کی کوشش ہوتی ہے، علمی زبان میں پیچیدہ سے پیچیدہ خیال کو اس طرح ادا کیا جاتا ہے کہ وہ ذہن میں روشنی کر دے۔ مہذب زبان کی پہچان یہی ہوتی ہے کہ وہ ادبی اظہار اور علمی اظہار دونوں کے لیے سرمایہ رکھتی ہو۔ کاروباری اظہار تو زبان کی ابتدائی حالت میں بھی کسی نہ کسی طرح ہو ہی جاتا ہے۔

مشرقی زبانوں کی ایک خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ وہ جذباتی اظہار پر تو پوری طرح قادر ہیں مگر ذہنی اظہار کے لیے انھیں ابھی بہت ترقی کرنا ہے۔ گویا ادبی اظہار کے علاوہ علمی معیار سے بہت ترقی کی گنجائش ہے۔ ایک زمانے میں شاعری علوم کی زبان بھی تھی مگر رفتہ رفتہ اس نے اپنے مخصوص کردار کو پہچان لیا۔ اب مغرب میں کوئی تاریخ منظوم نہیں کرتا نہ منظوم جغرافیہ لکھتا ہے نہ نفسیات اور معاشیات کے مسائل نظم کرتا ہے۔ شاعری فرد کے جذبہ کی ترجمان بن گئی اور نثر اس کے ذہن کی۔ علمی نثر کی ترقی اسی میلان کا نتیجہ ہے۔ اس ترقی نے شاعری کو بھی فائدہ پہنچایا ہے کیونکہ ادبی اظہار اور علمی اظہار الگ الگ راستوں پر گام زن ہونے کے باوجود چور دروازوں اور پگڈنڈیوں کے ذریعہ سے ایک دوسرے سے متاثر ہوتے ہیں۔

ایسا نہیں ہے کہ مشرقی زبانوں میں علمی اظہار کی کوئی روایت نہیں ہے یا علمی زبان بہت کم ملتی ہے۔ خود اردو کو ہی لے لیجئے۔ اس میں علمی نثر انیسویں صدی کے وسط سے ملنے لگتی ہے اور سرسید اور ان کے رفقاء کے ہاتھوں اسے بڑی ترقی ہوئی۔ مگر اس میں شک نہیں کہ علمی زبان پر ادبی زبان و اسالیب کا اثر ذرا زیادہ رہا ہے چنانچہ آج بھی علمی نثر کی تعریف کرتے وقت اس کی سلاست، شگفتگی، روانی پر زور دیا جاتا ہے اور کبھی کبھی تو یہ بھی کہہ دیا جاتا ہے کہ اس میں افسانے کی سی دلچسپی ہے۔

اس وجہ سے ضرورت ہے کہ ہم آج کی صحبت میں سب سے پہلے علمی نثر کی ضروریات

پر کچھ غور کر لیں کیونکہ ترقی اردو بورڈ کا کام اس علمی نثر کو فروغ دینا ہے۔ اس فروغ کا مقصد صرف معلوماتی ادب کا ایک ذخیرہ مہیا کرنا ہی نہیں، خیال اور ذہن کو تقویت دے کر زیادہ سے زیادہ پیچیدہ مفاہیم اور نازک ترین کیفیتوں کے اظہار پر قدرت حاصل کرنا ہے اور اس طرح زبان کو وسعت اور جامعیت عطا کرنا ہے۔ علمی نثر کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ مشکل ہو یا آسان، عربی لے رکھتی ہو یا ہندی۔ علمی نثر علم کے مطالب کے اظہار کے لیے ہوتی ہے۔ جہاں علم کی مبادیات عام فہم زبان میں بیان کرنا ہیں وہاں وہ آسان ہو گی تو اس کے ساتھ موٹی موٹی باتوں پر اکتفا کرے گی، جہاں وہ اس علم کے اسرار و رموز پر روشنی ڈالے گی وہاں اس کا فرض اتنا ہی ہو گا کہ وہ سچ اور صرف سچ بولے اور پوری بات کہے۔ اس لیے اصطلاحات سے اسے لازمی طور پر کام لینا پڑے گا۔ اس کا مقصد معلومات عطا کرنا ہو گا۔ جذبات سے اپیل نہیں۔ علوم کی بہت سی قسمیں ہیں۔ انھیں سہولت کے لیے تین خانوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ قدرتی علوم جس میں طبعی علوم اور حیاتیاتی علوم آتے ہیں۔ اجتماعی علوم جن میں سیاسیات، اقتصادیات، نفسیات، لسانیات، جغرافیہ، تعلیم آتے ہیں۔ تاریخ کو پہلے انسانی علوم Humanities, میں رکھا جاتا تھا، اب اسے اجتماعی علوم میں شامل کیا جاتا ہے۔ انسانی علوم میں فلسفہ، فنون لطیفہ اور ادبیات آتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ قدرتی علوم میں سے طبیعاتی علوم میں نثر کی زبان خالص معلوماتی ہوتی ہے اور اس کا نصب العین ریاضی کی طرح قطعیت حاصل کرنا ہوتا ہے۔ حیاتیاتی علوم میں انواع کے رشتوں کی تفصیل اور ارتقا کی منزلوں کی تشریح کے سلسلے میں بیانیہ انداز کی وہ وضاحت بھی ضروری ہے جس میں ایک خوشگوار پہلو ہو سکتا ہے مگر اسے کسی طرح نمایاں نہ ہونا چاہیے۔ اجتماعی علوم کے سلسلے میں معلومات ہی کا معاملہ نہیں یہاں رشتوں کی پیچیدگی کے علاوہ اسباب و علل کے سلسلے کو بھی ذہن میں رکھنا ہوتا ہے۔ قوموں کی تقدیر اسرار امم، نفسیات کی بھول بھلیاں، سماج کی سیڑھیاں، کسب زر کی داستان، مختلف خطوں کی آب و ہوا

کا مطالعہ اور نفسیات پر اثر، غرض اجتماعی علوم میں چونکہ صرف معلومات کا سوال نہیں بلکہ معلومات کی ترتیب، بنیادی اور فروعی مسائل کی تشریح اور مختلف نظریات کے تحت ان کی اہمیت سے بحث ہوتی ہے اس لیے اجتماعی علوم میں نثر کا کام قدرتی علوم سے زیادہ مشکل ہو جاتا ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ قدرتی علوم میں زیادہ تر ایک نظریئے کے مطابق اظہار خیال ہوتا ہے۔ اجتماعی علوم کے معاملے میں نظریوں کی کثرت ہے۔ قدرتی علوم کے سلسلے میں مکمل معروضیت ممکن ہے۔ اجتماعی علوم کے سلسلے میں اس کی کوشش ضروری ہے مگر شخصی نظر یا داخلی انداز کا دخل بھی ہو ہی جاتا ہے جس کی وجہ سے جذبے کی زبان کو کچھ بار مل جاتا ہے۔ مگر نصب العین یہاں بھی معروضیت ہے۔ انسانی علوم میں فلسفہ علم کی وہ شاخ ہے جہاں مجرد تصورات سے بحث ہے، جلووں کی کثرت میں ایک وحدت دیکھنے کی سعی ہے یا دوسرے الفاظ میں ایک نظام فکر بنانے یا ایک ذہنی محور پانے کی جستجو۔ اس لیے فلسفے کی بنیاد منطق پر ہے اور استدلال اس کا طریقۂ کار ہے۔ برٹرینڈ رسل نے کہا ہے کہ شوپنہار، نٹشے اور برگسان کو خالص فلسفی اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ ان کے یہاں ادبیت بھی در آئی ہے۔ یعنی ان کی بظاہر طاقت در اصل ان کی کمزوری ہے۔ کانٹ کے متعلق یہ بات نہیں کہی جا سکتی۔ ادبیات کے سلسلے میں ادبی تنقید علوم کے ذیل میں آتی ہے۔ اس لیے جدید دور میں اسے زیادہ سائنٹفک بنانے پر زور دیا گیا ہے لیکن چونکہ یہ بہر حال ادب کی ایک شاخ ہے اس لیے اور سائنسی ہوتے ہوئے بھی ادبی اظہار سے اپنا رشتہ توڑ نہیں سکی، ہاں تاثرات کی دلدل سے اسے ضرور نکلنا ہے۔

اس تمہید کا مقصد یہ ہے کہ ہم علوم کی زبان کی خصوصیات کو ہی ذہن میں رکھیں، معلومات دینے کو سب سے زیادہ اہمیت دیں، پھر منطقی ترتیب، معروضیت اور ایک غیر جانبدار زبان کو جو جذبے کی گرمی یا شخصیت کے لمس سے بڑی حد تک آزاد ہو۔ ان اصولوں کی روشنی میں ہمیں ترقی اردو بورڈ کے تراجم اور تصانیف کے کام کو آگے بڑھانا ہے۔

ترجمے کے کام کو اب تک تصنیف کے مقابلے میں عام طور پر حقیر سمجھا گیا ہے یہ بہت غلط میلان ہے۔ ترجمے کی اہمیت کسی طرح تخلیق سے کم نہیں۔ ترجمے میں تخلیق کو از سرِ نو پانا ہوتا ہے اس لیے امریکہ میں ترجمے کے لیے دوبارہ تخلیق Recreation, کا لفظ بھی استعمال کیا گیا ہے۔ ترجمے کے ذریعہ سے ہم دوسری زبانوں کے افکار و اقدار سے آشنا ہوتے ہیں۔ ایک فاضل کے الفاظ میں مترجم کا کام صرف لسانی نہیں بشریاتی Anthropological. بھی ہے یعنی اسے صرف اصل زبان Source Language. سے ہی واقفیت نہیں ہونی چاہئے، اسے اس زبان کی تہذیب اور معاشرے سے بھی آشنا ہونا چاہئے۔ اس کی دو مثالیں دینا ضروری ہیں تاکہ بات واضح ہو جائے۔ دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کے لیے روم کی تاریخ کے ترجمے میں Papal Bulls کا ترجمہ پاپائی سانڈ کیا گیا تھا۔ اردو کے ایک ممتاز ادیب نے اپنی ایک کتاب میں شیکسپیر کے ایک ڈرامے As you like it. سے ژاک کی ایک تقریر کا حوالہ دیا۔ اس میں لفظ Humour کا ترجمہ مزاح کیا گیا تھا حالانکہ یہاں طبی اصطلاح خلط مراد ہے۔ مغرب کی رومانی تحریک میں مشرقی ادب کے تراجم کا بڑا اثر ہے۔ جدیدیت کی تحریک میں چین اور جاپان کی شاعری کے تراجم کا بھی دخل ہے۔ ہندوستان کی نشاۃ الثانیہ پر مغربی ادب کے تراجم براہ راست اثر انداز ہوتے ہیں۔ ہماری علمی نثر اور جدید نظم دونوں مغربی تراجم کے سہارے آگے بڑھے ہیں۔ اس لیے ترجمے کی اہمیت کسی طرح تخلیق یا تصنیف سے کم نہیں۔ یہ تخلیق کے لئے بھی نئے زمین و آسمان دیتا ہے اور علمی موضوعات پر تصانیف کے لیے بھی ذہنی غذا مہیا کرتا ہے۔ یہاں یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ علمی کتابوں کے ترجمے میں آزاد ترجمے یا اصل خیال کو اپنے الفاظ میں بیان کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہاں وہی بات ہر مرغوب پیو ورنہ مقدس چشمے کو ہاتھ نہ لگاؤ۔ یہاں صرف لفظی ترجمے اور مطابق اصل ترجمے یعنی (Literal and faithful), پر گفتگو ہو سکتی ہے۔ لفظی ترجمے میں لسانیات

کی رو سے ایک متنی اظہار کو دوسرے متبادل متنی اظہار میں منتقل کرنا ہوتا ہے لیکن جیسا کہ اوپر کہا گیا ترجمہ صرف لسانیاتی عمل نہیں بشریاتی عمل بھی ہے، اس لیے ظاہر ہے کہ مطابق اصل کو ترجیح ہونی چاہیے کیونکہ ہر زبان کی صرفی و نحوی خصوصیات علیحدہ ہوتی ہیں۔ خصوصاً انگریزی سے ترجمے میں تو لفظی ترجمہ مضحکہ خیز ہو جاتا ہے اس لیے مطابق اصل کے معنی یہ ہوئے کہ اصل زبان کے متن کو ترجمے کی زبان کے ایسے الفاظ میں ڈھالا جائے جو ترجمے کی زبان کی جی نی اس کے مطابق ہوں مگر اصل زبان کے مفہوم کو زیادہ سے زیادہ ظاہر کرنے پر قادر ہوں۔ یوں تو ایلیٹ نے یہ بھی کہا ہے کہ کسی زبان کی شاعری کا ترجمہ دوسری زبان میں ناممکن ہے مگر ترجمے ہوئے ہیں اور ان کے اثرات بھی پڑے ہیں۔ ترجمے کو جو ویٹ نے ایک مفاہمہ کہا ہے۔ یہ مفاہمہ بہرحال کبھی زیادہ کامیاب ہوتا ہے کبھی کم۔ مگر اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیے کہ ترجمہ نہیں ہو سکتا یا ترجمہ نہیں کرنا چاہیے۔ جہاں تک ادب العالیہ یا علمی سرمائے کے ترجمے کا سوال ہے اس سلسلے کی افادیت میں شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں مطابق اصل ترجمے پر زور دیا جا سکتا ہے۔ اس ترجمے کے لیے چند شرائط ہیں۔ مترجم اس موضوع سے واقفیت رکھتا اور اپنی زبان کے سرمائے پر بھرپور نظر کے علاوہ اصل زبان سے بھی اچھی طرح واقف ہو۔ اگر وہ موضوع سے واقف ہے اور اصل زبان سے بھی بڑی حد تک آشنا ہے مگر اپنی زبان کے سرمائے پر اس کی نظر نہیں ہے تو وہ جا بجا ٹھوکریں کھائے گا۔ اس کی زبان اکھڑی اکھڑی ہوگی اور اس کا ترجمہ پڑھنا ایسا ہوگا جیسا ناہموار راستے سے گزرنا۔ اگر وہ اپنی زبان پر عبور رکھتا ہے مگر اصل زبان سے اس کی واقفیت محدود ہے تو ظاہر ہے اور بھی خطرناک صورت پیدا ہو جائے گی، پھر علوم کے تراجم میں زبان یا زبانیں جاننے سے بھی مقدم اس علم سے واقفیت ہے اس لیے بھول کر بھی صرف زبان پر یا زبانوں پر عبور کی وجہ سے ترجمے کا کام کسی کو نہ دینا چاہیے۔ موضوع سے واقفیت بنیادی شرط ہے اس کے بعد اصل زبان سے اور پھر اپنی زبان سے۔ یہی وجہ ہے کہ

ڈیٹ رایٹ (امریکہ) کی Mass translation project میں یہ طریقہ برتا گیا ہے۔

Translator - Quality Control - Technical Editor
Language Editor,

مترجم - معیار کا نگران - ٹکنی کل ایڈیٹر - زبان کا ایڈیٹر۔

اس لئے میری رائے میں ترقی اردو بورڈ کو خالص علمی کتابوں کے ترجمے میں پہلے تو موضوع کے ماہر کا انتخاب کرنا چاہئے اس کے بعد ترجمے کے معیار کو پرکھنے کے لئے ایک دوسرے ماہر کو کتاب دکھانا چاہئے جسے تراجم کا بھی تجربہ ہو۔ اس کے بعد ٹیکنی کل ایڈیٹر سے مدد لینا چاہئے جو صرف یہ دیکھے کہ مواد کی ترتیب، اعداد وشمار، چارٹ وغیرہ درست ہیں۔ آخر میں زبان کے ماہر کی نظر بھی ضروری ہے تاکہ ترجمہ زبان کی جی نی اس کے مطابق ہو اور الفاظ کی نشست اور جملوں کی ساخت اجنبی نہ معلوم ہو۔ علمی کتابوں کے ترجمے کے لئے اردو میں اچھے نمونے موجود ہیں۔ مرزا ہادی رسوا، عبدالباری، خلیفہ عبدالحکیم، عبدالمجید سالک، فلسفۂ جذبات اور مکالمات برکلے والے مولانا عبدالماجد، ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عابد حسین، سید ہاشمی فرید آبادی، عزیز احمد، اختر رائے پوری، امتیاز علی تاج۔ لطیف الدین احمد، مبارز الدین رفعت، رحم علی الہاشمی نے قابل قدر ترجمے کیے ہیں پھر بھی انھیں حرف آخر سمجھنا غلط ہوگا۔ ترجمے کا ایک اہم اصول یہ ہے کہ اصل میں کمی بیشی نہ کی جائے۔ یورپ میں ایک بین قومی جماعت ہے جس کا نام FIT ہے۔ یعنی انٹرنیشنل فیڈریشن آف ٹرانسلیٹرس اس نے مترجموں کا ایک چارٹر مرتب کیا ہے۔ اس کی ایک دفعہ میں کہا گیا ہے کہ "مشکل فقروں کو مختصر کرنا یا انھیں خارج کر دینا غیر اخلاقی بات ہے۔" اس کے چند اور اصول قابل ذکر ہیں: ایک تو "اصل زبان کے بجائے کسی درمیانی زبان کے ذریعہ سے ترجمہ ایک ایسا مفاہمہ ہے جو غیر تسلی بخش ہے۔" دوسرے "نظم کا نثر میں ترجمہ فن پارہ کہلانے کا مستحق نہیں۔" تیسرے "اسٹایل

اور فارم کے معاملے میں عملی طریقہ کار کو اپنانا چاہیئے۔" مثلاً اصل زبان میں اگر کوئی ذومعنی لفظ ہے تو اس کا لفظی ترجمہ مناسب نہیں یہاں اس سے ملتا جلتا ترجمے کی زبان کا لفظ ہونا چاہیئے جس میں یہی رعایت ہو۔

اب میں چند مشہور ترجموں سے مثالیں دے کر یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ ان کو نظرانداز کرنے سے کیا خرابیاں پیدا ہوئیں۔

ارسطو کی کتاب فن شاعری Poetics, یا بوطیقا مغربی تنقید کا صحیفۂ اول کہی جاسکتی ہے۔ آج تک مغربی تنقید میں اس کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک فقرے پر بحث ہوتی ہے اور اس سے برابر نئے معانی اور مطالب نکالے جاتے ہیں۔ یہ ان بنیادی کتابوں میں سے ہے جس کا ترجمہ دنیا کی قریب قریب ہر زبان میں موجود ہے۔ اردو میں اس کا ترجمہ عزیز احمد نے ۱۹۴۱ء میں کیا تھا۔ عزیز احمد کا ترجمہ عام طور پر اچھا ترجمہ سمجھا جاتا ہے مگر ارسطو کی ٹریجڈی کی تعریف کا ترجمہ ملاحظہ کرکے آپ خود فیصلہ کیجیئے۔ پہلے انگریزی ترجمہ ملاحظہ کیجیے پھر عزیز احمد کا ترجمہ پھر اس پر تنقید اور آخر میں میرا ترجمہ

"Tragedy, then, is an imitation of an action that is serious, complete, and of a certain magnitude ; in language embellished with each kind of artistic ornament, the several kinds being found in separate parts of the play ; in the form of action, not of narrative, through pity and fear, effecting the proper purgation of these emotions".

BUTCHER

"ٹریجڈی نقل ہے کسی ایسے عمل کی جو اہم اور مکمل اور ایک مناسب عظمت (طوالت) رکھتا

ہو جو مزین زبان میں لکھی گئی ہو جس سے حظ حاصل ہوتا ہو۔ لیکن مختلف حصوں میں مختلف ذریعوں سے جو دردمندی اور دہشت کے ذریعہ اثر کرکے ایسے ہیجانات کی صحت و اصلاح کرے۔"

اردو میں اوقاف کا استعمال کم ہی ہوتا ہے۔ عزیز احمد نے صرف اسٹاپ کاما اور وقفے کا استعمال کیا ہے۔ حالانکہ انگریزی میں کاما اور کولن کا استعمال ہے۔ جملہ ایک ہی ہے عزیز احمد نے ایک جملے کا ترجمہ چار جملوں میں کیا ہے اور بعض ضروری الفاظ چھوڑ دیئے ہیں۔ بعض الفاظ کے ترجمہ سے بھی میں متفق نہیں ہوں۔ Serious, کا ترجمہ اہم کے بجائے سنجیدہ ہونا چاہیئے تھا۔ Magnitude کے لئے اردو میں سامنے کا لفظ حجم موجود ہے اس کے لئے مناسب عظمت اور پھر قوسین میں طوالت لکھنا غیر ضروری تھا۔ مزین زبان کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے کہ جس سے حظ حاصل ہوتا ہو In the form of action not of narrative. کا ٹکڑا جو بہت اہم ہے چھوڑ دیا گیا ہے پھر Purgation یا Katharsis کے لیے ایک لفظ کے بجائے دو لفظ صحت و اصلاح ہیں اس لئے میرے نزدیک نہ تو اس شکل میں مطابق اصل ترجمہ ہے نہ لفظی ترجمہ بلکہ ادھورا اور ناقص ترجمہ ہے، اس سے اصل کی روح مجروح ہوتی ہے۔ میرے نزدیک انگریزی عبارت کا ترجمہ کچھ اس قسم کا ہونا چاہیئے۔

"بس ٹریجڈی ایک ایسے عمل کی نقالی ہے جو سنجیدہ، مکمل اور مناسب حجم کا ہو جس کی زبان ہر قسم کی فنی آرائش سے مزین ہو اور (آرائش کی) یہ قسمیں کھیل کے مختلف حصوں میں پائی جاتی ہوں یہ عمل کے روپ میں ہو نہ کہ بیانیہ کے اور رحم اور خوف کے ذریعہ سے جذبات کا تنقیہ کرے۔"

تنقیہ کے علاوہ ایک اور لفظ بھی استعمال کیا جا سکتا ہے تزکیہ، فرق یہ ہے کہ تنقیہ طب کی اصطلاح ہے اور تزکیہ تصوف کی۔ تنقیہ میں فاسد مادے کے خارج ہونے اور پھر جسم کے نظام کے صحت پانے کا مفہوم موجود ہے۔ تزکیہ میں رفعت اور پاکی کا مفہوم ہے۔ صحت و

اصلاح سے وہ مفہوم ادا نہیں ہوتا جو میرے نزدیک Katharsis کا ہے۔

بہرحال یہ تو واضح ہو ہی گیا کہ بنیادی کتابوں کے متن کا ترجمہ قطعی طور پر مطابق اصل ہونا چاہئے۔ اس میں نہ تبدیلی کی گنجائش ہے نہ اضافے کی نہ کسی لفظ یا فقرے کو حذف کرنے کی، اس لیے اردو میں فن شاعری کے ایک اور ترجمہ کی ضرورت ہے اور اس کے لئے عنوان بوطیقا جیسے ثقیل عربی لفظ کی بجائے صرف فن شاعری یا شعریات لکھنا کافی ہوگا۔

جمیل جالبی نے ایلیٹ کے کچھ مضامین کا ترجمہ کیا ہے جس کی عام طور پر تعریف کی گئی ہے ایلیٹ کے مضمون Tradition & Individual Talent کے ایک اقتباس اور جالبی کے ترجمہ پر غور کیجئے۔ دیکھیں آپ کے پلے کیا پڑتا ہے۔

'I am alive to a usual objection to what is clearly part of my programme for the metier of poetry. The objection is that the doctrine requires a ridiculous amount of erudition (pedantry), a claim which can be rejected by appeal to the lives of poets in any pantheon. It will even be affirmed that much learning deadens or perverts poetic sensibility'.

"میں اس عام اعتراض سے واقف ہوں جو شاعری کے پیشے کے سلسلہ میں میرے پروگرام کا ایک حصہ ہے۔ اعتراض یہ ہے کہ نظریہ کے لئے مضحکہ خیز حد تک تبحر علمی اور اصول پرستی کی ضرورت پیش ہے اور جو ایک ایسا دعویٰ ہے جسے شاعروں کے حالات زندگی پر نظر ڈالنے ہی سے رد کیا جا سکتا ہے۔ اس سے یہ بھی پتہ چلے گا کہ زیادہ علمیت شاعرانہ احساس و ادراک کو کند کر دیتی ہے یا روک دیتی ہے۔" ۴۳-۱۴۲

پہلے جملے کا ترجمہ بالکل غلط ہے ترجمہ یہ ہونا چاہیئے: "میں اس عام اعتراض سے واقف ہوں جو شاعری کے پیشے کے سلسلے میں میرے پروگرام کے ایک حصہ پر کیا جاتا ہے۔" اب دوسرا جملہ لیجیے: "اعتراض یہ ہے کہ نظریہ کے لئے مضحکہ خیز حد تک تبحر علمی (اور اصول پرستی) کی ضرورت پڑتی ہے اور جو ایک ایسا دعویٰ ہے جسے شاعروں کے حالات زندگی پر نظر ڈالنے سے ہی رد کیا جاسکتا ہے۔" یہاں نظریہ سے پہلے لفظ 'اس' ضروری ہے، پھر یہ جملہ اچھی اردو کا جملہ نہیں نہیں ہے نیز اس میں Pantheon کا ترجمہ سرے سے کیا ہی نہیں گیا۔ میرے نزدیک اس جملے کا ترجمہ یہ ہونا چاہیئے: "اعتراض یہ ہے کہ میرے نظریئے کے مطابق مضحکہ خیز حد تک تبحر علمی (بلکہ فضیلت مآبی) درکار ہے یہ ایک ایسا دعویٰ ہے جو کسی مقدس سلسلے کے شعراء کے حالاتِ زندگی کی روشنی میں رد کیا جاسکتا ہے۔ بلکہ (معترض) اس پر بھی زور دیں گے کہ زیادہ علمیت شعری حسیت کو مردہ کرتی ہے یا مسخ کر دیتی ہے" ادبی تنقید کا ترجمہ اگرچہ آسان نہیں مگر فلسفہ کا ترجمہ بہر حال بہت مشکل ہے۔ اردو میں افلاطون کی ریاست کا وہ ترجمہ جو ڈاکٹر ذاکر حسین نے کیا ہے۔ عابد حسین کا کانٹ کا تنقید عقل محض کا ترجمہ، خلیفہ عبدالحکیم، مرزا ہادی رسوا اور مولانا عبدالباری کے ترجمے مجموعی طور پر اچھے ترجمے ہیں۔ اگرچہ عقلِ محض کے مقابلہ میں میرے نزدیک عقل خالص شاید بہتر ہوتا۔ ظفر حسین نے انواع فلسفہ کے نام سے Types of Philosophy. کا بہت اچھا ترجمہ کیا ہے۔ اجتماعی علوم میں قابل قدر ترجمے روسو کے معاہدۂ عمرانی کا ترجمہ ڈاکٹر محمود حسین کا کیا ہوا، کینس کا روزگار شرح سود وزر البوسالم کا کیا ہوا۔ ولیم جیمس کی مشہور کتاب نفسیات وارداتِ انسانی کا ترجمہ خلیفہ عبدالحکیم کا کیا ہوا اچھے ترجمے کیے جاسکتے ہیں۔ پھر بھی اجتماعی علوم میں بہت سی بنیادی کتابوں کا ترجمہ ہونا باقی ہے۔ ہمارے دستور کا جو ترجمہ اجمل خاں، محمد مجیب اور ہارون خاں شروانی نے کیا ہے وہ نہ صرف اردو میں انگریزی کی روح کو باقی رکھنے میں کامیاب ہے بلکہ اس کی خوبی یہ ہے کہ ترجمہ معلوم نہیں ہوتا۔ تمہید

ملاحظہ ہو :

"ہم ہند کے لوگوں نے پوری سنجیدگی کے ساتھ فیصلہ کیا ہے کہ ہند کو ایک پورے
اختیار والی عوامی جمہوریہ بنائیں اور اس کا بندوبست کریں کہ اس کے ہر شہری کو..
انصاف ملے، سماجی، معاشی اور سیاسی
آزادی ملے، خیال، بیان، عقیدے، مذہب اور عبادت کی
برابری ملے، حیثیت اور موقعوں میں
اور ہم نے طے کیا ہے کہ شہریوں کے درمیان اس طرح بھائی چارہ پھیلائیں کہ فرد کا
وقار اور قوم کی ایکتا محفوظ رہے۔"

جہاں تک تصنیف و تالیف کا سوال ہے اس کے مسائل ترجمے کے مسائل سے خاصے مختلف ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ تصنیف کے کئی درجے ہوتے ہیں۔ ایک ابتدائی درجہ عام فہم انداز میں کسی مسئلہ کے مبادیات کو بیان کرنے کا ہے، مثلاً سیاسیات یا نفسیات پر کوئی ابتدائی کتاب لکھی جائے جو بی۔ اے کے طالب علموں کے لئے ہو۔ اس میں نصاب کی ضروریات کو ملحوظ رکھنا ہوگا، طلبار کی عمر اور استعداد اور ان کی زبان پر قدرت کو بھی دیکھنا ہوگا، موضوع کے مناسب معیار کو دیکھنا ہوگا تاکہ اس ابتدائی منزل پر کوئی غلط نظریہ ذہنوں میں رائج نہ ہو جائے۔ یہاں اصطلاحات کی تعداد زیادہ نہ ہوگی مگر یہ ضروری ہوگا کہ یہ اصطلاحات مستند ہوں۔ بی۔ اے کی منزل کے بعد ایم اے کی منزل کے لئے کتابیں لکھوانے کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ یہاں کتاب کا معیار خالص علمی ہوگا۔ زبان کے عام فہم ہونے پر اصرار نہ ہوگا۔ کیونکہ یہ کتابیں اس مضمون میں مہارت حاصل کرنے کے لئے پڑھی جائیں گی۔ اس منزل پر موضوع پر جدید ترین معلومات ضروری ہوں گی۔ ترقی اردو بورڈ ابھی تو پہلی منزل کے لئے کتابیں لکھوا رہا ہے دوسری منزل بعد میں آئے گی اس لئے اس منزل کے مسائل پر بعد میں غور کیا جا سکتا ہے۔ یہاں تو یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ میرے نزدیک

ہر مضمون کے لئے تراجم اور تصانیف میں ایک خاص تناسب ہونا چاہیے۔ تراجم کی اہمیت مسلّم مگر تصانیف بی، اے کی منزل پر زیادہ اہم ہیں۔ اس لئے اگر کسی مضمون پر چار کتابوں کا ترجمہ کردیا گیا ہے تو کم سے کم دو تصانیف بھی ہونی چاہئیں۔ اگر کوئی ماہرِ فن اپنی نظر اور تجربے کی بناء پر سیاسیات یا اقتصادیات پر کوئی کتاب لکھے گا تو ہمارے طلباء اس مضمون سے زیادہ آشنا ہوں گے۔ ترجمہ کے ذریعہ اتنا ابلاغ نہیں ہوتا جتنا تصنیف کے ذریعہ ہوتا ہے۔ اجتماعی علوم میں ویسے ہی ہندوستانی ماحول اور مشرقی فضا کو دیکھتے ہوئے تصانیف کی زیادہ ضرورت ہے کیونکہ مقامی مثالوں کے ذریعہ بات کو زیادہ اچھی طرح ذہن نشین کرایا جاسکتا ہے۔ ترجمہ بہرحال پٹری پر چلنے کے مترادف ہے اور طالب علم اس پٹری سے اکتا بھی سکتا ہے۔ تصنیف میں زیادہ آزادی ہے اور اس کے ذریعہ سے زیادہ وسیع فضا کی سیر کی جاسکتی ہے۔

اب مجھے اصطلاح سازی کے اصولوں کے متعلق کچھ کہنا ہے۔ اِس سلسلے میں ہمیں چاہیئے کہ وحید الدین سلیم کی "وضعِ اصطلاحات" کو خاص طور سے نظر میں رکھیں جو لوگ آنکھ بند کرکے انگریزی کی اصطلاحات بجنسہٖ لینا چاہتے ہیں ان کے متعلق وحید الدین سلیم کی رائے یہ ہے:

> "انگریزی زبان میں علمی الفاظ کی اس قدر کثرت ہے کہ اگر ان سب الفاظ کو ہم بگاڑ کر جاہلوں کی زبان کی خراد پر چڑھا کر اپنی زبان میں داخل کرلیں تو ہماری زبان کا قدرتی حسن و جمال اور اس کے خط و خال کی قدرتی خوبیاں سب خاک میں مل جائیں گی۔ اجنبی زبان کے الفاظ کی کیسی ہی تراش خراش کیوں نہ کی جائے ان میں اجنبیت کی بو اس قدر باقی رہتی ہے کہ اہل زبان ان سے مانوس نہیں ہوتے۔ ہماری زبان میں موجودہ اصلی الفاظ کی تعداد ہی بمقابلہ مہذب زبانوں کے کم ہے۔ اگر انگریزی زبان کے تمام علمی الفاظ توڑ مروڑ کر اس میں

بھر دیئے جائیں تو ان کی تعداد اصلی الفاظ سے بھی زیادہ ہو جائے گی۔ اور ہماری زبان کی لچک اور نزاکت سب ملیامیٹ ہو جائے گی اور ہم ایسی زبان بولنے اور لکھنے پر مجبور ہوں گے جس کے الفاظ کا کوئی جزو گوش آشنا اور مانوس نہ ہوگا۔ برخلاف اس کے اگر ہم انگریزی زبان کے علمی الفاظ کے مقابلہ میں ایسے الفاظ وضع کریں جن کے اجزا پہلے سے گوش آشنا اور مانوس ہوں تو اس سے نہ تو زبان کی سلاست اور لوچ میں کوئی فرق آئے گا اور نہ ہم اپنی زبان میں کسی ناگوار مداخلت کے مرتکب ہوں گے۔" (وضع اصطلاحات)

میں اس نظریئے سے مجموعی طور پر اتفاق کرتا ہوں، ہاں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ اس کے باوجود بعض ایسے الفاظ کے لئے جو بالکل نئے ہیں اور جن کا مفہوم کسی طرح سے پرانے الفاظ سے ادا نہیں ہو سکتا، ایک دو جگہ انگریزی سے الفاظ لینے میں کوئی حرج نہیں۔ ان کی تعداد اتنی ہونی چاہیئے کہ مجموعی طور پر زبان کی جی نی اُس مجروح نہ ہو۔ یہاں میں نے لفظ مزاج یا بناوٹ استعمال نہیں کیا کیونکہ میرے نزدیک جی نی اُس میں انفرادیت کا جو پہلو ہے وہ مزاج یا بناوٹ سے ظاہر نہیں ہوتا پھر لفظ جی نی اُس ہمارے صوتی نظام سے ہم آہنگ ہے اس لئے ایسے الفاظ لینے میں کوئی حرج نہیں۔ ویسے بھی آئیڈیلزم، مارکسزم، بیلٹ، ایڈی پس کمپلکس (Oedipus Complex)، ایٹم، میزائل، ٹریبونل، اٹارنی، شیڈیول کو بجنسہٖ لے لینا بہتر ہوگا ان کا ترجمہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ لفظ اخباروں میں استعمال ہونے لگے ہیں۔

پھر بھی اصطلاح سازی کے لئے ہر جدید زبان کو کسی کلاسیکل زبان کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگرچہ وحید الدین سلیم نے اس پر زور دیا تھا کہ اردو کے آریائی مزاج کا خیال رکھا جائے مگر جامعہ عثمانیہ کی اصطلاحوں میں طبا طبائی کے اثر سے عربی سے ضرورت سے زیادہ فائدہ اٹھایا گیا۔ چند سال ہوئے کابل میں ترجمہ پر ایک سیمینار ہوا تھا جس میں ایران، افغانستان

تاجکستان، ہندوستان اور پاکستان کے نمائندے شریک ہوئے تھے ۔ میں اس سیمینار میں موجود تھا۔ ایران کے نمائندوں نے بتایا کہ ان کے یہاں عربی کی اصطلاحوں کے بجائے اب فارسی کی اصطلاحیں بولنے کا رواج ہے ۔ انھوں نے اس کے علاوہ فرانسیسی کے اثر کی وجہ سے بہت سی فرانسیسی اصطلاحوں کو مفرس کر لیا ہے ۔ ظاہر ہے کہ تہذیب کا یہ عمل ہمارے یہاں بھی جاری ہے اور جاری رہنا چاہئے مگر کچھ الفاظ پہلے فارسی سے پھر عربی سے پھر انگریزی سے لینے ہی پڑیں گے ۔ اردو چونکہ ایک جدید ہندوستانی زبان ہے اور اس کی بنیاد کھڑی بولی ہے جو شورسین اپ بھرنش سے نکلی ہے اس لئے اس کا تعلق اپ بھرنش کے ذریعہ سنسکرت سے ہے ۔ سنسکرت کا رشتہ فارسی سے مسلّم ہے کیونکہ دونوں زبانیں انڈو ایرین خاندان سے تعلق رکھتی ہیں اس لئے اگرچہ ہم اردو کی جی نی اُس کو دیکھتے ہوئے سنسکرت کی اصطلاحوں سے زیادہ فائدہ نہیں اٹھا سکتے پھر بھی فارسی کی اصطلاحوں پر زیادہ توجہ کر کے سنسکرت سے قریب رہ سکتے ہیں مثال کے طور پر ہم conscious, Unconscious sub-conscious کے لئے شعور، تحت شعور اور لاشعور کی اصطلاحیں استعمال کرتے ہیں، ان کی جگہ فارسی کی اصطلاحیں آگہی، زیر آگہی اور ناآگہی بے تکلف استعمال کر سکتے ہیں ۔ اس لئے میرے نزدیک اصطلاح سازی کے لئے ہمارا اصول یہ ہوگا کہ موجودہ اصطلاحوں میں سے جو ہمارے آریائی مزاج کے مطابق ہیں وہ بجنسہٖ رہنے دی جائیں۔ نئی اصطلاحیں فارسی کی مدد سے بنائی جائیں اور جہاں انگریزی کی اصطلاح لینی ناگزیر ہو وہاں انگریزی کی اصطلاح تھوڑے سے تصرف کے ساتھ اختیار کر لی جائے ۔ اس سلسلے میں ہمیں ایک اصول کو چھوڑنا پڑے گا جس پر اب تک ہمارے علمار اور خواص سختی سے عمل پیرا رہے ہیں ۔ یعنی فارسی اور ہندی الفاظ کی ترکیب سے احتراز یا ہندی اور عربی کے مرکب الفاظ بنانے سے پرہیز ۔ ہماری زبان میں جب لبِ سڑک، فوق البھڑک، جیٹھی رھاں، تماہی جیسے الفاظ موجود ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم حسب ضرورت اس اصول پر اپنی اصطلاحیں نہ بنائیں ۔ دراصل

انشاؔ نے دریائے لطافت میں اردو زبان کی خود مختاری کا جو اعلان کیا تھا اس سے پورا فائدہ اٹھانا ضروری ہے۔ انشاؔ نے کہا تھا کہ جو لفظ عربی یا فارسی کا اردو زبان میں مستعمل ہو گیا وہ اب اردو کا لفظ ہے اور اسے اردو کے قاعدے سے برتنا چاہیئے۔ اس اصول پر عمل کرنے سے ہماری بہت سی مشکلات دور ہو سکتی ہیں۔

میں چند مثالوں سے اپنی بات واضح کرنا چاہتا ہوں۔ ہم Nature کے لئے فطرت، Natural کے لئے فطری، Naturalisin کے لئے فطرت پرستی کی اصطلاحوں سے کام لیتے ہیں لیکن Supernatural کے لئے مافوق الفطرت کہتے ہیں حالانکہ فوق فطری کافی ہوگا۔ اسی طرح International کے لئے بین الاقوامی کے بجائے بین قومی لکھنا زیادہ مناسب ہوگا۔ نشاۃ الثانیہ کے لئے حیاتِ نو یا نوجیون مناسب ہوگا۔ ہم نے مذہب میں صلوٰۃ کے بجائے نماز کو اختیار کر لیا لیکن بہت سی اصطلاحیں عربی کی نہیں چھوڑ سکتے۔ حالانکہ فارسی کی اصطلاحیں یا ہندی کی وہ اصطلاحیں جو ہمارے صوتی نظام سے متصادم نہ ہوں ہمارے لئے زیادہ قابلِ قبول ہونی چاہئیں۔

اس سلسلہ میں ایک بات اور قابلِ غور ہے۔ انگریزی میں لفظ نیشن سے نیشنلائز اور آئیڈیل سے آئیڈلائز بنایا گیا ہے۔ اس نہج پر ہمیں قومیانا اور آدرشیانا لکھنا چاہیئے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ Idealization کے لئے آدرشیانے کا عمل اور Nationalization کے لئے قومیانے کا عمل لکھنا پڑے گا۔ قدیم اردو میں خرچ سے خرچنا استعمال ہوتا تھا۔ وحید الدین سلیمؔ نے اس اصول پر برتانا کی حمایت کی تھی۔ اس طرح سے بہت سے فعل بنائے جا سکتے ہیں گو اس میں شک نہیں کہ ہر جگہ یہ اصول کام نہیں دے گا۔ انگریزی میں بھی نہیں دیتا۔

اصطلاح سازی بہر حال ضروری ہے۔ نئے خیالات کے لئے نئے الفاظ لینے ہوں گے، ہاں حالیؔ کے بنائے ہوئے اصول کے مطابق اس معاملے میں احتیاط سے کام لینا

ہوگا۔ نئے الفاظ نئے ذہن کی تشکیل کرتے ہیں۔ اردو کو جدید ذہن سے ہم آہنگ کرنے کے لئے جدید اصطلاحیں بنائے بغیر چارہ نہیں۔ مگر کوئی جدید چیز بالکل جدید نہیں ہوتی، یہ کسی پرانی اور بھولی بسری روایت کی تجدید، توسیع یا ترمیم ہوتی ہے اس لئے ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے سارے خزانے کو کھنگالیں، پیشہ وروں کی اصطلاحات سے مدد لیں اور نئی چیزوں، نئے خیالات، نئے لفظوں کو حسب ضرورت اختیار کریں۔ یہ نہیں سوچنا چاہئے کہ یہ کتابیں کون پڑھے گا۔ طالب علم تو نہ اردو جانتے ہیں نہ ہندی نہ انگریزی۔ ایک طرف ہمیں اس پر اصرار کرنا چاہئے کہ جن کی مادری زبان اردو ہے وہ ثانوی تعلیم اردو کے ذریعہ سے حاصل کریں تاکہ ان کی بنیاد مضبوط ہو۔ دوسری طرف ہمیں ان کو افسانہ وافسوں اور جذبات کے محشرستان کے بجائے فکر و نظر کی رفعتوں کی طرف مائل کرنا ہوگا تاکہ وہ جدید ذہن پیدا کرسکیں اور اس جدید ذہن کی مدد سے موجودہ دور کے پُرپیچ اور نت نئے روپ بدلنے والی زندگی کے فرائض سے عہدہ برآ ہوسکیں۔ ترقی اردو بورڈ کے سامنے اپنے تراجم اور تصانیف کے کام میں یہی آدرش ہونا چاہئے۔ اس آدرش تک پہونچنے میں دیر لگے گی مگر تاریخ بتاتی ہے کہ اچھے راستے وہی ہوتے ہیں جو سب سے لمبے ہوتے ہیں کیونکہ انھیں میں خلوص، ریاض اور خون جگر کی مکمل نقش گری ہوسکتی ہے۔

روش صدیقی مرحوم

مجھے نہ روک، ہم نشیں

(چوتھائی صدی بیت گئی "حسن گریزاں" کے عنوان سے میں نے ایک نظم لکھی تھی، جس کا مرکزی خیال یہ مصرع تھا :

مرے سرو ناز ابھی نہ جا

مرے دلنواز ابھی نہ جا

اشاعت کے بعد، بہت دنوں تک ادبی حلقوں میں یہ نظم اظہار خیال کا موضوع بنی رہی۔ حال میں[1] عالم سروش سے اس کا جواب القا ہوا نظم کے لباس میں، اس میں وہی شوخی جواب روپوش ہے۔)

مجھے نہ روک ہم نشیں
میں کل ضرور آؤں گی
نہیں ہے کیوں تجھے یقیں
میں کل ضرور آؤں گی

---

۱ یہ نظم مع اس نوٹ کے مرحوم کے کاغذات میں ملی ہے، جسے مرحوم کے صاحبزادے شاہد سعید صدیقی صاحب نے از راہ کرم عنایت فرمایا ہے۔ اس پر کوئی تاریخ نہیں جس سے اندازہ کیا جاسکے کہ یہ جواب کب القا ہوا تھا۔

یہ جانتی ہوں زندگی　　طلسمِ خواہشات ہے
جو کل کو آج کر سکے　　یہ کس کے بس کی بات ہے
یہ دن جو بیت جائیگا　　تو پھر سہاگ رات ہے
نہ رنج کر نہ ہو حزیں
میں کل ضرور آؤں گی
مجھے نہ روک ہم نشیں
میں کل ضرور آؤں گی

یہ ہجر کیا ہے قرب کیا　　یہ سوز کیا ہے ساز کیا
یہ اضطراب شوق کیوں　　یہ درد کیا گداز کیا
یہ تشنگی ہے کس لئے　　ہے سرخوشی کا راز کیا
حیات کیا ہے کیا نہیں
یہ سب حجاب اٹھاؤنگی
مجھے نہ روک ہم نشیں
میں کل ضرور آؤں گی

یہ رختِ شوق کس لئے　　یہ شعلۂ ہوس ہے کیوں
شریکِ خوابِ آشیاں　　تصورِ قفس ہے کیوں
فراغِ دل کی تاک میں　　کمندِ پیش و پس ہے کیوں
کہاں ہے منزلِ یقیں
یہ آنکھ سے دکھاؤں گی

مجھے نہ روک ہم نشیں
میں کل ضرور آؤں گی

جمال ہم نشیں ہے کیا — خیالِ یار ہی تو ہے
بہشت جس کا نام ہے — وہ انتظار ہی تو ہے
جو شبِ ظلمتِ خزاں — شبِ بہار ہی تو ہے
بہار، ہاں وہ ہو کہیں
میں اس کو کھینچ لاؤں گی
مجھے نہ روک ہم نشیں
میں کل ضرور آؤں گی

وہ شمع تو نہیں ہوں میں — صبا جسے بجھا سکے
وہ نقش تو نہیں ہوں میں — ہوس جسے مٹا سکے
وہ خواب تو نہیں ہوں میں — جسے کوئی بھلا سکے
مرے رفیقِ دل نشیں
میں کل ضرور آؤں گی
مجھے نہ روک ہم نشیں
میں کل ضرور آؤں گی

سید احمد علی آزاد

جامعہ میں ابتدائی تعلیم کے تجربے

(۶)

بچوں کی حکومت کا الکشن

نئے داخلوں کی مصروفیت سے جب فرصت ملتی ہے تو بچوں کی حکومت کے صدر کے چناؤ کی ہاہمی شروع ہو جاتی ہے۔ دس پندرہ دن صدر کے چناؤ کی کنویسنگ ہوتی رہتی ہے۔ پہلے بھی یہی ہوتا تھا اور آج بھی یہی ہوتا ہے۔ یہ کام نگران مدرسہ ایک اُستاد کے سپرد کر دیتا ہے۔ وہ سارے الکشن کی نگرانی کرتا ہے۔ اس الکشن کا نقشہ ابتدائی ششم کے طلبا نے ذیل کے اشعار میں کھینچا ہے:

ہر سال الکشن ہوتا ہے، سب بچے حصہ لیتے ہیں
دلچسپ مشاغل ہوتے ہیں، اس طرح پڑھائی ہوتی ہے
بچوں کا الکشن ہوتا ہے، تقریریں سب کی ہوتی ہیں
جو کر بن بن کر آتے ہیں اور ان پہ ہنسائی ہوتی ہے
بچوں کا الکشن آتا ہے، نعروں کی گونجیں اٹھتی ہیں
ہر صدر کی کوشش ہوتی ہے، ہر دل میں سمائی ہوتی ہے
ہم اپنے وزرا چنتے ہیں، بچوں کی حکومت بنتی ہے
بچوں کے جلسے ہوتے ہیں، بچوں کی صدارت ہوتی ہے

بھیجیں گے راکٹ زمیں سے دوردُور — چاند اور سورج سے بھی مل آئیں گے
نظم اور تقریر تو ہم نے سُنی — اب سمجھ کر ووٹ دینے جائیں گے
اِن میں سے جو بھی صدر بن جائے گا[۲] — ایک کرسی پر اُسے بٹھلائیں گے
یہ ارادہ کرلیا ہم سب نے آج — جو بھی جیتا ہار ہم پہنائیں گے
گونجے گا نعرہ ہمارا زندہ باد — کامیابی کی خبر جب پائیں گے

ایک اچھے مدرسہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ کوئی اچھا مقصد سامنے رکھے۔ بامقصد کام میں تمام اساتذہ اور طلبار مصروف رہتے ہیں۔ مدرسہ ابتدائی کے یہ سارے کام مدرسہ کا مقصد تھے۔ نگران مدرسہ سال بھر کے کاموں کو استادوں کے سامنے پیش کرتا تھا اور مشورہ کرتا تھا۔ مشورہ کے بعد اِن کاموں کے کیے جانے کی تاریخیں مقرر ہوجاتی تھیں۔ اب یہ ہر جماعت کے اُستاد کا کام ہوتا تھا کہ وہ اِن کاموں کے ہونے کے دوران کتنا تعلیمی کام اپنی جماعت میں طلبار سے کرالیتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کسی جماعت کا اُستاد اُس وقت کی بچوں کی حکومت کے الکشن کی دلچسپی سے کوئی فائدہ نہ اُٹھائے بلکہ ساری دلچسپی، چہل پہل اور بچوں کی ہماہمی کو وقت کا ضائع کرنا ہی سمجھ بیٹھے۔ بلکہ مدرسہ کی اس قسم کی غیر نصابی دلچسپی کے خلاف آواز بلند کرے۔ گویا ان نئے کاموں کو، جس میں طلبار اپنی دلچسپی سے مصروف رہتے ہیں، تعلیم کا کام ہی نہ سمجھے۔ لیکن دوسری طرف بچوں کی اس دلچسپی سے کوئی اُستاد پورا فائدہ اٹھائے اور ہندوستان کے صدر کے انتخاب کے بارے میں بتلائے۔ کون صدر ہوسکتا ہے ؟ صدر جمہوریہ کے انتخاب کا طریقہ کیا ہے ؟ صدر جمہوریہ کے کیا کیا اختیارات ہوتے ہیں ؟ وغیرہ وغیرہ۔ اور اگر بچے دلچسپی لیں تو مختلف طریقے کی دنیا میں رائج حکومتوں کے بارے میں بتلایا جاسکتا ہے۔ میں نے ماحول کی اس دلچسپی سے فائدہ اٹھاکر چھٹی جماعت کے بچوں سے ایک

۲۔ اس الکشن میں افسر امین کامیاب ہوئے۔

نظم لکھوائی اور بچوں نے کامیابی سے کسی چھٹی جماعت کی کتاب سے چاند ... پر نظم پڑھایا۔ معلومات میں میونسپلٹی اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے بارے میں بتلایا۔

تعلیمی میلہ

پہلے اس میلہ کا نام "بچوں کا میلہ" تھا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کے ایما پر آزادی سے پہلے مدرسہ ابتدائی کے اساتذہ اور بچوں نے مل کر اسے شروع کیا تھا۔ ابتدا میں مختلف دکانیں اور اسکاؤٹنگ کے مظاہرے اس میلے کی رونق ہوتے تھے۔ دو ایک ڈرامے بھی ہوتے تھے۔ دہلی میں ... کے محلوں میں اشتہار لگائے جاتے تھے۔ اس پر ڈاکٹر سعید احمد بریلوی کا یہ مصرعہ لکھا ہوتا تھا: "آیئے میلہ ہمارا دیکھیے" قرول باغ سے تعلیمی مرکز نمبر ۱ کے طلباء اور اساتذہ اس میں شرکت کرتے تھے۔ میلے کا ناظم بھی مدرسہ ابتدائی کا نگران ہوتا تھا۔ بچوں کی اسکاؤٹنگ، بچوں کے ڈرامے، بچوں کے کاموں کی نمائش، بچوں کی دکانیں اور بچوں کا ٹی اسٹال اس کی رونق بڑھاتے رہے اور بعد میں جب اس کا کام خاصہ بڑھ گیا تو اس کا نام "تعلیمی میلہ" رکھدیا گیا اور ناظم کا انتخاب تمام اداروں کے نگرانوں کے مشورہ سے ہونے لگا۔ اس کی رونق کو بڑھانے کے لئے ہر ادارہ کچھ نہ کچھ پروگرام پیش کرنے لگا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو علی گڑھ میں قائم ہوئی تھی اس تاریخ کو یاد رکھنے کے لئے میلے کی تاریخیں اس تاریخ کے آس پاس ہوتی تھیں۔ جامعہ کا کنووکیشن بھی انھیں تاریخوں میں ہونے لگا۔ جس میں ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم بحیثیت نائب صدر جمہوریہ اور بعد میں صدر جمہوریہ کی حیثیت سے شرکت کرتے رہے۔ یہ تین چار دن کا میلہ مدرسہ ابتدائی کے بچوں کے لئے خاص خوشی کا زمانہ ہوتا تھا۔ بچے طرح طرح کی چیزیں دیکھتے تھے، نئے نئے پروگراموں میں شرکت کرتے تھے۔ مختلف اداروں کی طرف سے ہونے والی نمائشیں دیکھتے تھے اور رات کو ڈرامہ میں شرکت کرتے تھے۔ یہ بچوں کی منصوبہ بند عید ہوتی تھی۔

اس تعلیمی میلہ میں خود مدرسہ ابتدائی کا بہت بڑا حصہ ہوتا تھا۔ دن کو اساتذہ اور طلباء اپنی اپنی جماعتوں میں پروجکٹ پر کام کرتے تھے اور رات کو ڈراموں اور رنگارنگ پروگراموں کی تیاری میں حصہ لیتے تھے۔ ہر جماعت کی ڈرائنگ کا کام جس کی پروجکٹ کے سلسلہ میں ضرورت ہوتی تھی، رات کو ہوتا تھا۔ تمام جماعتوں کے پروجکٹ تیار ہوکر ابتدائی مدرسہ کی ہوسٹل کی عمارت میں چار بڑے کمروں میں لگائے جاتے تھے۔ پروجکٹ کا سامان اس قدر ہوتا تھا کہ ہر جماعت کو حساب سے جگہ ملتی تھی باقی سامان میز پر رکھ دیا جاتا تھا۔ میرے خیال میں ابتدائی اول سے لے کر ابتدائی ششم تک اتنے زیادہ پروجکٹوں پر کام ہوا کہ پروجکٹ کے عنوانات کی فہرست ہی ختم ہوگئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض بعض پروجکٹ کئی کئی بار چلائے گئے۔ ان وقتی پروجکٹس کی فہرست بہت لمبی ہے۔ پھر بھی کچھ کے نام اپنی یادداشت سے لکھتا ہوں۔

(۱) ڈاکخانہ پروجکٹ (۲) حج پروجکٹ (۳) میلاد النبیؐ پروجکٹ (۴) نباتات پروجکٹ (۵) بانیانِ جامعہ پروجکٹ (۶) آدمی پروجکٹ (۷) جامعہ کے شعبے پروجکٹ (۸) ایشیا پروجکٹ (۹) آزادی کے مرکز پروجکٹ (۱۰) گاندھی پروجکٹ (۱۱) ہالہ کی مہمیں پروجکٹ (۱۲) ہالہ کی ہندوستانی مہمیں پروجکٹ (۱۳) ریلوے پروجکٹ (۱۴) چاند کی فتح پروجکٹ (۱۵) یو، ان، او پروجکٹ (۱۶) دنیا کے بچے پروجکٹ (۱۷) بندر پروجکٹ (۱۸) حیوانات پروجکٹ (۱۹) ہماری شاعری پروجکٹ (۲۰) تہوار پروجکٹ (۲۱) عید پروجکٹ (۲۲) کیڑے مکوڑے پروجکٹ

یہ فہرست نامکمل ہے۔ مدرسہ ابتدائی میں کام کرنے والے اساتذہ سوچ سوچ کر نئے نئے پروجکٹ شروع کرتے تھے اور بچے استاد کی ہدایت کے مطابق اس سے تعلیمی فائدہ اٹھاتے تھے۔ ہر پروجکٹ کے تعلیمی کام کو بیان کرنا پڑھنے والوں کے لیے دلچسپ نہ ہوگا صرف طریقہ کار لکھا جاتا ہے۔ میلے کے موقع پر مدرسہ ابتدائی کی ہر جماعت میں پروجکٹ چلتا تھا جولائی کا نصف مہینہ داخلوں کی مصروفیت میں گذرتا تھا۔ اگست کے آخر تک بچوں کی حکومت کے انتخابات ہوتے رہتے تھے۔ ستمبر سے ہر جماعت پروجکٹ کا انتخاب کر کے کام شروع کردیتی

تھی۔ اکتوبر کے آخری ہفتہ یا نومبر کے پہلے ہفتہ کے درمیان میلے کی تاریخوں کا اعلان ہو جاتا تھا۔ گویا دو مہینے ہر جماعت کو پروجکٹ پر کام کرنے کے لئے ملتے تھے۔ چوتھی جماعت سے چھٹی جماعت تک کے استادوں کا کام خاصا بڑھ جاتا تھا۔ اس لیے کہ ان جماعتوں میں خاصا تحریری کام ہوتا تھا۔ اگر کسی پروجکٹ پر بیس عنوانات پر مضامین لکھوانے ہوتے تھے تو ہر طالب علم کو اِن بیس عنوانات پر مضامین لکھنے ہوتے تھے۔ تمام بچوں کی کاپیاں آنے پر ان سب کی اصلاح کی جاتی تھی اور اِن میں سے جس طالب علم نے سب سے اچھا مضمون لکھا ہوتا تھا وہ منتخب کرلیا جاتا تھا۔ بعض بعض مضامین کئی بچوں کے بہت اچھے ہوتے تھے تو دو دو تین تین مضامین لے لیے جاتے تھے اور ان کا ایک کتابچہ (پمفلٹ) بنا دیا جاتا تھا۔ ان تمام اچھے مضمونوں کو پمفلٹ کے کاغذ پر صاف صاف لکھوایا جاتا تھا اور بچوں کے لکھنے کے بعد اِن کتابچوں کی بھی اصلاح ہوتی تھی تاکہ کوئی غلطی نہ رہ جائے۔ یوں اگر بیس کتابچے بھی لکھوائے جاتے تھے تو بھی اصلاح کا کام خاصا ہو جاتا تھا لیکن پمفلٹ کی تعداد عام طور سے بیس اور چالیس کے درمیان ہوتی تھی۔ بعض بعض پروجکٹس میں چارٹس کی لکھائی بھی بچے کرتے تھے۔ اور اُن کی اصلاح کا کام بھی استاد کرتا تھا۔ پروجکٹ کے بارے میں مواد جمع کرنا اور صحیح معلومات بچوں کو دینا خاصہ محنت طلب کام ہوتا تھا لیکن اساتذہ لگ کر کرتے تھے۔ پروجکٹ کے سلسلہ میں چیزیں اور تصویریں بھی جمع کرائی جاتی تھیں۔ اگر پروجکٹ کے سلسلہ میں کہیں مشاہدہ کے لیے جاتے تھے تو اس کا حال بھی بچوں سے لکھوایا جاتا تھا۔ جب پروجکٹس میلے کے موقع پر نمائش کے کمرے میں لگائے جاتے تھے تو یہ وضاحت ضرور کی جاتی تھی کہ کس مضمون میں کتنا کام ہوا اور وہ سارا کام مضمون وار وہاں رکھ دیا جاتا تھا۔ مضمون وار کام کی وضاحت ایک چارٹ پر لکھوا دی جاتی تھی۔

میلے کی دلچسپیوں کو ابتدائی ششم کے طلبا نے اپنی ایک نظم میں اس طرح قلمبند کیا ہے:

آئیے میلہ ہمارا دیکھئے — ایک نئی دنیا بساتا دیکھئے
لڑکیاں ہنستی اچھلتی آئیں گی — آئیے ان کا تماشا دیکھئے
آپ بچوں کی دکاں میں جائیے — اُن کی محنت اور سلیقہ دیکھئے
گھومیے اور کام سارا دیکھئے — رات ہو جائے ڈرامہ دیکھئے
آج دولہن بن گئی ہے جامعہ — اس کی رونق کا تماشا دیکھئے
کار پر اپنی ذرا آجائیے — شام تک میلا ہمارا دیکھئے
جائیے کمرہ نمائش دیکھئے — سال بھر کا کام ہمارا دیکھئے
میوزیم کی سیر کرنے آئیے — وقت دیجے کام سارا دیکھئے
آئیے بچوں کے ٹی اسٹال میں — اُن کی سروس اور سلیقہ دیکھئے
صدر بچوں کی حکومت آگئے — اُن کی مسند کا ڈرامہ دیکھئے

نگران مدرسہ جناب آزاد رسول صاحب کو ڈراموں کے انتخاب اور تیاری میں خاص محن
کرنی پڑتی تھی۔ وہ اس قسم کا ڈرامہ انتخاب کرتے تھے جس میں زیادہ سے زیادہ بچے حصہ
سکیں۔ جامعہ میں ڈرامہ کا معیار بہت بلند رہا ہے۔ اس معیار کو مدرسہ ابتدائی میں بھی قا
رکھا جاتا تھا لہٰذا آزاد رسول صاحب نے مدرسہ ابتدائی کی طرف سے جتنے ڈرامے کرا
ان کے سابقہ بلند معیار کو برابر قائم رکھا۔ ڈراموں کی روزانہ مشق ہوتی تھی اور اس مشق
دوران اس کی باریکیوں پر نظر رکھی جاتی تھی۔ نگران مدرسہ ہر اُستاد کو ان کے شروع کر
ہوئے پروجکٹ کی پلیننگ میں برابر مشورہ دیتا تھا اور ڈرائنگ کلاس میں کافی رات
جاگ کر استادوں کی ہمت افزائی کرتا رہتا تھا۔ مدرسہ ابتدائی کے صدر دروازہ کی آ
خاص پلیننگ کے ماتحت ہوتی تھی۔ یہ سارے کام، یہ مشق، یہ جدوجہد اور کام کی یہ لگ
سال ہوتی رہی۔ نگران مدرسہ، اساتذہ اور طلبا نے کام کا حق ادا کیا۔ اب کوئی اس
کرے یا نظر انداز کر دے۔ ہاں ہر سال نئے طلبا آتے ہیں اور نگران مدرسہ اور اساتذہ کو

اور سرفرازی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اپنے کاموں کو یاد کرتے ہیں، یہی سارے کام کا انعام ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ عبدالغفار مدہولی صاحب نے بہت سے نئے کاموں کی ابتدا کی، اور ان نئے کاموں کی وجہ سے جامعہ ملیہ نے ملک میں ایک خاص مقام حاصل کیا۔ لیکن بعد میں آنے والوں نے بھی اپنا حق پوری طرح ادا کیا، پرانے کاموں کو تو جاری ہی رکھا، بہت سے نئے کام بھی شروع کیے اور یوں جامعہ کے اس بلند معیار کو گرنے نہیں دیا۔
عبدالغفار صاحب کے زمانہ کی جامعہ محدود تھی لیکن ۱۹۵۴ — ۱۹۶۵ تک کی جامعہ بہت پھیل چکی تھی۔ اس پھیلی ہوئی جامعہ میں کاموں کا اتنا تنوع اور اتنا پھیلاؤ اور پھر اس کی تنظیم پرانی روایات سے زیادہ جدوجہد اور کوششوں کا پرتو تھا۔

ایک دن کا مدرسہ

تعلیمی سال کے پہلے حصہ میں دو دلچسپیاں "بچوں کی حکومت کے صدر کا انتخاب" اور "تعلیمی میلہ" ہوتی ہیں۔ جنوری سے جب دوسرا ٹرم شروع ہوتا ہے تو "ایک دن کا مدرسہ" "کھلی ہوا کا مدرسہ" اور سالانہ اسپورٹس ہوتے ہیں۔ ۱۰ جنوری کو مدرسہ کھلتا ہے اور دو چار دن گذرنے کے بعد اِن غیر نصابی دلچسپیوں کی تاریخیں طے ہو جاتی ہیں۔ سب سے پہلے "ایک دن کا مدرسہ" ہوتا ہے۔ ایک دن کا مدرسہ دراصل سارے مدرسہ کے طلباء کا ایک پروجکٹ ہوتا ہے۔ جس میں مدرسہ کے بیشتر طلباء کام کرتے ہیں۔ مدرسہ ابتدائی کی عام جماعتوں کی تدریس کا انتظام، اساتذہ کی غیر موجودگی میں، طلباء خود کرتے ہیں۔ نگران مدرسہ کے فرائض صدر بچوں کی حکومت انجام دیتا ہے۔ کلرک، چپراسی، جمعدار اور ناظم مطبخ کے فرائض بھی لڑکے ہی انجام دیتے ہیں۔ غرضیکہ سارے مدرسہ کا انتظام ایک دن کے لیے بچوں کے حوالہ کر دیا جاتا ہے اور مدرسہ کے اصل نگران، اساتذہ، کلرک، جمعدار اور چپراسی کہیں پکنک منانے چلے جاتے ہیں اور شام کو واپس آتے ہیں۔

اس ایک دن کے مدرسہ کے لیے بچے جو تیاریاں کرتے ہیں وہ دیکھنے کے قابل ہوتی ہیں۔ ہر طالب علم استاد جس کو کسی جماعت میں پڑھانا ہوتا ہے وہ اس جماعت سے مل کر جماعت میں پڑھائے جانے والے سبق کی تیاری کرتا ہے۔ حساب کے جس قاعدے کے سوال کرانے ہوتے ہیں وہ چالیس منٹ کے پیریڈ کے لئے ایک کاپی پر لکھ لیتا ہے۔ تمام طلبا مل کر جماعت کے لیے تعلیمی سامان تیار کرتے ہیں اور اُس دن اس تعلیمی سامان سے جامعہ کو سجاتے ہیں۔ تعلیمی سامان سے جماعت کو سجانے، جماعت میں نظم قائم رکھنے، ٹھیک طرح پڑھانے اور صفائی کا جماعتوں میں مقابلہ ہوتا ہے اور اول، دوم، سوم آنے والی جماعتوں کو کپ دیئے جاتے ہیں۔ چنانچہ طلبار دن رات لگ کر کام کرتے ہیں اور اِس میں بڑی حد تک سنجیدگی ہوتی ہے۔

پانچویں اور چھٹی جماعتوں میں انھیں جماعتوں کا طالب علم درس دیتا ہے اور پہلی سے چوتھی جماعتوں تک کے لئے پانچویں اور چھٹی جماعتوں کے ہونہار طلبار لیے جاتے ہیں۔ جماعت کی آرائش، پروجکٹ کے کام، اسباق سے متعلق چارٹس یا ماڈل سے کی جاتی ہے۔ طلبار دن رات لگ کر اِس ایک دن کے مدرسہ کی تیاری کرتے ہیں۔ بورڈنگوں میں بھی مقابلہ ہوتا ہے۔ وہاں صفائی ستھرائی، سلیقہ، بچوں کی بنائی ہوئی چیزوں میں مقابلہ ہوتا ہے اور اول، دوم، سوم، چہارم آنے والی بورڈنگوں کو کپ ملتے ہیں۔ اس لیے بورڈنگوں میں بھی خاصہ کام پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ طلبار اور اساتذہ اپنی جماعتوں اور بورڈنگوں میں نئے نئے کام کرتے ہیں اور یوں کاموں کے نئے نئے نمونے بچوں کے سامنے آتے ہیں۔ مدرسہ کے تمام بچے انھیں دیکھتے ہیں اور اِن سے سیکھتے ہیں، یوں ایک تعلیمی ماحول بنا رہتا ہے۔

بچوں کی حکومت کے مقرر کیے ہوئے اساتذہ، کارکن اور دوسرے عملے کے لوگ بیج لگائے ہوئے سارے کام انجام دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وزیر اعظم بچوں کی حکومت دو تین لڑکوں اور لڑکیوں کے ساتھ استقبالیہ کمیٹی کے فرائض انجام دیتا ہے۔ وہ مہمانوں

کے ساتھ بچوں کو کام کرتے ہوئے اور فرائض انجام دیتے ہوئے دکھلاتا ہے اور تمام کاموں کو سمجھاتا ہے۔ مدرسہ کی طرف سے ایک معائنہ کمیٹی مقرر ہوتی ہے جو بچوں کا یہ سارا کام دیکھتی ہے اور ان پر جماعت وار نمبر دیتی ہے۔ اسی طرح بورڈنگوں کا کام دیکھ کر ہر بورڈنگ کو نمبر دیتی ہے۔ ان کے دیے ہوئے نمبروں کے مطابق جماعتیں اور بورڈنگیں اول، دوم، سوم اور چہارم آتی ہیں۔ رات کو کیمپ فائر ہوتا ہے ہر جماعت اپنی طرف سے دس پندرہ منٹ کی ایک نقل پیش کرتی ہے۔ ساری جامعہ برادری کیمپ فائر دیکھنے آتی ہے۔ یہ ایک یا سوا گھنٹہ کا پروگرام بہت دلچسپ ہوتا ہے۔ نقلوں کے بعد اول، دوم، سوم اور چہارم آنے والی نقلوں پر انعام دیا جاتا ہے۔ کسی بچے کی اچھی اداکاری پر اس کو خصوصی تمغہ دیا جاتا ہے اس طرح ایک دن کے مدرسہ کا پروگرام ختم ہوتا ہے۔

چھٹی جماعت کے طلبا نے ایک دن کے مدرسہ کا حال اس طرح نظم کیا ہے:

ایک دن کا مدرسہ

قمر رضا

ایک دن کا مدرسہ ہے دل ہمارا شاد ہے
بچہ ہی شاگرد ہے اور بچہ ہی استاد ہے
ابتدائی کے گئے استاد سارے ٹور پر
صرف لڑکوں ہی کے دم سے مدرسہ آباد ہے

اقبال

ایک لڑکا بن گیا نگران اس اسکول کا
درجہ درجہ میں پڑھانے کے لیے استاد ہے

شائط الہ آبادی

کوئی ہے فائز اتالیقی پہ کوئی آپا جان ہے
بچہ بچہ خوش نظر آتا ہے اور آزاد ہے
سب نے مل کر لے لیا ہر مدرسہ کا انتظام
کوئی چپراسی بنا ہے اور کوئی استاد ہے

امرہ

ہر جماعت میں نیا ساماں نظر آنے لگا
ہر جگہ رونق ہے سارا مدرسہ آباد ہے

شمیم

بن گئے ناظم کتب خانہ کے بس مسٹر عقیل
حضرتِ اقبال استقبالیہ کے رُکن ہیں
بچوں ہی کا ایک ساتھی ششم کا استاد ہے
مدرسہ کوشش سے سب کی کس قدر آباد ہے

خورشید احمد

لڑکے ہی شاگرد ہیں اور لڑکے ہی استاد ہیں
ایک دن کے مدرسہ کا ہو رہا ہے اہتمام
ٹیچروں کے جانے سے بھی مدرسہ آباد ہے
کس قدر مسرور ہیں ہم دل ہمارا شاد ہے

آصف علی

اپنی آزادی کا سب کو آج بھی احساس ہے
ہوگی جب چھٹی تو ساتھی مل کے کھانا کھائینگے
جو مرا ساتھی تھا کل تک آج وہ استاد ہے
مدرسہ لڑکوں کے دم سے کس قدر آباد ہے

(باقی آیندہ)

عبداللطیف اعظمی

کوائف جامعہ

بنگلادیش پر ایک تقریر

بنگلادیش کی تحریک آزادی جس پس منظر میں شروع ہوئی اور جن حالات میں آگے بڑھی، اس کے برحق ہونے میں اور اس کے کچلنے کے لیے جن وحشیانہ مظالم سے کام لیا گیا، اس کے مذموم اور غیر اسلامی ہونے میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ مگر جن لوگوں کے ذہنوں میں کجھ کجی ہے یا جن لوگوں کو مغربی پاکستان کے ساتھ کسی وجہ سے ہمدردی ہے، وہ بنگلادیش کی تحریک آزادی کی کھل کر حمایت کرنے اور مغربی پاکستان کے فوجی حکمرانوں کے وحشیانہ مظالم کی واضح لفظوں میں مذمت کرنے سے کتراتے ہیں اور دوسروں کو غلط فہمی میں مبتلا کرنے کے لئے طرح طرح کے سوالات اٹھاتے اور اعتراضات کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں بہاریوں کے خلاف بنگالیوں کے مظالم کو خاص طور پر بڑی شد و مد کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ اس کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ فوجی ٹولے کی بہیمانہ حرکتوں کے لیے وجہ جواز پیدا کیا جائے یا کم از کم اس پر پردہ ڈالنے کی سعی نامشکور کی جائے۔

ابھی حال میں ڈھاکہ (سابق مشرقی پاکستان) کے ایک نوجوان ایڈوکیٹ جناب مودود احمد صاحب جامعہ ملیہ اسلامیہ تشریف لائے تھے اور انھوں نے اساتذہ کے ایک جلسے میں تقریر کی جس میں بڑی تفصیل کے ساتھ انھوں نے بنگلادیش کی تحریک آزادی پر روشنی ڈالی اور بہاریوں کے خلاف بنگالیوں کے مظالم کا مدلل اور مسکت جواب دیا۔ ذیل میں ہم

ان کی تقریر کا خلاصہ درج کرتے ہیں۔

معزز مہمان کی تقریر سے قبل جامعہ کالج کے پرنسپل اور جلسے کے صدر جناب ضیاء الحسن فاروقی صاحب نے موصوف کا خیر مقدم کرتے ہوئے فرمایا:

"مجھے خوشی ہے کہ آج میں بنگلا دیش کے ایک نمائندے اور محترم شخصیت کا استقبال کر رہا ہوں اور اسی کے ساتھ ایک دبا دبا سا غم بھی ہے کہ ایسے وقت میں ان کا خیر مقدم کر رہا ہوں کہ وہ اپنے وطن سے دور بنگلا دیش کی جنگ آزادی کے لئے جد و جہد کر رہے ہیں۔ موصوف ڈھاکہ ہائی کورٹ کے مشہور ایڈوکیٹ ہیں۔ ۲۵ر مارچ سے لیکر ۳۱ر مارچ تک وہ وہیں رہے اور اپنی آنکھوں سے وہ سب کچھ دیکھا جو ڈھاکہ میں خلق خدا پر گذری۔ یکم اپریل کو وہ ڈھاکہ سے، سب کچھ چھوڑ کر روانہ ہوئے۔ کچھ نہیں معلوم کہ ان کے والدین اور گھر والے کہاں ہیں۔ انھیں معلوم ہوا ہے کہ ان کا ذاتی کتب خانہ جو تقریباً ایک لاکھ روپے کی لاگت کی کتابوں پر مشتمل تھا، پاکستانی فوجیوں نے جلا دیا ہے۔ اس کے باوجود ان کا عزم ہے کہ بنگلا دیش کو، دوسرے مجاہد ساتھیوں کے ساتھ، آزاد کرائیں گے۔ ہمیں بھی امید ہے کہ انشاء اللہ جلد ہی جامعہ ملیہ میں آزاد بنگلا دیش کے آزاد شہری کی حیثیت سے ہم ان کا خیر مقدم کریں گے۔ مودود احمد صاحب چند روز پہلے بھی جامعہ تشریف لائے تھے، اس موقع پر میں نے جامعہ کی مختصر تاریخ اور اس کے تعلیمی و تہذیبی مقاصد انھیں بتائے تھے۔ میں نے کہا تھا کہ جامعہ سیکولرزم، جمہوریت اور سوشلزم کے اصولوں کو مانتی ہے اور بنگلا دیش بھی ان مقاصد کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یوں بھی ہم میں اور آپ میں بڑی ہم آہنگی ہے۔"

اس کے بعد معزز مہمان نے تقریر کی۔ انھوں نے اپنی تقریر کا آغاز لاہور قرارداد سے کیا، جو ۱۹۴۰ء میں منظور کی گئی تھی اور جسے اب عام طور سے قرارداد پاکستان کہا جاتا

ہے۔ موصوف نے فرمایا کہ اس میں دو خود مختار ریاستوں کا ذکر ہے، جس کا مطلب ظاہر ہے یہی ہے کہ مغربی اور مشرقی حصے، جن کے درمیان ۱۲ سو میل کا فاصلہ حائل ہے اور جن میں مذہب کے علاوہ اور کوئی چیز مشترک نہیں ہے، ایک حکومت کے اندر ہوتے ہوئے بھی دونوں خود مختار ہوں گے۔ اس لیے قدرتی طور پر مشرقی حصے کے لوگوں کو توقع تھی کہ قیام پاکستان کے بعد وہ اپنی قسمت کے آپ مالک ہوں گے، اسی لیے انھوں نے قیام پاکستان کے لیے بڑھ چڑھ کر جدوجہد کی اور بڑی سے بڑی قربانیاں دیں، مگر پاکستان بننے کے بعد ان کی یہ توقعات پوری نہیں ہوئیں۔ اگر ان کی حالت پہلے سے بدتر نہیں تو اچھی بھی نہیں ہوئی، استحصال اور لوٹ کھسوٹ کی جملہ شکلیں نہ صرف یہ کہ باقی رہیں بلکہ پاکستان کے نام پر ان میں اور اضافہ ہوا۔ مغربی پاکستان کے صرف ۲۲ خاندان ہیں جو پورے پاکستان پر حکومت کرتے ہیں، ملک کی سیاست اور معیشت پر ان کا کنٹرول ہے اور اپنے ذاتی مفاد کے لئے جو چاہتے ہیں کرتے ہیں۔ فاضل مقرر نے فرمایا، کہ آپ کو معلوم ہے کہ پاکستان میں آج تک جمہوری نظام قائم نہیں ہو سکا ہے، اس لیے جدید نسل کو اپنے خیالات کے اظہار کا موقع نہیں ملا۔ شروع کا زمانہ انتہائی انتشار کا تھا، پاکستانی لیڈروں اور مختلف جماعتوں میں طاقت اور اقتدار حاصل کرنے کے لئے آپس میں لڑائیاں تھیں، نئی نسل جو لاہور ریزولیوشن یا پاکستان بننے کے بعد پیدا ہوئی تھی، وہ صاحب شعور ہوئی تو اسے ایوب شاہی کا جابرانہ نظام ملا۔ اس میں پرانے سیاستدانوں کو ختم کر دیا گیا۔ ان میں بیشتر بلکہ تمام تر ایسے ہی تھے کہ ان کو اقتدار سے محروم کر دینا ہی پاکستان کے لیے مفید تھا، کیونکہ وہ ملک کے ساتھ مخلص نہیں تھے اپنی ذات کے ساتھ مخلص تھے اور انھوں نے پاکستان بنوایا ہی تھا اپنے فائدے کے لئے۔ مگر فیلڈ مارشل ایوب خاں نے جو کاروائی کی تھی وہ بھی ملک کے مفاد کے لیے نہیں اپنے اقتدار کی خاطر تھی، لیکن انھوں نے جس طرح حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی تھی، اسی طرح ان کے ہاتھ سے نکل کر یحییٰ خاں کے ہاتھ میں آگئی۔ مگر اب زمانہ پہلے جیسا

نہیں تھا، نئی نسل کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا اور وہ طے کر چکے تھے کہ وہ ملک کے حالات کو بدلیں گے اور ملک میں جمہوریت کو قائم کریں گے۔ اس لیے یحییٰ خاں کو الکشن کا اعلان کرنا پڑا۔ چنانچہ پچھلے سال کے آخر میں ـــــ ۷ دسمبر ۱۹۷۰ء کو ـــــ فوجی حکومت کے جابرانہ نظام میں پہلی مرتبہ پاکستان میں عام انتخابات ہوئے اور عوام نے ـــــ خاص طور پر مشرقی بنگال کے عوام نے بغیر کسی جھجک کے اپنی رائے دیدی کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ مگر ان کی رائے کا جو حشر ہوا وہ آپ سب کو معلوم ہے۔

فاضل مقرر نے چھ نکات کی، جن کی بنیاد پر عوامی لیگ نے انتخابات میں شرکت کی تھی اور نہ صرف صوبجاتی اسمبلی میں زبردست اکثریت سے کامیاب ہوئی تھی، بلکہ قومی پارلیمنٹ میں بھی سب سے بڑی پارٹی کی حیثیت سے کامیاب ہوئی تھی، وضاحت کرتے ہوئے بتلایا کہ مشرقی بنگال کے لوگ کیوں چاہتے ہیں کہ بیرونی تجارت پر ان کا کنٹرول ہو اور ان کا سکہ الگ ہو یا اگر یہ ممکن نہ ہو تو ملک میں دو ریزرو بنک ہوں، ایک مشرقی پاکستان کے لیے اور دوسرا مغربی پاکستان کے لیے۔ اعداد و شمار کی مدد سے موصوف نے بتلایا کہ پاکستان بننے کے بعد جس قدر بڑی صنعتیں قائم ہوئیں، وہ مغربی پاکستان میں قائم ہوئیں اور اگر ایک آدھ مشرقی پاکستان میں قائم بھی ہوئیں تو ان کے مالک اور کرتا دھرتا مغربی پاکستان کے لوگ تھے، اس لئے ان سے بھی تمام تر فائدہ مغربی پاکستان کو پہنچا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغربی پاکستان کے لوگ امیر سے امیر تر ہوتے گئے اور مشرقی پاکستان کے لوگ غریب سے غریب تر۔ جب ہم نے الگ سکے کا مطالبہ کیا تو اس کا مقصد اس کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا کہ ہمارے عوام جو کچھ پیدا کریں یا ہمارے علاقے کے کارخانوں اور ملوں سے جو آمدنی ہو، ہمارے حق کے مطابق اس میں ہمارا بھی حصہ ہو۔ الگ سکے کی جب سختی سے مخالفت کی گئی تو ہم اس پر تیار ہو گئے کہ مشرقی حصے کے لیے الگ سے ریزرو بنک ہو، جس کا مشرقی پاکستان کے سکے کی آمد و رفت پر پورا پورا کنٹرول ہو۔ ہم کسی حالت میں بھی اس کے لیے تیار نہیں کہ ہمارے عوام کی محنت کا استحصال

اور مشرقی پاکستان میں لوٹ کھسوٹ کا یہ سلسلہ جاری رہے۔ اس کو روکنے کے لئے ان دو صورتوں کے علاوہ کوئی اور موثر صورت ہو تو ہمیں بتلایا جائے، ہم اس پر غور کرنے کے لیے تیار ہیں۔

اس پروپگنڈے کی کہ شیخ مجیب الرحمان پاکستان کی سالمیت اور اتحاد کے مخالف ہیں جناب مودودی احمد صاحب نے تردید کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ الزام سراسر غلط اور گمراہ کن ہے۔ اگر وہ واقعی مشرقی بنگال کو پاکستان سے الگ کرنا چاہتے تو اس کے لیے سب سے اچھا موقع وہ تھا جب اگرتلا مقدمہ واپس لیا گیا تھا۔ اُس وقت بغیر کسی خاص رکاوٹ اور مزاحمت کے ہم مشرقی حصے پر قبضہ کر سکتے تھے۔ وہ موقع بھی اچھا تھا جب منتخب نیشنل اسمبلی کو ہم سے شورہ کئے بغیر غیر معینہ عرصے کے لیے ملتوی کر دیا گیا تھا۔ موصوف نے اس موقع پر ایک قانونی نکتہ یہ بیان کیا کہ صدر یحییٰ خاں نے یہ کاروائی ضابطے اور قانون کے خلاف کی۔ خود صدر پاکستان نے جو قوانین بنائے ہیں اس میں یہ تو لکھا ہے کہ وہ پارلیمنٹ کو بلا سکتا ہے، مگر یہ کہیں نہیں لکھا ہے کہ وہ برخاست یا ملتوی بھی کر سکتا ہے۔ دنیا کا دستور اور روایت یہ ہے کہ جب ایک مرتبہ اسمبلی بلا لی جائے تو پھر اسے منتخب اسپیکر ہی ملتوی یا برخاست کر سکتا ہے۔

شیخ مجیب الرحمان کے صبر و تحمل اور قوت برداشت کا ذکر کرتے ہوئے معزز مہمان نے کہا کہ انتخابات کے بعد نیشنل اسمبلی کے بلانے میں تاخیر کرنے اور بلا کر اسے ملتوی کر دینے کی وجہ سے مشرقی پاکستان کے نوجوانوں کی بےچینی بڑھتی جا رہی تھی اور ان کا غصہ قابو سے باہر ہوتا جا رہا تھا، مگر شیخ مجیب الرحمان کا حال یہ تھا کہ وہ کسی بڑے اقدام کے لیے تیار نہیں تھے۔ وہ بے چین نوجوانوں کو صبر و تحمل کی تلقین کرتے اور انھیں یقین دلاتے کہ حالات بہرحال بدلیں گے اور ان کے مطالبات منظور ہوں گے۔ ان کی اس نرم روی کی وجہ سے ان کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کو خاصا نقصان پہنچا اور نوجوان شیخ صاحب کو بزدل سمجھنے لگے اور ان کی

رہنمائی سے ان کی مایوسی بڑھنے لگی، مگر آخر تک وہ تشدد کی کارروائیوں کی مخالفت کرتے رہے وہ گفتگو اور سمجھوتے کے ذریعہ معاملات طے کرنا چاہتے تھے، اسی لیے انھوں نے گفتگو کا دروازہ ہمیشہ کھلا رکھا، مگر افسوس کہ فوجی ٹولے نے طاقت کے نشے میں صحیح حالات کو سمجھنے کی کبھی کوشش نہیں کی اور اب جو صورت حال پیدا ہوئی ہے، اس کی تمام تر ذمہ داری فوجی حکمرانوں پر ہے نہ کہ شیخ صاحب پر یا مشرقی بنگال کے عوام پر۔ شیخ صاحب اور عوامی لیگ پاکستان کے اندر رہ کر خود مختاری چاہتے تھے، مگر فوجی اقدام کر کے وہاں کے عوام کو مجبور کیا گیا کہ وہ اپنی آزادی کا اعلان کر دیں اور اب جبکہ لاکھوں کی تعداد میں لوگ مارے گئے ہیں اور بستیاں کی بستیاں جلا کر خاکستر کر دی گئی ہیں، وہ آزادی ــــ مکمل آزادی سے کم پر کسی طرح راضی نہیں ہوں گے۔

آخر میں انھوں نے بڑے یقین اور عزم کے ساتھ فرمایا کہ جیت بالآخر ہماری ہو گی، سوال صرف وقت کا ہے۔ جب کسی قوم میں آزادی کی محبت اور تڑپ پیدا ہو جاتی ہے تو بڑی سے بڑی طاقت بھی اور بڑے سے بڑا ظلم بھی ان کو آزاد ہونے سے نہیں روک سکتا۔ آزادی حاصل کرنے کے لئے جس قدر قربانی کی ضرورت ہو سکتی ہے، ہم اس سے کہیں زیادہ دے چکے ہیں، ابھی اور دینے کے لئے تیار ہیں۔ جغرافیائی اور بین الاقوامی سیاسی حالات بھی، بڑی حد تک، ہمارے حق میں ہیں، اس لیے ہمیں اپنی کامیابی کا پورا یقین ہے۔ جناب صدرِ جلسہ نے جس امید کا اظہار کیا ہے، انشاء اللہ وہ پوری ہو گی۔ اگر آیندہ پھر کبھی مجھے جامعہ آنے کا موقع ملا تو ایک آزاد ملک آزاد شہری کی حیثیت سے آؤں گا۔ انشاء اللہ۔

تقریر کے بعد جب سامعین کو سوال کرنے کی دعوت دی گئی تو ایک دوست نے سوال کیا کہ "نجی خطوط اور ایک پاکستانی عیسائی، مسکرینس (MASCARENHAS) کی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ بنگالیوں نے بھی غیر بنگالیوں کے ساتھ بڑا ظلم کیا ہے۔"

"یہ خطوط مشرقی بنگال کے کن علاقوں سے لکھے گئے ہیں؟" فاضل مقرر نے سوال کیا۔

"میں نے ان خطوط کو دیکھا نہیں ہے اور نہ یہ معلوم کیا کہ کن علاقوں سے لکھے گئے ہیں۔ میں نے صرف سنا ہے۔" سوال کرنے والے دوست نے جواب دیا۔

"مسکرینس کب مشرقی بنگال گیا تھا اور اس نے اپنی رپورٹ کب لکھی؟" سوال کرنے والے دوست سے یہ سوال ایک بزرگ اور بہت ہی سینیئر پروفیسر صاحب نے کیا، جن کا خاص مضمون تاریخ ہے۔ اس سوال کا جواب خود فاضل مقرر نے دیا کہ ۲۵ مارچ کے قتل عام کے کافی دنوں کے بعد وہاں تشریف لے گئے تھے اور ان کی یہ رپورٹ، جس کی طرف سوال میں اشارہ کیا گیا ہے، بہت بعد میں غالباً آخر جون میں شائع ہوئی ہے۔ اس سوال اور جواب کے بعد اس سوال کی اہمیت جاتی رہی، اس لیے پروفیسر صاحب نے مہمان عزیز سے سوال کیا کہ "آپ لوگوں کو یہ سمجھنے میں کہ بنگالی اور پنجابی ایک ساتھ نہیں رہ سکتے، اتنی دیر کیوں لگی؟" فاضل مقرر نے اس کا جواب فوراً نہیں دیا۔ ان کی خاموشی سے اندازہ ہوا کہ انھیں اس غلطی کا اعتراف ہے اور اس پر شرمسار بھی ہیں۔ کچھ ٹھہر کر جواب دیا۔ "نئی نسل تو فوراً سمجھ گئی تھی کہ دونوں حصوں میں، سوائے مذہب کے کوئی چیز مشترک نہیں ہے، اس لیے دونوں میں نباہ بہت مشکل ہے، اس لیے یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ صحیح صورت حال کو سمجھنے میں ہم نے دیر کی، البتہ یہ صحیح ہے کہ "برسٹ آوٹ" (BURST OUT) ہونے میں وقت لگا۔" پروفیسر صاحب نے دوسرا سوال کیا۔ "آزادی حاصل کرنے کے لئے آپ کی اسکیم کیا ہے؟"

"گوریلا جنگ۔" فاضل مقرر نے جواب دیا۔

"ہتھیار کہاں سے آئیں گے؟" پروفیسر صاحب نے یہ ضمنی سوال کیا۔

"ہمارے پاس کافی سامانِ جنگ ہے۔" فاضل مقرر نے جواب دیا۔ "جدید قسم کے اچھے سے اچھے ہتھیار ہیں اور یہ سب کے سب پاکستانی فوجیوں سے چھینے گئے ہیں، ان میں کچھ چینی ہیں اور کچھ امریکی۔ فی الحال چند ماہ تک ہمیں ہتھیار کی کمی نہیں ہوگی۔"

ہمارے ایک دوست نے مسکرینس کی رپورٹ کا، سوالات کے شروع ہی میں ذکر کیا تھا، جس کا جواب اس لئے ٹال دیا گیا تھا کہ وہ ۲۵ مارچ کے کئی دنوں کے بعد بنگلادیش گئے تھے اور اگرچہ انھوں نے فوجی مظالم کے خلاف بہت سخت لکھا تھا، مگر چونکہ ان کی شخصیت قابل اعتبار نہیں رہی تھی، اس لئے انھوں نے بنگالیوں کے مظالم کے بارے میں جو کچھ لکھا تھا وہ بھی مشتبہ ہو گیا تھا۔ مگر ہمارے دوست معزز مہمان سے اس کا جواب سننا چاہتے تھے اس لیے انھوں نے یہ سوال پھر اٹھایا۔ جناب مودود احمد صاحب نے اس کے جواب میں فرمایا کہ "اس نامہ نگار کو جو لاشیں دکھلائی گئی تھیں، انھوں نے کس بنا پر سمجھا کہ وہ بنگالیوں کی نہیں غیر بنگالیوں کی ہیں ؟" انھوں نے مزید وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ "بہار اور یوپی کے رہنے والوں اور بنگالیوں میں جسمانی لحاظ سے، خصوصًا سالہاسال سے بنگال میں رہنے کے بعد، کوئی بہت بڑا فرق نہیں ہے کہ کئی روز کی سڑی گلی لاشوں سے اندازہ کیا جا سکے کہ یہ بہاریوں کی ہیں اور یہ بنگالیوں کی ہیں۔ جیسے سرحدی پٹھانوں اور بنگالیوں کو آسانی سے پہچانا جا سکتا ہے۔" حاضرین میں سے دوسرے لوگ بھی مسکرینس کی رپورٹ کے اس حصے کو جس میں بنگالیوں کے مظالم کو بڑی شدت کے ساتھ بیان کیا گیا تھا، صحیح نہیں سمجھتے تھے، اس لیے اس سوال کو زیادہ اہمیت نہیں دی گئی۔

آخر میں ان ہی دوست نے پھر ایک سوال کیا۔ "آپ لوگ اپنے آپ کو سیکولر کہتے ہیں، مگر کیا وجہ ہے کہ بنگلادیش کی عارضی حکومت میں کوئی غیر مسلم نہیں ہے ؟" معزز مہمان نے ذرا جذباتی انداز میں اور کچھ ناپسندیدگی کے ساتھ فرمایا۔ "جو شخص ایسا سوال کرتا ہے وہ خود سیکولر نہیں ہے۔" اس کے بعد ذرا سنجیدگی کے ساتھ فرمایا کہ "جو لوگ کسی تحریک میں نمایاں ہوتے ہیں وہی حکومت میں لئے جاتے ہیں۔ دیکھنے کی چیز یہ نہیں ہے کہ کسی جماعت یا کسی حکومت میں مختلف فرقوں کے کتنے لوگ ہیں، بلکہ دیکھنے اور سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس جماعت یا حکومت کے خیالات اور عمل کیسے ہیں ؟ اگر اس کے خیالات اور عمل سیکولر ہیں تو وہ سیکولر

ہے، چاہے اس میں صرف ایک ہی فرقے کے لوگ ہوں اور اگر اس میں مختلف فرقوں کے لوگ شامل ہوں، مگر اس کے خیالات اور عمل سیکولر نہ ہوں تو وہ جماعت یا حکومت سیکولر نہیں کہلائے گی۔ ہم بنگلا دیش کے لوگ اپنے آپ کو سیکولر کہتے ہیں تو اپنے خیالات اور عمل کی بنیاد پر۔ اسی بنا پر ہمارے علاقے میں ـــــ فوجی مظالم سے پہلے ـــــ اقلیت کے لوگ جس قدر مطمئن اور خوش تھے، اس کی مثال برصغیر ہند و پاک میں کہیں نہیں ملے گی۔"

اس جواب کے بعد معزز مہمان کے شکریہ کے ساتھ یہ دلچسپ اور پر از معلومات صحبت ختم ہوئی۔

شیخ مجیب الرحمٰن کے بھائی جامعہ میں

۱۴؍ اگست کو شیخ مجیب الرحمان کے چھوٹے بھائی، جناب شیخ ابو نصر صاحب شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب سے ملنے کے لئے تشریف لائے تھے۔ شیخ الجامعہ صاحب نے تعلیمی اداروں کے سربراہ اور کچھ سینیر اساتذہ کو بھی اس ملاقات میں شریک کر لیا تھا۔ معزز مہمان نے مشرقی پاکستان کے جو حالات بیان فرمائے اور ان کے خاندان کے ساتھ مغربی پاکستان کی فوج نے جو سلوک کیا ہے، اس کو سن کر حاضرین میں سے کوئی نہ تھا جس کی آنکھیں پرنم اور جس کا دل مغموم نہ ہو۔

معیاری ادب شائع کردہ مکتبہ جامعہ

(سلسلے کے لیے ملاحظہ ہو شمارہ جولائی ۱۹۷۱ء)

(۲)

حیاتِ سعدی   از خواجہ الطاف حسین حالی

حجم ۲۵۶ صفحات، قیمت ۲/۲۵، لائبریری اڈیشن -/۴، تاریخ اشاعت: نومبر ۱۹۷۰ء

اس کتاب کی تصحیح جناب رشید حسن خاں صاحب نے کی ہے، موصوف نے فاضل مصنف کے بارے میں لکھا ہے:

"مولانا حالی کے متعلق اتنی بات سب کو معلوم ہے کہ سادگی ان کے مزاج کا جوہر تھی، اخلاقیات کے پرستار تھے، مبالغے کے دشمن تھے، عشق و عاشقی کے جھوٹے افسانوں سے نفرت کرتے تھے، وضعداری کو زندگی کا ضروری حصہ مانتے تھے اور تحریر کی سادگی پر ایمان تھا۔ ان کی نثر ان کے مزاج کا آئینہ ہے، سادگی سے آراستہ تکلف سے بری۔ حالی نے بھی اپنے زمانے میں فرسودہ غزلیہ شاعری کے خلاف جہاد کیا تھا اور غزلوں کی یکتائی سے منہ موڑ کر، نظم نگاری کو زیادہ ضروری سمجھا تھا، اگرچہ وہ خود ایک زمانے میں واقعی اچھے غزل گو تھے۔ انھوں نے نثر کو انشا پردازی کا آئینہ خانہ نہیں بننے دیا اور شاعری کو تجربوں سے محروم عاشق گری کا ہدف نہیں بنایا۔ "آبائی کھوٹی" جیسی پھبتیاں سنتے رہے، وہ ہمیشہ اس پر زور دیتے رہے کہ مشاہدے کے بغیر صداقت کی توانائی نصیب نہیں ہوتی ... مولانا حالی محقق نہیں تھے، وہ روایتوں کو اس طرح قبول کر لیا کرتے تھے یا اس طرح درج کر دیا کرتے تھے، جس سے غلط فہمی کے دروازے کھل سکتے ہیں۔"

پیشِ نظر کتاب کے بارے میں فاضل مرتب نے لکھا ہے:

"مولانا حالی کی تصنیفات میں جو وقعت مقدمۂ شعر و شاعری کی ہے اور جو حیثیت یادگارِ غالب کی ہے، وہ وقعت اور وہ حیثیت ان کی دو دوسری کتابوں کو حاصل نہیں ہو سکی۔ میری مراد ہے حیاتِ سعدی اور حیاتِ جاوید سے۔ اگرچہ ان دونوں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یادگارِ غالب میں حیاتِ سعدی کے مقابلے میں زیادہ جان ہے۔ وہاں جذباتی رشتہ بھی موجود ہے اور یہاں صرف ذہنی ربط ہے۔ ایک دوسری مشکل یہ بھی ہے کہ سعدی کے حالات بھی بہت زیادہ معلوم نہیں تھے۔ سعدی کی تصنیفات سے کچھ خاکہ تیار ہوا، کچھ تذکروں سے مسالہ ملا۔ جذباتی رنگ آمیزی اور خیالی گل کاری کے بغیر، ان سے قدِ آدم تصویر بننا مشکل تھی اور ان دونوں کے مولانا قائل نہیں تھے۔ تحقیق کے نقطۂ نظر سے بھی ایسی خیالی رنگ آمیزی منع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کہنے کو تو یہ کتاب شیخ سعدی کی سوانح عمری ہے، لیکن اس کا زیادہ حصہ ان کے کلام کے تبصرے پر مشتمل ہے اور واقعہ بھی یہ ہے کہ یہی تبصرے والا حصہ اس کتاب کی جان ہے۔ شروع کے ۷۵ صفحات[1] میں گویا سوانح کی کہانی لکھی گئی ہے اور باقی ۱۸۲ صفحوں میں[1] شیخ کی تصنیفات پر تبصرہ ہے یا اس سے متعلق باتیں ہیں۔"

اس اڈیشن کے بارے میں فاضل مرتب نے لکھا ہے:

"نسخۂ جامعہ کی بنیاد اس کتاب کے دوسرے اڈیشن پر رکھی گئی ہے، جسے مولانا حالی نے نظرِ ثانی کے بعد شائع کیا تھا۔۔۔ میرے سامنے اس کتاب کا چوتھا اڈیشن بھی ہے جو مولانا کی حیات ہی میں، محمڈن پریس، علی گڑھ سے، ۱۸۹۵ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ بھی اشاعتِ ثانی کے مطابق ہے۔۔۔ اغلاطِ طباعت کی تصحیح کے لیے

---

[1] صفحات کے شمار میں رشید حسن خاں صاحب سے سہو ہوا ہے۔ تفصیل یوں ہے:

۱۔ سوانح کا حصہ	۴۸ صفحات
۲۔ تصنیفات و شاعری پر تبصرہ	۱۹۳ "
۳۔ ٹائٹل و تعارف، دیباچہ وغیرہ	۱۵ "
کل حجم	۲۵۶ "

(اعظمی)

چوتھے اڈیشن اور نسخۂ لاہور[1] کو سامنے رکھا گیا ہے۔"

انتخاب اکبر الہ آبادی

مرتبہ: ڈاکٹر صدیق الرحمٰن قدوائی

حجم ۱۷۰ صفحات، قیمت ۲/- ، لائبریری اڈیشن ۲/۵۰ ، تاریخ اشاعت: دسمبر ۱۹۷۰ء

پیش نظر کتاب "معیاری ادب" کے سلسلے کی گیارھویں کڑی ہے۔ پچھلی کتابوں سے اس لحاظ سے مختلف ہے کہ ان میں مرتبین کو کچھ نہیں کرنا تھا اور اِسے فاضل مرتب نے اپنے ذوق کے مطابق شاعر کے نمایندہ اور بہترین کلام کا انتخاب کیا ہے، اس لیے اس میں مرتب کا کام اور ذمہ داری دونوں بڑھ گئے ہیں۔ اکبر کے کلام کے تین مجموعے ان کی زندگی میں شائع ہوئے تھے، ان کے انتقال کے بعد ۱۹۴۸ء میں الہ آباد سے "گاندھی نامہ" اور اسی سال مرحوم کے کلام کا ایک چوتھا مجموعہ کراچی سے شائع ہوا۔ انتخاب کے وقت یہ تمام کتابیں فاضل مرتب کے پیش نظر تھیں اور انھوں نے کوشش یہ کی ہے، جیسا کہ "تعارف" میں خود لکھا ہے کہ ایک طرف اکبر کی نمائندگی ہو تو دوسری طرف اس کے پڑھنے والوں کو وہ سب کچھ مل جائے جس کے وہ کلام اکبر میں متلاشی ہوں گے۔ موصوف لکھتے ہیں: "چنانچہ اس انتخاب میں کوشش یہی کی گئی ہے کہ اکبر کی پوری اور سچی تصویر پیش کر دی جائے۔" اکبر کی شاعری اور فن کے بارے میں فاضل مرتب نے "تعارف" میں لکھا ہے:

> "اکبر اس وقت تک اردو میں طنز و مزاح کے سب سے بڑے نمایندے ہیں۔ ان سے قبل اردو شاعری میں یہ عناصر عموماً غزلوں کے اشعار میں بکھرے ہوئے تھے، جن کا نشانہ زیادہ تر واعظ، محتسب، رقیب یا خود عاشق و معشوق ہوا کرتے تھے۔ ... اکبر کے یہاں ہمیں پہلی بار طنز و مزاح دونوں شاعر کی تنگ اور محدود دنیا سے بلند ہوتے نظر آتے ہیں۔ ان کے ہاں یہ محض ایک اندازِ بیان ہی نہیں، وہ اسے سماجی تبدیلیوں کو سمجھنے اور سمجھانے کا سب سے اچھا ذریعہ سمجھتے تھے۔ اسی لیے ان کی شاعری میں محض بھنسوڑپن اور مضحکہ (؟) نہیں بلکہ سنجیدگی، شائستگی اور تفکر

---

[1] مرتبہ شیخ اسمٰعیل پانی پتی

> کی فضا چھائی ہوئی ملتی ہے.... اکبر اپنے دور کی زندگی اور اس کے مسائل کو ایک کارٹونسٹ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان کی نگاہ ہمیشہ مغربی اثرات کے تحت پلنے والی جدید اقدار کے مضحک پہلوؤں پر پڑتی ہے۔ اپنے تخیل کی بدولت اور زبان کی مدد سے وہ ان پہلوؤں کو اور زیادہ مضحک بنا دیتے ہیں.... اکبر کو زبان پر بلا کی قدرت تھی۔ انھوں نے عام بول چال کی زبان اور انگریزی کے رائج الفاظ کا اس قدر برجستہ استعمال کیا اور ان کے ذریعے اس خوبی سے مزاح کا کام لیا کہ ان سے پہلے شاید کسی نے سوچا بھی نہ ہوگا.... اکبر نے ابتدا میں روایتی انداز کی غزلیں بھی بہت کہی ہیں جن کے بعض اشعار آج تک زبان زد ہیں اور لوگوں کو یہ گمان بھی نہیں ہوتا کہ یہ اشعار اکبر جیسے شاعر کے ہوں گے۔ یہ غزلیں اکبر کی جوانی کی یادگار ہیں۔ یہ فنی اور جمالیاتی نقطۂ نظر سے بھی اہم ہیں اور ان سے اکبر کی شخصیت و مزاج کو سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے۔"

اکبر ہندوستانی سماج کو جس طرف لے جانا چاہتے ہیں، اسے بہت سے لوگ رجعت پرستی اور احیاء پسندی سمجھتے ہیں۔ زیرِ تبصرہ کتاب کے فاضل مرتب ترقی پسند جماعت سے تعلق رکھتے ہیں، اس لیے ان سے توقع تھی کہ وہ اس پہلو پر ذرا تفصیل سے روشنی ڈالیں گے، مگر انھوں نے ایک جملے میں صرف اس طرف اشارہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں: "ان کے خیالات سے آج اتفاق نہیں کیا جاتا اور وقت کے ساتھ ساتھ شاید اتنا بھی اتفاق نہ رہے جتنا آج ہے۔"

فاضل مرتب نے حاشیے میں انگریزی الفاظ کو جو کثرت سے اکبر کے کلام میں استعمال ہوئے ہیں، انگریزی رسم خط میں لکھ دیے ہیں اور ان کے معنی بھی دیدئے ہیں، مگر پوری کتاب میں یکسانیت نہیں ہے، بعض الفاظ کو انگریزی رسم خط میں لکھنا بھول گئے ہیں، مثلاً "بیلون" غبارہ صفحہ ۹۶، "شومیکری" جوتا بنانے کا کام صفحہ ۱۱۰۔ اسی طرح بعض بہت ہی آسان اور معمولی لفظوں کے معنی لکھ دیے ہیں مثلاً Nation قوم، Small چھوٹا، Great بڑا، If اگر، But مگر وغیرہ اور بعض نسبتاً مشکل اور اہم لفظوں کو یونہی چھوڑ دیا ہے، مثلاً Empress، Shut، Manner، Variety۔ ان میں سے کسی کے معنی نہیں دئے گئے ہیں۔ اکبر کا ایک مصرع ہے: "خوگر ہوئے ہیں لیپ، اسٹک چپ کے"

اس میں انگریزی کے تین لفظ آئے ہیں، Leap ، Skip ، Jump ۔ اگر ”اِف“ اور ”بٹ“ کے معنی دیے جاسکتے ہیں تو اِن لفظوں نے کیا قصور کیا تھا۔

صفحہ ۹۴ کے حاشیے پر مِل کا پورا نام (جون اسٹورٹ مِل[1]) لکھنے کے بعد غالباً غلطی سے سنہ وفات دیدیا گیا ہے۔ (اگر سنہ ولادت بھی دیدیا جاتا تو اچھا تھا۔) اگر یہی عمل سرسید احمد خاں، سید عشرت حسین (اکبر کے صاحبزادے)، مسز اینی بسنت، انور پاشا، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، پنڈت مدن موہن مالوی، لالہ لاجپت رائے کے ساتھ بھی روا رکھو جاتی تو حاشیہ نگاری کا حق ادا ہو جاتا۔

اکبر کا ایک شعر ہے:

یہی مرضی خدا کی تھی ہم ان کے چارج میں آئے
سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ جارج میں آئے

”چارج“ (Charge) اور ”جارج“ (George) انگریزی رسم خط میں لکھ دیے گئے ہیں، مگر ضرورت تھی کہ جس طرح انور پاشا کے تعارف میں (صفحہ ۱۳۸) لکھا گیا ہے: ”مشہور و معروف ترک سپہ سالار“ اسی طرح یہ بھی لکھنا چاہیے تھا کہ جارج کون تھے اور ان کا زمانۂ حکومت کب سے کب تک تھا۔ ایک مصرعہ ہے:

”وظیفے کی جگہ یا پانیر یا آئی۔ ڈی۔ ٹی ہے“ (صفحہ ۱۱۶)

”آئی ڈی ٹی“ کے متعلق حاشیے میں لکھا گیا ہے کہ ”یہ بھی ایک اخبار کا نام ہے جو لکھنؤ سے نکلتا تھا۔“ حالانکہ یہ نام نہیں ہے، نام کا مخفف ہے، پورا نام ہے ”انڈین ڈیلی ٹیلیگراف“۔ نیز اگر حاشیے میں دوسری تفصیلات بھی لکھ دی جاتیں، جیسے اڈیٹر کون تھا، اخبار کی پالیسی

---

[1] مِل کے تعارف میں لکھا گیا ہے: ”انگریز فلسفی اور سیاست داں ...“ میرے خیال میں ”سیاستداں“ کے بجائے ماہر سیاسیات لکھا جاتا تو اچھا تھا۔

کیا تھی، کب جاری ہوا اور کب تک جاری رہا تو تعارف مکمل ہو جاتا اور فاضل مرتب بھی اپنے فرض سے بہ احسن سبکدوش ہو جاتے۔

حاشیے کی ان خامیوں سے قطع نظر جہاں تک انتخاب کا تعلق ہے، اسے اکبر کے کلام کا نمائندہ کہا جا سکتا ہے اور فاضل مرتب اکبر کی مکمل اور سچی تصویر پیش کرنے میں پوری طرح کامیاب ہیں۔

ایک گزارش جناب ناشر سے بھی ہے۔ وہ یہ کہ اس کتاب کا "حرف آغاز" ان کتابوں سے مختلف ہونا چاہیئے تھا جو معیاری ادب کی دوسری کتابوں میں شامل ہے۔ یہ انتخاب بالکل نیا ہے، اس لئے اسی مناسبت سے اس کا "حرف آغاز" بھی ہونا چاہیئے تھا۔ اس میں لکھا ہے کہ "پرانی کتابیں کم یاب ہوتی جا رہی ہیں ۔۔۔۔ قدیم معیاری کتابیں، صحت متن اور حسنِ طباعت کے ساتھ پیش کی جائیں گی۔" ظاہر ہے کہ اس انتخاب کو پرانی اور قدیم معیاری کتابوں میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔

انتخابِ میر مرتبہ: ڈاکٹر محمد حسن

حجم ۲۸۷ صفحات، قیمت ۳/۶۰۔ لائبریری اڈیشن ۴/۵۰۔ تاریخ اشاعت، دسمبر ۱۹۷۰ء

"انتخابِ اکبر الہ آبادی" کی طرح "انتخابِ میر" بھی نیا انتخاب ہے، جسے اردو کے مشہور ادیب ڈاکٹر محمد حسن صاحب نے مرتب کیا ہے۔ کلامِ اکبر کے نئے انتخاب کی وجہ تو سمجھ میں آتی ہے کہ اس کا پہلے سے کوئی معیاری اور نمائندہ انتخاب موجود نہیں تھا، مگر کلامِ میر کے جب کئی انتخابات پہلے سے موجود ہیں اور ان میں بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب مرحوم کا انتخاب ہر لحاظ سے معیاری اور نمائندہ ہے تو سمجھ میں نہیں آیا کہ کسی نئے انتخاب کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ فاضل مرتب نے بھی "تعارف" میں اس پر کوئی روشنی نہیں ڈالی ہے، حالانکہ اس کی ضرورت تھی۔ ناشر کی طرف سے اس میں حسب معمول وہی "حرف آغاز" شامل ہے، جس

میں بیان کیا گیا ہے کہ "پرانی کتابیں کم یاب ہوتی جا رہی ہیں جو کتابیں ملتی ہیں ان میں سے بیشتر اعتبار نہیں، عام طور سے ان کی قیمتیں بھی زیادہ ہیں ۔۔۔ ان امور کے پیش نظر مکتبہ جامعہ ۔۔۔ ایک نیا سلسلہ شروع کیا ہے، جس کے تحت قدیم معیاری کتابیں، صحت متن اور حسن طباعت کے ساتھ پیش کی جائیں گی۔"

میر کی طرف جو اشعار منسوب ہیں، ان کی تعداد ہزاروں ہے، ان میں رطب و یابس ہر طرح کے اشعار ہیں، ان میں الحاقی اشعار کی بھی کمی نہیں۔ اس لیے ایسے انتخاب کی ضرورت تھی جس سے میر کے مزاج اور رجحانات اور ان کی شاعری کے صحیح رنگ و انداز کو سمجھنے اور ان بلند مرتبے کو پہچاننے میں مدد ملے۔ بقول پروفیسر آل احمد سرور "جس طرح غالب نے اپنے کلا کا انتخاب کیا تھا، اسی طرح میر کے بھی کلام کا انتخاب ہوتا تو اس کی عظمت کا نقش اور گہرا ہوتا"[۱] مگر زیر تبصرہ انتخاب کے فاضل مرتب نے لکھا ہے کہ "یہ انتخاب مرتب اور شاعر کے درمیان ایک مفاہمہ ہے، جہاں انتخاب کرنے والے نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ جو اشعار اسے پسند آئیں انھیں ضرور چن لے وہاں اس کا بھی لحاظ رکھا ہے کہ میر کی شاعری کی تمام خصوصیات کی نمائندگی ضرور ہو جائے گی" اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف نے انتخاب کرتے وقت تحقیق و تنقید کے ذریعہ اس کی کوشش نہیں کی ہے کہ میر کا صرف مصدقہ کلام ہی انتخاب میں شامل ہو۔ "تعارف" کے آخر میں انھوں نے اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"ہنوز کلیات میر کا کوئی مصدقہ نسخہ جو مستند مخطوطات سے مرتب کیا گیا ہو، شائع نہیں ہوا ہے۔ یہ انتخاب بھی اس کمی کو پورا نہیں کرتا۔ البتہ میر کے کلام کے اس حصے کو مزید پیش کرتا ہے جس سے میر کے رنگ و آہنگ کے تقریباً سبھی اہم گوشے سامنے آجاتے ہیں۔"

غزلوں کی ترتیب کی صرف دو ہی شکلیں ممکن ہیں، ایک قدیم طریقہ ردیف ــــ کے

۱؎ دلی کالج میگزین (اردو) میر نمبر صفحہ ۱۲۶

لحاظ سے، دوسرا تاریخ کی بنیاد پر۔ کلام میر کے متعلق پروفیسر آل احمد سرور کی رائے ہے کہ ان کے دہلوی اور لکھنوی کلام کو الگ کرنا ضروری ہے۔ لکھتے ہیں :

"میر کا کلام ان کی زندگی میں مشہور ہو گیا تھا۔ بظاہر ان کے جو دیوان ملتے ہیں ان میں ایک تاریخی ترتیب ہے، لیکن ان کے دہلی اور لکھنؤ کے کلام کو علیحدہ کرنا ضروری ہے تاکہ اس کے ارتقاء پر رائے زنی ہو سکے۔"[1]

لیکن "انتخاب میر" میں کوئی ترتیب نظر نہیں آتی۔ نہ ردیف وار ہے، نہ تاریخ وار اور نہ دہلی اور لکھنؤ کے کلام کی بنیاد پر پھر کیا صورت ہے، اس پر فاضل مرتب ہی روشنی ڈال سکیں گے۔ غالباً کسی خاص ترتیب ہی کے نہ ہونے کی وجہ سے بعض غزلیں مکرر چھپ گئی ہیں۔ مثلاً صفحہ ۲۲ پر ایک غزل ہے، جس کا پہلا شعر ہے :

عشق میں اے طبیب یاں ٹک سوچ　　پائے جاں درمیاں ہے یہاں ٹک سوچ

یہ غزل صفحہ ۱۰۹ پر بھی ہے، فرق اس قدر ہے کہ یہاں مقطع حذف کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح صفحہ ۲۳ کی غزل

غافل ہیں ایسے سوتے ہیں گویا جہاں کے لوگ　　حالاں کہ رفتنی ہیں سب اس کارواں کے لوگ

صفحہ ۱۱۸ پر بھی ہے۔ نیز اسی صفحہ (۲۳) کی غزل

یارو مجھے معاف رکھو۔ میں نشے میں ہوں　　اب دو تو جام خالی ہی دو میں نشے میں ہوں

صفحہ ۱۲۶ پر بھی شائع ہوئی ہے۔ البتہ "پاؤں" کا املا دونوں جگہ مختلف ہے۔ اگر قند مکرر کے طور پر ان غزلوں کو شائع نہیں کیا گیا ہے تو یہ عیب نہ ہوتا اگر کسی اصول کے تحت اس انتخاب کو مرتب کیا گیا ہوتا۔

اوپر "پاؤں" کے املا کے فرق کا ذکر آیا ہے۔ "انتخاب میر" کے صفحہ ۲۴ پر "پانوں" لکھا گیا ہے اور صفحہ ۱۲۶ پر "پاؤں" ہے اور "دیوانِ درد" میں اس کا تیسرا املا ہے

---

[1] دلی کالج میگزین (اردو) ـــــ میر نمبر صفحہ ۱۲۰

یعنی "پانو" بغیر نون کے۔ ملاحظہ ہو صفحہ ۱۰۴ :

بے طرح کچھ ان آنسوؤں نے پانو نکالے

صفحہ ۱۰۶ پر ہے :

ہاتھ اب لگتے نہیں جو پانو دبوایا کیے

معیاری ادب کے ناشر صاحب نے دعویٰ فرمایا ہے کہ "صحتِ متن کے ساتھ صحتِ املا کا بھی بہ طورِ خاص لحاظ رکھا جائے گا" اب پتہ نہیں ان تین میں سے کون سا املا مجلسِ ادارت کے نزدیک صحیح ہے۔

ڈاکٹر محمد حسن صاحب کو اردو ادب میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ اس لیے امید ہے کہ اس انتخاب کو پسند کیا جائے گا۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، آج کل بازار میں میر کا کوئی انتخاب نہیں ملتا، اس لیے مکتبہ جامعہ نے یہ انتخاب شائع کرکے اردو ادب کی ایک مفید خدمت انجام دی ہے۔ (باقی آیندہ)

عبداللطیف اعظمی



gd. No. D - 768 September, 1971

The Monthly JAMIA

JAMIA NAGAR, NEW DELHI-25

جامعہ

جامعہ ملّیہ اسلامیہ دہلی

جامعہ

سالانہ چندہ
چھ روپے

قیمت فی پرچہ
پچاس پیسے

جلد ۶۸	بابت ماہ اکتوبر ۱۹۷۱ء	شمارہ ۴

فہرست مضامین

مجلس ادارت

مدیر

ضیاء الحسن فاروقی

خط وکتابت کا پتہ

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

طابع وناشر: عبداللطیف اعظمی   مطبوعہ: یونین پریس دہلی   ٹائیٹل: دیال

شذرا

آج کل ملک میں جمہوریت، سیکولرزم اور سوشلزم کا بہت چرچا ہے اور حکومت ہند وزیراعظم اندرا گاندھی کی قیادت میں اس کے لئے کوشاں ہے کہ یہاں جمہوری و معاشی انصاف قائم کرکے ایسے بے شمار انسانوں کی ترقی و خوشحالی کا انتظام کرے جو پرانے نظام کے تحت تنگی، پستی اور محرومی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ جو قوتیں موجودہ صورت حال میں کسی بھی اصلاح و تبدیلی کی مخالف ہیں، وہ اقلیتوں میں، خاص طور سے مسلمانوں میں یہ پروپیگنڈا کررہی ہیں کہ دستور میں چوبیسویں اور پچیسویں ترمیم کے بل کے منظور ہو جانے سے ان کے مذہبی و تہذیبی حقوق خطرہ میں پڑجائیں گے، اس لئے انھیں اس طرح کے تمام اقدامات کی سخت مخالفت کرنی چاہیئے۔ جہاں تک اقلیتوں کے مذہبی و تہذیبی حقوق کا تعلق ہے، وزیراعظم اندرا گاندھی اور دوسرے ذمہ دار لوگوں نے لوک سبھا اور راجیہ سبھا میں اس کی ضمانت دی ہے کہ دستور میں متعلقہ ترمیمات سے ان کے مذہبی و تہذیبی حقوق پر کوئی آنچ نہیں آئے گی، اور یہ کہ دونوں ترمیموں کا مقصد ملک میں معاشی انصاف کے قیام کے لئے راہ کی اُن رکاوٹوں کو دور کرنا ہے جو کسی طرح غریبوں اور محروموں کی ترقی سے متعلق منصوبوں کو آگے نہیں بڑھنے دیتیں۔

مسلمانوں میں بعض بااثر حلقے ایسے ہیں جو سوشلزم کے نام سے گھبراتے ہیں، اور ذہنی الجھنوں کا شکار ہوکر عوام کے ذہنوں میں اپنی ژولیدہ بیانیوں سے شک و شبہ پیدا کرتے ہیں، (یہاں مسلمانوں کے اُن زعمائے ملت کا ذکر نہیں جو کھلم کھلا سرمایہ داری نظام کے حامی ہیں۔)

ہمارا خیال ہے کہ دستورِ ہند کے جمہوری اور سیکولر ڈھانچے میں سوشلزم سے مقصود جس ما
معاشی انصاف قائم کرنا ہے، وہ معاشی انصاف سے متعلق اسلام کے اصولوں سے ز
انقلابی و اصلاحی نہیں ہے۔ اس لئے مسلمانوں کا نہ صرف شہری بلکہ مذہبی فریضہ ہے ک
حکومت ہند کے اُن تمام آئینی و قانونی اقدامات کی حمایت کریں جن کا مقصد ملک میں
انصاف کا قیام ہے۔ آئیے دیکھیں کہ اس سلسلہ میں اسلامی اصول کیا کہتے ہیں۔

سب سے پہلے تو یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اسلام کے اخلاقی و مذہبی نظام سے اس کا معا
اس طرح مربوط ہے کہ کہیں کسی طرح کا جھول نہیں ہے۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنی مشہور عا
حجۃ اللہ البالغہ میں فرمایا ہے: "یہ واضح رہے کہ انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا منشاء اگرچہ
عبادات الٰہی سے متعلق ہے لیکن عبادات کے ساتھ ساتھ اس منشاء میں رسوم فاسد کو فنا
اجتماعی زندگی میں بہترین نظام کا قیام بھی شامل ہے" ظاہر ہے کہ بہتر اجتماعی زندگی کا کو
مرتب نہیں ہو سکتا جب تک ان تمام اسباب کو ختم نہ کر دیا جائے جن سے عوام پر معاشی دستبرد
امکانات قوی ہوتے ہیں۔ اس اجتماعی نظام میں جو چیز ریڑھ کی ہڈی کا حکم رکھتی ہے، وہ
معیشت کی مساوات، کیونکہ اگر یہ نہیں تو انسانی مساوات اور سماجی انصاف کے تص
ایسے خواب ثابت ہوں گے جن کی کوئی عملی تعبیر نہیں ہوتی۔

قرآن کریم میں ایسی بہت سی آیتیں ہیں جو حق معیشت کی مساوات پر زور دیتی
ایسی نصوص قرآنی، احادیث و اخبار اور ان سے مستنبط فقہی احکام بالکل واضح اور عا
اور ان سے صاف پتہ چلتا ہے کہ حق معیشت کی مساوات کے اصول ہی پر ایک متو
اور مبنی بر عدل نظام معاشی قائم کیا جا سکتا ہے۔ شاہ ولی اللہؒ نے کہ محرم اسر
تھے، اپنی تصنیفات مثلاً حجۃ اللہ البالغہ، ازالۃ الخفاء، البدور البازغہ

الخیر الکثیر[۱] وغیرہ میں محنت و سرمایہ سے متعلق جو خیالات بیان فرمائے ہیں اور فرد کے حق ملکیت اور اسٹیٹ کے حقوق و فرائض کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، اس پر اگر غور کیا جائے تو اندازہ ہو جائے گا کہ اسلام کے معاشی اصولوں کی بنیاد پر کس طرح کا نظام معیشت بن سکتا ہے۔ ان اصولوں کو مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی ؒ نے اپنی قابل قدر کتاب 'اسلام کا اقتصادی نظام' (طبع ثانی، ۱۹۴۲ء، صفحات ۳۱ و ۳۲) میں اس طرح بیان کیا ہے:

"۱۔ وہ 'نظام' ہر متعلقہ فرد کی معاشی زندگی کا کفیل ہو اور اپنے دائرہ عمل میں کسی بھی فرد کو معاشی زندگی سے محروم نہ رکھتا ہو۔

۲۔ ایسے اسباب و وسائل کا قلع قمع کرتا ہو جو معاشی دستبرد کا موقع مہیا کرکے افراد انسانی کے درمیان ظلم و استبداد کی راہیں کھولتے اور معاشی نظام کے فساد کا موجب بنتے ہوں۔

۳۔ دولت اور اسباب دولت کو کسی خاص فرد اور محدود جماعت کے اندر سمٹ آنے اور اس فرد یا جماعت کو نظام معیشت پر قابض و مسلط ہونے سے باز رکھتا ہو تاکہ معاشی نظام تمام کائنات انسانی کی فلاح کی بجائے مخصوص طبقوں کے اغراض کا آلۂ کار بن کر نہ رہ جائے۔

۴۔ محنت اور سرمایے کے درمیان صحیح توازن قائم کرتا اور ایک کو دوسرے کی حدود پر غاصبانہ دستبرد سے بچاتا ہو۔"

پس، حق معیشت کے مساوات سے متعلق نصوص قرآنی اور احادیث نبوی پر ہم جس قدر بھی غور کریں اور ان کی روشنی میں مستند علماء حق کی متعلقہ تحریروں کا جتنا بھی مطالعہ کریں، یہی تین بنیادی باتیں ابھر کر سامنے آتی ہیں کہ

(۱) پیداوار کے وسائل میں زمینیں، جنگلات، دریا، معدنیات کی کانیں

۱۔ ملاحظہ ہو مولانا محمد میاں کی کتاب 'علماء ہند کا شاندار ماضی'، جلد ۲، ۱۹۵۷ء، صفحات ۸ تا ۱۱

متعلقہ فیکٹریاں اور کارخانے وغیرہ ہیں، ان کی ملکیت کو مفاد عامہ کے پیش نظر محدود
کیا جا سکتا ہے اور اس میں اسلامی نقطۂ نظر سے کوئی قباحت نہیں بشرطیکہ انفرادی
ملکیت کے حق کی بالکل نفی نہ کی جائے۔

(۲) اکتناز و احتکار کی ساری صورتیں غیر شرعی اور غیر منصفانہ ہیں۔ یہ برائیاں
اگر قانون کے ذریعہ ختم کی جا رہی ہوں تو مسلمانوں کو دوسروں کے مقابلہ میں اس کی پُر
تائید کرنی چاہئے کہ یہ ان کا مذہبی فریضہ بھی ہے۔

(۳) معیشت کے تفاوت میں مدارج کو تسلیم کرتے ہوئے حق معیشت میں
مساوات کو ضروری و فطری قرار دینے اور اس سلسلہ میں قوانین نافذ کرنے کی صورت
درپیش ہو تو مسلمانوں کو ایسے تمام اقدامات کا نہ صرف استقبال کرنا چاہئے بلکہ ایسے
قوانین کے نفاذ میں موثر اور نتیجہ خیز تعاون کرنا چاہئے، کیونکہ اسی طرح سرمایہ و
محنت میں صحیح توازن قائم ہو سکتا ہے اور سرمایہ داری نظام کو قوت پہونچانے
والے وسائل کی راہیں مسدود کی جا سکتی ہیں۔

ڈاکٹر سلامت اللہ

لسانی اقلیتوں کی تعلیم اور استادوں کی ٹریننگ

(اصل مضمون انگریزی میں لکھا گیا تھا اور یہ استادوں کی تعلیم سے متعلق پہلی ایشیائی کانفرنس میں پیش کیا گیا تھا جو جون سنہ ۱۹۷۱ء میں بنگلور میں منعقد ہوئی تھی۔)

تعلیم کا مقصد ہے فرد کی مکمل نشوونما کرنا، اس کے شعور اور احساس کو نکھارنا اور اُس میں دردمندی کی صفت پیدا کرنا۔ غرض، تعلیم فرد کو صحیح معنوں میں انسان بنانے کا ایک ذریعہ ہے۔ عرصے سے تعلیم کا یہی منصب سمجھا جاتا رہا ہے۔ لیکن حال میں تعلیم کی غرض و غایت میں ایک نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ اب تعلیم کے احاطہ کے اندر فرد کے علاوہ جماعت بھی آگئی ہے۔ چنانچہ اب تعلیم قومی ترقی کے لئے ایک آلۂ کار کی حیثیت رکھتی ہے۔ قومی ترقی ایک ایسا نصب العین ہے جس میں انسانی اور مادی دونوں قسم کے وسائل کو فروغ دینا شامل ہے، اور یہ بات ٹھیک ہی ہے کیونکہ موجودہ زمانے میں پیداوار کی کسی بھی صنف کو ترقی دینے کے لئے مخصوص علم و ہنر اور استعداد کی ضرورت ہوتی ہے اور اس علم و ہنر اور استعداد کو حاصل کئے بغیر کسی ملک کے مادی وسائل میں توسیع نہیں ہو سکتی۔ مزید، یہ بات مسلّم ہے کہ علم و ہنر اور استعداد کو بھی قومی مفاد میں استعمال نہیں کیا جا سکتا، جب تک کہ لوگوں میں قومی فلاح و بہبود

کی طرف صحیح رجحان نہ ہو یا ان میں سماجی احساس موجود نہ ہو۔ لہٰذا تعلیم کا کام یہ ہے کہ ایک طرف تو لوگوں کو پیداوار بڑھانے کے لئے ضروری علم وہنر اور استعداد بہم پہنچائے اور دوسری طرف ان میں ایسا رجحان اور سماجی احساس پیدا کرے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو قومی ترقی کے لئے بروئے کار لانے پر مائل ہوں۔

اگر کسی سماج میں قومی ترقی کا شعور نہ ہو تو ہو سکتا ہے کہ وہاں تعلیمی مواقع صرف چند منتخب افراد کے لئے ہی فراہم کئے جائیں۔ ایسے سماج میں ایک چھوٹا سا طبقہ جو پہلے ہی سے ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے تمام تعلیمی سہولتوں کا اجارہ دار بن جاتا ہے اور تعلیم کی بدولت، یہ طبقہ اپنے اقتصادی، سماجی اور سیاسی مرتبے کو صرف قائم ہی نہیں رکھتا بلکہ اس کو اور پائیدار بناتا ہے۔ ایسے معاشرے میں اکثریت یعنی عوام الناس کے لئے باضابطہ تعلیم کی سہولتیں فراہم کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی۔ انجام کار یہ لوگ خودرو پودوں کی طرح زندگی گزارتے رہتے ہیں اور بحیثیت مجموعی مادی اور تہذیبی دونوں حیثیتوں سے مفلس اور پس ماندہ رہ جاتے ہیں۔ مگر یہ صورت حال نہ صرف اس نچلے طبقہ کے لئے تکلیف دہ ہے بلکہ اس سے پورے سماج کو بھی نقصان پہنچتا ہے وہ ترقی کی دوڑ میں پیچھے گھسٹتا رہتا ہے۔ اس کے برعکس اب ایک ایسے سماج کو لیجئے جس نے قومی ترقی کو اپنا نصب العین قرار دیا ہے۔ یہ سماج صرف چھوٹے سے طبقے کے عروج پر مطمئن نہیں ہو سکتا۔ اس کے نزدیک یہ امر ناگزیر ہے کہ سب کے لئے برابر کے تعلیمی مواقع فراہم کئے جائیں کہ صرف اسی صورت میں ہر فرد اپنی فطری صلاحیتوں کو امکانی حد تک ترقی دے سکتا ہے اور زیادہ سے زیادہ معاشرے کی تعمیر میں حصہ لے سکتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی ذاتی زندگی کو بھی مادی اور تہذیبی دونوں لحاظ سے مالا مال کر سکتا ہے۔

کسی ملک کے تمام شہریوں کو تعلیم کے مساوی مواقع فراہم کرنے کا مسئلہ بہت پیچیدہ

ہے۔ بعض ترقی یافتہ ممالک بھی اس مسئلہ سے دوچار ہیں۔ ہندوستان جیسے ترقی پذیر ملک میں تعلیم کے مساوی مواقع فراہم کرنا اشد ضروری ہے۔ حکومت ہند نے ۱۹۶۴ء میں جو تعلیمی کمیشن مقرر کیا تھا اس نے اس مسئلے کی اہمیت کو محسوس کیا اور اس کی نوعیت اور وسعت کو متعین کرنے کی کوشش کی۔ کمیشن نے خاص طور پر توجہ دلائی کہ تعلیمی سہولتوں کی فراہمی میں عدم مساوات کئی طرح پیدا ہوتی ہے کمیشن کی رائے میں دیہات اور شہر میں اس معاملہ میں بین فرق ہے۔ شہر کے باشندوں کو گاؤں والوں کے مقابلہ میں بہتر تعلیمی مواقع حاصل ہیں۔ ہمارے ملک میں لوگوں کے اقتصادی اور سماجی مدارج میں ایک بڑی خلیج حائل ہے۔ اس وجہ سے بھی سب کے لئے تعلیمی مواقع برابر نہیں ہیں۔ پھر آبادی کے بعض حصے تاریخی وجوہ کی بنا پر تعلیم کے میدان میں پچھڑے ہوئے ہیں مثلاً اچھوت اور نیچی ذاتیں، قبائلی لوگ اور عورتیں۔ کمیشن نے عدم مساوات کی مندرجہ بالا تمام صورتوں کی طرف بجا طور پر توجہ دلائی ہے۔ مگر یہ تعجب کی بات ہے کہ اس مسئلہ کا ایک اہم پہلو کمیشن کی نظر سے اوجھل رہا۔ وہ ہے لسانی اقلیتوں کا معاملہ کہ جنھیں تعلیم کی وہی سہولتیں میسر نہیں جو دوسرے لوگوں کو حاصل ہیں۔

جمہوریہ ہند کے دستور اساسی کی رو سے ہر ریاست اپنی حدود کے اندر تعلیم فراہم کرنے کی ذمہ دار ہے۔ اس سلسلہ میں قانون بنانے اور نافذ کرنے کا اختیار کلی ہر ایک ریاست کو حاصل ہے۔ چنانچہ ریاستی حکومتیں تعلیم سے متعلق اپنی اپنی پالسی مرتب کرتی ہیں۔ تقریباً تمام ریاستوں نے ثانوی منزل تک اپنی علاقائی زبانوں کو ذریعہ تعلیم قرار دیا ہے۔ اس پالسی پر عمل کرنے کے لئے چند ضروری اقدامات بھی کئے گئے ہیں۔ مثلاً طلبہ کے لئے علاقائی زبانوں میں درسی کتابوں اور دیگر تعلیمی ادب کی فراہمی کا انتظام کیا گیا ہے۔ نیز اساتذہ کی ٹریننگ میں بھی کچھ توجہ دی گئی ہے کہ وہ علاقائی زبان میں تعلیم دینے کے قابل ہو سکیں۔ چنانچہ ابتدائی مدرسوں کے لئے اساتذہ کی

تیاری کا کام اب ہر ریاست میں علاقائی زبان کے ذریعہ انجام پاتا ہے۔ لیکن ثانوی
کے اساتذہ کی ٹریننگ پر یہ بات پورے طور پر صادق نہیں آتی۔ بعض ریاستوں میں
ثانوی منزل پر بھی اساتذہ کی تعلیم علاقائی زبان میں ہونے لگی ہے۔ خاص طور پر یہ ر
وہ ہیں جہاں اعلیٰ تعلیم کی منزل تک علاقائی زبانوں کو ذریعہ تعلیم تسلیم کر لیا گیا ہے۔ ا
یہ اقدام صحیح ہے، اس لیے کہ ہندوستان میں ریاستوں کی تنظیم تو کم و بیش لسانی بنیاد پر
ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علاقائی زبان ہر ریاست میں رہنے والے لوگوں میں سے اکثریت
مادری زبان ہے۔ تاہم ہو سکتا ہے کہ ایک ریاست میں کوئی ایسی قابل لحاظ اقلیت
موجود ہو جس کی مادری زبان، اُس ریاست کی اکثریت کی زبان سے مختلف ہے۔ جہاں
عوام کی اکثریت کی تعلیم کا تعلق ہے، علاقائی زبان کو ذریعہ تعلیم بنانا بہت مناسب ہے
اس پالیسی کے تحت لسانی اقلیتوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح سب کے لئے
تعلیمی مواقع فراہم کرنے کے اصول کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔

لسانی اقلیتوں کو ان کی مادری زبان میں تعلیم دینے کا مسئلہ ابھی تک ہمارے
میں محتاج توجہ ہے۔ یہ بے توجہی نہ صرف اقلیتوں کے حق میں مضر ہے بلکہ ملک کو بھی اس
بھاری قیمت ادا کرنی پڑ رہی ہے۔ اس کا نتیجہ صرف یہی نہیں ہوا ہے کہ اقلیتی طبقے کے بہ
سے لوگ تعلیم سے محروم رہ گئے ہیں بلکہ ریاستی پالسی کے خلاف ان کے اندر ذہنی ا
جذباتی فصیل قائم ہو گئی ہے۔ اس طرح اکثریتی فرقے اور ریاست کے خلاف اقلیتو
شکوک و شبہات پیدا ہونے لگے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اقلیتی فرقے کے لوگ قومی دھ
سے کٹ کر رہ گئے ہیں۔ قومی ترقی کی راہ میں یہ ایک زبردست رکاوٹ ہے۔ علاوہ
اس کی وجہ سے اقلیتیں ایک قسم کی کش مکش میں مبتلا ہیں اور اس کے اثرات بہت مضر
ہو رہے ہیں۔ اور نتیجہ یہ ہے کہ زندگی ان کے لئے اور بھی سوہان روح ہوتی جا رہی
اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ریاستیں اس مسئلے کو حل کرنے میں کیوں ناکا

رہی ہیں۔ ریاستیں عموماً اقلیتوں کو وہ بنیادی حق دینے سے گریز کرتی ہیں جس کے تحت وہ اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرسکیں۔ ریاستوں کی جانب سے اکثر یہ بات کہی جاتی ہے کہ ان حالات کی بنیادی وجہ ریاست کی مالی اور انتظامی دشواریاں ہیں اور فی الوقت ان دشواریوں پر قابو نہیں پایا جاسکتا۔

آئیے اب ایک ٹھوس مثال لے کر دیکھیں کہ ان دشواریوں سے کیا مراد ہے۔ اترپردیش میں ایک بڑی اقلیت کا دعویٰ ہے کہ اردو ان کی مادری زبان ہے۔ آزادی سے پہلے پورے ملک کی تعلیم، تجارت اور نظم ونسق میں اگر زیادہ نہیں تو کم سے کم اردو کو وہی درجہ حاصل تھا جو دوسری ملکی زبانوں کو نصیب تھا لیکن آزادی کے بعد اردو کی حیثیت روز بروز کم ہوتی گئی، اردو داں طبقے کے مستقل مطالبے کے باوجود صرف چند مدرسے ایسے ہیں جن میں اردو ذریعہ تعلیم ہے۔ جب کہ اترپردیش میں حکومت کی یہ اعلانیہ پالیسی ہے کہ جن بچوں کی مادری زبان اردو ہے انھیں اردو کے ذریعے ابتدائی تعلیم دی جانی چاہیئے۔ لیکن عملی طور پر یہ اصول شاذونادر ہی برتا جاتا ہے۔ اس کی خلاف ورزی کرنے کے سلسلے میں مختلف قسم کی دلیلیں پیش کی جاتی ہیں، مثال کے طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ جن بچوں کی مادری زبان اردو ہے ان کی تعداد اتنی کم ہے کہ مالی اعتبار سے ان کے لئے علٰحدہ مدرسے کھولنے کا کوئی جواز نہیں۔ اردو مدارس کھولنے کا ذکر ہی کیا بعض صورتوں میں تو کسی مدرسے میں اردو کی ایک جماعت یا ایک سیکشن کھولنے تک سے اسی بنا پر گریز کیا جاتا ہے۔ کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ اردو کے ذریعے تعلیم دینے والے اساتذہ کی کمی ہے اور اردو میں لکھی ہوئی درسی کتابیں بھی موجود نہیں۔ دراصل یہ تمام حیلے ہیں۔ یہ ایک دائرۂ فاسد ہے۔ جب ملک میں اردو کے ذریعے استادوں کی تربیت کا کوئی انتظام ہی نہیں تو اس بات کی توقع کیسے کی جاسکتی ہے کہ اردو مدارس کے لئے باصلاحیت استاد دستیاب ہوسکیں اور اردو کے ذریعے تعلیم دینے کے لئے درسی کتابیں تیار کی جاسکیں۔

قومی یک جہتی اور قومی ترقی کے پیش نظر لسانی، تہذیبی اور مذہبی اقلیتوں کا مسئلہ
غور وفکر کا مستحق ہے۔ قومی اقلیتوں کی تعلیم کے مسئلے کو اس پس منظر میں دیکھنے کی ضرورت
کہ ہندوستان کے تمام باشندوں کے تہذیبی ورثے کو فروغ دینا ہے۔ یہ مسئلہ یقیناً پیچیدہ
لیکن اگر نیک نیتی اور پختہ ارادہ ہو تو کوئی بھی مسئلہ ناقابل حل نہیں۔ ضرورت اس بات
کہ اقلیتوں کی تعلیم کے مسئلے کو ہر جانب سے حل کرنے کی کوشش کی جائے۔ اردو داں اق
کی تعلیم کے مسائل کو حل کرنے کے سلسلے میں چند تجاویز حسب ذیل ہیں:

جہاں کہیں بھی ایسے بچے مناسب تعداد میں موجود ہوں جن کی مادری زبان ارد
ہے، وہاں اردو کے مدرسے، جماعتیں یا سیکشن کھولے جائیں۔ اردو زبان میں طلبہ
لئے تمام مضامین کی درسی کتابیں تیار کرائی جائیں اور استادوں کی رہنمائی کے لئے بھی ا
میں کتابیں لکھوائی جائیں۔ جس علاقے میں اردو مدارس کافی تعداد میں پہلے سے موج
ہوں، وہاں ایسے ٹریننگ اسکول یا کالج قائم کرنے چاہئیں جن میں اردو کے ذریعہ
دی جائے، اور ان مدرسوں کو استادوں کی ٹریننگ کے لئے بطور مشقی مدارس استعما
جائے۔ اساتذہ کی تیاری کے پروگرام کو موثر طور پر چلانے کے لئے ضروری ہے کہ زیر تربیہ
اساتذہ اور ان کے معلمین کے لئے اردو میں موزوں کتابیں تیار کرائی جائیں۔ یہ ایک ا
شگون ہے کہ ابھی حال میں حکومت ہند نے ملک کی تمام زبانوں میں کتابیں تیار کرنے کی ا
اسکیم مرتب کی ہے۔ اس اسکیم کے تحت اعلیٰ تعلیم کے لئے کتابیں تیار کرائی جا رہی ہیں
ایسی کتابیں بھی اس اسکیم میں شامل ہیں جو ٹریننگ اسکولوں اور کالجوں میں ان اساتذہ
تیاری میں استعمال کی جاسکیں گی جنھیں اردو زبان کے ذریعہ مدارس میں تعلیم دینی ہوگ
ضرورت اس بات کی ہے کہ ریاستی حکومتیں بھی اسی طرح اپنی علاقائی زبانوں اور اقلیا
زبانوں میں درسی کتابوں اور تعلیمی ادب کی تیاری کا کام سنجیدگی سے انجام دیں۔ ریاستی
کو چاہئے کہ خاص طور سے ایسی کتابوں کی تیاری پر توجہ مرکوز کریں جو ابتدائی مدارس

اساتذہ کی ٹریننگ میں مفید ثابت ہوسکیں۔ اس لحاظ سے دیکھئے تو اردو کے ابتدائی مدارس کے اساتذہ کے لئے کتابوں کی تیاری اور اشاعت کی ذمہ داری بڑی حد تک شمالی ہندوستان کی ریاستوں پر عائد ہوتی ہے۔ خاص طور سے اترپردیش اور بہار کی ریاستوں پر۔

روش صدیقی مرحوم

رباعیاں

سب نقشِ قدم چھپا دیے ہیں میں نے
سجدوں کے نشاں مٹا دیے ہیں میں نے
جب سے دیکھا ہے خلوتِ دل میں تجھے
لاکھوں پردے گرا دیے ہیں میں نے

خوابِ شبِ ہجر بھول جانے دے مجھے
اب، حسرتِ دید کو جگانے دے مجھے
فردا نے پہن لیا، لباسِ امروز
اے حسنِ ازل نقاب اٹھانے دے مجھے

شر، خیر کے اسلوب میں ڈھل جاتا ہے
پندار، خلوص سے بدل جاتا ہے
وہ دل بھی، جو ہو پارۂ سنگ و آہن
خوشبوئے محبت سے پگھل جاتا ہے

دنیا باتیں گھڑے تو چپ ہی رہنا
ناحق تہمت جڑے تو چپ ہی رہنا
قدرت، تیری طرف سے دے لے گی جواب
اے دوست! جو بن پڑے تو چپ ہی رہنا

محمد اجتبار ندوی

نظام الملک طوسی
اور
اُس کے مَدارس

اسلام نے ابتدا ہی سے علم و معرفت حاصل کرنے کے لئے ہر مسلمان کو توجہ دلائی اور اس کی ہمت افزائی کی۔ عالمِ اسلام کے گوشہ گوشہ میں تعلیمی حلقے قائم کئے گئے، جس کا مقصد علم کی اشاعت تھا، یہ تعلیمی حلقے مختلف شکلوں میں تھے، مکتب یا مدرسہ، بادشاہوں، حاکموں، دولتمندوں کے محل اور دولتکدوں میں، کاغذی کی دوکانوں پر یا محلہ کی مسجدوں میں، مسجد کے ساتھ مکتب لازمی تھا، مگر یہ حلقے، کسی منظم اور مقررہ نصاب و نظام کے تحت نہ تھے، اس لئے تعلیم کے لئے نجی مدرسے قائم کرنے ضروری سمجھے گئے جو صحیح تعلیمی و تربیتی نظام کے تحت چلائے جا سکیں، اس میں طالب علم کو مختلف علمی و ادبی مضامین سے استفادہ کے مواقع حاصل ہوں۔

پانچویں صدی ہجری کے نصف میں یہ مقصد پورا ہو سکا، جبکہ عالم اسلام کو سلجوقی عہد میں چند ایسے مدرسے میسر آئے جو اعلیٰ تعلیم کے لئے مخصوص تھے، میری مراد "مدارس نظامیہ" سے ہے، یہ وہ زمانہ ہے جبکہ عالمِ اسلام، علمی و فکری اور ادبی میدان میں بہت زیادہ ترقی پذیر ہو چکا تھا۔

"مدارس نظامیہ" کل نو عدد تھے جنھیں سلجوقی وزیر نظام الملک طوسی نے مندرجہ ذیل شہروں میں قائم کئے تھے:

بغداد، موصل، بصرہ، اصفہان، مرو، نیشاپور، ہرات اور بلخ — یہ مدارس آج کی اصطلاح میں کالج یا یونیورسٹی کے معیار کے تھے، کیونکہ یہ اعلیٰ تعلیم کے لئے مخصوص تھے، اور اعلیٰ علم و ثقافت کی اشاعت ان کا اولین مقصد تھا، اور سلجوقی دور کے چوٹی کے علماء اور ماہرین تعلیم ان مدارس سے وابستہ تھے۔ بغداد کے "مدرسہ نظامیہ" کو سب سے زیادہ شہرت حاصل ہوئی، اس لئے کہ بغداد عباسی خلافت کا دارالسلطنت تھا، سیاسی، سماجی، ثقافتی لحاظ سے بغداد کا ثانی کوئی دوسرا شہر نہیں تھا، مفکرین، فلاسفہ، ادباء، علماء اور عدالت عالیہ کا مرکز تھا، ان سارے اسباب کی بنا پر "مدرسہ نظامیہ" کو جو شہرت حاصل ہوئی کوئی تعجب خیز بات نہیں۔

بغداد کے "مدرسہ نظامیہ" کی بنیاد ۴۵۷ھ مطابق ۱۰۶۵ء میں پڑی اور تکمیل ۴۵۹ھ میں ہوئی، اس کی شاندار اور پرشوکت عمارت دریائے دجلہ کے کنارے واقع تھی۔

"مدارس نظامیہ" کی تاسیس کے اسباب پر مورخین اور ناقدین کی مختلف رائیں ہیں۔

ایک طبقہ کا خیال ہے کہ سلجوقی سلطنت میں امن و امان اور استحکام قائم کرنے کے لئے ان مدارس کی بنیاد ڈالی گئی تھی، تاکہ ان مذہبی اختلافات اور مناقشوں کو ختم کیا جائے جو بڑی شدت اختیار کرتے جا رہے تھے۔

ایک دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ شافعی مسلک کو معتزلہ کے مقابلہ میں طاقتور اور مضبوط بنانے کے لئے یہ مدارس قائم کئے گئے، اور معتزلہ کے مقابلہ میں ان مدارس کے ذریعہ اشاعرہ کو کامیابی حاصل ہوئی۔ (اشعری شافعی المسلک تھے)

بعض لوگوں کی رائے ہے کہ باطنی شیعہ کی بیخ کنی کے لئے یہ مدارس قائم

کئے گئے، سلجوقی عہد میں بغداد کے معاشرہ پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں
مختلف الاجناس اور مختلف الخیال لوگ جمع تھے۔ عرب، ترک، اکراد اور ایرانی وغیرہ، مذ
اعتبار سے مسلمان غالب اکثریت میں تھے، اگرچہ کچھ عیسائی اور یہودی تعداد بھی تھی، مسلما
دو گروہوں میں بٹے ہوئے تھے، سنی، شیعہ، سنیوں کے چار مسلک تھے، حنفی، شافعی
حنبلی اور مالکی۔ ان مسلکوں میں سخت جنگ و پیکار تھی، بعض حاکموں کا کسی ایک مسلک سے
تعلق اس آگ کو بھڑکا دیتا تھا۔

سلجوقی حاکم طغرل بک کا وزیر کندری معتزلی شیعہ تھا، اور اشاعرہ سے خار کھاتا تھ
اس نے ایک مرتبہ طغرل بک کے دربار میں "اشاعرہ" کو بہت برا بھلا کہا، اور بادشاہ کو
برانگیختہ کر دیا، طغرل بک اشعری مذہب سے اس قدر ناراض ہوا کہ اس نے یہ حکم صادر
کر دیا کہ مسجد کے منبروں سے اشعری مذہب پر لعنت بھیجی جائے اور اس کے علماء کو کافر
کہا جائے، اشعری علماء کو مسجدوں میں خطبے اور وعظ سے منع کر دیا گیا۔ کندری نے اشاع
کے خلاف حنفیوں کو بھی ملا لیا تھا۔

اس تعصب، عناد اور ضد نے اشاعرہ اور بعض مفکرین مثلاً شیخ الحرمین ابوالمعا
الجوینی اور ابوالقاسم القشیری کو ناراض کر دیا، یہ دونوں بزرگ بغداد چھوڑ کر چلے گئے، بعض
اشعری علماء جیسے ابواسحٰق شیرازی نے اشعری مذہب کی جانب سے دفاع شروع کیا
یہ اعلان کیا کہ وہ اسلام کی حفاظت وحمایت میں اٹھ کھڑے ہوئے ہیں، پس جو بھی ان پر
لعنت بھیجے گا وہ تمام اہل سنت پر لعنت بھیجی جائے گی، اس سے پورے معاشرے میں
بے چینی، انتشار، اشتعال اور انتقامی جذبات برانگیختہ ہو گئے۔ عین اسی پر آشوب دور میں
ملک شاہ سلجوقی کا وزیر نظام الملک طوسی مقرر ہوا، اس نے یہ منصب سنبھالتے ہی ملک میں
امن وامان کی طرف توجہ کی اور اس نے سوچا کہ جب تک مذہبی جھگڑے فرو نہ ہوں گے
اس وقت تک امن وسلامتی مفقود رہے گی۔ اس مقصد کے حصول کی خاطر اس نے یہ مدار

قائم کئے جو اس کے نام سے موسوم ہوئے، ان کا نظام ونصاب مذہب شافعی کے مطابق مقرر ومرتب کیا، اور بڑی گرانقدر امداد وتعاون صرف کرکے عالم اسلام کے چوٹی کے علماء، فضلاء، مفکرین اور ماہرین تعلیم کو ان مدارس سے وابستہ کرسکا۔ اس کی وجہ سے ملک کے ہرگوشہ اور چپہ چپہ سے طلباء کھنچ کر چلے آئے، نظام الملک نے اپنی اس دانشمندانہ حکمت سے عوام اور قوم کی توجہ ان اختلافی اور متنازع فیہ مسائل سے ہٹا کر ان مدارس کی جانب موڑ دیا تاکہ وہ ایک دوسرے سے جنگ میں اپنا وقت اور صلاحیت کو ضائع نہ کریں، اس طرح نظام الملک "سلجوقی سلطنت" کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو اختلافی اور تنازعاتی بھنور سے بچالے گیا۔

ان مدارس کا ذمہ دار تنہا نظام الملک تھا، وہ ان کے سیاہ سپید کا مالک تھا، اپنی ذہانت، قابلیت، علم ومعرفت، قدرشناسی اور مردم شناسی کی بناپر خود ہی کسی لائق ترین شخص کا مدرسہ کی ذمہ داری کے لئے انتخاب کرتا۔ کبھی ایک مدرس کی خاطر مستقل مدرسہ بھی قائم کیا، چنانچہ بغداد کا "مدرسہ نظامیہ" صرف اس لئے قائم کیا کہ اس کا ذمہ دار شیخ ابواسحٰق شیرازی کو بنانا تھا، نظام الملک جانتا تھا کہ شیخ شیرازی اس دور کے سارے علماء میں، علم، ذہانت، صلاحیت اور قابلیت میں امتیازی مقام رکھتے تھے۔

اکثر مورخین نے تذکرہ کیا ہے کہ شیخ ابواسحٰق شیرازی "مدرسہ" کے افتتاحی جلسہ میں شریک نہیں ہوئے، حالانکہ مدرسہ انہیں کے لئے قائم کیا گیا تھا۔

ابن اثیر نے اپنی تاریخ "کامل" میں اس واقعہ کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:

> "ذیقعدہ ۴۵۹ھ میں بغداد کے "مدرسہ نظامیہ" کی عمارت مکمل ہوئی، اس میں شیخ ابواسحٰق شیرازی کا تدریس کے لئے تقرر ہوا، لوگ سبق کے لئے حاضر ہوئے، شیخ شیرازی کا انتظار ہونے لگا، مگر شیخ تشریف نہیں لائے، شیخ کے تشریف نہ لانے کا سبب یہ تبلایا گیا کہ راستہ میں شیخ کی ایک شخص سے

ملاقات ہوئی اس نے کہا کہ آپ ایک غصب شدہ جگہ میں کیسے تعلیم دیں گے؟ آپ نے ارادہ ملتوی کردیا، جب دن کافی چڑھ گیا، لوگ شیخ شیرازی کی آمد سے مایوس ہو گئے، تو شیخ ابو منصور بن یوسف نے "شامل" کے مصنف ابو الصباغ کو اشارہ کیا اور کہا کہ اس مجمع کا بغیر کچھ حاصل کئے ہوئے واپس جانا مناسب نہیں، ابو الصباغ تدریس کے لئے بیٹھ گئے، نظام الملک کو جب واقعہ معلوم ہوا تو اس نے شیخ شیرازی سے بڑی منت سماجت کی اور انھیں اطمینان دلایا، ان کے شکوک کا ازالہ کیا، اس کے بعد شیخ مدرسہ میں تدریس پر راضی ہوئے، اس دوران ابو الصباغ نے کل ۲۰ دن تدریسی فرائض انجام دیئے ......"

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ شیخ ابو اسحٰق شیرازی "مدرسہ نظامیہ" میں تدریس اس وجہ سے راضی ہوئے کہ جس مسجد میں شیخ پڑھاتے تھے وہاں کے طلباء نے شیخ بے نیازی کو ناپسند کیا اور "مدرسہ نظامیہ" چلے جانے کی دھمکی دی، یہ طلباء "نظامیہ" ا لئے جانا چاہتے تھے کہ وہاں مادی وسائل اور اسباب راحت اس قدر وافر تھے کہ میں اس کا عشر عشیر بھی میسر نہیں تھا، چنانچہ شیخ شیرازی نے نظام الملک کی درخواست پر "نظامیہ" کی ذمہ داری قبول کرلی۔

مدرسہ کا تدریسی عملہ حسب ذیل تھا:

فقہ، اصول فقہ، قرآن پاک، عربی زبان کے قواعد کے اساتذہ، ایک دا اور ایک ناظم کتب خانہ۔

مدرسہ کا سارا عملہ شافعی المسلک تھا، نظام الملک بذات خود ان اساتذہ کا تقرر کر تھا، صلاحیت، استعداد، علم و معرفت اور تدریسی تجربہ مدنظر رکھتا تھا، تنخواہ اتنی مقرر کر کہ جس سے اساتذہ پورے طور پر تعلیم و تدریس کی جانب متوجہ رہیں اور معاشی فکر و بحرا میں مبتلا نہ ہوں۔ اساتذہ اور مدرسہ کے دیگر عملے کا تقرر چونکہ نظام الملک کے ارا

اہش کے تابع تھا اس لئے کسی بھی استاذ کا ایک مقررہ مدت تک ادارہ میں باقی رہنا
روری نہیں تھا، اس اطمینان اور ضمانت کے فقدان کی وجہ سے کبھی تدریسی نظام میں
ران اور بدنظمی پیدا ہو جاتی تھی، مگر اس نظام میں ایک دوسرا پہلو بھی قابل لحاظ ہے کہ
نظام الملک باصلاحیت اساتذہ کی بے حد قدر کرتا تھا اور ان کو دوبارہ سہ بارہ اسی
نصب یا کرسیٔ تدریس پر واپس لانے میں دریغ اور بخل سے کام نہیں لیتا تھا۔ چنانچہ ان
دارس میں ایسے اساتذہ کی خدمات حاصل کی گئیں جو عالم اسلام اور مسلم حلقوں میں بڑی
شہرت اور قدر و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، ان میں سے بعض اساتذہ کا تذکرہ
فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔ مثلاً ابو اسحٰق شیرازی، ابو المعالی الجوینی، ابوبکر الشاسی، ابو عبداللہ
الطبری، ابوزکریا یحییٰ التبریزی، ابو حامد الغزالی، موہوب بن احمد الجوالیقی، البغدادی، رضی الدین
القزوینی اور ابوبکر الأنباری وغیرہم۔

ان اساتذہ کے علاوہ ہر استاذ کے لئے دو یا تین معاون ہوتے تھے جنھیں "معید"
کہا جاتا تھا، "معید" کے ذمہ استاذ کے لکچر کا اعادہ اور "تکرار" کرانا تھا، طلبہ کو سخت الفاظ
کے معانی اور دشوار موضوعات کو سمجھانا، آسان کرنا بھی ان کے فرائض میں داخل تھا،
اس منصب کے لئے شرف الدین الشہرستانی اور فیروز آبادی کا تقرر ہوا تھا۔

ان مدارس میں طریقہ یہ تھا کہ استاذ طلباء کے لئے چند پیراگراف متعین کر دیتا کہ وہ
غور سے پڑھ لیں، اس کے بعد ان ہی میں سے سوالات کریں، استاذ ان سوالوں کو حل کرتا
اور ان کی وضاحت کرتا، طلباء کو بحث مباحثہ اور تبادلۂ خیالات کا پورا موقع دیتا،
جس کی وجہ سے طالب علم اپنے مافی الضمیر کی ادائیگی پر قادر ہو جاتا، اساتذہ، طلباء کی
رائے اور صلاحیت کی قدر کرتے اور اس طرح طلباء کی ہمت افزائی ہوتی اور وہ مختلف
موضوعات میں امتیاز و تفوق حاصل کر لیتے تھے۔

نظام الملک کے ان مدارس میں طلباء کے لئے بڑی آسانیاں اور سہولتیں فراہم

کی گئی تھیں، جس کی وجہ سے طالب علم بہت اطمینان اور بے فکری سے تعلیم حاصل کر
تھا۔ اعلیٰ تعلیم کی تکمیل کے لئے بہت بڑی تعداد ان مدارس میں داخلہ لیتی تھی وہاں مد
میں علم عام تھا، ہر غریب، فقیر، محتاج، مسکین، دولتمند، مالدار کے لئے وظیفے مقر
اور ان کے کھانے، کپڑے اور رہنے کا مکمل انتظام تھا، طلبار اور اساتذہ کے لئے
الگ الگ بورڈنگ ہاؤس تعمیر کئے گئے تھے۔ کلاسوں کے لئے علاحدہ عمارت تھی۔
مدارس پر نظام الملک نے چھ لاکھ سے زیادہ کا سالانہ بجٹ بنا رکھا تھا، اس بجٹ
کی چوتھائی (¼) آمدنی اوقاف اور غیر منقولہ جائداد سے فراہم کی جاتی تھی۔

"مدارس نظامیہ" ایک مقررہ نصاب تعلیم کی وجہ سے ایک امتیازی مقام رکھتے
تھے، ان کا بہت ہی قابل قدر اور مفید نصاب تعلیم تھا جس میں اس دور کے تمام مضامین
پڑھائے جاتے تھے، چند اہم مضامین درج ذیل ہیں:

فقہ اور اصول فقہ: مذہب شافعی کے مطابق، قرآن پاک، حدیث شریف
، ادب، تاریخ، طب، فلکیات و ہیئت ــــ بعد میں کچھ دوسرے مضامین کا
بھی اضافہ کیا گیا تھا۔

نظام الملک نے ان مدارس میں شاندار اور قیمتی کتب خانے قائم کئے تھے جن
سے طلبار اپنی تعلیم میں استفادہ و تعاون حاصل کرتے تھے، ان کتب خانوں میں گرانقدر
کتابوں اور نایاب مخطوطات کا ذخیرہ تھا۔ اس دور کے فاضل علمار، مفکرین اور محققین
نے "مدارس نظامیہ" کے کتب خانوں کو نایاب اور قیمتی کتابیں پیش کی تھیں، بغداد کے
"مدرسہ نظامیہ" میں کتابوں کی ایک مثالی فہرست تھی جو چھ لاکھ کتابوں سے زائد پر مشتمل
تھی۔

ان مدارس نے علمار، ادبار، شعرار، نحوی اور مصنفین کی ایک بڑی تعداد پیدا کی
جنھوں نے تاریخ، ادب، شعر اور علم نحو میں کمال حاصل کیا اور عالمی شہرت پائی، مثلاً

شیخ سعدی شیرازی، ادب وشعر میں مشہور تصنیفات کے مؤلف، سلطان صلاح الدین ایوبی کے عہد کا مشہور و ممتاز مورخ و ادیب "عماد الدین" جو کاتب اصفہانی "کے نام سے مشہور ہوا، اور حمید بن یونس، جس نے "عماد الدین" کے نام سے شہرت حاصل کی اور اس کی کوشش سے موصل کے سلطان "نور الدین ارسلان" نے حنفی مسلک ترک کر کے شافعی مسلک اختیار کیا۔ ان مدارس کے نشاط، پختگی اور کارکردگی کی اس سے روشن اور تابناک مثال اور کیا ہو سکتی ہے!

اس دور میں "مدارس نظامیہ" کی وہی حیثیت تھی جو آج کی ترقی یافتہ یونیورسٹیوں اور علمی مراکز کی ہے، جس طرح آج کا طالب علم سہولتیں، علمی ترقی اور تعلیمی معیار کو پیش نظر رکھ کر سوربون، آکسفورڈ، کیمبرج، میکگل (مانٹریال) اور ہارورڈ کا رخ کرتا ہے تاکہ ان یونیورسٹیوں کے مفکر، محقق اور فاضل اساتذہ سے اعلیٰ تعلیم اور سندیں حاصل کرے، اسی طرح اس دور کا طالب علم، نظام الملک کے مدارس کی طرف رخ کرتا تھا تاکہ معیاری اور اعلیٰ تعلیم اور سند، امام ابو حامد غزالی جیسے مفکر، محقق اور ماہر تعلیم سے حاصل کرے اور شہرت دوام پائے۔

پروفیسر آل احمد سرور

غزل

(مجیب رضا کی نذر)

بے دلی کے دور میں کوئی خلش بھی کم نہیں
زیست کے آداب کی یہ سرزنش بھی کم نہیں

بزم عالم میں چراغاں سے کسے انکار ہے
اپنی چنگاری کی لیکن پرورش بھی کم نہیں

آج جب ہر بات پر ہاں کہنے والے ہیں بہت
میری یہ انکار کی کافر روش بھی کم نہیں

گو فضا میں نت نئے سورج بلاتے ہیں مجھے
اپنے دھرتی کے چراغوں کی کشش بھی کم نہیں

جب تمدن ہو کے رہ جائے نقابوں کا طلسم
یہ نقابیں نوچ دینے کی خلش بھی کم نہیں

الاماں، اس جوہری طاقت کی گرمی کا جلال
کچھ نئے انکار کی لیکن تپش بھی کم نہیں

تم کو شہروں کی چمن بندی مبارک دوستو
پھول صحرا میں کھلانے کی روش بھی کم نہیں

یہ حقائق کی پرستش ہے تری دولت سرور
کچھ حقائق کو بدلنے کی خلش بھی کم نہیں

نوٹ: یہ نظم ۲۳-۲۴ جولائی ۱۹۸۱ء کو جامعہ ملیہ اسلامیہ (نئی دہلی) میں ترقی اردو بورڈ کے جدیدیت پر سمینار میں پڑھی گئی۔

سید احمد علی آزاد

جامعہ میں ابتدائی تعلیم کے تجربے

(۷)

کھلی ہوا کا مدرسہ

کھلی ہوا کا مدرسہ، مدرسہ ابتدائی کا بہت بڑا پروجکٹ ہے۔ اس کی ذمہ داریاں بہت زیادہ ہیں۔ میں ۱۹۵۱ سے ۱۹۶۹ تک کے اُن تمام کھلی ہوا کے مدرسوں" میں شریک رہا ہوں جو وقفہ وقفہ سے ہوتے رہے ہیں۔ سوائے ۱۹۶۹ کے، جبکہ پہلی اور دوسری جماعت کے بچے کھلی ہوا کے مدرسہ میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ جمنا کے کنارے ہونے والے کھلی ہوا کے مدرسہ سے ہمایوں کے مقبرہ کے پاس ہونے والے کھلی ہوا کے مدرسہ تک پہلی جماعت سے چھٹی جماعت تک کے تمام بچے اور بچیاں شریک ہوتی رہی ہیں۔ ۱۹۵۱ کے مقابلہ میں اب تعداد کہیں زیادہ ہوگئی ہے۔ ۱۹۵۱ میں تعداد طلبا ۱۱۰ تھی ہر جماعت میں ایک ایک سیکشن تھا۔ اب طلبا کی تعداد ۴۵۰ ہوگئی ہے اور مدرسہ کی چھ جماعتوں میں سے ہر ایک میں سیکشن ہے۔ اس لیے انتظامی اعتبار سے کام خوب بڑھ گیا ہے یعنی ذمہ داری دوگنی اور تین گنی ہوگئی ہے۔ پہلے بورڈنگ کے طلبا زیادہ ہوتے تھے اور غیر مقیم طلبا کم، اب بورڈنگ کے طلبا کم ہوتے ہیں اور غیر مقیم طلبا کی تعداد زیادہ ہوگئی ہے۔ پہلے لڑکیوں کی تعداد گنی چنی ہوتی تھی، اب لڑکیوں کی تعداد

اسّی نوے ہو گئی ہے۔ بورڈنگ کے طلبا بورڈنگ میں رہنے کی وجہ سے اکثر ذمہ دا
خود سنبھالتے ہیں۔ بورڈنگ کے طلبا اپنی سوجھ بوجھ سے دوسروں کی مدد بھی کر د
ہیں اور استاد کے لیے بہت سہارا ہوتے ہیں، جبکہ ڈے اسکالر لڑکوں کی سار
ذمہ داری گھروں پر خود گھر کے لوگ سنبھالتے ہیں جس کی وجہ سے ڈے اسکالر طلبا جب
یکایک اس طرح خیموں میں رہنے لگتے ہیں تو اپنی چیزوں کی نگہداشت تک نہیں کر سکتے
اُن کے رکھ رکھاؤ میں نہ کوئی ترتیب ہوتی ہے نہ تنظیم۔ اس کی وجہ سے اُن کی چیزیں اِد
اُدھر ہو جاتی ہیں، کھو جاتی ہیں، خراب ہو جاتی ہیں۔ پہلی جماعت کے بچوں کے لیے یہ سہ
باتیں اور بھی دشوار ہوتی ہیں۔ اساتذہ کا بیشتر وقت بچوں کو اور ان کی چیزوں کو سنبھا
ہی میں صرف ہو جاتا ہے۔

اگر صحیح طور پر کھلی ہوا کے مدرسے میں کام کرنے اور کرانے کا نقشہ بنا لیا جائے
تو ان دشواریوں پر ایک حد تک قابو پایا جا سکتا ہے۔ کھلی ہوا کے مدرسہ کی تاریخوں ک
مہینے دو مہینے پہلے فیصلہ ہو جاتا ہے۔ اس لیے پلیننگ کا کام پہلے سے کیا جا سکتا ہے۔
کھلی ہوا کے مدرسہ میں تمام طلبا، تمام اساتذہ اور ملازمین دس دن رہتے ہیں۔ پہلا
دن مقررہ جگہ پر پہونچنے میں گذر جاتا ہے اور آخری دن واپسی میں گذرتا ہے۔ اس
طرح کام کرنے کے لئے کل آٹھ دن ملتے ہیں۔ ان آٹھ دنوں میں وہاں خیموں کے آس
پاس اتنا کام ہوتا ہے کہ اِس کے پورا کرنے ہی میں خاصے دن لگ جاتے ہیں، اس
لیے جس جگہ جانے کا فیصلہ ہو اس جگہ کی مناسبت سے پلیننگ کا کام کر لیا جائے اور
تعلیمی کام پہلے سے کرا لیا جائے تاکہ بچوں کا تعلیمی کام، آخری دن، جبکہ معائنہ ہوتا ہے
پیش کیا جا سکے۔

کھلی ہوا کے مدرسہ میں کھانے اور ناشتے پر خاصہ خرچ ہوتا ہے۔ تمام اساتذہ، ملازمین
اور مطبخ میں کام کرنے والوں کے کھانے اور ناشتے کا انتظام بھی انہی کو کرنا ہوتا ہے جس

کی ان سے کوئی قیمت نہیں لی جاتی ہے۔ جماعتوں کو گیجٹس، تعلیمی سامان اور ماڈلز کی تیاری کے لیے بھی کافی سامان دیا جاتا ہے۔ سولہ سترہ بڑے خیموں، قناتیں اور چھولداریوں کا دس بارہ دن کا کرایہ بھی ہوتا ہے۔ تمام طلبا کے بکس، بستر، اور مطبخ کا سارا سامان ٹرکوں کے ذریعہ مدرسہ سے مقررہ جگہ پر منتقل ہونے اور واپس لانے کا کرایہ خاصہ ہوتا ہے۔ تمام بچے لاری سے لے جائے جاتے ہیں۔ دس دن تک لاری کھلی ہوا کے مدرسہ میں رہتی ہے اس لیے کہ ہر روز ایک یا دو جماعتیں لاری کے ذریعہ آس پاس مشاہدہ کے لیے جاتی ہیں۔ اس لیے لاری کا خرچہ بھی کافی ہوتا ہے۔

ان تمام اخراجات کو پورا کرنے کے لئے بورڈنگ کے طلبار سے سولہ روپے فی طالب علم اور غیر مقیم طلبار سے بیس روپے فی طالب علم فیس کھلی ہوا کے مدرسہ کے نام سے لی جاتی ہے۔ بورڈنگ کے طلبار کی دس دن کی مجرائی طعام، مطبخ سے لے لی جاتی ہے۔ جامعہ، کھلی ہوا کے مدرسہ کے لیے دو ہزار روپے دیتی ہے۔ اس کے علاوہ مختلف مدوں کی رقم سے بھی متعلقہ کاموں پر خرچ کیا جاتا ہے، تب جاکر سارے اخراجات پورے ہوتے ہیں۔

نگران مدرسہ کا کام خاصا بڑھ جاتا ہے۔ سب سے پہلے اسے جگہ کے انتخاب اور اس جگہ کی اجازت حاصل کرنے کے لیے جدو جہد کرنی پڑتی ہے۔ کئی جگہیں دیکھنے کے بعد جگہ کا فیصلہ کیا جاتا ہے اور اجازت لی جاتی ہے۔ جگہ شہر سے دور ہونا چاہئے۔ آس پاس قدرتی ماحول ہونا چاہئے۔ کھانا پکانے اور پینے کے لئے صاف اور ستھرا پانی میسر ہونا چاہئے۔ اتنے لڑکوں کے پاخانے، پیشاب، منھ ہاتھ دھونے، وضو کرنے، نہانے دھونے کے لیے کافی پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ شہر سے دور پائپ واٹر کی سہولت نہیں ہوسکتی۔ کیمپ کو پانی حاصل کرنے کے لئے بہت سے بہشتی اور بہت سے برتنوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر آس پاس کوئی کنڈ یا تالاب ہو تو بڑی سہولت ہوتی ہے، اس

لیے کہ پائپ اور کنویں کے ہوتے ہوئے بھی پانی کی کمی رہتی ہے اور آزادی سے پانی کا استعمال نہیں ہو سکتا۔ پانی اور قدرتی ماحول کے اعتبار سے ۱۹۵۸ء کا سورج کنڈ کا کھلی ہوا کا مدرسہ بہترین تھا۔"

کھلی ہوا کے مدرسہ میں رہائش خیموں میں ہوتی ہے۔ دو رویہ خیمے لگا دئے جاتے ہیں۔ بیچ کی جگہ کیمپ فائر کے لئے ہوتی ہے جو کافی کشادہ ہوتی ہے۔ لڑکیوں کی رہائش علیحدہ خیموں میں ہوتی ہے۔ اِن کے ساتھ اتالیقہ اور مدرسہ کی دوسری استانیاں رہتی ہیں۔

ہر جماعت کو ایک بڑا خیمہ دیا جاتا ہے جس میں اس جماعت کے تمام بچوں کے بستر فرش پر لگائے جاتے ہیں۔ خیمہ کی زمین صاف اور ہموار کرکے اس پر دری بچھا دی جاتی ہے اور ان دریوں پر ہر جماعت کے طلبار اپنے اپنے بستر لگا لیتے ہیں۔ ہر بچہ کا بکس ایک علیٰحدہ چھولداری میں بکس اسٹینڈ بنا کر رکھ دیا جاتا ہے، اس طرح کہ ہر بچہ اپنا بکس آسانی سے کھول اور بند کر سکے۔ بکس اور بستروں کا انتظام کرنے کے بعد خیموں کے ارد گرد نالی بنا دی جاتی ہے اور نالی کی مٹی خیموں پر چڑھا دی جاتی ہے تاکہ بارش کا پانی خیموں کے اندر نہ آئے۔ خیموں کے اندر ڈنڈے باندھ کر ان میں دیسی قسم کے ہینگر باندھ دئے جاتے ہیں تاکہ طلبار اپنے اپنے کپڑے ان پر لٹکا سکیں اور کپڑے اِدھر اُدھر نہ پڑے رہیں۔

ایک شامیانہ طلبار کے کھانا کھانے کے لیے لگا دیا جاتا ہے۔ یہیں کھانا کھاتے ہیں اور نماز ہوتی ہے (اگر آس پاس مسجد ہوتی ہے تو نماز وہاں پڑھتے ہیں) کھانا کھلی جگہ میں پکتا ہے اور جنس چھولداریوں میں رکھی جاتی ہے۔ ایک ایک چھولداری استادوں کو بھی دی جاتی ہے لیکن اساتذہ عام طور پر طلبار کے ساتھ ان کے خیموں میں رہتے ہیں۔ اس سے نگرانی اور طلبار سے کام لینے میں آسانی ہوتی ہے۔ ایک بڑا خیمہ شفا خانہ کے لیے ہوتا ہے۔ جامعہ کے ڈاکٹر صاحب تھوڑی دیر کے لیے روزانہ آتے ہیں اور خیریت معلوم کر جاتے ہیں ایک کمپونڈر ہر وقت رہتا ہے۔ ایک بڑا خیمہ دفتر اور سامان کے لیے ہوتا ہے۔ بانس،

سُتلی، کیلیں، سفیدا ور رنگین چاک، کاغذ، گتہ غرضیکہ کھلی ہوا کے مدرسہ میں استعمال ہونے والا ہر سامان اس میں رکھا رہتا ہے اور طلب کرنے پر پرچی کے ذریعہ دیا جاتا ہے۔ بعض مخصوص چیزیں اساتذہ خود بھی بازار سے منگا لیتے ہیں اور رسیدیں دے کر پیسے لے لیتے ہیں۔

جماعتیں جب اپنے خیموں میں مقیم ہو جاتی ہیں تو ان کو ایک پھاوڑا، ایک فوارہ ایک تسلا، ایک بالٹی، ایک قینچی، ایک آری۔ ایک بسولا، ایک داب، دو کھرپے اور دو جھاڑویں دی جاتی ہیں جو کھلی ہوا کے مدرسہ کے ختم ہونے پر واپس کی جاتی ہیں۔ اس سامان کی حفاظت بھی بہت بڑا کام ہوتا ہے اور ان کے غائب ہو جانے کا ہر وقت اندیشہ ہوتا ہے۔ چونکہ ہر جماعت کے طلباء میں بے حد جوش ہوتا ہے اور سامان کم ہوتا ہے اس لیے طلباء بغیر پوچھے دوسری جماعتوں کا سامان اٹھا لاتے ہیں اور کام میں لگ جاتے ہیں۔ نیت اچھی ہوتی ہے لیکن طریقہ غلط ہوتا ہے۔ اگر پوچھ کر لائیں تو یہی بات خوبی بن جائے اور سامان غائب ہونے سے جو پریشانی ہوتی ہے وہ نہ ہو۔

ہر جماعت ایک مٹکا اسٹینڈ بناتی ہے تاکہ پانی پینے کے مٹکے رکھے جا سکیں۔ بچے ہوئے پانی کے لئے ایک گڑھا پاس ہی بنا لیتے ہیں تاکہ کیچڑ نہ ہو۔ خیموں کے باہر جوتا اسٹینڈ، تولیہ اسٹینڈ، آئینہ اسٹینڈ اور لوٹا اسٹینڈ وغیرہ بناتے ہیں اور اس طرح بناتے ہیں کہ رہنے کا سلیقہ معلوم ہو۔ خیموں کے پیچھے ایک رسّی باندھ دی جاتی ہے تاکہ طلباء نہانے کے بعد اپنے گیلے کپڑے پھیلا سکیں۔ مٹکا اسٹینڈ کے پاس ایک گلاس اسٹینڈ بھی بناتے ہیں۔

مدرسہ کی طرف سے ایک ٹائم ٹیبل آتا ہے جس میں یہ درج ہوتا ہے کہ کس کس دن کیمپ سے باہر جانے کا پروگرام ہے اور کس کس دن کیمپ میں موجود رہنا ہے۔ کیمپ سے باہر لاری کے ذریعہ یا پیدل مشاہدہ کے لیے جاتے ہیں۔ مشاہدہ جماعت کے

استاد کی نگرانی میں ہوتا ہے۔ کبھی کبھی سائنس کی چیزوں کے مشاہدہ میں ٹیچرس ٹریننگ کا کے طلبا ء بھی شریک ہو جاتے ہیں۔ کیمپ میں موجود رہنے کی صورت میں خیموں کے اردگر کے کاموں کا موقع ملتا ہے۔ ہر خیمہ کے سامنے کافی جگہ ہوتی ہے۔ اس جگہ میں تعلیمی ماڈل ہوتا ہے تاکہ خالی خالی جگہ بری نہ معلوم ہو۔ آس پاس سے جو جڑی بوٹی، پودے اور پتھ وغیرہ جمع ہوتے ہیں انھیں بھی یہاں رکھا جاتا ہے۔ پودوں، پھولوں اور جڑی بوٹی کے متعلق معلومات لوگوں سے اور گڈریوں سے پوچھ پوچھ کر لکھتے ہیں۔ اگر کھلی ہوا کا مدرسہ تاریخی عمارتوں کے آس پاس ہوتا ہے تو تاریخی عمارتوں کی معلومات اُن عمارتوں کے دکھلانے کے بعد لکھائی جاتی ہیں۔ غرض کہ اس جگہ کو ماڈلز، چارٹس، پمفلٹ، نقشے اور بچوں کی جمع کی ہوئی چیزوں کی نمائش کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

ماڈلز میں عام طور پر اردو، ہندی کی درسی کتابوں کی کسی کہانی کی تصویر کا ماڈل بناتے ہیں جیسے دو بکریوں کا ایک پل پار کرتے ہوئے، یا جغرافیہ کا کوئی ماڈل بناتے ہیں جیسے سورج کا خاندان یا قطب تارے کا ماڈل (زمین پر) یا ماحول کی کسی چیز کا ماڈل بناتے ہیں جیسے قطب مینار یا کسی مہم کا ماڈل بناتے ہیں جیسے ایورسٹ کے راستہ کا ماڈل یا چاند کی تسخیر کا ماڈل۔ یعنی ایسی چیزیں جن کا اخباروں میں ذکر ہوتا رہتا ہے اور بچے بھی ترانے میں خبریں پڑھنے کی وجہ سے معلومات رکھتے ہوں۔ ہر جماعت پہلے سے اپنے لئے ماڈل طے کر لیتی ہے اور اس کے مطابق سامان فراہم کرتی ہے۔ رات کو روزانہ کیمپ فائر ہوتا ہے ہر جماعت ایک دو نقلیں پیش کرتی ہے اور رات کا ایک دو گھنٹہ وقت اچھا گذرتا ہے۔ روشنی کا انتظام بجلی کی روشنی سے یا گیس کے ہنڈوں سے کیا جاتا ہے۔ رات کو جو لڑکے پہرہ دیتے ہیں ان کے پاس ڈنڈے اور ٹارچ ہوتی ہے۔ پہرہ دینے کے لئے ہر جماعت سے دو دو لڑکے لیے جاتے ہیں۔ اِن کے ساتھ ایک یا دو استادوں کی ڈیوٹی بھی ہوتی ہے۔ یہ لڑکے چائے پیتے جاتے ہیں اور پہرہ دیتے جاتے ہیں۔ اِن کے پاس سیٹی بھی ہوتی ہے۔

کھلی ہوا کا مدرسہ عام طور سے فروری کے آخر میں یا مارچ کے کسی ہفتہ میں ہوتا ہے، اور یہ مہینے ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں موسم اُتھل پتھل رہتا ہے۔ کبھی آندھی آتی ہے، کبھی خوب بارش ہونے لگتی ہے، کبھی اولے گرنے لگتے ہیں اور کبھی یہ سب باتیں ایک ساتھ ہونے لگتی ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ کوئی کھلی ہوا کا مدرسہ ان حالات سے دوچار ہوئے بغیر نہیں گذرا۔ موسم کی اس حالت کے درمیان کام رک جاتا ہے، کام خراب ہوجاتا ہے اور دوبارہ محنت کرنی پڑتی ہے اور اگر آندھی میں خیمے اکھڑ گئے تو بے پناہ دشواریوں اور مصیبتوں سے سابقہ پڑتا ہے لیکن ہم سب اساتذہ اور طلبار ان حادثات کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں اور پہلے سے ذہن بناکر آتے ہیں۔ چنانچہ مہر دلی کے کھلی ہوا کے مدرسہ میں جو مارچ ۱۹۶۹ء میں ہوا تھا، آخری مظاہرہ سے ایک دن پہلے دوپہر کو تیز ہوا اور تیز بارش نے تمام بنا بنایا سامان بگاڑ دیا لیکن طلبار اور اساتذہ نے مل کر رات بھر کام کیا اور دوسرے دن صبح سے چار بجے سہ پہر تک لگ کر تمام بگڑا ہوا سامان از سرِ نو درست کر دیا اور ہر چیز کو قرینہ اور سلیقہ سے لگا کر اور سجا کر مہمانوں کے دیکھنے کے قابل بنا دیا۔ اِن کاموں کو دیکھ کر کسی کو گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ سارا کام بارش اور طوفان کے حادثات سہہ کر سامنے آیا ہے۔

کھلی ہوا کا مدرسہ بچوں میں مشکل پسندی کے جذبے کو پروان چڑھاتا ہے جس سے ان کی شخصیت کی تعمیر میں مدد ملتی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ عبدالغفار صاحب مدرسہ ابتدائی قرولباغ میں بچوں کے اس جذبہ مشکل پسندی کے پیش نظر اور اچانک خطرہ سے نکلنے کے لیے "خطرے کی گھنٹی" بجوایا کرتے تھے۔ بچے سارا کام چھوڑ کر کلاس سے نکل آتے تھے اور ایک منٹ میں باغبانی میں جمع ہوجاتے تھے جہاں اُن کو کوئی اہم اطلاع دی جاتی تھی۔ ایک مرتبہ ایک لڑکے کی دو انگلیاں دروازے کی چول میں آکر بُری طرح زخمی ہوگئیں لیکن وہ اس حالت میں بھی بھاگا اور رُکا نہیں اور نہ دوسرے لڑکے تماشہ دیکھنے کے

لیے جمع ہوئے۔ اس واقعہ کی نہ تشہیر ہوئی نہ چرچا۔ جامعہ نے مشکل حالات میں اپنی شروع کی تھی اور اپنے طالب علموں کو اس بات کی تربیت دیتی تھی کہ مشکلات کا مقابلہ کس طرح کیا جائے۔ کھلی ہوا کے مدرسہ سے ذیل کے فائدے ہیں:

۱۔ طلبار کو اپنی سمجھ بوجھ اور طبیعت کی اپج کے استعمال کا موقع ملتا ہے۔ نئے حالات میں زندگی گذارنا سیکھتے ہیں۔

۲۔ خراب اور مایوس کن حالات میں بھی پُرامید رہتے ہیں اور اپنی محنت اور ... سے حالات پر قابو پانا سیکھتے ہیں۔

۳۔ اتنے نئے نئے کام ہوتے ہیں کہ ہر بچہ کو اس کی طبیعت کے مطابق کام مل جاتا ہے۔

۴۔ نئی نئی چیزیں بنانا سیکھتے ہیں۔ نئی نئی چیزوں کے بارے میں معلومات حاصل کرتے ہیں اور یوں ان کی معلومات بڑھتی رہتی ہے۔ اپنی جماعت کے کاموں کے علاوہ دوسری جماعتوں کے کاموں کو دیکھ کر بھی بہت کچھ سیکھتے ہیں۔

۵۔ راتوں کو پہرہ دیتے ہیں اس طرح ڈر اور خوف دور ہوتا ہے۔ نڈر زندگی گذارنا سیکھتے ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ ہم بہادری کا کام انجام دے رہے ہیں۔

۶۔ تمام مشاہدات کو قلم بند کرتے ہیں اور اکثر مشاہدات کی ڈرائنگ بناتے ہیں۔

۷۔ گاؤں اور دیہات کی زندگی کے سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔

۸۔ کام بگڑتا ہے تو مایوس نہیں ہوتے بلکہ غیر معمولی کوشش اور محنت سے لگ کر کام کرتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔

۱۹۶۹ کا کھلی ہوا کا مدرسہ

اس سال میرے پاس پنجم جماعت کا سیکشن (الف) تھا۔ میں نے بہت سا

تحریری کام اور گیجیٹس بنانے کا کام مکمل ہوا میں جانے سے پہلے جماعت میں کرالیا تھا طلبار کو معلوم تھا کہ وہاں پہونچ کر کیا کیا کرنا ہے اور کس طرح کرنا ہے۔ مکمل ہوا کا یہ مدرسہ مہرولی ہوا تھا جہاں آس پاس بہت سی تاریخی عمارتیں ہیں۔ تمام طلبار کو آس پاس کی عمارتوں کا مختصر حال سرسید کی کتاب آثار الصنادید سے لکھا دیا گیا تھا۔ ہر بچہ کے پاس نو عمارتوں کا حال تھا لیکن کھلی ہوا کے مدرسہ میں پیش کرنے کے لئے ان سب کو علیٰحدہ علیحدہ موٹے چکنے کاغذ پر فرحانہ طیب سے، جس کا خط بہت اچھا تھا، لکھوا کر رکھ لیا گیا تھا اور بعد میں جب مشاہدہ میں بچوں نے ان عمارتوں کو دیکھا تو عمارتوں کی تصویریں بچوں کے ساتھ کھینچی گئیں اور پھر ان شیٹ پر لگا دی گئیں۔ اس موقع پر مندرجہ ذیل تحریری کام ہوا :

۱۔ آس پاس کی تاریخی عمارتوں کی معلومات۔

۲۔ اپالو ۸ کے سفر کے بارے میں معلومات اور چارٹس۔

۳۔ چاند کے بارے میں پوری معلومات ، چاند گرہن ، چاند کا گھٹنا بڑھنا ، چاند اور جوار بھاٹا اور چاند کس طرح روشنی حاصل کرتا ہے۔

۴۔ ہندوستان کا ۱۹۶۹ کا بجٹ۔

بچوں نے مندرجہ ذیل ماڈل بنائے :

۱۔ ہندوستان کا ماڈل۔ آمدنی اور خرچ کے ذریعہ آن کا اسکیچ۔

۲۔ اپالو ۸ کا راستہ زمین پر (مٹکوں پر زمین اور چاند کا نقشہ بنایا گیا جو نصف کرٹے ہوئے تھے۔)

۳۔ چاند گرہن اور چاند کا سورج سے روشنی حاصل کرنا۔ یہ بھی مٹکوں کو گاڑ کر بنایا گیا تھا۔

خیمہ کے باہر جو حصہ تھا اس کو ڈنڈوں سے گھیر کر پردے لٹکا دئے گئے تھے اور ان پردوں پر تاریخی عمارتوں کا حال ، اپالو ۸ کے سفر کا حال۔ چاند کی معلومات

کو چھوٹے اور بڑے شیٹ پر لکھوا کر باہر رُخ طلبار نے لگادیا تھا تاکہ آخری دن
والے مہمان بہ آسانی پڑھ سکیں۔ لکھائی کا سارا کام فرحانہ طیب نے بغیر رُکے کیا
پودوں اور پتھروں کے نام لکھنے کا کام بھی آخری دن کرتی رہیں۔ بانس گاڑنے،
لگانے اور ماڈل بنانے میں فیض محمد اور زین العابدین سب میں نمایاں رہے ا
کام جگہ جگہ نظر آتا تھا۔ ایک اخبار بھی پابندی سے نکلتا رہا۔ اس کام پر دو لڑکے
ذکی اور محمد یوسف مقرر تھے۔ یہ لڑکے صبح صبح مہرولی کے بازار سے دو اخبار خر
لاتے تھے اور ان کو پردے پر لگا دیتے تھے۔ اس طرح آنے جانے والے اخبارات
لیا کرتے تھے۔ بعد میں ان اخبارات کو اُتار کر ان کے مشکل الفاظ کے معنی پوری جا
کو بتلائے جاتے تھے۔

آخری دن، طوفان اور بارش کی سختیاں جھیلنے کے بعد، بچوں نے جس سوجھ ا
اور سلیقہ سے خیمے کے اندر بستر وغیرہ لگایا ہے اور چیزوں کو قرینہ سے رکھا ہے اور
کی چیزوں میں جو صفائی ستھرائی، حسن اور سلیقہ پیدا کیا ہے وہ انھیں کا حصہ تھا۔
انھوں نے اُستاد کی ہدایت سے زیادہ سمجھا اور زیادہ ذمہ داری سے سارا کام کیا
اور یوں کام خود اپنا انعام بن گیا۔ اس سارے کام کا سہرا شہاب الدین، الطاف حسین
اور محبوب عالم کے سر رہا۔ لیکن کام نہ کرنے والے چند طلبار اور احساس کمتری میں
مبتلا طلبار کہتے تھے کہ ہماری جماعت کی کوئی پوزیشن نہیں آئے گی اور اس لیے
کسی کو انعام لینے کے لیے بھی مقرر نہیں کیا لیکن اعلان ہوا کہ "مینار خیمہ" دوم ہے
(ابتدائی پنجم الف کے خیمہ کا نام "مینار کیمپ" تھا) اس موقع پر اسی طالب علم نے
بڑھ کر کپ حاصل کر لیا جو طلبار میں مایوسی کی باتیں کرتا تھا۔

(باقی آئندہ)

مولانا مہر محمد خاں شہاب مالیرکوٹلوی

اختلافات کے باوجود مل بیٹھنے کی صورت

مجلۂ "جامعہ" کے جون ۱۹۸۱ء سے لے کر اگست ۱۹۸۱ء تک تیسرا نمبر ہے جس میں حادثۂ کربلا کی بحث چل رہی ہے۔ کتنا اچھا ہوتا کہ جون ۱۹۸۱ء کے جامعہ میں جتنی گفتگو چھپ چکی تھی اسی پر اس سلسلہ کو ختم کر دیا جاتا۔ مگر ہوا یہ کہ حضرت مولانا قاضی زین العابدین سجاد صاحب نے اپنی صدارتی تقریر کے خلاصہ کو ناکافی خیال فرما کر اپنے خیالات کی وضاحت کے لئے جولائی ۱۹۸۱ء اور اگست ۱۹۸۱ء میں دوبارہ قلم اٹھایا۔ جسے پڑھنے کے باوجود میرا خیال یہ ہے کہ بات میں کوئی صفائی پیدا نہیں ہوئی۔ کیونکہ صدیوں کی بحث و تکرار اور تاریخی حوالوں کی بھرمار کے ہوتے ہوئے بحث اتنی الجھی ہوئی ہے کہ اسے سلجھانے کی ہر کوشش مزید الجھنیں پیدا کرتی چلی آ رہی ہے چنانچہ اس کا تازہ نمونہ خود حضرت علامہ قاضی سجاد صاحب محترم کی مجلۂ جامعہ کی اگست میں شائع ہونے والی وضاحت ہے۔

یزید کو پلید ثابت کرنے کے لئے حضرت قاضی صاحب نے البدایہ والنہایہ جلد ہفتم صفحہ ۲۲۶/۲۳۶ سے جہاندیدہ باپ حضرت امیر معاویہ کی نوجوان چہیتے فرزند یزید کو حسب ذیل نصیحت نقل فرمائی ہے کہ:

> "یزید نوجوانی کے زمانہ میں شراب پیتا تھا اور آزاد طبع نوجوانوں کی زندگی بسر کرتا تھا اس کے والد حضرت معاویہ کو اس کا احساس ہوا اور اسے نرمی سے اس طرح سمجھایا "اے بیٹے تمہارے لئے یہ بھی تو ممکن ہے کہ تم اپنی ضرورت اس طرح پوری کر لیا

کرو کہ تمہارا پردہ فاش نہ ہو۔ جس سے تمہاری قدر و منزلت جاتی رہے اور تمہارے دشمن خوش اور تمہارے دوست غمگین ہوں۔"

پھر (حضرت معاویہ نے) یہ شعر پڑھے:

"دن کے وقت عزت کی طلب میں کربستہ ہو جاؤ اور چہیتے محبوب کی جدائی پر صبر کرو۔ یہاں تک کہ جب رات تاریکی کا پردہ ڈال دے اور رقیب کی آنکھ جھپک جائے تو اس وقت اپنی حسرتیں دل کھول کر نکال لو۔ کیونکہ رات عقلمند کا دن ہے۔"

(مجلہ جامعہ دہلی اگست ۱۹۷۱ء صفحہ ۹۱-۹۲)

باپ کی بیٹے کو خلوت میں کی گئی یہ نصیحت پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ باپ کھلے بندوں قابل اعتراض حرکات کو بھی صرف اس لئے ناپسند کرتا تھا کہ بیٹے کے مخالف یا دشمن ان حرکتوں سے خوش اور دوست غمگین ہوں گے۔ ورنہ رات کی خلوتوں میں سب کچھ روا ہے۔

منقولہ بالا عبارت پڑھ کر مجھے کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر براؤن مرحوم کے سفر ایران (غالباً ۱۸۸۹ء) کا ایک لطیفہ یاد آ گیا جو پروفیسر موصوف نے اپنے سفرنامہ میں نقل کیا ہے کہ ایک ایرانی قلندر نے حادثہ کربلا کے بارے میں کتنوں کو گناہ گار بنا بنا کر زمینی نامداروں سے لے کر زمین و آسمان کے تاجدار تک سب کو لپیٹ کر ایک ایک کی مورتی بنا کر توڑنا شروع کر دی تھی۔

بہرحال جو ہو چکا وہ ہو چکا۔ آج سوال یہ ہے کہ اب کیا کیا جائے۔ تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُم مَّا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ (۲ : ۱۳۴)

(بہرحال) یہ ایک امت تھی جو گزر چکی، نہ تو اس کی نیک عملی تمہاری بدعملیوں کا کفارہ ہو سکتی ہے نہ اس کی بدعملی کے لئے تم جواب دہ ہو گے، اس کے لئے وہ تھا جو اس نے اپنے عمل سے کمایا۔ تمہارے لئے وہ ہوگا جو تم اپنے عمل سے کماؤ گے۔ تم سے کچھ اس کی پوچھ گچھ نہیں ہو گی کہ آن لوگوں کے اعمال کیسے تھے۔ (ترجمان القرآن جلد ۱ طبع اول از مولانا آزاد)

اسی جذبہ کے زیر اثر کچھ عرصہ ہوا میں نے اپنے ایک عزیز و فاضل محترم دوست کے ملاحظہ کے لئے سطور ذیل لکھی تھیں۔ جنھیں موصوف نے اس بحث پر بہت ناکافی خیال فرمایا تھا (اور واقعہ بھی یہی ہے کہ نہ صرف یہ سطریں ناکافی ہیں بلکہ ساری بحثیں ناکافی ہیں) تاہم گذشتہ الجھنوں کو سلجھانے کا ایک پہلو یہ بھی ہے۔ شاید اس طریقہ سے غور کرنے سے کوئی صورت مل بیٹھنے کی ذہن میں آجائے۔ اگرچہ اس میں بھی کوئی ندرت نہیں۔

معروضات حسب ذیل ہیں:

۱۔ میرے نزدیک عصر حاضر کا پہلا تقاضہ یہ ہے کہ ہم مسلمان باہم یہ طے کرلیں کہ ماضی کے تاریخی، نیم تاریخی، سیاسی، خیالی، جذباتی، اصولی اور فروعی اختلافات کی لمبی فہرست کے ہوتے ہوئے ایک ایسی قدرِ مشترک تلاش کرلیں جس کی رو سے تمام کلمہ گو، قدیم و جدید، جماعتوں اور فرقوں کو خاندان اسلام کے اعضاء و جوارح اور ایک درخت ثمر ور ہی کی چھوٹی بڑی شاخیں ہیں۔ اور بجائے اس کے کہ ماضی کے حقیقی یا جذباتی تنازعات و اختلافات کو ہوا دی جائے اور ان پر حال کی ضروریات اور تقاضوں کو قربان کردیا جائے۔ فیصلہ یہ کیا جائے کہ ماضی جو اور جیسی کچھ بھی تھی اس کے ہوتے ہوئے آج ایسی صورت اختیار کی جائے جو ہمارے حال و استقبال کی ترقیات و تحفظات کی بنیاد قرار پاسکے، کیوں کہ ماضی ہمارے بس سے باہر ہے، حال میں سے ہم گزر رہے ہیں اور غیر یقینی اور غیر معین مستقبل ہمارے سامنے ہے۔ چاہیئے کہ قومی موت کا راستہ اختیار کرنے کی بجائے حقائق کی بنا پر حیاتِ ملی کی جوت جگائیں اور ایک روشن مستقبل کی طرف قدم بڑھائیں۔

اختلافات ہوتے ہوئے سب فرقوں نے صدیوں میں جو علمی سرمایہ جمع کیا ہے اسے بحیثیت کل اسلام کا سرمایہ مان کر اس میں سے حیات بخش عناصر کو تلاش کرنے اور ان کو کام میں لانے میں کسی قسم کی کوتاہی یا ہچکچاہٹ سے کام نہیں لینا چاہیئے۔ ہمیشہ یہ حقیقت پیش نظر رہے کہ سب اسلامی فرقے اسلام کا حصہ ہیں۔ سب کے علوم اسلام کے علوم ہیں۔

ہم سب کلمہ گو اسلام کے دامن سے وابستہ ہیں اور سب فرقوں کا علمی سرمایہ ہم سب کا مشترکہ سرمایہ ہے۔ اس مد میں سب کی روایات، تفاسیر، فقہ، اجتہادات، لغت، ادب، شعر، فلسفہ، فنونِ لطیفہ، تاریخ جمال و جلال وغیرہ سبھی کچھ آجاتا ہے۔ یہ ہماری کوتاہ نظری و بے خبری ہے، جو اس حقیقت کی طرف سے غافل ہیں۔ ورنہ حق یہ ہے کہ صدیوں کے جمع شدہ ان گنجہائے گرانمایہ میں علوم و معارف کے وہ جواہرات تابناک دبے پڑے ہیں جو ہماری آج کی ضروریات میں کافی و وافی طور پر مدد ہو سکتے ہیں۔ انشاء اللہ۔

۲۔ ہمیں اپنی اصطلاح "اہل کتاب" کی تعریف پر بھی نظرِ ثانی کرنی ہوگی۔ اب تک ہم عموماً صرف یہود و نصاریٰ ہی کو اہلِ کتاب خیال کرتے رہے ہیں۔ لیکن ہمارے بعض بلند نظر حقیقت شناس علمائے سلف نے قرآنِ حکیم کی ہدایت کی روشنی میں اس حقیقت پر زور دیا ہے کہ ہر زمانہ میں ہر ملک و قوم و زبان و زمان میں اُس ملک و قوم و زبان و زمان کے لوگوں کو رب العالمین کی طرف سے ہدایت ملتی رہی ہے۔ چاہئے کہ ہم بھی بے تکلف علی الاعلان تحریر و تقریر میں اس سچائی کا اقرار و اظہار کریں اور یہ اقرار و اظہار بھی پورے یقین کے ساتھ کہ تمام ملکوں اور قوموں کے مقدس صحیفے خدا کا پیغام ہیں اور ان ملکوں کی مقدس پیشوا شخصیتیں خدا کے کلام کی مخاطب رہی ہیں۔ اس طرح مسلّم کتابوں میں وید، گیتا، دھم پد اور مہاویر کے اقوال اور کنفیوشش کے فرمودات خدائی ارشادات اور حضرات رام و کرشن بدھ و مہاویر اور کنفیوشش و زرتشت وغیرہ وغیرہ قدیم اور عہد قریب میں باوا نانک الٰہی ازلی ابدی صداقتوں کے مبشر بزرگوار تھے، کیونکہ واقعہ یہ ہے کہ قرآن حکیم صداقت کا ہمیشہ مُصدِّق رہا ہے۔ ہاں قرآنِ حکیم خدائی کلام اور مدعیوں کے اوہام و اہوا کو دو الگ الگ چیزیں قرار دیتا ہے۔ ہم ہر زمانے کے کلام اللہ کے مصدق اور تمام زمانوں کے اوہام و اہوا سے بے تعلق و بے زار ہیں خواہ وہ کسی نام اور لباس میں ہمارے سامنے آئے ہوئے ہیں۔

اگر یہ حقیقت تسلیم کر لی جائے تو تمام اقوام و ملل کے علمی و روحانی ذخائر ہمارے

ہیں اور ہم اُن سے بے تکلف فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ کیونکہ ازلی ابدی صداقتیں، لفظوں، اصطلاحوں اور زبانوں کی اجنبیت و غرابت میں مستور رہیں۔ سچے جذبۂ شوق سے کام لے کر یہ پردہ اٹھائیے، عروس حقیقت آپ کے سامنے ہے۔

۳۔ قرآنِ حکیم کی ذیل کی تین آیتیں قابلِ غور ہیں:

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَىٰ وَالصَّابِئِينَ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝

(۲ : ۶۲)

(دراصل اس بارے میں خدا کا ٹھہرایا ہوا قانون تو یہ ہے کہ فلاح وسعادت ایمان وعمل سے حاصل ہوتی ہے نہ کہ نسل وخاندان یا مذہبی گروہ بندیوں سے) جو لوگ (پیغمبر اسلام) پر ایمان لا چکے ہیں۔ وہ لوگ ہوں۔ یا وہ لوگ ہوں جو یہودی ہیں، یا نصاریٰ اور صابی ہوں۔ (کوئی ہو اور کسی گروہ بندی میں سے ہو) لیکن جو کوئی خدا پر اور آخرت کے دن پر ایمان لایا۔ اور اس کے اعمال بھی اچھے ہوئے تو وہ اپنے ایمان وعمل کا اجر اپنے پروردگار سے ضرور پائے گا اس کیلئے نہ تو کسی طرح کا کھٹکا ہوگا۔ نہ کسی طرح کی غمگینی

(ترجمان القرآن جلد اول طبع اول)

۲) إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالصَّابِئُونَ وَالنَّصَارَىٰ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝

(۵ : ۶۹)

جو لوگ (قرآن پر) ایمان لائے ہیں۔ وہ ہوں یا وہ لوگ ہوں جو یہودی اور صابی اور نصاریٰ ہیں۔ کوئی ہو۔ لیکن (اصل دین یہ ہے کہ) جو کوئی اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھے گا۔ اور اچھے کام کرے گا تو اس کے لئے تو کسی طرح کا اندیشہ ہے۔ نہ کسی طرح کی غمگینی ۔ (ترجمان القرآن جلد اول طبع اول)۔

(۳) اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِـِٕيْنَ وَالنَّصٰرٰى وَالْمَجُوْسَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا ۖ اِنَّ اللّٰهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝ (۲۲ : ۱۷)

جو لوگ ایمان لائے (یعنی مسلمان)، جو یہودی ہیں، جو صابی ہیں، جو نصاریٰ ہیں، جو مجوسی ہیں، جو مشرک ہیں، قیامت کے دن ان سب کے درمیان اللہ فیصلہ کر دے گا اور ان کے اعمال کی حقیقت ظاہر ہو جائے گی) اللہ سے کوئی بات چھپی نہیں۔ وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ (ترجمان القرآن جلد دوم طبع ا)

منقولہ بالا پہلی دو آیتوں میں مختلف جماعتوں اور گروہوں کے نام لے کر ان سب سے صرف تین چیزوں کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ اللہ اور یوم آخر پر ایمان ویقین کے مطابق اعمال وافعال و کردار۔ جس کا بھی ایمان ویقین، اس کے اعمال خیر پر منتج ہوتا ہے وہی فلاح وامان یافتہ ہے اور وہی حق کا مظہر و نمونہ ہے۔

تیسری آیت میں مجوس (جو اہل کتاب ہیں) اور مشرکین کو بھی اسی مد میں داخل کیا گیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ مذکورہ چند ناموں میں ہی یہ صداقت محدود و مستور نہیں بلکہ وہ اعمالِ صالح اور کردارِ نیک میں تلاش کرنے کی چیز ہے، یہ صداقت درحقیقت جہاں بھی ہو اور جس رنگ او لباس میں بھی۔ غرض بتایا یہ گیا ہے کہ افراد و اقوام کے اعمال کے نتائج سے ان کی قسمت کا آخری فیصلہ ہوگا۔ نہ کہ صرف نسلی یا مذہبی نسبتوں کی بنا پر۔

میرے نزدیک چاہا یہ گیا ہے کہ انسان کسی قسم کا لباس پہن لے اور کوئی سا نام بھی اختیار کر لے اور کسی بھی جماعت سے منسلک ہو جائے، مقصد زندگی کا حصول یقین محکم اور اسی کے مطابق عمل پُرخلوص ویقین پر منحصر ہے کیونکہ نتیجہ ناموں سے نہیں کاموں کے مطابق برآمد ہوگا۔ اِس لئے ضروری ہے کہ لوگوں کو محض ان کے ناموں سے نہیں ان کے اعمال و کردار سے جانچا، ناپا اور تولا جائے، اور اسی کے مطابق ان کی قدر و قیمت متعین ہونی چاہئے۔

اگر میں اس بات کو صحیح سمجھا ہوں تو تمام مذاہب، تمام اقوام کے تمام علوم و معارف ہمارے ہیں۔ اگر ہم ان سے استفادہ کریں تو ہمارا یہ عمل غیروں کے ہاں کی بھیک اور صدقہ نہیں بلکہ ایسا ہی ہے جیسے ایک بھائی دوسرے بھائی کے گھر سے بے تکلف کھا پی سکتا ہے۔ یہ خیال بھی مختلف قوموں میں سے نفرت و بیگانگی کے دور کرنے میں بہت کچھ ممد و معاون ہو سکتا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ کوئی شخص یا جماعت اپنی ممتاز ہستی کی انفرادیت کو دوسروں میں مدغم کر دے، بلکہ اس کے صرف یہ معنی ہیں کہ جس طرح خاندان کے افراد کے مختلف ناموں کے باوجود خاندان ایک ہی رہتا ہے، اسی طرح جماعتی مختلف ناموں کے باوجود ہم بخوشی ایک دوسرے سے محاسن کا لین دین کر سکتے ہیں اور ہماری انفرادیت پر مطلق آنچ نہیں آ سکتی۔

۴۔ کہا جاتا ہے۔ ہماری تاریخ آدم سے شروع ہوتی ہے، اس لیے نسل آدم کی تمام شاخوں کے علوم و معارف ہمارے ہیں۔ مگر "مسلم" کہلانے کے لحاظ سے ہماری تاریخ ۱۴ صدیوں سے شروع ہوتی ہے۔ ہم نے ۱۴ سو برس میں علمی و عملی طور پر جو کچھ کمایا ہے اس کا تذکرہ کتابوں کی "قبروں" میں مدفون ہے۔ انسانی برادری کے مشرقی و مغربی خاندانوں نے زمین و آسمان کی آخری حدوں کو چھو لینے کے ارادے سے چاند تاروں کو اپنی جولانگاہ بنا لیا ہے۔ اور ہم ہیں کہ لفظوں کی صنعت گری میں گم ہیں۔ وہ لفظوں کے "خول" سے "معانی" نکال کر عالم کائنات کے نقشے بدل رہے ہیں، ان کی تلاش و جستجو سے جو مسائل پیدا ہو رہے ہیں وہ ہمیں غور و فکر، تقابل و توازن پر مجبور کر رہے ہیں۔ یہ موقع شک و شبہ کا نہیں، فخر و افتخار کا ہے کہ آدم خاکی "نے امکانات کی وسعتوں کو کس طرح حقیقت آشنا یا حقیقت نما یا مرئی حقیقت بنا دیا ہے۔ اگر اس حقیقت میں اور ہمارے مظنونات میں تصادم و تخالف نظر آتا ہو تو ہمیں فکر تحقیق کی نظر سے کام لے کر اپنے خیالات میں تبدیلی پیدا کرنی چاہیئے۔ یا عملاً دکھا دینا چاہیئے کہ دوسروں کی حقیقت، حقیقت نہیں محض "نظر بندی" ہے، ورنہ یہ حقیقت یوں ہے اور

یہ ہے جو ہم دنیا کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔

ان تمام باتوں کے پیش نظر ہمیں چوکس ہونا ہوگا، بیدار ہونا ہوگا، اپنے گھر کے کونے کونے کو دیکھنا ہوگا، اپنے علوم و اخبار کا جائزہ لینا ہوگا، خیالات و اعتقادات و عملیات میں اصلیت اور حشو و زوائد کی جانچ کے بعد کی پیشی کرنی ہوگی یا قدیم تاویلات و تعبیرات سے کام لینا ہوگا، تاکہ ہم بھی "آسمان پرواز" اور "فلک پیا" دنیا کے ساتھ پرواز کر سکیں۔

ہم توحید کے ماننے والے ہیں۔ خدا ایک، دین یعنی صداقت ایک، آدم زاد ایک، حقیقت ایک، سب کے علوم ایک، سب کا دکھ درد ایک، سب کی بھلائی میں سبھوں کی بھلائی، سبھوں کے نقصان میں سب کا نقصان۔

یہ بحث و مباحثے ایک طرف، دوسری طرف مشرقی بنگال میں آئی ہوئی قیامت پر نظر ڈالئے۔ لاکھوں معصوم بچے، عورتیں اور بوڑھے بیحیائی قاہریت کی آگ میں بھسم ہو گئے اور لاکھوں وطن سے بے وطن اور گھر سے بے گھر ہو گئے۔ جن صاحب دل انسانوں کو خدا نے توفیق دی ہے وہ بلا امتیاز دین دھرم اور ذات پات تمام مصیبت زدوں کی مدد کے لئے پورب پچھم سے دوڑ پڑے ہیں۔ دکھ کی بات ہے کہ ایسے عبرتناک دور میں ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنا انسانی فریضہ بجا لانے والوں کا ہاتھ بٹانے کی بجائے دور بیٹھے، بلاکشوں کی ذات پات اور دین دھرم کے نام پر مصائب کو جائز بتلانے ہی میں اپنی ہمت صرف کر رہے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون:

بنی آدم اعضائے یک دیگرند   کہ در آفرینش زیک جوہرند
چو عضوی بدرد آورد روزگار   دگر عضوہا را نماند قرار
تو کز محنتِ دیگراں بے غمی   نشاید کہ نامت نہند آدمی

عبداللطیف اعظمی

کوائف جامعہ

ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کا قیام

مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین کی پہلی برسی، جب مئی ۱۹۷۰ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ میں منائی گئی تھی، تو وزیر تعلیم ڈاکٹر راؤ نے اس میں شرکت کی تھی اور اپنی تقریر میں ذاکر صاحب کی منجملہ اور یادگاروں کے یہ بھی اعلان فرمایا تھا کہ جامعہ ملیہ میں اسلامی علوم کے مطالعہ کے لئے ایک ادارہ قائم کیا جائے گا جو مرحوم کے نام سے منسوب ہوگا۔ اس کے بعد وزارت تعلیم نے لکھا کہ مجوزہ انسٹی ٹیوٹ کے لئے حکومت تین لاکھ کی رقم بنک میں جمع کر دے گی اور جب تک کوئی اور امداد نہ ملے اسی کے نفع سے انسٹی ٹیوٹ کے اخراجات پورے کئے جائیں گے۔ اس سال جولائی کے آخر میں تین لاکھ کی موعودہ رقم موصول ہو گئی اور بنک میں جمع کر دی گئی ہے۔ نیز مجلس منتظمہ منعقدہ ۲ ستمبر نے ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کا قیام منظور کر لیا ہے اور پروفیسر محمد مجیب صاحب کو اس کا اعزازی ڈائرکٹر مقرر کیا ہے۔ انسٹی ٹیوٹ کے مقاصد حسب ذیل ہیں:

"علوم اسلامیہ اور تصوف کی اقدار عالیہ کی اشاعت اور سچی مذہبی زندگی، سچی تعلیم اور اچھی شخصی و سماجی زندگی کے بارے میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کا جو تصور تھا، اس کی روشنی میں علمی تصانیف، علاقائی اور مقامی مشترک ہندی اسلامی تہذیب کے نمونوں کا مطالعہ، سیمیناروں اور کانفرنسوں وغیرہ کے ذریعہ دینی اور اخلاقی تعلیمات کو زندگی میں رہنمائی اور حوصلہ افزائی کا وسیلہ بنانا۔ تصوف کی مستند کتابوں کی اشاعت کرنا، ان

کے ترجمے کرانا اور ایسے دوسرے کام کرانا جن سے ان مقاصد کو فروغ ملے۔"

اس انسٹی ٹیوٹ کی ایک مجلس مشاورت مقرر ہوئی ہے، جس کے اراکین حسب ذیل ہیں:

صدر : پروفیسر محمد مجیب

اراکین : مولانا سعید احمد اکبرآبادی، پروفیسر خلیق احمد نظامی، پروفیسر اے ایم خسرو، پروفیسر ایچ سی گنگولی، ڈاکٹر سلامت اللہ اور جناب ضیاء الحسن فاروقی۔

اس وقت جناب رشید الوحیدی صاحب احیاء العلوم کا اردو میں ترجمہ اور تلخیص کر رہے ہیں، جس کا انگریزی میں بھی ترجمہ شائع کرنے کا ارادہ ہے۔ ترجمے اور تصنیف کی ایک مکمل اسکیم تیار ہو رہی ہے جو امداد کے لئے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن بھیجی جائے گی۔

ڈاکٹر ذاکر حسین کی سوانح حیات

ذاکر حسین میموریل کمیٹی نے پروفیسر محمد مجیب صاحب سے مرحوم کی مکمل سوانح حیات لکھنے کی فرمائش کی تھی۔ یہ کام رفتہ رفتہ فروری ۷۰ء سے شروع ہوا اور اب خدا کا شکر ہے کہ پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا، چنانچہ ۸ ستمبر کو کتاب کا مسودہ نیشنل بک ٹرسٹ کے حوالہ کر دیا گیا ہے، جس کے اہتمام میں یہ کتاب شائع ہوگی۔ پیش لفظ کے علاوہ اس کتاب کے نو ۹ ابواب ہیں، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ خاندان اور ابتدائی حالات
۲۔ تیاری کا زمانہ
۳۔ جامعہ ملیہ کی تعمیر
۴۔ تعلیمی تصورات اور تعلیم کا نصب العین
۵۔ بنیادی تعلیم کی مہم

۶۔ تقسیم ہند کا پیش خیمہ
۷۔ نئی شراب پرانے ساغر
۸۔ وقفہ
۹۔ تصور وطن کی تشکیل :
(الف) بہار کے گورنر
(ب) نائب صدر جمہوریۂ ہند
(ج) صدر جمہوریہ ہند

ذاکر حسین یادگار کا سنگ بنیاد

راشٹرپتی جناب وی وی گری، یکم اکتوبر کو مرحوم ذاکر حسین صاحب کی یادگار کا سنگ بنیاد رکھیں گے۔ اس تقریب کا پروگرام حسب ذیل ہے :

۱۔ تلاوت قرآن حکیم
۲۔ تقریر شیخ الجامعہ، پروفیسر محمد مجیب صاحب
۳۔ تقریر وزیر تعلیم
۴۔ تقریر وزیر اعظم
۵۔ صدر جمہوریہ سنگ بنیاد رکھیں گے اور اس کے بعد تقریر فرمائیں گے۔

حسب قاعدہ راشٹرپتی کی آمد کے وقت اور تقریب کے اختتام پر قومی ترانہ ہوگا۔
یہ تقریب حکومت ہند کی مقرر کردہ ذاکر حسین میموریل کمیٹی کے اہتمام میں کی جارہی ہے۔

اردو کی تعلیم خط و کتابت کے ذریعہ

اردو کی ترویج و اشاعت کے لیے، کافی عرصہ ہوا، جامعہ نے دہلی کے مختلف علاقوں

میں، خاص طور پر جہاں شرنارتھیوں کی آبادی ہے، اردو کے کتب خانے قائم کیے تھے، جو بہت مقبول ہوئے اور اب تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ اب جامعہ نے خط و کتابت کے ذریعہ ہندی اور انگریزی کے ذریعہ اردو کی تعلیم کے لیے ایک اسکیم بنائی ہے اور تجربے کے طور پر کام شروع ہوگیا ہے۔ ہندی کے ذریعہ اردو پڑھانے کا پرائمر جناب عبدالغفار مدہولی صاحب نے تیار کیا ہے، مئی جون میں چھپ گیا تھا اور انگریزی کے ذریعہ اردو پڑھانے کی کتاب جناب محمد ذاکر صاحب نے لکھی ہے جو اس وقت پریس میں ہے۔ اس شعبے کو چلانے کے لئے شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب کی صدارت میں ایک کمیٹی بنا دی گئی ہے جس کے ناظم عبدالغفار مدہولی صاحب اور عبداللہ ولی بخش قادری (لکچرر استادوں کا مدرسہ) اور محمد ذاکر صاحب (لکچرر جامعہ کالج) اس کے رکن ہیں۔ اب تک جن لوگوں نے اردو سیکھنے کے لیے اپنے نام رجسٹر کرائے ہیں ان کی تعداد نو سو سے اوپر پہنچ گئی ہے اور اس میں ہر علاقے اور ہر قوم کے لوگ شامل ہیں۔ اس اسکیم کو کس قدر پسند کیا جا رہا ہے، اس کا اندازہ کرنے کے لیے متعدد خطوط میں سے ایک خط ذیل میں شائع کیا جا رہا ہے:

مکرمی تسلیم

مجھے آپ کو یہ اطلاع دیتے ہوئے انتہائی خوشی ہے کہ آپ کی تجویز کردہ کتاب کے ذریعہ میں نے گیارہ صفحے بیس دن میں خود کوشش کر کے اور اب بیسویں صفحہ کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ اس سے قبل بذریعہ خط آپ کو مطلع نہ کر سکا اس کی معذرت چاہتا ہوں۔ پچیسواں صفحہ ختم کرنے کے بعد آپ کو دوسرا خط لکھوں گا۔

حقیقت میں مجھے یہ کہتے ہوئے ذرا بھی تامل نہیں ہے، اور میرا یہ کہنا مناسب ہوگا کہ "رہنمائے ہندی دوارا اردو" نام کی کتاب ہندی کے ذریعہ آسان طریقے سے اردو سکھانے کی ایک بے مثل، غیر معمولی شاہکار کتاب ہے۔ اسباق کا سلسلہ بہت ہی اچھا ہے۔

ہندی داں لوگوں کو اردو زبان سکھا کر آپ کی یونیورسٹی ان پر احسان ہی نہیں بلکہ بہت بڑا سلوک کر رہی ہے۔ بنگلہ زبان کو چھوڑ کر ہندوستانی علاقائی زبانوں میں اردو زبان سب سے اعلیٰ اور سلجھی ہوئی زبان ہے۔ اور ان زبانوں میں اپنا ایک اہم مقام رکھتی ہے۔ ہندوستان سے اردو جیسی خوبصورت زبان ختم ہوتی جا رہی ہے۔ آپ کی درسگاہ اس زبان کی مفت تعلیم دے کر اُسے ایک نئی زندگی بخش رہی ہے۔

ویسے تو مجھے اسباق کو سیکھنے میں کوئی دشواری یا مشکل پیش نہیں آئی اگر کوئی مشکل پیش آئی تو آپ کے تعاون کا پورا یقین ہے۔

آخر میں آپ سے عرض کرتا ہوں کہ میرے پاس میرا داخلہ نمبر (یونیورسٹی میں اردو زبان کے طالب علم کی حیثیت سے) نہیں آیا ہے براہ کرم واپسی ڈاک میرا رول نمبر بھجوا دیں تاکہ آئندہ میں اپنے خطوط میں رول نمبر کا حوالہ دے سکوں۔

نیاز مند

چمن لال۔ سی آر سیکشن

پی اینڈ ٹی بورڈ

ڈاک تار بھون

پارلیمنٹ اسٹریٹ۔ نئی دلّی ۱

معیاری ادب شائع کردہ مکتبہ جامعہ

(۳)

دیوان درد

از خواجہ میر درد دہلوی
مرتب: رشید حسن خاں

معیاری ادب ۱۳، حجم ۷۰ صفحات، قیمت ۲/۷۵، لائبریری اڈیشن ۳/۴۰،
تاریخ اشاعت: جنوری ۱۹۷۱ء۔

کتاب کے تعارف میں فاضل مرتب نے اس مجموعۂ کلام اور درد کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

"درد کا مجموعۂ کلام مختصر سا ہے، ان کے ہم عصروں کے مقابلے میں تو مختصر ترین۔ اس میں ایسے شعر بھی ہیں جن میں تصوف کے مضامین نظم ہوئے ہیں لیکن تصوف کے مضامین میر صاحب کے یہاں بھی مل جائیں گے۔ میر کے ضخیم کلیات میں سے خالص متصوفانہ شعر کم از کم اتنے ہی بہ آسانی منتخب کیے جا سکتے ہیں جتنے درد کے یہاں ہیں اور میر کو صوفی شاعر شاید ہی کسی نے کہا ہو۔ اس سلسلے کی ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ درد کے خالص متصوفانہ اشعار میں، یعنی اُن شعروں میں جن میں تصوف کی اصطلاحیں نظم ہوئی ہیں، وہ بات نہیں جو اُن کے دوسرے اشعار میں پائی جاتی ہے۔ ایسے شعروں میں شعریت کم ہے اور بعض جگہ کم تر۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ایسے اشعار درد کے نمائندہ اشعار نہیں ہیں۔ یہ اردو غزل کے بھی نمائندہ یا منتخب شعر نہیں۔"

میں نے مذکورہ بالا اقتباس صرف "دیوانِ دردؔ" کے تعارف کے لیے نقل کیا تھا، مگر نقل کرنے کے بعد محسوس کیا کہ اس میں ایک نزاعی بات آگئی ہے۔ خواجہ دردؔ کے بارے میں میں نے جس قدر پڑھا ہے، اس میں ان کی صوفیانہ شاعری پر زور دیا گیا ہے اور عام طور پر ان کا ایک صوفی شاعر ہی کی حیثیت سے ذکر آیا ہے، مگر زیرِ تبصرہ دیوانِ دردؔ کے فاضل مرتب فرماتے ہیں کہ دردؔ کے خالص متصوفانہ اشعار نہ تو خود ان کے نمائندہ اشعار ہیں اور نہ اردو غزل ہی کے۔ اس سلسلے میں میری اپنی کوئی ذاتی رائے نہیں ہے، بعض دوسرے ادیبوں کی رائیں پیش کرتا ہوں۔ ڈاکٹر وحید اختر صاحب (استاد مسلم یونیورسٹی) نے دردؔ پر کام کیا ہے۔ وہ اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

"وہ (یعنی دردؔ) صوفی ہیں اور اُن کے اشعار میں عشق کی وہ کیفیت ملتی ہے جو عشق حقیقی سے آداب اظہار مدعا سیکھ کر حضورِ حُسن گستاخ نہیں ہوتی..... وہ غزل میں خالص حسن و عشق کے شاعر ہیں، میں اسے ان کے تصوف ہی کا فیضان سمجھتا ہوں[1]۔"

ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی صاحب (استاد دلی یونیورسٹی) نے بھی دیوانِ دردؔ مرتب کیا ہے، جو ۱۹۶۱ء میں علی گڑھ سے شائع ہوا ہے، انھوں نے اس دیوان کے دیباچے میں لکھا ہے کہ "ان کی شاعری بیشتر غزل اور صوفیانہ غزل تک محدود ہے، جس میں خیالات کی پاکیزگی اور جذبات کا خلوص قدم قدم پر ملتا ہے[2]۔" ایک اور جگہ لکھتے ہیں: "ان کی شاعری اور زندگی دونوں میں جمال اور پاکیزگی کا ایک لطیف احساس ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ صوفی شاعر کے علاوہ اور کچھ نہ بن سکے[3]۔" دردؔ کی شاعری پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "ان کے کلام کا مطالعہ کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ صوفیانہ افکار ان کی روح میں رچ بس گئے ہیں[4]۔"

---

[1] جامعہ بابت ماہ اکتوبر ۱۹۶۱ء صفحہ ۲۴۳

[2] صفحہ ۵ [3] حیات صفحہ ۱

جو کچھ کہتے ہیں اس کا انداز شخصی ہے روایتی نہیں، پھر انداز بیان اس قدر صاف اور دل آویز ہے کہ طبیعت وجد کرنے لگتی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں[۱]:

دونوں جہاں کو روشن کرتا ہے نور تیرا — اعیان ہیں مظاہر ظاہر ظہور تیرا

ہے جلوہ گاہ تیرا کیا غیب کیا شہادت — یاں بھی شہود تیرا واں بھی حضور تیرا

جناب عبدالباری صاحب آسی نے بھی دیوان درد مرتب کیا ہے، جو پاکستان سے ۱۹۵۱ء میں شائع ہوا ہے۔ موصوف اس کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

"قدما کے کلام میں جا بجا تصوف کی چاشنی موجود ہے۔ میر، مصحفی، سودا، سوز کم وبیش سب کے یہاں یہ رنگ پایا جاتا ہے، مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ جن کو قدرتاً اس سے کوئی لگاؤ نہیں، ان کے یہاں ویسا ہی نقل اور اصل کا فرق بھی دکھائی دیتا ہو.. مگر خواجہ صاحب کی شاعری اس تلون سے بالکل پاک اور بے لوث ہے۔ ہر غزل میں یکسانیت اور ہمواری ویسی ہی ہے جیسی ہونی چاہیے۔ اکثر اشعار میں تصوف کے ایسے ایسے نازک مسائل اس طرح واضح کر کے بیان کیے ہیں کہ قال میں حال کا جلوہ نظر آتا ہے۔ بہت سے شعر عاشقانہ درد و اثر سے لبریز ہیں اور آج تک سننے والوں کے دلوں میں برشتگی پیدا کرتے ہیں[۲]۔"

جناب عبدالمنان بیدل عظیم آبادی نے لکھا ہے کہ میر کے کلام میں تصوف کے جو اثرات ملتے ہیں وہ خواجہ درد کی دین ہے۔ ملاحظہ ہو:

"بعض عارفین نکتہ رس کا یہ خیال ہے کہ میر کے کلام میں جو تصوف کی چاشنی ہے وہ خواجہ صاحب ہی کی صحبت اور توجہ کا فیض ہے۔" بعض تذکرہ نویسوں کا یہ لکھنا کہ "تصوف کو ان سے بہتر کسی نے نہیں کہا" بالکل صحیح ہے۔ رموز معرفت اور حقائق

---

[۱] شاعری صفحہ ۱۹ [۲] دیوان اردو خواجہ میر درد صفحہ و

تصوف کو اس خوبصورتی اور پاکیزگی سے بیان کرجاتے ہیں کہ دلوں پر ایک روحانی کیفیت طاری ہوجاتی ہے اور ایمان تازہ ہوجاتا ہے۔"

"صاحب گل رعنا کا خیال ہے کہ تصوف کے اعتبار سے ان (خواجہ دردؔ) کا کلام میرؔ اور مرزاؔ کے کلام سے زیادہ دل آویز ہے[1]۔"

"دیوانِ درد" کے متعدد اڈیشن مرتب اور شائع ہوئے ہیں اور ان میں سے دو اڈیشن اِس وقت میرے سامنے بھی ہیں، جن کے اوپر حوالے دئے گئے ہیں، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اِن کے مقابلے میں جامعہ کا یہ اڈیشن طباعت اور گٹ اپ کے لحاظ سے بہت بہتر ہے۔ معنوی لحاظ سے ایک خاص خوبی یہ ہے کہ آخر میں مشکل اور غریب الفاظ کی ایک فرہنگ دیدی گئی ہے، جس کی بہرحال بہت ضرورت تھی اور اس کتاب کے مرتب رشید حسن خاں اس کے لیے بہت موزوں ہیں، الفاظ کے معانی اور ان کے محل استعمال پر ان کی نظر ہے۔ اس سے پہلے وہ کئی قدیم کتابوں کی فرہنگیں مرتب کرچکے ہیں، مگر یہ کام جس قدر مشکل اور دقت طلب ہے اس لحاظ سے شاید وہ "دیوانِ درد" کی فرہنگ کے لیے وقت اور توجہ نہیں دے سکے۔ میرا خیال ہے کہ جب کسی مخصوص کتاب کی فرہنگ تیار کرنی ہو تو سب سے پہلے وہ معنے درج کرنے چاہئیں جو اس کتاب میں استعمال ہوئے ہیں۔ اس کے بعد اگر گنجائش ہو تو دوسرے معنے بھی دئے جاسکتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو مایوسی ہوتی ہے۔ غور سے دیکھنے کے بعد محسوس کچھ ایسا ہوتا ہے کہ کسی لغت سے مختلف معانی درج کردئے گئے ہیں، قطعِ نظر اس کے کہ "دیوانِ درد" میں کوئی لفظ کس معنے میں استعمال ہوا ہے۔ نقل کرتے وقت بھی پوری احتیاط سے کام نہیں لیا گیا ہے، بسا اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ لفظ کوئی اور ہے اور معنے کسی اور لفظ کے نقل کردئے گئے ہیں۔

---

[1] اشعارِ میر (مطبوعہ ۱۹۳۵ء) صفحہ ۴۹

چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔ اس فرہنگ میں "اضطرار" کے معنے درج ہیں: "کسی کو یہاں تک مجبور کرنا کہ وہ ناچار اختیار کرلے۔ مجازاً: بے اختیاری" غالباً نور اللغات سے یہ معنے نقل کئے گئے ہیں، کیونکہ اس میں لفظ بہ لفظ یہی لکھے ہوئے ہیں سوائے اس کے کہ اس میں "چارنا چار" لکھا ہوا ہے اور یہی صحیح ہے۔ اب خواجہ دردؔ کے وہ اشعار ملاحظہ ہوں جن میں "اضطرار" استعمال ہوا ہے:

نہ برق ہیں، نہ شرر ہم، نہ شعلہ، نے سیماب
وہ کچھ ہیں پر، کہ سدا اضطرار رکھتے ہیں — صفحہ ۸۴

عاشق ہے اور اضطرار کرنا
یک جا نہ کہیں قرار کرنا — صفحہ ۱۳۶

نور اللغات ہی میں یہ بھی درج ہے: "لیکن شعراء اضطرار اور مضطر کو اضطراب اور مضطرب کی جگہ بھی استعمال کرتے ہیں۔ رشکؔ

ہے اے کرم شعار اپنے کئے سے شرمسار
تجھ سے مٹے گا اضطرار تیرے گناہ گار کا

میرا خیال ہے کہ خواجہ دردؔ کے مذکورہ بالا دونوں شعروں میں "اضطرار" اضطراب کے معنی میں استعمال ہوا ہے جو فرہنگ میں درج نہیں ہے۔ دوسرا لفظ لیجئے۔ "دیوان درد" کی فرہنگ میں "نخل ماتم" کے معنے لکھے ہیں: "ایک طرح کی آرائش (پھولوں کی ٹہنیاں وغیرہ لگانا) جو مردوں کے تابوت پر کی جاتی ہے۔ پہلے یہ طریقہ ایران میں رائج تھا، ہندوستان میں (ہندوؤں میں) بوڑھے آدمی کی ارتھی کو اس طرح سجایا جاتا ہے۔" "فرہنگ آصفیہ" میں تھوڑے بہت فرق کے ساتھ تقریباً ان ہی الفاظ میں یہ معنے "نخل تابوت" کے دئے ہوئے ہیں۔ شاید "نخل ماتم" کے بجائے "نخل تابوت" کے معنے درج کرنے کی وجہ یہ ہوگی کہ فرہنگ آصفیہ میں "نخل ماتم" کے سامنے لکھا ہوا ہے کہ "دیکھو نخل تابوت"۔ لیکن اگر فاضل مرتب نور اللغات کو دیکھتے تو اس میں "نخل ماتم" کے معنے "بیری" دئے ہوئے ہیں اور سند میں صباؔ کا حسب ذیل شعر پیش کیا گیا ہے:

ہائے وہ خوش قدم پئے گلگشت اب نہیں آتا
نخلِ ماتم ہے ہر اک سروِ گلستاں آج کل

اب خواجہ درد کا وہ شعر ملاحظہ فرمائیے جس میں "نخلِ ماتم" استعمال ہوا ہے اور فیصلہ فرمائیے کہ اس لفظ کے کیا معنے ہیں

اپنے نزدیک، باغ میں تجھ بن جو شجر ہے سو نخلِ ماتم ہے صفحہ ۹۰

اس فرہنگ میں سب سے زیادہ دلچسپ اور افسوسناک غلطی وہ ہے جو لفظ "الٰہی" کے معنے نقل کرتے وقت کی گئی ہے۔ فرہنگ میں اس کے معنے لکھے ہوئے ہیں: "وہ علم جس میں ایسے امور سے بحث ہو جو وجودِ خارجی و ذہنی میں مادّے کی محتاج نہ ہوں" (۹) یہ معنے لفظ الٰہیات کے ہیں، شاید نقل کرنے میں یہ غلطی ہو گئی ہے۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ شاید لغات سے معنے نقل کرنے کا کام کسی ایسے طالب علم نے کیا ہے جس کی واقفیت بہت سطحی تھی اور فاضل مرتب اس کو دیکھنے کے لیے وقت نہ نکال سکے۔

اسی طرح بعض اور الفاظ ہیں جن کے معنے محلِ نظر ہیں، مثلاً فرہنگ میں لکھا ہے "رجا کے معنی امید اور خوف دونوں ہیں"۔ بیشک نور اللغات میں یہی لکھا ہے، مگر اس نے کوئی سند نہیں پیش کی ہے اور جب تک کوئی سند نہ ہو اس کے ماننے میں مجھے تامل ہے۔

"مورد" کے تلفظ کے بارے میں مجھے فاضل مرتب سے اختلاف ہے۔ عربی میں بیشک مَورِد (بہ فتح اول و بہ کسرہ سوم) ہے، مگر میرے خیال میں اردو میں عام طور پر مُورد (بہ ضمہ اول) مروج و مستعمل ہے اور فاضل مرتب میری طرح ان لوگوں میں سے ہیں جو معنے اور تلفظ کے معاملے میں اسی کو صحیح سمجھتے ہیں جو اردو میں مروج اور مستعمل ہے۔

"مانند" اردو میں مذکر اور مونث دونوں مستعمل ہے۔ پرانی کتابوں میں عام طور پر مذکر مستعمل ہے۔ غالباً اسی لحاظ سے خواجہ درد کے اشعار میں جہاں جہاں یہ لفظ آیا ہے — اور متعدد جگہوں پر آیا ہے — مذکر لکھا گیا ہے۔ مگر نہ جانے کیوں فرہنگ میں ایک جگہ

مذکر درج ہے اور دوسری جگہ مونث ۔ ملاحظہ ہو :

"تشبیہ : ایک چیز کو دوسری چیز کے مانند ٹھہرانا" (صفحہ ۱۵۲)

"شمسہ : ... حلقے جو تسبیح میں ہر ثلث پر خوبصورتی اور شمار کے واسطے پھندے کی مانند ڈال دیتے ہیں۔" (صفحہ ۱۵۹)

رشید حسن خاں صاحب ان چند لوگوں میں سے ہیں جو اردو کے املا میں کچھ اصلاحات کرنا چاہتے ہیں۔ اگرچہ ان کی اصلاحات سے ان لوگوں کو بھی اختلاف ہے جو ان ہی کی طرح املا کے بارے میں مخصوص رائیں رکھتے ہیں مثلاً مالک رام صاحب، لیکن یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ جہاں رشید حسن خاں صاحب بعض انقلابی اصلاحات کرنا چاہتے ہیں، وہاں "دیوان درد" میں "معنے" کا املا وہی ہے جو عام طور پر مروج ہے یعنی یائے معروف کے ساتھ، حالانکہ روزمرہ اور محاورے کے لحاظ سے اس کا تلفظ یائے مجہول ہے یعنی معنے نہ کہ معنی۔

معیاری ادب کے سلسلے کی صرف انھیں کتابوں پر میں نے تبصرہ کیا ہے، جو قدیم اور پرانی نہیں ہیں، بلکہ اسی سلسلے کے لئے مرتب کی گئی ہیں۔ ظاہر ہے شبلی، حالی، محمد حسین آزاد، سرشار، شرر اور رسوا کی تصنیفات پر تبصرہ کرنے کی میں جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ مگر ان کتابوں کے "حرف آغاز" میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ "۔ صحت املا کا بھی بہ طور خاص لحاظ رکھا جائے گا" نیز چونکہ ان کتابوں کی ترتیب و نگرانی کے لیے ایک مجلس ادارت قائم کی گئی ہے، جس میں اردو کے مشہور نقاد، ادیب اور مصنف شامل ہیں، اس لیے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

ا۔ صحت املا کے سلسلے میں پہلا سوال میرے ذہن میں یہ پیدا ہوا کہ اس کا مطلب کیا ہے؟ ظاہر ہے اس کا یہ مطلب نہیں ہوگا کہ پہلے کی چھپی ہوئی کتابوں میں املا کی غلطیاں ہیں، جیسے ص کی جگہ س ہو یا ث کی جگہ س یا ص ہو یا ظ کے بجائے ض یا ص کے بجائے ظ ہو وغیرہ۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں اس دعوے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ

بہت ہی قدیم زمانے میں، مثلاً خواجہ دردؔ کے زمانے میں جو طرز املا رائج تھا، اس میں موجودہ زمانے میں کافی تبدیلی آگئی ہے۔ معیاری ادب کے اس سلسلے میں موجودہ طرز املا کو اختیار کیا جائے گا، دوسرا یہ کہ بعض اہل نظر اردو کے مروجہ طرز املا میں اصلاح کی ضرورت سمجھتے ہیں۔ مثلاً بعض لوگوں کا خیال ہے کہ "اعلیٰ" کو "اعلا" لکھنا چاہیے۔ "گذرنا" ذ کے بجائے ز سے لکھا جائے (گزرنا) وغیرہ۔ معیاری ادب کی مجلس ادارت ان کے بارے میں کوئی فیصلہ کرے گی اور اس کے مطابق عمل کیا جائے گا۔

میں نے اس سلسلے کی تمام کتابوں کو بغور دیکھا ہے اور مجھے افسوس کے ساتھ عرض کرنا پڑتا ہے کہ ان میں املا کی یکسانیت نہیں ہے۔ مثلاً کہیں اعلیٰ ہے کہیں اعلا، کہیں علاحدہ ہے کہیں علیٰحدہ، کہیں کیونکے ہے کہیں کیونکہ۔ پر لطف بات یہ ہے کہ ایک صفحے پر "کارگزاریوں" ہے اور اس کے مقابل صفحے پر "کارگذاریوں"[1] مالک رام صاحب اور رشید حسن خاں صاحب اصلاح املا کے بارے میں خاص رائیں رکھتے ہیں، ان کی مرتبہ کتابوں میں یہ اصلاحات موجود ہیں، مگر دوسری کتابوں میں عام طور پر مروجہ طریقے پر عمل کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ سے ایک تو صحت املا کا دعویٰ غلط ہو گیا دوسرے اس مجلس ادارت سے، جس میں اہم شخصیتیں شامل ہیں، جو فائدہ پہنچ سکتا تھا وہ نہیں پہنچ سکا۔ اصلاح کا یہ مسئلہ متنازع فیہ ہے، اس لیے املا میں جو تبدیلی بھی اختیار کی جاتی، اس کے بارے میں شخصی فیصلے کے بجائے اجتماعی فیصلے پر عمل کیا جانا چاہیے۔ اجتماعی فیصلے کے لئے اگر بہت سے لوگوں کی رائیں حاصل نہیں کی جاسکتی تھیں تو محض اسی مجلس ادارت کا ایک فیصلہ حاصل کر لیا جاتا اور اس کے مطابق صرف معیاری ادب کی کتابوں ہی میں نہیں مکتبہ جامعہ کی تمام مطبوعات میں عمل کیا جاتا تو اردو زبان کو یقیناً فائدہ پہنچتا۔

املا کی اصلاح کی وجہ سے ایک جگہ ایک دلچسپ غلطی نظر سے گذری۔ تقریباً تمام ہی کتابوں میں "مصرعہ" کے بجائے "مصرع" لکھا گیا ہے۔ ایک کتاب میں بہ طرز قدیم "مصرعۂ اولیٰ"

---

[1] شریف زادہ (مرتبہ: ڈاکٹر قمر رئیس) صفحہ ۵۸ و ۵۹

لکھا گیا تھا، جدید طریقے کے مطابق "مصرعہ" کو "مصرع" کر دیا گیا اور "اولیٰ" کو بحالہ باقی رکھا گیا یعنی "مصرعِ[1] اولیٰ" کر دیا گیا جو ظاہر ہے غلط ہے۔ "مصرعِ اول" کر دینا چاہیے تھا۔

اس سلسلے کی بعض کتابوں میں املا کے جو نئے طریقے اختیار کیے گئے ہیں، ان سے کسی کو اتفاق ہو یا نہ ہو مگر ان کے پیچھے جو دلیل ہے، وہ سمجھ میں آتی ہے، مگر رشید حسن خاں صاحب کی دو اصلاحات کی وجہ میں سمجھنے سے قاصر رہا، ایک "ذمہ داری" کے بجائے "ذمے داری" اور دوسری "چھ" کے بجائے "چھے[2]"۔

پرانی کتابوں کے طرزِ املا میں ایک خرابی یہ تھی کہ بلا ضرورت دو لفظوں کو ایک دوسرے سے ملا کر لکھتے تھے، آجکل کا مذاق اس طرز کو پسند نہیں کرتا۔ لیکن "شریف زادہ" (مرتبہ: ڈاکٹر قمر رئیس) کی پرانے ہی طرز پر ملا کر کتابت کی گئی ہے۔ مثلاً انکے، انکی، کیلیے (صفحہ ۶) نادلونگی (صفحہ ۸)، گذریگا (صفحہ ۴۲) اس طرح کا عیب آج کل عام طور پر نظر نہیں آتا۔ "معیاری ادب" کی کتاب میں یہ دیکھکر تعجب ہوا۔

۲۔ نہ صرف ذاتی طور پر مجھے معلوم ہے، بلکہ کتاب کے غائر مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتابیں مجلس ادارت کے سامنے پیش نہیں کی جاتیں۔ جب ہر کتاب پر مجلس ادارت کے اراکین کے نام درج ہوتے ہیں تو ان کتابوں کی خوبیوں اور خرابیوں کی ذمہ داری ان تمام اراکین مجلس پر آتی ہے۔ اس لیے میری ناچیز رائے میں بنیادی باتیں ان کے مشورے اور فیصلے سے طے ہونی چاہئیں۔

۳۔ اس سلسلے کی اب تک جس قدر کتابیں (نمبر ۱ تا ۱۳) چھپی ہیں انھیں اراکین مجلس ہی میں سے کسی نہ کسی نے مرتب کیا ہے۔ میری ناچیز رائے میں اس حلقے کو وسیع کرنے کی ضرورت ہے۔ کسی کتاب کو ترتیب و تصحیح کے لیے دیتے وقت اس کا لحاظ رکھنے کی ضرورت ہے کہ اس شخص

---

۱ فسانۂ آزاد (مرتبہ: ڈاکٹر قمر رئیس) صفحہ ۴۶

۲ حیات سعدی صفحہ ۱۱۷، اور ۱۳۷ "چھے سو برس"۔

کو دی جائے جس نے اس موضوع پر کچھ کام کیا ہو یا اس سے گہرا تعلق رکھتا ہو۔ کسی ایک ہی شخص کو ہر فن مولی سمجھ لینا صحیح نہیں ہے۔ مثلاً خواجہ دردؔ پر ڈاکٹر وحید اختر صاحب نے کام کیا ہے یا ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی صاحب نے دیوان دردؔ کو مرتب کیا ہے اور اس کے مقدمے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں انھوں نے کافی محنت و تحقیق کی ہے۔ اسی طرح "مضامین شبلی" کی ترتیب کا کام یا تو رفقائے دار المصنفین میں سے کسی کو دینا چاہئے تھا یا اسے جس نے شبلیؔ پر کام کیا ہو۔

۴۔ "تعارف" کے لئے مجلس ادارت کی طرف سے کوئی واضح ہدایت ہونی چاہئے تھی کہ اس میں کم سے کم یہ باتیں ضرور لکھی جائیں اور اگر کوئی تاریخ دینی ہو تو سنہ عیسوی ضرور درج کیا جائے۔ مثلاً ہر مرتب نے صاحبِ تصنیف یا صاحب کلام کے، مختصر طور پر، حالات زندگی ضرور دئے ہیں۔ اگر حالات زندگی لکھنے ہوں تو تاریخ ولادت اور تاریخ وفات دینا ضروری ہے۔ مگر "دیوان دردؔ" کے "تعارف" میں (مرتبہ رشید حسن خاں صاحب) خواجہ دردؔ مرحوم کی صرف تاریخ وفات درج ہے، تاریخ ولادت نہیں، "حیاتِ سعدیؔ" کے تعارف میں (مرتبہ رشید حسن خاں صاحب) مولانا حالیؔ کے حالات زندگی کا سرے سے ذکر ہی نہیں، اس لئے تاریخ ولادت اور تاریخ وفات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسی طرح یہ ہدایت بھی دینے کی ضرورت تھی کہ جو بھی تاریخ دی جائے، چاہے توسین ہی میں سہی، مگر سنہ عیسوی میں ضرور دی جائے۔ "دیوان دردؔ" اور "انتخاب میر" (مرتبہ: ڈاکٹر محمد حسن صاحب) میں صرف سنہ ہجری درج ہے۔ حالانکہ میرؔ کی تاریخیں جہاں سے لی گئی ہیں، وہاں سنہ عیسوی بھی دیا ہوا ہے۔ پھر آجکل ایسی تقویمیں بڑی آسانی سے مل جاتی ہیں، جن میں تاریخ ہجری کو تاریخ عیسوی میں بغیر کسی زحمت کے معلوم کیا جا سکتا ہے، اگر مجلس کی طرف سے اس طرح کی کوئی ہدایت ہوتی تو مرتبین اس پر ضرور عمل کرتے۔

۵۔ قدیم کتابوں کے ساتھ متروک، غریب اور مشکل الفاظ کی فرہنگ شامل کرنے کے معاملے میں غالباً کسی اصول پر عمل نہیں کیا گیا ہے کیونکہ خواجہ دردؔ اور میر تقی میرؔ ایک ہی دور سے تعلق رکھتے

ہیں، مگر انتخاب میر کے ساتھ فرہنگ شامل کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی اور "دیوان درد" کے ساتھ شامل کرنا ضروری سمجھا گیا۔ اس فرق کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی سوائے اس کے کہ غالباً ایک مرتب کو اس ضرورت کا احساس تھا، دوسرے کو نہیں۔ مجلس ادارت اور جناب ناشر شاید فاضل مرتبین کے معاملات میں عدم مداخلت کی پالیسی پر کاربند ہیں۔

۷۔ "معیاری ادب" کے سلسلے کی کتابوں کی پشت پر کچھ عرصے سے مشہور ادیبوں اور شاعروں کے نام شائع کئے جاتے ہیں۔ یہ دیکھ کر تعجب اور افسوس ہوا کہ شبلی کو اس قابل نہیں سمجھا گیا کہ ان میں شامل کیا جاتا۔ مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے "انتخاب مضامین شبلی" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "مکتبہ جامعہ کے سلسلۂ معیاری ادب میں نمبر ۱۵ اور افادی حیثیت سے اگر دیکھا جائے تو اس کا نمبر سب سے پہلے آنا چاہئے تھا۔ ہمارے معیاری ادب کے معماروں میں شبلی نہ صرف خاص ہیں بلکہ کہنا چاہئے کہ خاص الخاص ہیں[۱]۔" اگر وہ اسی کتاب کی پشت ملاحظہ فرماتے تو شاید اسی کو غنیمت سمجھتے کہ مولانا شبلی کے مضامین کا انتخاب اس سلسلے میں شامل کر لیا گیا ہے[۲]۔

میرے ان مشوروں اور تبصروں سے یہ نہ سمجھا جائے کہ میری نظر میں اس کام کی اہمیت نہیں ہے۔ اس میں ذرا بھی شبہے کی گنجائش نہیں ہے کہ مکتبہ نے اس سلسلے کو شروع کر کے اردو زبان و ادب کی بہت مفید اور اہم خدمت کی ہے۔ امید ہے کہ قوم اسے زیادہ سے زیادہ علم و ادب کی خدمت کا موقع دے گی۔ اگر اس سلسلے کو پسند کیا گیا اور ان کی نکاسی خاطر خواہ ہوئی تو مکتبے کو اردو کی خدمت کا مزید اور اچھا موقع ملے گا۔

(ختم) (عبداللطیف اعظمی)

---

[۱] صدق جدید (لکھنؤ) بابت ۱۰ ستمبر ۱۹۷۱ء صفحہ ۳ کالم ۲

[۲] اس سے پہلے مولانا شبلی کی مشہور کتاب "موازنۂ انیس و دبیر" اس سلسلے کے تحت شائع کی جا چکی ہے۔

Regd. No. D - 768 **October, 1971**

The Monthly J A M I A

JAMIA NAGAR, NEW DELHI-25

جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

جامعہ

سالانہ چندہ چھ روپے		قیمت فی پرچہ پچاس پیسے
جلد ۶۴	بابت ماہ نومبر ۱۹۷۱ء	شمارہ ۵

فہرست مضامین

مدیر

ضیاء الحسن فاروقی

خط و کتابت کا پتہ

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی — مطبوعہ: یونین پریس دہلی — ٹائٹل: دیال پریس دہلی

شذرات

علی گڑھ کے نامور اولڈ بوائے اور جنگ آزادی کے مشہور سپاہی جناب یٰسین نوری مرحوم کا غم ابھی تازہ تھا کہ ۲۸ ستمبر ۱۹۷۱ء کو ڈاکٹر سید محمود کی شمع حیات بھی گُل ہو گئی اور ان کا جسد خاکی دہلی کے تاریخی قبرستان مہندیان میں جہاں شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور دوسرے اکابر دفن ہیں، سپرد خاک کر دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کے مراتب بلند کرے، آمین۔ ڈاکٹر سید محمود کی قربانیاں، ملک وملت کے لئے، بہت ہیں، ان کا سا اخلاص، قلب گداز اور ساتھ ہی ہمت و جرأت، کم لوگوں میں پائی جاتی ہے، وہ ہماری تاریخ کے اس عہد میں پیدا ہوئے تھے جب قومی زندگی کے لئے باصلاحیت، ایثار پیشہ، جذبۂ حب وطن سے سرشار اور میدان علم وعمل کے مرد فدا کار افراد اپنی زندگیاں وقف کر دیتے تھے، اب ایسے لوگ کہاں ہیں؟ اور جو ہیں وہ ایک ایک کر کے اٹھتے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر سید محمود ۱۸۸۹ء میں ضلع غازی پور (یو۔ پی) کے ایک چھوٹے سے قصبے سید پور بھتری میں پیدا ہوئے، ایم اے او کالج علی گڑھ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی، پھر یورپ گئے اور انگلستان اور جرمنی میں رہ کر اپنی تعلیم مکمل کی۔ انگلستان میں انہوں نے بیرسٹری کا امتحان بھی پاس کیا تھا، ہندوستان واپس کر انہوں نے بیرسٹری کی پریکٹس شروع کی، وہ ایک کامیاب بیرسٹر تھے مگر زیادہ وقت قومی وملّی کاموں میں گذرتا تھا، تحریک خلافت وعدم وتعاون میں اس طرح شامل ہوئے کہ جنگ آزادی کی آزمائشیں ہی زندگی کا اوڑھنا بچھونا بن گئیں۔ علی گڑھ میں طالب علمی ہی کے دور سے قومی کاموں سے ان کی عملی دلچسپی آشکارا تھی، الہلال اور مولانا محمد علی مرحوم کے کامریڈ اخبار کا ان کے قومی ذہن کی تشکیل میں بڑا حصہ تھا، خلافت کمیٹی کی سرگرمیوں میں یہ اُن کا بے لوث اشتغال ہی تھا کہ آل انڈیا خلافت کمیٹی کے

جنرل سکریٹری مقرر ہوئے۔ اُن کی تصنیف، اسی دور کی، خلافت اینڈ انگلینڈ (بزبان انگریزی) اور اس کا
اردو ترجمہ خلافت اور انگلستان کافی مقبول ہوا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب عدم تعاون اور خلافت کی تحریکوں
کی مدافعت اور برطانوی حکومت کے ترجمان اخباروں کے اعتراضوں کے جواب میں ان کے قلم سے
بہت اچھے مضامین انگریزی زبان میں نکلے، اس سے ان کی شہرت کا حلقہ وسیع ہوگیا اور وہ انگریزوں
کی نظر میں بھی آگئے، پہلی بار ۱۹۲۱ء میں قید و بند کی آزمائش سامنے آئی اور وہ اس سنت یوسفی
کو کارِ آخرت سمجھ کر جیل کی سختیاں خوشی خوشی جھیل گئے۔ پھر اس کے بعد ۱۹۴۲ء تک جب بھی
موقع آیا کسی سے پیچھے نہیں رہے اور زندانیان بلاکش کی صف اول میں جگہ ملتی رہی۔ سچ ہے، یہ
رتبۂ بلند سب کے نصیب میں نہیں ہوتا۔ کانگریس کے ہائی کمان کا اعتماد شروع ہی سے انھیں حاصل
تھا، اسی لئے وہ آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے سکریٹری بھی رہے اور آل انڈیا کانگریس کی ورکنگ کمیٹی
کے رکن کی حیثیت سے بھی ملک و قوم کی خدمت کی۔ ۹ اگست ۱۹۴۲ء کو جب پوری ورکنگ کمیٹی
بمبئی میں گرفتار کرلی گئی تو انھیں مولانا ابوالکلام آزاد اور پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھ قلعۂ احمد نگر
میں رکھا گیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے غبار خاطر کے ایک مکتوب میں مرحوم کا ذکر بڑے دلچسپ
پیرایے میں کیا ہے

جس زمانے میں وہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے سکریٹری تھے، اس سے پہلے ہی سے بہار کی
کانگرس میں انھیں ایک نمایاں جگہ حاصل ہوگئی تھی، اس ناتے بہار سے تعلق اتنا گہرا ہوتا گیا کہ
لوگ انھیں صوبہ بہار ہی کا باشندہ سمجھنے لگے۔ ۱۹۳۷ء میں اور پھر اس کے بعد ۱۹۴۶ء میں وہ بہار
کی وزارت میں شامل رہے، پھر وہ آزاد ہندوستان کے دستور کے نفاذ کے بعد الیکشن میں کامیاب ہوکر
پارلیمنٹ کے ممبر اور وزارت خارجہ میں وزیر مملکت مقرر ہوئے۔ بعد میں وہ راجیہ سبھا کے ممبر رہے، ڈاکٹر
سید محمود بڑے کھرے نیشنلسٹ مسلمان تھے، مسلم لیگی سیاست کے دور میں انھیں اپنی نیشنلزم کی وجہ سے
اپنی مسلمانوں کی سخت سست بھی سننی پڑی اور کئی موقع پر ان کی بے عزتی بھی کی گئی، لیکن ان کے پائے استقلال
میں لمحہ بھر کے لئے بھی لغزش نہیں ہوئی۔ اُن کو آخر تک اس بات پر یقین رہا کہ ملک کی اور خود مسلمانوں
کی بھلائی ہندو مسلم اتحاد میں ہے، مرحوم مذہب اور مذہبیت کے معنی خوب سمجھتے تھے اور جانتے تھے کہ سچی مذہبیت

پریم، محبت، رواداری، اخلاص، حق گوئی و بے باکی کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ صدق دلانہ خدا پرستی سے انھیں اعلا اقدار کی محبت پیدا ہوتی ہے، اور انسان انھیں کے سہارے زندگی میں حسن و معنی تلاش کرتا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ ان کی مذہبیت کا یہ رنگ مولانا آسی سکندر پوری مرحوم (ثم غازیپوری) سے عقیدت اور تعلق کی بنا پر اور چوکھا ہو گیا تھا۔

مذہب وسیاست کے علاوہ ڈاکٹر سید محمود کا علمی و ادبی ذوق بھی بہت شگفتہ تھا۔ قلعۂ احمد نگر کی اسارت کے زمانے میں انھوں نے فارسی اور اردو شعراء کے اپنے پسندیدہ اشعار کا ایک انتخاب کیا تھا جو رہائی کے بعد 'ارمغان آلام' کے نام سے شائع ہوا۔ اس سے ان کے ذوق کی شائستگی کا اندازہ ہوتا ہے، اس کے علاوہ علی گڑھ تحریک، مسلمانوں کی قومی خدمات، ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی تاریخ اور انگریزوں کی سیاست سے متعلق انھوں نے بڑے قابل قدر مضمون لکھے، بعض طویل مضامین کتابی صورت میں بھی شائع ہوئے، پروفیسر آل احمد سرور صاحب نے لکھا ہے کہ "جب نظامی بدایونی نے دیوان غالب کا ایک خاص ایڈیشن مرتب کرکے شائع کیا تو اس پر ڈاکٹر سید محمود نے ایک مقدمہ لکھا تھا جس میں غالب کی شاعری میں قومی رنگ پر خاص طور سے زور دیا تھا۔" یہ مرحوم کا علمی ذوق ہی تھا کہ انھیں دار المصنفین (اعظم گڑھ) سے بڑا گہرا لگاؤ تھا۔ عرصہ تک وہ اس کی مجلس انتظامیہ کے رکن رہے اور پھر صدر بنے۔ ان کی ذات سے دار المصنفین کو بہت فائدے پہونچے، مولانا آزاد کے بعد انھیں کے اثر سے حکومت ہند اس ادارہ کا بہت خیال رکھتی تھی اور سعودی عرب کی حکومت سے انھیں کی کوشش کی بنا پر اسے ایک مرتبہ دس ہزار اور دوسری مرتبہ پچاس ہزار روپے ملے، وہ چاہتے تھے کہ دار المصنفین کی مالی حیثیت ہمیشہ کے لئے مستحکم ہو جائے۔ اس کے لئے انھوں نے اپنی ضعیفی العمری اور خرابی صحت کے باوجود کویت جانے کا پروگرام بنایا تھا۔ مرحوم زندہ رہتے تو ضرور جاتے۔

اوپر لکھا جا چکا ہے کہ مرحوم بڑے کھرے نیشنلسٹ مُسلم تھے، اسی لئے وہ تقسیم ہند کے بعد مسلمانوں کی بربادی پر بھی اشکبار ہوئے، ان کے آنسو دکھاوے کے آنسو نہ تھے، بلکہ ان پر اس بات کا بہت اثر تھا کہ اس ملک کی ایک جاندار اور اہم اقلیت محض جھوٹے مذہبی نعروں کی بنا پر

مجہول سیاست کے دامِ بلا میں گرفتار ہوگئی اور خود اپنے ہاتھوں اپنی تباہی کا سامان کرگئی، آزادی کے بعد بھی قبل از تقسیم کے زمانے کی فرقہ وارانہ سیاست کے نتائج و اثرات ظاہر ہوتے رہے اور کبھی کبھی تو بھیانک فرقہ وارانہ فسادات کی شکل میں رونما ہوئے جن میں مسلمانوں کا بڑا جانی اور مالی نقصان ہوا۔ اس صورتِ حال پر ان کا دلِ دردمند خاموش نہیں رہ سکتا تھا۔ اس لئے ان کی کوششوں سے مسلمانوں کی مختلف جماعتوں پر مشتمل ایک مجلس مشاورت بنی۔ اس مجلس کے وہ صدر تھے۔ جب یہ مجلس بنی اور مرحوم اس کے صدر منتخب ہوئے تو ہمیں اس کا احساس تھا کہ محض اپنے خلوص اور دردمندی کی بنا پر انھوں نے ایسی جماعت کا صدر رہنا منظور فرمایا ہے جس میں بعض ایسے فرقہ پرست عناصر بھی ہیں جو اُن کی کوششوں سے فائدہ اٹھائیں گے، جلد ہی مرحوم کو اس کا تلخ تجربہ بھی ہو گیا اور وہ اس جماعت سے مستعفی ہو گئے۔ انھوں نے مجلس مشاورت سے استعفیٰ ۱۹۶۷ء کے انتخابات کے بعد دیا تھا، پھر کیا تھا اس سے متعلق بیانات اور انٹرویوز وغیرہ کی اشاعت کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا، ایسی تحریریں بھی نکلیں جن میں مرحوم پر اعتراضات کئے گئے تھے، مارچ ۷۱ء میں ایک بزرگ کا جن کا مرحوم باوجود اس کے کہ وہ عمر میں کافی چھوٹے ہیں، بہت احترام کرتے تھے، ایک انٹرویو اخبارات میں شائع ہوا، اس سے ڈاکٹر صاحب مرحوم کو سخت تکلیف ہوئی اور انھوں نے روداد چمن کے عنوان سے جس کی پیشانی پر یہ شعر درج تھا:

شدتِ غم سے آہ کرتا ہوں
آج پہلا گناہ کرتا ہوں

اپنا ایک بیان عزائم (لکھنؤ، ۲۸ مئی ۷۱ء) میں چھپوایا۔ یہ مضمون مرحوم کی انشا پردازی، ادبیت اور علمیت کا آئینہ ہے، اس بیان سے جہاں ایک طرف ان کی بے عیب نیشنلزم اور خدا پرستی اور سچی اسلامیت پر روشنی پڑتی ہے، وہیں یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ مرحوم کے اسلوب نگارش میں ایک پُرکشش تیکھا پن تھا جس سے وہ بُت شکنی کا کام بھی لے سکتے تھے، افسوس، 'پیران وفا' کی محفل کی یہ یادگار بھی اب اس دنیا میں نہ رہی:

تا سحر وہ بھی نہ چھوڑی تو نے، اے بادِ صبا
یادگارِ رونقِ محفل تھی پروانے کی خاک

یادگار ذاکر حسین کے سنگ بنیاد کی تقریب

شیخ الجامعہ اور راشٹرپتی کی تقریریں

(راشٹرپتی جناب وراہ گری وینکٹ گری نے یکم اکتوبر کو یادگار ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کا سنگ بنیاد رکھا۔ اس موقع پر شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب اور راشٹرپتی نے جو تقریریں کیں وہ ذیل میں شائع کی جاتی ہیں۔)

پروفیسر محمد مجیب

راشٹرپتی جی!

اگلے زمانے میں لوگ کہا کرتے تھے کہ یہ دنیا ایک سرائے ہے جہاں آدمی آتا ہے، اپنے ٹھہرنے کا سامان جیسا بھی ہو سکتا ہے کرتا ہے اور پھر چل دیتا ہے۔ اچھا مسافر وہ مانا جاتا تھا جو اس سرائے کو بعد میں آنے والے مسافروں کے لئے زیادہ آرام کی جگہ بنا کر جائے، ورنہ یہی سہی اس کے سرائے میں ٹھہرنے کی نشانی ہو، ورنہ سرائے میں آنا جانا تو رہتا ہی ہے۔ کچھ لوگ قبر کی طرف اشارہ کر کے کہتے تھے کہ آدمی کی آخری منزل یہی ہے، کچھ ایسے بھی تھے جو کہتے تھے کہ ہمارے مرنے کے بعد ہماری قبر کو زمین پر تلاش نہ کرو، نیک اور خدا شناس لوگوں کے دلوں میں دیکھو، کہ ہمارا مقام وہیں ہے، ہم وہیں ملیں گے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کی زندگی کا سفر خاصا لمبا تھا، اس میں انھوں نے بڑی مصیبتیں جھیلیں، بڑی کٹھنائیوں کا مقابلہ کیا،

بڑی سے بڑی عزت کی جگہ پر پہنچے، اور گھوم پھر کر وہیں آ گئے جہاں سے ان کا سفر شروع ہوا تھا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی ایک شکل وہ تھی جب اسے سرائے بھی نہیں کہا جا سکتا تھا، مگر یہاں جو لوگ رہتے تھے انھوں نے ٹھان لیا تھا کہ اسے کچھ نہ کچھ بنا کر چھوڑیں گے۔ یہاں جو کچھ بن گیا ہے وہ آپ کے سامنے ہے اسے بنانے والوں کے رہنما کو آرام اور آخری قیام کے لئے جو جگہ ملی ہے اس کے ایک طرف مدرسہ ہے جہاں بچوں کی شوق سے چمکتی ہوئی آنکھیں اور مچلتے ہوئے دل ایک نئی زندگی کا سندیس سناتے ہیں، ایک طرف لائبریری ہے جہاں یہی آنکھیں اور یہی دل علم کے ذریعہ اپنی دنیا کو ایک نئی شکل دینے کی قابلیت پیدا کر سکتے ہیں، ایک طرف مسجد ہے، ہم سب کو یاد دلانے کے لئے کہ ہمارا رب، ہمارا پالن ہار، ہماری مدد کرنے والا اور ہمارے کاموں کو جانچنے والا ایک ہے، اور اسی کی سیوا کرنا ہماری زندگی کا مقصد ہونا چاہیے۔ آج ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کے مقبرہ کا سنگ بنیاد رکھ کر آپ ان سب باتوں کی تصدیق فرما دیں گے۔

لیکن آج ہمیں خاص طور پر اس کا دھیان ہونا چاہیے کہ اچھے، خدا شناس آدمی کا مرنے کے بعد اصل مقام وہ نہیں ہوتا جہاں وہ دفن ہو بلکہ ان لوگوں کے دلوں میں جنھوں نے اپنی زندگی میں وہی راستہ اختیار کیا ہو جو اس نے کیا تھا، جو وہی یا ویسے ہی کام کر رہے ہوں، جن کے حوصلے وہی ہوں، جنھیں انسان سے ویسی ہی محبت ہو، جن کے دلوں میں آخری جانچ کرنے والے کا ایسا خوف ہو کہ وہ دوسروں کی خطاؤں کو معاف کرتے رہیں، اپنی کسی خطا کو معاف نہ کریں۔ جامعہ ملیہ کے لوگ اپنے آپ کو اس قیمتی یادگار کا حقدار اسی طرح ثابت کر سکیں گے جب یہاں کے ہر استاد اور ہر طالب علم کا حوصلہ ہوگا کہ جامعہ کو جیسا اس نے پایا تھا اس سے بہتر چھوڑ کر جائے، یہاں علم کا شوق بڑھتا رہے، کارکردگی کا معیار اونچا ہوتا رہے، انسانی قدریں زیادہ دل نشین ہوتی رہیں، زندگی کا حسن فروغ پاتا رہے۔ تب وہ لوگ بھی جو اس مزار پر آئیں گے یہ دیکھیں گے کہ یہ خالی ایک یادگار نہیں ہے، ایک نئی زندگی کی نشانی، نئے دلوں کا سرچشمہ ہے، اور یہاں ہندوستان کے سچے

شہریوں اور کارپرداز خادموں کے اچھے نمونے تیار ہوتے ہیں۔

راشٹرپتی جی، میں جامعہ ملیہ کی طرف سے آپ کا سواگت کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ ہمیں اپنے منصوبے پورے کرنے میں آپ کی مدد حاصل ہوگی۔

جناب وراہ گری وینکٹ گری

میرے لئے یہ عزت کی بات ہے کہ آج شام کو ڈاکٹر ذاکر حسین کی یادگار کا، جو ان کے اعزاز میں قائم کی جارہی ہے، سنگ بنیاد رکھنے کے لئے حاضر ہوا ہوں۔ ذاکر صاحب ہندوستان کے ایک ایسے ممتاز سپوت تھے جنھوں نے ان تمام منصبوں کو امتیاز اور وقار بخشا، جو انھیں ملے۔ ریاست کے سربراہ کی حیثیت سے ملک کے اس عظیم عہدہ کو وقار اور جلال وجمال بخشا۔ اس لیے یہ فیصلہ بالکل صحیح اور مناسب تھا کہ ان کے نام کو زندۂ جاوید رکھنے کے لئے ایک یادگار قائم کی جائے ــــــ ایک ایسی یادگار جو مرحوم کے ایثار و قربانی اور کارناموں کی مکمل آئینہ دار ہو۔ یہ یادگار، میرے خیال میں، قوم کے اس جذبۂ احسان مندی اور شکر گذاری کی علامت ہے، اس شخص کے لئے جس نے ملک کی ہمہ جہت ترقی میں بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صرف مشہور اسکالر یا عظیم دانشور ہی نہیں تھے، بلکہ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ ایک ایسے انسان دوست تھے، جس کی زندگی مختلف اور رنگارنگ تہذیبوں کی آئینہ دار تھی، وہ ہمارے مشترک کلچر کے سچے نمائندے بھی تھے اور دنیا کے شہری بھی، وہ ایسے ہی تھے جیسا ایک کامل انسان کو ہونا چاہئے ــــــ شریف، وجیہہ اور منکسر مزاج۔

یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں ان سے تیس سال سے زیادہ عرصے سے واقف ہوں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہماری دوستی بڑھتی گئی اور ہم ایک دوسرے سے قریب تر ہوتے گئے۔ میں ان کے فن کارانہ طریق زندگی سے بے حد متاثر ہوا۔ وہ جو کچھ بھی کرتے اس میں وقار ہوتا کشش ہوتی اور دلنوازی۔ یہ سب کچھ اس لیے تھا کہ ان کے مزاج میں شرافت اور انسانیت کا جوہر تھا۔

ان کی یادگار کے لیے یہ جگہ سب سے زیادہ مناسب اور موزوں تھی، جہاں ذاکر صاحب نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ بحیثیت ایک معلم اور ماہر تعلیم کے گذارا ہے۔ وہ زندگی میں داخل ہوئے تو تعلیم کو پیشے کے طور پر اختیار کیا اور وہ ایک ایسا طریقۂ تعلیم بنانے میں کامیاب ہوئے جو آزاد ہندوستان کے عوام کے ذوق اور مزاج سے ہم آہنگ ہے۔ وہ اس مقولے پر سختی کے ساتھ یقین رکھتے تھے کہ علم کو اخلاقی زندگی اور طرز معاشرت کی بنیاد ہونا چاہیے جس کے سہارے سوسائٹی کی اخلاقی تشکیل نو کی جاسکے۔ ذاکر صاحب بنیادی تعلیم یا نئی تعلیم کے ترجمان اور مفسر تھے انھوں نے بالکل صحیح اور بروقت سوچا کہ عوام کی فلاح و بہبود کا تصور ملک کے نئے حالات میں اس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ تعلیم عام نہ ہو اور جہالت دور نہ کی جائے۔

انھوں نے جس تعلیمی نظام کو فروغ دیا وہ زندگی کی عملی سچائیوں سے قریب تھا۔ وہ خود بھی بسم اللہ کی گنبد میں محصور رہنے والے فلسفی نہیں تھے، بلکہ ان کی شخصیت میں روشنی اور حرارت سوجھ بوجھ اور تمام انسانوں سے یگانگت کے عناصر تھے۔ ہم ان کی پوری شخصیت کو ایک لفظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ صحیح معنوں میں ایک عظیم معلم تھے۔ وہ انسان کی عظمت کے نقیب تھے اور انھوں نے ہمیشہ اس بات کی کوشش کی کہ کم از کم ہر انسان کو شریف اور شائستہ زندگی گزارنے کے ضروری وسائل حاصل ہوں۔ ۱۹۶۷ء میں جب وہ صدر جمہوریہ منتخب کیے گئے تو اس وقت انھوں نے ہمارے قومی مقدر کے بارے میں کہا تھا کہ "ملک کو چاہیئے کہ وہ ذہنی کاہلی کے خلاف جنگ کرے اور اس بے توجہی کو ختم کرے جو سماجی انصاف کے مطالبوں کی طرف سے کی جاتی ہے، وہ تنگ نظری اور اجتماعی خود غرضی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکے اور یہ سب کچھ ہمارا ملک ایک اخلاقی ذمہ داری کے طور پر انجام دے گا، اسے وہ ایک ایسا اخلاقی فرض سمجھے گا، جسے اس نے بخوشی قبول کیا ہے۔ ہم اپنی قومی زندگی میں قوت کو اخلاق سے، بھارت کو اخلاقیات سے اور عمل کو فکر سے ہم آہنگ کریں گے۔" قوم ان کے ان حکیمانہ لفظوں کو ہمیشہ یاد کرے گی جب انھوں نے بھارت کو اپنا گھر بنایا تھا اور اس کے رہنے والوں کو اپنا خاندان۔

ے تھی۔ انھیں ہمیشہ زندگی کو روحانی
وں نے بار بار اظہار بھی کیا۔ وہ یادگار
یا ہیئے ان تمام مقاصد اور آدرشوں کا
ہمارا فرض ہے کہ ہم ان مقاصد اور
نی چاہیئے کہ یہاں ملک کے تمام علاقوں
ال انسان کے تمام شریف ترین عزائم
زندگی کو اپنے لیے نمونہ بنائیں تو یہ انیٹ
کارکنوں اور طالب علموں کا یہ خصوصی
فروغ کے لیے ذاکر صاحب نے اپنی
ان کے مقدر پر ایمان تھا، انھیں یقین
تھا کہ مشیت نے ہندوستان کو ایک ایسی تجربہ گاہ بنایا ہے جہاں تہذیبی امتزاج کا عظیم ترین تجربہ کامیابی کے ساتھ کیا جائے گا۔" آیئے ہم سب ان کی اس تمنا میں شریک ہوں اور ہندوستان کو مضبوط اور متحد بنانے کے کام میں لگ جائیں۔ جے ہند

ابوالنصر محمد خالدی

اصلاحِ کلام: حالی کی مثال

مقدمہ شعر و شاعری کا ایک ذیلی عنوان ہے: "آمد اور آورد میں فرق"۔ اس ضمن میں حالی نے غالباً کسی باخبر سے سن کر دو مغربی شاعروں ورجل وایرسٹو کی مثالیں دیتے ہوئے لکھا ہے:

"سچ یہ ہے کہ کوئی نظم جس نے کہ استقلال کے ساتھ جمہور کے دل پر اثر کیا ہے، خواہ طویل خواہ مختصر، ایسی نہیں ہے جو بے تکلف کہہ کر پھینک دی گئی ہو۔ جس قدر کسی نظم میں بے ساختگی اور آمد معلوم ہو جاننا چاہئے کہ اس پر زیادہ محنت اور زیادہ حک و اصلاح کی گئی ہے۔"

اسی سلسلہ میں ایک فارسی شعر نقل کرتے ہوئے حسن بن رشیق قیروانی متوفی ۶۳ھ ہجری کی کتاب العمدہ کے حوالے سے صرف اتنا لکھنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ عربی زبان کے شاعر بھی ایسا کیا کرتے تھے۔

عربی ادب کی اساسی کتابوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زبان میں نہایت اعلیٰ درجہ کے سیکڑوں اشعار ایسے بھی ملتے ہیں جو واقعی فی البدیہہ کہے گئے تھے۔ ایسے اِرتجالی اشعار کی شانِ صدور عموماً کچھ اس طرح کی ہوتی تھی کہ مثلاً جب کوئی نہایت موزوں طبع عرب ایسے ہیجانی ماحول میں گھر جاتا جو اس کے اعصاب کو غیر معمولی طور پر متاثر کر دیتا تو اس کے جذبات بڑے زور شور سے یکایک چند ابیات کی صورت میں ظاہر ہو جاتے تھے۔ ایسے اِرتجالی ابیات کی تعداد بالعموم دس بارہ یا پندرہ سے متجاوز نہیں ہونے پاتی تھی ان کے دیکھنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے گویا کسی قطعہ زمین کے نیچے پانی کا ایک بہت بڑا ذخیرہ جمع تھا کہ تہیج ارضی سے زور کھا کر پتھر

توڑتے ہوئے پھوٹ بہا۔ بعض شعراء تو ایسے بھی ہوئے ہیں کہ ان کے بہترین اشعار زیادہ تر اعصابی فشار کی حالت ہی میں کہے ہوئے ہیں۔

لیکن اسی عربی زبان میں چند قصیدے ایسے بھی ملتے ہیں جو اس کے باوجود کہ انتہائی غیر معمولی نفسیاتی ہیجانی لمحوں میں کہے جانے کے باوصف خاصے طویل ہیں[۲]، البتہ ایسی مثالوں کا شمار فی الجملہ مستثنیات میں ہوتا ہے۔

باعتبار تعداد ابیات طویل قصیدوں کی دوسری قسم وہ ہے جن کے کہنے والے فی الواقع ایسی ہی صلاحیت و قابلیت کے حامل تھے کہ جب وہ ایک مرتبہ شعر کہنا شروع کر دیتے تو سو سو، سو شعر کہے بغیر رک ہی نہیں سکتے تھے۔ وہ طبعاً پرگو تھے۔ بسیار گوئی ان کی فطرت تھی[۳]۔ بایں ہمہ ایسی مثالیں فی الجملہ کم ہی ہیں جو ارتجالاً صادر ہونے کے باوصف طویل ہیں۔ عموماً یہی ہوتا تھا کہ شعر کے سر انجام ہوتے ہی شاعر انھیں شائع نہیں کرتا تھا بلکہ پہلے وہ خود ہی وقفہ وقفہ سے ان پر غور کرنے، ان کی کانٹ چھانٹ کرنے، پھر ناقدوں کو سنانے اور ان کی رائے سے استفادہ کر کے کلام کو اچھی طرح سدھارنے سنوارنے کے بعد ہی مجمع عام میں سناتا اور شائع کرتا تھا۔

چھٹی صدی مسیحی کے شاید سب سے بڑے عرب شاعر زہیر کے متعلق تواتر سے ثابت ہے کہ وہ ایک خاصا طویل قصیدہ تو قریباً ایک ہی مہینہ میں کہہ ڈالتا تھا مگر پورے ایک سال (= حول) تک اس میں چھان بین (تنقیح) کرتا اور کاٹنے چھانٹنے (تحکیک) کے بعد ہی شائع کرتا تھا[۴]، اور یہی حال حطیئہ مخضرمی کا تھا اس کا مقولہ آج تک دہرایا جاتا ہے کہ خیر الشعر الحولی المحکک المنقح[۵]۔

ابتدائی اموی دور کے ایک بہت بڑے شاعر اخطل کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ بولہٗ اوّل جتنے اشعار کہتا ان میں سے کم و بیش دو تہائی خارج کر دیتا صرف ایک تہائی منتخب کرتا اور یہی وہ اشعار ہوتے جن کی شہرت جلد از جلد دور دور تک پہنچتی اور اہل فن و ادب

انھیں فوراً محفوظ کر لیا کرتے تھے۔

عباسی دور کے شاعر ابراہیم الصولی کے متعلق بھی ایسا ہی بیان کیا گیا ہے کہ وہ صرف اپنے منتخب اشعار ہی سناتا تھا۔

جریر اور فرزدق جیسے باکمال شعراء کا کلام شائع ہونے سے پہلے ان کے راوی اس کی خامیاں اور اس کے نقائص باقاعدہ طور پر دور کیا کرتے تھے۔

اموی دور کے ایک شاعر سُوید بن کراع نے تو برملا خود ہی کہہ دیا کہ وہ اپنے اشعار کی تنقیح و تہذیب کرتا ہے۔

أَبِيتُ بِأَبْوَابِ الْقَوَافِي كَأَنَّمَا   أُصَادِي بِهَا سِرْبًا مِنَ الْوَحْشِ نُزَّعَا
إِذَا خِفْتُ أَنْ تُرْوَى عَلَيَّ رَدَدْتُهَا   وَرَاءَ التَّرَاقِي خَشْيَةً أَنْ تَطَلَّعَا
وَجَشَّمَنِي خَوْفُ ابْنِ عَفَّانَ رَدَّهَا   فَثَقَّفْتُهَا حَوْلًا جَرِيدًا وَمَرْبَعَا

مطلب یہ کہ میں نے قافیوں کے دروازے پر کھڑے کھڑے رات بھور کر دی گویا کہ میں چوکنے ہرن کے شکار کرنے تاک لگائے بیٹھا ہوا تھا۔ جب مجھے اندیشہ ہوا کہ (میری نالائقی ثابت کرنے میرے روبرو) میرے ہی اشعار دہرائے جائیں گے تو میں نے انھیں اپنے حلق سے نیچے اتار کر سینہ میں دبائے رکھا مبادا کہ وہ بے قصد و بے ارادہ باہر نکل پڑیں اور سچ پوچھو تو بات یہ ہے کہ مجھے ابن عفان کے ڈر نے اس تکلیف میں ڈالا کہ پورے بارہ مہینہ تک انھیں ٹھیک ٹھاک کرتا رہوں۔

عدی بن وقاع نے بھی اپنے اشعار کی تنقیح و تہذیب کو عیب نہیں بلکہ ہنر سمجھ کر کہا ہے کہ

وَقَصِيدَةٍ قَدْ بِتُّ أَجْمَعُ بَيْنَهَا   حَتَّى أُقَوِّمَ مَيْلَهَا وَسِنَادَهَا
نَظَرَ الْمُثَقِّفِ فِي كُعُوبِ قَنَاتِهِ   حَتَّى يُقِيمَ ثِقَافُهُ مُنْآدَهَا

یعنی میں اپنے کہے ہوئے قصیدہ میں جو معنوی اونچ نیچ اور اس کے مختلف اشعار میں بے تعلقی و بے ربطی تھی اس کو اس کی لفظی خامیوں اور عروضی کوتاہیوں کو دور کرتا رہا۔

یری مثال ایسی ہے جیسے نیزوں کے بانس سیدھا کرنے والے کی ہوتی ہے۔ جو ٹیڑھے بیڑھے
انسوں کو آگ دکھا دکھا کر سیدھا کرتا اور اس کی گرہوں کو چھیل چھال کر صاف کرتا ہے[1]۔

حالی غالباً ان شواہد سے واقف نہیں تھے کیونکہ ان کے زمانہ میں محولہ کتابیں نہیں چھپی
تھیں اور ہندوستان میں ان کے قلمی نسخے نہایت کم یاب بلکہ نایاب تھے۔ بہرطور اتنی بات
یقینی ہے کہ حالی عرب شاعروں کے اس تنقیدی عمل سے بخوبی واقف تھے اور خود انھوں نے
اس پر عمل بھی کیا ہے۔

مسدس مدّ و جزر اسلام کا دوسرا دیباچہ اٹھارہ سو چھیاسی ۱۸۸۶ء عیسوی میں (۱۳۰۳ھ) لکھا
گیا۔ اس کا آخری جملہ ہے: "قدیم مسدس میں جستہ جستہ تصرف کیا گیا ہے۔ شاید بعض تصرفات کو ناظرین
اس وجہ سے کہ قدیم اسلوب مانوس ہو گیا تھا پسند نہ کریں مگر مصنف کا فرض تھا کہ دوستوں کی
ضیافت میں کوئی ایسی چیز پیش نہ کرے جو خود اس کے مذاق میں ناگوار ہو۔"

مسدس پہلی بار ۱۲۹۶ سنہ ہجری میں چھپا۔ قریباً سات سال پہلے چھپے ہوئے مسدس میں جستہ
جستہ کیا تصرف ہوا؟ اس کی تفصیل اصلاح شدہ نسخے اور قدیم نسخے کے متوازی مقارنہ سے
بآسانی معلوم ہو سکتی ہے۔ ذیل میں ایسی ہی قرأت پیش کی جا رہی ہے اس وقت ہمارے سامنے
وہ نسخہ ہے جو صدی ایڈیشن کے نام سے انیس سو پینتیس ۱۹۳۵ء عیسوی میں چھپا تھا اس کو ہم نے یہاں
الف سے تعبیر کیا ہے دوسرا قدیم نسخہ جس کو ق سے ظاہر کیا گیا ہے وہ مطبع (؟) لکھنؤ سے جنوری
سنہ اٹھارہ سو پچاسی۔ (۱۸۸۵ء) عیسوی میں شائع ہوا تھا ان دونوں نسخوں کا باہمی اختلاف
بالتفصیل وسلسلہ وار اس طرح ہے:

الف کے محاذی ہندسہ مسدس کے بند کا سلسلہ نشان ہے

۱۔ تنزل پہ اپنے قناعت وہی ہے = الف = ۵
مذلت پہ اپنے قناعت وہی ہے = ق

۲۔ عرب جس کا چرچا ہے یہ کچھ وہ کیا تھا جہاں سے الگ اک جزیرہ نما تھا

زمانہ سے پیوند جس کا جدا تھا　　نہ کشورستاں تھا نہ کشور کشا تھا
تمدن کا اس پر پڑا تھا نہ سایہ
ترقی کا واں تھا قدم تک نہ آیا　　الف = ۸

اس پورے بند پر غور مکرر کے بعد دو شعر اس طرح سر انجام ہوئے۔

عرب کچھ نہ تھا اک جزیرہ نما تھا　　کہ پیوند ملکوں سے جس کا جدا تھا
نہ وہ غیر قوموں پہ چڑھ کر گیا تھا　　نہ اس پر کوئی غیر فرماں روا تھا

لیکن تیسرا شعر علیٰ حالہ رہا۔

۳۔ وہ تیرتھ تھا اک بت پرستوں کا گویا　　جہاں نام حق کا نہ تھا کوئی جویا = الف = ۱۲
وہ اک بت پرستوں کا تیرتھ بنا تھا　　جہاں تین سو ساٹھ بت پج رہا تھا = ق

۴۔ قبیلے قبیلے کا اک بت جدا تھا۔ الف = ۱۴
قبیلے قبیلے کا بت اک جدا تھا = ق = "اک بت" کی تقدیم و تاخیر۔

۵۔ وہ بکر اور تغلب کی باہم لڑائی = الف = ۱۷
وہ بکر اور تغلب کی نامی لڑائی = ق = باہم کی بجائے نامی

۶۔ سترہویں بند کے بعد جو ع کرشمہ اک ان کی جہالت کا تھا وہ پر ختم ہوتا ہے۔ قدیم نسخے میں ایک مزید بند اس طرح ہے

اسی طرح ایک اور خوں ریز بیدا　　عرب میں لقب حرب داحس ہے جس کا
رہا ایک مدت تک آپس میں برپا　　بہا خون کا ہر طرف جس میں دریا
سبب اس کا لکھا ہے یہ اصمعی نے
کہ گھوڑ دوڑ میں چیند کی تھی کسی نے　　الف ندارد

۔ طبیعت میں جوہر تھے جو اس کے اصلی = الف = ۲۶
طبیعت میں جو اس کی جوہر تھے اصلی = ق ۔ "اس" کی تاخیر اور طبیعت کی تانیث

کے اعتبار سے کی"

۸۔ اسی پر ہمیشہ بھروسا کرو تم = الف = ۳۶
اسی پر بھروسا ہمیشہ کرو تم = ق ۔ "ہمیشہ بھروسا" کی تقدیم و تاخیر

۹۔ تم اوروں کے مانند دھوکا نہ کھانا　　کسی کو خدا کا نہ بیٹا بنانا
مری حد سے رتبہ نہ میرا بڑھانا　　بڑھا کر بہت تم نہ مجھ کو گھٹانا
سب انساں ہیں واں جس طرح سرفگندہ
اسی طرح ہوں میں بھی ایک اس کا بندہ = الف = ۳۸

نصاریٰ نے جس طرح کھایا ہے دھوکا　　کہ سمجھے وہ عیسیٰ کو بیٹا خدا کا
مجھے تم سمجھنا نہ زنہار ایسا　　مری حد سے رتبہ بڑھانا نہ میرا
سب انساں ہیں جس طرح واں سرفگندہ
اسی طرح ہوں میں بھی ایک اس کا بندہ = ق

پانچویں مصرع میں صرف "واں" کی تاخیر

۱۰۔ یتیموں کے رانڈوں کے غمخوار بندے = الف = ۵۷
یتیموں کے بیوؤں کے غمخوار بندے = ق = "بیوہ" کی بجائے "رانڈ"

۱۱۔ سمجھتے تھے ذمّی و مُسلم کو یکساں = الف = ۶۱
مسلمان و ذمّی کے سب حق تھے یکساں = ق

۱۲۔ نہ وہ دور دورہ تھا عبرانیوں کا　　نہ یہ بخت و اقبال نصرانیوں کا = الف = ۶۵
نہ ہنگامہ تھا گرم عبرانیوں کا　　نہ اقبال یاور تھا نصرانیوں کا = ق

۱۳۔ ادھر تھا عجم کو جہالت نے گھیرا = الف = ۶۶
ادھر تھا جہالت نے فارس کو گھیرا = ق "فارس" کی بجائے "عجم"

۱۴۔ نہ بھگوان کا دھیان تھا گیانیوں میں = الف = ۶۶

نہ بھگوان کا گیان تھا گیانیوں میں = ق ۔ "گیان" کی بجائے "دھیان"

۱۵۔ پڑی لُٹ رہی تھی ودیعت خدا کی = الف = ۶۷

پڑی کٹ رہی تھی ودیعت خدا کی = ق ۔ ممکن ہے "کٹ" لکھنوی نسخہ کی مطبعی غلطی ہو

۱۶۔ تباہی میں تھا نوعِ انساں کا بیڑا = الف = ۶۷

تباہی کا تھا نوعِ انساں کا بیڑا = ق ۔ "کا" یہ بھی لکھنوی نسخہ کی مطبعی غلطی معلوم ہوتی ہے

۱۷۔ جہاں ابرِ رحمت گہربار ہے اب = الف = ۶۹

جہاں علم و حکمت کی بھرمار ہے اب = ق

۱۸۔ نہ رستہ ترقی کا کوئی کھلا تھا = الف = ۷۰

نہ رستہ ترقی کا اب تک کھلا تھا = ق ۔ "اب تک" کی بجائے "کوئی"

۱۹ فلاطون کو زندہ پھر کر دکھایا = الف = ۷۴

فلاطوں کو پھر زندہ کر کے دکھایا = ق ۔ "پھر" کی تاخیر۔ فلاطون کے "ن" کا اعلان اور "کے" کا حذف

۲۰۔ مہیا کیے سب کے راحت کے ساماں = الف = ۷۸

مہیا کیے سب کی راحت کے ساماں = ق ۔ "کی" واحد مونث کی بجائے "کے" نسخہ الف کی طباعتی غلطی معلوم ہوتی ہے۔

۲۱۔ تمام ان کا چھانا ہوا بحر و بر تھا جو لنکا میں ڈیرا تو بربر میں گھر تھا = الف = ۸۰

کھنگالا ہوا ان کا سب بحر و بر تھا جو لنکا میں تھے ان کا بربر میں گھر تھا = ق

۲۲۔ ملایا میں ہیں ان کے آثار اب تک = الف = ۸۱

ہیں سیلون میں ان کے آثار اب تک = ق ۔ ایک لفظ کی تبدیلی

۲۳۔ سر کوہ آدم سے تا کوہ بیضار جہاں جاؤ گے کھوج پاؤ گے ان کا = الف = ۸۲

تمہیں کوہ آدم سے تا کوہ بیضار ملے گا جہاں جاؤ گے کھوج ان کا = ق

۲۴۔ عرب کی ہوں میں اس زمیں پر نشانی = الف = ۸۴

میں ہوں اس زمیں پر عرب کی نشانی ۔ ق ۔ تقدیم وتاخیر

۲۵۔ مساجد کے محراب و در جا کے دیکھے = الف = ۸۶

وہ اجڑا ہوا کرو فر جا کے دیکھے = ق

۲۶۔ وہ بلدہ کہ فخرِ بلادِ جہاں تھا | تر و خشک پر جس کا سکہ رواں تھا

گڑا جس میں عباسیوں کا نشاں تھا | عراق و عرب جس سے رشکِ جناں تھا

اڑا لے گئی بادِ پندار جس کو

بہا لے گئی سیلِ تاتار جس کو = الف = ۸۷

وہ مشہور پایۂ تخت عباسیوں کا | لبِ دجلہ اڑتا تھا جس کا پھریرا

تر و خشک پر جس کا پڑتا تھا سایا | عراقِ عرب جس پہ تھا فخر کرتا

ہوئی سرنگوں جس کی مدت سے جھنڈی

ہے جو آج کل ایک تجارت کی منڈی = ق

۲۷ بہت خشک اور بے طراوت مگر واں = الف = ۱۱۲

بہت خشک اور بے طراوت مگر ہاں = ق

۲۸ ہری ٹہنیاں جھڑ گئیں جس کی جل کر = الف = ۱۱۳

ہری ٹہنیاں جھڑ گئیں جس کی ہل کر = ق = ہلنے کی جگہ جلنا۔

۲۹۔ کہ کل فخر تھا جس پہ اہلِ جہاں کو | لگا اُن سے عیب آج ہندوستاں کو = الف = ۱۱۶

کہ کل فخر تھا جس سے ہندوستاں کو | ہوئے آج سب ننگِ ہندوستاں وہ = ق

۳۰ کبھی یاں سکندر کبھی یاں ہے دارا = الف = ۱۱۷

کبھی یاں ہے بہمن کبھی یاں ہے دارا = ق = ایک لفظ کی تبدیلی و تغیر

۳۱۔ رہی اب نہ اسلام کی اس کو حاجت = الف = ۱۱۹

رہی اب نہ اسلام کو اس کی حاجت = ق "کی" و "کو" کی تقدیم و تاخیر معمولی ہے
معنوی حیثیت سے یہ تبدیلی نہایت اہم ہے۔

۳۲۔ گئی گزری دنیا سے عزت ہماری = الف = ۱۲۷
گئی گزری دنیا سے حرمت ہماری = ق = ایک لفظ کی تبدیلی

۳۳۔ یہی اپنے نزدیک حدّ بشر ہیں = الف = ۱۲۸
یہی اپنے نزدیک حدّ بصر ہیں = ق = ایک لفظ کی تبدیلی

۳۴۔ اسی طرح کے اور بھی نام ہیں اکثر = الف = ۱۲۹
اسی طرح کے اور بھی نام اکثر = ق = بحذف ہیں ۔ اور الف میں "ہیں" سہو ہے

۳۵۔ کہ یہ سانس آخر ہیں اب کوئی دم میں = الف = ۱۳۲
کہ یہ سانس آخر ہے اب کوئی دم میں = ق "ہیں" بصیغہ جمع کی جگہ "ہے" بصیغہ واحد

۳۶۔ جو انصاف کیجے تو ہم سے ہے بہتر کہ غافل نہیں فرض سے اپنے دم بھر = الف = ۱۳۳
گر انصاف کیجے تو ہم سے ہے بہتر جو غافل نہیں فرض سے اپنے دم بھر = ق

۳۷۔ وہ قومیں کہ سب راہ طے کر چکی ہیں ذخیرے ہر اک جنس کے بھر چکی ہیں
ہر اک بوجھ بار اپنے سر دھر چکی ہیں ہوئی تب ہیں زندہ کہ جب مر چکی ہیں = الف = ۱۳۴
وہ قومیں جو سب راہ طے کر چکی ہے ذخیرے ہر اک جنس کے بھر چکی ہے
ہر اک بوجھ بار اپنے سر دھر چکی ہے ہوئی تب ہیں زندہ کہ جب مر چکی ہے = ق
ہر ایک مصرع کے آخر میں "ہیں" بصیغہ جمع کی بجائے "ہے" بصیغہ واحد

۳۸ جہاں میں ہیں ایسے کہ گویا نہیں ہیں = الف = ۱۳۶
ہیں دنیا میں ایسے کہ گویا نہیں ہیں = یک لفظی تبدیلی و تغیر

۳۹۔ نہ فارغ ہیں اولاد کی تربیت سے نہ بے فکر ہیں قوم کی تقویت سے = الف = ۱۳۷
نہ فارغ ہیں تعلیم اولاد سے وہ نہ غافل ہیں سستی بنیاد سے وہ = ق

۴۰۔ نہ رسوا ہیں عادت میں اطوار میں وہ = الف = ۱۳۹

نہ رسوا ہیں عادت واطوار میں وہ = ق "میں" کی جگہ "و" عاطفہ

۴۱۔ ۱۳۹ ویں بند کے بعد جو ع نہ محنت مشقت سے کچھ عار ان کو پر ختم ہوتا ہے

قدیم نسخہ میں ایک پورا بند اس طرح ہے :

طبیعت میں اک اک کے ہے خاکساری بڑا سن کے کرتے ہیں وہ بُردباری

تواضع ہے سب کی رگ و پے میں ساری دماغ ان کے ہیں کبر و نخوت سے عاری

نہ باتوں میں ان کے حقارت کسی کی

نہ جلسوں میں ان کے مذمت کسی کی

اصلاح شدہ نسخے سے یہ پورا بند حذف کر دیا گیا ہے۔

۴۲۔ یونہیں ہیں وہ دیدے کے دَم دام لیتے = الف = ۱۴۶

کہیں چھوٹے وعدوں پہ ہیں وام لیتے = ق

دام : شروع میں دال مہملہ ہندی الاصل بمعنی پیسہ، رقم یا قیمت اور وام : شروع میں واؤ فارسی الاصل بمعنی ادھار، دین یا قرض میں سے کونسا لفظ قدیم نسخہ میں تھا اور اصلاح شدہ نسخہ میں کونسا لایا گیا ؟

میرا خیال ہے کہ غالباً مصرع اول میں خواہ وہ اصلاح شدہ نسخہ کا ہو یا قدیم نسخہ کا ہر دو جگہ وام (= ادھار) تھا اور دوسرے مصرع میں قدیم نسخہ میں وام (= ادھار) ہی تھا اصلاح میں وام (= ادھار) کو دام (= رقم) سے بدلا گیا ہے۔

۴۳۔ نہ گفتار میں کوئی ان کی خطا ہے = الف = ۱۵۸

نہ گفتار میں ان کے کوئی خطا ہے = ق اصلاح میں "کوئی" کو مقدم کیا گیا اور "کے" کی بجائے "کی"

۴۴۔ دلوں میں امیدیں امنگوں کی خوشیاں = الف = ۱۷۵

دلوں کی انگیں امیدوں کی خوشیاں = ق تقدیم وتاخیر

۴۵ کیا قلتین اس کو غسل و وضو کا = الف = ۱۹۴

کیا اس کو بالوعہ غسل و وضو کا = ق بالوعہ کو قلتین سے بدلا گیا۔

۴۶۔ کبھی ہوں نہ سیدھی روایت سے خوش ہم = الف = ۱۹۶

نہ ہوں سیدھی سادی روایت سے خوش ہم = ق

۴۷۔ کہے آگ کو اپنا قبلہ تو کافر = الف = ۱۹۷

جھکے آگ پر بہرِ سجدہ تو کافر = ق

۴۸۔ ہر اک قوم کے دل سے نفرت نکالی = الف = ۲۱۰

ہر ایک قوم کے دل سے وحشت نکالی = ق

۴۹۔ نہیں دستیاب ایسے اب دس مسلماں = الف = ۲۱۱

نہیں دستیاب ایسے اب دو مسلماں = ق

کیا یہ تبدیلی اس بات کی علامت ہے کہ خواجہ الطاف حسین حالؔی سات سال بعد پُرامید ہو گئے تھے ؟

۵۰۔ عزیزوں کے غم میں دل افگار ہوتے = الف = ۲۱۲

غمِ قوم میں سینہ افگار ہوتے = ق

۵۱ کھرا ان کا بازار ہے یا کہ کھوٹا ہے قول و قرار ان کا جھوٹا یا سچّا = الف = ۱

ہے بازار ان کا کھرا یا کہ کھوٹا ہے قول و قرار ان کا جھوٹا کہ سچا = ق

۵۲۔ نہ ملا کو صوفی کو اس سے حذر ہے = الف = ۲۱۶

نہ ملا نہ صوفی کو اس سے حذر ہے = ق "کو" کی بجائے "نہ"

۵۲/۲۱۸ نہیں ظاہر اکوئی اس میں برائی = الف = ۲۱۸

نہیں ظاہرا جس میں کوئی برائی = ق

۵۳۔ دلوں پر ہیں نقش اہلِ یوناں کی رائیں = الف = ۲۳۶
جمی ہیں دلوں میں ارسطو کی رائیں = ق

۵۴۔ اب اس فلسفہ پر ہیں جو مرنے والے شفا اور مجسطی کے دم بھرنے والے
ارسطو کی چوکھٹ پہ سر دھرنے والے فلاطون کی اقتدا کرنے والے = الف = ۲۴۷
اب اس فلسفہ پر جو ہیں مرنے والے شفا کے ہیں سب جن کو ازبر مقالے
جنھوں نے مجسطی پہ ڈیرے ہیں ڈالے حواشی ہیں تجرید کے سب کھنگالے = ق

پہلے مصرع میں "ہیں جو" کی تقدیم و تاخیر۔ دوسرے مصرع میں تغیر و تبدل اور چوتھا مصرع بالکل نیا۔

۵۵۔ اُسی راہ پر پڑ لیا سارا گلا = الف = ۲۴۳
اسی راہ پر پڑ لیا گلا سارا = ق "گلا" کی تاخیر

۵۶ وہ ہے ہدف نظر علم انشا ہمارا = الف = ۲۵۱
وہ علموں میں علم ادب ہے ہمارا = ق

۵۷۔ ۲۵۲ ویں بند کے بعد جو ع "جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے" پر ختم ہوتا ہے قدیم نسخہ میں درج ذیل بند موجود ہے۔ یہ نظرثانی شدہ نسخہ سے حذف کر دیا گیا ہے۔

سخن جو ہے یاں آج حصہ ہمارا نہیں قوم کو ظاہرا جس سے چارا
ہر اک کذب و بہتاں ہے جس میں گوارا مجسم ہو اس کا اگر جھوٹ سارا
بنے ہند میں اس سے اک اور ہمالہ
ہمالا سے ہو جس کی چوٹی دوبالا

۵۸۔ پڑی ان کے خطبوں سے دنیا میں ہل چل = الف = ۲۵۶
پڑی ان کے خطبوں سے عالم میں ہل چل = ق

۵۹۔ قلی یا لغز ہو تو کچھ کام آئے = الف = ۲۶۹

قلی یا نفر ہو جو کچھ کام آئے = ق "جو" کی بجائے "تو"

۶۰۔ بگڑنے کو بیٹھے ہیں تیاریاں سب = الف = ۲۹۲

بگڑنے کو تیار بیٹھے ہیں یاں سب = ق "تیار" کی تقدیم و تاخیر

ترتیب جدید:

اصلاح شدہ نسخہ میں دو سو چھیانوے بند ہیں۔ جو بند اس میں نہیں ہیں اور صرف قدیم نسخہ میں پائے جاتے ہیں وہ اوپر مذکور ہو چکے۔ اصلاح شدہ نسخہ قدیم نسخہ سے بندوں کی ترتیب کے لحاظ سے بھی قدرے مختلف ہے۔ مثلاً ۲۳۳ واں بند۔ وہ تقویم پارینہ الخ قدیم نسخہ میں موجودہ ۲۵۰ ویں بند ــــ نہ قانون میں ان کے الخ کے بعد آیا ہے۔ اور ۲۴۷ ویں بند ــــ نہ سمجھے وہ جب تک الخ کے بعد ــــ بند ــــ شریفوں کی اولاد الخ ہے جو اصلاح شدہ نسخہ میں ۲۵۹ ویں شمارے پر ہے اور اس کی بجائے یعنی ۲۵۸ والے۔ طوائف کو ازبر ہیں الخ کے بعد اصلاح شدہ نسخہ کا ۲۴۸ واں بند ــــ وہ طب جس پہ غش ہیں الخ آیا ہے۔

اسی طرح اصلاح شدہ نسخہ کے ۲۳۴ ویں بند سے ۲۶۶ ویں بند تک قدیم نسخہ کی ترتیب میں تقدیم و تاخیر کی گئی ہے۔

نظر ثانی میں ان بندوں کو مقدم و موخر کرنے کی کیا وجہ ہو گی؟ شاعر و منشی جانتے ہیں کہ اپنے معنی کو مخاطبوں کے دل میں اتارنے کے لئے سب سے پہلے ان کے (= معنی کے) لئے ٹھیک الفاظ کا انتخاب، پھر جملوں میں ان کا مناسب محل دروبست پھر ان جملوں کی ترتیب بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔

جہاں استاد داغ علیہ الرحمۃ کے متعلق ان کے ایک شاگرد عزیز یار جنگ مرحوم سے سنا تھا کہ وہ مشاعرہ کے لئے جو غزل لکھتے اس کے کئی مطلع قلم بند کرتے۔ بعد ازاں ان میں سے صرف ایک مطلع ایسا منتخب کرتے کہ محفل مشاعرہ میں سناتے ہی حاضرین کی زبان سے

بے ساختہ واہ نکل جاتی اور حسن مطلع بھی اسی شان کا ہوتا اور مابقی اشعار کی ترتیب اس طرح رکھتے کہ مقطع سے پہلے گویا غزل کا آخری شعر تو اس آن بان کا ہوتا کہ سامعین کے دل میں اتر جاتا اور سب کو بے تکلف یاد رہ جاتا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسدس پر نظرثانی کرتے ہوئے حالی مرحوم کے پیش نظر ارسال و ابلاغ کی ایسی ہی کوئی مصلحت پیش نظر تھی۔

آخر میں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ حالی مرحوم نے اپنے مسدس پر جو نظرثانی کی اس میں ان تنقیدوں کا اثر بھی پایا جاتا ہے جس کی طرف عبدالماجد نے صدی اڈیشن میں اشارہ کیا ہے کہ بڑے بڑے پیلیتن یلغار کرکے ٹوٹ پڑے، جواب کے لئے، تردید کے لئے الخ" ان میں سے دو یا تین پیلیتنوں کے جوابی مسدسوں کی تفصیل جناب مبارز الدین صاحب رفعت کے قلم سے نکلی ہے، (ملاحظہ ہو، رسالہ "اردو" انجمن ترقی اردو پاکستان، شمارہ اپریل ۱۹۵۲ء)

حوالے

۱۔ مثال کے طور پر ھُدْبَۃ بن خشرم عذری کے اشعار ملاحظہ ہوں جو اس نے اپنے قتل سے چند ہی لمحوں قبل کہے تھے یہ تعداد میں صرف دس ہیں۔ یہ جاحظ نے اپنی کتاب الحیوان (ج ۷ ص ۱۵۶ مصر۔ ۱۳۶۴ھ) میں نقل کئے ہیں۔ عبدیغوث وغیرہ کے لئے دیکھئے اسی مصنف کی کتاب البیان والتبیین ج ۲ ص ۲۶۸ مصر ۱۳۶۷ھ۔

۲۔ اس مظہر کی مشہور و نمایاں مثال طرفہ کا والیہ ہے۔ اس کے جملہ اشعار کی تعداد ایک سو پانچ ہے۔ واقعہ کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو علق النفیس۔ از قاضی ظفر الدین، لاہور، ۱۸۸۸ء

اس قصیدے کا آخری شعر

سَتُبْدِیْ لَکَ الْاَیَّامُ مَا کُنْتَ جَاهِلًا　　وَیَاْتِیْکَ بِالْاَخْبَارِ مَنْ لَمْ تُزَوِّدِ

جو باتیں تم نہیں جانتے زمانہ جلد ہی وہ تم پر ظاہر کر دے گا اور جس شخص کو تم نے زادِ راہ دے کر روانہ نہیں کیا تھا وہ بھی تمھیں خبریں پہنچا دے گا، شائد خود بخود بہت سی باتیں تمھاری کوشش کے بغیر اور شائد تمھاری مرضی کے خلاف تمھیں معلوم ہو جائیں گی ـــــ کے متعلق کہا گیا ہے کہ ـــــ ھذا من کلام النبوۃ ـــــ ملاحظہ ہو العقد الفرید۔ ابن عبد ربہ ج ۱ ص ۱۳۷۔ مصر۔ ۱۳۶۱ھ اور ج ۵۔ ص ۲۷۱۔ مصر۔ ۱۳۶۵ھ

۳۔ پُر گوئی کے لحاظ سے عربی میں بشار بن بُرد متوفی ۱۶۸ھ، سید حمیری م ۱۷۳ اور ابو العتاہیۃ متوفی ۲۰۵ھ بہت مشہور ہیں۔ آخر الذکر کا قول تھا کہ اگر میں چاہوں تو اپنی سب باتیں کلام موزوں میں بیان کروں۔ ملاحظہ ہو البیان والتبیین ج ۱ ص ۱۱۵۔ مصر۔ ۱۳۶۷۔

۴۔ خزانۃ الادب۔ عبد القادر۔ ج ۱ ص ۳۷۶۔ مصر۔ ۱۲۹۹۔

۵ البیان۔ ج ۲ ص ۱۳ = مُخضرمِی = خضرم کے معنی ہیں اونٹ کے کان کا تقریباً نصف حصہ عموداً کاٹ دینا۔ اس کی وجہ سے کٹا ہوا حصہ لٹکتا رہتا ہے اس کا اسم مفعول مخضرم ہے۔ تاریخ شعر عرب میں اس سے مراد وہ شخص ہے جس کی عمر کا کم و بیش نصف حصہ دورِ جاہلیۃ میں اور کچھ حصہ اسلامی دور میں گزرا ہو۔

۶۔ الاغانی۔ ج ۸ ص ۲۸۴۔ مطبوعہ دار الکتب العربیہ۔ مصر

۷۔ ایضاً۔ ج ۱۰ ص ۴۰

۸۔ ایضاً۔ ج ۴ ص ۲۵۸

۹۔ البیان۔ ج ۲ ص ۱۱۲

۱۰۔ ایضاً ج ۳ ص ۲۴۴ والشعر والشعراء: ابن قتیبہ۔ ج ۲ ص ۶۰۱ مصر۔ ۱۳۶۶ھ

رادھے شیام پاٹھک

ہندو مذہب

ہندو مذہب رہن سہن، برتاؤ، مراقبے، نظریاتی آزادی اور روحانی پرواز کے بہت سے پہلوؤں کو تسلیم کرنے والا، اور جذباتی کیفیات کو ترجیح دے کر ہجرِ محبوب کے صدقے اتارنے والا دھرم ہے۔ یہ مذہب کسی ایک کتاب، دیوتا، پیغمبر اور مذہبی عقیدے کا پابند نہیں لیکن تاریخ، روایات اور خدائی اعتقاد کی اہمیت کو ترجیح دیتا ہے۔ مذہبی رواداری ہندوؤں کا ایک مانا ہوا اصول ہے۔

ہندو تسلیم کرتے ہیں کہ خدا ایک ہے۔ لیکن اس تک رسائی کے طریقے اور راہیں بہت سی ہو سکتی ہیں۔ اپنی قابلیت اور صلاحیت کے مطابق ہر شخص اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے آزاد ہے۔

ہندو مذہب ہر شخص کو ضمیر کی آزادی عطا کرتا ہے۔ انسان کو پہچاننے والی انسانی نگاہ کمزور نہ ہو جائے اس لئے ہندو مذہب روح کی صحیح جانکاری پر زیادہ زور دیتا ہے۔ ہندو مذہب تسلیم کرتا ہے کہ انسان کا مقصد اعلیٰ فکر، اعلیٰ کردار، روحانی آزادی اور ہوش و خرد کا دائمی سکون حاصل کرنا ہے۔

گیتا میں کہا گیا ہے کہ ”خدا کا بندہ وہ ہے جو دنیا میں کسی کو پریشان نہیں کرتا اور نہ خود کسی سے پریشان ہوتا ہے۔“ (۱۵-۱۱ گیتا)

ہندو دھرم زندگی کی تخلیق میں انسان کو مسلسل حصہ دار بنائے رکھتا ہے۔ اور روحانی کھوج کی نئی سے نئی تحقیقات میں برابر شریک رہا ہے۔ ہندو دھرم خدا کے محدود اور لامحدود،

مجسم اور غیر مجسم دونوں ہی پہلوؤں کی حقیقت کو تسلیم کرتا ہے۔ خدا کے مجسم ہونے کے عقیدے کا احترام کرنے والے لوگ مندروں کی تنظیم میں شرکت فرماکر اپنے روحانی سکون کا سامان پیدا کر لیتے ہیں۔ اور خدا کی غیر مجسم ہستی میں عقیدہ رکھنے والے لوگ خدا کی لا فانی، لامحدود، بے مثال خوبیوں میں یقین رکھ کے اپنی روحانی جستجوؤں کو تسکین بخشتے ہیں۔

ہندو دھرم لچکیلا کپڑے کی مانند ہے۔ جو وقتی ضرورتوں کے مطابق سماج کے بڑھتے ہوئے جسم کو پوری طرح ڈھکے رہنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ مراقبہ، پوجا، عبادت وغیرہ کو ہندو خدا تک پہنچنے کا ذریعہ تسلیم کرتے ہیں۔ اس لئے ہندوؤں کا نظریۂ انسانی مراقبہ اور بت پرستی میں بھی عقیدہ ہے۔ خدا کے متعلق ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ وہ سبھی جگہ پر ہر وقت موجود ہے پر اُسے پریم ہی سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

"ہری ویاپک سروتر سمانا   پریم تے پرگٹ ہوئے میں جانا"

(بال کانڈ، ۳۱ : ۸۴)

ہندوؤں کا زندگی کے متعلق ایک خاص نظریہ ہے۔ یہ نظریہ آریہ، شک، دراوڑ، ناگ، آبھیر وغیرہ قوموں کے سینکڑوں سال کی جد و جہد کے بعد بنا ہے۔ ہندو قوم میں کسی دوسری قوم کا آدمی آسانی سے شریک نہیں ہو سکتا۔ اگر اپنی خوشی سے کوئی ہندو بن بھی جائے تو وہ کوئی سماجی حیثیت حاصل نہیں کر سکتا۔ ہندو اپنی سماجی زندگی میں کسی اجتماعیت کا حصہ نہیں مانا جاتا ہے۔ اس کی ایک علیحدہ ذاتی اہمیت ہے۔ لیکن اس کی ہستی پر مختلف مذہبی عقیدوں اور یقینوں کا اثر ہوتا ہے۔ ہندو کی زندگی پر دھرم کی گرفت بڑی باریک، پیچیدہ، لچکیلی اور پر اسرار ہوتی ہے۔

مہابھارت کے شانتی پرو میں دھرم راج یدھشٹر کو نصیحت کرتے ہوئے دیواستھان منی نے کہا ہے۔ کسی بھی جاندار کو نہ ستا کر جس دھرم کی پیروی کی جاتی ہے وہی اعلیٰ دھرم ہے، کسی کو نہ ستانا، سب لوگوں کو مناسب حصہ دینا، سب کے لئے رحم کا جذبہ بنائے رکھنا، دل اور

نفس پر قابو رکھنا، نرم کلامی، حیا اور سنجیدگی اور اس طرح کی دوسری خوبیوں کو اپنانا اعلیٰ دھرم ہے۔

منوسمرتی کے ایک شلوک میں دھرم کی دس صفات بتائی گئی ہیں : (۱) استقلال، (۲) عفو و درگذر، (۳) دل کو قابو میں رکھنا، (۴) چوری نہ کرنا، (۵) ظاہر و باطن سے پاک صاف رہنا، (۶) علم حاصل کرنا، (۷) مذہبی کتابوں سے روشنی حاصل کرنا، (۸) نفس کُشی، (۹) راست گوئی، (۱۰) غصّہ نہ کرنا۔

ہندو دھرم اپنی لاتعداد مذہبی کتابوں سے روشنی حاصل کرتا ہے۔ اِن میں وید، برہمن گرنتھ، ارنیک، اُپنشد، سوتر گرنتھ اور ویدانگوں کی گنتی کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ چھ نظامِ فلسفہ، اٹھارہ پُران، سمرتیاں، رامائن، مہابھارت اور گیتا وغیرہ ہندو دھرم کو روشنی عطا کرنے والی مذہبی کتابیں ہیں۔

اِن کتابوں سے روشنی حاصل کر کے ہندو دھرم سب کی بھلائی کرنے والی ایک ایسی تنظیم کے روپ میں ظاہر ہوا ہے جس میں عیش و آرام کو ترجیح نہ دے کر، دل، زبان اور اخلاق کی پاکیزگی کو خدا کے پاس پہنچانے والی اعلیٰ خواہشات سے جوڑ دیا گیا ہے۔

ہندوؤں کی مذہبی کتابوں نے انسانی دماغوں کے دروازوں پر مختلف سوال لاکر کھڑے کر دیئے ہیں۔ یہ دنیا کیا ہے؟ انسان محدود ہے یا لامحدود؟ انسان دنیا میں آنے سے پہلے کیا تھا اور موت کے بعد کیا ہوگا؟ مرنے کے بعد آدمی جنّت یا جہنم میں جاتا ہے یا نہیں؟ جاتا ہے تو اس کا ثبوت کیا ہے؟

اِن سوالوں نے مادی زندگی کے متعلق انسانی ذہن کو جھنجھوڑ دیا اور ہندوستانی علمیت فقیرانہ کیفیات کو اہمیت دینے لگی۔ امریکہ میں کسی سے مذاق کرتے ہوئے سوامی ولویکانند نے بھی کہا تھا: "سنیاس کے خلاف ایک بات میرے ذہن میں بھی آتی ہے کہ یہ سبھی قابل شخصیتوں کو سوسائٹی سے الگ کر دیتا ہے۔"

تاریخ اور وقت سے سبق سیکھ کر ہندو دھرم نے اپنے تجربات سے نہیں معلوم

کب اور کیسے یہ نتیجہ نکال لیا کہ زندگی اور دنیا کی طرف بھی توجہ رکھنا ضروری ہے۔ اور رو
منزل مقصود کی راہ میں چاہے جتنی بھی مشکلات آئیں، مسلسل چلتے رہنا ہے۔ وہ دھرم دیتی کی ہ
بلند رکھنی ہے۔

ہندو دھرم کی بنیاد میں ویدک آریوں کی روحانیت ہے۔ اس نے دراوڑ، مسلما
صوفیوں اور پارسیوں کے مذہبی عناصر کو اپنے میں ملا کر اپنی طاقت کو بڑھایا ہے۔ ہندو دھ
جذبات کی پاکیزگی کو بہت اہمیت دیتا ہے۔ یہ ایک روایت ہے، ایک جذبہ ہے، ایک را
ہے۔ اس میں مادی اور روحانی عناصر کا میل بٹھا دیا گیا ہے۔

ہندو دھرم کی بنیادی باتیں نہ بدلنے والی ہیں۔ تبدیلی صرف وسائل، ذرائع اور دھ
کی باہری باتوں میں ہو سکتی ہے۔ ہندو دھرم کے سبھی ادارے تجربے کے لئے ہیں۔ ان
نئی زندگی پھونکنے والے نیک انسان سماج کی ضرورتوں کے مطابق تبدیلی لاتے رہے ہیں مثا
کے طور پر گاندھی جی نے غریبوں کی خدمت کو خدا کی مانند بتا کر غریبوں کی طرف ہندوستانی عوا
توجہ دلائی۔ اِگ وید کی تعلیم کے مطابق بھی اسے تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ اِگ وید میں کہ
کہ خدا کے بہت سے نام ہیں اور اُس کے کارنامے بھی اَن گنت ہیں۔

ہندو دھرم برتاؤ اور کردار کو بہت اہم مانتا ہے۔ منوسمرتی میں کہا گیا ہے وید، ا
برتاؤ جو خود کو اچھا لگے سبھی دھرم ہے۔ پر سلوک کو اعلیٰ دھرم تسلیم کیا گیا ہے۔ اپنی سما
تنظیم میں ہندوؤں نے خوبیوں اور کام کی صلاحیتوں کے مطابق سماج کو برہمن، چھتری، وی
اور شودر میں تقسیم کیا ہے۔ آج کل اس نظام میں بگاڑ پیدا ہو جانے کی وجہ سے ہندو دھرم
میں یقین رکھتے ہوئے بھی اس میں تبدیلی کرنے کے لئے تیار ہو گیا ہے۔

آشرموں کی تنظیم کا مطلب عیش و عشرت کے جذبات پر قابو پانا ہی تھا۔ برہمچریہ، گرہ
بان پرست اور سنیاس آشرموں کی تنظیم دنیا سے لگاؤ اور دنیا سے کنارہ کشی کے لئے ہوئی
پہلے دو آشرم دنیا سے تعلق کو اہمیت دیتے ہیں۔ اور بعد کے دو دنیا سے کنارہ کشی کو۔ ہن

بانی طور پر آج بھی اس تقسیم میں یقین رکھتا ہے۔ لیکن سماجی دباؤ کی وجہ سے اور نئی سماجی یلیوں کے سبب سے اس تنظیم کی بھی اہمیت روز بروز کم ہوتی جارہی ہے

ہندو دھرم نے نظامِ حیات کے کاموں کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے: (۱) ہتیہ، (۲) ک، (۳) کامیہ۔ غسل، سندھیا، جپ، یگیہ، مطالعہ، دیوتاؤں کی پوجا، مہمان نوازی کرم مانے جاتے ہیں۔ سولہ سنسکار، بزرگوں کی عزت، شرادھ وغیرہ نیمتیک کرم ہیں۔ اوی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے جو کام کئے جاتے ہیں انھیں کامیہ کرم کہتے ہیں۔

مذہبی روایات میں ہندو "پانچ مہایگیوں" کو بھی اہمیت دیتے ہیں (۱) برہم یگیہ، پتر یگیہ، (۳) اتی تھی یگیہ، (۴) بھوت یگیہ، (۵) دیو یگیہ۔ برہم چریہ پر عمل کرتے ئے، گرو کی خدمت کرتے ہوئے پختہ عقیدہ رکھتے ہوئے مطالعہ کرنے کو برہم یگیہ ہتے ہیں۔ ماتا، پتا اور گرو کے حکم کے مطابق چلنا، اپنے خاندان کی عزت بڑھانا اور مرے ئے خاندانی لوگوں کے روحانی سکون کا خیال رکھنا پتر یگیہ کہلاتا ہے۔ مہمان کی خاطر تواضع نا اور اس کے آرام کا زیادہ سے زیادہ خیال رکھنا اتی تھی یگیہ ہے۔ سبھی جانداروں کی خوراک نظام کر کے خوش ہونا بھوت یگیہ کہلاتا ہے۔ ہون وغیرہ سے گھر کی پاکیزگی اور صفائی کرنا یگیہ کہلاتا ہے۔ اس کے علاوہ سولہ سنسکار بھی ہیں۔ یہ سبھی کام اور رواج ہندو دھرم کی دی باتوں کی جانکاری کرانے کے لئے تسلیم کئے گئے ہیں۔ ان پر عمل کرنا ہندو دھرم کی ی شرط نہیں ہے۔ ان سنسکاروں کو جسمانی، دماغی اور روحانی ترقی کے لئے تسلیم کیا ہے۔ ان روایات میں ان باتوں کو شامل کر دیا گیا ہے جو ہندو کی زندگی کو سنوارتی ہیں اسے بنائے رکھنے میں مدد پہنچاتی ہیں۔ ہندو دھرم، دھرم، ارتھ، کام، موکش کو زندگی ار سیڑھیاں مانتا ہے۔ یا انھیں زندگی کی ترقی کے سلسلے میں اہمیت دیتا ہے۔

ہندو اخلاقیات کا مطلب فرد کا ذاتی مفاد نہ ہو کر سماج کی بھلائی کا جذبہ ہے۔ دھرم لفظ ی دھاتو سے بنا ہے جس کا مطلب بنائے رکھنا یا مضبوط کرنا ہے۔ جو چیزیں زندگی کو

بنائے رکھنے کے لئے بہت ضروری ہیں وہی دھرم ہیں۔ ویدوں میں یہ لفظ مذہبی رواجوں کے لئے بھی استعمال ہوا ہے۔

ہندو دھرم کے چار ماخذ ہیں:

(۱) شُرتیاں یا وید

(۲) سمرتیاں یا اُن کے بنانے والوں کا برتاؤ

(۳) دھرماتما لوگوں کا کردار

(۴) انسان کا اپنا ضمیر

مجاز سے حقیقت کی طرف، اندھیرے سے روشنی کی جانب، جہالت سے علم کی سمت اور موت سے لافانی زندگی کی طرف جانے کی فکر ہر ہندو کرتا ہے۔ وہ دنیاوی باتوں سے کچھ اونچا اُٹھ کر رازِ ہستی جاننے کی خواہش رکھتا ہے۔ خدا تک پہنچنے کے لئے جذباتی اور ذہنی کوششوں کے متعلق اس کا رُخ صحتمندانہ رہتا ہے۔ ہندو خدا کو فکر کے ذریعے بھی جاننا چاہتا ہے اور احساس کے ذریعے بھی۔

ہندو دھرم روح کی تلاش میں، تسکین حاصل کرنے والا دھرم ہے۔ زندگی کو سکون بخشنے والی تمام طاقتوں طریقوں اور ترکیبوں کو اس نے قبول کیا ہے۔ ہندو دھرم میں استحکام اور ارتقاء پذیری دونوں کا ہی میل دکھائی دیتا ہے۔ یہ روحانی طاقت اور ثابت قدمی کے واسطے فاقہ، جاگرن، کیرتن، عبادت، تیرتھ یاترا اور یتر یگیہ وغیرہ کو بھی اہمیت دیتا ہے۔ اا فکر و نظر کے میدان میں غور و فکر، گیان دھیان، مذہبی مباحثے اور مذہبی تذکروں کی بھی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ ہندو کی تعریف کرتے ہوئے ڈاکٹر رادھاکرشنن لکھتے ہیں، "ہندو وہ ہے جو اپنی زندگی اور برتاؤ میں ویدوں کی بنیاد پر کھڑی کسی بھی مذہبی روایت کو اپناتا ہے۔ وہ لوگ ہی ہندو نہیں ہیں جو ہندو ماتا پتا کی اولاد ہیں بلکہ وہ لوگ بھی ہندو ہیں جن کے ماتا یا پتا کی جانب سے کبھی کوئی ہندو تھا، اور جو خود اس وقت اپنے کو عیسائی یا مسلمان نہیں کہتے۔

ہندو دھرم پرانے طریقوں کے غلط مورچوں پر جمے رہنے والا دھرم نہیں ہے۔
۔نہ یہ اپنے بنیادی اصولوں کو ہی جلدی چھوڑ دینے والا دھرم ہے۔ اسی طاقت کے بل پر
ں دھرم نے بہت سے انقلابوں کا سامنا نہایت اطمینان کے ساتھ کیا ہے۔
بہت سے بُرے رواجوں، روایتوں، اندھے عقاید، تعصبات، پریشان کن رسوم اور
وت چھات وغیرہ نے ہندو دھرم کے سماجی پہلوؤں کو کمزور کیا ہے۔ لیکن ہندو دھرم صرف
ہری برتاؤ کا نام ہی نہیں ہے۔ یہ جذبات عقیدت، فکر و نظر، آزاد خیالی اور بے خوفی کے جذبات
ے لبریز ایک پیمانہ ہے، جس سے ہند کہے جانے والے بہت سے لوگوں کی پیاس بجھتی ہے۔
اسی لئے کہا گیا ہے، "دوستوں سے مجھے ڈر نہ لگے، دشمنوں سے بھی میں نہ ڈروں، علم سے
مجھے خوف نہ ہو، جہالت سے بھی میں بے خوف رہوں، دن مجھے نہ ڈرائیں، رات میں بھی
نڈر رہوں۔ سب سمتیں میری دوست ہوں۔"
ہندو دھرم نے کرم کے اُصول اور پُنر جنم کے اصول سے بھی زندگی کو وسعت بخشی
ہے۔ اور اِسے ایک لافانی یقین عطا کیا ہے۔ ہندو دھرم کی باریکیاں جاننے والوں نے
ہندوؤں کو لامحدود کی طرف راغب رکھنے کے لئے جس جذباتی، ذہنی، جسمانی اور دلفریب خلش
کو پیدا کیا ہے، اُس کی مثال ملنی مشکل ہے۔
ہندو دھرم کو مختصر الفاظ میں اس طرح سمجھایا جا سکتا ہے ـــــ ہندو دھرم سے
جب محدود دنیا کے متعلق ذکر کیا جاتا ہے تو وہ کہتا ہے لامحدود کے بغیر محدود کا ذکر بیکار اور
ناممکن ہے جب اس سے موت پر بات کی جاتی ہے تو وہ اُسے نئی زندگی بتاتا
ہے۔ جب اُس سے کال (وقت) کے متعلق سوال کئے جاتے ہیں تو یہ اُسے
نورِ الٰہی کی پرچھائیں بتا دیتا ہے۔ نفس کو یہ روحانی تلاش میں رکاوٹ
مانتا ہے۔ زندگی کو یہ ایک خواب سمجھتا ہے۔ جو جلدی ٹوٹ جاتا ہے۔ اور
ہم پھر جاگ جاتے ہیں۔ کرم کے پھل سے وہ ہر انسان کا گہرا واسطہ تسلیم کرتا ہے۔

انسان کی زندگی کو یہ یہیں ختم ہونے والی نہیں مانتا۔ آتما کو ہمیشہ رہنے والی بتاتا ہے۔ سبھی مذہبی ادارے، مذہبی کتابیں، رہن سہن، برتاؤ وغیرہ کے متعلق ہندو دھرم کا خیال ہے کہ یہ دل بہلانے کی چیزیں ہیں۔ چار دن کی طاقت پر غرور کرنا بیکار ہے۔ آدمی کو وقت کا لامحدود میدان پار کرنا ہے۔ مختصر الفاظ میں یہ کہ مجھے تو ہندو دھرم کی انھیں باتوں سے خاص نسبت معلوم ہوتی ہے۔

نئی دنیا کی تعمیر

[انجمن اقوام متحدہ ۲۴ر اکتوبر ۱۹۴۵ء کو قائم کی گئی۔ اس کے مقاصد کو یاد دلانے کے لئے ہر سال اس کی سالگرہ منائی جاتی ہے۔ کسی ایسے ہی موقع پر، ہمارے سابق صدر جمہوریہ ڈاکٹر رادھا کرشنن نے پیش نظر عنوان کے تحت ایک عالمانہ تقریر کی تھی، جس کا پہلا پیرا ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔]

ہمارا کام ذہنی معیار کو بلند کرنا، سائنس کی اشاعت اور تمدن کی حفاظت ہے، لیکن یہی وہ موضوع ہیں جو آج کل طاق نسیاں کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ اقوام عالم، خواہ وہ بڑی ہوں یا چھوٹی، اپنی قومی آمدنی کا کثیر حصہ سامان جنگ بنانے میں خرچ کرتی ہیں۔ شاید وہ ممالک جن کے وسائل وسیع ہیں، تعلیم اور روزگار کو نظر انداز کئے بغیر غیر منفعت بخش فوجی اخراجات برداشت کر سکتے ہیں، لیکن غریب ممالک یہ بار گراں برداشت نہیں کر سکتے، لیکن خوف و خطر میں پھنسے ہوئے ملک اپنی قوتیں عوام کی اخلاقی اور مادی ترقی میں خرچ کرنے کے بجائے دفاع کے طریقوں پر ضائع کرنے کے لیے مجبور ہیں۔ کیا یہ بات ناقابل قیاس نہیں ہے کہ ایک طویل اور مہیب لڑائی کے بعد جس نے دنیا کو مفلوک الحال بنا دیا ہے، ہم پھر مار ڈالنے اور مرنے کے قیمتی اور ظالمانہ طریقے ایجاد کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔

احمد علی آزاد

جامعہ میں ابتدائی تعلیم کے تجربے

(۸)

انہ جلسہ

مدرسہ ابتدائی کے تعلیمی سال کا یہ آخری فنکشن ہوتا ہے۔ اسپورٹس کے ختم ہونے کے بعد نہ جلسہ اپریل کے آخر میں ہوتا تھا۔ انعامات تقسیم ہونے سے پہلے ہلکا پھلکا پروگرام پیش کیا جاتا تھا۔ ورے مغرب کے بعد یہ پروگرام ہوتا تھا۔ مدرسہ ابتدائی کی ہوسٹل کی عمارت کے صدر دروازے رش پر دریاں بچھ جاتی تھیں۔ مغربی دیواروں کے ساتھ ساتھ میزوں پر انعامات ترتیب سے رکھ جاتے تھے۔ ابتدائی کے تمام بچے دریوں کے فرش پر بیٹھتے تھے۔ ثانوی کے طلبا بنچوں پر بیٹھ جاتے تھے اور مہمانوں کے لئے کرسیاں لگا دی جاتی تھی۔ بیچ میں خاص جگہ پروگرام کے لئے چھوڑ دی جاتی تھی۔

یہ سارا پروگرام بچے پیش کیا کرتے تھے۔ اس کی تیاری ورزش اور کھیل کا استاد نگران مدر نگرانی اور ہدایات کے مطابق کراتا تھا۔ اس پروگرام کا معیار خاصہ بلند ہوتا تھا۔ پروگرام میں چھوٹی چھوٹی نقلیں اور لیزی ام ہوتا تھا۔ لیزی اَم کا پروگرام بہت اہتمام کے ساتھ پیش کیا جاتا تھا جس میں بچوں کا لباس اور مختلف رنگوں کی روشنی، جو لیزی اَم کا عمل کرنے والوں پر ڈالی جاتی تھیں اور جو بدلتی رہتی تھیں، خاص اثر پیدا کرتی۔ محمد صدیق صاحب اور احمد حسن صاحب لیزی اَم کا پروگرام ترتیب دینے میں اور پیش کرنے میں نمایاں نظر آتے تھے۔ یہ جلسہ عام طور سے شیخ الجامعہ صاحب

کی صدارت میں ہوتا تھا لیکن ایک مرتبہ ہاکی کے ایک مشہور کھلاڑی نے انعامات تقسیم کی اور اپنی ایک ہاکی مدرسہ کے بچوں کو تحفے کے طور پر دے گئے تھے۔ اس پروگرام کو دیکھنے کے غیر مقیم طلبار کے سرپرست، جامعہ کے اساتذہ اور طلبار آتے تھے۔ جامعہ کی پرانی روایت کے اول، دوم اور سوم آنے والے طلبار کے علاوہ تمام دوسرے طلبار کو بھی انعامات دیے جاتے

بچوں کی شاعری

اب تک میں نے مدرسہ ابتدائی جامعہ نگر کے اجتماعی کاموں کا ذکر کیا ہے اور ان کاموں کرانے کے دوران جو تعلیمی فائدے حاصل ہوتے ہیں ان کو بیان کیا ہے۔ ایک اچھے استاد سب سے اچھا رول یہ ہے کہ وہ مدرسہ کی طرف سے پیش کیے جانے والے پروگراموں میں پور طرح حصہ لے اور اپنی جماعت کے طلبار کو انفرادی طور پر شریک ہونے کی ہمت افزائی کرے اس کے علاوہ جماعت کا بھی پروگرام رکھے تاکہ جماعتی مقابلوں میں جماعت کے طلبار احساس کمتر محسوس نہ کریں۔ مدرسہ ابتدائی جو پروگرام پیش کرتا رہا ہے اس کی یہ بہت بڑی خوبی رہی ہے ڈراموں، جوہر ٹرانی کے مقابلوں، بچوں کے الکشن اور مسند نشینی کے جلسوں میں جہاں بچو اپنی انفرادی صلاحیتوں کے پیش کرنے کا موقع ملتا رہتا تھا وہاں اپنی جماعت کے کاموں کو بہتر پر پیش کرنے کا موقع مختلف پروجکٹس چلانے، ایک دن کے مدرسہ اور کھلی ہوا کے مدرسہ میں رہتا ہے۔

ابتدائی ششم مدرسہ ابتدائی کی آخری جماعت ہے اس جماعت کے اکثر طلبار مدرسہ تمام اجتماعی کاموں میں حصہ لیتے رہتے ہیں لیکن اپنی جماعت کے کاموں میں بھی وہ جی جان سے لگے رہتے تھے۔ ایک دن کے مدرسہ اور کھلی ہوا کے مدرسہ میں تو تمام طلبار استاد کے دست بازو ہوتے تھے اور سارا کام استاد کی ہدایات کے مطابق استاد کی نگرانی میں کرتے تھے۔ میں چھٹی جماعت کے طلبار کو چھتیس سال تک پڑھایا ہے۔ ان بچوں کے ذہنی معیار کو میں سمجھ

بھتا ہوں، اس لئے اگر بچوں کو اشعار کہنے کی ترغیب دی تو کوئی انوکھی بات نہیں کی۔
ماعت میں بچوں سے اشعار لکھوانے کا موقع اُن کی اُردو کی چھٹی جماعت کی کتاب میں "ہماری زبان"
ے سلسلہ میں آیا جس میں یہ بتلایا گیا ہے کہ اردو زبان کی ابتدار اشعار سے ہوئی اور نثر لکھنے کی
بتدا بہت بعد میں ہوئی۔ بچوں میں سے ایک دو نے برجستہ اشعار بھی کہے۔ اس کی روداد کچھ
س طرح ہے:

ان نظموں کے ترتیب دینے کا کام ابتدائی ششم کے طلبار سے اس طرح کرایا گیا کہ استاد
ماعت نے کسی عنوان مثلاً "پکنک" پر ایک مصرعہ بورڈ پر لکھ دیا اور طلبار نے اُس مصرعہ کے مطابق
ہلے ایک دو دو اشعار اپنی کاپی پر لکھے۔ ہر بچہ نے اشعار لکھنے کے بعد اپنی کاپی استاد کو دیدی۔
ہر بچہ کے اِن اشعار میں سے اصلاح کے بعد ایک دو اشعار اس قابل ہوئے جو دیئے ہوئے
مصرعہ کے مطابق ہوئے باقی اصلاح کے دوران غلط قرار دیدیئے گئے۔ اس طرح کئی بچوں کی کاپیو
میں ایک ایک دو دو اشعار صحیح ہوئے۔ ان لڑکوں نے اِن صحیح اشعار کو علٰحدہ علٰحدہ کاغذ پر نقل
کر کے استاد کو دے دیا۔ استاد نے ان اشعار کو ترتیب دے کر اُس عنوان پر نظم تیار کر دی کسی
عنوان پر کوئی مصرعہ طلبار کے تجویز کرنے پر مشورہ کے بعد بورڈ پر لکھا جاتا تھا۔ طلبار اس مصرعہ
کو اپنی کاپی پر شعر لکھنے کے لئے لکھ لیتے تھے۔ دوسرے دن اشعار لکھ کر لاتے تھے۔ کئی لڑکے
جن کی سمجھ میں نہیں آتا تھا وہ کچھ بھی لکھ کر نہیں لاتے تھے۔ مثلاً پکنک پر طلبار نے ان مضمونوں
پر اشعار لکھے:

۱۔ پھر وہی پکنک کا موسم آگیا۔

۲۔ موسم برسات کا کچھ لطف اٹھاتے جایئے۔

دیئے ہوئے عنوان پر جو مصرعہ بورڈ پر لکھا جاتا تھا اس میں سب ہی طلبار دلچسپی لیتے تھے۔ ابتدار
میں اس کا طریقۂ کار طلبار کی سمجھ میں نہیں آیا، اس لیے غلط اشعار زیادہ کہے لیکن بار بار سمجھانے
سے بچوں نے اس کا طریقہ اپنا لیا۔ پھر یہ عنوانات عام طور پر وہی ہوتے تھے جن کا وہ خود مشاہدہ

کرتے رہتے تھے یا اس میں مصروف رہتے تھے۔ مثلاً گرمی، برسات، پکنک، بچوں کا میلا، دلی کا مدرسہ، داخلہ، مدرسہ ابتدائی اور سورج کنڈ کی چڑھائی وغیرہ۔

یہ کام اس لئے نہیں کرایا گیا کہ بچوں کو شاعر بنانا مقصود تھا نہ استاد خود شاعر تھا۔ بے کیے میرے ہم جماعت جناب محمود حسین خاں صاحب (ذاکر حسین خاں مرحوم کے چھوٹے بھائی) علی گڑھ کی طالب علمی کے زمانہ میں "آزاد" تخلص عطا فرمایا تھا اور یہ کچھ ایسی ساعت میں عطا کیا تھا کہ میرے نام کا جز بن گیا۔ بہرحال کہنا یہ ہے کہ جس طرح ہر بچہ اس عمر میں چوٹی فتح نہیں کرسکتا لیکن کوہ پیمائی کرسکتا ہے، اسی طرح اس عمر میں ہر بچہ شاعر نہیں بن سکتا لیکن شعر کہنے کی کوشش کر ہے۔ شاعری اظہار خیال کا ایک ذریعہ ہے۔ اس بات کا ذکر ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم نے مدرسہ ابتدائی کے نصاب تعلیم میں، زبان سکھلانے کے طریقے کے سلسلہ میں کیا ہے۔ میں نے اس کو کرکے دیکھا اور کامیاب رہا۔

جب یہ کام شروع ہوا تو بعض بچوں نے صحیح خیال پیش کیا۔ ہر نظم کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ جماعت کے ٢٦ میں ٨ سے لے کر ١٢ طلباء تک کے اشعار ہیں۔ لکھا سب نے لیکن سب کی کوشش بار آور نہیں ہوئی۔ ایک طالب علم کا اگر ایک نظم میں شعر نہیں تھا تو دوسری نظم میں فرد شامل ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ اعتماد پیدا ہوگیا اور ہر طالب علم نے سمجھا کہ اگر کوشش کروں تو میرا شعر بھی شامل ہوسکتا ہے۔ جب نظم تیار ہوجاتی تو اسے بورڈ پر لکھ دیا جاتا تاکہ ہر طالب علم اس کو نقل کرلے، اس طرح ہر نظم ہر طالب علم کے پاس بھی محفوظ ہوجاتی تھی۔ بورڈ پر اشعار لکھتے وقت ہر شعر کے ختم ہونے پر اس طالب علم کا نام بھی لکھ دیا جاتا تھا جس کا وہ شعر ہوتا تھا۔ اس سے طلباء میں اور زیادہ کوشش کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا تھا۔

اشعار لکھوانے کے اثرات اچھے ہی ہوئے۔ بچوں کی لکھی ہوئی نظمیں ترانے اور جلسوں میں پڑھی جانے لگیں۔ آج کل کے ماحول میں جبکہ فلمی گانوں کا زور ہے اگر مدرسوں میں اس طرح کا رجحان پیدا کیا جائے تو بچے ایک حد تک اس خرابی سے محفوظ رہیں گے۔ بچوں کی تمام نظموں

اب گوپی ناتھ صاحب امن کو دکھلایا گیا۔ انھوں نے بڑی دلچسپی سے بچوں کے اشعار کا سقم دور اور بچوں کی نظموں کے متعلق ذیل کا نوٹ لکھا:

"بچوں کی یہ نظمیں قابل داد ہیں۔ یقیناً ان بچوں میں سے کچھ بڑے شاعر ہوں گے اور ادب میں نام پیدا کریں گے۔ ان کی شاعری میں وہ خرافات بالکل نہیں ہے جس کے لیے اردو شاعری بدنام ہے۔ انھوں نے اپنے مشاہدات اور جذبات سیدھے سادے الفاظ میں رکھ دیے ہیں۔ خدا ان کو اور ان کے ذوق کو برقرار رکھے۔ ان کے اساتذہ خاص طور پر جناب احمد علی صاحب قابل مبارکباد ہیں جنھوں نے اپنی تربیت سے یہ ذوق سلیم پیدا کیا۔"

گوپی ناتھ امن ۱۸ر نومبر ۱۹۶۳ء

داخلہ

زبیدہ تبتی

کھل گئے اسکول سارے لوگ اب آنے لگے
سرپرست، استاد، پڑھنے والے سب آنے لگے

شہناز انجم

کچھ تو اسکوٹر پہ آئے اور کچھ ٹیکسی پہ تھے
لے کے بچے سرپرست اب مدرسہ آنے لگے

عادل منصور

جامعہ کا نام سن کر اپنے گھر سے چل دیے
لے کے اپنے ساتھ کچھ بچوں کو وہ آنے لگے

طلعت فاطمہ

دور اداسی ہو گئی ہے ہر طرف رونق بڑھی
مدرسہ میں ہر طرف لڑکے نظر آنے لگے

عطیہ بیگم

دوستوں سے مل کے سب مسرور ہیں اور شاد ہیں
قہقہے ایسے لگائے دور تک جانے لگے

کشور

کچھ جو ساتھی فیل تھے ان کو بھی پرچہ مل گیا
ٹیسٹ کا پرچہ جو دیکھا سب ہی گھبرانے لگے

شہناز

سرپرست اب اپنے بچے چھوڑ کر جانے لگے
ان کو جاتا دیکھ کر بورڈنگ میں چلانے لگے

عادل منصور

کوئی رویا کوئی اپنے ساتھیوں سے مل گیا
وقت رخصت سرپرست ان سب کو بہلانے لگے

طلعت فاطمہ

سرپرستوں کے بچھڑنے کا تھا طاری دل پہ غم
بیٹھ کر استاد اُن بچوں کو سمجھانے لگے

گرمی

ریاض احمد	جی مرا گرمی سے گھبرانے لگا	آگ برسی جسم تھرانے لگا
"	سر مرا گرمی سے چکرانے لگا	موت کا منظر نظر آنے لگا
"	شدتِ گرمی تمازت دھوپ کی	خود بخود کشمیر یاد آنے لگا
جہانگیر علی	شدتِ گرمی سے لب پر دم ہوا	ہو گیا بے ہوش دم جانے لگا
"	کام میں اب جی نہیں لگتا مرا	اُف ری گرمی جی بھی گھبرانے لگا
نصیر احمد	آگ کی مانند تن تپنے لگا	اور پسینہ جسم سے آنے لگا
"	کیفیت گرمی کی ہو کیوں کر بیاں	ہر نفس گرمی سے گھبرانے لگا
رعنا امین	کچھ عجب ہے حال گرمی سے مرا	بھاگ کر میں باغ میں جانے لگا
زاہد حسن	شدت گرمی سے سب بے حال ہیں	حبس کی گرمی سے دم جانے لگا
عفت زاہرہ	ہے ہوا بھی بند اور گرمی بہت	سانس بھی گھٹ گھٹ کے اب آنے لگا
زیتون بیگم	اب تو سورج اور گرمانے لگا	اپنے منہ سے آگ برسانے لگا
رشید احمد	دوپہر کے وقت یہ حالت ہوئی	سر پہ سورج آگ برسانے لگا

برسات

فردوس بیگم	آسماں پر ابرِ رحمت چھا گیا	اس کی رحمت کا سماں دکھلا گیا
سلمیٰ بیگم	دوستو بارش کا موسم آ گیا	شوق پکنک کا دلوں پر چھا گیا
”	ہر طرف کالی گھٹائیں چھا گئیں	دل پہ اک مستی کا عالم چھا گیا
نکہت یاسمین	کالے بادل آسماں پر چھائے تھے	کوندی بجلی دل مرا تھرا گیا
شبیر احمد خاں	پے بہ پے بارش سے حالت یہ ہوئی	ہر طرف دریا میں طوفاں آ گیا
عامر قدوائی	ہر طرف سبزہ نظر آنے لگا	آنکھ کی راحت کا ساماں آ گیا
شفیق احمد	کالے کالے بادلوں کو دیکھ کر	پھر لبوں پر ”چل کبڈی“ آ گیا
”	آج بادل خوب برسے ہر طرف	چھت کا پانی گھر کے اندر آ گیا
شاہان سلیم	بچہ بچہ خوش نظر آنے لگا	دل پہ پکنک کا تصور چھا گیا

پکنک

برسات اور پکنک کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ برسات شروع ہوتے ہی لوگ پکنک کے لئے جانے لگتے ہیں۔ پکنک کے لیے اس مدرسہ کی ہر جماعت کا علٰحدہ علٰحدہ پروگرام بنتا ہے اور بڑی تیاریاں ہوتی ہیں۔ بچوں کے ذیل کے اشعار میں اس کی ایک جھلک موجود ہے۔

مصرع طرح تھا: پھر وہی پکنک کا موسم آ گیا

رعنا امین	آسماں پر ابرِ رحمت چھا گیا	پھر وہی پکنک کا موسم آ گیا
ابرار احمد	ابرِ رحمت آسماں پر چھا گیا	مہرِ عالم تاب بھی شرما گیا
زیتون بیگم	دوستو لو ابرِ باراں آ گیا	اور پکنک کا زمانہ آ گیا
ابرار احمد	شور درجہ میں یہ برپا ہو گیا	لفظ پکنک کا لبوں پر آ گیا

ابرار احمد	سب نے مل کر ماسٹر جی سے کہا	دل پہ پکنک کا تصور چھا گیا
عفت زہرا	مینو کھانے پینے کا بنتا رہا	لیجیے سامانِ پکنک آ گیا
ریاض احمد	کر لیا پھر ناشتے کا اہتمام	برفیاں، کیلے، سموسہ آ گیا
نسیم حلیم	ہم نے لاری بک کرائی شام تک	صبح دم لاری ڈرائیور آ گیا
عنایت اللہ	جا رہے تھے سمت سورج کنڈ کے	دل پہ اک مستی کا عالم چھا گیا
نصیر احمد	تازہ تازہ پھلکیاں پکنے لگیں	لطف پکنک کا سبھی کو آ گیا
"	دوپہر تک دھوپ میں جلتے رہے	پھر اچانک ابرِ رحمت چھا گیا
"	بادلوں سے ہلکی ہلکی سی پھوار	ٹھنڈے موسم کا سماں پھیلا گیا

پکنک

دوسرے سال جبکہ وسیم اور عطیہ وغیرہ ششم جماعت میں تھے (۶۳-۶۴) ایک دوسری نظم لکھی گئی جس کا مصرعہ تھا: "لطف گر لینا ہے کچھ پکنک منانے آئیے"۔

سید وسیم احمد

لطف گر لینا ہے کچھ، پکنک منانے آئیے — اپنا اپنا کھانا لے کر بس میں پھر آ جائیے

طلعت فاطمہ

ہلکی ہلکی سی پھواروں میں جو واں جھولے پڑیں — دوڑیے اور بھاگیے، پوری کچوری کھائیے
شام ہو برسات کی اور ایک کشتی ہو وہاں — سیر ہو دریا کی پھر اس میں نہانے جائیے

فیروز حسن

گرد سورج کنڈ کے دل کھول کر پھر پیجیے — گر وہاں انڈے ملیں تو جیب میں بھر لائیے

عطیہ بیگم

کیجیے ایسی جگہ پکنک جہاں کوئی نہ ہو — کچھ مٹھائی، کچھ سموسے ساتھ لیتے جائیے

عطیہ بیگم

لطف گر لینا ہے کچھ، سدھ کنڈ پر آجائیے　　کھیلئے اور کودیئے کیلے سموسے کھائیے

حسن حیدر

پیاس سے بے چین ہوں یا بھوک سے بیتاب ہوں　　پانی بھر کر لائیے اور خوب کھانا کھائیے

جمیل الرحمٰن

لیجیے دو چار دریاں اور چادر ساتھ میں　　پُر فضا اک جگہ پر بچھا انھیں بچھوائیے
کھانے پینے کی بہت تیاریاں کر لیجیے　　ساتھ اپنے ساتھیوں کو بھی وہاں لے جائیے

شعیب عبداللہ

سنڈے پہ لاری سے اتریں ساتھ سب سامان کے　　گھومیے چاروں طرف آکر پکوڑی کھائیے

مدرسہ ابتدائی

یہ ایک لمبی نظم ہے جو کئی طالب علموں نے مل کر لکھی ہے۔ ١٩٦١ اور ١٩٦٢ کے تعلیمی سال میں اس وقت جو طلبا، ابتدائی ششم میں تھے انھوں نے اس کے نظم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس وقت مدرسہ میں جتنے کام ہوتے تھے سب کا ذکر اس میں آیا ہے۔ بچوں کے الکشن کے اشعار نکال کر باقی اشعار یہاں لکھتا ہوں۔ اس لمبی بحر میں بھی بچوں کی کوشش خوب ہے۔ امن صاحب نے نشاط الہ آبادی کے پہلے شعر میں، عقیل، افتخار، عامرہ، ناظم الدین، شمیم، نسیم حلیم کے اشعار میں خفیف سی اصلاح کی ہے۔

نشاط الہ آبادی　　ہے شانِ ابتدائی کیسی کیا خوب پڑھائی ہوتی ہے
دلچسپ پروجکٹ چلتے ہیں اس طرح پڑھائی ہوتی ہے

ہ　　جب گھر سے جامعہ آتے ہیں دل بیٹھا بیٹھا رہتا ہے
استاد کی تسکیں ہوتی ہے، ہنس ہنس کے پڑھائی ہوتی ہے

عفت زهرہ	جب کام نہیں ہم کرتے ہیں، استاد ہمیں سمجھاتا ہے ہم غور سے باتیں سنتے ہیں، پھر دل کی صفائی ہوتی ہے
"	جب کام غلط ہو جاتا ہے، افسوس ہمیں بھی ہوتا ہے اُستاد ہدایت دیتا ہے، پھر راہ نمائی ہوتی ہے
عارف	ہم مولی گاجر بوتے ہیں، اور اُس کی خدمت کرتے ہیں ہم اچھی کھاد بھی دیتے ہیں اور خوب سنچائی ہوتی ہے
زاھد حسن	کیاری کی مینڈ بناتے ہیں اور خوب صفائی کرتے ہیں ہم کھاد اور پانی دیتے ہیں، پھر خوب کھدائی ہوتی ہے
افتخار	پکنک کے لئے بھی جاتے ہیں اور حلوہ پوری کھاتے ہیں "ہم گرم پکوڑی کھائیں گے" ہر دل میں سمائی ہوتی ہے
"	ہم طلبا، سیر کو جاتے ہیں، واں اچھے گانے گاتے ہیں ہم شام کو تھک کر آتے ہیں، پھر خوب سلائی ہوتی ہے
اقبال	بورڈنگ میں خوش خوش رہتے ہیں اور کام بہت سا کرتے ہیں جھاڑو بھی ہم دے لیتے ہیں، کمروں کی صفائی ہوتی ہے
ریاض احمد	بورڈنگ کی صفائی کرتے ہیں اور دل سے کام میں لگتے ہیں ہم مل کر اس میں رہتے ہیں، راتوں کو پڑھائی ہوتی ہے
خورشید احمد	ہم صبح کو ورزش کرتے ہیں اور شام کو کھیل میں جاتے ہیں گر چوٹ ہمیں لگ جاتی ہے، بورک کی سکائی ہوتی ہے
نسیم حلیم	نقصان کوئی کر دیتے ہیں، جرمانے ہم پر ہوتے ہیں پھر گھر پر پرچہ جاتا ہے اور خوب پٹائی ہوتی ہے
نصیر احمد	آتا ہے زمانہ میلے کا اور کام بہت سا ہوتا ہے جب کام نہیں ہم کرتے ہیں تو کان کھنچائی ہوتی ہے

نصیر احمد — راتوں کو جاگتے رہتے ہیں اور چائے بہت سی پیتے ہیں
پھر چارٹس بہت سے بنتے ہیں اُن پہ بھی لکھائی ہوتی ہے

عارفہ خاتون — ہر بچہ کام پہ لگتا ہے، میلے کی رونق بڑھتی ہے
ہر روز ڈرامہ ہوتا ہے، پھر خوب کھچائی ہوتی ہے

محمد اقبال — جب سال کا آخر ہوتا ہے پرچوں کا خوف بھی ہوتا ہے
ہم ڈٹ کر محنت کرتے ہیں، دن رات پڑھائی ہوتی ہے

ششم کی الوداعی دعوت

سال کے آخر میں ابتدائی پنجم کے طلبار ابتدائی ششم کے طلبار کو الوداعی دعوت دیتے ہیں۔ دونوں جماعتوں کے طلبار اور اساتذہ ایک جگہ جمع ہوتے ہیں۔ اس موقع کے لئے ابتدائی ششم کے طلبار نے ذیل کی نظم لکھی۔ کوثر بانو نے اس نظم کو اس انداز سے پڑھا کہ مطبخ کا ہال تالیوں سے دیر تک گونجتا رہا۔

مصرعہ طرح تھا: لیجئے ہم ششم سے جاتے ہیں

ریاض احمد	لیجئے ہم ششم سے جاتے ہیں	دعوتیں الوداعی کھاتے ہیں
نسیم حلیم	آپ پنجم سے آئیں گے اس میں	اور اب ہم ششم سے جاتے ہیں
″	چھوٹتے ہیں پرانے سب استاد	اس قدر غم بھی لے کے جاتے ہیں
ناظم الدین	اچھے استاد ابتدائی کے	ثانوی جا کے یاد آتے ہیں
ابرار احمد	کام اچھے کیے ہیں کچھ ہم نے	واسطے سب کے چھوڑے جاتے ہیں
یحییٰ	اِن کے کاموں کو یاد رکھیے گا	سبق الفت کا دے کے جاتے ہیں
نسیم حلیم	اک پروجیکٹ جو چلا یا تھا	ہم یہاں اس کو چھوڑے جاتے ہیں
رعنا امین	یاد تین زنگ کی ہم کو آتی ہے	کس قدر حوصلہ بڑھاتے ہیں

ابرار	دیدیئے سارے امتحاں ہم نے	اب تو اپنے گھروں کو جاتے ہیں
ناظم الدین	ساتویں میں ضرور جائیں گے	دل نہ محنت سے ہم چراتے ہیں
زاہد حسن	منزل ثانوی پہونچ کر ہم	پچھلی باتوں پہ مسکراتے ہیں
اختر جمیل	فیل ہم میں سے ہو گیا کوئی	شرم سے آنکھ وہ چراتے ہیں

ریل

یہ عنوان اور اس عنوان پر مصرعہ طرح دونوں بچوں کے تجویز کردہ تھے۔ مصرعہ تھا:
"لو چلی وہ ریل بل کھاتی ہوئی"

عفت زہرہ	لو چلی وہ ریل بل کھاتی ہوئی	جیسے ناگن جائے لہراتی ہوئی
"	جنگلوں میں گھومتی پھرتی چلی	ہر طرف یہ آگ برساتی ہوئی
یحییٰ	آگ کوئلہ پھینکتی جاتی ہے ریل	جا رہی ہے آگ برساتی ہوئی
رشید احمد	جنگلوں کو پار کرتی جائے گی	کوہ کے دامن سے کتراتی ہوئی
جہانگیر	پل پہ گذری خوب تھراتی ہوئی	موڑ پر مڑتی اور اٹھلاتی ہوئی
زیتون	کوہ دریا پار کرتی جائے گی	دندناتی شان دکھلاتی ہوئی
ناظم الدین	نام تھکنے کا نہیں لیتی یہ ریل	کس طرح پھرتی ہے اتراتی ہوئی
قمر رعنا	سامنے سے ریل اب جانے لگی	اک نیا انداز دکھلاتی ہوئی
عشرت	کوہ سے گذری عجب انداز سے	ناز سے سو پیچ و خم کھاتی ہوئی
"	ہر طرف پھیلا دیا اس نے دھواں	جا رہی ہے زور دکھلاتی ہوئی

باغبانی، بھٹے، بچوں کی حکومت کا الکشن، تعلیمی میلہ، ایک دن کا مدرسہ وغیرہ نظمیں پہلے آچکی ہیں۔ ج کنڈ کی چڑھائی کی نظمیں، ہمالہ کی مہمیں، پروجکٹ کے بیان میں آئیں گی۔

(باقی آئندہ)

کوائف جامعہ

جلسۂ یوم تاسیس

حسب معمول ۲۹ اکتوبر کو جامعہ کا یوم تاسیس منایا گیا۔ صبح کو ٹھیک سوا نو بجے شیخ الجامعہ صاحب نے جامعہ کا جھنڈا لہرایا، اس کے بعد شیخ الجامعہ صاحب کی صدارت میں جلسہ منعقد ہوا، جس کا انتظام اسال مدرسہ ثانوی نے کیا تھا۔ جلسے کی کارروائی کا آغاز تلاوت قرآن حکیم سے ہوا، اس کے بعد جامعہ کا ترانا گایا گیا، بعد ازاں مختلف اداروں کے طالب علموں نے مضامین پڑھے، جن میں انھوں نے جامعہ کے بارے میں اپنے تاثرات اور خیالات بیان کئے تھے۔ آخر میں شیخ الجامعہ صاحب نے تقریر کی جس میں انھوں نے فرمایا:

برادرانِ جامعہ،

ہم نے پچھلے سال اسی زمانے میں جامعہ کی گولڈن جوبلی منائی تھی۔ انسان اس عمر کو پہنچتا ہے تو اس کی نظر ماضی اور مستقبل دونوں پر ہوتی ہے، وہ بالغ تو کب کا ہو چکا ہوتا ہے، اس سن کو پہنچ جائے تو سمجھا جا سکتا ہے کہ قدرت نے اسے جتنی عقل دی ہے اس کے لحاظ سے وہ عاقل بھی ہوگا، اپنے تجربے سے اس نے سیکھنے کی باتیں سیکھ لی ہوں گی، اپنے اور اپنے کاموں کے اندر اس نے جو خامیاں دیکھی ہوں گی انھیں دور کرنے کی تدبیریں کرتا رہا ہوگا، اور اس کی آئندہ زندگی مقصد اور طریق کار کی ہم آہنگی کا کم از کم پہلے کے مقابلے میں بہت بہتر نمونہ پیش کرے گی۔ انسانی زندگی کو اداروں کی زندگی کے لئے مثال نہیں بنایا جا سکتا، پھر بھی ان میں جو لوگ کام کرتے ہیں ان کے بارے میں امید کی جا سکتی ہے کہ جیسے وہ بالغ ہونے کے بعد ادارے سے متعلق ہوئے تھے ویسے ہی وہ ادارے

کی سرگزشت اور کارگزاری اور اپنے تجربے سے فائدہ اٹھائیں گے، اور ادارے کے طریق کار میں اس کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور نظر آئے گا کہ اسے اپنا کام کرتے کرتے پچاس سال گذر گئے ہیں۔ جہاں تک اس خیال کا جامعہ سے تعلق ہے، میں اپنی رائے بیان کر دوں گا، لیکن میری مدت کار اب ختم ہونے کو ہے، اور اب ضرورت اس کی ہے کہ آپ جامعہ کے تمام مسائل پر غور کریں اور بہتری کی صورتیں نکالیں

جوبلی کا سال جیسے جیسے قریب آتا گیا ہمیں اس کی فکر ہوتی گئی کہ اس موقع سے فائدہ اٹھائیں۔ ہمیں کام چلانے کا خرچ، جسے Maintenance Grant کہتے ہیں، وزارت تعلیم سے ملتا ہے۔ کام کی توسیع اور ترقی کے لئے یو جی سی سے روپیہ ملتا ہے۔ ان دونوں ذریعوں سے جو چاہا ہو سکتا ہے اس کے لئے قوم سے چندہ مانگنا مناسب نہ تھا، اور ہمارا مقصد اگر ایک طرف یہ کہ اپنی ضرورتیں پوری کریں تو دوسری طرف یہ بھی تھا کہ قوم سے اپنا رشتہ جو ٹوٹتا ہوا نظر آرہا۔ مضبوط کریں۔ سوچنے کے بعد یہ سمجھ میں آیا کہ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کے نام سے وظائف فنڈ، مد کی نامکمل عمارت کی تکمیل اور مسجد کی تعمیر کے لئے چندہ مانگا جائے، اور جیسے کہ اب دستور ہو گیا ہر کام کے لئے ایک کمیٹی بنی، اور پھر عادت اور دستور کے مطابق شور مچنے لگا کہ کام ہونا چاہئے اور کمیٹی کچھ نہیں کر رہی ہے۔ اتفاق سے اسی زمانے میں وزیر تعلیم ڈاکٹر راؤ نے طے کیا کہ اردو کو ترقی دی کا جو وعدہ انھوں نے ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم سے کیا تھا اسے پورا کریں گے، انھوں نے ایک کانفرنس بلائی، کانفرنس نے ایک بورڈ قائم کیا، اور ڈاکٹر راؤ کی تحریک پر بورڈ کے تمام کاموں کا ذمہ دار مجھے بنا دیا گیا۔ جناب خازن صاحب کو معلوم ہوا کہ ترقی اردو بورڈ کا کام میرے سپرد ہوا ہے تو بہت خوش ہوئے، اور فرمایا کہ بورڈ کا کام آپ کیجئے، جوبلی کا میں اپنے ذمے لے لوں گا۔ مگر اسی زمانے میں حکومت ہند نے انھیں ایک کمیٹی کا ممبر بنا دیا جو فرقہ وارانہ فسادات کے بارے میں تحقیق کرنے کے لئے مقرر ہوئی تھی اور وہ اس کے جلسوں میں مصروف ہو گئے۔ جامعہ میں جوبلی کا ایک دفتر قائم کیا گیا، مگر یہاں کام شروع ہی ہوا تھا یا ہونے والا تھا کہ دفتر کا کمرہ آڈٹ پارٹی

جو جامعہ کا حساب جانچنے کے لئے آئی تھی، دیدیا گیا۔ جب منصوبوں کا نقشہ اس طرح بنتا اور بگڑتا بلکہ بننے سے پہلے بگڑتا رہے تو وہ پورے کیسے ہوسکتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہمیں پتا نہ چلا کہ توم کیا ہے اور کہاں ہے، اور جو چندہ ملا وہ اس سارے ہنگامے کے بغیر چند لوگوں کو خط لکھنے سے مل سکتا تھا۔"

تقریر کے آخر میں شیخ الجامعہ صاحب نے جامعہ کے استادوں، کارکنوں اور طالب علموں کو نئے سال کی مبارکباد دی جو ۲۹ر اکتوبر سے شروع ہوا ہے۔ جلسے کی کاروائی قومی ترانے پر ختم ہوئی جسے مدرسہ ثانوی کے طلبا نے پیش کیا تھا۔

مرحوم ذاکر صاحب کی یادگار کے سنگ بنیاد کی تقریب

ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کی یادگار کا سنگ بنیاد رکھنے کے لئے یکم اکتوبر کو، جمعہ کے دن شام کو ۵ بجے ایک جلسہ منعقد ہوا، جس کا انتظام وزارت تعلیم کی معرفت حکومت ہند نے کیا تھا اور جس میں اساتذہ اور طلبائے جامعہ کے علاوہ مختلف ملکوں کے سفیروں اور معززین شہر نے شرکت کی۔ شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب، ترقی اردو بورڈ کے جلسۂ اصطلاحات میں شرکت کے لئے جے پور تشریف لے گئے تھے۔ صرف اسی جلسے میں شرکت کے لئے وہ صبح سویرے تشریف لائے اور جلسے کے بعد اسی روز واپس تشریف لے گئے۔

جلسے کی کاروائی کا آغاز تلاوت قرآن پاک سے ہوا، اس کے بعد شیخ الجامعہ صاحب نے اردو میں تقریر کی، جس میں راشٹرپتی جناب وراہ گری وینکٹ گری کا خیر مقدم کیا گیا تھا۔ شیخ الجامعہ صاحب کی تقریر کے بعد وزیر تعلیم جناب سدھارتا شنکر رے نے انگریزی میں تقریر کی، جس میں مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیا اور ان کی خدمات کا اعتراف کیا۔ آخر میں راشٹرپتی سے سنگ بنیاد رکھنے کے لئے درخواست کی۔ راشٹرپتی نے سنگ بنیاد رکھنے کے بعد تقریر کی۔ راشٹرپتی اور شیخ الجامعہ کی تقریریں جو لکھی ہوئی تھیں اس شمارے کے شروع میں شامل ہیں۔

وزیر تعلیم کی تقریر زبانی تھی، جس کا افسوس ہے نوٹ لیا نہیں جا سکا۔

سنگ بنیاد کی عبارت اردو، ہندی اور انگریزی میں ہے، جو الگ الگ تین پتھروں کندہ کی گئی ہے اور ان تینوں پتھروں کو اس طرح ایک ساتھ جوڑ دیا گیا تھا کہ راشٹرپتی نے ان کو ایک ہی ساتھ نصب فرمایا۔ اردو کی عبارت حسب ذیل ہے اور جس طرح یہاں لکھی گئی ہے اسی طرح پتھر پر کندہ کی گئی ہے۔ ملاحظہ ہو:

ڈاکٹر ذاکر حسین

بھارت کے راشٹرپتی

(۱۳ر مئی ۱۹۶۷ء ——— ۳ر مئی ۱۹۶۹ء)

یہ یادگار

بھارت کی جنتا نے اپنی محبت اور پریم کو ظاہر کرنے اور مرحوم کی قومی خدمات کا دل سے اعتراف کرنے کے لئے قائم کی

بھارت کے راشٹرپتی

شری وراہ گری وینکٹ گری

نے یکم اکتوبر ۱۹۷۱ء کو اس کا سنگ بنیاد رکھا

اس یادگار کی تعمیر کا کام ۲۹ر اکتوبر کو جو قیام جامعہ کی تاریخ ہے، باقاعدہ شروع کر دیا گیا ہے۔

بچوں کی حکومت کی مسند نشینی

طلبائے مدرسہ ابتدائی کی انجمن "بچوں کی حکومت" کی ۱۵ر اکتوبر کو مسند نشینی کی رسم ادا کی گئی۔ جلسے کی کاروائی کا آغاز تلاوت قرآن حکیم سے کیا گیا۔ نئے عہدہ داروں اور کابینہ کے نئے اراکین کا تعارف کرایا گیا، الکشن کی رپورٹ، سالانہ رپورٹ اور نئے منتخب صدر کا خطبہ صدارت پڑھا گیا۔ الکشن کی رپورٹ کا آغاز حسب ذیل الفاظ میں تھا:

ہمارے مدرسے کا الکشن بھی کیا عجیب چیز ہے، کھیل کا کھیل اور کام کا کام،

سیاست کی اچھی خاصی تعلیم اور لڑکوں کے اچھلنے کودنے کا انوکھا سامان۔ اگر کسی کے پاس وقت ہو تو اس سارے پروگرام کو آکر دیکھے اور سمجھے کہ سیاست بڑے لوگ ہی نہیں چھوٹے بچے بھی جانتے ہیں اور بہت سے کاموں میں تو بڑوں سے آگے بڑھے ہوئے ہیں....“

اس رپورٹ میں ایک دلچسپ واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے، قارئین جامعہ کی دلچسپی کے لیے نیچے نقل کیا جاتا ہے:

”اس موقع پر ایک دلچسپ بات یہ ہوئی کہ اول جماعت کے ایک ننھے ووٹر کو جب بیلٹ پیپر دے کر پردہ کے پیچھے بھیجا گیا تو وہاں سے واپس آنے میں دیر ہوئی تو آپا جان نے جا کر دیکھا کہ آخر کیا کارستانی ہو رہی ہے۔ دیکھا تو ننھے منے ووٹر صاحب بیلٹ پیپر ہاتھ میں لئے آنکھوں میں آنسو بھرے کچھ پریشان کھڑے ہیں۔ انھوں نے پوچھا بھئی کیوں کھڑے ہو، ووٹ کیوں نہیں ڈالتے؟ کہنے لگے ہمیں یاد نہیں رہا کس کو ووٹ دینا ہے....“

سالانہ رپورٹ میں، پچھلے صدر نے سال بھر کی کارگذاریوں کی تفصیل بیان کی اور خطبۂ صدارت میں نئے صدر نے اپنے ارادوں اور منصوبوں کا ذکر کیا اور وزیروں کو ان کی ذمہ داریاں یاد دلائیں۔

پچھلے سال مسند نشینی کے موقع پر طالب علموں نے اس پر اپنی خوشی کا اظہار کیا تھا کہ ان کا مطبخ الگ کر دیا گیا ہے اور اس کا جملہ انتظام ان کے ہاتھ میں ہے، اپنی خوشی کا اظہار انھوں نے ایک قوالی کی شکل میں کیا تھا۔ اُس وقت شیخ الجامعہ صاحب نے اپنی تقریر میں باورچی خانے اور ڈائننگ ہال کی صفائی پر خاص طور پر زور دیا تھا۔ امسال مسند نشینی کی کاروائی سے پہلے شیخ الجامعہ صاحب کو باورچی خانہ اور ڈائننگ ہال دکھلایا گیا۔ اس ایک سال کے اندر بہت سے نئے کمرے بنوائے گئے اور باورچی خانے کو جدید طریقوں پر بنایا گیا، جس کا مسند نشینی سے

قبل شیخ الجامعہ صاحب نے افتتاح فرمایا۔

امسال شیخ الجامعہ صاحب نے اپنی تقریر میں وزیر آرائش سے ایک نئی فرمائش کی۔ انھوں نے فرمایا کہ مدرسہ کے سامنے لان کو بہتر بنانے اور خوبصورت پھول لگانے کے منصوبے بنائے گئے ہیں، امید ہے کہ بچوں کی حکومت کے وزیر اس منصوبے کو کامیاب بنانے میں ہماری مدد کریں گے۔ (عبداللطیف اعظمی)



تعارف و تبصرہ

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہے)

دہانِ زخم — اختر انصاری

سائز $\frac{18 \times 22}{8}$، حجم ۴۵۵ صفحات، سال اشاعت ۱۹۷۱ء، مجلد مع گرد پوش،

قیمت: پندرہ روپے، ملنے کا پتہ: انوار بک ڈپو، مسلم یونیورسٹی مارکٹ، علی گڑھ (یوپی)

جناب اختر انصاری ان چند گنے چنے شعرا میں سے ہیں جو اچھے نثر نگار بھی ہیں، موصوف اپنے پیشے کے لحاظ سے معلم ہیں اور ان کا خاص مضمون تعلیم ہے، مگر قدرت نے انھیں تصنیف و تخلیق اور شعرو شاعری کی بھرپور صلاحیت اور ستھرا ذوق عطا کیا ہے، جس کا دائرہ بہت وسیع اور متنوع ہے۔ وہ ایک سنجیدہ اور منفرد افسانہ نگار، سلجھے ذہن و دماغ کے تنقید نگار اور فنکار و سحر کار شاعر ہیں۔ ان کے افسانوں کے مجموعے، "اندھی دنیا"، "نازو"، "خونی" اور "لو ایک قصہ سنو" ان کی تنقیدی کتابیں "افادی ادب" اور "ایک ادبی ڈائری" اور ان کے کلام کے مجموعے "نغمۂ روح"، "آب گینے"، "خوناب"، "روحِ عصر" اور "خندۂ سحر" شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ اب ان کے کلام کا تازہ مجموعہ "دہانِ زخم" کے نام سے شائع ہوا ہے، جو موصوف کے قطعات، غزلیات، منظومات، مثنویات اور رباعیات پر مشتمل ہے۔ مجموعے کا یہ نام غالب کے اس شعر سے لیا گیا ہے:

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی
مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی

یوں تو سبھی اصناف سخن میں اختر انصاری صاحب نے طبع آزمائی کی ہے اور بقول نیاز فتحپوری

"ایک ذہنِ خلاق اور فکرِ صحیح کے آثار ہر جگہ نمایاں ہیں۔" مگر قطعات میں خاص طور پر ان کی انفرادیت اور خصوصیت بہت نمایاں اور ممتاز ہے۔ فراق گورکھپوری کے قطعات بھی بہت مقبول اور مشہور ہیں، مگر خود فراق نے اختر انصاری کے قطعات کی بے حد تعریف کی ہے۔ انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے: "اختر انصاری کے یہاں بھی عشقیہ جذبات سے تھرتھراتے ہوئے وہ قطعات ہیں جو ہمارے دکھتے ہوئے دلوں کی دھڑکنوں کو اور تیز کر دیتے ہیں اور ہماری سانس اور آواز رک سی جاتی ہے۔" ڈاکٹر خلیل الرحمان اعظمی کا خیال ہے کہ "ان کی شاعری میں مجموعی طور پر ان کے قطعات ہی ان کی بہتر نمایندگی کرتے ہیں۔" اس لئے یہاں صرف قطعات کے کچھ نمونے پیش کئے جاتے ہیں۔ نہ جانے کیوں ان کی شاعری میں بالخصوص قطعات میں رنج و غم کا اظہار، مختلف پیرائے میں بڑی کثرت سے ملتا ہے۔ ذیل کے قطعات سے اس کی کیفیت اور شدت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے:

الم نے چھین لیے ہائے وہ خوشی کے دن
وہ انبساط کی راتیں، وہ دل لگی کے دن
بجھی ہوئی ہے طبیعت، اداس رہتا ہوں
کہاں گئے مرے اللہ! وہ خوشی کے دن

خوں بھرے جام انڈیلتا ہوں میں
ٹیس اور درد جھیلتا ہوں میں
تم سمجھتے ہو شعر کہتا ہوں
اپنے زخموں سے کھیلتا ہوں میں

ہر چند نامراد محبت ہے بے زباں
موسیقیٔ حزیں ہے مگر اس کی ترجماں
بجتا ہے جب ستار تو یہ جانتا ہوں میں
دہرا رہا ہے کوئی میرے غم کی داستاں

ہمیشہ وقتِ سحر جب قریب ہوتا ہے
ہوائیں چلتی ہیں، سارا جہان سوتا ہے
تجھے خبر نہیں او غم سے بے خبر! اُس وقت
ترے پڑوس میں اک غم نصیب روتا ہے

میرے مایوس دل میں اے اخترؔ!
اس طرح سے امید آتی ہے
جس طرح اک اداس چہرے پر
مسکراہٹ سی کھیل جاتی ہے

ہمیشہ جاگتے ہی جاگتے سحر کر دی
کبھی ہنسا، کبھی آہیں بھریں، کبھی رو دیا
بنا کے چاند کو اپنا گواہ کہتا ہوں
میں آج تک شبِ مہتاب میں نہیں سویا

ایک آخری قطعہ ملاحظہ ہو، جس کا عنوان ہے "مجموعۂ کلام":

میرا طرزِ سخن نرالا ہے — میں نے نالوں کو لے میں ڈھالا ہے
میرا مجموعۂ کلام اخترؔ — خون کے آنسوؤں کی مالا ہے

غم و اندوہ اور یاس و محرومی کا احساس و اظہار کچھ قطعات ہی تک محدود نہیں، غزلوں اور نظموں میں بھی اس کا شدت اور کثرت سے اظہار ہوا ہے، جیسے محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کو صرف ناکامی و محرومی اور رنج و غم سے ہی واسطہ پڑا ہے، پوری زندگی مسرت و خوشی اور اطمینان و سکون سے یکسر خالی ہے۔ اس مجموعے میں ایک طویل مثنوی بھی شامل ہے، جس کا عنوان ہے "درد و داغ"۔ یہ دراصل شاعر کی رودادِ حیات ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ غمِ ذات اور غمِ روزگار نے ان کے دل و دماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ کہتے ہیں:

جلتا ہوں مگر زیست پہ ایمان نہیں   دل شاد نہیں، سینہ پر ارمان نہیں

مگر اس مایوسی اور ناکامی میں بھی نئی دنیا اور نئے آدم کی تلاش جاری ہے۔ کہتے ہیں:

رہتی ہے کسی اور ہی عالم کی تلاش   یعنی نئی دنیا، نئے آدم کی تلاش

ماہنامہ آجکل ــــــ فلم نمبر

ایڈیٹر: شہباز حسین
سب ایڈیٹر: نند کشور وکرم

جناب شہباز حسین صاحب نے "آجکل" کی ادارت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے بعد اس کی شکل و صورت کو بہت بہتر بنا دیا ہے، اسی کے ساتھ دلچسپ اور مفید مضامین کا بھی اضافہ کیا اور مخصوص موضوعات پر خصوصی نمبروں کا سلسلہ شروع کیا۔ فلم نمبر اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ فلم عام طور پر غیر سنجیدہ بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ گھٹیا موضوع سمجھا جاتا ہے، اس لئے سنجیدہ اور معیاری ادبی اور علمی رسالوں نے اس سے اپنے صفحات کو آلودہ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ پھر "آجکل" جیسے ادبی پرچے نے فلم نمبر نکالنے کی بدعت کیوں کی، اس پر "ملاحظات" میں روشنی ڈالتے ہوئے کہا گیا ہے کہ:

> "فلموں کا ہماری زندگی سے گہرا تعلق ہے، یہ ایک ایسا میڈیم ہے جس کے اثرات بڑے اہم اور گہرے ہیں اور ہماری توجہ کے طالب ہیں، خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ ہندوستان میں فلموں کے جمالیاتی اور سماجی پہلو پر بہت کم بحث کی گئی ہے... اس کے ماسوا فلم تعلیم و تدریس، معلومات کی بہم رسانی، سائنسی ایجادات و انکشافات سے واقفیت کا نہایت اہم ذریعہ ہے... اس کی ضرورت و اہمیت کے پیش نظر ہم نے فلم نمبر نکالنے کا فیصلہ کیا تاکہ ان تمام امور پر روشنی ڈالی جا سکے جو فلموں کی موجودہ افسوسناک صورت حال کے ذمہ دار ہیں۔"

اس نمبر کے خاص خاص عنوانات حسب ذیل ہیں:

ہندوستانی فلموں کے پچھتر سال۔ ہندوستانی فلموں کا آغاز و ارتقا۔ بین الاقوامی میلے اور ہماری فلمیں۔ بھارت میں فلمی آلات کی تیاری۔ فلم کیسے بنتی ہے۔ ڈاکومنٹری فلمیں۔ چلڈرنس فلم سوسائٹی۔ علاقائی زبانوں کی فلمیں۔ وغیرہ۔ فلمی دنیا سے تعلق رکھنے والی اہم شخصیتوں کی تصاویر بھی شامل ہیں۔ بڑے سائز پر ۱۴۸ صفحات۔ قیمت درج نہیں۔ ملنے کا پتہ: پبلیکیشنز ڈویژن۔ پٹیالہ ہاؤس۔ نئی دہلی ۱

(عبداللطیف اعظمی)

Regd. No. D - 768 November, 1971

The Monthly JAMIA

JAMIA NAGAR, NEW DELHI-25

جامعہ

جامعہ ملّیہ اسلامیہ دہلی

جامعہ

سالانہ چندہ
چھ روپے

قیمت فی پرچہ
پچاس پیسے

جلد ۶۴ | بابت ماہ دسمبر ۱۹۷۱ء | شمارہ ۶

فہرست مضامین

مجلسِ ادارت

پروفیسر محمد مجیب — ڈاکٹر سید عابد حسین

ڈاکٹر سلامت اللہ — ضیاء الحسن فاروقی

مدیر

ضیاء الحسن فاروقی

خط و کتابت کا پتہ

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی مطبوعہ: یونین پریس دہلی ٹائٹل: دیال پریس دہلی

شذرات

خودستائی ایک بُرائی ہے، بظاہر اس بُرائی کا کوئی اثر دوسرے پر نہیں پڑتا ہے، لیکن اس کی عادت پڑجائے تو انسان کے نفس کو اس کے بغیر سکون نہیں ملتا، اور وہ ایک طرح کے غرور میں مبتلا ہوجاتا ہے پھر اس کے دو نتیجے ظاہر ہوتے ہیں: ایک یہ کہ وہ دوسروں سے ستائش کی تمنا رکھتا ہے اور یہ تمنا پوری نہ ہو تو دوسروں سے اس کے تعلقات پر اثر پڑتا ہے، دوسرے یہ کہ دوسروں کی خوبیاں اسے خوبیاں نہیں نظر آتیں، وہ بھولے منہ کبھی کسی کے اچھے کام کی تعریف نہیں کرے گا، موقع ہوگا تو اُلٹا بُرائی کرے گا۔ خود کبھی اس پر کوئی اعتراض یا تنقید کرے تو وہ بپھر جائے گا، ناراض ہوگا اور انتقام پر اُتر آئے گا۔ غرور کے معنی فریب کے ہیں یعنی ایسا شخص اس فریب میں مبتلا رہتا ہے کہ اُس جیسا کوئی نہیں، پھر وہ اس بات کا اظہار چاہتا ہے، کوئی اور نہیں کرتا تو وہ طرح طرح کے حیلے بہانے چھانٹ کر یہ کام خود انجام دیتا ہے۔

ہم نے مذہبی اور آزاد خیال دونوں طبقوں میں ایسے لوگ دیکھے ہیں جو رسمًا اپنے نام کے ساتھ و گفتگو یا تحریر میں اپنے ذکر کے ساتھ 'احقر'، 'ناچیز' اور 'خاکسار' وغیرہ لفظوں کا استعمال کثرت سے کرتے ہیں حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ روزمرہ کے معاملات میں، ان جیسا سخت دل، مغرور اور تنگ نظر مشکل سے لے گا، خودستائی کا ایک نتیجہ اس قسم کی منافقت بھی ہے جو قول اور فعل دونوں میں سو بھیس بدل کر آتی ہے ر ایسے اشخاص کے اخلاق کے ساتھ جماعت کے اخلاق کی بھی بیخ کنی کرتی ہے۔ ایک بزرگ سے ملاقات ری، پانچ منٹ کی بات چیت میں بلاشبہ انھوں نے آٹھ دس بار احقر اور ناچیز کی صفت اپنے لئے تعمال کی اور اس انداز سے، اس لب و لہجہ سے گویا اُن پر خشیت الٰہی کا غلبہ ہے، سب سے زیادہ گنہگار پنے آپ کو سمجھتے ہیں، روزِ قیامت کا ایسا دھڑکا لگا ہے کہ آواز گلوگیر ہوئی جاتی ہے، لیکن چند ہی

روز بعد معلوم ہو گیا کہ یہ حضرت رنگے سیار ہیں، وقف کے مکان میں تیس روپے ماہانہ پر عرصہ سے رہتے ہیں، وقف کہتا ہے کہ مکان خالی کر دیجئے، مرمت کرادی جائے اور کسی دوسرے کو کرایہ پر دے دیا جائے تو اس سے تین سو روپے ماہانہ آمدنی ہو گی، اور اس سے ایک کے بجائے دو چار محتاجوں اور بیواؤں کی امداد ہو سکے گی۔ لیکن وہ کسی قیمت پر مکان خالی نہیں کرتے اور کہتے ہیں قانونی چارہ جوئی کیجئے۔ اس کے علاوہ ان کے اور کارنامے بھی ہیں اسی نہج کے۔

ایک بزرگ اور ہیں جو صحافی اور عالم ہیں، صف اول کے اہل قلم میں ان کا شمار ہوتا ہے، ساتھ ہی صوفی صافی ہونے کا دعویٰ ہے، قال اللہ اور قال الرسولؐ کہتے زبان نہیں تھکتی، تصوف کا غلبہ اس قدر ہے کہ اپنے آپ کو کمترین، ہیچمداں اور نالائق ترین انسان لکھتے اور کہتے ہیں لیکن اندر نفس ویسا ہی موٹے کا موٹا معلوم ہوتا ہے، کیونکہ خود ستائی کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے، اگر کوئی مراسلہ اُن کے اخبار کی تعریف، ان کی کسی تحریر کی توصیف میں آتا ہے، تو پہلے تو وہ اُسے اپنے اخبار میں بعینہٖ چھاپ دیں گے اور جتنے توصیفی الفاظ اس مراسلے میں ہیں ان پر نمبر لگا کر نیچے فٹ نوٹ دیں گے، کچھ اس طرح کے: "یہ آپ نے کیا لکھدیا، من آنم کہ من دانم"، "خواہ مخواہ شرمندہ کرتے ہیں، مجھ میں یہ سب کہاں، جو کچھ ہے اللہ کی طرف سے ہے"، وغیرہ وغیرہ، اب کوئی پوچھے کہ آپ نے یہ مراسلہ جو آپ کی تعریف میں تھا، شائع ہی کیوں کیا، اور شائع ہی نہیں کیا، تمام توصیفی کلمات پر نمبر لگائے گئے اور حاشیے میں فٹ نوٹ لکھے گئے، یہ سب کیا ہے، قرآن اور حدیث کے مدت العمر کے مطالعے کا نتیجہ اگر یہ ہے کہ گوشت کا وہ لوتھڑا جسے دل کہتے ہیں، لوتھڑا ہی رہا، ذرا بھی اس کی اصلاح نہ ہوئی، تو پھر کسی تعلیم یافتہ شخص کو جو برائی کو دل سے برا سمجھتا ہے، بھلائی کے بھلا ہونے کا دل سے یقین رکھتا ہے، اور اس لئے اعمال اور برتاؤ میں صاف ستھرا ہے، برا کیوں سمجھئے، اس پر فقرے کیوں کسئے اور اپنے قلم کو اس کی برائی سے ملوث کیوں کیجئے، لہٰذا قرآن و حدیث پر رحم کیجئے، انھیں اپنا دام تزویر تو نہ بنایئے۔

قارئین جامعہ کو اخباروں سے خبر مل ہو گی کہ ۴ نومبر ۱۹۷۱ء کو صبح ۵ بجکر ۴۰ منٹ پر حیدرآباد میں ڈاکٹر سید عبداللطیف کا اسیؔ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا، مرحوم میں بہت سی خوبیاں تھیں، اور سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ ایک شریف انسان اور ایک اچھے عالم تھے، وہ ۱۱ ستمبر ۱۸۹۱ء کو کرنول (آندھرا پردیش) میں پیدا ہوئے، ان کے والد حضرت سید شاہ حسین الحسینی کرنول کے مشہور عالم و صوفی اور بزرگ طریقت تھے، خاندان کے متصوفانہ اثرات و روایات کی چھاپ مرحوم پر گہری تھی، اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ وہ عمر بھر ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا کے بغیر خاموش خدمت کرتے رہے۔ جامعہ عثمانیہ میں وہ عرصہ تک انگریزی کے استاد رہے، اُن کو انگریزی زبان اور ادب پر خاص قدرت تھی، ادبیات اُن کا مضمون تھا اور کنگس کالج لندن میں انھوں نے اپنا پی ایچ ڈی کا مقالہ "اردو ادب پر انگریزی ادب کے اثرات" کے موضوع پر لکھا تھا۔ غالبؔ کی شاعری سے متعلق ان کی باتوں سے اختلاف کیا جاسکتا ہے لیکن اِسے سبھی تسلیم کرتے ہیں کہ غالب کے کلام کی تاریخی ترتیب کی طرف سب سے پہلے انھوں نے ہی توجہ دلائی اور غالبؔ کی تنقید کے لئے جن اصولوں پر زور دیا ان میں سے کئی اب بھی مقبول ہیں۔ لیکن قدرت کو ادب سے کہیں زیادہ ان سے مسلمانوں اور علوم اسلامی کی خدمت لینی مقصود تھی۔ اس سلسلے میں ان کے علمی کارنامے انھیں ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔ ان کے دو مقالے جو تقسیم ہند سے پہلے شائع ہوئے ملک کے ہر طبقے میں مقبول و مشہور ہوئے، ان میں سے ایک کا عنوان ہے "ہندوستانی مسلمانوں کی تہذیب" اور دوسرے کا "ہندوستان کے تہذیبی منطقے"۔ انھوں نے مسلمانوں کے مسائل کی ترجمانی کے لئے ایک انگریزی ہفتہ وار اخبار کلیرین بھی نکالا، پولیس ایکشن کے بعد تھوڑے دنوں ان پر یاس کی کیفیت طاری رہی، لیکن جلد ہی انھیں اپنا منصب یاد آیا اور ۱۹۵۲ء میں اپنی وہ معرکۃ الآرا تصنیف شائع کی جس کا چرچا اب تک، ہندوستان اور بیرون ہندوستان کے علمی حلقوں میں ہوتا ہے، کتاب انگریزی میں ہے اور عنوان کا ترجمہ ہے "وہ ذہن جس کی قرآن تعمیر کرتا ہے"۔ اسی سال مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے تعاون سے آپ نے انسٹی ٹیوٹ آف انڈو مڈل ایسٹ کلچرل اسٹڈیز قائم کیا، مرکزی اور ریاستی حکومتوں کی امداد سے اس انسٹی ٹیوٹ نے اب تک کم و بیش چالیس مطبوعات شائع کی ہیں، ۱۹۵۴ء سے ۱۹۵۸ء تک آپ مولانا ابوالکلام آزاد کے ترجمان القرآن کے انگریزی ترجمے میں مصروف رہے۔ اس ترجمہ کی دو جلدیں ایشیا پبلشنگ ہاؤس بمبئی سے شائع ہو چکی ہیں، تیسری جلد زیر طباعت ہے۔ مرحوم کا آخری علمی کارنامہ قرآن شریف کا انگریزی ترجمہ ہے جو دسمبر ۱۹۶۸ء میں شائع

ہوا۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ لفظی ترجمہ نہیں ہے بلکہ اس میں قرآن مجید کی روح کو انگریزی زبان میں ڈھالا گیا ہے۔ مرحوم عرصہ سے بیمار چلے آرہے تھے، بینائی بھی بہت کمزور ہو گئی تھی، لیکن اس عالم میں بھی برابر قرآن کی خدمت کا خیال رہتا، چنانچہ انھوں نے علالت کے دوران ایک قرآنی ٹرسٹ قائم کیا اور اپنی تمام تصانیف کا حق اشاعت اس ٹرسٹ کے حوالے کر دیا اور اس کے ساتھ بیس ہزار روپے کی رقم بھی ٹرسٹ کے سپرد کی۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کبھی دنیا کے پیچھے نہیں دوڑے، اسی لئے کبھی مصلحت اندیشی سے کام لینے کی ضرورت بھی پیش نہیں آئی، استغنا اور بے نیازی سے زندگی گذار کر اپنے پیدا کرنے والے سے جا ملے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کے مراتب بلند سے بلند تر کرے۔

۱۸ر نومبر کو یہ افسوسناک خبر ملی کہ لاہور میں ۱۶ر نومبر کو مولانا غلام رسول مہر کا انتقال ہو گیا۔ وہ ۸۷ برس کے تھے۔ مولانا مہر غالب اور اقبال کے عاشقوں میں تھے اور مولانا ابوالکلام آزاد کو اس صدی کا سب سے بڑا عالم دین تصور کرتے تھے۔ انھوں نے غالباً ۲۱-۱۹۲۰ء میں مولانا آزاد کی امامت پر بیعت بھی کی تھی۔ وہ ایک بلند پایہ صحافی، ادیب اور سیرت نگار تھے اور اخبار زمیندار سے عرصہ تک وابستہ رہنے کے بعد انھوں نے مولانا عبدالمجید سالک کے ساتھ مل کر روزنامہ انقلاب جاری کیا۔ غالب پر ان کی کتاب اردو ادب میں ایک بڑا اضافہ ہے، سیرت سید احمد شہیدؒ اُن کی برسوں کی محنت کا نتیجہ ہے، ان کی تحریک سے متعلق بھی انھوں نے کتابیں لکھیں، ان کتابوں کے تقریباً تمام معلوم ماخذوں کو کھنگال کر انھوں نے یہ کارنامہ انجام دیا جو یادگار رہے اور عرصہ تک سید احمد شہیدؒ اور ان کے رفقاء کے سوانح اور ان کی تحریک کی تاریخ کے طالب علموں کو اس سے فیض پہونچتا رہے گا۔ غالب، اقبال، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا محمد حسین آزاد پر ان کی تحریریں شرمۂ چشم اہل دانش ہیں، معلوم ہوا ہے کہ اُن کا ایک قابل ذکر کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے مولانا آزاد کے الہلال کے اداریوں کی مدد سے سیرت النبیؐ مرتب کی ہے، یقیناً یہ ایک منفرد تالیف ہوگی، ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنی رحمت خاص سے نوازے اور اعلیٰ علیین میں جگہ دے۔ آمین۔

پروفیسر محمد مجیب

رپورٹ شیخ الجامعہ

(۵ر نومبر ۱۹۷۱ء)

جناب امیر جامعہ، جناب ڈھلن صاحب، خواتین و حضرات!

ہر ملک اور قوم میں ایسے لوگ ہوتے ہیں جو اپنی طبیعت سے انصاف پسند ہوتے ہیں، اور ہر سماجی نظام میں ایسے عہدے ہوتے ہیں جن کا حق وہی ادا کرسکتا ہے جو ملکی، غیر ملکی اور بین الاقوامی قانون سے پوری واقفیت رکھتا ہو اور انصاف پسندی کا مثالی نمونہ بن سکے۔ جامعہ کی بڑی خوش قسمتی ہے کہ اس مبارک موقع پر ہندستان کے ایک سابق چیف جسٹس اور لوک سبھا کے موجودہ اسپیکر ایک ساتھ رونق افروز ہیں۔ انصاف کرنا بہت مشکل ہوتا ہے، اور میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ اس جج کے لیے زیادہ مشکل ہوتا ہے جسے حق بات کو وکیلوں کی لچھے دار دلیلوں کی چھان بین کرکے نکالنا ہوتا ہے۔ یا ایسے جلسوں کی صدارت کرنے والے کے لئے جو مختلف سیاسی پہلوانوں کا اکھاڑہ ہوتے ہیں، مگر ہندوستان کا ہر شہری اس قابلیت، ہمت اور حق شناسی پر رشک کرسکتا ہے جس نے ہمارے امیر جامعہ اور آج کے مخصوص مہمان کو ممتاز کیا ہے۔ جناب ڈاکٹر ڈھلن صاحب اب بھی کھولتے جذبات کو ٹھنڈا کرنے، زور آزمائی کے آرزومندوں کو قابو میں رکھنے میں مصروف ہیں، اور ہم تقریباً آپ کی ہر روز کی سرگذشت سے سبق لے سکتے ہیں۔ خاص طور سے ہمارے وہ نوجوان جو سمجھتے ہیں کہ ہنگاموں کو برپا کرنا بہادری کی بات ہے اور جنھیں اس کا اندازہ ہی نہیں کہ

آمادۂ پیکار طاقتوں کو قابو میں رکھنا کتنی اہم اور صبر آزما خدمت ہے۔

حکومت ہند نے اپنے، دہلی کی حکومت اور کارپوریشن کے درمیان اختیارات کی جو تقسیم کی ہے اس کی پیچیدگی کی شکایت میں ہر سال کرتا ہوں، اگرچہ یہ معلوم ہے کہ اس سے کوئی فائدہ نہیں۔ بہرحال، اب معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا ماسٹر پلان منظور ہو جائے گا اور ہم اُن عمارتوں کو بنانے کا کام شروع کر سکیں گے جس کے لیے ہم کو یو جی سی سے روپیہ ملا ہے۔ ان عمارتوں میں سے بعض جوبلی کی یادگار ہوں گی، جس کے لیے یو جی سی نے ساڑھے سات لاکھ کا عطیہ دیا تھا، بعض کا تعلق فورتھ فائیو ایر پلان سے ہے۔ کتب خانہ کی عمارت امید ہے ڈیڑھ مہینے میں مکمل ہو جائے گی، اور سائنس بلاک، جس کا کام اس وجہ سے رک گیا تھا کہ اس کا نقشہ منظور نہیں ہوا تھا، جلد بننا شروع ہو جائے گا۔ جن دشواریوں کا ہمیں سامنا کرنا پڑا ہے وہ ایسی نہیں ہیں جن سے ہمت بلند ہوتی ہے یا مزاج میں استقلال پیدا ہوتا ہے، یہ صرف دفتری طریق کار کی خامیاں ہیں جو انسان کو بہتر انسان نہیں بناتی ہیں بلکہ پکار پکار کر کہتی ہیں کہ بعض اخلاقی اصولوں کو چھوڑے بغیر اس دنیا میں اپنا مطلب حاصل نہیں کر سکتا۔ مگر اسی دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو مشکلیں کسی قدر آسان بھی کر دیتے ہیں۔ میں دہلی کے میئر، جناب ہنس راج گپتا صاحب کا بہت مشکور ہوں کہ انھوں نے دو مرتبہ اس جرمانے میں تخفیف کرا دی جو جامعہ پر تعمیر کا کام شروع کرنے میں بے صبری دکھانے کی وجہ سے لگا تھا، اور انھیں کی ہدایت کا نتیجہ ہے کہ کارپوریشن کے دفتروں میں ہمارے معاملات پر نسبتاً جلد غور کیا جانے لگا ہے۔

جامعہ کے بنیادی اصولوں میں سے ایک یہ ہے کہ کارگذاری کا اندازہ کرنے کے لیے روپیوں اور عمارتوں کا شمار نہ کیا جائے بلکہ یہ دیکھا جائے کہ شوق کے آثار کہاں اور کس شکل میں نمایاں ہوئے ہیں اور مجھے اپنے اندر زندگی کے آثار اس وقت نظر آئے ہیں جب میں کسی کے شوق کو پورا کرنے میں مدد دے سکوں۔ یو جی سی نے جوبلی کے موقع پر جو گرانٹ دی تھی اس کا ایک حصہ اس کام کے لیے تھا جسے ہم کسی زمانے میں آرائش بلدہ کہتے تھے، اور میں نے

۱۹۷۸ء کے شروع میں جناب مدھوسدن دت صاحب سے درخواست کی تھی کہ وہ اس کام کو
ذمے لیں۔ وہ اس میں اس طرح لگ گئے کہ مجھے بار بار انھیں احتیاط اور اعتدال کی
ملت سمجھانے کی ضرورت پڑی۔ اس کا ان پر کچھ اثر نہ ہوا اور وہ دھوپ اور گرمی
شدت کا خیال کیے بغیر جامعہ کے کیمپس میں گھومتے اور کام کی نگرانی کرتے رہے۔ ان
کارگذاری کا اندازہ اس وقت بھی کیا جا سکتا ہے، لیکن وہ صحیح معنوں میں تبھی نمایاں
گی جب ان کے لگائے ہوئے درخت اور خوشنما پودے بڑھ کر اپنی رونق دکھائیں گے۔
ق کی دوسری مثال خط وکتابت کے ذریعے اردو کی تعلیم ہے جسے عبدالغفار مدہولی صاحب
اپنے ذمے لیا ہے۔ ان سے بھی بار بار درخواست کرتا رہا ہوں کہ اتنی تیزی سے آگے نہ
ھیے کہ زمانہ پیچھے رہ جائے، مگر انھوں نے بھی میرے مشورے سے اثر نہ لیا۔ کورس کو
ری کرنا جوبلی کے منصوبوں میں سے تھا، لیکن اس کے لیے نہ چندہ جمع کیا گیا نہ بجٹ میں
لی رقم مخصوص کی گئی۔ میں نے وزیر تعلیم سے مدد مانگی تو مجھے بتایا گیا کہ ہندوستانی زبانوں
ترقی دینے کے لئے وزارت کا ایک الگ شعبہ ہے، اس شعبہ کو لکھا تو اس نے مدد
ینے کا وعدہ کیا۔ مگر کہیں سے کچھ ملا نہ تھا کہ عبدالغفار صاحب نے جو مواد تیار ہوا تھا
سے چھپوا بھی لیا اور اس سال جون کے پہلے ہفتہ میں پریس کے ذریعہ کورس کے جاری
ہونے کا اعلان کر دیا گیا۔ اعلان کے ساتھ ہی معلوم ہوگیا کہ بہت سے لوگ ایسے ہی کورس
کے جاری ہونے کے منتظر تھے، اور ان میں سے بیشتر کی عمر ۱۹ اور ۳۶ کے درمیان ہے،
گویا وہی عمر جب کہ دنیا میں قدم جمانے کا خیال طبیعتوں پر حاوی ہوتا ہے اور ادھر اُدھر
کی بات میں جی نہیں لگتا۔ اب یہ بھی معلوم ہوگیا ہے کہ ان متفرق لوگوں کے علاوہ ملک میں
ایسے ادارے بھی ہیں جنھیں اُردو کو رواج دینے کی فکر ہے اور انھیں ایسے ہی تعلیمی مواد کی
ضرورت ہے جیسا کہ ہم نے تیار کیا ہے۔ مجھے پہلے جو اندیشہ تھا کہ عبدالغفار صاحب زمانے
سے بہت آگے نکل جائیں گے یعنی وہ خرچ کرتے رہیں گے اور میرے پاس ان کے بل ادا

کرنے کے لئے روپیہ نہ ہوگا، وہ اندیشہ بھی دور ہوگیا ہے۔ حال ہی میں وزارت تعلیم نے یہ طے کردیا ہے کہ اس کورس کو چلانا جامعہ کے منظور شدہ کاموں میں شمار کیا جائے اور اس کا خرچ جامعہ کے بجٹ میں شامل کرلیا جائے۔

عبدالغفار مدہولی صاحب کے ذمّے ہندی جاننے والوں کو اردو رسم خط سکھانے کا کام تھا، اگرچہ انھوں نے جو قاعدہ مرتب کیا ہے اُس سے ہندوستان کی ہر زبان کے ذریعے اردو سکھانے کا کام لیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ ایسے قاعدے کی بھی ضرورت ہے جس کے ذریعے انگریزی زبان جاننے والوں کو اُردو رسم خط اور زبان سکھائی جاسکے۔ میں نے جناب محمد ذاکر صاحب سے ایسا قاعدہ تیار کرنے کی درخواست کی، وہ خوشی سے اس پر راضی ہوگئے اور بڑی محنت سے ایسا قاعدہ مرتب کرلیا۔ انھوں نے میری مجبوریوں کا لحاظ کیا، اس لیے ان کا قاعدہ ابھی تک چھپ نہیں سکا ہے، مگر اب جو کورس کے اخراجات کے بارے میں فیصلہ ہوگیا ہے تو انگریزی جاننے والوں کو اردو سکھانے کا سلسلہ بھی جلد شروع ہوجائے گا۔

ہر سماج میں اختلافات پیدا ہوتے رہتے ہیں اور اکثر کاموں میں رکاوٹ ڈالتے ہیں۔ مسلمانوں کو تسلی دینے کے لیے یہ حدیث بہت کارآمد ثابت ہوئی ہے کہ امت کا اختلاف صحت مندی کی علامت ہے۔ ہندوستان میں تعلیم کا کام کبھی یکسوئی سے ہو ہی نہیں سکا اس لئے کہ ماہر اختلاف کرنے پر مصر رہے اور انھیں مصروف رکھنے کے لئے کمیشن اور کمیٹیاں بنتی رہیں۔ مجھے بہت خوشی ہے کہ ہمارے اردو رسم خط کی تعلیم کے دونوں ماہر اس پر راضی ہوگئے ہیں کہ ہر ایک اپنے طریقے کو صحیح سمجھے اور دوسرے کو اس کے طریقے پر کام کرنے دے۔

جامعہ کو قریب دو سال ہوئے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری دینے کی اجازت مل گئی تھی، ہماری دونوں فیکلٹیوں میں امیدواروں، ان کے ریسرچ کے موضوعات اور ان کے رہنماؤں کا انتخاب کرنے کے لیے کمیٹیاں بن گئی ہیں، اور انھوں نے امیدواروں کا انتخاب بھی کیا ہے۔ لیکن

مقالے لکھواکر پی ایچ، ڈی کی ڈگری دینے سے کہیں زیادہ ضروری یہ ہے کہ ہمارے وہ استاد جو تعلیم کے اعلیٰ شعبوں میں کام کرتے ہیں تحقیق اور تصنیف میں مصروف رہیں۔ افسوس ہے اب یہ ایک دستور سا بن گیا ہے کہ وائس چانسلر علمی ذوق بڑھانا اپنا منصب نہ سمجھے۔ مجھے انتظامی کاموں اور مجلسوں کی صدارت میں چاہے جتنا وقت صرف کرنا ہو کسی کے دل میں یہ سوال نہیں اٹھتا کہ میں نے اپنے وقت کا صحیح استعمال کیا یا نہیں۔ لیکن میں نے شعبۂ تاریخ کے ایک بہت ہونہار لکچرر کے ایک مسودے کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی اور اسے جلد دیکھ بھی لیا، تو انھوں نے اس انداز سے میرا شکریہ ادا کیا کہ گویا میں نے ان پر بڑا احسان کیا ہے۔ حالانکہ مقالہ اتنا اچھا تھا کہ مجھے ان کا شکریہ ادا کرنا چاہئے تھا۔ میں اس بات کا اپنی رپورٹ میں اس لیے ذکر کر رہا ہوں کہ جامعہ کی برادری اور جامعہ کے ہمدردوں کو اگر یہ غلط فہمی ہے کہ میں علمی ذوق کو بڑھانا اپنا فرض نہیں سمجھتا تو وہ دور ہو جائے۔

مجھے امید ہے کہ اس غلط فہمی کو دور کرنے میں مجھے ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز سے بہت مدد ملے گی۔ اس انسٹی ٹیوٹ کو جامعہ میں قائم کرنے کی تجویز ذاکر حسین میموریل کمیٹی کی طرف سے ہوئی تھی، مگر یہ واضح نہیں کیا گیا تھا کہ اسے حکومت ہند قائم کرے گی یا یو جی سی یا خود جامعہ۔ اس کے علاوہ یہ بھی طے کرنا تھا کہ انسٹی ٹیوٹ کی نوعیت کیا ہوگی اور اس کا میدانِ عمل کیا ہوگا۔ معمولاً ایسے انسٹی ٹیوٹ کی اپنی الگ عمارت ہوتی ہے، اور تحقیق اور تدریس کے کاموں کے لیے الگ اسٹاف ہوتا ہے۔ میں نے اسی نمونہ کو پسند کیا ہوتا تو شاید انسٹی ٹیوٹ کو قائم کرنے میں کوئی خاص دشواری نہ ہوتی۔ مگر مجھے اب کچھ ضد سی ہو گئی ہے کہ اپنے بس بھر روپے کی خاطر علم کو بدنام نہ ہونے دوں، اس لیے میں نے طے کیا کہ انسٹی ٹیوٹ میں ڈائرکٹر اور دفتری عملے کے علاوہ مستقل اسٹاف نہ ہوگا، ڈائرکٹر کی مدد کے لئے ایک مشاورتی کمیٹی ہوگی، جو انسٹی ٹیوٹ کے مقاصد طے کرے گی کہ کون سا کام کس عالم سے کرنے کی درخواست کی جائے۔ اور اگر ریسرچ اسٹڈیز ہوں تو ان کا کون نگران ہو۔ اور ان کی تکمیل کے لیے کتنا اسٹاف

کتنی مدت کے لیے رکھا جائے۔ مجھے چند مہینے یہ معلوم کرنے میں لگ گئے کہ یو جی سی سے ایسے انسٹی ٹیوٹ کے قیام کے لیے گرانٹ نہ مل سکے گی، لیکن اس کے جو منصوبے ہوں گے ان کے لئے مل سکے گی۔ جب یہ معلوم ہوگیا تو وزارت تعلیم نے انسٹی ٹیوٹ کے قیام کو اپنے ذمہ لے لیا، اور ۳۴ جولائی کو تین لاکھ کی گرانٹ وصول ہوگئی۔ جس کا سالانہ منافع، جو بیس، اکیس ہزار ہوگا، انسٹی ٹیوٹ کی مستقل آمدنی ہوگی۔ مجلسِ تعلیمی اور مجلسِ منتظمہ نے انسٹی ٹیوٹ کو ایسی شکل میں قائم کرنا منظور کر لیا ہے جو میں نے تجویز کی تھی۔ مشاورتی کمیٹی کا، جس کے رکن پروفیسر ایس ایم خسرو، پروفیسر ایچ سی گنگولی، پروفیسر خلیق احمد نظامی، مولانا سعید احمد اکبرآبادی، ضیاء الحسن فاروقی صاحب اور ڈاکٹر سلامت اللہ صاحب ہیں۔ ایک جلسہ ہو چکا ہے اور میری تحریک پر وہ مندرجہ ذیل منصوبے منظور کر چکی ہے، جن سے آپ کو انسٹی ٹیوٹ کے میدانِ عمل کا اندازہ ہو جائے گا۔

۱۔ امام غزالی کی احیاء العلوم کی اخلاقی تعلیمات کا خلاصہ، (اردو میں) یہ کام رشید الوحیدی صاحب کے سپرد ہوا ہے اور آدھے کے قریب ہو چکا ہے۔

۲۔ شیخ محب اللہ الہ آبادی کے مکتوبات (فارسی میں)، یہ پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحب ایڈیٹ کریں گے۔

ہندوستانی مسلمانوں کا نظامِ تعلیم (انگریزی میں) اور فوائد الفواد کا ترجمہ، (انگریزی میں) — یہ دونوں کام ضیاء الحسن فاروقی صاحب نے اپنے ذمے لیے ہیں۔

رسالہ قشیریہ کا ترجمہ (اردو میں)، جناب عرفان نوری صاحب ترجمہ مکمل کر چکے ہیں۔ اور اس پر نظرِ ثانی کر رہے ہیں۔

ہندوستانی مسلمانوں کی سماجی خصوصیات۔ یہ پروجیکٹ ڈاکٹر اے، آر، سید کے سپرد ہوا ہے۔

دہلی کی مسلمان عورتوں کے تہذیبی رجحانات ۔ یہ پروجیکٹ مس رلیارام کے سپرد ہوا ہے۔

معتزلہ کی تعلیمات ۔ یہ مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے اپنے ذمے لیا ہے۔

مسلمانوں کی مخصوص تعلیم کا مسئلہ ۔ ڈاکٹر سلامت اللہ صاحب اس پر مقالہ تیار کریں گے۔

۲۔ مولانا عبدالوہاب بخاری صاحب کے دو مقالے انگریزی میں ، ایک اجتہاد پر، ایک فقہ پر، یہ تیار ہیں اور ان پر نظرثانی کی جارہی ہے۔

۲۔ اسلام پر ڈھائی سو صفحے کی کتاب، انگریزی میں ۔ یہ میں نے پٹیل یونیورسٹی، گجرات کی فرمائش پر لکھنے کا وعدہ کیا ہے۔ گجراتی میں اس کا ترجمہ وہاں سے چھپے گا اور انگریزی میں فاکلٹی یونیورسٹی سے۔

فی الحال انسٹی ٹیوٹ کا ڈائرکٹر اعزازی ہوگا، اور اعزازی ڈائرکٹر کے فرائض میں انجام دے رہا ہوں ۔ امید ہے سال ڈیڑھ سال کے اندر انسٹی ٹیوٹ کے کچھ کام پبلک کے سامنے آجائیں گے، اور ان عالموں سے تعلقات پیدا ہو جائیں گے جو اس کے منصوبوں میں شریک ہو سکتے ہیں ۔ اس طرح انسٹی ٹیوٹ کا حلقہ بہت وسیع ہوگا۔ روپیہ اصل کارگزاری کے مطابق صرف ہوگا، اور چند سال بعد اگر انسٹی ٹیوٹ کی اپنی عمارت نہ ہوئی اور اسٹاف نہ ہوا تب بھی اس کے ذریعہ سے جامعہ کے اس اہم مقصد کے پورا ہونے کی شکل پیدا ہو سکتی ہے کہ اس کا کام عمارتوں میں بند نہ ہو بلکہ علمی اور تہذیبی تحریک بن جائے۔

ڈاکٹر گردیال سنگھ ڈھلوں

خطبہ جلسۂ تقسیم اسناد

(۵ر نومبر ۱۹۷۱ء)

میں سب سے پہلے آپ کے وائس چانسلر اور اپنے عالم دوست پروفیسر محمد مجیب اور جامعہ کے ارباب حل وعقد کی خدمت میں ہدیۂ تشکر پیش کرتا ہوں۔ جنھوں نے مجھے خطبۂ تقسیم اسناد دینے کا موقع عنایت فرمایا۔ حیات وحوصلہ سے معمور نوجوان نسل سے ملاقات ہمیشہ مسرت بخش ہوتی ہے اس لیے کہ یہی مستقبل کی امید اور سہارا ہے۔ مجھے ایک ایسے ادارے سے وابستگی پر فخر ہے جس کے بانیوں میں معمار قوم مہاتما گاندھی اور ملک کے دوسرے ممتاز اور سرکردہ رہنما شامل تھے اور جس کی ہدایت و رہنمائی اور ساخت و پرداخت میں ذاکر صاحب کا بڑا حصہ ہے۔

ذاکر صاحب کے لیے جامعہ زندگی کی حیثیت رکھتی تھی۔ وہ اس ادارے کے عظیم ترین علمی سپوت تھے۔ انھوں نے بڑی سچی لگن سے اس کی خدمت کی۔ اگرچہ ملک کی دوسری اہم اور قدرے گراں بہا ذمہ داریوں نے انھیں مجبور کر دیا کہ وہ جامعہ کو خیرباد کہہ دیں پھر بھی علم اور تعلیم سے ان کا عشق کم نہ ہوا۔ ہمیں ایسے لوگ خال خال ہی ملتے ہیں جن میں ذاکر صاحب جیسا انکسار، مقصد سے پرخلوص وابستگی اور پرسکون متانت کے عناصر ملتے ہیں۔ ان کا انکسار ایسا تھا جو دوسروں میں بھی یہی صفت پیدا کر دیتا تھا۔ جو بھی ان سے ملتا تھا متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔ یہی کیفیت ان کے جانشین پروفیسر مجیب میں بھی نظر آتی ہے۔ مجھے ان سے مل کر

اور تبادلۂ خیال کر کے ہمیشہ خوشی ہوئی ہے اور ایک طرح کی ذہنی تازگی کا احساس ہوا ہے۔ ان سے گفتگو کر کے میرے ذہن نے ہمیشہ روشنی اور حرارت حاصل کی ہے اور یہ محسوس کیا ہے کہ ان کے علم کی حدیں کتنی وسیع ہیں۔

جامعہ اس جذبے کی پیداوار ہے جو خلافت اور عدم تعاون کی تحریکوں کا محرک رہا ہے۔ یہ اس آدرش کی تخلیق ہے جو روایت اور جدت کے درمیان اعتدال کی راہ کا متلاشی تھا۔ اپنے وجود کے اس عرصے میں اس نے بہت سی اعلیٰ اور شریف روایتوں کی بنا ڈالی ہے۔ جنھیں ہم آشتی اتحاد اخلاقی اور روحانی اقدار اور ایثار وخدمت کی روایات کا نام دے سکتے ہیں۔ اس نے آزادانہ اور بے باک بحث وگفتگو کی فضا کی تخلیق کی ہے۔ تعلیم گاہوں کی فضا کچھ ایسی پرکشش ہوتی ہے کہ وہاں جانے اور کام کرنے کو بے ساختہ جی چاہنے لگتا ہے۔ بالخصوص ایسی تعلیم گاہوں میں کام کرنے کی اور بھی خوشی ہوتی ہے جو بڑے آدرشوں کے زیر اثر ہوتی ہیں۔ یہ آدرش ان کی دیواروں پر کندہ نہیں ہوتے بلکہ وہاں کے کارکنوں کے پرخلوص کاموں سے نمایاں ہوتے ہیں۔

جدید دور تیز رفتار اور ہوش ربا تبدیلیوں کا دور ہے۔ علم کے دائرے بڑی تیزی سے وسیع ہو رہے ہیں۔ ایسی صورت میں ایسے ادارے جو انتہا پسندی سے ہٹ کر اعتدال کے متلاشی ہیں زیادہ اہمیت کے حامل ہیں اور اُن کی ذمہ داریاں بھی زیادہ ہیں۔ ایسے اداروں کی جڑیں گرچہ ماضی میں پیوست ہوتی ہیں پھر بھی وہ جدید علم کو اپنے طالب علموں کی وساطت سے معاشرے تک منتقل کرتے رہتے ہیں۔ ایسی صورت میں اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ تعلیمی ادارے اپنی بنیادوں سے محروم ہو جاتے ہیں اور اپنی انفرادیت کو کھو بیٹھتے ہیں۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہے کہ جامعہ نے اپنی انفرادیت کو باقی رکھا ہے۔

ہم کوئی پچیس سال پہلے آزاد ہوئے۔ اس عرصے میں ایسے کئی مواقع آئے جب یہ محسوس ہوا کہ ہمارے بہت سے آدرش خطرے میں ہیں لیکن بالآخر یہی ثابت ہوا کہ ہم

نے جو سیاسی نظام اپنایا ہے یا جن اصولوں پر اس کی اساس ہے وہ مناسب بھی ہیں اور موثر بھی۔ ہم نے اپنے لیے پارلیمانی جمہوریت کا نظام منتخب کیا تھا۔ کبھی کبھی ایسے لمحے بھی آئے جب ہمارے ذہنوں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ شاید ہم نے پارلیمانی جمہوریت کا راستہ اختیار کر کے غلطی کی ہے۔ ۱۹۶۷ء کے عام انتخابات کے بعد کے زمانے میں ہمارے جمہوری آدرشوں پر بڑا کڑا وقت پڑا۔ بہت سی ریاستوں میں کمزور اور ناپائدار وزارتیں ابھریں اور ختم ہوئیں۔ دل بدلی کی وبا تو ایسا لگتا تھا کہ ہمارے پورے سیاسی ڈھانچے کو تباہ کر کے رکھ دے گی۔ بعض پیمبران زوال کا تو یہاں تک خیال تھا کہ اس طرح کی صورت مرکز میں بھی پیش آئے گی۔ ایک طرح سے ۱۹۷۱ء کے عام انتخابات ترقی و توسیع کی ایک نئی جہت کی طرف ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔ ہمارے دستور کے بنانے والوں نے عوام اور ان کی سیاسی سوجھ بوجھ پر جو بھروسہ کیا تھا اس انتخاب نے اس کی واضح شہادت پیش کر دی۔ عوام نے اپنی پسند کا غیر مبہم اظہار کر دیا۔ انھوں نے ناپائدار سرکاروں سے اپنی ناپسندیدگی کا بھی کھلا ہوا ثبوت فراہم کر دیا۔ کوئی بھی ملک جو ہمارے ملک کی طرح اقتصادی ترقی کی راہ پر گامزن ہو، ناپائداری کو پسند نہیں کر سکتا۔ بلاشبہ یہ ایک سیاسی فیصلہ ہے لیکن ہماری تعلیمی پالیسی کو ان سماجی اور اقتصادی تبدیلیوں سے ہم آہنگ ہونا پڑے گا، جس کے عوام خواہاں ہیں۔ جو لوگ تعلیم کے شعبے میں ہیں ان کی ذمہ داری کسی طرح بھی ان لوگوں سے کم نہیں ہے جو زندگی کے دوسرے شعبوں میں برسرِ کار ہیں۔ اگر تعلیم کو بامعنی بننا ہے تو اسے سماجی مقصد کا تابع اور معاون ہونا پڑے گا۔

اقتصادی ترقی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ مشترک شہریت اور ثقافت کا احساس پیدا ہو اور قومی یک جہتی کو فروغ حاصل ہو۔ یہ وہ کام ہیں جو ہمارے تعلیمی کمیشن نے ملکی تعلیم کو تفویض کیے ہیں۔ ہمارا تمدن ایک مشترک تمدن ہے۔ مختلف تمدنوں کے امتزاج سے اس کی صدیوں میں نشوونما ہوئی ہے۔ بہرحال اس تمدن کی بقا اور فروغ کی امید کی جاتی

چاہیئے۔ ہمارا ملک بہت بڑا ہے اتنا بڑا کہ اسے برصغیر کہا جاتا ہے۔ بذات خود ملک کی وسعت ہی علاقوں اور گروہوں کو علیحدگی پسندی پر آمادہ کرتی ہے۔ خاص طور پر اس زمانے میں تو ایسا ضرور تھا جب ذرائع حمل ونقل کم رفتار بھی تھے اور دشوار بھی۔ ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جو بھی گھوم لے گا اسے حیرت ناک تنوع اور رنگا رنگی کا احساس ہوگا۔ اگرچہ ہمارے سماج میں اس تنوع کے باوجود بنیادی وحدت کا ایک رشتہ بھی ہے۔ یہی کافی نہیں ہے کہ ہم اس وحدت کا تصور اپنے ذہنوں میں قائم کرلیں اور خاموش بیٹھے رہیں۔ ہمیں صبر و محنت کے ساتھ اسے متشکل بھی کرنا ہے اور پائدار اور مستحکم بھی بنانا ہے تاکہ یہ وحدت ایک جیتی جاگتی صداقت بن جائے۔

ماضی قریب میں ایسے بہت سے مسائل پیدا ہوئے ہیں تاکہ اس وحدت کو پارہ پارہ کردیں۔ یہ اختلافات لسانی عصبیت ذات پات اور علاقائیت کی شکل میں نمودار ہوئے ہیں۔ لیکن ان تمام اختلافات کے پیچھے سیاسی اور اقتصادی اسباب کارفرما ہیں۔ ذات پات کے اختلافات کو سیاسی اور اقتصادی فائدوں کے لیے استعمال کیا ہے۔ اسی طرح لسانی اختلافات کو مفاد پرست گروہوں نے اپنے سیاسی عروج کے لئے استعمال کیا ہے۔ کسی گروہ یا علاقے کی ترقی کی خواہش میں اور اس خواہش کے سیاسی اور دوسرے استعمال میں ہمیں فرق کرنا چاہیئے۔ یہ نہیں ہے کہ ہمیں فرق اور اختلاف کا احساس نہیں ہے۔ یہ اختلافات موجود ہیں اور ان کی موجودگی فطری بھی ہے بالخصوص ہندوستان جیسے بڑے ملک میں۔ ان اختلافات کا ہمیں احساس تھا اس لیے ہم نے سیکولر آدرش کو اپنایا۔ ہمارا آئین تمام شہریوں کو بعض بنیادی حقوق کی ضمانت دیتا ہے اور ذات پات، مذہب اور جنس کی بنیاد پر کسی بھی تفریق یا امتیاز کو روا نہیں رکھتا۔ ہم نے بہت سی پرانی سماجی معذوریوں اور دشواریوں کا خاتمہ کیا ہے اور ان پر عمل کرنے کو قانوناً جرم قرار دیا ہے۔ بلاشبہ تمام شہریوں کے ساتھ سماجی، اقتصادی اور تمدنی

انصاف کو ہم نے منزل مراد قرار دیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ کسی جماعت، فرقے، ذات یا علاقے کو ایسی حیثیت نہ دی جائے گی کہ وہ دوسروں پر برتری حاصل کر لے۔ کسی ایک فرقے یا طبقے پر غیر ضروری اور نامناسب تفوق حاصل نہ ہوگا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ دیکھنا پڑے گا کہ ان اختلافات کو ملک کی ترقی روک دینے کے لئے تو استعمال نہیں کیا جا رہا ہے اسے غالباً ہم گوارا نہیں کریں گے۔

یہاں بھی مرض کی وجہ سمجھ میں آتی ہے اور علاج واضح ہے۔ اگر ملک میں خوشحالی اور فراوانی کا دور دورہ ہو تو یہ اختلافات مٹ سکتے ہیں۔ ایک کہاوت ہے کہ "اگر کنویں میں پانی ہو تو وہ گھڑے میں ضرور آجائے گا۔" اگر خوشحالی کا کنواں بھرا ہوا ہے تو ہم میں سے ہر شخص اس میں سے اپنے حصے کا پانی کھینچ لے گا اگر اس میں پانی ناکافی ہے تو زیادہ سے زیادہ پانی حاصل کرنے کے لئے رسہ کشی شروع ہو جائے گی۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ اقتصادی ترقی کی رفتار میں اضافہ کیا جائے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ اختلافات اس وقت ختم ہو جائیں گے جب ملک اقتصادی ترقی کی راہ پر کافی آگے بڑھ جائے گا۔

جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں کہ ہم ترقی کی راہ پر ٹھیک ٹھیک چل رہے تھے لیکن ہمیں کچھ پریشانیاں بھی لاحق تھیں۔ ماضی قریب میں ہمیں دو جنگوں سے بھی سابقہ پڑا۔ اس وقت بنگلہ دیش کے نوّے لاکھ یا اس سے زیادہ مہاجرین ہمارے ملک میں آگئے ہیں۔ آپ کو پاکستان کی معاندانہ روش اور جنگ کی دھمکیوں کا بھی علم ہے۔ ہم اپنے پڑوسیوں کے ساتھ دوستی کے خواہاں ہیں مگر دوستی کی ہماری پیش کش کو کمزوری پر محمول نہیں کرنا چاہئے۔ بنگلہ دیش نے ثابت کر دیا ہے کہ صرف مذہب ہی کسی ملک کو متحد نہیں رکھ سکتا۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ نسل کشی کیوں ہوئی ہوتی جو وہاں ہوئی۔ اپنے مصیبت زدہ بھائیوں کی جو ہم پر ذمہ داری ہے اسے ہم فراموش نہیں کر سکتے۔ مسئلے کے سیاسی حل کی آن کی جدوجہد میں ہم ان کے ساتھ ہیں تاکہ وہ اپنے گھروں کو واپس جا سکیں۔

ملک ان بہت سی عظیم مشکلوں میں مبتلا ہونے کے باوجود اپنے اس عزم میں راسخ ہے کہ وہ اپنی سوشلسٹ پالیسی کی منزل کی طرف گامزن رہے گا جس کی اساس سماج کے تمام طبقوں کی اخوت پر ہے۔ مقامی اور تمدنی خودمختاری تمام گروہوں کو اس بات کا موقع دے گی کہ وہ اپنے طور پر اپنی زندگی گزاریں اور متحدہ قومی زندگی کی تعمیر میں معاون ہوں۔ ہمارا تعلیمی نظام اور وہ لوگ جو تعلیم دیتے ہیں اس ضمن میں ایک مثبت کردار ادا کر سکتے ہیں۔

تعلیمی معائب پر گفتگو کرنا آج کل ایک فیشن بن گیا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ گرتا ہوا تعلیمی معیار ایک مسئلہ ہے۔ میرے خیال میں اس کی وجہ بھی اقتصادی ہے۔ لوگوں کو ڈگریاں حاصل کرنے کا خبط ہو گیا ہے۔ جس کی وجہ سے یونیورسٹیوں میں طلباء کی کثرت ہے۔ ڈگری حاصل کرنے کو ایک طویل بے روزگاری کے خلاف ایک طرح کی ضمانت سمجھا جاتا ہے۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ اگر کسی کے پاس اونچی ڈگری ہے تو اس کی بے روزگاری کی مدت کم ہو جاتی ہے۔ یونیورسٹیوں میں طلباء کی بھیڑ بھاڑ سے معیار میں گراوٹ کے علاوہ اور بھی مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ امنِ عامہ کا مسئلہ بھی اسی کا شاخسانہ ہے۔ طالب علم کا مقصد چونکہ ڈگری حاصل کرنا ہوتا ہے اس لیے اس کی توجہ صرف ڈگری کی طرف ہوتی ہے۔ پڑھنے لکھنے میں اور اپنے علم کو ترقی دینے سے اسے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ ڈگریوں کے خبط اور بے روزگاری کے خوف کی وجہ سے ہی یہ صورتِ حال پیدا ہوئی ہے کہ ذہین اور باصلاحیت افراد ملک سے باہر قسمت آزمائی پر آمادہ ہو گئے ہیں۔ ایسے نوجوان اپنی تعلیمی استعداد کو بڑھانے کے لئے دوسرے ملکوں میں جاتے ہیں اور اپنی اقتصادی حالت کو بہتر بنانے کے لئے وہیں رک جاتے ہیں۔ اس صورتِ حال سے نپٹنے کے لیے دو طریقے پیش کیے گئے ہیں۔ پہلا تو یہ ہے کہ کالجوں میں داخلوں کی تعداد پر پابندی لگائی جائے اور دوسرا یہ کہ جب طلباء کی تعداد

حد سے تجاوز کر جائے تو نئی یونیورسٹیاں کھول جائیں۔ لیکن مسئلہ کا مستقل حل یہ ہوگا کہ ایسے مثبت اقدام کیے جائیں کہ ہائی اسکول تک کی تعلیم ایسے معیار پر آجائے کہ طالب علم اس کے بعد کوئی مفید ملازمت حاصل کر سکے۔ تعلیم کو اسی رُخ پر مرتب کرنا چاہیے۔ اس طرح رفتہ رفتہ یونیورسٹیوں میں طلبا کی بڑھتی ہوئی تعداد کم ہو سکے گی۔

اس سال کے گریجوئٹو! میں تمھیں مبارکباد دیتا ہوں کہ تم نے ڈگریاں حاصل کیں۔ میں تمھیں اس بات پر بھی مبارکباد دیتا ہوں کہ تم جس آدرش کی پیداوار ہو وہ دوسرے تعلیمی اداروں کے آدرشوں سے مختلف ہے۔ تمھاری تربیت ان روحانی اقدار کو نظر میں رکھ کر کی گئی ہے جن کی عدم موجودگی آج زندگی کے ہر شعبے میں نمایاں ہے خواہ وہ تجارت ہو یا سرکاری ملازمت یا کوئی اور پیشہ۔ تمھیں یہاں سے اپنے ہمراہ اخلاقی اقدار اور روحانی توازن کا پیغام لے کر جانا ہے۔ خواہ تم کہیں بھی جاؤ۔ تم میں سے بہت سے لوگوں نے معلمی کو اپنا پیشہ بنایا ہے۔ یہ تمام پیشوں میں افضل ہے۔ علم کو دوسروں تک پہنچانا مقدس ترین کام ہے۔ مگر اس کے لئے قربانی اور خلوص کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں تمھیں گاندھی جی کی ایک بات یاد دلاؤں گا:

> "کسی قوم کی برتری کا معیار اس کے ذہنی امتیاز کو ہونا چاہیے اور اس صلاحیت کو کہ وہ کس حد تک دنیا کو علم کے حدود وسیع کر کے مالا مال کر سکتی ہے۔ جب کسی قوم کی یہ صلاحیت ختم ہو جاتی ہے جب وہ صرف قبول کرتی ہے اور اس کے پاس دینے کو کچھ نہیں ہوتا تو وہ انحطاط کی ظلمتوں میں ڈوب جاتی ہے اور بالکل طفیلی بن کر رہ جاتی ہے۔"

اس ملک کے شہری تمھارے حوالے کیے جائیں گے۔ یہ تمھارے اختیار میں ہوگا کہ تم انھیں گاندھی جی کے خوابوں کے مطابق بناؤ۔ تم اپنی محنت، توجہ اور خلوص کار کی مدد سے ملک کو ایسے ممتاز افراد دے سکتے ہو جو اپنی تابانی فکر سے صرف یہی نہیں کہ ملک کی زندگی کو مالا مال

اور منور کریں گے بلکہ علم کے حدود کو ممکنات کی حد تک وسیع کر سکیں گے۔

تم میں سے کچھ لوگوں نے دیسی انجینیرنگ کے پیشے کو اختیار کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ تم حقیقی ہندوستان کی خدمت کرو گے۔ تم جہاں بھی جاؤ اور جس شعبے میں بھی جاؤ میری نیک تمنائیں تمھارے ساتھ ہیں۔ میں تم سب سے یہی کہوں گا۔

خدا کرے تم اپنے عمل سے اپنی مادرِ علمی کے وقار کو اپنے ہم وطنوں کی نظر میں اور دنیا والوں کی نظروں میں اور اونچا کرو۔ میں ایک مرتبہ پھر وائس چانسلر صاحب اور ان کے ساتھیوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے مجھے یہ موقع عنایت فرمایا۔ جے ہند

"دنیا میں جو جنگیں ہوئی ہیں ان کی اہمیت کا سبب یہ نہیں ہے کہ فلاں فریق جیتا اور فلاں فریق ہارا۔ اس کا مطالعہ کرنا اس لیے ضروری ہے کہ جنگ میں قوموں کی صحیح حالت ظاہر ہو جاتی ہے۔ امن کے زمانے میں قوموں کے بہت سے عیب چھپے رہتے ہیں، جنگ تمام راز فاش کر دیتی ہے، سیرت کی کمزوریاں، آپس کی بے اعتباری، صبر اور استقلال اور قوت برداشت کی کمی، ذہنی اور اخلاقی بے مائگی، بلکہ ان کے علاوہ بہت سی خامیاں ہیں جو اس وقت اپنی اصلی صورت میں نظر آتی ہیں جب کسی جماعت کو اپنی حفاظت کرنے یا کسی دوسری جماعت پر غالب آنے کے لئے اپنی پوری جسمانی اور اخلاقی قوت سے کام لینا پڑتا ہے۔ جنگ میں کامیابی چند افراد کے کمالات سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ ان اوصاف کی بدولت نصیب ہوتی ہے جو جماعت میں ربط، ہم آہنگی اور اتحادِ عمل پیدا کرتے ہیں۔"

(جامعہ، ستمبر ۱۹۳۵ء) پروفیسر محمد مجیب

ڈاکٹر سیّد احتشام احمد ندوی

ڈاکٹر طٰہٰ حسین

(عصرِ جدید کے ایک بڑے ناقد اور مفکر)

ڈاکٹر طٰہٰ حسین عصرِ جدید کے ایک صاحب طرز ادیب، ممتاز ناقد اور ایک عظیم مفکر ہیں جنھوں نے ادب، تاریخ اور تنقید میں ایسے بنیادی اور اہم کام کئے ہیں جو دوسروں کے لئے نشانِ منزل ہیں۔ اُن کے اعلیٰ افکار کی روشنی سے عربی ادب پُر نور بن گیا ہے۔ انھوں نے اپنے تنقیدی افکار و نظریات سے ایک فکری انقلاب برپا کیا ہے۔ ان کی ادبی تخلیقات کے تراجم دنیا کی اہم زبانوں میں کئے گئے اور انھیں عالمی مقبولیت حاصل ہوئی۔ طٰہٰ حسین ایک عظیم فن کار ہیں جنھوں نے تقلیدی اور فرسودہ راہوں کو چھوڑ کر فکر و فن کی نئی اور پُر کشش راہیں اختیار کیں۔ طٰہٰ حسین کی زندگی اور ادبی جدوجہد ایک دلچسپ داستان ہے جس میں عبرت اور بصیرت کے بہت سے گوشے سامنے آتے ہیں۔ یہاں ان کے فکری ارتقار کی کہانی ان کی زندگی کے پس منظر میں پیش کی جاتی ہے تاکہ ان کی شخصیت اور ان کے افکار واضح ہو سکیں۔

وہ چار برس کی عمر میں چیچک کی بیماری میں اندھے ہو گئے مگر بصارت کے فقدان نے بصیرت کی قوت کو تیز تر کر دیا۔ قرآن مجید حفظ کر کے اور نحو و صرف پڑھ کر اپنے بھائی کے پاس جامعہ ازہر گئے وہاں سے عالمیت کی سند حاصل کی اس طرح وہ شیخ طٰہٰ حسین بن گئے۔ جدید عربی میں شیخ بالکل اسی معنی میں استعمال ہوتا ہے جس مفہوم میں ہمارے یہاں مولانا کا لفظ

مستقل ہے۔ ان کا خیال تھا کہ جامعہ ازہر سے فضیلت حاصل کر کے وہیں مدرس ہو جائیں گے چنانچہ مذہبی علوم کی طرف انھوں نے توجہ کی مگر مذہبی مسائل میں علمائے ازہر کا جمود دیکھ کر انھوں نے ادب کا رُخ کیا اور انھیں یونیورسٹی جانے کا خیال ہوا اور وہ جامعہ مصریہ میں جو نئی نئی قائم ہوئی تھی داخل ہو گئے۔ اس طرح طٰہٰ حسین نے جامعہ ازہر سے ٹھوس علمی استعداد حاصل کی اور یونیورسٹی جا کر تقلید اور جمود کے بُت توڑے اور یورپ کی نئی روشنی سے اپنے دل و دماغ کو منور کیا۔

ازہر میں طٰہٰ حسین ایک محنتی اور ذہین طالب علم کی حیثیت سے اپنے ساتھیوں میں احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ وہ اس بارے میں اپنی خود نوشت سوانح الایام میں لکھتے ہیں کہ

"جو مدت میں نے ازہر میں گذاری وہ عجب اضطراب کا زمانہ تھا۔ مفتی محمد عبدہ ازہر کی قدامت اور جمود کی شکایت کرتے تھے۔ قاسم امین عورتوں کی آزادی کے علمبردار تھے۔ نحی زاغلول کتابوں کے تراجم شائع کرتے۔ رسالہ جریدہ میں سیاست اور اجتماعی مسائل پر نئے انداز سے بحثیں شائع ہوتیں۔ ہم طلبہ اس دور میں سخت ذہنی اضطراب میں مبتلا تھے۔ ہم تلامذۂ شیخ مرصفی اس حقیقت سے واقف ہو گئے تھے کہ ازہر قدامت پرست ادارہ ہے۔ ایک بار میں شیخ مرصفی کے درس میں شریک تھا وہ کتاب الکامل پڑھا رہے تھے اس میں یہ عبارت آئی کہ

"وما کفر الفقهاء به الحجاج	فقہاء نے جس بنیاد پر حجاج کی تکفیر کی تھی
قوله والناس یطوفون بقبر النبی	وہ اس کا یہ قول تھا کہ جو لوگ آنحضرت
ومنبرة انما یطوفون برمة	کی قبر اور منبر کا طواف کرتے ہیں وہ صرف
واعواد"	بوسیدہ ہڈی اور خوشبوؤں کا طواف کرتے

ہیں۔

اس پر میں نے کہا کہ اس عبارت میں حجاج نے کوئی کفر کی بات تو نہیں کہی ہاں سوئے ادب ضرور ہے۔ میرا یہ تبصرہ شیخ جامعہ ازہر کو پہونچ گیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ وہ مجھکو

ازہر سے خارج کر دیں گے۔ میں رسالہ جریدہ کے دفتر گیا۔ میں ایک مقالہ اس بارے میں شائع کرانا چاہتا تھا مگر جب لطفی السید سے ملا تو انھوں نے مقالہ کو شائع کرنے سے صاف انکار کر دیا البتہ انھوں نے یہ یقین دلایا کہ وہ اس امر کی کوشش کریں گے کہ ان کو ازہر سے خارج نہ کیا جائے۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اصحاب حل وعقد میں میرے نکالے جانے پر اتفاق نہ ہو پایا تھا لیکن میں نے اسی وقت سوچ لیا کہ ازہر میں رہ کر میری علمی ادبی تمناؤں کو آسودگی کا سامان میسر نہیں آسکتا اس لئے میں نے ازہر کو چھوڑ کر جامعہ مصریہ میں داخلہ لے لیا۔"

جامعہ مصریہ میں یہ مشکل پیش آئی کہ وہاں ذریعہ تعلیم فرانسیسی تھی طہٰ حسین نے ایک شبینہ اسکول میں داخلہ لے لیا اور شب وروز محنت کرکے ۵ ماہ کے اندر اتنی استعداد پیدا کرلی کہ غیر ملکی اساتذہ کے لکچرز کو فرانسیسی زبان میں سمجھ سکیں۔ یونیورسٹی میں آکر ان کے سامنے ایک نئی دنیا آئی جو ازہر سے بالکل مختلف تھی۔ انھوں نے ازہر کے طرز تعلیم اور یونیورسٹی کے لکچر کے طریقوں اور ان کے اثرات کا مطالعہ کیا۔ ۱۹۱۴ء میں نابینا طہٰ حسین نے نابینا فلسفی اور شاعر ابوالعلاء معری پر اپنا مقالۂ تحقیق پی، ایچ، ڈی کی ڈگری کے لئے پیش کیا۔ ان کے ممتحنوں نے ان کو غیر معمولی طور پر سراہا اور یونیورسٹی نے طہٰ حسین کو انعام اور ڈگری دینے کے لئے خدیو مصر کو مدعو کیا اس لئے کہ یہ پہلی ڈاکٹریٹ کی ڈگری تھی جو کسی مصری طالب علم کو جامعہ مصریہ سے دی گئی، چنانچہ ۱۲ مئی ۱۹۱۴ء کو بادشاہ نے خود آکر ان کو ڈگری دی اور ان سے گفتگو بھی کی۔ انھوں نے یہ معلوم کرکے مزید مسرت کا اظہار کیا کہ مولانا طہٰ حسین ازہری ہیں جنھوں نے ایک امتحان فرانسیسی زبان کا بھی پاس کیا ہے اور اب وہ پیرس جا رہے ہیں۔

طہٰ حسین کی یہ کتاب ذکری ابی العلاء (یعنی ابوالعلاء معری کی یاد) جب شائع ہوئی تو ریم حلقہ میں بڑی ہلچل مچ گئی اور اس کے خلاف بہت سے مقالات لکھے گئے۔ انھوں نے تلف اعتراضات کا مطالعہ کیا تو صاف کہا کہ ان میں سب وشتم کے علاوہ ایسی کوئی بات

نہیں ہے جس کا جواب دیا جائے۔ اصل میں معترضین کا اندازِ فکر ہی فرسودہ اور جامد تھا۔ بعضوں نے ان پر الزام لگایا کہ انھوں نے معرّی کو اسلام سے خارج کر دیا۔ اس پر طٰہٰ حسین نے بڑا عمدہ تبصرہ کیا۔ انھوں نے لکھا کہ اسلام میں داخل کرنا، یا اس سے خارج کرنا میرے اختیار سے باہر کی بات ہے۔ دراصل اس کتاب میں طٰہٰ حسین نے معرّی کی زندگی، شاعری، ادب، فلسفہ اور عقیدہ کے بارے میں گہرا مطالعہ پیش کیا ہے۔ اس کتاب کی عظمت کے بارے میں سامی کیالی کا بیان بڑا دلچسپ ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ میں شاعری سے ذوق رکھتا تھا اور خود بھی الٹی سیدھی شاعری کرتا تھا۔ اتفاق سے ایک بار طٰہٰ حسین کی ایک کتاب ہاتھ لگ گئی جس کا نام تھا "ذکری ابی العلاء" میں نے اس کا مطالعہ شروع کیا تو آنکھیں کھل گئیں، اس لئے کہ اس کتاب میں مصنف نے نیا اندازِ نظر اختیار کیا ہے، اس وقت تک ہمارے اہلِ نظر کا طرزِ تصنیف یہ تھا کہ نہ وہ شعر کی تحلیل کرتے نہ ادبی تخلیقات میں اقتصادی، سماجی نفسیاتی اور دوسرے مسائلِ حیات کا مطالعہ کرتے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے مجھے محسوس ہوا کہ ادبی مطالعہ میں طٰہٰ حسین نے پہلی بار جسارت سے کام لیا ہے۔ تقلید روایت پرستی کے بندھنوں کو توڑا ہے اور بحث و تجزیہ کی ان جدید راہوں کو اختیار کیا ہے جو ہم کو زندہ قوموں میں ملتی ہیں۔

جامعہ مصریہ نے طٰہٰ حسین کی اعلیٰ صلاحیتوں کے پیشِ نظر ان کو مزید تعلیم کے لئے پیرس روانہ کرنے کا فیصلہ کیا[1]۔ انھوں نے فرانس پہونچ کر سب سے پہلے ازہر کی "مولویت" کا صفایا کیا اور جبہ و دستار اتار پھینکا اور مولانا سے مسٹر بن گئے۔ وہ اس واقعہ کا ذکر مزاحیہ انداز سے یوں کرتے ہیں کہ "جب میں نے پہلی بار مصر کو چھوڑا تو میں عمامہ باندھے اور جبّہ پہنے جید مولانا تھا جو سمندر میں جہاز پر سوار ہوا۔ جبّہ کا ہلتا ہوا دامن فرانس میں کرہ تک پہونچا ہی تھا کہ میرے سر سے عمامہ اڑ گیا۔ میں یاد کرتا ہوں کہ کہاں گیا مگر کچھ پتہ نہیں چلتا۔ بہرحال کرہ پہونچ کر میں نے

۱۔ طٰہٰ حسین کے مزید حالات کے لئے راقم الحروف کی کتاب "جدید عربی ادب کا ارتقاء" ملاحظہ ہو
[illegible]

اس کو اتار پھینکا تھا، اگر اب وہ مجھے مل سکتا تو بطور یادگار رکھ لیتا" وہاں انھوں نے ایک سال گذارا تھا کہ جامعہ مصریہ کی مالی حالت خراب ہو گئی اور ان کو مصر واپس ہونا پڑا۔ تین ماہ انھوں نے بڑی حسرت ویاس کے عالم میں قاہرہ میں گذارے۔ دوسرے سال جب یونیورسٹی کی مالی حالت بہتر ہو گئی تو ان کو دوبارہ پیرس جانے کی اجازت ملی۔ پہلے وہ فرانس پہونچ کر ایک ہوٹل میں ٹھہرے پھر ایک گھر میں منتقل ہو گئے۔

اب یہاں سے طٰہٰ حسین کی زندگی کا ایک دوسرا باب شروع ہوتا ہے۔ ایک فرانسیسی ادیب نے صحیح لکھا ہے کہ "ایک دن طٰہٰ حسین لکچر ہال میں اپنی کرسی پر جامعہ سوربون میں بیٹھے ہوئے تھے کہ انھوں نے ایک خوبصورت آواز سنی کہ "میں اسباق کو دہرانے اور پڑھنے میں آپ کی مدد کروں گی۔" یہ آواز ایک فرانسیسی طالبہ کی تھی جو ایک کیتھولک گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ طٰہٰ حسین نے غالباً اسی کی منشا سے اس کے گھر میں قیام کیا۔ یہ نوجوان لڑکی ٹریننگ کالج میں پڑھتی تھی۔ اس نے بطور سکریٹری ان کی مدد کی اس لئے کہ اندھے ہونے کے باعث یہ نہ خود لکھ سکتے تھے اور نہ پڑھ سکتے تھے، اس لئے مطالعہ کے لئے ان کو کتابیں سنائی جاتی تھیں اور لکھنے کے لئے یہ اپنی تصانیف املا کراتے تھے۔ یہ لڑکی اور اس کی ماں رات کو بیٹھ کر طٰہٰ حسین کو فرانسیسی ادب کے شاہکار پڑھ کر سناتیں، یہ لڑکی اکثر مشکل عبارتوں، اشعار اور الفاظ کا مطلب بھی ان کو سمجھاتی۔ اس سے انھوں نے دو برس میں لاطینی زبان بھی سیکھ لی۔ فرانس میں طٰہٰ حسین نے اپنے کو خوب مشغول رکھا۔ مختلف کالجوں میں مفید لکچر جا کر سنتے۔ انھوں نے مختلف علوم بڑی محنت سے حاصل کئے۔ قدرتی امر ہے کہ طٰہٰ حسین کو اس لڑکی سے قلبی تعلق پیدا ہو گیا۔ یہ جان و دل سے آرزومند ہو گئے کہ اس کو اپنا شریک حیات بنالیں مگر لڑکی نے جس کا نام سوزاں تھا ان کے اندھے پن کی وجہ سے تذبذب محسوس کیا۔ وہ کافی دنوں تک اس مسئلہ میں مذبذب رہی لیکن اس کے ایک عزیز جو پادری تھے انھوں نے ایک ایسی بات کہہ دی جس نے اس کے تذبذب کو ختم کر دیا۔ انھوں نے کہا کہ "اس شخص پر تم بھروسہ کر سکتی ہو کہ یہ تمہارے ساتھ ہمیشہ رہے گا اور تم کو کبھی نہیں چھوڑے گا۔" اس

کے بعد سوزان نے شادی کی منظوری دیدی مگر جامعہ مصریہ کے قاعدہ کے مطابق کسی طالب علم کو دورانِ تعلیم کسی غیرملکی لڑکی سے شادی کی اجازت نہ تھی لہٰذا طٰہٰ حسین نے جامعہ مصریہ کو لکھا کہ اندھے ہونے کی وجہ سے مجھے ایک مددگار کی ضرورت ہے، میں شادی کرنا چاہتا ہوں لہٰذا مجھے اس قانون سے مستثنیٰ کرکے شادی کی اجازت دیدی جائے۔ چنانچہ یونیورسٹی نے کثرت رائے سے ان کے حق میں فیصلہ کیا اور طٰہٰ حسین نے اگست ۱۹۱۷ء میں سوزان سے شادی کرلی۔ اس کے بعد وہ دونوں ایک چھوٹے سے گھر میں الگ رہنے لگے۔ سامی کیالی نے صحیح لکھا ہے کہ یہ رفیقہ حیات ان کے لئے حاسۂ سادسہ ثابت ہوئی۔ اس نے فرانسیسی ادب کے شاہکاروں سے طٰہٰ حسین کو مانوس کیا۔ اسی نے ان کو لاطینی سکھائی یہاں تک کہ انھوں نے اس زبان کی ایک اہم ڈگری حاصل کرلی۔ طٰہٰ حسین لکھتے ہیں کہ اس نے میری ظلمتِ حیات کو روشنی سے بدل دیا۔ یہ میری رفیقہ، استاد، مددگار اور مختلف حیثیتوں سے میری زندگی میں شریک ہے۔

یہ کوئی آسان بات نہ تھی کہ ازہر کا ایک مولوی جامعہ سوربون سے ابن خلدون کے فلسفۂ اجتماع پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرے اور کالج دی فرانس کے معروف انعام "سنتور" کا مستحق قرار پائے۔ جس طرح ان کی پہلی کتاب ذکری ابی العلاء کو علمی حلقوں میں نہایت اہمیت کی نظر سے دیکھا گیا اسی طرح ابن خلدون پر طٰہٰ حسین کی مساعی کو بھی سراہا گیا۔ یہ حقیقت ہے کہ طٰہٰ حسین نے پہلی بار علامہ ابن خلدون کے اعلیٰ افکار کو ایک منظم انداز میں سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اس کتاب کے مقدمہ میں انھوں نے بڑی عمدہ بات کہی ہے کہ عصر جاہلی سے اب تک عربی ادب میں دو شخصیتیں نہایت ممتاز ہیں جن کے اندر غیرمعمولی خلاقانہ صفات وصلاحیت نظر آتی ہے۔ پہلی شخصیت ابوالعلاء معری کی ہے جس نے اپنے مجموعۂ شعری "اللزومیات" میں فلسفۂ زہد وتشاؤم پیش کیا ہے یہاں تک کہ اس کو "لوکریس العرب" کہا جاتا ہے۔ اسی طرح اس نے رسالۃ الغفران میں عالم آخرت میں اپنے سفر کا حال لکھا ہے اور جنت کی تعریف اور وہاں شعراء کا حال بیان کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ کہ کس شعر کی وجہ سے کس کی مغفرت ہوئی۔

ابن خلدون کی شخصیت معری کی ضد ہے۔ ابن خلدون کی خلاقانہ ذہنیت زندگی کے عملی میدان پر اپنی قوت صرف کرتی ہے، اگرچہ ان کی زندگی اور زمانہ کے سیاسی اضطرابات اور سازشوں نے ان کو اس کا موقع نہ دیا کہ وہ اپنے نفس اور دوسروں کی زندگیوں پر گہری نظر ڈالیں۔ پھر انھوں نے اس مضطرب زمانہ میں تاریخ اسلام اور مختلف فلسفہ کے گہرے مطالعہ سے نیا فلسفۂ تاریخ پیش کیا جس کا موضوع سماج اور اس کی تاریخ تھا۔ طٰہٰ حسین نے ابن خلدون کے فلسفہ کی تشریح کے دوران کہیں کہیں ان کے نظریات سے اختلاف کیا ہے اور ان کا ابطال بھی کیا ہے۔

ابن خلدون نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اہل عرب حکومت وجہانبانی سے ناواقف اور اس کے لئے نااہل ہیں۔ وہ اس وقت کامیاب حکومت چلا سکتے ہیں جب کہ کوئی دینی طاقت ان کے ساتھ ہو۔ اس رائے سے طٰہٰ حسین نے اختلاف کرتے ہوئے لکھا کہ اگرچہ تفاصیل بیان کرنے کا یہاں موقع نہیں پھر بھی یہ حقیقت ہے کہ جو اصطلاحات انسانی سوسائٹی کی فلاح وبہبود کے لئے خلفائے راشدین، بنی ہاشم اور بنی عباس نے رائج کیں اور ان کے نتیجہ میں جو عمدہ انصاف پسند سماج ظہور پذیر ہوا اس سے انکار ناممکن ہے۔ ان کی انتظامی صلاحیتیں قابل رشک ہیں۔ ان کے ادوار حکومت میں لوگوں کو مادی اور عقلی ترقی کے اسباب پوری طرح فراہم کئے گئے۔ اگرچہ ہم یہ پسند نہیں کرتے کہ عربوں اور ترکوں کے طرز حکومت کا موازنہ کریں ورنہ یہ امر واضح ہو سکتا ہے کہ عربوں نے ملکوں کو آباد کیا اور قوموں کو مہذب بنایا مگر ترکوں نے انھیں برباد کر دیا[۱]۔ طٰہٰ حسین کی اس کتاب کا ترجمہ فرانسیسی سے عربی میں استاذ عنان نے کیا

جب وہ فرانس سے واپس ہوئے تو عربی زبان میں ان کی دو کتابیں اہمیت حاصل کر چکی تھیں چنانچہ جامعہ مصریہ جس کے وہ طالب علم بھی رہ چکے تھے اس میں ان کو استاد بنا دیا گیا۔ یہاں طٰہٰ حسین نے بالکل ایک نیا انداز درس اختیار کیا۔ انھوں نے قدیم یونانی علوم کا درس دینا شروع

۱۔ ملاحظہ ہو مقدمہ فلسفۃ ابن خلدون الاجتماعیۃ

کیا طٰہٰ حسین چاہتے تھے کہ جامعہ مصریہ عظیم یورپی تعلیم گاہوں کی بلندی تک پہنچ جائے۔ اس کے لئے ان کے نظریہ سے یونانی ادبیات کا مطالعہ نہایت ضروری تھا، انھوں نے طلبہ کو یونانی تاریخ اور ادبیات کے درس دئے اور اس سلسلہ میں دو کتابیں تصنیف کیں ایک "الشعر التمثیلی" اور دوسری "الادب التمثیلی عند الیونان"۔ اسکولوس اور سوفوکلیس کی کومیڈی کے ترجمے بھی انھوں نے کئے۔ اس سلسلہ میں ان کا بڑا کارنامہ ارسطو کی کتاب کا وہ ترجمہ ہے جو نظام الاثنین کے نام سے شائع ہوا۔ یہ ارسطو کی وہ عظیم کتاب ہے جس کا علم دنیا کو مصر کے ذریعہ سے ہوا۔ ۱۸۹۱ء میں مصر میں یہ کتاب دریافت کی گئی اور برٹش میوزیم پہونچ گئی۔ پھر لندن و پیرس سے اس کے ترجمے انگریزی، فرانسیسی، جرمن اور اطالوی زبانوں میں چھپے۔ طٰہٰ حسین نے اس کو عربی میں منتقل کر کے ایک بڑی اہم خدمت انجام دی۔ طٰہٰ حسین کا نظریہ یہ ہے کہ مولیئر، شکسپیر اور ملٹن کا مطالعہ اہمیت رکھتا ہے مگر ان سب سے پہلے یونانی ادب کا مطالعہ ضروری ہے۔

جب طٰہٰ حسین نے جامعہ مصریہ میں لکچر دینے شروع کئے تو انھوں نے ارادہ کیا کہ عربی ادب کی ایک جدید تاریخ مرتب کریں۔ اس مقصد کے پیش نظر انھوں نے عربی ادب کا مطالعہ بالکل ابتدائی دور یعنی عصر جاہلیت سے شروع کیا۔ اس وقت ان کے ذہنوں میں ادب جاہلی کے بارے میں شکوک پیدا ہوئے۔ وہ برابر مطالعہ کرتے رہے۔ اصل اشعار کو الحاقی اشعار سے الگ کرتے رہے اور ان کے الفاظ و معانی پر غور کرتے رہے یہاں تک کہ انھوں نے یہ نظریہ قائم کیا کہ جس کو جاہلی شاعری کہتے ہیں وہ سب انتحال[1] ہے اور اسلام کے بعد گھڑی گئی ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب "الشعر الجاہلی" میں بتایا کہ جاہلی شاعری میں دراصل مسلمانوں کی زندگی اور ان کے ذہنی رجحانات کی ترجمانی زیادہ ہے اور شعرائے جاہلیت کی زندگی کی تصویریں بہت کم ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ یہ قصائد اتنے مرصع ہیں کہ عصر جاہلیت میں ان کا وجود مستبعد ہے۔

۱۔ انتحال عربی کی ایک اصطلاح ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی چیز گھڑ کر دوسرے کی طرف منسوب کر دی جائے۔

ان میں وحدت ہے اور ایک ترقی یافتہ شاعرانہ انداز ہے جس کا تصور عصر جاہلیت میں مشکل تھا ان کی رائے میں ان قصائد کو راویوں، نحویوں، قصہ گویوں، مفسروں، محدثوں اور متکلمین نے گھڑا ہے۔ اپنے نظریہ کے ثبوت میں انھوں نے شکوک ابھارے۔ یہ طریقہ دراصل ڈیکارٹ کا ہے جس کے فلسفۂ شک سے انھوں نے تاثر قبول کیا تھا۔

اس سلسلہ میں بعض بحثیں ان کی کتاب میں ایسی شامل ہوگئیں جن سے مذہبی لوگوں کے جذبات مجروح ہوئے خاص طور سے جامعہ ازہر کے علماء نے ان کی اس عبارت پر سخت اعتراضات کئے :

انه لا یکفی لکی تثبت من الوجهة العلمية وجود ابراهيم وابنه فی التاريخ ان يكون اسماهما قد ذكر افی التوراة والقرآن	علمی طور پر حضرت ابراہیم اور ان کے بیٹے (حضرت اسماعیل) کا وجود ثابت کرنے کے لئے یہ دلیل کافی نہیں کہ ان دونوں کا ذکر توریت اور قرآن میں کیا گیا ہے۔

چونکہ اس عبارت سے حضرت ابراہیم کا انکار نہ سہی مگر ان کے وجود کے بارے میں شک ضرور پیدا ہوتا ہے اس لئے مذہبی اور ادبی دونوں لحاظ سے اس کتاب کے خلاف بے شمار مضامین اور بہت سی کتابیں شائع کی گئیں۔ ان میں سے چند وقیع واہم کتابوں کی فہرست درج ذیل ہے :

تحت راية القرآن	مصنفہ	مصطفے صادق الرافعی
الشهاب الراصد	"	محمد لطفی جمعة
نقد الشعر الجاهلی	"	علامہ فرید وجدی
نقض الشعر الجاهلی	"	الاستاذ محمد خضر حسین
النقد التحليلی لكتاب فی الادب الجاهلی	مصنفہ	استاذ محمد احمد غمراوی
		مع مقدمۂ طویل از علامہ شکیب ارسلان

یہ معاملہ اتنا بڑھ گیا کہ عوام الناس میں طٰہٰ حسین کے خلاف شدید قسم کے جذبات پیدا ہوگئے

اور یہ قضیہ بجائے علمی ہونے کے سیاسی بن گیا۔ چونکہ جامعہ مصریہ بالکل نئی تھی اور طٰہٰ حسین اس میں کام کرتے تھے اس لئے خدشہ یہ ہوا کہ حکومت اس میں دخل نہ دے اور اس طرح یونیورسٹی کو نقصان نہ پہونچ جائے، لہٰذا طٰہٰ حسین نے وائس چانسلر کے نام ایک خط لکھا جس میں یہ اعلان کیا کہ میں مسلمان ہوں۔ مجھے اسلامی شخصیتوں کے وجود میں کوئی شک نہیں۔ میں اللہ کے رسولوں، اس کی کتابوں، فرشتوں، جنت و دوزخ اور حشر و نشر پر یقین رکھتا ہوں۔ ان کے خلاف جذبات اس بیان سے بھی نہ رکے اور بالآخر کتاب کو قابل ضبطی قرار دیا گیا۔ طٰہٰ حسین کے خلاف ملک میں اتنا غم و غصہ تھا کہ ان کے والد نے ان کو خط لکھا جس میں اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔ طٰہٰ حسین نے اس کا ایک مختصر جواب اس طرح دیا[1]:

ابی،	والد صاحب!
انت اوصیتنی بأن لا اصدق کل ما اسمع و انا اوصیك بأن لا تصدق کل ما تقرأ۔ ولك من ابنك وجتی ومنی الطیب التحیات	آپ نے مجھے اس امر کی نصیحت کی تھی کہ میں ہر اس بات کو صحیح نہ مانوں جو کہ سنتا ہوں۔ میں آپ سے گذارش کرتا ہوں کہ آپ ہر اس چیز کو صحیح تصور نہ فرمائیں جو آپ پڑھتے ہیں۔ میری اہلیہ کی طرف سے اور میری طرف سے سلام قبول ہو۔
طٰہٰ حسین	طٰہٰ حسین

بعضوں نے تو طٰہٰ حسین کو قتل کی دھمکی دی مگر بہر حال اس سے طٰہٰ حسین کی علمی شہرت بڑھ گئی بعد میں صدقی پاشا نے ان کو یونیورسٹی سے ہٹا کر وزارت تعلیم میں مقرر کیا اور وہاں سے بھی اسی جرم نے ان کو الگ کروادیا۔ طٰہٰ حسین کا اصل نظریہ یہ تھا کہ شعر و ادب کی جانچ میں علمی نقطۂ نظر اختیار کرنا چاہیئے۔ مذہبی تقدس یا عقیدہ کے باعث تاریخی حقائق کو نظر انداز نہ کرنا چاہیئے۔ جس طرح

۱۔ مع طٰہٰ حسین از سامی کیالی، قاہرہ ۱۹۵۲ء ص ۱۰ تا ۲۷

سائنسداں مادہ کی تحلیل غیر جانبداری سے کرتے ہیں اسی طرح ہم کو ادبی حقائق اور فن کاروں کی
ندگی کا مطالعہ سائینٹفک انداز سے کرنا چاہیے جس میں آزادیٔ فکر کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔
بعد میں یہ کتاب الادب الجاہلی کے نام سے چھپی اور مقبول ہوئی۔ اس میں ایک باب طٰہٰ حسین
نے بالکل حذف کردیا اور چند ابواب کا اضافہ کردیا۔ آج یہ کتاب ہر جگہ داخل درس ہے
ر اونچی جماعتوں میں پڑھائی جاتی ہے (باقی آئندہ)

جناب عبدالصمد صارم الازہری نے "تنقیدات طٰہٰ حسین" کے نام سے اردو
میں ایک کتاب لکھی ہے جو ۱۹۷۱ء میں لاہور سے شائع ہوئی ہے جس میں
ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی وہ تنقیدات شامل ہیں جو نظم سے متعلق ہیں۔ کتاب کے
پیش لفظ میں فاضل مرتب نے لکھا ہے کہ "ان تنقیدات کے شائع کرنے سے
میرا یہ بھی مقصد ہے کہ ہماری زبان میں ہمارے اس محبوب مصنف کے
خلاف بھی کچھ جمع ہو جائے۔" اس کے باوجود کہ فاضل مرتب ڈاکٹر طٰہٰ حسین
کے مخالف ہیں پھر بھی انھوں نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

> "پروفیسر طٰہٰ حسین مشرق و مغرب میں ایک ممتاز عربی ادیب
> کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں۔ تمام دنیا کے مصنفین نے
> ان کی تصانیف کو سراہا ہے۔ وہ اپنے زور قلم کی بنا پر بات
> کو بڑی خوبی سے پیش کرتے ہیں اور واقعات کی کڑی
> سے کڑی ملاتے جاتے ہیں کہ کہیں بھی جھول محسوس نہیں ہوتا۔"

دانیال لطیفی
تلخیص و ترجمہ: ڈاکٹر مشیر الحق

مسلم پرسنل لا سے متعلق ایک اہم عدالتی فیصلہ

آزاد ہندوستان کی عدالتوں نے وقتاً فوقتاً مسلم پرسنل لا کے متعلق جو فیصلے کئے ان میں انصاف اور عملی نتائج کے اعتبار سے غالباً سب سے اہم فیصلہ کیرلا ہائی کورٹ کے چیف جسٹس، وی، آر، کرشنا آئر کا ہے جسے اے آئی، آر (۱۹۷۱) کیر، ۲۶۱ میں یوسف بنام سورتا کے تحت دیکھا جاسکتا ہے۔ اس مقدمہ کی روداد مختصراً یہ ہے کہ ایک ۱۵ سالہ حنفی العقیدہ مسلمان لڑکی سورتا کی شادی ۱۹۶۲ء میں اس سے تقریباً دوگنی عمر کے ایک شخص، یوسف، سے ہوئی تھی۔ تھوڑے ہی دنوں کے ازدواجی تعلقات کے بعد سورتا اپنے شوہر کو چھوڑ کر چلی گئی۔ کئی برس تک دونوں الگ الگ رہتے رہے، اس کے بعد سورتا نے قانون انفساخ نکاح مسلمانان مجریہ ۱۹۳۹ کے تحت عدالت میں اس بنا پر خلع حاصل کرنے کے لئے درخواست دی کہ اس کے شوہر نے ۲ سال سے اس کا نان نفقہ ادا نہیں کیا تھا۔

یوسف نے اپنے جواب دعویٰ میں کہا کہ مدت مذکورہ میں اس کی بیوی کے لچھن ایسے نہیں رہے ہیں کہ وہ اس کے نان نفقہ کی ذمہ داری اٹھاتا۔ بدیں وجہ سورتا کو نان نفقہ کی بنیاد پر طلاق مانگنے کا حق حاصل نہیں ہے، لیکن جسٹس کرشنا آئر نے شوہر کی درخواست رد کردی اور بیوی کو طلاق حاصل کرنے کا حق دیدیا۔

مقدمہ کے مالہ وماعلیہ پر غور کرتے وقت جسٹس آئر کو یہ پتہ چلا کہ مسلم پرسنل لا کے گہرے

مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ حیرت انگیز طور پر اس کا قانون طلاق معقول، حقیقت پسند اور جدید طرز کا قانون ہے۔ انھوں نے اپنے فیصلہ کی بنیاد اس بات پر رکھی کہ "اسلام میں نکاح کی حیثیت ایک باہمی معاہدہ ہے۔ یہ کوئی ایسا مقدس معاہدہ نہیں ہے جس کے شرکا کبھی الگ ہو ہی نہ سکیں بلکہ یہ ایک ایسا مشروط معاہدہ ہے جسے خاص حالات میں شرکار معاہدہ کی مرضی سے ختم کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں عوامی اعلان صرف مستحسن ہے، لازمی نہیں ہے، نہ ہی کسی مذہبی رسم کی بجا آوری کی ضرورت ہے۔"

جسٹس کرشنا آئر کا خیال ہے کہ مسلم قانون ازدواج میں جو ایک ہلکی سی جدیدیت ہے اسے نظرانداز کرنا ممکن نہیں ہے، بلکہ اس قانون میں جن نکات کو نمایاں کیا گیا ہے وہ بعینہ وہی ہیں جو ترقی یافتہ ممالک کے قانون ازدواج یا ہندوستان کے اسپیشل میرج ایکٹ (نمبر ۴۳، ۱۹۵۴ء) میں پائے جاتے ہیں۔ مسلمانوں کے علاوہ بعض غیر مسلم فرقوں مثلاً MARUMAKKATHAYEE کے یہاں بھی شادی بیاہ میں مذہبی رسومات پر زیادہ زور نہیں دیا جاتا۔ اسی طرح عدالتی شادیاں بھی بغیر کسی مولوی ملا کی مدد کے انجام پا جاتی ہیں۔

شوہر کے لامحدود اختیارات

جسٹس کرشنا آئر اپنے فیصلہ میں لکھتے ہیں: "اس بات کی حیثیت غلط العوام سے زیادہ نہیں ہے کہ مسلمان مرد کو قرآن نے طلاق دینے کے لامحدود اختیارات دے رکھے ہیں۔ اس کے برخلاف قرآن تو واضح طور سے طلاق دینے کے بہانے تلاش کرنے سے شوہروں کو روکتا ہے..... اگر کوئی شوہر اپنی بیوی کو بلا وجہ چھوڑ دے یا اسے بیچ ادھر میں لٹکائے رکھے تو در حقیقت وہ غضب خداوندی کو دعوت دیتا ہے۔" کیونکہ پیغمبر اسلام (صلعم) کے بقول جو شخص اپنی بیوی کو

احمد گلواش ، دی ریلیجن آف اسلام ، صفحہ ۱۰۴۳

شک وشبہ کی بنا پر چھوڑ دے اس پر اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہوتا ہے۔ نبی صلعم نے فرمایا ہے کہ طلاق اللہ تعالیٰ کی نظروں میں ابغض المباحات ہے"۔ اور یہ کہ "دنیا میں خدا نے جتنی چیزیں پیدا کی ہیں اس میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز طلاق ہے"۔ بعض مسلمان مفسرین نے لکھا ہے کہ اس کی تائید کچھ مسلم ممالک (مثلاً عراق) کے مروجہ قوانین سے بھی ہوتی ہے کہ شوہر کے لئے ضروری ہے کہ وہ طلاق دینے سے قبل عدالت کو ان وجوہات کی طرف سے مطمئن کر دے جن کی بنا پر وہ طلاق دینا چاہتا ہے۔ مگر ہندوستان میں مسلم پرسنل لا نے ایک ایسا رُخ اختیار کر لیا ہے جو نہ صرف قرآن وحدیث کی روح کے برخلاف ہے بلکہ اسلام نے بیوی کو جو حق طلاق دیا ہے اسے بھی سلب کر لیتا ہے۔

بیوی کا حق

بیویوں کے حق مطالبۂ طلاق پر بحث کرتے ہوئے جسٹس کرشنا آئر قرآن کی ایک آیت کا حوالہ دیتے ہیں جس کا مفہوم یہ ہے کہ جس طرح شوہروں کو اپنی بیویوں پر اختیارات حاصل ہیں اسی طرح بیویوں کو بھی اپنے شوہروں پر اختیارات حاصل ہیں۔ جسٹس کرشنا آئر کی نظر میں یہ ایک انقلابی حکم ہے کیونکہ اس کی رو سے عورتیں مردوں کے مساوی ہو جاتی ہیں۔ اس اقدام کو موثر بنانے کے لئے، عدالتیں اپنے فیصلوں میں اور قانون اسلام کے مصنفین اپنی تصنیفات میں آنحضرت صلعم کے قول وعمل کو اکثر وبیشتر مثال کے طور پر پیش کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً آنحضرت صلعم نے فرمایا ہے کہ جس شادی سے کسی عورت پر ظلم ہو رہا ہو اس شادی کو ختم ہو جانا چاہئے۔

عورتوں کے حق خلع کا ذکر کرتے ہوئے جسٹس آئر اسلام میں خلع کے سب سے پہلے مقدمہ کا حوالہ دیتے ہیں جس کا ذکر امام بخاری نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔ واقعہ یوں ہے کہ ایک صحابی ثابت بن قیس کی بیوی جمیلہ آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور کہنے لگیں، یارسول اللہ، مجھے ثابت کے مزاج یا ان کی مذہبی زندگی سے کوئی شکایت نہیں ہے لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ اگر ہمارے

ازدواجی تعلقات جلد ہی ختم نہ ہو گئے تو میری دینی زندگی خطرہ میں پڑ جائے گی۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ ثابت نے مہر میں جو باغ تمھیں دیا تھا کیا تم اسے واپس کرنے پر تیار ہو، جمیلہ نے اس پر رضامندی ظاہر کی، تب آنحضرتؐ نے ثابت سے فرمایا "اپنا باغ لے لو اور انھیں فوراً طلاق دے دو۔" اس روایت سے جسٹس آئر یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ثابت بے قصور تھے اور طلاق کا مطالبہ بیوی کی طرف سے ہوا تھا جسے یہ خطرہ تھا کہ وہ حق زوجیت کو حدود اللہ کے مطابق ادا نہ کر سکیں گی۔ ایسی صورت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیوی کو خلع کی اجازت اس شرط پر دیدی کہ وہ اپنی آزادی کے معاوضہ میں شوہر کی طرف سے آئی ہوئی چیزوں کو واپس کر دے۔

جسٹس کرشنا آئر کے خیال میں خلع ایک ایسی طلاق ہے جسے ایک غیر مطمئن بیوی کے مطالبہ پر بے قصور اور غیر خواہشمند شوہر کو نبی صلعم کے حکم کے مطابق دینا پڑتا ہے۔ اس لئے اگر کوئی جج اس بات سے مطمئن ہو کہ فریقین کے ازدواجی تعلقات ناکام ہو چکے ہیں، اور بیوی مہر وغیرہ کے سلسلے میں مناسب شرائط کو تسلیم کرنے پر آمادہ ہے تو پھر عدالت شوہر کو طلاق دینے پر مجبور کر سکتی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ انگریزوں کے بنائے ہوئے مسلم قانون طلاق میں خلع کی حیثیت کو پوری طرح سے نہیں سمجھا گیا ہے۔ بقول علامہ عبداللہ یوسف علی "اگرچہ ازدواجی زندگی کی بقا کے لئے شادی کے رشتہ کی تقدیس ضروری ہے لیکن اگر انسان کی فطری کمزوریاں اور افراد کی غیر مزاجی مطابقت کو ذہن میں نہ رکھا گیا تو پھر یہی تقدیس انسانی زندگی کے لئے ایک بندھن بن کر رہ جائے گی۔" اسی خطرہ کی طرف قرآن نے نہ صرف اشارہ کیا ہے بلکہ اس احل بھی بتادیا ہے۔ "اگر تمھیں میاں بیوی کے درمیان کشمکش کا علم ہو تو تم ایک حَکَم مرد کے خاندان سے اور ایک حَکَم عورت کے خاندان سے مقرر کر دو۔ اگر دونوں کی نیت اصلاح حال کی ہوگی اللہ تعالیٰ دونوں کے درمیان موافقت پیدا کر دے گا۔" اس حکم قرآن کی تشریح کرتے ہوئے نانا محمد علی لاہوری اپنے انگریزی ترجمہ قرآن میں لکھتے ہیں: "اس آیت نے طلاق کے قضیوں کے

بارے میں ایک قاعدہ متعین کر دیا ہے، جس کی رو سے کوئی شوہر اپنی بیوی کو از خود نہیں چھوڑ سکتا۔ اس کے لئے اُسے جج سے اجازت لینی پڑے گی۔۔۔۔ جج کے لئے ضروری ہے کہ وہ دو حکم مقرر کرے، ایک شوہر کے خاندان کا ہو دوسرا بیوی کے۔ یہ دونوں صورت حال کا جائزہ لیں اور کوشش کریں کہ فریقین میں مصالحت ہو جائے۔ لیکن اگر مصالحت کی تمام کوششیں ناکام ہو جائیں تب شوہر کو طلاق دینے کی اجازت دی جائے گی۔ بہرحال یہ واضح رہے کہ آخری فیصلہ جج کے ہاتھوں میں ہے کیونکہ قانونی طور سے صرف وہی طلاق کو نافذ کرنے کا مجاز ہے۔ تاریخ اسلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں مقدمات طلاق کے فیصلے اسی نہج پر کئے جاتے تھے۔" اس کے بعد جسٹس آئر نے اپنے فیصلہ میں پاکستان سپریم کورٹ کے ایک مقدمے (خورشید بی بی بنام محمد امین۔ پی، ایل، ڈی، ۱۹۶۷، ایس، سی، ۹۷) کے فیصلے کا حوالہ دیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اگر عدالت کو اس بات کا اطمینان ہو جائے کہ بصورت دیگر عورت کو ایک گھناونے رشتہ میں بندھے رہنے پر مجبور ہونا پڑے گا تو وہ بیوی کو خلع حاصل کرنے کا حق دیدے گی۔ اس کے بعد جسٹس آئر کہتے ہیں کہ پیغمبر اسلام (صلعم) کے زمانہ میں کچھ بد قماش لوگ ایسے تھے جن کی نظروں میں بیویاں صرف جنسی تسکین کا ذریعہ ہوتی تھیں۔ آپؐ نے اپنے احکام اور عمل کے ذریعہ عرب سماج کو اس برائی سے پاک کیا اور لوگوں کے دلوں میں خاندانی زندگی کی تقدیس کو جاگزیں کیا۔ اس سلسلے میں طلاق کے لئے جو بنیادیں مہیا کی گئیں ان میں باہمی نارضامندی کو ایک اہم جگہ دی گئی، کیونکہ اگر ایسے دو نامطمئن اشخاص کو ازدواجی رشتے میں باندھے رکھا جائے تو پھر زندگی اجیرن ہو جائے گی۔

بیّن اختلاف

جسٹس کرشنا آئر نے اپنے فیصلہ میں ہماری توجہ اس بین اختلاف کی طرف بھی مبذول کرائی ہے جو حقوق نسواں کے سلسلے میں ہندوستان کے مختلف ججوں کی رایوں میں پایا جاتا ہے۔ کیا

عورت طلاق کا مطالبہ کرنے میں صرف اسی وقت حق بجانب ہے جب اس کی طرف سے وظیفۂ جنسی کو پورا کرنے میں کوتاہی نہ ہوئی ہو، یا اس کی اپنی کوتاہیوں سے قطع نظر وہ اس بنیاد پر بھی خلع کا مطالبہ کرسکتی ہے کہ اس کے شوہر نے ۲ سال سے نان نفقہ کی ذمہ داریوں کو پورا نہیں کیا ہے۔ آخرالذکر شکل میں بہت سے ججوں کو یہ خطرہ محسوس ہوتا ہے کہ بری طرح رکھی جانے والی اکثر و بیشتر عورتیں بے دھڑک اپنے شوہروں سے علحدگی اختیار کرلیں گی اور خلع کا مطالبہ کریں گی۔ لیکن اس سلسلے میں جسٹس کرشنا آئر ان ججوں سے پوری طرح متفق نہیں ہیں، ان کا خیال ہے کہ اولاً تو ہندوستان کے مروجہ قانون کے تحت مسلمان شوہر کو اس بات کا پورا حق حاصل ہے کہ وہ جب چاہے اپنی مرضی سے رشتہ ازدواج کو ختم کر دے، اور ثانیاً ایسا مزمن اور بے اثر رشتہ اس قابل نہیں ہے کہ اسے باقی رکھا جائے۔ اگرچہ اس سلسلے میں کیرالا ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے نظائر خاموش ہیں لیکن جسٹس کرشنا آئر کے خیال میں اسلامی قانون طلاق کو اگر اس کے صحیح پس منظر میں رکھ کر دیکھا جائے تو اس سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ خلع کے لئے صرف یہ بنیاد کافی ہے کہ شوہر نے ۲ سال سے نان نفقہ ادا نہیں کیا ہے۔ اپنی اس بات کی تصدیق کے طور پر انھوں نے جسٹس حاتم طیب جی کا ایک فیصلہ (اے، آئی، آر، ۱۹۵۰، سندھ ۸) نقل کیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ بلاشبہ مسلم اخلاق اس بات کا طالب ہے کہ ازدواجی زندگی کے دوران شوہر اپنی بیوی کا نان نفقہ برداشت کرتا رہے، خواہ بیوی اپنی حرکتوں کے باعث قانونی طور سے نان نفقہ کی حقدار نہ رہ گئی ہو۔ بہرحال یہ سمجھ لینا چاہئے کہ بیوی کے اخراجات کی ادائگی خواہ وہ قانونی طور سے اس کی حقدار ہو یا نہ ہو شرط میں ہارے ہوئے روپوں یا ختم المدتی قرضوں کی ادائگی سے کسی طور کم نہیں ہے۔ ازدواجی زندگی کے دوران نان نفقہ کی ذمہ داریوں کو اٹھانے اور رشتۂ ازدواج کو منقطع کرنے والے اسباب کی بنیادوں میں فرق ہے۔ نکاح صرف اسی وقت فسخ ہوسکتا ہے جب ازدواجی تعلقات حقیقتاً ختم ہوگئے ہوں یا رشتۂ ازدواج کا بقا بیوی کے حق میں تباہ کن ثابت ہو رہا ہو۔ ایسے رشتہ کو مصنوعی طور سے باقی رکھنا خصوصاً

جبکہ شوہر اور بیوی حدود اللہ کا خیال نہ رکھتے ہوں اسلام کی نظر میں قابل نفرت ہے اور آنحضرت صلعم نے ایسے رشتوں کو ختم کر دینے کا حکم دیا ہے۔

صحیح نقطۂ نظر

جسٹس طیب جی نے اپنے فیصلہ میں لکھا ہے کہ انفساخ نکاح کے نقطۂ نظر سے مسلم شادیاں دوسرے مذاہب کی شادیوں سے بہت مختلف ہیں۔ یہاں کسی ایسے رشتے کو باقی رکھنا عقلمندی نہیں ہے جہاں فریقین کے باہمی ازدواجی تعلقات ناکام ہو چکے ہوں۔ ایسی ناکام شادیوں کو ختم کر دینے میں کوئی برائی نہیں ہے۔ اس کے بعد جسٹس طیب جی کتاب البخاری سے جمیلہ اور ثابت بن قیس کی مذکورہ بالا روایت کو نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں: اسلام میں شروع ہی سے بیویوں کو خلع کا حق حاصل رہا ہے۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ زوجین حدود اللہ کو قائم رکھنے میں ناکام ہو چکے ہیں تو نکاح فسخ ہو سکتا ہے اگر (۱) ازدواجی تعلقات اپنی حقیقی اہمیت زوجین کی نظروں میں کھو چکے ہوں یا (۲) رشتہ ازدواج کا بقا بیوی کے حق میں تباہ کن ہو..... جب زوجین الگ الگ رہتے ہوں اور شوہر نان نفقہ برداشت نہ کر رہا ہو اس صورت میں فسخ نکاح ایسے شوہر کو سزا دینے کے لئے نہیں ہے جس نے اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں کوتاہی برتی ہے، نہ ہی اس فعل سے عورت کا حق نان نفقہ متعین اور ثابت کرنا مقصود ہے۔ مسلم قانون انفساخ میں نان نفقہ کی طرف سے طویل عرصہ تک لاپرواہی برتنے کو صرف یہ حیثیت دی گئی ہے کہ اس کی بنا پر ایک شادی کو قریب الختم سمجھا جائے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بیوی کا نافرمانبردارانہ رویہ یا شوہر کے ساتھ رہنے سے اس کا انکار انفساخ نکاح کی اجازت کے لئے بنیادی اصول کی حیثیت نہیں رکھتے۔

اصول انفساخ

مذکورہ بالا فیصلہ کے بارے میں جسٹس کرشنا آئر لکھتے ہیں: چیف جسٹس طیب جی

کے دلائل سے میں بہت ہی متاثر ہوا ہوں۔ میری حقیر رائے میں ان کا فیصلہ اسلام کی مقد کتابوں اور مسلم سماج کی خصوصیات سے پوری طرح مطابقت رکھتا ہے......... جسٹس ا جی کی طرح جسٹس عبدالرشید نے بھی (جو بعد میں پاکستان کے چیف جسٹس مقرر ہوئے) لاہ کے ایک مقدمہ میں اسی قسم کا فیصلہ دیا تھا۔ درحقیقت مسلم قانون طلاق کا بنیادی اور افاد نقطۂ نظر ترقی یافتہ ممالک میں تسلیم شدہ اصولوں کے بالکل مطابق ہے۔ اس سلسلے میں ہم جرم ڈیموکریٹک ری پبلک کے عائلی قانون کو پیش کرسکتے ہیں جس کی تشریح سرکاری طور پر حسب ف الفاظ میں کی گئی ہے:

"اس قانون کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس نے سابقہ جرمن سول فیملی لا کے "اصول خطا" کو ختم کردیا ہے، جس کے تحت طلاق کے خواہش مند کو یہ ثابت کرنا پڑتا تھا کہ دوسرے فریق نے مجرمانہ طریقہ سے ازدواجی فرائض کی طرف سے کوتاہی برتی ہے۔ اس کے برخلاف جرمن ڈیموکریٹک ری پبلک کے موجودہ قانون میں طلاق کے لئے ازدواجی صورت حال کو بنیادی اصول کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔ مسودہ قانون میں یہ واضح کردیا گیا ہے کہ اگر شادی اولاً زوجین کے لئے اور نتیجتاً بچوں اور سوسائٹی کے لئے بے معنی ہو کر رہ جائے تو ایسی شادی کو ختم کردیا جانا چاہیئے خواہ الزام کسی بھی شریک زندگی کے سر ہو، کیونکہ ازدواجی رشتے کی نزاکتوں اور اس کی بوقلمونیوں کے پیش نظر یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ زوجین میں سے کسی ایک کے سر الزام رکھا جاسکے خصوصاً جبکہ طلاق پر ختم ہونے والے اختلافات برسہا برس اندر ہی اندر پکتے رہتے ہیں اور جڑیں گہری ہوتی چلی جاتی ہیں۔"

قانون اور رواج

طلاق کے بارے میں فلسفی برٹرنڈ رسل کے خیالات کو بھی جسٹس کرشنا آئر نے نقل

یا ہے۔ رسل کے بقول "طلاق کے سلسلے میں عجیب ترین ہے وہ اختلاف جو عموماً رواج اور قانون کے درمیان پایا جاتا ہے۔ یہ بات قطعاً صحیح نہیں ہے کہ قانون طلاق میں آسانیاں پیدا کر دینے کی وجہ سے طلاق کی تعداد میں بے تحاشا اضافہ ہو جائے گا۔ میرے خیال میں قانون اور رواج کا یہ امتیاز اہم ہے کیونکہ اگرچہ میں نسبتاً آسان قانون طلاق کا حامی ہوں لیکن جب تک "والدینی (Biparental) خاندانوں کا رواج باقی ہے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ مخصوص حالات سے قطع نظر طلاق دینا رواج کے خلاف کیوں ہو۔ میرے نزدیک شادی صرف جنسی رشتہ کا نام نہیں ہے بلکہ یہ دو اشخاص کے درمیان بچے پیدا کرنے اور ان کی پرورش اور تربیت کرنے کے معاہدہ کا نام ہے۔"

رسل کا خیال نقل کرنے کے بعد جسٹس کرشنا آئر لکھتے ہیں۔ "MARUMAKKATHAYEE کے قانون طلاق میں اگرچہ خاصی وسعت ہے لیکن اس کے باوجود ان کے یہاں عملاً جتنی طلاقیں دی جاتی ہیں ان کی تعداد قطعاً چونکا دینے والی نہیں ہے۔ یہ درست ہے کہ قانون کے ذریعہ مکانات کے دروازے کھل جاتے ہیں لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ سماج کا دباؤ انھیں چوپٹ کھلنے سے روکے رکھتا ہے۔ ان باتوں کے پیش نظر میری رائے ہے کہ مسلمان عورت قانون انفساخ مسلمانان کی دفعہ نمبر ۲ (ii) کے تحت خلع کا مطالبہ اس بنیاد پر کر سکتی ہے کہ اس کے شوہر نے نان نفقہ کی ادائگی میں کوتاہی برتی ہے خواہ اس کے لئے شوہر کے پاس معقول عذر رہا کیوں نہ ہو۔ قانون کی آواز پر جو عوامی خیالات کی بازگشت ہوتی ہے اکثر و بیشتر اخلاقیات کے بجائے حقائق پر مبنی ہوتی ہے۔

مساوی حقوق

جسٹس کرشنا آئر کے خیال میں اگر آنحضرتؐ کے فرمودات کو ذہن میں رکھتے ہوئے زوجین میں سے ہر فریق کو مساوی حقوق حاصل ہو جائیں نیز طلاق کے "فی الفوری" طریقہ کو ختم کر کے خلع کی طرح اسے

بھی عدالتی کاروائیوں کا پابند کر دیا جائے تو اس سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ مسلمان عورت بھی (دو
عورتوں کی طرح) اپنے پیروں پر کھڑی ہو جائے گی، اور اس طرح فریقین میں جو سماجی اونچ نیچ تا ہے
وہ ختم ہو جائے گی نیز مساوی انصاف کی بنیاد پڑ جائے گی۔

قانونی اہمیت سے قطع نظر جسٹس کرشنا آئر کے فیصلہ کی جو عملی اہمیت ہے وہ حسب ذیل ہے

(۱) یہ فیصلہ طلاق دینے میں مسلمان مرد اور عورت دونوں کو برابر کا درجہ دیتا ہے۔ جس طرح طلاق دینے میں شوہر کو ضمیر کے بوجھ کے علاوہ اور کوئی جھجک نہیں محسوس ہوتی اسی طرح عورت بھی اس بنیاد پر کہ اس کے اور شوہر کے درمیان ۲ سال سے علحدگی ہو چکی ہے اور شوہر نے نان نفقہ نہیں دیا ہے خلع حاصل کر سکتی ہے۔ اس طرح قانون طلاق ملک کے دستور کی دفعہ ۱۴ کے مطابق ہو جاتا ہے جس میں فطری امتیازات سے قطع نظر ہر حیثیت سے مرد اور عورت کو مساوی قرار دیا گیا ہے۔

(۲) یہ فیصلہ عورت کو غیر ذمہ دارانہ شوہروں کے ظالمانہ برتاؤ سے گلو خلاصی حاصل کرنے کا موقع مہیا کر کے سماج میں اس کے درجہ کو بلند کرتا ہے۔

(۳) یہ عورت سے متعلق اس خیال کی سختی سے نفی کرتا ہے کہ عورت صرف مردوں کے جنسی جذبہ کی تسکین کے لئے ہے۔

(۴) یہ شوہروں کو نان نفقہ مہیا کرنے کے سلسلے میں زیادہ محتاط بناتا ہے کیونکہ انھیں یہ ڈر لگا رہے گا کہ اگر ۲ سال تک انھوں نے اس کی طرف سے بے توجہی برتی تو وہ بیویوں سے محروم ہو جائیں گے

جسٹس کرشنا آئر کے فیصلے نے اسلام کے اصل قانون نکاح وطلاق کو جو صدیوں کی جابرانہ حکومت کے گرد وغبار سے دبا ہوا تھا، از سر نو اس کے اصلی روپ میں پیش کر دیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس عالمانہ فیصلہ کو سپریم کورٹ یا کسی دوسرے ذریعہ سے ملک کا قانون بنا دیا جائے۔

سید احمد علی آزاد

جامعہ میں ابتدائی تعلیم کے تجربے

(۹)

مدرسہ ابتدائی کے صبح کے ترانے میں ابتدائی چہارم سے ابتدائی ششم تک ترانے کی باری تی ہے۔ ہر جماعت اپنی باری پر تلاوت، حدیث، خبریں اور نظموں کے پڑھنے کی تیاری کرتی ہے۔ ناد جماعت اس ترانہ میں طلباء کی مدد کرتا ہے۔ ایک سال خبروں کے پڑھے جانے کو ابتدائی ششم میں زیادہ وسعت دی گئی اور خبریں پڑھنا جماعت کا مقصد بنا دیا گیا۔ ترانے میں خبریں سنانے بعد اس سے تعلیمی فائدہ حاصل کرنے کا منصوبہ بنایا گیا۔ مثلاً خبروں میں جو مشکل الفاظ آتے رہتے کے معنی لکھائے جاتے رہے۔ باری ہفتہ میں ایک دن ہوتی تھی۔ اگر سال میں چالیس بار بھی یں پڑھی گئیں تو ہر طالب علم کے پاس الفاظ کا کافی ذخیرہ ہو گیا۔ طلباء کو ان کے معنی بھی لکھوائے ۔ بچوں نے ان نئے الفاظ کے معنی بھی یاد کر لیے۔ یہ اس منصوبہ کا تعلیمی فائدہ تھا۔

خبریں عام طور سے صوبہ کی راجدھانی کے حوالہ سے اخباروں میں درج ہوتی تھیں۔ ہندوستان ایک بڑے نقشہ پر ہر صوبہ کی راجدھانی کی جگہ بنائی گئی اور اس راجدھانی سے متعلق خبریں شائع کرنے لئے ایک جگہ بھی بنائی گئی اور شہر سے خبر کی جگہ تک تاگے سے اشارہ کا نشان بھی بنا دیا گیا۔ یہاں بار خبریں لکھ کر نقشے کے ارد گرد بنے ہوئے خانوں میں یا تو بورڈ پن سے ٹکس کرتے تھے یا کارڈ راس میں لگا دیتے تھے۔ اس طرح ہندوستان کے تمام صوبوں کی راجدھانیوں کا طلباء کو علم بیا۔ نقشہ جماعت میں آویزاں رہتا تھا تاکہ راجدھانی کی جگہ اور نام یاد رہیں۔ اخباروں میں

بھی خبروں کے ساتھ نقشے ہوتے تھے۔

کسی کسی خبر کے ساتھ اخباروں میں تصویریں بھی شائع ہوتی تھیں۔ وہ تصویریں بھی کاٹ کر خبر کے پاس بورڈ پن سے لگا دی جاتی تھیں۔ یوں خبریں زیادہ بامعنی ہو جاتی تھیں، تصویروں کے نیچے جو انگریزی عبارت ہوتی تھی اس کا انگریزی ترجمہ بھی لکھوایا جاتا تھا۔ ان تصویروں کی انگریزی عبارت میں بہت سے نئے الفاظ لڑکوں نے سیکھے۔ بچوں کا خط خاصا سدھر گیا۔ جو لڑکا یا لڑکی جس دن خبریں پڑھتا تھا یا پڑھتی تھی اُس کی ذمہ داری ہوتی تھی کہ وہ خود لکھ کر خبروں کو شہروں کی مقررہ جگہ پر لگائے اور تصویریں بھی کاٹ کر لگائے۔ اس کام میں استاد کو انفرادی توجہ دینی ہوتی تھی تاکہ ہر مرحلہ پر کام ٹھیک ہو اور سلیقہ سے ہو۔ اس طرح ہر طالب علم توجہ سے کام کرتا تھا۔ ان تمام خبروں کا ایک البم بھی بنایا گیا اور ہر طالب علم کا خبروں کا ریکارڈ بھی رکھا گیا۔ مثلاً اردو اور انگریزی کے نئے الفاظ اور اُن کے معنی اور نقشے جو اخباروں میں چھپے تھے، اس البم کو اس طرح تیار کیا گیا کہ ہر شیٹ کو البم میں سے نکال کر بورڈ پر لگایا جا سکے۔

سال بھر کی خبروں میں سیلاب، زلزلے، ریلوں کے حادثے، مسلسل بارش کے نقصانات، بسوں کے حادثے، سمندروں کے طوفان اور آندھیوں کی خبریں اور تصویریں بھی تھیں۔ ان خبروں کے بعد سیلاب، زلزلے، بارش وغیرہ کے بارے میں طلباء کو بتلایا گیا اور جغرافیہ کا پورا نصاب پورا کرا لیا گیا۔ سورج گرہن اور چاند گرہن کے بارے میں بھی بتلایا گیا۔ دوسری جنگ عظیم کے زمانہ میں یورپ میں جنگ کے دوران جرمنی کی پیش قدمی کی خبریں نقشے کے ذریعہ دی جانے کا کام بھی کرایا گیا تھا۔ جرمنی اور جاپان کی فوجوں کی پیش قدمی دو نقشوں کے ذریعہ تیروں اور چھوٹی جھنڈیاں نصب کر کے سمجھائی جاتی رہی ہیں، اِس سے اُس وقت اِن ملکوں کی جنگی اور جغرافیائی حالت بچوں کو سمجھائی گئی تھی۔

ملا لکھوانا

بہت کم ابتدائی مدرسے ایسے ہوتے ہیں جو بچوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ بچوں کی سیرت

کی تعمیر کی طرف توجہ کرتے ہیں اور کام کرانے کے دوران اِس کو نظرانداز نہیں کرتے۔ اس کی عملی صورت تو وہ تھی جو مرغی خانہ کے پروجکٹ میں بیان کی گئی کہ بچے وقت کی پابندی، دیانت داری اور محنت سے کام کرنے کی مشق کرتے رہے، لیکن بچوں کی بعض خامیوں کو دور کرنے کے لئے املا کا ذریعہ بھی اختیار کیا گیا۔

جماعتوں میں املا لکھوانے کا کام ہر مدرسہ میں ہوتا ہے۔ اساتذہ صاحبان عام طور سے درسی کتابوں سے املا لکھواتے ہیں۔ میں نے املا کی تیاری خود کی اور عبارت میں بچوں کی خامیوں کا ذکر کرکے اُنھیں متوجہ کرتا رہا۔ اُستاد سے گہرا لگاؤ ہونے کے سبب بچوں نے اِن خامیوں کو دور کرنے کی کوشش کی۔

ذمّہ داری کا احساس

کام کا شوق اور ذمہ داری کا احساس یہ دو ایسی خوبیاں ہیں جن کی وجہ سے طلبار مشکل سے مشکل کام کرنے کے لئے آمادہ رہتے ہیں۔ اگر یہ خوبیاں طلبار میں نہ ہوں تو وہ ادنیٰ سے ادنیٰ اور آسان سے آسان کام انجام نہیں دے سکتے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ چھوٹی عمر کے طلبار اکثر بڑے بڑے اور مشکل کام کر جاتے ہیں، کیوں؟ اس لیے کہ یہ دو خوبیاں اُن کی مدد کرتی رہتی ہیں۔ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ بڑی عمر کے طلبار چھوٹے چھوٹے اور آسان کام نہیں کرپاتے۔ کیوں؟ اس لیے کہ ان کی طبیعتیں ان دو خصوصیات سے محروم ہیں۔ اُن میں کام کا شوق نہیں، ذمہ داری کا احساس نہیں۔ اس لیے وہ کافی بڑے ہوجانے کے باوجود زندگی میں ناکام رہتے ہیں۔

جھوٹ

تمام مدرسوں میں کتابوں کے ذریعہ کتنی بے بہا نصیحتوں اور اچھی باتوں کی تعلیم دی جاتی

ہے۔ بڑے اچھے لوگوں کے حالات پڑھائے جاتے ہیں۔ ان کی زندگیوں سے متعلق بڑی اچھی اچھی باتیں ہمارے سامنے آتی ہیں لیکن طالب علموں کی زندگی پر ان اچھی باتوں اور اچھے کردار کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

وہ جماعت میں، کھیل کے میدان میں، بورڈنگوں میں اور گھروں پر وہ کرتے ہیں جو کتابوں میں نہیں لکھا ہوتا، جس کی کسی کتاب میں تعلیم نہیں دی گئی ہوتی۔ وہ اپنی کمزوریوں، اپنی کوتاہیوں، اپنی سستی، اپنی کاہلی اور اپنی خراب عادتوں کو چھپانے کے لیے اکثر جھوٹ بولتے ہیں جبکہ اُردو، ہندی، انگریزی کی تمام کتابوں میں چیدہ چیدہ اسباق کے ذریعہ سچ بولنے اور جھوٹ نہ بولنے کی تعلیم دی جاتی ہے اور اس کی تاکید کی جاتی ہے۔ دراصل ماحول کی تعلیم کا درسی تعلیم سے زیادہ اثر پڑتا ہے۔

چڑانا یا چڑ نکالنا

جماعتوں اور بورڈنگوں میں اکثر و بیشتر طلبار کی دوسرے طلبار چڑ مقرر کر دیتے ہیں۔ اُنھیں پریشان کرنے اور ستانے کے لئے اُن کے اصلی نام سے نہیں بلکہ مقرر کی ہوئی چڑ سے پکارتے ہیں۔ اکثر طلبار اس کا کوئی اثر نہیں لیتے، کوئی اہمیت نہیں دیتے اور ہنس کر ٹال دیتے ہیں چڑانے والے لڑکوں کو شکست دینے اور اُس کی عادت چھڑانے کے لئے یہی بہترین علاج ہے، یہی بہترین طریقہ ہے۔ جتنی شدت سے آپ اثر لیں گے اُتنا ہی آپ کی چڑ کا اشتہار ہوگا۔ دوسرے لڑکے بھی چڑانے لگیں گے اور چڑانے والوں کا ایک گروہ آپ کے پیچھے پڑ جائے گا۔ اس لیے عقلمندی اس میں ہے کہ آپ نہ چڑیں اور کوئی اثر نہ لیں۔ اِن چڑانے والوں کو نظرانداز کر دیں۔ کسی کے چڑانے کا اثر لینا اور چڑنا اپنی طبیعت کی کمزوری اور اپنی کم عقلی کا اعلان کرنا۔

امتحان

امتحان ایک زبردست معرکہ ہے۔ یہ جتنا قریب آتا جاتا ہے اُتنی ہی تیزی کے ساتھ

طلبار کی ذہانت، حافظہ اور مستعدی کی صلاحیت کو اُبھارتا رہتا ہے، لیکن اس محرک سے بھی اکثر لڑکے پورا فائدہ نہیں اُٹھاتے، تعلیم پر آمادہ اور پڑھنے کی طرف مائل نہیں ہوتے۔ وہ اپنے دماغ کے تمام سوتوں کو اس زمانے میں بھی تعلیم کے لیے بند کر لیتے ہیں۔

اس محرک سے سمجھ دار، ہوشیار، تعلیم میں آگے بڑھنے والے اور اپنے مقصد کو سامنے رکھنے والے ہی فائدہ اٹھاتے ہیں۔ امتحان کے قریب والے دنوں کا ایک ایک لمحہ اُن کے لیے قیمتی اور اہم ہوتا ہے۔ اُن کی تیاری ایک باقاعدہ نقشے کے مطابق ہوتی ہے۔ تھوڑی سی غفلت بھی اُن کے لیے بڑی تکلیف دہ ہوجاتی ہے۔ لیکن وہ مایوس نہیں ہوتے، حوصلہ پست نہیں کرتے، مقصد کو نہیں بھولتے بلکہ دوگنی محنت، حوصلہ اور لگن سے اپنی کوششوں کو جاری رکھتے ہیں۔ کامیابی انھیں کے قدم چومتی ہے۔

ریکارڈ رجسٹر

مدرسہ ابتدائی کے ہر جماعت کے اُستاد کے پاس ایک ریکارڈ رجسٹر ہوتا ہے۔ اس رجسٹر کی ابتدا میں نے باڑہ ہندو راؤ کے دہلی ٹڈل اسکول میں کی جو اب شفیق میموریل اسکول کے نام سے وہاں چل رہا ہے۔ اس کے صفحوں پر رجسٹر حاضری کی طرح ۳۱ خانے بنے ہوتے ہیں۔ طلبار کے نام لکھنے کا خانہ علیحدہ ہوتا ہے۔ اس رجسٹر میں ہر طالب علم کے روزانہ کام کا اندراج نمبروں کی صورت میں ہوتا ہے۔ مثلاً پانچویں جماعت کا اُستاد اپنی جماعت میں حساب، اردو، سماجی علم اور عام سائنس پڑھاتا ہے۔ اُستاد مضمون وار طلبار کے نام اس رجسٹر میں لکھے گا۔ فرض کیجیے یکم اگست میں اُستاد نے حساب کے کسی قاعدہ پر پانچ سوالات حساب کے گھنٹے میں کرائے۔ جن لڑکوں کے یہ پانچوں سوالات صحیح ہو گئے اُن کی تعداد اُن کے نام کے آگے یکم اگست میں درج کر دی گئی (حساب میں تعداد سوالات درج ہوتے ہیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ کس قاعدہ پر کتنے سوالات لامشق طالب علم نے کی) اور تین سوالات گھر کے لئے دیدئے گئے۔ دوسرے دن جن لڑکوں

نے سوالات کر کے کاپیاں دیدیں انھیں دیکھکر ہر اگست میں اُن لڑکوں کے صحیح سوالات اُن کے ناموں کے آگے ہوم ورک کے نام سے لکھ دئے گئے۔ یوں ہر طالب علم کا روزانہ کا ریکارڈ درج ہوتا گیا۔ جن لڑکوں نے نہ جماعت میں نہ گھر پر کام کیا ان کا خانہ خالی رہا۔ اس میں لکھ دیا گیا کہ 'کام نہیں کیا'۔ اگر سرپرست اپنے بچے کی کاپی دیکھ کر شکایت کرے کہ جماعت میں حساب نہیں کرایا گیا یا گھر کے لیے کام نہیں دیا گیا تو اسے اس ریکارڈ رجسٹر سے مطمئن کیا جا سکتا ہے کہ روزانہ حساب کا کام کرایا جا رہا ہے، آپ کا لڑکا کام نہیں کرتا ہے، نہ جماعت میں نہ گھر پر۔

اردو کی کلاس میں اگر کوئی سبق پڑھا گیا ہے تو ہر طالب علم سے اس سبق کو جماعت میں پڑھوایا جاتا ہے اور اُس کی ریڈنگ کے نمبر درج کیے جاتے ہیں۔ اس ریڈنگ کے دوران الفاظ کے صحیح تلفظ اور روانی سے پڑھ سکنے کے نمبر دئے جاتے ہیں۔ سبق کے آخر میں جو سوالات ہوتے ہیں انھیں جماعت میں یا گھر پر حل کرایا جاتا ہے۔

ہر طالب علم کے کام کو دیکھ کر نمبر دئے جاتے ہیں اور وہ نمبر روزانہ رجسٹر میں درج ہوتے رہتے ہیں۔ جو لڑکا کام نہیں کرتا اس کے خانہ میں نمبر درج نہیں ہوتا بلکہ لکھا جاتا ہے کہ 'کام نہیں کیا'۔ اسی طرح تاریخ وار ہر مضمون میں درج ہوتا ہے۔

ریکارڈ رجسٹر کے اندراجات سے ہر طالب علم اپنے کام کی طرف سے چوکنا رہتا ہے اور غفلت نہیں کرتا۔ ریکارڈ کے پچاس نمبر ہوتے ہیں، یہ نمبر ششماہی اور سالانہ امتحانات کے موقع پر استاد اوسط نکال کر دیتا ہے۔ اگر سرپرست یا طالب علم اپنے نمبروں کی کمی کی شکایت کرتے ہیں، انھیں اس رجسٹر سے مطمئن کیا جاتا ہے۔ طلبار کے ہر مضمون کے نمبر اُن کی کاپیوں میں بھی درج ہوتے ہیں۔ ہر مضمون کی کاپی کے شروع میں فہرست مضامین ہوتی ہے۔ اس فہرست میں بھی طلبار کے کام کے حاصل کردہ نمبر درج ہوتے رہتے ہیں اور اسی سے رجسٹر میں درج کیے جاتے ہیں۔

ریکارڈ رجسٹر میں بچوں کا عملی کام بھی درج ہوتا ہے۔ خواہ انھوں نے اپنے اُستاد کی

ن میں کیا ہو خواہ کسی دوسرے اُستاد کی نگرانی میں۔ مثلاً باغبانی، بچوں کی دوکان، ایک دن کا
سہ اور کھلی ہوا کے مدرسہ میں طلبار اپنے اُستاد کی نگرانی میں عملی کام کرتے ہیں اور بچوں کی حکومت
نکشی اور ڈراموں کی تیاری میں وہ دوسرے استادوں کی نگرانی میں عملی کام کرتے ہیں اور استاد
ت کو اطلاع دیتے رہتے ہیں۔ اس طرح کے عملی کاموں میں طلبار کے اپنے شوق اور صلاحیت
طیار رہتا ہے۔ معلوم ہوتا رہتا ہے کہ بچوں نے کتنی ذمہ داری اور محنت سے کہاں کہاں کام
ہے۔ عملی کام کے سو نمبر ہوتے ہیں جو ششماہی اور سالانہ امتحانوں کے موقعوں پر علیحدہ علیحدہ
جاتے ہیں۔ اگر طالب علم کو کسی مفوضہ کام سے دلچسپی کم ہوتی ہے تو وہ اپنی پسند سے کوئی
ڈرائنگ بناکر نمبر حاصل کرتا ہے۔ طالب علم اسکیمو کا گھر بناکر روئی چپکا دیتا ہے، یا ننگا
کی مہم کا ماڈل بناتا ہے اور پلاسٹک کے چھوٹے چھوٹے آدمیوں کو چڑھائی کرتے ہوئے
ہے۔ طلبار عملی کاموں میں زیادہ سے زیادہ نمبر حاصل کرنے کے لئے مٹی، کارڈ بورڈ، تھری
رگھاس پھوس سے کوئی ماڈل بنا لیتے ہیں۔ اور جس سال کھلی ہوا کا مدرسہ ہوتا ہے اس
ل طلبار کے عملی کاموں کے نمبر ۸۰ فیصدی سے زیادہ ہی ہوتے ہیں۔ طلبار کی بنائی ہوئی
یا ایک دن کے مدرسہ کے موقع پر ہر جماعت میں رکھ دی جاتی ہیں۔

ساسیریں

جامعہ کی زندگی میں تعلیمی سیریں خاص اہمیت کی حامل رہی ہیں۔ ۱۹۲۲ کی دسمبر کی تعطیلات
ڈھ سے رؤف پاشا صاحب، ہیڈ ماسٹر جامعہ ہائی اسکول کی نگرانی میں ایک قافلہ آگرہ
پر روانہ ہوا۔ ہائی اسکول اور کالج کے اکثر طلبار اس میں شامل تھے۔ اساتذہ صاحبان
جہ عبدالحی صاحب، خواجہ حافظ فیاض احمد صاحب اور کئی دوسرے اساتذہ اس
ل تھے۔ مذہبی جوش جس قدر تھا کہ فتح پور سیکری جاتے ہوئے آگرہ فورٹ کے
نارم پر فجر کی نماز ادا کی گئی اور امامت کے لئے خاکسار کو حکم دیا گیا جو اُس وقت

ثانوی چہارم کا طالب علم تھا۔ سائیکلوں پر کشمیر کا سفر یادگار سفر رہا ہے۔ ۱۹۲۵ میں جامعہ علی گڑھ سے دہلی آگئی۔ اس وقت تک جامعہ کا کوئی ابتدائی مدرسہ نہیں تھا۔ خواجہ حافظ فیاض احمد مرحوم نے بارہ ٹوٹی صدر بازار میں ایک ابتدائی مدرسہ ۱۹۲۷ میں ایک کرایہ کی عمارت میں قائم کیا۔ یہیں کے چند طلبار نے ۱۹۲۹ کی گرمیوں کی تعطیلات میں مسوری کا تفریحی سفر کیا۔ طلبار کی تعداد تو چند تھی لیکن خواجہ حافظ فیاض احمد مرحوم، حامد علی خاں مرحوم، حافظ نبی احمد مرحوم، ماسٹر عبدالحئی صاحب اور سید نصیر احمد نیازی صاحب نے اس میں شرکت کرکے اس سفر کو بہت دلچسپ بنا دیا تھا اس سفر کا حساب کتاب رکھنا میرے ذمہ تھا۔

اس سفر کی سب سے دلچسپ ہستی خواجہ نبی احمد مرحوم تھے۔ موٹاپے کی وجہ سے پیدل نہیں چل سکتے تھے اس لیے ان کے لیے راجپور سے مسوری تک ایک ٹٹو کیا گیا۔ باقی لوگ پیدل چلے۔ راستہ میں بارش شروع ہوگئی۔ کسی نے ان کے ٹٹو کو سنٹی لگائی تو ٹٹو ایک نشیبی راستہ پر کٹ کٹ روانہ ہوگیا۔ اب یہ چیخے کہ بچاؤ۔ ماسٹر عبدالحئی صاحب دوڑ کر گئے اور ٹٹو کو پکڑ کر واپس لائے۔ بارش میں چلنا اور چڑھائی طے کرنا مشکل ہوگیا۔ بارش میں ہر ایک کو جونکوں نے بہت پریشان کیا۔ ہر ایک کا پیر لہولہان ہوگیا۔

کامٹی فال جاتے ہوئے بھی حافظ نبی احمد مرحوم کو بڑی پریشانی ہوئی۔ اس مرتبہ انھوں نے ٹٹو پر بیٹھنے سے انکار کر دیا۔ پیدل چلے لیکن ڈھلان پر ان کا پیدل چلنا بھی لڑھکنے سے کم نہ تھا۔ ہم لوگ چلائے کہ بیٹھ جاؤ لیکن بیٹھنے پر بھی قابو نہ تھا۔ یہ مشکل اس طرح دور ہوئی کہ انھوں نے کنارے کا ایک درخت پکڑ لیا اور بیٹھ گئے۔ ہم لوگوں نے دیکھا کہ سانس بہت زور زور سے چل رہا ہے اور بہت بے حال ہیں۔ تھوڑی دیر ستانے کے بعد پھر چلے لیکن اس مرتبہ عبدالحئی صاحب نگرانی کرتے چلے۔ کامٹی فال سے واپسی پر پھر بارش شروع ہوگئی اور سب ہی لوگ بھیگ کر شرابور ہوگئے۔ اس سفر کا حال طلبار نے بڑے اچھے انداز میں لکھا۔

(باقی آئندہ)

عبد اللطیف اعظمی

کوائف جامعہ

خطبہ عید الفطر

جامعہ طبیہ میں جمعہ اور عیدین کی نماز عام طور پر ناظم دینیات مولانا عبدالسلام صاحب رائی ندوی پڑھایا کرتے ہیں اور عربی خطبے کے دوران اردو میں تذکیر و تلقین کی جو باتیں کہتے ہیں وہ بڑی مفید اور فکر انگیز ہوتی ہیں۔ ایک زمانے میں مولانا مودودی نے یہ اہتمام کیا تھا کہ انہوں نے جمعہ کے موقع پر جو خطبے دئے تھے انھیں کتابی صورت میں چھپوا دیا تھا، مولانا عبدالسلام صاحب کے خطبے سن کر یہ خواہش ہوتی ہے کہ یا تو مولانا انھیں لکھکر پڑھتے یا کوئی اللہ کا بندہ انھیں قلمبند کر لیتا تو کتابی صورت میں نہیں تو کم از کم ماہنامہ جامعہ میں شائع کئے جاسکتے تھے جن سے اس وقت بھی لوگ استفادہ کرسکتے تھے اور آنے والی نسلیں بھی۔

امسال نماز عید الفطر کے موقع پر، جو جامعہ کی زیر تکمیل مسجد میں ادا کی گئی اور جس میں جامعہ برادری کے علاوہ، آس پاس کے لوگ، نئی دہلی کے سرکاری آفیسر اور ملازمین اور عرب ممالک کے کچھ سفیر شریک تھے، مولانا نے جو تقریر کی، ضرورت ہے کہ مسلمان اسے بہت غور اور توجہ سے سنیں۔ اس کا خلاصہ درج ذیل ہے:

انھوں نے قرآن حکیم کی آیت كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ ـــ الخ پڑھنے کے بعد فرمایا: "اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرماتا ہے کہ تم سب سے اچھی قوم ہو۔ خیر الامم ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اغراض و خواہشات سے بلند ہو کر تمہارے اندر خدمت خلق کا جذبہ اور خدا کے بندوں کو برائیوں سے بچا کر صحیح راہ دکھانے کا ولولہ ہو اور اس خدمت کا خدا کے سوا اور کسی سے کوئی صلہ مطلوب نہ ہو۔ بندگانِ خدا کی بے غرض خدمت ایک مومن کا مقصدِ زندگی ہے۔ پیغامبر اسلام علیہ السلام نے الخلق عیال اللہ کہہ کر ساری خلقت کو خدا کا کنبہ قرار دیا اور ان کی خدمت کو نیکی اور حسن کردار کا معیار قرار

دیا۔ سردار کے لئے قوم کا خادم ہونا ضروری ہے (سید القوم خادمہم) اس تعلیم کا اثر تھا کہ اس کے پیروؤں نے شروع ہی سے اس جانب توجہ کی۔ صحابہؓ اور بزرگانِ دین کی زندگی میں بکثرت خدمتِ خلق کے واقعات ملتے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ ایک بوڑھی عورت کی بکریاں دوہ دیا کرتے تھے۔ جب وہ خلیفہ ہوئے تو اس عورت کی چھوٹی بچی نے کہا اب یہ خلیفہ ہو گئے ہیں ہماری بکریاں نہیں دوہیں گے حضرت ابوبکرؓ نے سنا تو فرمایا کہ میں اب بھی یہ خدمت انجام دیتا رہوں گا چنانچہ برابر وہ اس پر عمل کرتے رہے۔ تجارت ذریعہ معاش تھی خلافت کے بعد لوگوں نے کہا کہ آپ تجارت میں لگے رہیں گے تو ملک کا انتظام اور رعایا کی خبرگیری کون کرے گا لوگوں کے اصرار سے بیت المال سے معمولی تنخواہ لینے پر راضی ہو گئے لیکن دل اس سے مطمئن نہ ہوا۔ انتقال کے وقت وصیت کی کہ میری جائداد فروخت کرکے یہ ساری رقم بیت المال کو واپس کردی جائے۔ وفات کے بعد حضرت عمرؓ کے سامنے جب معاملہ آیا تو وہ بہت متاثر ہوئے دیر تک روتے رہے اور فرمایا ابوبکرؓ اپنے بعد والوں کے لئے بہت مشکل کر گئے۔ یہ مثال ہمیشہ ان کے سامنے رہی مرتے وقت اپنے متعلقین کو ہدایت کی کہ یہ مکان اور املاک فروخت کرکے وہ رقم جو تنخواہ کے طور پر مجھے ملتی رہی تھی بیت المال میں داخل کردی جائے۔ خلافت کا سارا زمانہ روکھا پھیکا کھاکر اور موٹا جھوٹا پہن کر گزار دیا غریبوں مسکینوں کی خدمت کرتے رہے۔ حضرت عثمانؓ کی خوشحالی بہت مشہور ہے غنی ان کے نام کا جزو ہو گیا ہے لیکن خلافت ملی تو اپنے عیش و آرام کو چھوڑ کر دوسروں کی راحت کی فکر میں لگ گئے۔ مورخین نے تصریح کی ہے کہ دوسرے لوگوں کو امیرانہ کھانا کھلاتے لیکن خود سرکہ اور روغن زیتون سے روٹی کھاتے ایک پیسہ بیت المال سے نہیں لیا اپنا تجارتی سرمایہ اور جائداد سب خدمتِ خلق میں صرف کردی۔ حضرت علیؓ کا زہد و تقویٰ تو ضرب المثال ہے۔ رات دن خلافت کے کاموں میں لگے رہتے تھے کیسا مشکلات کا زمانہ تھا۔ کیسے فتنوں کے دروازے کھل رہے تھے لیکن علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے آخری لمحات حیات تک حق و صداقت کا علم بلند رکھا اور خدا کے بندوں کو راہِ نجات دکھاتے رہے اور ان کی راحت و آسانی میں لگے رہے۔ واقعات بہت ہیں لیکن خطبہ کے محدود وقت میں ان کے بیان کی گنجائش نہیں۔

صحابہ اور بزرگانِ دین کی اسی بے لوث زندگی اور بے غرض خدمت کا نتیجہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں مخلوق کا محبوب بنا دیا تھا جدھر وہ نکل جاتے تھے لوگ ان کے نقوشِ قدم کو

دلیل راہ اور ان کی خاک پا کو سرمۂ چشم بناتے تھے۔ آج بھی اس نور زندگی میں یہی تاثیر ہے صدیاں گذر گئیں لیکن خواجہ نظام الدین اب بھی محبوب الٰہی ہیں اور ان کا آستانہ بندگان خدا کا مرکز عقیدت ہے۔ وقت بہت ہو گیا دو ایک واقعات اپنے زمانہ کے بھی سن لیجئے۔ تقریباً تیس برس ہوئے ہوں گے بلبھ گڑھ کے قریب ایک صاحب مولوی رحمۃ اللہ رہتے تھے بڑے مخلص اور درد مند تھے۔ جامعہ کے سنسکرت اور ہندو تھیالوجی کے استاد پنڈت حکم چند نے مجھے ان کا ایک عجیب واقعہ سنایا۔ مولوی صاحب کا تمام گھر گرستوں کی طرح قاعدہ تھا کہ فصل کے زمانہ میں سال بھر کی ضرورت کا سامان خرید لیا کرتے تھے جس سال دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو وہ حسب معمول اناج خرید چکے تھے جنگ کے بعد قیمتیں بڑھنے لگیں اور چند ماہ میں ایک روپے کے بیس سیر والے گیہوں چار سیر کے بکنے لگے ایک دن خبر ملی کہ مولوی صاحب اپنا اناج فروخت کر رہے ہیں۔ خیال ہوا کہ بڑھی ہوئی قیمت سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں لیکن جب لوگوں نے گیہوں کے دام پوچھے تو کہا کہ ایک روپے کے بیس سیر۔ لوگ حیرت سے مولوی صاحب کو دیکھنے لگے سمجھے مذاق کر رہے ہیں لیکن جب مولوی صاحب نے سنجیدگی کے ساتھ بار بار یہی کہا تو ان کے ایک بے تکلف دوست (پنڈت جی کے والد) نے کہا مولوی صاحب کیا غضب کرتے ہیں کیا گھر لٹانے کا ارادہ ہے؟ کہنے لگے پنڈت جی! اب مجھ سے یہ گیہوں کھائے نہیں جاتے نوالے حلق میں پھنستے ہیں، میں بیس سیری روپے کے بھاؤ کے کھا رہا ہوں اور میرے غریب بھائی چار سیر کے حساب سے خرید رہے ہیں، یہ فرق طبیعت کو گوارا نہیں ہوتا، اس لیے جس طرح بیس سیر کے خریدے تھے، اسی طرح بیس سیری روپے کے حساب سے بیچ دیتا ہوں اور اب اپنے دوسرے بھائیوں کی طرح میں بھی چار سیری روپے کے حساب سے خرید کر کھاؤں گا، اس کے بغیر طبیعت کو چین نہیں آئے گا۔ اس واقعے کے چند برس بعد مولوی صاحب کا انتقال ہو گیا اور ۱۹۴۷ء کا ہولناک زمانہ آیا، مولوی صاحب کے لڑکوں نے بھی جان بچانے کے لئے بھاگنا چاہا، مگر گاؤں والوں نے ان کے قدم پکڑ لئے اور کہا کہ گھبراؤ نہیں ہم تمھاری حفاظت کریں گے، تم مولوی رحمت اللہ کی اولاد ہو۔ چنانچہ اس قتل و غارتگری کے زمانہ میں ان کے لڑکے آرام اور حفاظت سے رہے اور ان کی طرف کسی نے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔

اب ایک ٹیچر کا کردار بھی سنئے۔ لکھنؤ کے جوبلی کالج میں ایک استاد صدیقی تھے (اب شاید

کہیں اور ہوں، غیر مسلموں کی بہت بڑی اکثریت کے درمیان رہتے تھے، مگر اپنی ایمانداری کی بدولت سب کی آنکھوں کا تارا تھے۔ کالج کے لئے ہزاروں روپے کا سامان ان کی معرفت خریدا جاتا تھا، مگر کبھی ایک پیسے کا فائدہ نہیں اٹھایا، دوکانداروں نے انتہائی کوشش کی کہ ان کی کوئی نذر قبول کر لیں لیکن ناکام رہے، ان کے ایک ساتھی نے مجھے بتایا کہ ایک مرتبہ کسی بڑے دوکاندار کو کسی سامان کے لیے انھوں نے ٹیلیفون کیا، ملازم نے فون مالک کو دیا تو مالک کھڑا ہو گیا، نوکر نے کہا، بیٹھ جائیے، دوکاندار بولا، بیٹھ کیسے جاؤں آدمی نہیں بھگوان بول رہے ہیں، میں اس شخص کو ایک پیالی چائے کا بھی ممنون نہ کر سکا۔ ایک مزدور کا بھی حال سنئے۔ اجرت دو روپے زیادہ لیتا تھا، مگر متعصب سے متعصب لوگ اس کو بلانے کی کوشش کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اجرت دو روپے زیادہ لیتا ہے مگر کام چار روپے سے بھی زیادہ کا کر دیتا ہے اور پھر ایماندار ایسا کہ اگر گھر میں جواہرات پڑے ہوں، تب بھی ان پر نظر نہیں ڈالتا۔

دوستو! گنتی کے پھیر میں نہ پڑو، وزن پیدا کرو۔ کاغذ کے سینکڑوں پرزے ہوا کے ایک جھونکے میں تتر بتر ہو جاتے ہیں، مگر پتھر کی چٹان کو بڑی سے بڑی آندھی بھی نہیں ہلا پاتی۔ شکایت کی عادت چھوڑ دو، اپنا کیرکٹر بلند کرنے کی کوشش کرو، دوسروں کو برا کہنے میں اپنا بھلا نہیں ہے، طاقت باہر نہیں ہے، خود اپنے اندر ہے، آپ کے اخلاق بلند ہوں گے، دل میں خلوص اور طبیعت میں بے غرضی ہوگی تو دشمن بھی آپ سے محبت کرنے لگیں گے لیکن کج خلقی اور نفس پروری دوستوں کو بھی متنفر کر دے گی۔ ذرا پیچھے پلٹ کر اپنی تاریخ کو دیکھو، تمھارے پاس ملک، ساز و سامان کیا کچھ نہیں تھا، لیکن خود غرضی اور ہوا و ہوس کے ہاتھوں دانے دانے کو محتاج ہو گئے۔ عروج و زوال کی اس داستان سے سبق لو، دوسروں کی طرف نہ دیکھو اپنی طرف دیکھو، اپنے اخلاق کو سنبھالو، اپنی عادات درست کرو، ایمان و عمل صالح سے آراستہ ہو کر زندگی کے میدان میں قدم رکھو اور دنیا کو دکھا دو کہ رحمت عالم کے نام لیوا آج بھی بندگان خدا کے لیے باعث زحمت نہیں باعث رحمت ہیں۔ اگر تم نے ایسا کر لیا تو دیکھو گے کہ وقت کا دھارا کس طرح تمھارے موافق ہو جائے گا اور عزت و سرفرازی اور عروج و اقبال کی متاع گم گشتہ پھر تمھارے ہاتھ میں آ جائے گی۔

آج عید کے اس مبارک دن عہد کر دو کہ آج تمھاری زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوگا احترام و

ہوا کی تاریکیوں سے نکل کر ایمان و یقین کی روشنی میں قدم آگے بڑھاؤ گے اور بے اعتدالی اور بے راہ روی کے بجائے صراط مستقیم پر گامزن رہو گے۔"

آخر میں مولانا نے جامعہ کے لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اس مسجد کی تعمیر میں تو تمام مسلمانوں نے شرکت کی ہے، لیکن اس کے مستقل انتظام اور اس کی مستقل ضروریات کی ذمہ داری آپ لوگوں پر ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ جامعہ کا آغاز مسجد سے ہوا تھا اور ایک وسیع اور شاندار مسجد کی تعمیر کا پروگرام جامعہ کے منصوبوں میں شروع سے شامل تھا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کی بڑی خواہش تھی کہ اس کی تعمیر کا کام جلد سے جلد شروع کیا جائے۔ میں جب بھی ان سے ملتا وہ اسے یاد دلاتے اور روپے کی کمی کے بارے میں فرماتے: کام شروع ہو جائے گا تو اللہ تعالیٰ روپے کا بھی انتظام کر دے گا۔ خدا کا شکر ہے کہ اب یہ مسجد اتنی تیار ہو گئی ہے کہ صرف پنج وقتہ نماز ہی نہیں بلکہ عید بقرعید اور جمعہ کے موقعوں پر اس کے اندر بخوبی نماز ادا کی جا سکتی ہے۔ اس لیے اس کے روزمرہ انتظام اور مستقل اخراجات کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے اور یہ کام جامعہ کے لوگوں کو ہی کرنا ہے۔

جلسۂ تقسیم اسناد

جامعہ کا کانووکیشن، ہر سال ۲۹ را کتوبر کو جو جامعہ کے قیام کا دن ہے، منعقد ہوا کرتا ہے، مگر امسال ۵ رنومبر کو منعقد ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس موقع پر خطبہ پڑھنے کے لیے لوک سبھا کے اسپیکر جناب گردیال سنگھ ڈھلوں کو دعوت دی گئی تھی اور وہ بیرونی ممالک کے سفر پر گئے ہوئے تھے، جس سے وہ ۵ رنومبر سے قبل یہاں نہیں آسکتے تھے، اس لیے حسب روایت ۲۹ را کتوبر کو منعقد نہیں کیا جا سکا۔ اس موقع پر موصوف نے جو خطبہ پڑھا اور شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب نے جو رپورٹ پیش کی وہ مکمل اس شمارے کے شروع میں شامل ہیں۔ فارغ التحصیل طلبا کو جو ڈگریاں یا ڈپلوما دیے گئے ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱-	ایم اے	۱۴
۲-	ایم ایڈ	۱۶
۳-	بی ایڈ	۱۰۸
۴-	بی اے (آنرز)	۳۲
۵-	بی اے (پاس)	۷۲
۶-	بی ایس سی (پاس)	۲۴
۷-	ڈپلوما آف بیسک ٹریننگ	۴۷
۸-	ڈپلوما ان ٹیچنگ آرٹ اینڈ کریفٹ	۳۲
۹-	ڈپلوما ان رورل سروسز	۳
۱۰-	ڈپلوما ان سول اینڈ رورل انجینرنگ	۴۵
	کل میزان	۳۹۳

بنگلا دیش کے مہاجرین کی وجہ سے حکومت ہند پر جو مالی زیر باری آئی ہے، اس کی وجہ سے امسال میلا نہیں کیا گیا اور کانوکیشن کی تقریب بھی بہت سادگی سے منائی گئی۔ اس کی وجہ سے معزز مہانوں کو تکلیف ہوئی ہوگی، خاص طور پر عصرانہ کے نہ ہونے کی وجہ سے روزہ داروں کو افطار میں زحمت ہوئی ہوگی، مگر ہماری مجبوریوں کی وجہ سے امید ہے انھوں نے برا نہ مانا ہوگا۔

جامعہ میں نئے داخلے

جامعہ کے مختلف اداروں میں نئے داخلوں کے بعد طلبار کی تعداد حسب ذیل ہے

۱-	جامعہ کالج	۵۴۱
۲-	استادوں کا مدرسہ	۳۰۷
۳-	اسکول آف سوشل ورک	۶۷
۴-	شعبۂ سول اینڈ رورل انجینرنگ	۹۰
۵-	مدرسہ ثانوی	۳۹۵
۶-	مدرسہ ابتدائی	۴۷۵
۷-	نرسری اسکول	۵۶
۸-	بالک ماتا سنٹر	۲۵۱
	کل میزان	۲،۱۸۲

The Monthly JAMIA
JAMIA NAGAR, NEW DELHI-25